

گاہر تیل گارسیا مارکنز



منتخب تحریریں

گاہریل گارسیا مارکز

منتخب تحریریں

کتابتِ کلاسیک

پہلی اشاعت: سرمایہ آج کراچی خصوصی شمارہ بہار ۱۹۹۱

دوسری اشاعت (کتاب کی صورت میں): جولائی ۱۹۹۳

اہتمام: آج کی کتابیں بی ۱۳۰ سیکٹر ۱۱ بی نارنگ کراچی ٹاؤن شپ کراچی ۷۵۸۵۰

طباعت: لیبو کیشنل پریس پاکستان چوک کراچی

خطاطی: محمد ایوب

ترتیب:

اجمل کمال

ترجے:

فاروق حسن

افضال احمد سید

راشد مفتی

آصف فرخی

عطا صدیقی

زینت حسام

اجمل کمال

مارکیز کیوں؟

اس سوال کا سب سے سادہ اور براہِ راست جواب تو یہ ہے کہ دنیا کی آواز زبانوں کی طرح اردو زبان کے پڑھنے والے بھی یقیناً اس کے حق دار ہیں کہ اس زمانے کے ایک عظیم ترین قصہ گو ادیب کی تحریروں سے آشنائی حاصل کریں۔
لیکن اس کے آواز جواب بھی ممکن ہیں۔

محمد حسن عسکری نے کہا تھا کہ ہر دور کے پڑھنے والوں کا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ہم عصر لکھنے والوں سے برابر سنت مطالبے کرتے رہیں۔ پڑھنے کا یہ عمل، بلاشبہ، صرف پڑھنے تک محدود نہیں۔ دنیا جہاں کے ادیبوں کی تحریروں سے آشنا ہونا، اس آشنائی کے لطف میں اوروں کو شریک کرنا، ان کا ترجمہ کرنا، ان تحریروں سے حاصل کی ہوئی روشنی میں اپنے زمانے، اپنے خطے اور اپنی زبان کے ادب کو پرکھنا اور اس کے مقام اور اس کی سمت کا کھوج لگانے کی کوشش کرنا، یہ سب پڑھنے ہی کے عمل کا حصہ ہے۔ اور اسی کے باعث لکھنے والے نئے نئے مطالبوں کا سامنا کرتے ہیں۔

مارکیز ایک بے مثل ادیب ہے، اور اس انتخاب کے مترجموں نے اس کے اسلوب کے حسن کو بھلا کر اردو میں قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس قصہ گو کے سرائیکی نثری سے مسرت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ آپ اس انکشاف سے بھی گزریں گے کہ یہ تحریریں جس دنیا کی حقیقت کو بیان کرتی ہیں وہ خود ہمارے خطے سے کس ناقابلِ یقین حد تک مماثل ہے۔ گو کہ مارکیز کے بیش تر فکشن میں واقعات ایک فرضی قصبہ میں پیش آتے ہیں جہاں اس نے اکوندو کا نام دیا ہے، لیکن یہ بات ہر لحاظ سے بالاتر ہے کہ اس کی بنیاد مارکیز نے اپنے ارد گرد کی دنیا کی حقیقی تفصیلات کے مدد پر حساس شعور پر رکھی ہے۔

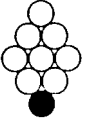
مارکیز کے اسلوب کو بیان کرنے کے لیے مغربی دانش وروں نے "طلسی حقیقت نگاری" کی اصطلاح وضع کی ہے۔ مارکیز کو اس سے قطعی اتفاق نہیں؛ وہ اپنے اسلوب کو محض حقیقت نگاری کہتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تخلیق کا سرچشمہ، آخری تجزیہ میں، حقیقت ہی ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں مبالغے کی کارفرمائی کم ہی دیکھتا ہے، لیکن بلاشبہ مارکیز کی حقیقت نگاری اس سہل انگار اسلوب سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی جو حقیقت کو یک رخِ خاد رکھنے کی عادی ہے، اور جس کا ہمارے ہاں بھی بہت چلن رہ چکا ہے۔ دوسری جانب، اس کا حقیقت نگاری کے اس بے بنیاد رد سے بھی کچھ واسطہ نہیں، ہمارا آج کل کا بیش تر فکشن جس کا شمار ہے۔ "آپ عقلیت کا برگ انجیر اُسی وقت اتار کر پیمینک سکتے ہیں،" مارکیز کہتا ہے، "جب آپ مکمل انتشار اور لغویت، اور فیمنشی، کی دلدل میں دھنسنے کے خطرے سے آزاد ہوں۔" تنقید اور حواس سے کام لے کر اپنی حقیقت کو دریافت کرنے کے علاوہ، لکھنے کے عمل کا نوے فی صد حصہ برصغیر کے کام پر مشتمل ہے، جس پر اس کے خیال میں لکھنے والے کو پوری طرح حاوی ہونا چاہیے۔

لاٹینی امریکا کے ایک دورِ اتحادہ ملک کولومبیا کی تاریخ نوآبادیت، آمریت، بے پناہ تشدد، خانہ جنگی، سیاسی بازیگری اور بڑی طاقتوں کے استعمار کی وہی کہانی ہے جو، برائے نام فرق کے ساتھ اس سیارے کے اس بڑے حصے پر دوہرائی جاتی رہی ہے جسے کچھ دنوں پہلے تک تیسری دنیا کہا جاتا تھا۔ یہ بنیادی طور پر ایک غم انگیز کہانی ہے، اور امید کے پہلو اس میں بہت کم ہیں۔ لیکن لاٹینی امریکا کے ادیبوں نے اس ناامیدی کا سامنا ایک بے محابا ادبی فراوانی سے کیا ہے۔ "ایک خمیر حقیقی اور مطلق العنان تاریخ" کے مقابل، مائیکل وڈ کے لفظوں میں، "یہ ادبی فراوانی، بیانیہ تکنیکوں کا یہ بلند ہمت مظاہرہ، ایک آزادی کی خواہش کا جشن منانے کے لیے ہے جو اخلاقی بھی ہے، سیاسی بھی اور فن کارانہ بھی۔"

حقیقت کو پوری طرح اپنے شعور اور بیان کی گرفت میں لے آنا اسے تغیر کر لینے ہی کی ایک شکل ہے۔ مارکیز کی تحریروں میں آپ ہی سردیکھیں گے، اور اس کی حیرت اور مسرت سے گزر جانے کے بعد شاید یہ سوال باقی رہ جائے کہ آخر کیوں ہماری حقیقت ہمارے ادیبوں کی تحریروں میں اپنا مکمل اظہار پانے سے محروم ہے۔

اجمل کمال

تیسرا باب



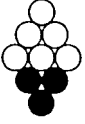
۹ پلینیو پولیسو بیندوزا: گابریئل

مضمون



ناولٹ اور کہانیاں

معصوم اریندرا	۳۷
محبت کے اُس پار منظر موت	۸۵
گم گشتہ وقت کا سمندر	۹۳
بڑے بڑے پروں والا ایک بوڑھا پھوس	۱۱۳
دنیا بھر کا حسین ترین ڈوب مرنے والا	۱۲۲



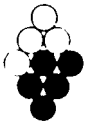
کہانیاں

- ۱۲۹ مٹل کے دن کا قیلوہ
۱۳۷ ~ ایک نہ ایک دن
۱۳۱ اس قصبے میں کوئی چور نہیں
۱۷۱ باتا زار کی حیرت انگیز سہ پہر
۱۸۰ مونٹیسل کی بیوہ
۱۸۸ سنپیر کے بعد کے دن
۲۱۱ کاغذی گلاب
۲۱۸ بڑی ماما کا جنازہ



ناول

۲۳۵ کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا



ناول

۲۹۵ ایک پیش گفتہ موت کی روداد

ناولوں کے ابواب



- ۳۷۱ تنہائی کے سوال (پہلے تین باب)
۳۲۲ وبا کے دنوں میں محبت (دوسرا باب)



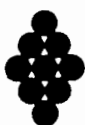
تقریر اور مضمون

- ۳۷۷ لاطینی امریکا کی تنہائی
۳۸۳ کولومبیا کا مستقبل



مضامین

- ۳۹۳ مائیکل وڈ: گابریئل گارسیا مارکیز
۵۰۷ ولیم رو: تنہائی کے سوال



گفتگو

- ۵۲۱ امرود کی مہک

- ۵۶۸ ضمیمہ ۱ واقعات کی سن وار ترتیب
۵۷۵ ضمیمہ ۲ کتابیات

گابریئل گارسیا مارکیز کے ہم وطن ادیب پلینیو اپولیو پیندورا (Plinio Apuleyo Mendoza) نے مارکیز کی زندگی، فن اور خیالات کے بارے میں ایک طویل دوستانہ گفتگو کو "امروڈ کی مہک" (Fragrance of Guava) نامی کتاب کی شکل میں مرتب کیا جس کا انگریزی ترجمہ ۱۹۸۳ میں شائع ہوا۔

پیندورا ۱۹۳۲ میں پیدا ہوئے اور ناول نگار اور مدیر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان کا ناول *The Deserter* ۱۹۷۳ میں شائع ہوا تھا اور دوسرا ناول *Years of Flight* ۱۹۷۹ میں۔ پیندورا وینسویا اور کولومبیا کے کئی رسالوں کی ادارت کر چکے ہیں۔ *Libre* نامی رسالہ، جو ان کی ادارت میں ۱۹۶۰ کی دہائی میں پیرس سے شائع ہوتا تھا، ان متعدد لاطینی امریکی ادیبوں کو یکجا کرنے کا موجب ہوا جن کے نام آج دنیا بھر میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔

"گابریئل" پیندورا کے لکھے ہوئے ان پانچ سوانحی پاروں پر مشتمل ہے جو "امروڈ کی مہک" نامی کتاب میں مختلف مقامات پر شامل ہیں اور مارکیز کی تحریروں کے اس انتخاب کے لیے ایک پس منظر فراہم کر سکیں گے۔ مارکیز کی گفتگو سے ترتیب دیا گیا متن "امروڈ کی مہک" کے عنوان سے انتخاب کے نویس جسے میں شامل کیا گیا ہے۔

پلینو پولیسو میندوزا

ترجمہ: اجمل محال

گا برینٹل

ریل گاڑی۔۔۔ جسے بعد میں اس کی یادداشت میں ایک زرد رنگ کی، گرد آلود اور دم گھونٹنے والے دھویں میں لپٹی ہوئی ریل گاڑی کی صورت میں محفوظ رہتا تھا۔۔۔ کیلوں کے وسیع باغات سے گزر کر ہر روز گیارہ بجے قصبے میں پہنچتی۔ پٹریوں کے ساتھ ساتھ چلتی تھی سرسبز کیلوں سے لدی سُست رفتار ریل گاڑیاں ہچکولے کھا رہی ہوتیں۔ ریل گاڑی کے قصبے میں داخل ہوتے ہی مسافروں کو گرمی کی ایک شدید لہر محسوس ہوتی، اور اسٹیشن پر انتظار کرتی ہوئی عورتیں ہمیشہ اپنی بڑی بڑی رنگین چھتریوں کے نیچے دھوپ سے پناہ لیے ہوئے ہوتیں۔

فرسٹ کلاس کے ڈبوں کی تختیوں پر بید کی بنی ہوئی تھیں۔ تھرد کلاس کے ڈبوں میں، جن میں باغات کے مزدور سفر کیا کرتے تھے، لکڑی کی بنچیں ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی ایک اور ڈبہ گاڑی میں جوڑ دیا جاتا، مکمل ایرکنڈیشنڈ اور نیلے شیشے کی کھڑکیوں والا، جس میں بنانا کمپنی کے اعلیٰ عہدے دار سفر کرتے تھے۔ جو لوگ اس ڈبے سے اترتے تھے نہ اُن کے کپڑے قصبے کی گلیوں میں نظر آنے والے لوگوں جیسے ہوتے، نہ اُن کی رنگت قصبے کے لوگوں کی طرح سرسوں کی سی ہوتی، اور نہ اُن کا انداز ان کی طرح سویا سویا ہوتا تھا۔ وہ بھرے بالوں، مضبوط جسموں اور تھینگے کی سی سُرخ رنگت والے لوگ مہم جوؤں کی طرح دھوپ سے بچانے والے بیٹوں اور موزوں سے لیس ہوتے تھے۔ اگر اُن کی بیویاں بھی ساتھ ہوتیں تو وہ باریک ملل کے لباس میں لپٹی سید تازک

اندام دکھائی دیتی تھیں۔

"امریکی!" اُس کے تانا، جو کر ٹل تھے، اسے بتاتے۔ ان کے انداز میں اس تحقیر کا شائبہ سامہوتا جو قصبے کے قدیم، معتبر خاندان تمام نے آنے والوں کی بابت ظاہر کرتے تھے۔ جب گا بریئل پیدا ہوا، اس وقت تک کیلوں کی تجارت کے اُس جوش و خروش کے آثار باقی تھے جس نے چند سال پہلے اس علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اراکاتا کا وائلڈ ویسٹ کے کسی قصبے جیسا لگتا تھا، نہ صرف اس ریل گاڑی اور پرانے چوبی مکانات اور جھلستی ہوئی تچی سرخوں کی وجہ سے، بلکہ اُن اساطیر اور قصے کہانیوں کی وجہ سے بھی جو اب تک اپنی جڑیں گاڑ چکی تھیں۔ اُنیں سودس کے لگ بجگ، جب یونائیٹڈ فروٹ کمپنی کیلے کے گھنے بانات کے درمیان اپنی آبادیاں قائم کر چکی تھی، یہ قصبہ انتہائی تعیثانہ اسراف کے ایک دور سے گزر آیا تھا۔ اُن دنوں میں پیسہ پانی کی طرح بہتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ برہنہ عورتیں تاجروں کے سامنے رقص کیا کرتی تھیں، جو اپنے سگار پلتے ہوئے نوٹوں سے سلگاتے تھے۔

اس قصبے، اور اس جیسے اور قصبوں کی کشش بے شمار مہم جوؤں اور طوائفوں کو غول در غول کولومبیا کے شمالی ساحل کے اس اُنھاڑ قصبے میں لے آئی۔ یہ "نچلے طبقے کے لوگ تھے، اکیلی عورتیں اور مرد، جو اپنے خمر بوٹل بگے باہر لگے گھصوں سے باندھتے اور ہاتھ میں اپنا کل اسباب یعنی لکڑی کا صندوق یا کپڑوں کی گٹھری اٹھائے ہوتے۔"

اس کی تانی، دو تارا نکیلیٹا کے لیے، جو شہر کے ایک قدیم ترین خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، "اُن جانے چہروں، رہگزاروں کے کنارے لگے سائیاں، گلی میں کپڑے بدلتے مردوں، کھلی چھتریوں تلے صندوقوں پر بیٹھی عورتوں، اور بوٹل کے آس پاس بھوک سے ایک کے بعد ایک مَرتے لوارث چھروں کا یہ طوفان" محض "پتوں کا طوفان" تھا؛ انسانی کوڑے کرکٹ کا بگولا جو کیلوں کی تجارت کا سنہری دور اپنے چہچہے اراکاتا کا میں چھوڑ گیا تھا۔

دو تارا نکیلیٹا اُس مکان پر حکمران تھیں جس کو وہ بعد میں ایک وسیع و عریض، قدیم مکان کے طور پر یاد رکھنے والا تھا، جس کے پائیں باغ میں تپتی ہوئی راتوں میں چنبیلی کی گارھی خوشبو تیرتی رہتی تھی، اور جس کے بے شمار کمرے تھے جن میں سے گاہے گاہے مرحوم رشتہ داروں کے آہیں بھرنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ دو تارا نکیلیٹا کا خاندان محلّتی رست کے جزیرہ نما گواہیرا سے تعلق رکھتا تھا جو مقامی انڈین باشندوں، اسمگلروں اور ساحروں کا مسکن تھا۔ وہ غیر معمولی چیزوں کے بارے میں اس طرح بات کرنے کی عادی تھیں گویا وہ روزمرہ کی باتیں ہوں۔ آہنی عزم کی مالک، پستہ قد اور بھیڑی آکھوں والی اس عورت کے ذہن میں مرے ہوؤں اور زندوں کے

درمیان سرحد واضح نہ تھی، اور جوں جوں ان کی عمر میں اضافہ اور پیدائشی میں کمی ہوتی گئی، یہ سرحد اور بھی زیادہ دھندلی ہونے لگی، یہاں تک کہ خاتمے کے قریب انھیں اکثر مردوں سے باتیں کرتے اور ان کی آہیں، سسکیاں اور ہکا-بتیں سنتے ہوئے پایا جاسکتا تھا۔

جب رات -- سو سن اور چنبیلی کی گھنٹی خوشبو اور جھینگروں کی آواز سے بوجھل، گرم، جس زدہ رات -- ایک لخت مکان پر آن اترتی تو کرسی پر بیٹھے ہوئے پانچ سالہ گا بریئل کو اس کی تانی ان سرے ہوؤں کے قفسے سنا سنا کر دہشت زدہ کیا کرتیں جو ہر طرف گھومتے پھرتے تھے۔ ان میں خالہ بیتر تھی، ماموں لزارو اور خالہ مارگریٹا -- حسین مارگریٹا مارکیز جو اگرچہ جوانی میں مر گئی تھی، لیکن جس کی یاد خاندان کی دو نسلوں کے ذہنوں میں سلگتی رہی۔ "اگر تم بیلے،" تانی ختمے گا بریئل سے کہتیں، "تو خالہ بیتر اپنے کمرے سے نکل آئیں گی۔ یا شاید ماموں لزارو۔"

(آج، پچاس برس بعد بھی، جب گا بریئل کی آنکھ روم یا بیڈشاک کے کسی موٹل کے کمرے میں کھلتی ہے تو وہ ایک لمحے کے لیے پچپن کی اسی قدیم دہشت سے گزرتا ہے: اندھیرا اس کے اُن مرحوم قربات داروں کا مسکن ہے۔)

جس مکان میں اس کا پچپن گزرا وہ اس کے ماں باپ کا نہیں بلکہ نانا تانی کا تھا۔ بعض مخصوص حالات اسے بڑوں کی دنیا میں گم ایک بچہ بنا دینے کا باعث بنے، وہ دنیا جو ماضی کی یادوں کے بوجھ سے دبئی ہوئی تھی: جنگوں کی یادیں، خشک سالی کے برسوں اور گزرے وقتوں کی آب و تاب کی یادیں۔

اس کی ماں، لوئیزا کبھی شہر کی حسین لڑکیوں میں سے ایک تھی۔ وہ خانہ جنگی کے ایک عرصہ، کرنل مارکیز کی بیٹی تھی جن کی تمام لوگ عزت کرتے تھے، اور اس کی پرورش علاقے کے ندیم معتبر خاندانوں سے مخصوص سخت گیر، اخلاقی اور فطری طور پر سید قدامت پرست، کاسٹیلیئن ماحول میں ہوئی تھی۔ ان خاندانوں کا طریقہ تھا کہ وہ نئے آنے والوں اور اجنبیوں کو اصلے پر رکھتے تھے۔ لیکن جنہیں وہ اتنا ناپسند کرتے تھے، انھیں اجنبیوں میں سے ایک شخص ایک سہ پہر ان کے دروازے پر آیا اور لوئیزا کا رشتہ طلب کیا۔

گا بریئل الیمو گارسیا، کارتاہینا یونیورسٹی میں اپنی طب کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر نیلگراف آپریٹر کے طور پر کام کرنے اراکاتاکا چلا آیا تھا۔ طب کا پیشہ اپنانے کے لیے مناسب مسائل میسر نہ ہونے کی وجہ سے اس نے سرکاری ملازمت اختیار کرنے اور شادی کر لینے کا فیصلہ لیا تھا۔ اپنے ذہن میں قصبے کی تمام مقامی لڑکیوں کی فہرست بنا کر اس نے آخر کار لوئیزا مارکیز کے لیے قسمت آزمائی کی ٹھانی: وہ حسین اور سنجیدہ تھی اور ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی

تھی۔ اگرچہ اس نے کبھی اپنی محبت کے اظہار کے لیے اس لڑکی سے مخاطب ہو کر ایک لفظ بھی نہ کہا تھا، پھر بھی وہ اس کا رشتہ طلب کرنے کے لیے ایک عزم کے ساتھ اس کے گھر کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ اُس کے خاندان نے صاف انکار کر دیا: لوئیزا کسی ٹیلیگراف آپریٹر سے ہرگز شادی نہیں کر سکتی، خاص طور پر جب اس آپریٹر کا آبائی وطن بولیوار کا علاقہ رہا ہو جہاں کے لوگ سہل پسند اور اکھڑتے اور اس استکام اور وقار سے محروم تھے جو کرنل اور اس کے خاندان کا امتیاز تھا۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ گارسیا کترروہ بٹو تھا یعنی اُس پارٹی سے تعلق رکھتا تھا جس کے خلاف کرنل نے زندگی بھر جدوجہد اور بعض موقعوں پر مسلح جنگ تک کی تھی۔

(کولومبیا ۱۸۱۹ میں اسپین کے تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے بعد وقفے وقفے سے جاری رہنے والی خانہ جنگی کا ایک صدی تک شکار رہا۔ اٹھارہ سو چالیس میں دو پارٹیوں نے واضح شکل اختیار کر لی تھی: ایک طرف کترروہ بٹو تھے جن کے روایتی فلسفے کی بنیاد خاندان، کلیسا اور ریاست پر تھی، اور دوسری طرف لبرل جو آزاد خیال، مخالف کلیسا اور معاشی آزاد روی کے قائل تھے۔ ان دونوں پارٹیوں کے درمیان تمام خانہ جنگیوں میں سے خونریز ترین وہ تھی جسے "ہزار روزہ جنگ" کہا جاتا ہے، جو ۱۸۹۹ سے ۱۹۰۲ تک جاری رہی اور جس نے ملک کو دیوالیہ اور تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔)

لوئیزا اور اس کے خواستگار کے درمیان فاصلہ پیدا کرنے کی غرض سے اُسے اس کی ماں کے ساتھ ساحل پر واقع دیگر قصبوں اور شہروں کے ایک طویل سفر پر روانہ کر دیا گیا۔ لیکن اس کا چنداں فائدہ نہ ہوا۔ ہر قصبے میں تار گھر موجود تھا اور تمام ٹیلیگراف آپریٹر اپنے اراکاتاکا کے ساتھی سے تعاون کرتے ہوئے اس کے عشقیہ پیغامات مورس کوڈ میں وصول کر کے فوجوان خاتون تک پہنچاتے رہے۔ وہ جہاں جہاں گئی یہ تار اُس کا اسی طرح پہنچا کرتے رہے جس طرح زرد تتلیاں مورسیو بایلوینا کے تعاقب میں رہتی تھیں۔ لوئیزا کے خاندان کو اس مستقل مزاجی کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہی بنی۔ شادی کے بعد گا بریئل الیمو اور لوئیزا نے کریبین میں کے ساحل پر واقع ایک قدیم شہر ریوباچا میں سکونت اختیار کی۔ یہ شہر ایک زمانے میں بحری قزاقوں کی یلغار کا بہت دفرن تک شکار رہ چکا تھا۔

کرنل کی خواہش پر لوئیزا نے اپنے پہلے بچے کو اراکاتاکا میں جنم دیا۔ اور پھر، شاید ٹیلیگراف آپریٹر سے اس کی شادی کے باعث پیدا ہونے والی تلخی کی باقیات کو رفع کرنے کی غرض سے، اس نے نومولود کو اس کے نانا تانی کے ہاتھوں پرورش پانے کے لیے ویس جھوڑ دیا۔ اس طرح گا بریئل اس گھر میں، بہت سی عورتوں کے درمیان تنہا لڑکے کے طور پر بڑا ہوا۔

ان میں دو تار نکلیں تھیں جو مردوں سے زندوں کی طرح بات کرتی تھیں، اور ان کے علاوہ خالہ فرانسکا، خالہ بیٹرا اور خالہ الورا تھیں۔ یہ تمام عورتیں تختیل پرست تھیں اور مستقل طور پر پرانی یادوں کے درمیان رہا کرتی تھیں۔ ان سب میں پیش گوئی کی حیران کن صلاحیت موجود تھی اور اکثر وہ اپنے گواہی کے اندین ملازموں کی طرح توہم پرستی کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ وہ سب غیر معمولی واقعات کو اس طرح برتتی تھیں گویا وہ انتہائی فطری باتیں ہوں۔ مثلاً خالہ فرانسکا سیمو نو سیا، جو ایک منسوبہ اور کبھی نہ ٹھکنے والی عورت تھی، ایک روز اپنا کفن پینے بیٹھ گئی۔ جب گا بریئل نے پوچھا کہ "آپ یہ کفن کیوں بنا رہی ہیں؟" تو اس نے جواب دیا: "اس لیے بیٹے کہ میں مرنے والی ہوں"، اور یہ حقیقت ہے کہ جوں ہی اُس کا کفن تیار ہوا، وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی، اور مر گئی۔

گا بریئل کے نانا بلاشبہ گھر کی سب سے اہم ہستی تھے۔ کھانے کی میز پر بڑے میاں کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی اور ان کے ارد گرد نہ صرف گھر کی عورتیں بیٹھی ہوتیں بلکہ وہ دوست اور رشتے دار بھی جو اُس روز گیارہ بجے کی گاڑی سے وہاں پہنچے ہوتے۔ ان کی ایک آنکھ لکڑ کوما کے ہاتھوں سے بوجھی ہوئی تھی مگر وہ عمدہ اشتہا، لٹکتی ہوئی توند اور سرگرم جنسیت کے مالک تھے جس کے سبب علاقے بھر میں درجنوں ناجائز بچوں کا جنم ہوا تھا۔ کرنل مارکیز ایک اصول پسند لبرل تھے اور پورا قصبہ ان کا سید احترام کرتا تھا۔ اُس واحد آدمی کو جس نے کبھی ان کی توہین کی جرأت کی تھی، انھوں نے اپنے پستول کی ایک بی گولی سے قتل کر دیا تھا۔

اپنی جوانی میں کرنل نے ان خانہ جنگیوں میں حصہ لیا تھا جو وفاق کے حامی لبرل اور آزاد خیال لوگوں نے، بڑے جاگیرداروں، کلیسا اور ریاستی فوج کی پشت پناہی سے یکے بعد دیگرے اقتدار میں آنے والی کتر رویہ حکومتوں کے خلاف لڑی تھیں۔ ان میں سے آخری جنگ، جو ۱۸۹۹ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۰۲ء تک جاری رہی، اپنے چھپے ایک لاکھ لاشیں چھوڑ گئی تھی۔ گاربالدی کی روایت اور فرانسیسی انقلابیت کے زیر اثر ایک پوری نوجوان لبرل نسل سرخ قمیصوں میں ملبوس، جھنڈے اٹھائے میدان جنگ میں اتری تھی اور نیست و نابود کر دی گئی تھی۔ کرنل نے اپنے معرکے، افسانوی شہرت کے مالک جنرل رافیل اُریبے اُریبے کی کمان میں، ساحلی علاقوں میں سرکے تھے جہاں سب سے زیادہ خونریزی ہوئی تھی۔ (جنرل کی شخصیت کے بغض پسلوں اور اس کے بہت سے جسمانی خدوخال کی بنیاد پر گا بریئل آگے چل کر کرنل اور یلیا نو بونندیا کا کردار تراشے والا تھا۔)

جنگ کے زمانے کے واقعات اپنے ذہن میں بار بار بسر کرنے کی عادت میں مبتلا ساٹھ سالہ نانا اور ان کے پانچ سالہ نواسے کے درمیان، جن کے سوا اس عورتوں سے بھرے گھر میں

کوئی اور مرد نہ تھا، ایک انڈی اور مضبوط دوستی قائم ہو گئی۔

گا بریٹل کے حافظے میں اس بوڑھے آدمی کی انتہائی خوشگوار یادیں ہمیشہ محفوظ رہیں۔
تھیں: کھانے کی میز پر، جب وہ گھر کی عورتوں کی مستقل چلتی رہنے والی باتوں کے درمیان
پُرسکون اور تھکمانہ انداز سے اپنی جگہ سنبھالتے تھے اور سالن کی بجائے اُگلتی قاب ان کے سامنے
رکھی ہوتی تھی؛ سہ پہر میں جب وہ دونوں پیدل قصبے کا چکر لگاتے تھے؛ جب وہ چلتے چلتے اپنا تک
گلی کے درمیان رگ کرا سے (ایک پانچ سالہ لڑکے کو) ایک لمبی سانس بھر کر کسی اہم راز میں
شریک کرتے: "تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ مرا ہوا آدمی کتنا وزنی ہوتا ہے۔"

گا بریٹل کو وہ صمیم بھی یاد رہنے والی تھیں جب تانا اسے لے کر کیلوں کے باغات میں
گئے تھے تاکہ وہ دونوں پہاڑوں سے بہہ کر آنے والی ندی میں تیر سکیں۔ بڑے بڑے، سفید اور
ما قبل تاریخ کے اندلوں سے مشابہ پتھروں پر تیزی سے بہتا ٹھنڈا صاف پانی؛ باغ کی خاموشی، اور
دن کی گرمی بڑھنے کے ساتھ ساتھ جمیگروں کی بڑھتی ہوئی آوازیں؛ اور بڑے میاں کی طویل گشتگو:
خانہ جنگیوں، محاصروں، لڑائیوں، چتر جُتی ہوئی توپوں، گرجا گھروں کی راہداریوں میں دم توڑتے
زخمیوں اور قبرستان کی دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے گولی سے اُڑا دیے جانے والوں کے بارے میں
باتیں۔۔۔ یہ سب کچھ، یادداشت کے دور افتادہ ساحل پر سرمارتی پُرخروش لہروں کے جھاگ کی
طرح، ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ رہنے والا تھا۔

تانا اپنے دوستوں سے دون اتونیو داسکوتی کے کیفے میں ملا کرتے تھے (جو "سنہائی
کے سو سال" میں پھرترو کر سپی کے کردار کا - آخذ بننے والا تھا)۔ یہ تمام دوست انہی کی طرح کے
پرانے لبرل تھے جنہوں نے اپنے فوجی اعزازات بارود کی بو اور جنگ کے شور کے درمیان حاصل
کیے تھے: کپتان، کرنل اور جنرل۔ اس خونریز تنازعے کی یاد کیفے میں چھت کے پتھروں کے
نیچے ان کی طویل، یاد آور گفتگو میں پھر سے یوں روشن ہوا جتنی گویا اس کے بعد ہونے والے
واقعات کی، یہاں تک کہ کیلے کی تجارت کے جوش و خروش کی بھی، ان کی زندگیوں میں کوئی
اہمیت نہ ہو۔

پُرسکون شخصیت کے مالک عمر رسیدہ کرنل کا سلوک اپنے نواسے سے سجد توبہ کا تھا۔ وہ
اس کی بات دھیان سے سنتے اور اس کے تمام سوالوں کا جواب دیا کرتے۔ جب نہ دے پاتے تو
کہتے: "آؤ دشمنی میں دیکھیں وہ کیا کہتی ہے۔" (اس طرح گا بریٹل کے دل میں اس گرد آلود
کتاب کے لیے گہرا احترام پیدا ہو گیا جو اتنے سارے مشکل سوالوں کے جواب رکھتی تھی)۔ جب
کبھی کوئی سرکس قصبے میں اپنے خیمے گاڑتا تو بوڑھے کرنل مارکیز اپنے نواسے کو اٹلی پکڑ کر وہاں

لے جاتے اور اسے خانہ بدوشوں، رستی پر کرتب دکھانے والوں اور ساندنیوں کے بارے میں بتایا کرتے۔ اور ویس ایک بار انھوں نے منہجہ سمندری مچھلیوں کا ایک صندوق کھلوا کر برف کے اسرار سے اس کا پہلی بار تعارف کرایا تھا۔

گا بریل کر اپنے نانا کے ساتھ بنانا کمپنی کی زمینوں کے کنارے تک جانا بہت اچھا لگتا تھا۔ یہ تقارہ اے مسکور کر دیتا تھا۔ غیروں کی اس جاگیر کے ارد گرد لگی تاروں کی بارڈھ میں سے اسے ہر چیز صاف ستھری، خشک، اور قصبے کی گرد اور شدید گرمی سے بے اندازہ دور لگتی تھی۔ وہاں تیراکی کے تالاب تھے جن کا پانی نیلا تھا اور جن کے گرد چھتریوں تلے میز، کرسیاں چنی ہوئی تھیں؛ خوبصورت سبز لان تھے جو لگتا تھا وہ جینیا کے پکچر پوسٹ کارڈوں سے اٹھائے گئے ہیں۔ یہ اس گرم خطے کے بچوں پر بے ہوشی اسکاٹ فٹزجیرالڈ کی دنیا تھی۔

شام کے وقت نوجوان امریکی لڑکیاں جدید ترین فیشن کے مطابق ملبوس، جنھیں دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ براہ راست بیسویں صدی کے دوسرے عشرے کے پیرس کے موں پارٹاس، یا نیویارک کے بوٹل پلازا کی لابی سے چلی آرہی ہیں، اپنی کار میں بیٹھ کر اراکاتا کا کے قصبے کی گرم گلیوں میں چکر لگاتیں۔ یہ ایک کنورٹبل کار تھی اور اس میں، دو عظیم الجثہ السیشین کتوں کے درمیان بیٹھی، وہ سید تازک اور مسرور اور اپنے ملل کے سفید باریک لباسوں میں ارد گرد کی گرمی سے بے نیاز معلوم ہوتی تھیں۔

وہ گردوغبار، وہ لڑکیاں، گلیوں میں شام کے وقت پھرنے والی وہ کنورٹبل کار؛ اس کے نانا کے ساتھ جنگ کی پرانی یادیں تازہ کرنے والے شکست خوردہ بوڑھے سپاہی؛ اپنا کفن تیار کرتی ہوئی خالائیں؛ مردوں سے گفتگو کرنے والی نانی؛ اور خالی خواب گاہوں میں آئیں بھرتے ہوئے مرحوم رشتہ دار؛ باغیچے میں چنبیلی کے پودے، کیلوں سے لدی زرد ریل گاڑی؛ گھسنے باغات کے درمیان سے گزرتی ہوئی تازہ پانی کی ندی، صبح سویرے کراکلوں کی چمکار۔ یہ سب مٹ جانے والا تھا، اسے جو اسی طرح اڑنے والی تھی جس طرح "ستھانی کے سوسال" کے آخری صفحات میں ماکوندو کے قصبے کو۔

جب گا بریل کی عمر آٹھ برس کی تھی، اس کے نانا کی موت نے اس کے ابتدائی بچپن، اور ساتھ ہی اس کے اراکاتا کا کا خاتمہ کر دیا۔ اسے الٹی پلانوں سطح مرتفع پر واقع دور دراز دارالحکومت میں بھیج دیا گیا، جہاں سے اسے، برسوں بعد، اپنی قانون کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر بہت مختصر وقت کے لیے واپس آنا اور اس ویرانی کو دریافت کرنا تھا جو کسی شے کے ہمیشہ کے لیے فنا ہو جانے کے بعد باقی رہ جاتی ہے۔

وہ اپنی ماں کے ساتھ نانا کا مکان فروخت کرنے کے لیے آیا تھا۔ شکستہ اسٹیشن پر، جو کبھی لوگوں اور رنگین چھتریوں سے بھرا ہوا ہوتا تھا، کوئی ذی روح موجود نہ تھا۔ ریل گاڑی نے انہیں دوپہر کی سانس لیتی ہوئی خاموشی کے درمیان اتار دیا جسے جھینگروں کی آوازیں چیر رہی تھیں، اور یوں اپنے راستے پر چل دی جیسے کسی آسیبی قصبے سے گزرتی چلی جا رہی ہو۔ برشے برباد، ترک کردہ، اور گرمی اور بے اعتنائی کی کھائی ہوئی لگ رہی تھی۔ لکڑی کے پرانے مکانات اور چوک پر لگے بادام کے درختوں پر برسوں کی گرد جم چکی تھی۔

جذبات سے مغلوب گا بریکل اور اس کی ماں، ان گلیوں میں چلتے ہوئے، بربادی کی اس تصویر میں، رونق اور خوش حالی کے جیتے جگتے دنوں کی دور دراز کی یادوں سے رنگ بھرنے کی کوشش کرتے رہے۔ انہیں جھگوں اور مکانات کو پہچاننے میں بہت دشواری ہوئی اور انہیں یقین نہ آیا کہ یہ مکان کبھی معزز گھرانوں کی، ولندیزی چالی کے لباسوں سے مزین عورتوں اور بڑی بڑی موچھوں والے جزلوں کے مسکن رہ چکے تھے۔

اس کی ماں کو اپنی جو پہلی سسلی ملی (جو ایک نیم تاریک کمرے میں سلائی کی مشین لیے بیٹھی تھی)، وہ پہلی نظر میں پہچان میں نہ آئی۔ دونوں عورتیں ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھا کیں جیسے ان شکے ہوئے اور سال خوردہ خدوخال کے چمچھے ماضی کی اُن حسین اور کھلکھلائی لڑکیوں کی جملک تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہوں جو وہ کبھی رہ چکی تھیں۔ سسلی کی آواز میں غمناکی اور کچھ حیرت تھی۔

"ارے تم! اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

دونوں عورتیں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"میرے پہلے ناول کا جنم اس ملاقات میں ہوا"، گا بریکل بھتا ہے۔

پہلے ناول کا، اور شاید اس کے بعد آنے والے تمام ناولوں کا بھی۔

دریا کے ریتیلے کناروں پر گرمی کے ہاتھوں غنودہ ایک مگر مچھ اچانک نمودار ہوتا۔ پوپٹے یا شام کے وقت جب سورج کی آتشیں کرنیں رخصت ہو رہی ہوتیں، دور کے کناروں سے بندر اور توتے شور مچایا کرتے۔ مارک ٹوین کے دریا نے مس سپی میں پلنے والی دریائی اسٹیروں کی طرح، پیروں کے زور سے چلائی جانے والی کشتی دریا نے ماگدالینا میں مولے ہوئے ملک کے اندرونی علاقوں کی سمت بڑھ رہی ہوتی۔ یہ آٹھ دنوں کا سفر ہوا کرتا تھا۔ اسی کشتی میں تیرہ سالہ گا بریکل نے

پہلی مرتبہ ایک قسم کی جلاوطنی کا آغاز کیا جو اس کی زندگی کی راہ متعین کرنے والی تھی۔ کشتی کے سفر کے بعد ایک ریل گاڑی تھی جو کھر آلود پہاڑوں پر، زور لگا کر، آہستہ آہستہ چڑھ رہی تھی۔ اس طویل سفر کے اختتام پر، جنوری کی ایک سہ پہر، جو اسے اپنی زندگی کی اداس ترین سہ پہر کے طور پر آب بھی یاد ہے، اس نے خود کو بوگوتا کے اسٹیشن پر پایا۔ اس نے اپنے باپ کے سوٹ کو تراش کر بنایا جو سیاہ سوٹ، واسکٹ اور ہیٹ پہن رکھا تھا، اور ایک صندوق اٹھا رکھا تھا "جس میں تدفین کے مقدس تابوت کی سی شان تھی۔"

اسے بوگوتا "ایک دور افتادہ، اداس شہر" معلوم ہوا، "جہاں ایک متواتر بلکی بارش سولہویں صدی کے آغاز سے جاری تھی۔ اس کمبیر دار الحکومت کی پہلی چیز جس کا مجھے احساس ہوا، یہ تھی کہ بہت سارے لوگ بے حد عجلت میں نظر آرہے تھے؛ انھوں نے میری ہی طرح سیاہ سوٹ اور ہیٹ پہن رکھے تھے، اور کمبیں کوئی عورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ پھر میں نے بارش میں بے سر کی بوتلوں سے بھری گاڑیاں کھینچتے ہوئے قومی بیکل گھوڑوں، برستے پانی میں لگیوں کے مور کاٹتے وقت پچھلے ٹیوں کی طرح چٹکاریاں چھوڑتی ٹراموں، اور طویل جنازوں کی وجہ سے بار بار ہونے والے ٹریفک جام کے وجود کو محسوس کیا۔ یہ دنیا کے سب سے زیادہ مضحکہ خیز جنازے تھے! آراستہ اور عظیم الشان میت گاڑیاں، اور کالی کفنیوں والے پٹوں سے مزین سیاہ گھوڑے، اور اہم خاندانوں سے تعلق رکھنے والی میت، وہ بلند رتبہ خاندان جن کے خیال میں موت کی ایجاد انھی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔"

یورپ کے لوگ جو موسم کی سست رو تبدیلی کے عادی ہوتے ہیں۔۔۔ وہ تبدیلی جس کا تعلق سال کے مخصوص وقت سے ہوتا ہے نہ کہ کسی مخصوص مقام سے۔۔۔ آسانی سے اس تضاد کا تصور نہیں کر سکتے جو کولومبیا کی سرحدوں کے اندر آباد کریبینین کے ساحل اور آندیز کے پہاڑوں کی دو مختلف دنیاؤں کے درمیان پایا جاتا ہے۔

یہ تضاد سب سے بڑھ کر جغرافیائی ہے۔ کریبینین کو، جو گرمی اور تیز روشنی کی دنیا ہے، صرف گھر سے سبز اور نیلے رنگوں میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ آندیز میں، جو کھر، بارش اور سرد ہواؤں کی دنیا ہے، سلیٹی اور اداس بلکے سبز رنگوں کا ایک بدلتا ہوا سلسلہ ظاہر ہوتا ہے۔ یہ تضاد لوگوں کے مابین بھی ہے۔ اندلیوں، افریقیوں اور سرکش کریب انڈین نسلوں سے پیدا ہونے والے ساحلی باشندے بے تکلف اور خوش و خرم لوگ ہیں۔ وہ نام و نمود کی پروا نہیں کرتے اور نہ سماجی درجے اور حسب مراتب کا کوئی خاص لحاظ رکھتے ہیں۔ انھیں رقص سے عشق ہے۔ ان کی پُر متوجہ موسیقی میں، مسرت کر دینے والی افریقی تال شامل ہے۔ دوسری جانب پہاڑوں کے باسی کولومبیین،

کاسٹیلیئن روایت پسندی اور چچا انڈین لوگوں کے سے کم گو اور شنی انداز سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے موڈ بھی اچانک بدل جاتے ہیں۔ ان کے شائستہ آداب کے پیچھے جارحیت کا امکان پوشیدہ ہوتا ہے، جو کسی وقت شراب کے زیرِ اثر غیر متوقع طور پر سطح پر بھی آسکتی ہے۔ (ملک کے سیاسی تشدد کا آغاز ہمیشہ اتنی پلانوں سے ہوا ہے، نہ کہ ساحلی علاقوں سے)۔ وہاں کے لوگوں کی موسیقی بھی ان کے ارد گرد کے لینڈ سکیپ سے ملتی جلتی ہے، اور حسرت ناک انداز میں جدائیوں، مرمیوں اور ناکام محبتوں کی کہانیاں سناتی ہے۔

ساحلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے کسی تیرہ سالہ لڑکے کے لیے اتنی مختلف دنیا میں بھیج دیے جانے سے بڑھ کر دشوار اور مضطرب کر دینے والی کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی تھی۔ اداسی کے عالم میں وہ دارالحکومت میں گھومتا پھرتا رہا۔ دھندلی ہوتی روشنی میں گھنٹیاں ایمان والوں کو عبادت کے لیے بلا رہی تھیں۔ ٹیکسی کی کھڑکیوں سے اس نے بارش میں بھیگی سلیٹی سڑکیں دیکھیں اور اس کا دل اس بات میں ماحول میں کئی برس گزارنے کے خیال سے ڈوبنے لگا۔ جو شخص اسٹیشن پر اسے لینے پہنچا تھا وہ اسے روتا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

سینکڈ ٹری اسکول، جس میں اسے داخلہ ملا تھا، "ایک کانونٹ میں واقع تھا جہاں نہ آستانہ تھے اور نہ پھول۔" اور "دورِ افتاد، اداس، سمندر سے چھ سو میل کے فاصلے پر واقع" اسی قصبے میں قائم تھا جہاں اوریلیا نو سکندو، فرماندار ایل کارپیو کو لینے کی غرض سے گیا۔ کریمین سے تعلق رکھنے والے لڑکے گا بریسل کے لیے یہ اسکول ایک سزا سے کم نہ تھا اور یہ برفیلا شہر ایک ناانسانی بات تھی۔

پڑھنا اس کے لیے واحد بھلاوا تھا۔ خاندان سے دُوری اور پیسوں سے مرمی کے عالم میں شہری دنیا میں رہنے پر مجبور، ساحلی لڑکے گا بریسل کو اس غمناک حقیقت سے کتابوں ہی میں پناہ لینے والی تھی۔ انہیں اسکول کی ڈارمیٹری میں کتابیں بلند آواز سے پڑھ کر سنائی جاتی تھیں۔ "ڈیمیک ماؤنٹین"، "ڈیمیک میٹیرز"، "ڈیمیک بیک آف نوٹرڈیم"، "ڈیمیک آف مونٹی کرسٹو"۔ اور اتوار کے دن، رُپاکیرا کی سردی اور اداسی سے ٹرساں، گا بریسل اسکول کی لائبریری میں چھپ کر جُول ورن اور سالگری کے ناول، اور اسکول کی کتابوں میں شامل ہسپانوی اور کولومبین شاعروں کی نظمیں پڑھا کرتا۔ یہ خراب اور مصنوعی شاعر تھے۔ خوش قسمتی سے اس نے اسی زمانے میں ایک ادبی دریافت کر لی۔ اس کی ملاقات چند ایسے کولومبین شاعروں سے ہوئی جنہوں نے روبن داریو، جوان رامون خیمینیز اور (زیادہ فوری اور قابلِ فہم طور پر) پابلو نیرودا سے متاثر ہو کر "پتھر اور آسمان" کے نام سے ایک گروپ بنا رکھا تھا۔ ادبی باغیوں کا یہ گروپ رومانویوں، پارناسیوں اور

نوکلےسیکول کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ وہ حیران کن جرأت مندی سے استعارے کا استعمال کرتے تھے۔ "وہ اس زمانے کے دہشت پسند تھے،" گا بریسل اب کہا کرتا ہے۔ "اگر میری ملاقات ان لوگوں سے نہ ہوئی ہوتی تو شاید آج میں ادیب نہ ہوتا۔"

جب اس نے سینکڑی اسکول کی تعلیم مکمل کی اور بوگوتا کی نیشنل یونیورسٹی میں قانون پڑھنے کے لیے داخلہ لے لیا، تب بھی شاعری کو اس کی زندگی کی بنیادی دل چسپی کی حیثیت حاصل رہی۔ وہ قانونی متون کی بجائے نظمیں پڑھا کیا۔ نظمیں، نظمیں، جیسا کہ وہ اب کہتا ہے۔ "اُس زمانے میں میرا سب سے زیادہ پُر تعیش مشغلہ یہ تھا کہ ہر اتوار کو نیلے شیشوں والی ٹرام میں سوار ہو جاتا جو پانچ سینٹ کے عوض پلازا بولیوار سے ایونیو اسپیلے تک لے جاتی اور واپس لاتی تھی۔ اس سے پہلوں کا وہ تسلسل جس میں ایک آورویران اتوار کے امکان کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ میں اس چکر دار سفر کو نظموں کی لاتعداد کتابیں پڑھ پڑھ کر گزارتا تھا اور شہر کے ہر بلاک کو طے کرتے ہوئے ایک مختصر مجموعہ پڑھ ڈالتا، یہاں تک کہ کبھی نہ رکنے والی بارش میں گلیوں کے لیمپ روشن ہونے لگتے۔ تب میں پرانے شہر کے خاموش کیفوں میں کسی ایسے شخص کی تلاش میں گھوما کرتا جو مجھ پر ترس کھا کر میری پڑھی ہوئی بے شمار نظموں کے بارے میں مجھ سے بات کرے۔"

ناول میں اس کی دل چسپی اُس رات شروع ہوئی جب اس نے گاٹا کا "یٹامور فوس" پڑھا۔ اب اسے یاد آتا ہے کہ کس طرح وہ شہر کے وسط میں واقع اپنے خستہ حال ہوٹل میں، ایک کتاب بغل میں دبائے واپس پہنچا جو اسے ایک دوست نے پڑھنے کے لیے دی تھی۔ اس نے اپنی جیکٹ اور جوتے اتارے، بستر پر لیٹ گیا، کتاب کھولی اور پڑھنے لگا؛ "جب ایک صبح گرگر سما اپنے مضطرب خوابوں سے بیدار ہوا تو اس نے خود کو اپنے بستر پر ایک بڑے سے کیرٹے میں منقلب پایا۔" گا بریسل پر لرزہ طاری ہو گیا اور اس نے کتاب بند کر دی۔ "میرے خدا!" وہ سوچنے لگا، "تو ایسا بھی لکھا جاسکتا ہے!" اگلے روز اس نے اپنی پہلی کہانی لکھی۔ تعلیم وغیرہ سب اس کے دماغ سے موم ہو گئی۔

لیکن بلاشبہ اس کا یہ جرأت مندانہ فیصلہ اس کے باپ کی سمجھ میں نہ آیا۔ سابق ٹیلیگراف آپریٹر اپنے بیٹے سے وہ کچھ کر دکھانے کی توقع رکھتا تھا جو وہ خود کبھی نہ کر سکا: یعنی یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کرنا۔ جب اسے پتا چلا کہ گا بریسل نے پڑھائی ترک کر دی ہے تو وہ اس کے مستقبل سے مایوس ہو گیا۔ گا بریسل کے دوستوں نے بھی، اپنے قدرے مہربان اور ہرمز انداز میں، یہی خیال کیا۔ بے ترتیب لباس اور بڑھی ہوئی داڑھی کے ساتھ بغل میں کتاب دبائے ایک کیفے سے دوسرے کیفے میں آتا جاتا، جہاں رات پڑ جائے وہیں سو جانے والا گا بریسل، کوئی آوارہ گرد دکھائی

دستا تھا۔ اب وہ نظمیں، نظمیں، نظمیں پڑھنے کی بجائے ناول، ناول، ناول پڑھا کرتا تھا۔ سب سے پہلے دستو سیسکی، پھرتا ستائی، ڈکنز، انیسویں صدی کے فرانسیسی ادیب، فلوبر، ستاں دال، بالزاک، زولا۔

جب وہ بیس برس کا ہوا تو ساحلی علاقوں کو لوٹ گیا۔ اس نے کارتاچینا میں، جو بالکنیوں اور مغرور دیواروں سے گھری تنگ نوآبادیاتی گلیوں والا ایک پرانا شہر تھا، اس نے کریبینین کی روشنی اور گرمی کو از سر نو دریافت کیا۔ وہ "ایل یونیورسل" نامی اخبار کے گرد آلود اداریں دفتر میں بطور سب ایڈیٹر کام کرنے لگا۔ اس ملازمت میں اسے اتنا وقت مل جاتا تھا کہ وہ کہانیاں لکھ سکے اور بندرگاہ کے قریب ہنگامہ خیزے خانوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ صبح اس وقت تک رَم پی سکے جب اسمگروں کے جہاز طوائفوں کو بطور سامان لاد کر اروپا اور کوراساؤ کے جزیروں کی طرف جانے کے لیے بادبان چڑھانے لگتے۔

اس دکتے ہوئے بے پروا شہر میں، جسے رقص، حسن کی ملاؤں اور بیس ہال سے پیار تھا، ایک عجیب بات ہوئی۔ وہاں گا بریسل اپانک یونانیوں، خصوصاً سوفوکلز کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اس کا ذمہ دار اس کے مے خانے کے دوستوں میں سے ایک تھا، جو آج ایک خوش حال کسٹم وکیل ہے، اور جو یونانیوں سے اپنی جھٹیلی کی پخت کی طرح واقف تھا۔ اس نے گا بریسل پر کیر کے گارد اور کلوویل کو بھی مکثت کیا۔

یونانیوں کے بعد، اس کی ادبی تعلیم کے سلسلے میں مرکزی حیثیت رکھنے والا ایک اور انکشاف بیسویں صدی کے ایٹگو سیگسن ادیب، خصوصاً جوئس، ورچینیا وولٹ اور ولیم فاکنر کی صورت میں ہوا۔ اس کی اس دریافت کا سہرا ادب گزیدہ، ہنگامہ پسند دیوانوں کے ایک گروپ کے سر تھا جو کریبینین کے ایک اور ساحلی شہر بارنیکلا میں جمع ہو گئے تھے جہاں گا بریسل کارتاچینا کے بعد مقیم ہو گیا تھا۔

بارنیکلا، جو دریائے ماگدالینا کے ڈیلٹا کے گرد غبار اور گرمی میں گھرا ہوا ایک بڑا صنعتی شہر ہے، کارتاچینا کی سی کوئی کشش نہیں رکھتا: وہاں نہ نیلے کانچ سا چمکتا ہوا سمندر ہے، نہ کارتاچینا کی سی دیواریں، لائٹ ہاؤس یا قدیم بالکنیاں ہیں اور نہ شہزادیوں، بحری قزاقوں اور محاسبوں کی روحیں نوآبادیاتی حویلیوں میں بھگتی پھرتی ہیں۔ یہ ایک کھلا شہر ہے جو مختلف خطوں سے آنے والوں کے خیر مقدم کے لیے تیار رہتا ہے۔۔۔ سائن سے فرار ہو کر پاپیوں (Papillon) کے راستے پر چل کر آنے والے فرانسیسی، پہلی جنگ عظیم کے شکست خوردہ جرمن پائلٹ، ناسیوں کے ہاتھوں ستائے ہوئے یہودی، جنوبی اٹلی، شام، لبنان اور اردن کے تارکینِ وطن جو ایک، دو، تین

نسلوں پہلے، نہ معلوم کس طرح آئے اور انھوں نے رفتہ رفتہ شہر کے موجودہ باعزت گھرانوں کی بنیاد ڈالی۔ کارنیوال کے سالانہ وقفے کو چھوڑ کر، جس میں پھولوں، حسین لڑکیوں اور ساٹن کے نئے نیٹے لباسوں میں شور مچاتے سازندوں کے طائفوں سے لدی گاڑیاں شہر کی گلیوں میں دوڑتی ہیں، اس شہر کے باسیوں کی زیادہ تر توانائی صنعت اور تجارت میں صرف ہو جاتی ہے۔ تجارتی سرگرمی اور سہل تفریحات کے اس ماحول میں ادب اور آرٹ کو کسی ویران گوشے میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ ایسی جگہ، کسی بھی اور جگہ سے بڑھ کر، ادیبوں اور مصوروں کی حیثیت سماجی ہیئت میں انجبی عناصر کی سی ہوتی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ، شاید اسی ناامید تنہائی کے سبب سے، باریکیلا میں آرٹسٹ بوگوتا کے مقابلے میں کمپن زیادہ توانائی سے پھلتے پھولتے ہیں، حالانکہ بوگوتا کو نوآبادیاتی وقتوں سے تہذیبی برتری کا دعویٰ ہے۔

ادب کے جنون میں مبتلا دیوانوں کے جس گروہ سے گابریئل کی باریکیلا میں انیس سو پچاس کے عشرے میں ملاقات ہوئی، انھیں آج یورپ اور امریکا کی یونیورسٹیوں میں لاطینی ادب کے ماہرین سنجیدگی سے پڑھتے ہیں۔ ان کے خیال میں گارسیا مارکیز اسی دیدہ زیب ادبی خاندان کا خلف ہے جسے "باریکیلا گروپ" کہا جاتا ہے۔ خواہ اس براہ راست نسب پر اصرار درست ہو یا نہ ہو، یہ یقیناً درست ہے کہ یہ گروہ اس براعظم کے انتہائی با علم اور عقلی جنس کے حامل گروہوں میں سے تھا اور گارسیا مارکیز کی ادبی تربیت پر اس کا فیصلہ کن اثر ہوا۔

یہ گروپ نہایت بے ادب اور فراوانی سے لبریز نوجوانوں پر مشتمل تھا جو بچے شرابی تھے اور درحقیقت پینیول (Pagnol) کی تحریروں سے نکل کر آنے والے مخصوص کریبینی کرداروں سے مشابہ تھے۔ یہ لوگ خود کو بھی سنجیدگی سے نہیں لیتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے بچے دوست تھے اور اُن دنوں اُن تک مطالعے میں مصروف تھے: جوئس، ورجینیا وولف، اسٹائن بیک، کالدویل اور فاکنر (جسے وہ بڑے میاں کہا کرتے تھے) ان کا مشترکہ شغف تھے۔ وہ اکثر رات بھر ان دیوالائی قبر خانوں میں بیٹھے پیتے اور ادب پر بحث کرتے رہتے تھے، جو پرندوں اور پودوں اور خوفزدہ کمپن لڑکیوں سے بھرے ہوئے تھے جو بھوک کے باعث جسم فروشی کرتی تھیں، جسے بعد میں اس نے "تنہائی کے سوسال" میں بیان کیا۔

"یہ میری زندگی کا انتہائی حیران کن دور تھا،" گابریئل پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے بھتا ہے، "اور یہ نہ صرف ادب کی، بلکہ زندگی کی دریافت کا دور تھا۔ ہم پوری رات شراب سے مست ہونے اور ادب پر گفتگو کرنے میں گزار دیتے۔ ہر رات گفتگو میں کم از کم دس ایسی کتابوں کا ذکر آ جاتا جو میں نے نہیں پڑھی ہوتی تھیں۔ اگلے روز وہ سب (اس گروپ کے دوستوں سے) مجھے ادھار مل

جاتیں۔ یہ سب کتابیں ان کے پاس تھیں اور پھر اس گروپ میں ایک کتب فروش بھی شامل تھا، اور کتابیں منگوانے کے لیے فہرست بنانے میں ہم سب اس کی مدد کرتے تھے۔ جب کبھی بیونس آئرس سے کتابوں کا صندوق موصول ہوتا تو ہم سب ہوش و حواس کھو بیٹھتے۔ یہ کتابیں ارجنٹینا کے اشاعت گھروں سیودا میرکانا، لوسادا اور سیور سے آتیں اور ان تمام شاندار تحریروں کا ترجمہ بورخیس کے دوستوں نے کیا ہوتا تھا۔"

اس گروپ کا ادبی اتالیق دون راسون وینیز نامی ایک کتالانی جلاوطن تھا۔ اس کی عمر ان سب سے زیادہ تھی۔ وہ چند سال پیشتر، پہلے اپنے وطن سے ری پبلک کی شکست کے ہاتھوں، اور پھر پیرس سے ناسیوں کے ہاتھوں نکالے جانے کے بعد، بارکلیا میں وارد ہوا تھا۔ دون راسون کو ادب سے ویسا ہی لگاؤ تھا جیسا کسی سپاہی کو اپنی بندوق سے ہوتا ہے۔ اس نے ان نوجوانوں کے اندھا دھند مطالعے میں ایک ترتیب پیدا کی۔ اس کے باعث گارسیل اور اس کے دوستوں نے ایک سمرزدگی کے عالم میں فاکٹر کے ناولوں کی دنیا دریافت کی، اور جوئس کی نشان زدہ چھوٹی بڑی شاہراہوں پر آوارہ گردی کی، لیکن گاہے گاہے وہ انھیں پکار کر چونکا دیتا اور ان کی توجہ ہومر کی جانب مبذول کراتا۔

برسون بعد گارسیل وینیز کا یہ قرض اتار کر اسے "تنہائی کے سوسال" کے بوڑھے دانش مند کتالانی کا روپ دینے والا تھا جو اپنی موت سے پہلے بارسلونا چلا جاتا ہے لیکن ماکوندو کی یاد میں سوکھتا رہتا ہے۔ درحقیقت کتاب کے آخری صفحات کا ماکوندو، اراکاتا کا کی نہیں بلکہ اُس دور کے بارکلیا کی تصویر ہے۔

ان حیران کن، غلیظ دنوں کو یاد کرتے ہوئے آج بھی گارسیل کو نوستلیا کی کک موسم ہوتی ہے۔ "کوچہ جراثیم" کے مغلنے اور قہر خانے؛ "پیپی" نامی مے خانہ جے انھوں نے قرض لے لے کر کنگال کر دیا تھا، اور دوسرا "نار" نامی مشہور شراب خانہ جہاں ادب کے دستی ان نوجوانوں کی ملاقات شکاریوں اور مچھیروں سے ہوا کرتی؛ کبھی نہ ختم ہونے والی گلیاں اور راتیں۔

وہ کبھی کبھی طوائفوں کے اس "بوٹل" کو یاد کرتا ہے جہاں اس کا ایک کمرہ تھا۔ جب اس کے پاس اگلی رات کا کرایہ ادا کرنے کے لیے پیسے نہیں ہوتے تھے تو وہ بوٹل کے ملازم کے پاس اپنے زیر تحریر ناول کا نامکمل مسودہ ضمانت کے طور پر رکھوا دیا کرتا۔ "وہ بوٹل"، اب وہ یاد کرتا ہے، "بہت بڑا تھا اور اس میں کمروں کو تقسیم کرنے والی گتے کی دیواریں اتنی پتلی تھیں کہ برابر والے کمرے میں ہونے والے راز و نیاز صاف سنائی دیتے تھے۔ کئی بار میں اعلیٰ سرکاری افسروں کی آوازیں پہچان لیتا تھا اور یہ دریافت کر کے بہت متاثر ہوتا تھا کہ ان میں سے اکثر وہاں مباشرت

کی غرض سے نہیں، بلکہ اپنی عارضی محبوباؤں سے اپنے بارے میں گفتگو کرنے جایا کرتے تھے۔ صحافی کے طور پر میرے اوقات طوائفوں کے اوقات کار سے مطابقت رکھتے تھے، اور ہم سب دن چڑھے بیدار ہو کر ایک ساتھ ناشتہ کیا کرتے تھے۔

انہی دنوں گواہی میں، جو اس کی نخیال کا وطن اور جھلستی ہوئی ریت کا جزیرہ نمائندہ، اسے انسائیکلوپیڈیا اور طبی کتابوں کے سیزمین کی حیثیت سے روزگار مل گیا۔ بیچا وچا تو اس نے کچھ نہیں، البتہ لاری ڈرائیوروں اور سفری تاجروں سے بھرے ہوٹلوں میں گرم تنہا راتیں بسر کرنے کے دوران اسے ایک نہایت وفادار ساتھی میسر رہا: ایک انگریز خاتون جس کی وہ چھپ کر پرستش کرنے لگا: ورجینیا وولف۔

اب اسے اصرار ہے کہ اپنے پہلے ناول کے ابتدائی اشارے اسے "مسز ڈیلوے" سے ملے تھے۔ شاید شعوری طور پر یہ بات درست ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب وہ "پشوں کا طوفان" لکھنے بیٹھا تو اس کے پہلو میں صرف طبقہ اشرافیہ کی یہ بظاہر دوشیزہ، مسز وولف، نہیں تھی۔ وہاں دوسرے ادیب بھی تھے جنہوں نے اس کی ادبی تعلیم و تربیت میں حصہ لیا تھا: سالگری اور جیول ورن جن کے ساتھ اس نے اپنے بورڈنگ اسکول کی تنہائی کو فریب دیا تھا: وہ محبوب شاعر جنہیں اس نے بوگوٹا کے اتواروں کی اُن کھمر آلودہ پہروں میں نیلے شیشوں والی ٹراموں میں سفر کرتے ہوئے پڑھا تھا: کافکا، اور روسی اور فرانسیسی ناول نگار، جنہیں اس نے اپنی طالب علمی کے ہوسٹل میں دریافت کیا تھا: انگریز اور امریکی ادیب جن کا انکشاف بارنیکلا کے مے خانوں اور قحبہ خانوں میں دوستوں کے ساتھ میسر کی بوتلوں کے درمیان ہوا تھا۔

سو جب وہ اپنی ماں کے ساتھ اس سفر کے بعد اراکاتا کا سے واپس آیا تو نہ صرف اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا بلکہ لڑکپن اور پُر تجسس نوجوانی میں اتنے سارے ادیبوں کی صحبت میں رہنے کے بعد وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اسے کس طرح کہا جائے۔

اس نے اپنی پہلی کتاب ایک ہی جگہ میں مکمل کی۔ وہ بارنیکلا میں "ایل بیرالدو" کے دفتر کے خالی ہونے کے بعد رات بھر لکھتا رہتا، جب لائسنس مشینیں خاموش ہو جاتیں اور نیچے کی منزل میں لگے ہوئے پریس کے بانپنے اور ہونکنے کی آوازیں آیا کرتیں، چھت کے پٹکنے خالی کرسیوں کے اوپر گھوم گھوم کر گرمی کی شدت کم کرنے کی بے سود کوشش کر رہے ہوتے، اور "کوچہ جراثیم" میں واقع مے خانوں سے موسیقی کی تیز آواز ٹیرتی ہوئی اندر آرہی ہوتی۔ جب

گا بریسل ٹکان سے چور، لیکن مکمل بیدار، اس حالت میں اپنے ٹائپ رائٹر سے اٹھتا کہ ماکونڈو کی تصویریں اور کردار اس کے ذہن میں گھوم رہے ہوتے، تورات تقریباً ختم ہو چکی ہوتی۔ وہ تازہ لکھے ہوئے صفحات چمڑے کے ایک بستے میں رکھ لیتا اور دفتر سے باہر نکل جاتا۔ باہر جا کر وہ دلدلی زمین کی گرم بو اور گھٹے ہوئے پھلوں کی باس میں سانس لیتا جو اس شہر پر خادتا چھائی رہتی ہے۔ کوئی شرابی کسی مے خانے کی دیلیز پر ٹھوکر کھاتا۔ مسودہ بغل میں دبائے، گا بریسل سان نکولاس کے چوک کو پار کرتا جہاں رات کے اس آخری حصے میں گدا گروں اور غلاظت کے انباروں کے سوا کچھ نہ ہوتا، اور چوک پار کر کے گلی کے سرے پر واقع طوائفوں کے "بوٹل" کا رخ کرتا جس کے قریب منشی بیٹھا کرتے تھے۔ ہر رات ڈیڑھ پیسو کے معاوضے پر ایک مختلف کمرہ (یا بلکہ گتے کی چار دیواریوں سے گھر ایک سپاہیانہ پلنگ) اس کے لیے خالی رکھا جاتا۔

یہ وہ ماحول تھا جس میں اس کے پہلے ناول "پشوں کا طوفان" نے جنم لیا۔ یہ ایک توانا تحریر تھی جس میں ماکونڈو کی ویرانی اور نوستالجیا اپنا اظہار پانے لگا تھا، اور یہ اس لائق تھی کہ مارکیز کو لاطینی امریکا میں ایک مقام عطا کر دے۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ قدر شناسی یا شہرت۔۔۔ جو بھی نام اس انعام کو دیا جائے جس کی ہر ادیب ایک اچھی کتاب (بلکہ گا بریسل کے معاملے میں چار اچھی کتابیں) لکھنے کے بعد توقع کرتا ہے۔۔۔ اسے کئی برس بعد نصیب ہوئی، جب اس کی پانچویں کتاب "تنبہائی کے سو سال"، پہلے بیونس آئرس میں، پھر پورے لاطینی امریکا میں اور آخر کار تمام دنیا میں، باتھوں باتھ بکے لگی، جس پر اسے بے حد حیرت ہوئی۔

اس سے پہلے انتشار کا طویل اور دشوار دور جاری رہا۔ وہ صبر کے ساتھ، جس میں شاید تھوڑی سی تحقیر بھی شامل تھی، انتظار کرتا رہا، پھر بھی اندر ہی اندر شکوک اور ناگزیر دشواریاں اس کا محاصرہ کیے رہیں۔

"پشوں کا طوفان" کے چھپنے میں پانچ سال کا عرصہ لگا۔ ان چند ناشرین نے، جنہیں اس نے اس کا مسودہ پیش کیا، اس میں کسی دل چسپی کا اظہار نہ کیا۔ ہسپانوی نقاد گیلیرمو دی تورے نے، جو بیونس آئرس کے لومادا اشاعت گھر کا مشیر تھا، اسے ایک تند و تیز تبصرے کے ذریعے مسترد کر دیا، جس میں اس نے کہا کہ اسے ایک مخصوص شاعرانہ کشش کے سوا اس کتاب میں ایسی کوئی خوبی دکھائی نہیں دیتی جس کی بنا پر وہ اس کی سفارش کر سکے۔ اس نے نہایت نیک نیتی سے مصنف کو کوئی اور پیشہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ اس وقت تک گا بریسل بوگوٹا کے اخبار "ایل ایپیکٹادور" میں ملازمت اختیار کر چکا تھا اور آخر کار اسے یہ کتاب چند دوستوں کی مدد سے بوگوٹا کے ایک چھوٹے سے طباعت گھر میں خود ہی چھاپنی پڑی۔

اگرچہ مقامی طور پر اس کتاب کو اچھے تبصرے حاصل ہوئے، لیکن اسے ان مضامین کے مقابلے میں جو گا بریسل "ایل ایسپیکٹا دور" میں لکھ رہا تھا، کم توجہ حاصل ہوئی۔ اخبار کے وہ شمارے جن میں وہ ایک غرقاب شدہ جہاز کے طالع کی مہم کا حال یا ایک سائیکلنگ چیمپیئن کی سوانح حیات قسط وار لکھ رہا تھا، باتوں باتہ فروخت ہو جاتے۔

اس وقت تک جب "ایل ایسپیکٹا دور" نے اسے اپنے نامہ نگار کی حیثیت سے یورپ روانہ کیا، گا بریسل کو لوجیا میں صحافی کے طور پر خاصی شہرت حاصل کر چکا تھا، لیکن ادیب کے طور پر ابھی تک گمنام تھا۔ ریو کورٹس، پیرس، میں واقع ہوٹل ڈفلاندر کی مالکن کے لیے، جس کے پاس وہ ۱۹۵۵ کے موسم سرما میں ٹھہرا تھا، وہ "ساتویں منزل والا صحافی" تھا، اور اب بھی جب کبھی وہ گا بریسل کی تصویر کسی اخبار میں دیکھتی ہے تو اسے اسی تھب سے یاد کرتی ہے۔

تقریباً یہی زمانہ تھا جب میری اس سے ملاقات ہوئی۔ آج اس کی زندگی پر بُرج ثور کی کامیابیوں کا غلبہ ہے، لیکن اس وقت وہ ایک بے بدافت بُرج حوت میں تھا، جو صرف اپنی جنت کے رادار کی رہنمائی میں آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ دبلا تھا اور الجزائر کی دکانی دیتا تھا، جس کی وجہ سے پولیس والے، اور خود الجزائر بھی، شک میں پڑ جاتے۔ وہ بولوار ساں شیل میں اسے روک کر اس سے عربی میں بات کرنے کی کوشش کرتے۔ پتھر کی سلوں کے فٹ پاتھوں اور کھر کے اس شہر میں، جس کا نام پیرس ہے، وہاں کی زبان سے نا آشنائی کے عالم میں، قدم جمائے کی کوشش میں وہ دن بھر میں تین تین پیکٹ سگریٹ پھونک ڈالتا۔ یہ الجزائر کی جنگ، براساں کے اولین گیتوں اور میٹرو میں اور عمارتوں کے دروازوں میں بوس و کنار کرتے ہوئے جوڑوں کا زمانہ تھا۔ بوداپست جانے سے قبل کے ان دنوں میں وہ سیاسی دنیا کو کسی ویسٹرن فلم کی طرح اچھے اور برے لوگوں میں تقسیم شدہ دیکھا کرتا تھا۔ اور اچھے لوگ سوشلزم کی طرف تھے۔

کچھ عرصے قبل ہم دونوں ریو کورٹس کے اس بالائی منزل کے کمرے میں دوبارہ گئے جہاں وہ رہا کرتا تھا۔ کمرے کی کھر کی سے لیٹن کوارٹر کی چھتیں دکانی دیتی ہیں، جہاں سوربون کا گھنٹا اب بھی وقت کا اعلان کرتا ہے، لیکن جو اب صبح کی گلیوں کو اپنی آوازوں سے بھرتے باقی چمک فروشوں سے خالی ہو چکا ہے۔ گا بریسل اس کمرے میں گھٹنے ریڈی ایٹر پر رکھے، دیوار پر آنکھوں کی بلندی کے پاس اپنی محبوبہ مرسیڈس کی تصویر لگائے، رات بھر لکھتا رہتا تھا۔ وہاں اس نے ایک ناول لکھنا شروع کیا جس نے بعد میں "منوس وقت" کی شکل اختیار کی، لیکن اسے ابتدا ہی میں اس تحریر کو ادھورا چھوڑنا پڑا۔ ایک کردار، خانہ جنگی کے زمانے کی پشمن کا انتظار کرتا ہوا ایک بوڑھا کرنل، دخل انداز ہوا اور اپنے لیے ایک کتاب کا مطالبہ کرنے لگا۔ گا بریسل نے وہ کتاب لکھ ڈالی۔

اس نے "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" کو "منوس وقت" کے لیے راستا صاف کرنے کی غرض سے بھی لکھا اور اپنے روزمرہ کے ہیجان پر ادب کے ذریعے قابو پانے کے مقصد سے بھی۔ اس کتاب کے مرکزی کردار کی طرح اسے بھی پتا نہیں ہوتا تھا کہ اس کا اگلا کھانا کہاں سے آئے گا۔ وہ خود بھی ایک خط کا منتظر تھا، ایک ایسے خط کا جس میں کچھ رقم ملفوف ہو، جو کبھی موصول نہیں ہوا۔

اس کی مالی مشکلات "ل'موند" میں چھپنے والی ایک تین سطری خبر سے شروع ہوئی تھیں جسے ہم دونوں نے ساتھ ریو دیزیکول کے ایک کینے میں بیٹھ کر پڑھا تھا: کولو بیا میں برسرِ اقتدار آمر رویاں پینیلانے گا بریسل کے اخبار "ایل ایسپیکٹا دور" کو بند کر دیا تھا۔ "یہ کوئی سنگین بات نہیں ہو سکتی،" اس نے کہا تھا۔ لیکن یہ درحقیقت نہایت سنگین بات تھی۔ اس کی ڈاک میں چیک موصول ہونا بند ہو گئے اور ایک ماہ بعد وہ ہوٹل کا بیل ادا کرنے کے قابل نہ رہا۔ براساں اپنے گیت گاتا رہا، نوجوان جوڑے میٹرو میں بوس و کنار میں مشغول رہے، لیکن گا بریسل کے لیے پیرس وہ پہلے والا شہر نہ رہا۔ وہ سرد کمروں اور پٹھے ہوئے سوپٹروں والا وہی کمینڈ اور دوشوار شہر بن گیا جس سے بے شمار لاطینی امریکی واقف رہے ہیں، جہاں گرم کھانا اور آتش دان کے قریب لگا ہوا بستر ایسے معجزات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو توقعات کی رسائی سے باہر ہوتے ہیں۔

بارنکیلا میں اس کی مغلی ایک دیدہ زیب شان رکھتی تھی، اور بہر حال پیرس کی فلاحی کے مقابلے میں کم سنگین تھی: وہاں ہر طرف اس کے دوست تھے: گورنر تک اسے لینے کے لیے اپنی گاڑی "ہوٹل" بھجوا دیتا تھا، جس پر ملازمین اور طوائفیں حیران رہ جاتیں۔ کریسٹین ایک انسانیت نواز خط ہے۔ وہاں کی ضرب الملش ہے کہ جب دو آدمیوں کے لیے کھانا موجود ہے تو تین بھی کھا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس، پیرس کسی مغس کے سامنے اپنا دل پتھر کر لیتا ہے۔ یہ بات گا بریسل کی سمجھ میں اسی دن آ گئی جب اسے میٹرو میں ایک سکہ مانگنا پڑا۔ اسے سکہ تول گیا، لیکن جس آدمی نے تھک مزاجی سے وہ سکہ اس کے ہاتھ پر رکھا، اس نے اس کی وضاحت سننے کی زحمت نہ کی۔

گا بریسل نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ہر وہ شہر جس میں وہ رہا ہے، اس کے ذہن پر ایک ایسا نقش چھوڑ جاتا ہے جو اس شہر کے دوسرے تمام نقوش پر غلبہ پالیتا ہے۔ پیرس کے بارے میں اس کا تصور غمناک ہے۔ "وہ ایک عید طویل رات تھی، جب میرے پاس سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی، اور اُسے میں نے ادھر ادھر بنیوں پر اونگھتے ہوئے، میٹرو سے نکلنے والی بیاپ سے گرمی حاصل کرتے ہوئے اور پولیس کی نظروں سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے گزارا تھا جو مجھے الجزا مری سمجھ کر دھرنے کے چکر میں رہتی تھی۔ صبح کے وقت اچانک دریائے سین کا ہواؤ رک گیا، ابلی ہوئی گوبھیوں

کی مہک غائب ہو گئی، اور ایک لمحے کے لیے خزاں کے اس منگل کی چمکتی دُھند میں پورے خالی شہر میں میں اکیلا ذی روح رہ گیا۔ اُس وقت یہ واقعہ پیش آیا۔ جب میں ساں شیل کا پُل پار کر رہا تھا، مجھے ایک شخص کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مجھے دُھند میں سے وہ آدمی گھرے رنگ کی جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ دے، سلیقے سے بال بنائے نکلتا نظر آیا۔ جیسے ہی ہم نے پل پار کیا تو مجھے اس کا زرد بڈیالا چہرہ دکھائی دیا: وہ رو رہا تھا۔"

اس کی دوسری کتاب "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" اسی دور کی پیداوار تھی۔ اس نے بھی گا بریٹل کے لیے دروازے وا نہ کیے۔ مجھے یاد ہے کہ زرد کاغذوں پر ٹائپ کیا ہوا وہ مسودہ میرے پاس بھی کافی دن تک رہا تھا۔ میں نے یہ مسودہ کئی ایسے لوگوں کو دکھایا جو اسے چھپوانے میں مددگار ہو سکتے تھے لیکن وہ اس کی ادبی خوبیوں سے نا آشنا معلوم ہوئے۔

پیرس میں گزارے ہوئے ان برسوں کے بعد، جب ہم دونوں کاراکاس میں صحافیوں کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، گا بریٹل نے راتوں کو اور فارغ وقت میں لکھنا جاری رکھا۔ اب وہ جس کتاب پر کام کر رہا تھا وہ "برٹنی ماما کا جنازہ" تھی لیکن کسی نے اخباری رپورٹر کے عتب میں چھپے اس عمدہ ادیب کو دریافت نہ کیا جو اتفاقات کے باتھوں کاراکاس میں آ نکلتا تھا۔ کاراکاس، تاریکی وطن کا شہر۔۔ جس کی بلند عمارتوں اور پکی سڑکوں کے اندر کوئی روح نہیں ہے اور جہاں کامیابی کو بولیوار کے سکوں میں ناپا جاتا ہے۔۔ ایسی کسی صلاحیت کو دریافت کرنے کی فرصت نہیں رکھتا جو پہلے ہی سے تسلیم شدہ نہ ہو۔ آج وہ شہر گارسا مارکیز پر بے حد مہربان ہے، لیکن اُن دنوں میں اس دہلے، بے چین، تیس سالہ صحافی کے وجود سے یکسر بے خبر تھا جو اس قدر عمدہ مضامین لکھا کرتا تھا لیکن جسے اخباروں کے کمانیوں کے مقابلوں میں کبھی کامیابی نہ ہوتی تھی۔

بعد میں بوگوٹا میں بھی انتظار کا یہ دور جاری رہا۔ اس کی راتیں اب بھی لکھنے میں گزرتی تھیں (اب اس نے "منوس وقت" پر دوبارہ کام شروع کر دیا تھا) اور دن میں ہم دونوں کیوبا کی خبر رساں ایجنسی "پرینسا لاطینا" کا مقامی دفتر چلایا کرتے۔ انہیں دنوں میں "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" ایک ادبی رسالے میں شائع ہوا جس کے مدیروں نے نہ تو گا بریٹل سے اجازت حاصل کرنے کی زحمت کی اور نہ اسے کوئی رقم ادا کی۔ وہ واقعی یہ سمجھتے تھے کہ ایک ایسے مسودے کو شائع کرنا جسے سارے ناشر رد کر چکے ہیں، بجائے خود ایک احسان اور قدر شناسی کا عمل ہے۔ مقامی نقادوں نے بلاشبہ اس کا خیر مقدم کیا، جیسا کہ کچھ عرصے بعد "منوس وقت" کا بھی، جسے ایٹو کولوبیانانا نامی ایک تیل کی کمپنی کا جاری کیا ہوا ایک قومی انعام دیا گیا۔

لیکن یہ کامیابی بے حد معمولی تھی۔ ناول کی بہت کم کاپیاں طبع ہوئیں، رائٹنگ کی شرح بہت

کم تھی اور یہ تحریریں صرف تھوڑے سے مقامی پڑھنے والوں تک پہنچ سکیں۔ کولومبیا کے باہر کسی نے گارسیا مارکیئر کا نام تک نہ سنا تھا، اور ملک کے اندر بھی لوگ، اس کے قریبی دوستوں کو چھوڑ کر، اسے ایک قد آور ادیب کی بجائے علاقائی ادب کا ایک اچھا نمائندہ تصور کرتے تھے۔ بوگوتا کے اعلیٰ طبقے کے معززین، لوگوں کی حیثیت کا اندازہ ان کے خاندانی ناموں اور لباسوں سے لگانے کے عادی تھے، اور یوں وہ اب تک اس کے آبائی ساحلی علاقے، اس کی خوشنویس داری، لال موزوں اور مچھلی کھانے کے چھری کانٹوں اور میٹھا کھانے کے چھری کانٹوں میں تمیز کرنے میں اس کی نااہلی سے صرف نظر کرنے پر تیار نہ تھے۔

اکثر کہا جاتا ہے، اور بجا طور پر، کہ لاطینی امریکا کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ وجود رکھنے (to be) اور ملکیت رکھنے (to have) کے معنوں کو آپس میں گڈھ کر دیتے ہیں۔ آپ کس کی نمائندگی کرتے ہیں، یہ بات اس سے زیادہ اہم ہے کہ آپ دراصل خود کیا ہیں۔ جس روز گا برنسل اس قابل ہوا کہ ان کی طرح اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں قیام کر سکے، اونچے ریسٹورانوں میں جھینگے کھا سکے، ان کی طرح بلکہ ان سے بہتر طور پر وائس کے درست درجہ حرارت اور پینیر کی مختلف قسموں کو پہچان سکے، نیویارک، پیرس اور لندن میں گھوم پھر سکے اور ممتاز نظر آ سکے، اس دن انھوں نے اپنے دروازے گا برنسل کے لیے وا کر دیے اور اس بات کو اپنا اعزاز جانتے لگے کہ اس نے ان کی پیش کی ہوئی وسکی کو قبولیت بخشی، اور یہاں تک کہ وہ "ستھانی کے سو سال" کے مصنف کے پائیں بازو کے خیالات اور فیدل کاسٹرو کے لیے اس کی حمایت کو بھی نظر انداز کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

لیکن اُس زمانے میں نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اس کی شائع شدہ کتابوں کے باوجود ("بڑی ماما کا جنازہ" کے میکسیکو میں یونیورسٹی آف ویراکروز پریس کے زیر اہتمام شائع ہونے کے بعد اب ان کی تعداد چار ہو چکی تھی) اس کے انتظار کے چند برس اور باقی تھے۔ جب اسے پرنسلا لاطینا کی طرف سے نیویارک بھیجا گیا تو گا برنسل نے دن میں صحافی اور رات کو ہوٹل کے کمرے میں ادیب کے طور پر اپنی دوہری زندگی کو جاری رکھا۔ یہ دور کسی اعتبار سے اس کے لیے دشوار تھا۔ اسے نیویارک میں مقیم کیونین جلاوطنوں کی طرف سے دھمکانے والے ٹیلیفون آتے جن میں اسے یاد دلایا جاتا کہ اس کی بیوی اور ایک بچہ ہے جنہیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔ وہ کام کے دوران ایک آہنی سلخ اپنے ہاتھ کی پہنچ کے اندر رکھتا تھا کہ حملے کی صورت میں اپنا دفاع کر سکے۔ دریں اثنا کیونین وہ سال شروع ہو چکا تھا جے بعد میں "فرقہ واریت کا سال" سمجھا گیا۔ پرانی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان ریاستی اداروں میں کلیدی عہدوں پر قابض ہونے لگے تھے۔ پرنسلا لاطینا خاص طور پر ایک پُرکشش ادارہ تھا۔ اس بجنسی

کے ڈائریکٹر خورشید رکاردو ماسیتی نے، جو ارجنٹینا سے تعلق رکھنے والا ایک محبوب اور دیانتدار نوجوان تھا، پارٹی کے ارکان کی مزاحمت کرنے کی کوشش کی، اور جب اسے اس کے عہدے سے برطرف کیا گیا تو ہم سب، جو اس انقلابی جوش و خروش اور فرقہ واری کمیونزم کے استرداد میں اس کے شریک تھے، اس کے ساتھ ہی مستعفی ہو گئے۔ گا بریئل نے بھی یہی کیا۔

(میرے لیے یہ واقعات کیوبا کے انقلاب کے ایک ناگوار رخ پر چل پڑنے کے آئینہ دار تھے۔ لیکن گا بریئل کی نظر میں ان کی یہ معنویت نہ تھی۔ میرے خیال میں وہ انہیں راستے میں لگنے والا ایک ہلکا سا جھٹکا سمجھتا تھا اور اس نے کیوبا کی حکومت کے لیے اپنی حمایت کو سرد نہ پڑنے دیا، حالانکہ اس کی حمایت نہ اس وقت غیر مشروط تھی اور نہ اب ہے۔)

استغنے کے بعد اس کے پاس نیویارک میں نہ روزگار تھا اور نہ واپسی کا ٹکٹ۔ کسی لغو وجہ سے۔۔ اگرچہ اس کی لغویتوں میں بھی ایک قسم کی خالص جنینی منطق پوشیدہ ہوتی ہے۔۔ اس نے اپنی بیوی اور بچے کو ہمراہ لے کر بس کے ذریعے میکسیکو جانے کی ٹھان لی، جبکہ اس کی جیب میں سو ڈالر کی خطیر رقم تھی (جو اس کا کل سرمایہ تھا)۔

جس روز اسے میکسیکو میں عورتوں کے ایک رسالے میں سب ایڈیٹر کے طور پر ملازمت ملی اس کے جوتوں کے ٹکے ادھڑنے لگے تھے۔ اس رسالے کے مالک سے، جو ایک معروف فلم ساز بھی تھا، اسے ایک بار میں ملاقات کرنی تھی۔ گا بریئل جان بوجھ کر وقت سے پہلے وہاں پہنچ گیا اور سب سے آخر میں ٹھاتا کہ اس کے ٹوٹے ہوئے جوتوں کی جھلک دکھائی نہ دے۔ اتنے برسوں تک لکھتے رہنے کے بعد بھی اس کی حالت وہی تھی جو اُس پہلے دن تھی جب اس نے لکھنے کا آغاز کیا تھا۔

مجھے یاد نہیں کہ اس وقت میں اس سے ملنے میکسیکو گیا ہوا تھا یا وہ مجھ سے ملنے بارکیلا آیا ہوا تھا، جب اس نے ایک نئے ناول کا ذکر کیا جس پر وہ ان دنوں کام کر رہا تھا۔ "یہ ایک بولیرو کی طرح ہے،" اس نے کہا۔ (بولیرو لاطینی امریکی موسیقی کی سب سے زیادہ مستند طرز ہے۔ اُس کی یہ بات شاید نہایت جذباتی معلوم ہو، لیکن اس میں ایک قسم کی شہرارت بھی تھی، اور اس مبالغے میں مزاح کا عنصر بھی تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ اس سے لغوی معنی مراد نہ لیے جائیں، اور اس مزاح کو غالباً صرف ہم لاطینی امریکی ہی پوری طرح سمجھ سکتے ہیں۔ یہ بورخیس کی تحریروں میں استعمال کیے ہوئے اسمائے صفت کی طرح ہے۔) "اب تک،" اس نے میز پر انگلیاں رکھ کر انہیں وسط کی طرف چلاتے ہوئے کہا، "میں نے اپنے ناولوں میں محفوظ ترین راستا اختیار کیا ہے۔ میں نے کوئی خطرہ مول نہیں لیا۔ اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مجھے کھائی کے کنارے کنارے چلنا ہے۔" اور اس کی انگلیاں میز کے کنارے پر خطرناک انداز میں لٹکھڑاتے ہوئے چلنے لگیں۔ "سنو: اس کتاب میں

ایک کردار جب گولی مار کر خودکشی کرتا ہے تو اس کے خون کی پتلی سی لکیر شہر کی گلیوں میں بہتی بہتی آخر کار مرنے والے کی ماں تک پہنچ جاتی ہے۔ پوری کتاب اسی طرح کی ہے، رفعت اور عامیانہ پن کے درمیان کی تیز دھار پر چلتی ہوئی۔ بالکل بولیرو کی طرح۔ "پھر اس نے اضافہ کیا، "یا تو یہ کتاب میری کامیابی ہوگی یا میں اپنا سر گولی سے اڑا دوں گا۔"

بلاشبہ وہ "تنہائی کے سو سال" کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ جب، اس کے مکمل ہونے کے تھوڑے دن بعد، میں نے اس کا مسودہ پڑھا، تو اسے ایک رقعہ لکھا کہ یہ کتاب بغیر کسی شبے کے اس کی بڑی کامیابی ہے۔ اگلی ڈاک سے اس کا جواب آیا۔ "تمہارا خط پڑھنے کے بعد آج رات میں سکون سے سو سکوں گا۔ میرا بڑا مسند اس ناول کو لکھنا نہیں تھا بلکہ ان دوستوں کا سامنا کرنا تھا جو اسے پڑھیں گے، اور جن کی رائے میرے نزدیک اہم ہے۔ اس پر آنے والے رد عمل میری امید سے بڑھ کر ہیں۔ میرے خیال میں ان سب کا خلاصہ بیونس آئرس کے ایڈیٹوریاں سیوڈا میریکا نا کے رد عمل میں موجود ہے؛ انہوں نے دس ہزار کی تعداد میں اسے شائع کرنے کی بامی بھری تھی، لیکن دو ہفتے بعد اپنے ماہرین کو پروف دکھاتے وقت یہ تعداد گنی کر دی ہے۔"

وہ طویل انتظار جس کا آغاز پندرہ سال قبل ہوا تھا، جب وہ "پشوں کا طوفان" لکھتے لکھتے صبح کو نمودار ہوتے دیکھا کرتا، آخر کار پورا ہو چکا تھا۔

بے شک اب اس میں تبدیلی آ چکی ہے۔ کبھی اس کا بُرج حوت ہوا کرتا تھا، مگر اب ثور ہے۔ وہ دبلا اور بے چین تھا اور بے تحاشا تمباکو نوشی کیا کرتا تھا۔ اب اس نے تمباکو نوشی ترک کر دی ہے، اس کے وزن میں دس کلو گرام کا اضافہ ہو چکا ہے اور اس کے انداز میں ایک ٹھوس پن اور ٹھہراؤ آ گیا ہے، جو ہم میں سے ان لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے جو اس سے ماضی میں واقف رہ چکے ہیں۔ اس کی نوجوانی کے لالہ بالی دور کا شائبہ تک باقی نہیں رہا، ان دنوں کا جب اس کی صبح سے ملاقات بے خبری کے عالم میں ادارتی ڈیسک پر، یا کسی سے خٹنے یا نامانوس کمرے میں ہوا کرتی تھی۔ اب اس کی مصروفیات کا ڈائری میں کڑا حساب رکھا جاتا ہے۔ اس کی بیوی، مریدس، اور اس کی لٹریری اینٹنٹ، کارمین بالیلز، اسے ملاقات کے خواہش مندوں کی زد سے محتاط طور پر باہر رکھتی ہیں، جن میں عموماً صحافی، یونیورسٹیوں کے استاد یا طلبا شامل ہوتے ہیں جو اس سے اس کی تحریروں کی بابت گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی پوری زندگی کی پہلے سے منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ وہ ستمبر

کی کسی ملاقات کا پیشگی وعدہ جنوری میں کر سکتا ہے، اور اس کی پابندی بھی کر سکتا ہے، جو کسی لاطینی امریکی کے لیے ایک نہایت نادر بات ہے۔

"تہائی کے سو سال" سے پہلے کے زمانے میں اسے اپنے دوستوں کو مختصر وقفوں سے خط لکھنے اور انہیں سب کچھ بتانے کی واقعی ضرورت محسوس ہوتی تھی: سب کچھ اپنی امیدیں، اپنے اضطراب، اپنی ناکامیاں، اپنی ذہنی کیفیات: ("آپس کی بات ہے، مجھے اس جگہ ڈر سا لگتا ہے"، یا، "یہ مت سمجھنا کہ اس تناو کا اثر نہیں ہو رہا ہے" وغیرہ)۔ اب وہ خط لکھنا اصولی طور پر ترک کر چکا ہے۔ وہ اپنے دوستوں سے ٹیلیفون کے ذریعے رابطہ رکھتا ہے۔ اس کا برتاؤ نہایت پرسکون، دوستانہ، لیکن بے حد کریہیمن ہوتا ہے۔ "گا بو بول رہا ہوں، کیا ہو رہا ہے؟"۔۔۔ لیکن اب وہ اپنے رازوں میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

وہ موقع جب وہ اپنے اندر پوشیدہ رکھے ہوئے کسی احساس کو اچانک ظاہر کر دے، اسی وقت آتا ہے جب اس کے لیے تمام حالات بیک وقت مینا ہوں: وسکی کے چند جام، صبح کا اولین وقت۔ تب اس کے کسی نامکمل فقرے یا آنکھ کی اچانک چمک میں آدمی کسی پوشیدہ یاد یا ملال کی ایک لمحاتی جھلک دیکھ سکتا ہے۔ مثلاً کس طرح کھینچوں پر سے پھٹے ہوئے سویٹر میں لمبوس تیس سالہ ادیب، جس سے میں ان دنوں واقف تھا، اُس حسین اور شائستہ خاتون سے عشق کے امکان پر لپک اٹھا تھا جو آج پچاس سالہ ادیب کو نوازشات کے اشارے دیتی رہتی ہے۔ اب وہ اس خوف سے ان اشاروں کا جواب نہیں دیتا کہ کہیں اپنی زندگی کے سکون اور ترتیب کو خاک میں نہ ملا بیٹھے۔

ان معروف شخصیات کے باوصف جن میں وہ اب اٹھتا بیٹھتا ہے، دنیا کی تمام قوموں سے تعلق رکھنے والے آٹوگراف کے شائقین اور صحافیوں کے باوجود جو اس سے ملاقات کرنے کے خواہش مند رہتے ہیں، شہرت نے اس کا داغ خراب نہیں کیا۔ اپنے دوستوں کے لیے وہ اب بھی وہی "گا بو" یا "گابینو" ہے، اور اُن کا سلوک بھی اس کے ساتھ وہی پرانا ہے۔ یہ بات اس کے بار نکلیلا والے دوستوں کے بارے میں خصوصاً درست ہے جو، کریہیمن کے اچھے باشندوں کی طرح، شہرت سے بہ آسانی متاثر نہیں ہوتے۔ ان میں سے اس کے کئی قریبی دوست جوانی میں مر چکے ہیں۔ دوسرے کئی دوست، جن کا وزن بڑھ چکا ہے اور بالوں میں سفیدی آگئی ہے، اس سے اسی پرانے ساتھی کے طور پر برتاؤ کرتے ہیں جیسے وہ تیس سال پہلے جو اُس اور فاکنر کی کتابیں ادھار دیا کرتے تھے۔

گا بریکل اور مرسیڈس یحد متحدہ میاں بیوی ہیں۔ گا بریکل اس سے اُس وقت ملا تھا جب وہ تیرہ سال کی افسردہ اور غیر حیرت پذیر آنکھوں والی ایک بے حد دہلی لڑکی تھی۔ زندگی کے

السیوں، اور اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ کہ زندگی کی اتفاقی خوش قسمتیوں، کے مقابل وہ اپنا پتھر یلاسکون برقرار رکھتی ہے اور ہر چیز کو اس خاموش، اندر اتر جانے والی نگاہ سے دیکھتی ہے، جس نگاہ سے اس کے باپ کے آباؤ اجداد نے دریائے نیل کو دیکھا ہو گا۔ لیکن اس کی شبابت گارسیا مارکیز کے ناولوں میں آنے والی کریمیں عورتوں میں بھی ہے، جو حقیقت پر اپنی ذہنی گرفت کے سبب تاج و تہمت کے عقب میں اقتدار کی اصل طاقت ہیں۔ مریدس تمام شہرہ آفاق لوگوں سے -- خواہ وہ فیدل کاسترو ہو، مونیکا ونٹی ہو یا لونی بُونیل -- اپنے شوہر کے ہمراہ اسی فطری انداز سے ملتی ہے جس کی جڑیں بہت پہلے کی بے حد محفوظ دنیا میں پیوست ہیں۔ اس کا راز یہ ہے کہ وہ اب بھی زندگی کو یوں برتنی ہے جیسے مگانگوے کے اُس دور اُفتادہ گرم قصبے میں، جہاں وہ پیدا ہوئی تھی، اپنے عم زادوں سے مل جُل رہی ہو۔

ان کے دونوں بیٹوں، روڈریگو اور گونزالو، کا اپنے باپ سے تعلق یحد عمدہ ہے۔ یہ ایک نہایت قربت کا تعلق ہے جس میں ہر جانب بے تکلفی کا ماحول ہے۔ کہاں ہے ہمارا مشہور ادیب؟ وہ گھر میں داخل ہوتے ہی مذاقاً پکارتے ہیں۔ گابریئل نے اپنے بچوں کی تربیت لاطینی امریکا کی روایات کے قطعاً برعکس انداز میں کی ہے، جہاں امیر غریبوں کا، سفید فام سیاہ فاموں کا، اور والدین بچوں کا ہر گز احترام نہیں کرتے۔ وہ ان کے ساتھ مکمل برابری کا برتاؤ کرتا ہے اور محکم کی آسان ترغیب کو دبائے رکھتا ہے۔ اس کے نتائج قابلِ تحسین ہیں۔ اس کے دونوں لڑکے خود اپنے مالک ہیں، اور دنیا اور اس کے لوگوں پر ذہانت اور عقل مندی کے فراوان انداز سے نظر ڈالتے ہیں۔

گابریئل سال کا بیشتر حصہ میکسیکو میں گزارتا ہے۔ وہاں اس کا پُر آسائش مکان پیدریگل دسان آئجل پر ہے جو آتش فشاں پہاڑ پر بنے ہوئے یحد عالی شان مکانات پر مشتمل ایک مصنف ہے جہاں سابق صدور، بینکار اور فلمی دنیا کے لوگ اپنی امارت کی شان و شوکت کے ساتھ رہتے ہیں۔ مکان کے اندر سارے سال ایک ہی درجہ حرارت برقرار رہتا ہے: ماکوندو کی طرح گرم، ان دنوں میں بھی جب باہر برسات یا سردی کا موسم ہو۔ اس کے کام کرنے کے آلات میں نصف درجن لغات، ہر قسم کے انسائیکلوپیڈیا (یہاں تک کہ ہوا بازی سے متعلق بھی)، ایک فوٹو کاپیئر، ایک بے آواز برقی ٹائپ رائٹر اور کاغذ کے ہر وقت مہیا رہنے والے پانچ سوسادہ اور ارق شامل ہیں۔

آب وہ رات کے وقت نہیں لکھتا جیسا کہ ان اولین غربت زدہ دنوں میں لکھا کرتا تھا۔ اب وہ، ہوائی جہازوں کے مکینکوں کی سی ایک ڈانگری میں ملبوس، ہر روز صبح نو بجے سے سہ پہر تین بجے تک لکھتا ہے۔ دوپہر کا کھانا تین بجے کے روائتی ہسپانوی وقت پر لگایا جاتا ہے۔ کھانے کے بعد وہ

بیٹھ کر موسیقی سنتا ہے۔ اسے جیمبر موسیقی اور مقبول عام لاطینی امریکی موسیقی پسند ہے، جس میں آگستین لارا کے وہ پرانے بولیرو بھی شامل ہیں جو اس کی نسل سے تعلق رکھنے والے افراد میں پرانی یادیں جگا دیتے ہیں۔ لیکن وہ ان ادیبوں میں سے نہیں ہے جو خود کو باہمی دانت کے ینار میں قید کر لیتے ہیں۔ اگرچہ اسے صبح کے وقت مکمل تنہائی درکار ہوتی ہے، مگر سہ پہر کے بعد اسے لوگوں میں گھرے رہنا پسند ہے۔ وہ ہفتے میں کئی بار رات کا کھانا باہر جا کر کھاتا ہے؛ شراب اعتدال سے پیتا ہے۔ وہ خبروں کا غلام ہے؛ ملک کے تمام اخبار ہوائی ڈاک سے روز منگواتا ہے، اور امریکی اور فرانسیسی رسالوں کا سچا پڑشوق قاری ہے۔ اس کے ٹیلیفون کا بل بے پناہ زیادہ ہوتا ہے، کیوں کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر دنیا بھر میں بکھرے اپنے دوستوں سے ہم کلام ہونے کا عادی ہے۔ وہ کسی عجلت کے بغیر مختلف چیزوں کے بارے میں ان سے یوں باتیں کرتا ہے گویا وہ نہ ناک کے گلاس تھامے اس کے روبرو بیٹھے ہوں۔

وہ سفر بھی بہت کرتا ہے۔ میکسیکو شہر کے مکان، اور قریب ہی کورناواکا میں ایک اور مکان کے علاوہ، اس کا ایک فلیٹ بوگوٹا میں ہے اور ایک پیرس میں، جہاں وہ موسم خزاں میں قیام کرتا ہے۔ یہ لاکوپول سے صرف تیس قدم کے فاصلے پر ہے۔ اس کے تمام مکانات گم سامان، آرام دہ اور خوش ذوقی سے آراستہ ہیں۔ (ٹھوس چمڑے کی ایک آرام کرسی اور ایک اعلیٰ درجے کا بائی فائی ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔) شیفون میں کتابیں، الماریوں میں کپڑے اور بار میں عمدہ اسکاچ کی بوتلیں ہمیشہ مینا رہتی ہیں تاکہ وہ کسی بھی وقت اسباب کی زحمت اٹھائے بغیر وہاں آ سکے۔ وہاں پہنچ کر اسے صرف اتنا کرنا ہوتا ہے کہ زرد پھولوں کا ایک دستہ گلدان میں لگا دے۔ یہ ایک پرانا توہم ہے۔ زرد پھول خوش قسمتی کا نکلون ہیں۔

در حقیقت وہ گواہیرا کے انڈین باشندوں کی طرح، جو اس کی نانی کے گھر میں کام کیا کرتے تھے، توہم پرست ہے۔ وہ اس بات پر اعتقاد رکھتا ہے کہ بعض چیزیں، حالات اور افراد ایسے ہوتے ہیں جو بد قسمتی لاتے ہیں (جسے وہنی زویلا میں "پاوا" اور اٹلی میں "بیٹا تیورا" سمجھا جاتا ہے۔) سب سے حیرت ناک بات یہ ہے کہ عموماً اس کا یہ اعتقاد درست نکلتا ہے۔ جن افراد کو وہ بد شگون قرار دیتا ہے، وہ واقعی بد قسمتی کے پیامبر ثابت ہوتے ہیں۔ گا بریل میں کرنل اور یلیانو بوندیا کی طرح مستقبل کی پیش گوئی کی صلاحیت موجود ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ کوئی چیز گر کر پاش پاش ہونے والی ہے، اور جب واقعی ایسا ہو جاتا ہے، جب وہ شے گر کر چکنا چور ہو جاتی ہے، تو اس کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے۔ اسے کوئی علم نہیں کہ یہ پیش گوئی انہ احساس اسے کیوں کر ہو جاتا ہے۔ "کسی بھی لمحے کوئی بات ہونے والی ہے،" اس نے ایک بار جنوری کی پہلی تاریخ کو کاراکاس میں مجھ سے

کہا۔ ہم اس وقت ساحل سمندر پر جانے ہی والے تھے۔ ہم نے اپنے غسل کے لباس اور تولیے نعل میں داب رکھے تھے۔ تین منٹ بعد وہ روشن، سہل انگار شہر، جو پچھلے کئی برسوں سے فسادات اور مٹگاموں سے محفوظ تھا، اچانک بموں کے دھماکوں سے لرز اٹھا۔ باغیوں کے ہوائی جہازوں نے ڈکٹیٹر پیریز خیمینیز کے صدارتی محل پر حملہ کر دیا تھا۔

اس کی شخصیت میں ساحری کے سے عناصر موجود ہیں۔ اس کی زندگی کے کئی فیصلے کسی ایسی وجدانی کیفیت میں کیے گئے جس کی کوئی عقلی توجیہ پیش نہیں کی جاسکتی۔ وہ اور دیکارت کبھی اچھے دوست نہیں ہو سکتے تھے (راہلے یقیناً، لیکن دیکارت ہرگز نہیں)۔ دیکارت کا انداز فکر اسے ایک تنگ واسکٹ کی طرح غیر آرام دہ موس ہوتا ہے۔ اگرچہ فرانسیسیوں میں سے کئی اس کے بے حد عمدہ دوست ہیں، جن میں صدر فرانسوا مٹراں بھی شامل ہیں، لیکن اسے منطق کا وہ گھبراہٹ رنگ جس میں ہر فرانسیسی اوائل عمر سے رٹکا جانے لگتا ہے، بہت محدود کر دینے والا لگتا ہے۔ اسے وہ ایک ایسا سانچا موس ہوتا ہے جس میں حقیقت کے صرف ایک پہلو کی گنجائش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ، مائیکروفون اور کیرے سے اس کی قدیم دہشت سے قطع نظر، وہ فرانسیسی ٹیلی وژن کو انٹرویو دینے سے عموماً احتراز کرتا ہے۔ ”ادب کیا ہے؟“ (یا ”زندگی کیا ہے؟“، ”موت کیا ہے؟“، ”آزادی کیا ہے؟“، ”محبت کیا ہے؟“) قسم کے سوال جو مجرّد تصورات اور تجربوں کے پروردہ فرانسیسی صحافی ایک خفیہ چالاکی کے ساتھ انٹرویو دینے والے پر اُچھالنے کے بے حد شائق ہوتے ہیں، اس کے رونگٹے کھڑے کر دیتے ہیں۔ اس کے نزدیک اس قسم کی بحث میں پڑنا ایسا ہی خطرناک ہے جیسے بارودی سرنگوں سے بھرے میدان سے گزرنا۔

اس کے اظہار کا پسندیدہ ذریعہ حکایتیں اور قصے کہانیاں ہیں۔ اسی لیے وہ ناول نگار ہے، مضمون نگار نہیں۔ ممکن ہے یہ صرف جغرافیے اور کلچر کا معاملہ ہو، کیوں کہ کریبینین باشندے، بحیثیت مجموع، حقیقت کو قصے کہانیوں کے ذریعے بیان کرنے کے عادی ہیں۔ بہت سے یورپی دانشوروں کے برعکس گارسیا مارکیز کو نظریاتی بیانات جاری کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ وہ پُرکثرت خطابت جو آلتی پلائو کے خٹے میں ہسپانویوں کی باقیات ہے، اسے بے معنی اور خود اپنا ہی مضحکہ اڑاتی موس ہوتی ہے۔ مجھے ہمیشہ خیال آتا ہے کہ فیدل کاسترو سے اس کی دوستی، بڑی حد تک، زندگی کو دیکھنے کے ایک مخصوص انداز، ایک مخصوص زبان اور عقلی رویے سے پیدا ہوئی ہے جو ان دونوں کے مشترکہ جغرافیائی پس منظر کا حصہ ہے۔

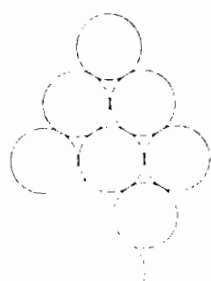
اگر آپ گارسیا مارکیز پر اسی سخت گیرمی سے نظر ڈالیں جو بہت سے یورپی دانشور روا رکھتے ہیں، تو اس کی سیاسیات کو سمجھنا آسان نہیں۔ وہ کاسترو کا دوست ہے لیکن سوویت حکومت یا

اس سلیٹی بیورو کرسی کا مدح خواں نہیں جو کمیونسٹ دنیا پر حکمرانی کرتی ہے۔ اس کے نزدیک برزنیف اور کاسٹرو دو بالکل مختلف مظاہر ہیں، حالانکہ اس بات سے کم ہی لوگ انکار کر سکیں گے کہ کیوبا کا نظام کئی اعتبار سے سوویت نظام کی طرز پر ڈھالا گیا ہے۔ (اس موضوع پر ہماری بحث عرصہ ہوا قفل کا شکار ہو چکی ہے) مگر یہ بات واضح ہے کہ آرتھوڈوکس کمیونزم کا اسے داغ نہیں۔ اس کے قریبی دوستوں کے حلقے سے باہر، چند ہی لوگ اس اہم سیاسی کردار سے باخبر ہیں جو وہ خیر سچائی کے ایک غیر رسمی سفیر کی حیثیت سے کریمین کے علاقے میں ادا کرتا ہے۔ سوشل ڈیموکریٹک رجحانات اور ترقی پسند لیبر لوگوں سے اس کے قریبی رابطے ہیں۔ ایک ایسے برا عظم میں جس کو ہمہ وقت ایک طرف رجعت پسند، عسکریت پسند، امریکہ نواز دائیں بازو، اور دوسری طرف ایک سخت گیر، سوویت نواز بائیں بازو کے درمیان ایک کڑے انتخاب کا سامنا ہے، وہ مقبول جمہوری متبادل کو ترجیح دیتا ہے۔ ممکن ہے مہتران کے لیے اس کی حمایت کا یہی سبب ہو۔ چوں کہ لاطینی امریکا کا دایاں بازو تھریبا ہمیشہ عسکری آمریت کی حمایت کرتا ہے، اس لیے وہ ہمیشہ مارکیٹ کا مخالف رہتا ہے۔ وہ لوگ اسے کاسٹرو کا ایک خطرناک ہیمنٹ تصور کرتے ہیں۔ "وہ اپنی دولت میں غریبوں کو حصے دار کیوں نہیں بناتا؟" اس کے متعلق دشمن، جو مارکس اور سینٹ فرانس آف ایسیسی میں کوئی فرق نہیں دیکھتے، سوال کرتے ہیں۔ یہ بات انہیں ناگوار ہے کہ وہ کیوبی آر، آونسٹر، عمدہ سمپین، اول درجے کے ہوٹلوں، عمدہ تراش خراش کے لمبوسات اور جدید ترین کاروں کی سی بورژوا آسائشوں کا مشتمل ہو سکتا ہے۔ درحقیقت وہ اپنی دولت کے معاملے میں انتہائی شاد خرچ واقع ہوا ہے، اپنی اس دولت کے معاملے میں جسے اس نے، کسی کا استحصال کیے بغیر، صرف و محض اپنے مائپ رائٹر کی مدد سے حاصل کیا ہے۔

بہت سے لوگ اس کی یہ بات سن کر حیران رہ جاتے ہیں کہ "سرور کا زوال" ایک ایسی کتاب ہے جس میں اس کی خود نوشت کے سب سے زیادہ اجزا شامل ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک عمیق، پوشیدہ سطح پر ایسا ہی ہے۔ اس کتاب کے ڈکٹیٹر کے برعکس، جس نے اقتدار حاصل کرنے کی باقاعدہ کوشش کی تھی، شہرت گارنٹل پر غیر متوقع طور پر نازل ہوئی ہے، اور اگرچہ اس کے اچھے پہلو بھی ہیں، مگر اس کی بڑی باری قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ اب اس کے لیے کوئی چیز پرانے دنوں کی سی بے ساختگی کے ساتھ کرنا، سمجھنا، یا لکھنا ممکن نہیں رہا۔ شہرت سے بھی اقتدار ہی کی طرح نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ یہ ایک طرح کا اقتدار ہی ہے۔ اس میں آدمی کو ہر وقت چونکنا رہنا پڑتا ہے اور کسی پر ضرورت سے زیادہ اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی کچھ باتیں یقیناً ہوں گی جنہیں آج کل وہ صرف اپنے آپ سے کہہ سکتا ہے۔ تھلاشی اور نوجوانی کے دنوں کا ماحول اب ایک خود کلامی میں

تبدیل ہو چکا ہے۔

یہ بلوچہ نہیں ہے کہ تنہائی کا موضوع اس کی تمام تحریروں پر چھایا ہوا ہے۔ اس کی جڑیں اس کے اپنے تجربے میں بہت گہری ہیں۔ اس وقت جب وہ اراکاتاکا میں اپنے نانانانی کے بڑے سے مکان میں ایک تنہا بچہ تھا، یا اس وقت جب وہ بوگوتا کی ٹراموں میں طالب علمی کے زمانے میں اتوار کی سہ پہروں کی اداسی کو شاعری کے مطالعے میں ڈبو یا کرتا تھا، یا اس وقت جب وہ بارنگیلا کے ایک قہر خانے میں مقیم ایک نوجوان ادیب تھا، تنہائی کا سایہ ہمیشہ اس کے تعاقب میں رہا ہے۔ اب بھی، جب وہ ایک مشہور عالم ادیب ہے، یہ سایہ ہر جگہ اس کا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ لاکوپول کی پُر تکلف شاموں میں بھی، جب وہ دوستوں میں گھرا ہوا ہوتا ہے، تنہائی کا سایہ موجود رہتا ہے۔ اس نے وہ بنیس جنگلیں جیت لی ہیں، جو کرنل اور یلیانو بونسدیا بار گیا تھا، لیکن وہ تقدیر جس نے پورے بونسدیا خاندان پر ایسا آنِ مٹ نشان چھوڑ دیا تھا، وہی بے رحم تقدیر اس کی بھی ہے۔



استحاب کا یہ حصہ مارکیز کے ناولٹ "معصوم اریندرا" اور چار کہانیوں پر مشتمل ہے۔

"معصوم اریندرا"، جس کا مکمل عنوان The Incredible and Sad Tale of

Innocent Erendira and Her Heartless Grandmother

معروف ترین ناول "تنبائی کے سو سال" میں بیان کیے گئے ایک قصے پر بنیاد رکھتا ہے۔ مارکیز کے

مخصوص انداز میں اس قصے کے کرداروں کا، یا ان کی صورت حال کا، ذکر کئی تحریروں میں ایک ضمنی واقعے

کے طور پر آتا ہے۔ یہ ناولٹ اور اگلی دو کہانیاں، "گم گشتہ وقت کا سمندر" (The Sea of Lost

Time) اور "محبت کے اُس پار منتظر موت" (Death Constant Beyond Love) اُس

مجموعے میں شامل ہیں جو انگریزی میں Innocent Erendira and Other Stories کے نام

سے شائع ہوا۔

"بڑے بڑے پروں والا ایک بوڑھا بھوس" (A Very Old Man with

Enormous Wings) اور "دنیا بھر کا حسین ترین ڈوب مرنے والا" (The Handsomest

Drowned Man in the World) انگریزی مجموعے Leaf Storm and Other

Stories سے لی گئی ہیں۔ ان دونوں بے حد خوب صورت اور مسور کن کہانیوں کو مارکیز نے بچوں کی

کہانیوں کا ذیلی عنوان دیا ہے۔

گاہری سیما مار کیز

ترجمہ: راشد مفتی

معصوم اربندر
اور اس کی سنگ دل دادی
کی ناقابل یقین اور غمناک داستان

جب اس کی بد بختی کی ہوائیں چلنی شروع ہوئیں تو اربندر اپنی دادی کو سہارا ہی تھی۔ صحرا کی تنہائی میں گم سفید کنکریٹ کی وسیع حویلی پہلے ہی جھگڑ میں بنیادوں تک بل گئی تھی۔ لیکن اربندر اور اس کی دادی صحرا کے فطری خطرات کی عادی تھیں؛ سو انھوں نے غسل خانے میں، جو موروں کی تصویروں اور رومی حتماں کی بچکانہ بچی کاری سے مزین تھا، ہوا کی شدت پر مشکل ہی سے توجہ دی۔

عریاں اور بھاری بھر کم دادی سنگ مرمر کے ٹب میں ایک خوبصورت سفید وبل کی طرح لگ رہی تھی۔ پوتی ابھی ابھی پندرہویں سال میں لگی تھی۔ اس کا چہرہ پر مردہ اور ہڈیاں نرم تھیں، اور وہ اپنی عمر کے لحاظ سے بہت کمزور تھی۔ وہ اپنی دادی کو اس جُڑ سی کے ساتھ سہارا ہی تھی جس میں مقدس پابندی کا سا عنصر تھا۔ غسل کے پانی میں بوٹیاں اور خوشبودار پتیاں ابالی گئی تھیں اور یہ پتیاں اس کی موٹی کمر، گھنے دھات رنگ بالوں اور طاقت ور شانوں سے چھٹی ہوئی تھیں، جو اس بے رحمی سے گودے ہوئے تھے کہ ملنا بھی دیکھتے تو شرماتا تھے۔

"رات میں نے خواب میں دیکھا کہ مجھے ایک خط کا استعارہ ہے۔" دادی نے کہا۔
 ارنسدر نے، جو صرف اس وقت بولتی تھی جب بولنا ناگزیر ہو، پوچھا: "خواب میں دن
 کون ساتھا؟"
 "جمرات۔"

"تب تو یہ بُری خبر والا خط تھا،" ارنسدر نے کہا، "لیکن یہ کبھی آئے گا نہیں۔"
 جب وہ اپنی دادی کو سلا چکی تو اسے خواب گاہ میں لے گئی۔ دادی اتنی فریب تھی کہ صرف
 اپنی پوتی کے ٹانے پر جھک کر، یا لٹھی کے سہارے، جو کسی پادری کے عصا سے مشابہ تھی، چل
 سکتی تھی۔ لیکن اس کی دشوار ترین کوششوں میں بھی ایک کہنہ بنگوہ کی طاقت عیاں تھی۔ خواب گاہ
 میں، جسے باقی سارے گھر کی طرح بہت زیادہ اور کسی حد تک جنونی ذوق سے سجایا گیا تھا، ارنسدر
 کو اپنی دادی کی مشاطگی کے لیے مزید دو گھنٹے درکار تھے۔ اس نے دادی کے بالوں کی ایک ایک
 لٹ کو سلجایا، خوشبو لگائی، کتھنچی کی: اسے پھول دار لباس پہنا یا: چہرے پر پودر اور ہونٹوں پر چمک
 دار لپ اسٹک لگائی: گالوں کو روڑ اور پلکوں کو افشاں سے آراستہ کیا، اور اس کے ناخنوں پر سیپی
 کے رنگ کی پالش لگائی۔ جب وہ اسے ایک بڑی ساری گڑیا کی طرح سنوار چکی تو ایک مصنوعی باغ
 میں لے گئی جس میں ویسے ہی جس زدہ پھول تھے جیسے کہ اس کے لباس پر۔ اس نے دادی کو
 ایک بڑی سی کرسی پر، جس کی بنیاد اور نسب تخت جیسا تھا، بٹھا دیا اور بھونپو جیسے اسپیکر والے
 گراموفون پر گئے دنوں کے ریکارڈ سننے کے لیے چھوڑ دیا۔

دادی جب تک ماضی کی بھول بھلیوں میں بھگتی، ارنسدر اس تاریک و پراگندہ، اور عجیب
 و غریب فرنیچر والے مکان کی جھاڑ پونچھ میں مصروف ہو گئی، جو خیالی سیزروں کے مجسموں، بٹوری
 فانوسوں اور سنگ جراثحت کے فرشتوں، ایک سنہری پیانو اور ناقابلِ تصور جسامتوں اور صورتوں
 کے لاتعداد گھنٹوں سے آراستہ تھا۔ آنگن میں پانی ذخیرہ کرنے کی مانند تھی، جو دور دراز کے
 چشموں سے مقامیوں کی کمر پر لاد کر، کئی برسوں میں لایا جاتا رہا تھا۔ اور مانند کی دیوار پر لگے ایک
 طلقے سے بندھا ایک ازکار رفتہ شرمخ تھا جو اس لعنتی آب و ہوا میں جی سکنے والی واحد پردار مخلوق
 تھی۔ یہ مکان اللہ میاں کے پچھواڑے، صحرا کے قلب میں ایک خستہ و خراب اور تپتی ہوئی گلیوں
 والی نوآبادی سے متصل تھا جہاں بد بختی کی ہوائیں چلنے پر بکریاں کس مہر سی کے عالم میں
 خود کشی کر لیتی تھیں۔

یہ ناقابل فہم پتاہ گاہ دادی کے شوہر نے بنوائی تھی، جو آمادیس نامی ایک افسانوی اسمگر تھا۔ اس شخص سے اُس کا، اسی نام کا ایک بیٹا تھا جو ارندرا کا باپ تھا۔ کسی کو اس گھرانے کی اصل کا پتا تھا نہ دلپسپوں کا۔ مقامیوں کی زبان میں زیادہ سے زیادہ معلوم روایت یہ تھی کہ باپ امادیس نے اپنی خوبصورت بیوی کو آتیل کے ایک قہر خانے سے چھڑایا تھا، جہاں اس نے ایک آدمی کو چاقوؤں کی لڑائی میں قتل کر دیا تھا، اور یہ کہ اس نے اپنی بیوی کو صحرا کی برست میں ہمیشہ کے لیے لا بسایا تھا۔ جب دونوں امادیس مر گئے۔ ایک سرسامی بخار کے ہاتھوں، اور دوسرا ایک عورت کے سبب گولیل سے چھلنی ہو کر۔۔۔ تو دادی نے ان کی لاشوں کو صحن میں دفن دیا۔ اس نے اپنی چودہ برہنہ پانچا دماؤں کو فارغ کر دیا اور اپنی تاجا ز پوتی کی قربانیوں کے طفیل، جسے اس نے پیدائش کے وقت سے پالا تھا، اس پوشیدہ مکان کے سایوں میں اپنے شان و شوکت والے خوابوں پر غور و خوض جاری رکھا۔

ارندرا کو صرف گھنٹے ملانے اور انہیں چابی دینے ہی میں چھ گھنٹے لگتے تھے۔ جس دن اس کی بد بختی شروع ہوئی، اسے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی، کہ گھنٹوں میں اگلی صبح تک چلتے رہنے کے لیے کافی چابی موجود تھی۔ لیکن اس کے برخلاف، اسے اپنی دادی کو نہلاتا اور ملبوس کرنا تھا، فرش صاف کرنے تھے، دوپہر کا کھانا پکانا تھا اور بلوری برتنوں کو پالش کرنا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب جب وہ شرمخ کے پیالے کا پانی تبدیل کر رہی تھی اور امادیسوں کی جڑواں قبروں کے گرد لگے صحرائی جھاڑ جھکاڑ کو پانی دے رہی تھی، اسے ہوا کے عتاب کا سامنا کرنا پڑا جو اس وقت تک ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ لیکن اسے ذرا بھی احساس نہ ہوا کہ یہ اس کی بد بختی کی ہوا ہے۔ بارہ بجے جب وہ شمسین کے گلاس صاف کر رہی تھی تو اسے۔۔۔ بخنی کی بو آئی اور اسے اپنے عقب میں قیمتی بلور کی کڑیاں چھوڑے بغیر لپک کر باورچی خانے پہنچنے کا معجزہ دکھانا پڑا۔

بخنی اُبل کر گرنے لگی والی تھی کہ اس نے جوں توں چولہے سے برتن اتارا۔ پھر اس نے ایک دم بھت، جو پہلے ہی سے تیار تھا، چولہے پر رکھ دیا، اور دم بھر کے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے باورچی خانے میں رکھے اسٹول پر سانس لینے کو بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں موند لیں، ایک بے شکے تاثر سے انہیں دوبارہ کھولا اور ڈوگے میں بخنی اندیلنے لگی۔ وہ سوتے میں کام کر رہی تھی۔

چاندی کے شمع دانوں والی، بارہ افراد کی ضیافتی میز کے سرے پر دادی اکیلی بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی چھوٹی سی گھنٹی بلائی اور ارندرا بہا پ نکلے ہوئے ڈوگے کے ساتھ تقریباً فوراً ہی پہنچ گئی۔ ارندرا جب بخنی پیش کر رہی تھی تو اس کی خواب خرابی نے دادی کی توجہ مبذول کرائی۔

اس نے اریسندرا کی آنکھوں کے سامنے اپنا ہاتھ اس طرح پھرایا گویا کسی غیر مرئی شیشے کو صاف کر رہی ہو۔ لڑکی نے اس کا ہاتھ نہیں دیکھا۔ دادی کی نظریں اس کا تعاقب کرتی رہیں اور جب اریسندرا واپس باورچی خانے جانے کے لیے مڑی، وہ اس پر چیخ پڑی:

"اریسندرا!"

اچانک جگمگاتے جانے پر لڑکی نے ڈونگا قالین پر گر دیا۔

"کوئی بات نہیں، مچی۔" دادی نے یقین دلانے والی شفقت سے کہا۔ "تم پھر پلتے پھرتے سو گئیں۔"

"میرے جسم کو اس کی عادت ہے۔" لڑکی نے عذر خواہی کے طور پر کہا۔

اریسندرا نے، جو ابھی تک نیند کے خمار میں تھی، ڈونگا اٹھایا اور قالین کے داغ صاف کرنے لگی۔

"اے چھوڑ دو۔" دادی نے اسے باز رکھتے ہوئے کہا۔ "تم اسے آج سہ پہر میں دھو سکتی ہو۔"

سواپنے روزمرہ سہ پہر کے کام کاج کے علاوہ اریسندرا کو کھانے کے کمرے کا قالین بھی دھونا پڑا اور اس نے غسل خانے میں اپنی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پیر کے دن کی دھلائی بھی کر ڈالی۔ جو اس دوران مکان کے گرد چکر کاٹتی ہوئی اندر آنے کا راستا تلاش کرتی رہی۔ اریسندرا کے پاس اتنا کام تھا کہ اس کے محسوس کیے بغیر رات نے اسے آیا اور جب اس نے کھانے کے کمرے کا قالین دوبارہ بچھایا تو سونے کا وقت ہو چکا تھا۔

دادی تمام سہ پہر پیا نو پر اپنے زمانے کے گیت اونچی آواز میں اپنے آپ کو سنا کر رہی تھی۔ اس کی پلکوں پر افشاں اور آنسوؤں کے دھبے تھے۔ لیکن اپنے ملل کے لباس شبِ خوابی میں وہ بستر پر لیٹی تو بے شوق یادوں کی تلخی لوٹ آئی۔

"کل کا دن مصروف میں لا کر بیٹھک کا قالین بھی دھو ڈالو،" اس نے اریسندرا سے کہا۔

"اے رونق کے دنوں سے دھوپ لگی ہی نہیں ہے۔"

"اچھا دادی۔" لڑکی نے جواب دیا۔

اس نے پروں کا پیمکا اٹھایا اور کٹھور مالکن کو، جو غنودگی میں شینہ احکام گنوار ہی تھی، جھلنے لگی۔

"سونے سے پہلے سارے کپڑے استری کر لینا تاکہ تم صاف ضمیر کے ساتھ سو سکو۔"

"اچھا دادی۔"

"کپڑوں کی الماریاں احتیاط سے دیکھتا، طوفانی راتوں میں کیرٹے زیادہ بھوکے ہو جاتے ہیں۔"

"اچھا دادی۔"

"تمہارے پاس جو وقت ہے اس میں پھولوں کو آنگن میں لے جاؤ کہ انہیں ذرا ہوا لگ سکے۔"

"اچھا دادی۔"

"اور شتر مرغ کو دانہ ڈال دو۔"

وہ سوچتی تھی لیکن پھر بھی حکم چلا رہی تھی، کیوں کہ پوتی کو سوتے میں بیدار رہنے کی صلاحیت اسی سے ورثے میں ملی تھی۔ ارندرا دبے پاؤں کمرے سے چلی گئی اور رات کے آخری کام کاج سمیٹنے لگی۔ وہ اب بھی خوابیدہ دادی کے احکام کا جواب دے رہی تھی۔

"قبروں پر تھوڑا سا پانی ڈال دینا۔"

"اچھا دادی۔"

"اور اگر امادیس آئیں تو انہیں روک دینا،" دادی نے کہا۔ "کیوں کہ پور فیریو گالان کا گروہ ان کی گھات میں بیٹھا ہوا ہے۔"

ارندرا نے جواب نہیں دیا کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ دادی ہڈیاں میں گم ہو رہی ہے، لیکن اس نے ایک بھی حکم گوش انداز نہیں کیا۔ جب اس نے کھڑکی کی چٹھنیوں کی پرستال ختم کی اور آخری بتیاں بجھا کر اپنی خواب گاہ میں جانے کے لیے کھانے کے کمرے سے ایک شمع دان اٹھایا تو بوا کے وقتوں کو دادی کے پُرسکون اور زوردار انقاس پُر کر رہے تھے۔

اس کا کمرہ بھی پُر تکلف تھا، لیکن اس کی دادی کے کمرے جتنا نہیں۔ اس میں اُس کے حالیہ پچپن کے چابی والے جانوروں اور گڑیوں کا ڈھیر تھا۔ دن بھر کے وحشیانہ کام کاج کی ماری ارندرا میں اتنا دم نہ تھا کہ لباس تبدیل کر سکتی۔ اس نے شمع دان میز پر رکھا اور بستر پر ڈھیر ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کی بدنہتی کی ہوا شکاری کتوں کے غول کی طرح خواب گاہ میں در آئی اور شمع کو اٹھا کر پردوں پر دے مارا۔

صبح کے وقت جب ہوا آخر کار تھم گئی تو بارش کی چند موٹی اور اکادکا بوندیں گرنے لگیں جنہوں نے پچھلے کچھ انگارے بجھا کر حویلی کی دھواں دستی ہوئی راکھ کو بٹھا دیا۔ گاؤں کے لوگوں نے، جو

زیادہ تر انڈین تھے، تباہی سے بچی ہوئی چیزیں نکالنے کی کوشش کی جو شرمخ کی سوختہ لاش، سنہری پیانو کے ڈھانچے اور ایک مجسمے کے اوپری حصے پر مشتمل تھیں۔ دادی اپنی دولت کی خاکستر پر ناقابلِ سرایت افسردگی کے ساتھ گہری سوچ میں گم تھی۔ ارندرا نے روٹا دھوتا بند کر دیا تھا اور وہ دونوں امادیوں کی قبروں کے درمیان بیٹھی تھی۔ دادی کو جب یقین ہو گیا کہ مبلغے میں صرف چند ہی چیزیں سلامت ہیں تو اس نے پُر خلوص رحم سے اپنی پوتی پر نظر ڈالی۔

"میری بد نصیب بچی،" اس نے آہ بھری۔ "اس سانحے کی ادائیگی کے لیے تجھے ساری زندگی بھی کم پڑے گی۔"

ارندرا نے اسی دن، بارش کے شور تلے ادائیگی شروع کر دی، جب اسے گاؤں کے دکان دار کے ہاں لے جایا گیا جو ایک دہلیہ تلا، قبل از وقت رنڈوا تھا، اور دوشیزگی کی اچھی قیمت چکانے کے لیے صحرا میں خاصی شہرت رکھتا تھا۔ رنڈوے نے سائنسی سخت گیری کے ساتھ ارندرا کا معائنہ کیا۔ دادی اس دوران ڈھٹائی سے استکار کرتی رہی۔ اس نے لڑکی کی رافوں کی طاقت، اس کی چھاتیوں کے اجبار، کولہوں کی گولائی پر غور کیا اور جب تک اس کی قیمت کا اندازہ نہ لگایا، ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا۔

پھر وہ بولا۔ "یہ تو ابھی بالکل نیچی ہے۔ اس کی چوچیاں کتیا جیسی ہیں۔"

پھر اس نے اپنے فیصلے کو اندادو شمار سے ثابت کرنے کے لیے لڑکی کو ترازو پر کھڑا کر دیا۔ اس کا وزن نوے پونڈ نکلا۔

"اس کا مول سو پیو سے زیادہ نہیں،" رنڈوے نے کہا۔

دادی بھونچکا رہ گئی۔

"ایک بالکل نئی لڑکی کا مول سو پیو!" اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "نہیں جناب! اس سے تو آپ میں خوبی کی قدر کا فقدان ظاہر ہوتا ہے۔"

"چلو، میں ڈیڑھ سو دے دوں گا۔"

"اس لڑکی نے مجھے دس لاکھ پیو سے زیادہ کا نقصان پہنچایا ہے،" دادی نے کہا۔ "اس رفتار سے تو اسے ادائیگی کے لیے دو سو سال چاہئیں۔"

"تم خوش قسمت ہو کہ اس کی واحد اچھی خاصیت اس کی عمر ہے،" رنڈوے نے کہا۔

طوفان مکان کو ڈھانے دے رہا تھا اور چھت میں اتنے سوراخ تھے کہ جتنا پانی باہر برس رہا تھا اتنا ہی اندر ٹپک رہا تھا۔ دادی اس مصیبت بھری دنیا میں خود کو بالکل تنہا محسوس کر رہی تھی۔

"اچھا، تین سو دے دو۔" وہ بولی۔

"ڈھائی سو۔"

آخر کار وہ دو سو بیس پیسہ نقد اور کچھ اجناس پر مستحق ہو گئے۔ پھر دادی نے ارندرا کو ندوے کے ساتھ جانے کے لیے اشارہ کیا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر عقبی کمرے کی طرف اس طرح لے چلا گیا اسے اسکول لے جا رہا ہو۔

"میں یہاں تمہارا انتظار کروں گی،" دادی نے کہا۔

"اچھا دادی۔"

عقبی کمرہ ایک طرح کا اینٹوں کے چار ستونوں والا چھتر تھا جسے پام کے گلے سرے پتوں، چھت نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے گرد ایک تین فٹ اونچی گارے کی دیوار تھی جس کے اعٹ باہر کی خلل اندازی احاطے میں در آتی تھی۔ دیوار کے اوپر کیکٹس اور دوسرے صحرائی وودوں کے گٹلے رکھے تھے۔ دو ستونوں کے درمیان، بساویں رواں کشتی کے آزاد بادبان کی طرح بڑھڑھاتا ہوا، اڑی ہوئی رنگت والا ایک جھولنا لٹک رہا تھا۔ طوفان کے شور اور پانی کی بوجھاڑ میں دُور سے آتی ہوئی چٹخیں، دوردراز کے جانوروں کی غراہٹ اور ڈوبنے والے جہاز سے اُستھتی ہوئی پکار سنائی جا سکتی تھی۔

جب ارندرا اور رندو چھتر میں گئے تو بارش کے ایک ریلے نے ان کے قدم اکھاڑ لیے۔ وہ مشکل سے سنبھل پائے اور پانی کی بوجھاڑ نے انہیں جھگو کر رکھ دیا۔ ان کی آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں لیکن ان کی حرکات و سکنات شدید ہوا کے شور میں واضح ہو گئی تھیں۔ ندوے کی پہلی کوشش پر ارندرا نے ناقابل سماعت طور سے چیخ کر بچ نکلنے کی کوشش کی۔ ندوے نے اسے کسی آواز کے بغیر جواب دیا، کلائی سے پکڑ کر اس کا بازو مروڑا اور گھسیٹا ہوا بھولنے تک لے گیا۔ وہ رندوے کے چہرے پر خراش ڈالتی ہوئی اس کی گرفت سے نکل گئی اور بان خموشی میں پھر چیخ پڑی، لیکن رندوے کے زوردار تھپڑ نے اسے زمین سے اٹھا کر پل بھر کو وامیں معلق کر دیا اور اس کے میدو مایہ سے لمبے بال ہوا میں لہرا گئے۔ اس سے پیشتر کہ اس کے اوڑں پھر سے زمین پکڑتے، رندوے نے اسے کمرے پکڑ کر ایک ہیمنہ بھنکنے کے ساتھ جھولنے میں گرا دیا اور اپنے گھٹنوں سے جکڑ لیا۔ پھر ارندرا پر دبشت غالب آ گئی اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ اس کی ایسی حالت ہو گئی جیسے طوفانی ہوا میں تیرتی ہوئی مچھلی سے نکلنے والی چاندکروں سے مسور ہو رہے گئی ہو۔ رندوے نے اس دوران ایک باقاعدہ طریقے کے مطابق اس کا لباس نوچتے کھسوٹتے ہوئے اسے عریاں کر دیا۔ یہ عمل وہ اس طرح کر رہا تھا گویا گھاس اکھیر رہا ہو۔ اس نے ارندرا کے باس کی دھتیاں اڑا دیں جو رنگ برنگی جھنڈیوں کی طرح ہوا کے دوش پر بکھر گئیں۔

جب گاؤں میں ارسندرا کے پیار کا مول چکانے والا کوئی شخص باقی نہ رہا، تو دادی نے اسے ٹرک میں بٹھایا اور اسمگلروں کی تلاش میں چل پڑی۔ انھوں نے یہ سفر ٹرک کے کھلے ہونے سے چھپا کر چلا دیا اور چربی کی بالٹیوں کے درمیان طے کیا، جہاں آگ سے بچا کچھا سامان، جو شاہانہ مسہری کے سر ہانے، ایک جھنجھو فرشتے، جھلے ہوئے تخت اور بے کار کاٹھ کباڑ پر مشتمل تھا، اس کے علاوہ تھا۔ دونوں امادیوں کی باقیات انھوں نے ایک ٹرک میں رکھ چھوڑی تھیں جس پر دو بھدتی سی صلیبیں بنی تھیں۔

دادی نے ایک پھٹی پرانی چھتری کے ذریعے اپنے آپ کو دھوپ سے بچا رکھا تھا۔ گو پسیسے اور گرد کے باعث اس کے لیے سانس لینا بھی دشوار تھا لیکن اس ناخوشگوار حالت میں بھی وہ اپنا وقار بحال رکھے ہوئے تھی۔ ڈبوں اور چاول کی بوریوں کے ڈھیر کے چپھے ارسندرا بیس پیسوفی باری کے حساب سے ٹرک کے لوڈز کو سفر اور بار برداری کی ادائیگی کر رہی تھی۔ پہلے پہل اس کا دفاعی نظام ویسا ہی تھا جیسا اس نے رنڈوس کے حملے کے خلاف استعمال کیا تھا، لیکن لوڈز کی رسائی مختلف تھی، دھیمی اور دانش مندانہ۔ اس کی نرمی نے ارسندرا کو رام کر لیا تھا۔ سوا ایک جان لیوا سفر کے بعد جب وہ پہلے شہر میں پہنچے تو ارسندرا اور لوڈز سامان کی منڈیر کے چپھے ایک سیرکن مباشرت کے بعد ستر رہے تھے۔

ڈرائیور نے چلا کر دادی سے کہا:

"یہ وہ جگہ ہے جہاں سے دنیا شروع ہوتی ہے۔"

دادی نے بے یقینی سے خستہ و خراب اور تنہا گلیوں کو دیکھا۔ یہ شہر کسی حد تک بڑا تھا، لیکن اتنا ہی اداس جتنا کہ وہ چھوڑ آئے تھے۔

"مجھے تو ایسا نہیں لگتا،" اس نے کہا۔

"یہ مبغلوں کا علاقہ ہے،" ڈرائیور نے بتایا۔

"مجھے خیرات سے نہیں، اسمگلروں سے دلچسپی ہے،" دادی بولی۔

سامان کے عقب سے مکالمہ سنتی ہوئی ارسندرا نے چاول کی ایک بوری کو انگلی سے کرایا۔ اچانک اس کے ہاتھ ایک ڈوری آگئی۔ اس نے اسے کھینچا تو نیچے سے سچے موتیوں کا بار نکل آیا۔ وہ اسے اپنی انگلیوں کے درمیان ایک مردہ سانپ کی طرح تھامے حیرانی سے دیکھا کی۔ ڈرائیور اس کی دادی کو جواب دے رہا تھا:

"دن میں خواب مت دیکھو، خاتون۔ اسمگلر نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔"

"یقیناً نہیں،" دادی نے کہا۔ "مجھے تمہاری زبان پر اعتبار ہے۔"

"ڈھونڈنے کی کوشش کرو، تمہیں خود پتا چل جائے گا،" ڈرائیور نے شیخی بگھاری۔
 "اسمگلروں کی بات ہر شخص کرتا ہے لیکن آج تک کسی نے ایک بھی اسمگلر نہیں دیکھا۔"

لوڈر نے محسوس کر لیا کہ ارنندرا نے بار نکالا ہے، سو اس نے جلدی سے بار اس سے لے کر دوبارہ بوری میں چھپا دیا۔ دادی نے، جو قصبے کی غربت کے باوجود یہاں ٹھہرنے کا فیصلہ کر چکی تھی، اپنی پوتی کو آواز دی کہ ٹرک سے اترنے میں اس کی مدد کرے۔ ارنندرا نے لوڈر کو ہوسہ دیتے ہوئے، جو تعمیلی لیکن بے ساختہ اور سچا تھا، الوداع کہی۔

انھوں نے جب تک سامان اُتارنے کا کام مکمل کیا، دادی سرٹک کے وسط میں اپنے تخت پر بیٹھی انتظار کرتی رہی۔ آخری مداما دیوں کی باقیات والا ٹرک تھا۔

"اس کا وزن تو مَرے ہوئے آدمی جتنا ہے،" ڈرائیور نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اس میں ایک نہیں، دو ہیں،" دادی نے کہا۔ "لہذا انھیں مناسب احترام دو۔"

"میں شرط لگاتا ہوں کہ دونوں سنگ مرمر کے مجھے ہیں،" ڈرائیور دوبارہ ہنسا۔

اس نے باقیات والا ٹرک بے پروائی سے جھلے ہوئے فرنیچر کے درمیان رکھ دیا اور اپنا مٹھلہ ہوا ہاتھ دادی کے آگے بڑھایا۔

"پچاس پیسو،" اس نے کہا۔

"تمہارا ملازم پہلے ہی دائیں ہاتھ پر وصولی کر چکا ہے۔"

ڈرائیور نے اپنے مددگار کو حیرانی سے دیکھا جس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ڈرائیور ٹرک کے کیمپ میں واپس چلا گیا جہاں ماتمی لباس میں ایک عورت گود میں بچہ لیے بیٹھی تھی جو گرمی سے بلبل رہا تھا۔ لوڈر نے بڑے پُر اعتماد لہجے میں دادی سے کہا:

"اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ارنندرا میرے ساتھ چل رہی ہے۔ میرے ارادے نیک ہیں۔"

لڑکی نے حیرت زدہ ہو کر مداخلت کی:

"میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کہی!"

"یہ سراسر میرا پتا خیال تھا،" لوڈر نے کہا۔

دادی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا، تحقیر سے نہیں بلکہ اس کی جرأت کا اندازہ کرنے کے لیے۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں،" اس نے لوڈر کو بتایا۔ "بشرطے کہ تم اس کی غفلت سے ہونے والے نقصان کا ازالہ کر دو۔ کل رقم آٹھ لاکھ ہتھ بزار تین سو پندرہ پیسو ہے، جس میں سے

پار سو بیس، جن کی ادائیگی یہ کر چکی ہے، منہا کرنے کے بعد آٹھ لاکھ اکھتر ہزار آٹھ سو پچانوٹ پیسہ باقی ہیں۔"

ڈرائیور نے ٹرک اسٹارٹ کر دیا۔

"یقین کیجیے اگر میرے بس میں ہوتا تو یہ ڈھیر ساری رقم آپ کو ضرور دے دیتا،" لوڈر نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ لڑکی اس لائق ہے۔"

دادی کو لڑکے کے فیصلے سے خوشی ہوئی۔

"اچھا، تو پھر تمہارے پاس جب اتنی رقم ہو تب آنا،" اس نے ہمدردانہ لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن بہتر یہ ہے کہ اب تم چلے جاؤ، کیوں کہ اگر ہم پھر حساب کتاب کریں تو تمہیں دس پیسہ دینے پڑیں گے۔"

لوڈر ٹرک کے عقبی حصے میں کود گیا اور ٹرک چل پڑا۔ اس نے ٹرک میں سے اریندر کا الوداع بھی لیکن وہ ابھی تک اتنی حیران تھی کہ اس نے جواب نہ دیا۔

زمین کے اسی خالی کمرے پر جہاں ٹرک نے انہیں چھوڑا تھا، اریندر اور اس کی دادی نے رہنے کے لیے، جستی چادروں اور قالین کے پچھلے کمرے سے ایک چھپر کھڑا کر لیا۔ انہوں نے زمین پر دو چٹائیاں بچھا دیں اور اتنی ہی اچھی نیند سونگئیں جتنی کہ حویلی میں سوتی تھیں، یہاں تک کہ دھوپ کی شدت نے چھت میں سوراخ کر دیے اور ان کے چہرے جلانے لگی۔

عام طور پر جو معمول تھا اس کے بالکل برعکس، دادی اس صبح خود اریندر کے بناؤ سنگھار میں مشغول ہو گئی۔ اس نے اریندر کا چہرہ ضربی حسن کی طرز پر سنوارا جو اس کی جوانی کے دنوں کا رواج تھا۔ اسے مصنوعی ناخنوں اور ارگنڈمی بو سے مزین کیا جو اس کے سر پر ایک تسلی کی طرح نظر آتی تھی۔

"تم بہت عجیب لگ رہی ہو،" اس نے تسلیم کیا۔ "لیکن یہی بہتر ہے: مرد نسوانی معاملات میں بالکل احمق ہوتے ہیں۔"

انہیں دیکھنے سے بہت پہلے ان دونوں نے صحرا کے پتھروں پر دو چٹروں کے پلنے کی آواز پہچان لی تھی۔ دادی سے ہدایت ملنے پر اریندر اچٹائی پر اس طرح دراز ہو گئی جیسے کوئی نئی اداکارہ اس لمحے ہوتی جب پردہ اٹھنے والا ہوتا۔ اپنے پادری کے عصا کے سہارے دادی چھپر سے باہر آئی اور تخت پر بیٹھ کر چٹروں کے گزرنے کا انتظار کرنے لگی۔

ڈاکیا آ رہا تھا۔ وہ صرف بیس سال کا تھا، لیکن اس کے کام نے اسے معمر بنا دیا تھا۔ وہ خاک کی وردی، ساق پوش اور پودوں کے خشک گودے سے بنا بیلٹ پہنے ہوئے تھا اور اس کی کار تو سوں

والی بیٹی میں ایک فوجی پستول لگا تھا۔ وہ ایک توانا چتر پر سوار تھا اور ایک دوسرے خچر کی، جو زیادہ کار یافتہ تھا اور جس پر کینوس کے ڈاک تھیلے لدے تھے، رسی تھامے ہوئے تھا۔

اس نے دادی کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے سلام کیا اور اپنی راہ چلتا گیا۔ لیکن دادی نے اسے چتر میں جھانکنے کا اشارہ کیا۔ وہ رکا اور ارندرا کو گزرے زمانوں کے سنگھار اور غنائی گوٹ دار لباس میں چٹائی پر دراز دیکھا۔

"پسند ہے؟" دادی نے پوچھا۔

اس وقت تک ڈاکیا سمجھا نہیں تھا کہ تجویز کیا ہے۔

"پریر پر رہنے والے کے لیے خیال برا نہیں ہے،" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پچاس پیسو،" دادی نے کہا

"مائی۔ تم تو پوری کمال مانگ رہی ہو!" اس نے کہا۔ "اس رقم سے میں پورا مہینا گزار سکتا

ہوں۔"

"کنبوسی مت کرو،" دادی نے کہا۔ "ہوائی ڈاک میں تو پادری سے بھی زیادہ تنخواہ ملتی

ہے۔"

"میں مقامی ڈاک میں ہوں،" اس نے کہا۔ "ہوائی ڈاک والا آپ میں سفر کرتا ہے۔"

"بہر حال، پیار بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنی کہ غذا،" دادی نے کہا۔

"لیکن اس سے پیٹ نہیں بھرتا۔"

دادی کو احساس ہو گیا کہ اس شخص کے پاس، جو اپنی روزی دوسروں کے انتظار سے کھاتا

ہے، سودے بازی کے لیے ضرورت سے زیادہ وقت ہے۔

"تمہارے پاس کتنی رقم ہے؟" اس نے پوچھا۔

ڈاکیا خچر سے اترا اور جیب سے کچھ مڑے مڑے نوٹ نکال کر دادی کو دکھائے۔ اس نے

سب کے سب نوٹ سرعت سے اس طرح جھپٹ لیے جیسے وہ کوئی گیند ہوں۔

"میں تمہارے لیے قیمت گھٹا دوں گی،" وہ بولی۔ "لیکن ایک شرط ہے: تم یہ خبر چاروں

طرف پھیلانے دو گے۔"

"دنیا کے پر لے سرے تک!" ڈاکیا نے کہا۔ "اپنا تو کام یہی ہے۔"

ارندرا نے، جو پکلیں جھپکانے کے بھی قابل نہ تھی، اپنی مصنوعی پکلیں اتاریں اور اپنے

اتفاقی محبوب کو جگہ دینے کے لیے چٹائی پر ایک طرف کو سرک گئی۔ وہ جوں ہی چپیر میں داخل ہوا،

دادی نے پھسلوان پردہ زور سے کھینچ کر راستہ بند کر دیا۔

یہ ایک موثر سودا تھا۔ ڈاکیے کی پھیلائی ہوئی خبر کی بدولت لوگ ارندرا کے منے پن سے واقف ہونے کے لیے دُور دُور سے آنے لگے۔ ان کے پیچھے پیچھے جوئے کی میزیں اور کھانے کے اسٹال آئے اور ان سب کے پیچھے ایک بائیکل سوار فوٹو گرافر، جس نے پڑاؤ کے دوسری طرف جھیل اور بے روح بظوں کے پس منظر اور ایک ماتمی آستین کے ساتھ تپائی پر کیرا سجالیا۔

اپنے تخت پر بیٹھی پیکھا ہلاتی ہوئی دادی خود اپنی دکان سے بیگانہ نظر آتی تھی۔ اسے اگر کسی بات سے دلچسپی تھی تو صرف اپنی باری کے منظر گاہکوں کی قطار میں نظم و ضبط قائم رکھنے اور اس رقم کی پڑمال سے جو ارندرا کے پاس جانے کے لیے وہ پیشگی ادا کرتے تھے۔ وہ پہلے پہل اتنی سخت گیر تھی کہ اس نے ایک اچھے خاصے گاہک کو صرف پانچ پیسہ کم ہونے کی وجہ سے ٹوٹا دیا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ محتاق سے سمجھوتا کرنے لگی اور آخر کار ایسے لوگوں کو بھی اجازت دینے لگی جو اپنی اداسی مڈھی تمغوں، خاندانی یادگاروں، شادی کی انگوٹھیوں اور کسی بھی ایسی چیز سے پوری کرتے تھے جسے اس کے دانتوں کی کاٹ خالص سونا ثابت کرتی، چاہے اس میں چمک کا فقدان ہی کیوں نہ ہو۔

پہلے قصبے میں طویل قیام کے بعد دادی کے پاس کافی رقم آگئی۔ سو اس نے ایک گد خرید لیا اور تاوان کی ادائیگی کے لیے زیادہ سازگار مقامات کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ وہ گد سے کے اوپر رکھی گئی ایک ڈولی میں، جو ہاتھ کے ہاتھ بنائی گئی تھی، سفر کر رہی تھی، اور ساکت وصامت سورج سے اس آدھی تیلیوں والی چترمی کے ذریعے محفوظ تھی جسے ارندرا نے اس کے سر پر سنبھال رکھا تھا۔ ان کے عقب میں چار انڈین خدمت گار چل رہے تھے جنہوں نے پڑاؤ کی پچی کچی چیزیں، جو سونے کی چٹائیوں، بحال شدہ تخت، سنگ جراثیم کے فرشتوں اور امادیوں کی باقیات والے ٹرنک پر مشتمل تھیں، اٹھا رکھی تھیں۔ اس قافلے کے پیچھے پیچھے ذرا فاصلے سے، بائیکل سوار فوٹو گرافر اس طرح آ رہا تھا گویا کسی اور جشن میں جا رہا ہو۔

جب دادی اپنے کاروبار کی مکمل صورت حال سمجھنے کے قابل ہوئی تو آگ لگنے کے واقعے کو چمداہ گزر چکے تھے۔

"اگر معاملات اسی طرح چلتے رہے،" اس نے ارندرا کو بتایا، "تو آٹھ سال، سات ماہ اور گیارہ دن کے اندر اندر تم تاوان ادا کر چکی ہوگی۔"

بند آنکھوں کے ساتھ دانے ٹٹولتے ہوئے، جنہیں وہ رقم والی تھیلی میں رکھتی تھی، اس نے دوبارہ حساب لگایا اور اپنی تصحیح کرتے ہوئے بولی:

"اس میں بلاشبہ نوکروں کی تنخواہ، خوراک اور دوسرے چھوٹے موٹے خرچ شامل نہیں

ہیں۔"

گرد اور تمازت سے بے حال ارندرا نے، جو گدھے کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی، ان اعداد و شمار پر دادی کو ملامت نہیں کی، لیکن اپنے آنسو مشکل ہی سے روک پائی۔

"میری بڈیوں میں جیسے پسا ہوا شیشہ بھر گیا ہے،" اس نے کہا۔
"سو نے کی کوشش کرو۔"

"اچھا دادی۔"

اس نے آنکھیں موند کے جھلکاتی ہوئی ہوا کا گھبراہٹ لیا اور نیند میں چلتی گئی۔

افتح کی گرد میں بکریوں کو ڈراتا ہوا، پنہروں سے لدا ایک چھوٹا ٹرک نمودار ہوا، اور سان میگل دیل دیزیر تو کے قصبے کی اتواری خوابیدگی کے لیے پرندوں کی چکار ٹھنڈے پانی کا چھینٹا بن گئی۔ اسٹیرنگ پر ایک لمیم سیم ولندیزی کسان بیٹھا تھا جس کی جلد پر بیرون در رہنے کے اثرات واضح تھے۔ اس کی مونچھوں کا رنگ، جو کسی جد امجد کا ورثہ تھیں، گلہری جیسا تھا۔ اس کا بیٹا یولی رس جو دوسری سیٹ پر بیٹھا تھا، ایک سنہری رنگت والا نوجوان تھا جس کی آنکھیں سمندر کی طرح اور شبابت کسی کائیاں فرشتے جیسی تھیں۔ ولندیزی کی توجہ ایک خیمے نے اپنی طرف کھینچی جس کے سامنے مقامی محافظ دستے کے تمام سپاہی اپنی اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ وہ دین در دین منتقل ہوتی ہوئی ایک ہی بوتل سے پی رہے تھے۔ ان کے سروں پر بادام کی شاخیں تھیں جیسے وہ لڑائی کے لیے کیو فلاڑ کی حالت میں ہوں۔ ولندیزی نے اپنی زبان میں پوچھا:

"ارے، اس خیمے میں کیا بک رہا ہے؟"

"ایک عورت،" اس کے بیٹے نے بالکل فطری انداز میں جواب دیا۔ "اس کا نام ارندرا

ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟"

"صہرا میں ہر شخص کو معلوم ہے،" یولیس نے جواب دیا۔

ولندیزی نے شہر کے چھوٹے سے ہوٹل پر ٹرک روکا اور نیچے اتر آیا۔ یولیس ٹرک میں بیٹھا رہا۔ اس نے سبک دستی سے بریف کیس کھولا جو اس کا باپ سیٹ پر چھوڑ گیا تھا، اور نوٹوں کا ایک بندل نکالتے ہوئے بہت سے نوٹ اپنی جیب میں ٹھونس لیے۔ پھر اس نے ہر چیز کو اسی طرح رکھ دیا جیسی کہ تھی۔ اس رات جب اس کا باپ سو رہا تھا، وہ ہوٹل کی کھڑکی سے کودا اور

اریندرا کے خیسے کے سامنے قطار میں کھڑا ہونے چلا گیا۔

رنگ رلیاں اپنے عروج پر تھیں۔ مدہوش رنگروٹ آپ ہی آپ ناچ رہے تھے کہ مفت کی موسیقی صانع نہ ہو، اور فوٹو گرافر میکینیشیم پیپر کی مدد سے شبینہ تصویریں بنا رہا تھا۔ اسے کاروبار کی نگرانی کرتی ہوئی دادی نے گود میں پڑے ہوئے نوٹوں کو گنا اور مساوی ڈیسریوں میں تقسیم کرتے ہوئے ایک ٹوکری میں رکھ دیا۔ اس وقت صرف بارہ سپاہی تھے لیکن شام کی قطار شہری گاہکوں کی وجہ سے بڑھ گئی تھی۔ یولیس قطار کے آخری سرے پر تھا۔

یہ ایک بہت بد بیست سپاہی کی باری تھی۔ دادی نے، نہ صرف یہ کہ اس کا راستا مسدود کر دیا بلکہ اس کی رقم کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔

"نہیں بیٹا،" اس نے سپاہی کو بتایا۔ "تم دنیا بھر کا سونا لے آؤ تب بھی اندر نہیں جا سکتے۔ تم بد شگون ہو۔"

سپاہی، جس کا تعلق ان علاقوں سے نہیں تھا، حیران رہ گیا۔
"کیا مطلب؟"

"تمہارے ساتھ بدی کے سائے ہیں،" دادی نے کہا۔ "آدمی کو صرف تمہارے چہرے پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔"

دادی نے ہاتھ کے اشارے سے، اسے جھوٹے بغیر، رخصت کر دیا اور اگلے سپاہی کے لیے راستا چھوڑ دیا۔

"سیدھے اندر جاؤ، خوش صورت!" دادی نے خوش طبعی سے کہا۔ "لیکن زیادہ دیر مت لگانا۔ تمہارے ملک کو تمہاری ضرورت ہے۔"

سپاہی اندر گیا لیکن اُلٹے پاؤں واپس آ گیا کیوں کہ اریندرا دادی سے بات کرنا چاہتی تھی۔ اس نے رقم کی ٹوکری اپنے بازو پر لٹائی اور خیسے کے اندر چلی گئی، جو زیادہ کشادہ تو نہیں، لیکن صاف ستھرا ضرور تھا۔ عقبی حصے میں اریندرا ایک فوجی چارپائی پر لیٹی اپنے بدن کی لکچا ہٹ پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ سپاہیوں کے پسینے میں لتھڑی ہوئی وہ بڑی افسوس ناک حالت میں تھی۔

"دادی!" اس نے سسکی بھری۔ "میں مر رہی ہوں۔"

دادی نے اس کی پیشانی کو جھوا اور جب اس نے دیکھا کہ اسے بخار نہیں ہے تو تسلی دینے کی کوشش کی۔

"صرف دس سپاہی رہ گئے ہیں،" اس نے کہا۔

ارندرا نے کسی خوف زدہ جانور کی طرح چیختے ہوئے رونا شروع کر دیا۔ تب داوی کو احساس ہوا کہ وہ دہشت کی حدوں سے گزر چکی ہے۔ اس نے ارندرا کا سر تھپتھپاتے ہوئے اسے چپ کرایا۔

"مشکل یہ ہے کہ تم کمزور ہو،" اس نے کہا۔ "چھوڑو بھی، اب چلاؤ مت۔ بوٹی والے پانی سے نہالو، تمہارے خون کی گردش بحال ہو جائے گی۔"

ارندرا چُپ ہوئی تو داوی خیسے سے باہر آئی، اور منتظر سپاہی کو اس کی رقم لوٹا دی۔ "آج کا وقت ختم ہو گیا،" اس نے سپاہی کو بتایا۔ "کل آنا، میں تمہیں قطار میں پہلی جگہ دوں گی۔" پھر وہ قطاروں میں کھڑے لوگوں پر چلائی:

"بس لڑکو، کل صبح نو بجے۔"

سپاہیوں اور شہریوں نے احتجاجاً چیختے چلاتے ہوئے قطاریں توڑ دیں۔ داوی نے خوش مزاجی سے ان کا سامنا کیا، لیکن وہ اپنا خوفناک عصا سنبیدگی سے لہرا رہی تھی۔

"تم خود غرض گنواروں کا ایک ٹولا ہو!" وہ چلائی۔ "تمہارے خیال میں یہ لڑکی کس چیز کی بنی ہوئی ہے، لوہے کی؟ تم اس کی جگہ ہوتے تو میں دیکھتی۔ بے راہ رو! غلیظ آوارہ گردو!"

لوگوں نے اسے جواباً آور بھی بھونڈی گالیاں دیں لیکن وہ بغاوت پر قابو پانے میں کامیاب رہی، اور اپنی لاٹھی کے ساتھ اس وقت تک نگرانی کرتی رہی جب تک وہ کھانے کی میزیں اور جوئے کے اسٹال اٹھا کر نہ لے گئے۔ وہ خیسے میں واپس جانے ہی کو تھی کہ اس کی نظر یولیس پر پڑی، جو اس تاریک اور خالی جگہ پر پورے قد سے اکیلا کھڑا تھا جہاں ابھی ابھی لوگوں کی قطار تھی۔ اس کے گرد ایک غیر حقیقی بالہ تھا اور اپنے جمال کی دنگ کے باعث وہ سایوں میں بھی مری لگ رہا تھا۔

"تم!" داوی نے اس سے پوچھا۔ "تمہارے پروں کو کیا ہوا؟"

"پروں والا میرا دوا تھا،" یولیس نے اپنے فطری انداز میں جواب دیا۔ "لیکن کوئی اس بات پر یقین نہیں کرتا۔"

داوی نے اسے دوبارہ سر سے پاؤں تک گرویدگی سے دیکھا۔ "خیر، مجھے یقین ہے،" وہ بولی۔ "کل پر لگا کر آنا۔" وہ یولیس کو وہیں تڑپتا چھوڑ کر خیسے میں چلی گئی۔

خشل کے بعد ارندرا بستر ممس کرنے لگی تھی۔ اس نے ایک چھوٹا سا گوٹ دار جاگلیا پس رکھا تھا اور سونے سے قبل اپنے بال خشک کر رہی تھی، لیکن ابھی تک آنسو پینے کی کوشش میں تھی۔ اس کی داوی سو رہی تھی۔

ارندرا کے بستر کے پیچھے، بہت آہستگی سے یولیس کا سر نمودار ہوا۔ اس نے شفاف اور

منکر آنکھیں دیکھیں، لیکن کچھ بولنے سے پہلے، یہ یقین کرنے کے لیے کہ یہ فریب نظر نہیں، اپنے سر کو تولیے سے رگڑا۔ جب یولیس نے پہلی بار پلکیں جھپکائیں، ارندرا نے بہت دھیمی آوازیں پوچھا:

"تم کون ہو؟"

یولیس نے اپنے آپ کو کندھوں تک اٹھایا۔ "میرا نام یولیس ہے،" اس نے کہا۔ اس نے ارندرا کو اپنے چُرائے ہوئے نوٹ دکھائے، اور بولا:

"میرے پاس پیسے ہیں۔"

ارندرا نے اپنے ہاتھ بستر پر رکھے اور اپنا چہرہ اس کے قریب لاتے ہوئے اس طرح باتیں کرنے لگی گویا کوئی بچوں کا کھیل کھیل رہی ہو۔

"تمہیں قطار میں کھڑا ہونا چاہیے تھا،" اس نے یولیس سے کہا۔

"میں نے رات بھر انتظار کیا ہے،" یولیس بولا۔

"اچھا، اب تمہیں کل تک انتظار کرنا ہوگا،" ارندرا نے کہا۔ "مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی میرے گردوں پر ضربیں لگاتا رہا ہے۔"

عین اسی لمحے دادی نے نیند میں بولنا شروع کر دیا۔

"بارش ہوے بیس سال ہونے کو ہیں،" وہ کہنے لگی۔ "ایسا بولناک طوفان تھا کہ بارش اور سمندر کا پانی یک جا ہو گیا تھا، اور اگلی صبح سارا گھر مچھلیوں اور گھونگھوں سے بھرا ہوا تھا، تمہارے دادا کو۔۔۔ ان پر خدا کی رحمتیں ہوں۔۔۔ ہوا میں تیرتی ایک دھمکتی ہوئی کرن دکھائی دی۔"

یولیس پھر سے بستر کے پیچھے چھپ گیا۔ ارندرا دلچسپی سے مسکراتے لگی۔

"گھبراؤ نہیں،" اس نے کہا۔ "دادی سوتے میں ہمیشہ دیوانوں کی سی حرکتیں کرتی ہے، لیکن اس کی نیند میں زلزلہ بھی خلل نہیں ڈال سکتا۔"

یولیس دوبارہ سامنے آ گیا۔ ارندرا نے اسے شرارت بھری مسکراہٹ سے، جس میں قدرے پیار بھی تھا، دیکھا اور گدے پر سے مٹکی چادر بٹانے لگی۔

"آؤ،" اس نے کہا۔ "چادر بدلنے میری مدد کرو۔"

یولیس بستر کے پیچھے سے نکلا اور چادر کا ایک سر اٹھام لیا۔ چوں کہ چادر گدے سے کافی بڑی تھی لہذا انہیں اس کو کئی بار تہ کرنا پڑا۔ وہ ہر تہ کے ساتھ ارندرا کے قریب ہوتا گیا۔

"میں تمہیں دیکھنے کو پاگل ہوا جا رہا تھا،" وہ اچانک بولا۔ "سب لوگ کہتے ہیں تم بہت حسین ہو۔ ان کا کہنا بالکل ٹھیک ہے۔"

"لیکن میں تو مری جا رہی ہوں،" ارندرا نے کہا۔
 "سیری ماں کھتی ہے صحرا میں مرنے والے آسمان پر نہیں بلکہ سمندر میں جاتے ہیں،"
 یولیس نے کہا۔

ارندرا نے گندی چادر ایک طرف رکھ دی اور گدے پر نئی چادر بچھا دی جو ابلی اور استری
 کی ہوتی تھی۔

"میں نے سمندر کبھی نہیں دیکھا،" وہ بولی۔
 "صحرا جیسا ہوتا ہے لیکن پانی کے ساتھ،" یولیس نے بتایا۔
 "تب تو اس پر چلا نہیں جاسکتا۔"

"میرے ابا ایک آدمی کو جانتے تھے جو چل سکتا تھا،" یولیس نے کہا۔ "لیکن یہ بات بہت
 پرانی ہے۔"

ارندرا مسرور ہو چکی تھی، لیکن اسے نیند آرہی تھی۔
 "اگر تم کل بہت جلدی آؤ تو قطار میں سب سے آگے ہو سکتے ہو،" اس نے کہا۔
 "میں صبح صبح ابا کے ساتھ جا رہا ہوں،" یولیس نے بتایا۔
 "واپسی پر اس راستے سے نہیں گزر دو گے؟"
 "کون جانے؟" یولیس نے کہا۔ "ہم تو صرف سرحد والی سرکل سے بھٹک کر یہاں آ
 گئے۔"

ارندرا نے کچھ سوچتے ہوئے اپنی خوابیدہ وادی کو دیکھا۔
 "اچھا،" وہ یک سو ہو گئی۔ "لاؤ، پیسے نکالو۔"
 یولیس نے اسے رقم تھما دی۔ ارندرا بستر پر لیٹ گئی لیکن وہ جہاں کھڑا تھا وہیں کانپتا
 رہا؛ فیصلہ کن لمحے میں اس کا عزم جواب دے گیا تھا۔ ارندرا اس کے میجان اور پریشانی کو اسی
 وقت محسوس کر سکی جب اس نے یولیس کو باتھ سے پکڑ کر اکسانا چاہا۔ وہ اس خوف سے واقف
 تھی۔

"کیا یہ پہلی بار ہے؟" اس نے پوچھا۔
 یولیس نے جواب نہیں دیا لیکن اداسی سے مسکرایا۔ ارندرا ایک مختلف لڑکی بن گئی۔
 "آہستہ آہستہ سانس لو،" اس نے یولیس سے کہا۔ "پہلی بار ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس
 کے بعد تم محسوس بھی نہیں کرو گے۔"
 اس نے یولیس کو اپنے برابر لٹا لیا اور اس کے کپڑے اتارنے کے دوران مادرانہ طور سے

اس کی دہبونی کرتی رہی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"یولیس۔"

"یہ تو بدیسی نام ہے،" ارندرا نے کہا۔

"نہیں، ملجائی نام ہے۔"

ارندرا نے اس کا سینہ کھولا اور چند چھوٹے چھوٹے اکھڑے ہوئے بوسے دیتے ہوئے اسے سو گھما۔

"ایسا لگتا ہے جیسے تم سارے کے سارے سونے کے بنے ہو،" اس نے کہا۔ "لیکن تم سے پھولوں کی مہک آتی ہے۔"

"مالٹوں کی ہوگی،" یولیس نے کہا۔

وہ اب نسبتاً مطمئن تھا اور اس کی مسکراہٹ ساز باز کی غماز تھی۔

"لوگوں کو غلط تاثر دینے کے لیے ہم بہت سارے پرندے لیے پھرتے ہیں،" اس نے سلسلہ جاری رکھا۔ "لیکن حقیقت میں ہم مالٹوں کی کھسپ سرحد پار اسمگل کر رہے ہیں۔"

"مالٹوں پر تو پابندی نہیں ہے،" ارندرا نے کہا۔

"ہمارے مالٹوں پر ہے،" یولیس نے کہا۔ "ایک ایک پچاس ہزار پیسو کا ہے۔"

ارندرا کافی دیر بعد پہلی بار ہنسی۔

"تم لغویات کو بھی سنجیدہ بنا دیتے ہو۔ تمہاری یہ بات مجھے پسند ہے،" اس نے کہا۔

وہ پھر سے بے ساختہ اور باتونی ہو گئی تھی، جیسے یولیس کی معصومیت نے اس کا مزاج ہی نہیں کردار بھی بدل ڈالا ہو۔ دادی جو بد بختی سے قدم بھر کے فاصلے پر تھی، نیند میں اب تک بول رہی تھی۔

"اسی زمانے کے آس پاس، مارچ کی ابتدا میں، وہ تمہیں گھر لے آئے،" وہ بولی۔ "تم روٹی میں لپٹی ہوئی چھپکلی لگ رہی تھیں۔ تمہارا نوجوان اور خوب صورت باپ لادیس اس سہ پہر اتنا خوش تھا کہ اس نے پھولوں سے بھرے بیس چمکڑے منگوائے جو گلیوں میں پھول بکھراتے آئے حتیٰ کہ سارا گاؤں سمندر کی طرح پھولوں سے سنہرا ہو گیا۔"

وہ کئی گھنٹوں تک اسی طرح بیٹیلے جذبے کے ساتھ اونچی آواز میں بڑبانتی رہی۔ لیکن یولیس کچھ سننے سے قاصر تھا؛ ارندرا نے اسے اتنی افراط اور اتنی شدت سے پیار کیا تھا کہ اس نے، جب کہ دادی کی لہن ترانیاں جاری تھیں، آدھی قیمت کے عوض اسے پھر پیار کیا، اور صبح تک بے قیمت

پیار کرتی رہی۔

مبلغوں کی ایک جماعت مصلوب مسیح کے مجسے اٹھائے، کندھے سے کندھا ملانے صحرا کے وسط میں کھڑی تھی۔ ایک ٹندو تیز ہوا، جو غضب ناک میں بدبختی کی ہوا جیسی تھی، ان کے کھردرے لباس اور ناہموار وارمضیوں کو ہلارہی تھی اور وہ مشکل ہی سے اپنے پیروں پر کھڑے تھے۔ ان کے عقب میں تبلیغی مرکز تھا، جو نوآبادیاتی عہد کی ایک سنگی عمارت تھی، جس کی کھردری سفید دیواروں کے اوپر ایک چھوٹا سا گھنٹا گھر تھا۔

سب سے کم عمر مبلغ نے، جو اس جماعت کا نگران تھا، چمک دار چمکی زمین میں ایک قدرتی دراڑ کی طرف اشارہ کیا۔

"تم اس لکیر کے پار نہیں جاؤ گی!" اس نے چلا کر کہا۔

ان چار انڈین خدمت گاروں نے، جو تختوں کی بنی ہوئی ڈولی میں دادی کو اٹھائے ہوئے تھے، جب یہ صدا سنی تو ٹھہر گئے۔ اس کے باوجود کہ وہ ڈولی میں بے آرام تھی اور اس کی خوش دلی کو صحرا کی گرد اور پیسنے نے مڑجھا دیا تھا، اس کی تمکنت جوں کی توں تھی۔ ارندرا پیدل چل رہی تھی۔ ڈولی کے پیچھے سامان اٹھائے ہوئے آٹھ خدمت گاروں کی قطار تھی اور سب سے آخر میں اپنی بائیکل پر سوار فوٹو گرافر تھا۔

"صحرا کسی کی ملکیت نہیں ہے،" دادی نے کہا۔

"یہ خدا کی ملکیت ہے۔" مبلغ نے کہا۔ "اور تم اپنے گھناؤنے کاروبار سے اس کے مقدس قوانین کی خلاف ورزی کر رہی ہو۔"

تب دادی نے مبلغ کا مخصوص استعمال الفاظ اور اسلوب پہچان لیا اور اس کے کٹر پن سے بچنے کے لیے دُوبدو مقابلے سے گریز کیا۔ وہ اپنے آپ میں آگئی۔

"بیٹا، میں تمہارے اسرار سمجھی نہیں۔"

مبلغ نے ارندرا کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ لڑکی ابھی نئی ہے۔"

"لیکن یہ میری پوتی ہے۔"

"پھر تو آؤر بھی برا ہے،" مبلغ نے جواب دیا۔ "اے رضامندی سے ہماری نگرانی میں دسے دو، ورنہ ہمیں دوسرے ذرائع اختیار کرنے پڑیں گے۔"

دادی کو یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اس حد تک چلے جائیں گے۔

"اچھا، یہ بات ہے تو یوں ہی سہی،" اس نے خوف سے ہتھیار ڈال دیے۔ "لیکن دیکھ لینا، جلد یا بدیر، میں اسے پار کر جاؤں گی۔"

مبلغوں سے جھڑپ کے تین دن بعد دادی اور ارندرا تبلیغی مرکز کے نزدیک ایک گاؤں میں سو رہی تھیں کہ خفیہ اور خاموش بدنوں کا ایک گروہ کشتی سپاہیوں کی طرح ریگلتا ہوا ان کے خیمے میں در آیا۔ وہ نئے نئے عیسائی ہونے والے چھ نو عمر اور طاقت ور انڈین تھے۔ ان کے کھردرے لباس چاندنی میں دکھتے ہوئے لگ رہے تھے۔ کوئی آواز پیدا کیے بغیر انھوں نے ارندرا کو ایک پھر دانی سے ڈھانپ کر اسے جگائے بغیر اٹھالیا، اور چودھویں کی رات میں پکڑی ہوئی کسی بڑی اور نازک پھلی کی طرح لپیٹ کر لے گئے۔

اپنی پوتی کو مبلغوں کے تحفظ سے چھڑانے کے لیے دادی نے ہر ممکن ذریعہ آزمایا، اور جب راست ترین سے پیچیدہ ترین تک، تمام ذریعے ناکام ہو گئے تو اس نے شہری اقتدار سے، جو ایک فوجی میں مرکوز تھا، رجوع کیا۔ دادی نے اسے اپنے گھر کے آگن میں اس حال میں پایا کہ اس کا سینہ عریاں تھا اور وہ ایک گھنیرے اور اکیلے بادل پر فوجی رائفل بے گولیاں چلا رہا تھا۔ وہ اسے برسانے کے لیے اس میں سوراخ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے نشانے تند و تیز اور رائیگاں تھے، تاہم اس نے دادی کی بات سننے میں وقت لگایا۔

"میں کچھ نہیں کر سکتا،" دادی کی بات سن کر اس نے واضح کیا۔ "معاذے کے مطابق مبلغوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بلوغت تک لڑکی کو اپنے پاس رکھیں، یا اس وقت تک جب تک اس کی شادی نہ ہو جائے۔"

"تو پھر تم کس لیے میسر ہو؟" دادی نے پوچھا۔

"بارش برسانے کے لیے۔"

پھر یہ دیکھتے ہوئے کہ بادل اس کی زد سے ٹکل گیا ہے، اس نے اپنے سرکاری فرائض معطل کیے اور دادی پر پوری توجہ مرکوز کر دی۔

"تھیں کسی بااثر آدمی کی ضرورت ہے جو تمہارا صامن بن سکے،" اس نے دادی کو بتایا۔ "کوئی ایسا شخص جو دستخط شدہ خط کے ذریعے تمہاری اخلاقی حیثیت اور مناسب طرز عمل کی تصدیق کر سکے۔ تم سینیٹر اوانے سیموسا پنجر کو جانتی ہو؟"

دادی نے، جو اپنے فراخ کولہوں کی نسبت ایک بہت تنگ اسٹول پر بیٹھی تھی، طیش میں آکر جواب دیا:

"میں تو صحرا کی وسعت میں ایک بے کس تنہا عورت ہوں۔"

میسر نے، جس کی دائیں آنکھ دھوپ کی وجہ سے بھی ہوئی تھی، اسے ترخم سے دیکھا۔

"پھر اپنا وقت صنایع نہ کرو، خاتون۔ تم دوزخ کا ایندھن بن جاؤ گی۔"

مگر بلاشبہ ایسا نہیں ہوا۔ اس نے اپنا خیمہ تبلیغی مرکز کے سامنے لگایا اور کسی قلعہ بند شہر کا محاصرہ کرنے والے تنہا جنگجو کی طرح سوچنے بیٹھ گئی۔ جہاں گرد فوٹو گرافر، جو اسے اچھی طرح جانتا تھا، اپنا ساز و سامان سائیکل کے بار گیر پر لاڈ کر اکیلا رخصت ہونے کو تھا کہ اس نے دادی کو نصف الشہار کی دھوپ میں تبلیغی مرکز پر نظریں گاڑے دیکھا۔

"دیکھتے ہیں پہلے کون ٹھکتا ہے،" دادی نے کہا۔ "وہ یا میں!"

"وہ یہاں تین سو سال سے ہیں، اور ابھی مزید رہ سکتے ہیں،" فوٹو گرافر نے کہا۔ "میں جا رہا ہوں۔"

دادی نے اس وقت تک لدی ہوئی سائیکل پر توجہ نہیں کی تھی۔

سمہاں جاؤ گے؟"

"جہاں بھی ہوا لے جائے،" فوٹو گرافر نے جواب دیا اور چل پڑا۔ "دنیا بہت بڑی ہے۔"

دادی نے آہ بھری۔

"اتنی بڑی نہیں جتنی تم سمجھتے ہو، ناکٹر گزار۔"

لیکن غصے کے باوجود وہ اپنی جگہ سے ہلی نہیں، مبادا اس کی نظروں سے تبلیغی مرکز اوجھل ہو جائے۔ اس نے قیامت خیز گرمی کے بہت سے دن اور ٹھنڈ تیز ہواؤں کی بہت سی راتیں اسی کیفیت میں گزاریں۔ وہ ہمہ وقت سوچ بچار کر رہی تھی لیکن تبلیغی مرکز سے باہر کوئی نہیں آیا۔ خدمت گاروں نے خیمے کے برابر پام کے پتوں سے ایک جھینر سا بنا کر وہاں اپنے جھولنے ٹھالے، لیکن دادی تا دیر اپنے تخت پر بیٹھی آرام کرتے ہوئے بیل کی ناقابل شکست سستی کے ساتھ، اپنی تعمیلی میں سے دانے چباتے ہوئے نگرا فی کرتی رہی۔

ایک رات ڈھکے ہوئے ٹرکوں کا ایک ست رو کارواں، جن میں رنگین بلبوں کے حلقوں کے سوا کوئی اور روشنی نہ تھی، اس کے بہت قریب سے گزرا۔ رنگ برنگی مدہم روشنیوں نے ٹرکوں کو خواب خرام قربان گاہوں کی طلسماتی جسات دے رکھی تھی۔ دادی نے انہیں فوراً پہچان لیا کہ وہ بوہو لادیوں کے ٹرکوں کی طرح تھے۔ کارواں کا آخری ٹرک آہستہ ہو کر رکا اور کیمپ میں سے ایک آدمی عقب میں کوئی چیز ٹھیک کرنے اتر ا۔ وہ اوپر اٹھے ہوئے کناروں والا بیٹ اور اونچے بوٹ پہنے ہوئے تھا؛ اس کے سینے پر ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی کارتوسوں کی دو پٹیاں،

شانے پر فوجی رائفلیں، اور پہلوؤں پر دو پستول سجے تھے۔ اس وضع قطع میں وہ امادیوں کی یادگار لگ رہا تھا۔ ایک ناقابل مزاحمت تحریص سے مغلوب ہو کر دادی نے اسے پکارا۔
"جانتے ہو میں کون ہوں؟" دادی نے اس آدمی سے پوچھا۔

آدمی نے دادی کو بے رحمی سے فلیش لائٹ کی زد پر لے لیا۔ اس نے لمحہ بھر کو شب بیداری سے مرجھائے ہوئے چہرے، مکان سے ابھی ہوئی آنکھوں اور عورت کے خشک بالوں پر غور کیا، جو اپنے چہرے پر پڑتی ہوئی تندو تیز روشنی میں، اس عمر اور خشکی میں بھی، کہہ سکتی تھی کہ وہ دنیا کی حسین ترین عورت رہی ہے۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اس عورت کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تو اس نے فلیش لائٹ بجادی۔

"میں تو بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ تم دائمی مدد کی دیوی نہیں ہو۔"
"اس کے برعکس! دادی نے بے حد شیریں آواز میں جواب دیا۔ "میں بیگم ہوں۔"
آدمی نے محض جہلت سے مجبور ہو کر اپنا ہاتھ پستول پر رکھ لیا۔
"کون بیگم؟"

"بڑے امادیس کی بیگم۔"

"پھر تم اس دنیا کی نہیں ہو،" اس نے تناو کے ساتھ کہا۔ "چاہتی کیا ہو؟"
"میری پوتی، بڑے امادیس کی پوتی، ہمارے بیٹے امادیس کی بیٹی، اس تبلیغی مرکز میں قید ہے۔ اسے چھڑانے میں میری مدد کرو۔"
آدمی نے اپنے خوف پر قابو پا لیا۔

"تم نے غلط دروازے پر دستک دی ہے،" اس نے کہا۔ "اگر تم سمجھتی ہو کہ ہمارا ارادہ خدائی معاملات میں دخل دینے کا ہے، تو پھر تم وہ نہیں ہو جس کا دعویٰ کرتی ہو؛ تم امادیوں کو جانتی ہی نہیں ہو اور اسمگلنگ کے بارے میں تمہیں خاک بھی نہیں معلوم۔"

اس رات کی آخری ساعتوں میں دادی پہلے کی نسبت کم سوئی۔ وہ اونی کمبل میں لپیٹی، لیٹی ہوئی سوچ رہی تھی؛ رات کے پچھلے پہر نے اس کی یادوں کو گڈمڈ کر دیا تھا اور دبا ہوا ہڈیاں اس کی بیداری کے باوجود ابھرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس خوف سے کہ سمندر کے قریب بڑے بڑے سرخ پھولوں والے ایک مکان کی یاد، جہاں وہ خوش رہی تھی، اس کا دم نہ گھونٹ دے، اسے اپنے دل پر اپنے ہاتھوں سے زور ڈالنا پڑا۔ وہ اسی عالم میں رہی یہاں تک کہ تبلیغی مرکز کا گھنٹا بجنے لگا اور کھڑکیوں میں پہلی روشنیاں چمکنے لگیں اور صبح کی گرم خوشبو سے معمور ہو گیا۔ پھر اس وہم کے دام میں آ کر کہ اسے اندر بیدار ہو گئی ہے اور بچ نکل کر اس کے پاس آنے کا راستہ ڈھونڈ رہی ہے،

اس نے اپنی مشقت ترک کر دی۔

تاہم جب سے اسے تبلیغی مرکز میں لایا گیا تھا، ارندرا نے ایک شب کی بھی نیند صانع نہیں کی تھی۔ انھوں نے چھانٹنے والی قینچی سے اس کے بال تراش دیے تھے اور اس کا سر برش جیسا ہو گیا تھا۔ اسے گوشہ نشینوں کا کھردرا چوہہ پنا کر، سفیدی کی ایک ہالٹی اور جھاڑو دے دی گئی تھی کہ ہر آنے جانے والے کے بعد سیرٹھیوں پر سفیدی کرتی رہے۔ یہ کام جان لیوا تھا، کہ کپڑے میں لٹھرے مہلوں اور نو مہی حملوں کی آمدورفت مسلسل جاری رہتی تھی۔ لیکن اس ڈراونی کشتی کے بعد، جو اس کا بستر ہی تھی، ارندرا کو ہر دن اتوار لگتا تھا۔ علاوہ ازیں رات کو ٹھکن سے چور اکیلی وہی نہیں ہوتی تھی کیوں کہ تبلیغی مرکز شیطان کے خلاف نہیں، صمرا کے خلاف برسرِ پیکار تھا۔ وہ انڈین نو مہیوں کو اناج گھر میں گائیں دوہنے کے لیے انھیں قابو کرتے، پنیر بنانے کے لیے کئی کئی دن تختوں پر اچھلتے، بکریوں کو بچہ جتنے میں مدد کرتے دیکھ چکی تھی۔ اس نے انھیں سیاہ فام قلیوں کی طرح پسینا بہاتے ہوئے تالاب سے پانی لا کر ایک ایسے سنگلخ باغ کو سیراب کرتے دیکھا تھا جہے دوسرے نو مہی صمرا کی پتھر پٹی زمین میں سبزیاں کاشت کرنے کے لیے کھڑپوں سے تیار کرتے تھے۔ اس نے روٹیاں پکانے کے لیے تنوروں کا زمینی جہنم اور کپڑے استری کرنے کے کمرے دیکھے تھے۔ اس نے ایک راہب کو سوڑ کے تعاقب میں صحن میں دوڑتے ہوئے اور پھر اس کو کانوں سے پکڑے پکڑے پھسل کر کپڑے کے گڑھے میں گرتے دیکھا تھا؛ تاوقتے کہ چڑھے کے پیش بندوں والے دو نو مہیوں نے اس پر قابو پانے میں راہب کی مدد کی، اور ان میں سے ایک نے اس کے گٹے پر چھری پھیر دی اور وہ سب خون اور کپڑے میں لٹھر گئے۔ اس نے اسپتال کے علیحدہ حصے میں تپ دق کی مریض راہباؤں کو دیکھا تھا جو اپنے شبینہ چوٹوں میں، خدا کے آخری احکام کی منتظر، چبوتروں پر بیٹھی عروسی چادریں کا رشتی رہتی تھیں جبکہ مرد صمرا میں تبلیغ کیا کرتے تھے۔ ارندرا اپنے سایوں میں جی رہی تھی۔ وہ حسن و دبشت کی ایسی صورتیں دریافت کر رہی تھی جن کا اپنے بستر کی محدود دنیا میں اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن جس دن سے اسے تبلیغی مرکز میں لایا گیا تھا، نہ تو سب سے اکھڑاؤ نہ ہی سب سے مہذب نو مہی اسے بولنے پر آمادہ کر سکا تھا۔ ایک صبح، جب وہ ہالٹی میں سفیدی تیار کر رہی تھی، اس نے وائکن کی آواز سنی جو ایسے نور کی طرح تھی جو صمرا کی روشنی سے بھی زیادہ شفاف تھا۔ اس نے مسور ہو کر ننھی دیواروں اور بڑی بڑی کھڑکیوں والی ایک کٹادہ اور خالی بیمک میں جھانکا، جس میں آتی ہوئی جون کی خیرہ کن روشنی ساکت تھی۔ اس نے کمرے کے وسط میں ایک بہت خوبصورت راہب کو، جسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، کلاوی کورڈ پر ایسٹر کا غنائیہ بجاتے دیکھا۔ ارندرا کو محسوس ہوا جیسے اس کا دل کسی دھاگے سے معلق ہے۔ وہ

موت کے عالم میں سنتی رہی حتیٰ کہ دوپہر کے کھانے کی گھنٹی بج اُٹھی۔ کھانے کے بعد، اپنے ٹرسل کے برش سے سیرمعیوں پر سفیدی کرتے ہوئے، وہ منظر رہی یہاں تک کہ تمام نو مہینوں کی آدورفت ختم ہو گئی اور وہ بالکل تنہا ہو گئی اور اس کی آواز سننے والا کوئی نہ رہ گیا۔ تب اس نے تبلیغی مرکز میں داخل ہونے کے بعد سے پہلی بار اپنے لب کھولے۔

"میں خوش ہوں،" وہ بولی۔

سو اس طرح ان اُمیدوں کا خاتمہ ہو گیا جو وادی کو ارنندرا کے واپس آنے کے بارے میں تھیں۔ لیکن اس نے پینٹی کوٹ کے تھوار تک، کسی فیصلے پر بیٹھنے بغیر اپنا کڑا محاصرہ جاری رکھا۔ اس زمانے میں منیخ، حاملہ داشتاؤں کی تلاش میں، کہ ان کی شادیاں کرا سکیں، مصر کو چھان رہے تھے۔ وہ ایک ٹوٹے پھوٹے ٹرک میں چار مسلح سپاہیوں اور سستے کپڑے کے ایک صندوق کے ساتھ انتہائی دور دراز کی نوآبادیوں تک جاتے تھے۔ مہم کا مشکل ترین حصہ عورتوں کو قائل کرنا تھا، جو اپنے آپ کو خدائی کرم سے اس حقیقت پسندانہ دلیل کے ذریعے بھاتی تھیں کہ مرد، جو اپنے جھولنوں میں ٹانگیں چورٹی کیے سو رہے ہوتے تھے، یہ محسوس کرتے ہیں کہ انہیں داشتاؤں کی نسبت قانونی بیویوں سے زیادہ بیماری کا کم لینے کا حق حاصل ہے۔ منشاے اُپزوی کو ان کی اپنی زبان کے شد میں گھولتے ہوئے، کہ انہیں کم تلخ محسوس ہو، انہیں دھوکے سے بھولانا ضروری تھا۔ لیکن ان میں سے عینار ترین بھی چمک دار بالیوں کے جوڑے سے قائل ہو جاتی تھی۔ اس کے برعکس مردوں کو، جب ایک بار عورتوں کی رضامندی لے لی جاتی تھی، رانفل کے کندوں کے ذریعے جھولنوں سے اٹھا دیا جاتا اور ٹرک میں بٹھا کر جبری شادی کے لیے لے جایا جاتا تھا۔

دادی کئی دن تک حاملہ انڈین عورتوں سے بھرے چھوٹے ٹرک کو تبلیغی مرکز میں جاتے دیکھتی رہی، لیکن اپنا موقع پہچاننے میں ناکام رہی۔ اس نے اسے خاص پینٹی کوٹ سنڈے کے دن پہچانا، جب اس نے آتش بازی دیکھی اور بجتی ہوئی گھنٹیاں سنیں۔ شاداں و غم زدہ بہوم کو جن میں جاتے دیکھا، بہوم میں شامل دھنوں کے لباس میں حاملہ عورتیں دیکھیں جو اپنے اتفاقی ساتھیوں کے بازو تھامے ہوئے تھیں، جنہیں اجتماعی شادی میں ان کے جائز خاوند قرار دیا جانے والا تھا۔

جلوس کے آخری شرکامیں عیترٹوں میں ملبوس مخصوص انڈین طرز کے بالوں والا ایک سادہ لوح لٹکا گزرا، جس نے ریشی رہن میں ہندھی ایسٹر کی شمع اٹھا رکھی تھی۔ دادی نے اسے بلایا۔

"بیٹا، ایک بات تو بتاؤ،" اس نے انتہائی نرم آواز میں پوچھا۔ "اس معاملے میں تمہارا کردار کیا ہے؟"

لڑکے کو جلتی ہوئی شمع سے ڈر رہا تھا اور اپنے بڑے بڑے دانستوں کے باعث اسے منہ بند

کرنے میں مشکل ہو رہی تھی۔

"مجھے پہلا عشاءے رباتانی ملنے والا ہے،" اس نے کہا۔

"انھوں نے تمہیں کتنی رقم دی ہے؟"

"پانچ پیسو۔"

داوی نے اپنی تعمیلی سے نوٹوں کی ایک گڈمی نکالی۔ لڑکا حیرت سے نوٹوں کو دیکھنے لگا۔

"میں تمہیں بیس پیسو دے رہی ہوں،" داوی نے کہا۔ "لیکن تمہارے پہلے عشاءے رباتانی

کے لیے نہیں، بلکہ تمہاری شادی کے لیے۔"

"کس کے ساتھ؟"

"میری پوتی سے۔"

سو گوشہ نشینوں کے چوغے میں ملبوس ارندرا، جس نے نو سیمیں کی دی ہوئی ریشمی شال اور ٹھکرھی تھی، تبلیغی مرکز کے صحن میں ایک ایسے دولہا سے، جسے داوی نے اس کے لیے خریدا تھا اور جس کا نام بھی وہ نہیں جانتی تھی، بیاہ دی گئی۔ وہ ساکت اور سلگتے ہوئے سورج تلے شور زدہ زمین پر گھٹنوں کے بل جھکنے کی اذیت، دو سو حاملہ دلہنوں کی بکری کے بالوں جیسی بو، اور لالٹینی میں چلا چلا کر پڑے جانے والے سینٹ پال کے خطوں کی سزا غیر یقینی امید کے ساتھ برداشت کر گئی، کہ مبلغوں کے پاس اس اچانک شادی کے فریب سے نمٹنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ لیکن انھوں نے اسے تبلیغی مرکز میں رکھنے کی آخری کوشش کرنے کا وعدہ کر لیا۔ تاہم داعیانہ حاکم، بادلوں پر گولیاں چلانے والے فوجی میسر، اپنے حالیہ شوہر اور اپنی بے حس داوی کی موجودگی میں تقریب کے بعد ارندرا نے اپنے آپ کو ایک بار پھر اس افسوں کے زیر اثر پایا جو پیدائش کے دن سے اس پر طاری تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ اس کی آزادانہ، حقیقی اور حتمی مرضی کیا ہے تو اس نے تذبذب میں آد بھی نہیں بھری۔

"میں جانا چاہتی ہوں،" اس نے کہا، اور اپنے شوہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وضاحت کی،

"لیکن اس کے ساتھ نہیں، اپنی داوی کے ساتھ۔"

یولیس اپنے باپ کے باغ سے ایک اٹا چڑانے کی کوشش میں پوری سرپھر ممانع کر چکا تھا، کیوں کہ اس کا باپ درختوں کی کاٹ چھانٹ کے دوران اس پر سے نظر نہیں بٹا رہا تھا اور اس کی ماں گھر میں سے نگرانی کر رہی تھی۔ لہذا اس نے اپنا منصوبہ کم سے کم اس دن کے لیے ترک کر دیا

اور آخری درختوں کی کانٹ چھانٹ تک باول ناخواستہ اپنے باپ کی مدد کرتا رہا۔
دور تک پھیلا ہوا یہ باغ پُرسکون و پوشیدہ تھا، اور مین کی چمت والے لکڑی کے مکان کی
کھڑکیاں تانبے کے جنگلوں سے مزین تھیں۔ سامنے کے حصے میں ستونوں پر اٹھا ہوا کشادہ برآمدہ تھا
جس میں افراط سے پھول دینے والے قدیم پودے لگے تھے۔ یولیس کی ماں برآمدے میں جمونے
والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس نے سردرد سے نجات کے لیے کنپٹیوں پر دھواں لگے ہوئے پتے
باندھ رکھے تھے اور اس کی مکمل انڈین نگاہ کسی غیر مرئی شعاع نور کی طرح، باغ کے دور دراز حصوں
تک اپنے بیٹے کا تعاقب کر رہی تھی۔ وہ بہت حسین تھی اور عمر میں اپنے شوہر سے کافی چھوٹی۔ وہ نہ
صرف یہ کہ اب تک اپنے قبیلے کا پہناوا استعمال کرتی تھی، بلکہ اپنے لو کے قدیم ترین رازوں سے
بھی آگاہ تھی۔

جب یولیس کاٹ چھانٹ کرنے والے اوزاروں کے ساتھ گھر پہنچا تو اس کی ماں نے اسے
اپنی چار بجے کی دوا دینے کو کہا جو ایک قریبی میز پر دھری تھی۔ اس نے جوں ہی انہیں چھوا، گلاس
اور بوتل کا رنگ بدل گیا۔ پھر اس نے، محض کھیل میں، ایک شیشے کی صراحی کو ہاتھ لگایا جو میز پر
پیالوں کے برابر رکھی تھی۔ صراحی بھی نیلی ہو گئی۔ اس کی ماں دوا پینے کے دوران برابر اسے دیکھ
رہی تھی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ یہ اس کے درد کا شاخسانہ نہیں ہے تو اس نے یولیس سے
گواہیروانڈین زبان میں پوچھا:

"ایسا کب سے ہو رہا ہے؟"

"جب سے ہم صحرا سے لوٹے ہیں،" یولیس نے بھی گواہیرو میں جواب دیا۔ "لیکن ایسا
صرف شیشے کی چیزوں کے ساتھ ہوتا ہے۔"
مظاہرے کی غرض سے اس نے یکے بعد دیگرے میز پر رکھے ہوئے گلاسوں کو چھوا اور وہ
سب مختلف رنگوں کے ہو گئے۔

"ایسی باتیں صرف محبت کی وجہ سے ہوتی ہیں،" اس کی ماں نے کہا۔ "کون ہے وہ؟"
یولیس نے جواب نہیں دیا۔ اس کا باپ، جو گواہیرو زبان نہیں سمجھتا تھا، اس لمبے مالٹوں کا
ایک گچھا لیے برآمدے کے پاس سے گزرتا تھا۔

"تم دونوں کیا باتیں کر رہے ہو؟" اس نے یولیس سے ولندیزی زبان میں پوچھا۔
"کوئی خاص بات نہیں،" یولیس نے جواب دیا۔

یولیس کی ماں ولندیزی نہیں جانتی تھی۔ جب اس کا شوہر اندر چلا گیا، اس نے اپنے بیٹے
سے گواہیرو میں پوچھا:

"کیا کچھ رہے تھے؟"

"کوئی خاص بات نہیں،" یولیس نے جواب دیا۔

باپ اندر گیا تو اس کی نظروں سے اوچل ہو گیا، لیکن یولیس نے دفتر کی ایک کھڑکی میں سے اسے پھر دیکھا۔ ماں اس وقت تک منتظر رہی جب تک یولیس کے ساتھ اکیلی نہ رہ گئی۔ تب اس نے دوہرایا:

"بتاؤ، کون ہے وہ؟"

"کوئی بھی تو نہیں،" یولیس نے کہا۔

وہ بے خیالی سے جواب دے رہا تھا کیوں کہ اس کی توجہ دفتر میں اپنے باپ کی حرکات پر تھی۔ وہ اسے قتل کے عدد ملانے کے دوران ماٹے تبوری کے اوپر رکھتے دیکھ چکا تھا۔ لیکن جس دوران وہ اپنے باپ پر نظر رکھے ہوئے تھا اس کی ماں اس پر نظر رکھے ہوئے تھی۔

"تم بہت دنوں سے روٹی نہیں کھا رہے ہو،" ماں نے اظہار کیا۔

"مجھے پسند نہیں ہے۔"

ماں کے چہرے پر یکایک غیر معمولی ہلاکت آ گئی۔ "یہ جھوٹ ہے،" اس نے کہا۔ "اس کی وجہ یہ ہے کہ تم محبت کے مریض ہو، اور جو لوگ محبت کے مریض ہوتے ہیں وہ روٹی نہیں کھا سکتے۔" آنکھوں کی طرح اس کی آواز بھی التجا سے دھمکی میں تبدیل ہو گئی تھی۔

"بستر ہو گا تم مجھے بتا دو کہ وہ کون ہے،" وہ بولی۔ "ورنہ مجھے تمہیں پاک کرنے والے غسل کرانے پڑیں گے۔"

دفتر میں ولندیزی نے تبوری کھول کر ماٹے اندر رکھے اور بکتر بند دروازہ بند کر دیا۔ یولیس کھڑکی سے بٹا اور اپنی ماں کو بے صبری سے جواب دیا۔

"میں پہلے ہی بتا چکا ہوں، کوئی نہیں ہے،" اس نے کہا۔ "میرا یقین نہیں تو اتنا سے پوچھ لو۔"

ولندیزی اپنا ملاحوں والا پائپ جلاتا ہوا دفتر کے دروازے میں نمودار ہوا۔ اس کی بغل میں بائبل کا گھساٹا نسخہ تھا۔ اس کی بیوی نے سپانوی میں اس سے پوچھا:

"صبرا میں تم کس سے ملے تھے؟"

"کسی سے بھی نہیں،" اس کے شوہر نے قدرے مشکوک ہو کر جواب دیا۔ "میرا یقین نہیں تو یولیس سے پوچھ لو۔"

وہ بال کے پرلے سرے میں بیٹھ کر پائپ پینے لگا یہاں تک کہ سارا تمباکو ختم ہو گیا۔ پھر

اس نے بے سوچے سمجھے بائبل کھولی اور لگ بھگ دو گھنٹے تک رواں اور گونج دار دلندہ یزی میں نشان زدہ حصے بلند آواز سے پڑھتا رہا۔

آدمی رات کو یولیس اتنی شدت سے سوچ رہا تھا کہ سو نہیں سکتا تھا۔ یادوں کے کرب پر قابو پانے کی کوشش میں وہ مزید ایک گھنٹے تک اپنے جھولنے میں لومٹا رہا حتیٰ کہ اسی کرب نے اسے وہ توانائی بخش دی جو فیصلہ کرنے کے لیے درکار تھی۔ اس نے اپنی کاؤ بوائے پستون، اوئی قمیص اور گھڑسواری کے بوٹ پہنے اور کھڑکی سے کود کر پرندوں سے لدے ٹرک میں گھر سے ہماگ نکلا۔ باغ سے گزرتے ہوئے اس نے وہ تین پکے ہوئے ماٹے توڑ لیے جنہیں سہ پہر کو اڑانے میں ناکام رہا تھا۔

رات کے باقی حصے میں اس نے صحرا کو عبور کیا، اور صبح سویرے شہروں اور دیہات میں اربندر کا اتاپتا پوچھتا پھرا، لیکن کوئی کچھ نہ بتا سکا۔ آخر کار اسے معلوم ہوا کہ وہ سینٹر اونی سیمو سانچیز کی انتخابی مہم کے جلوس میں سفر کر رہی ہے، اور یہ کہ غالباً اس دن وہ نیووا کاسٹیلا میں ہوگا۔ سینٹر یولیس کو وہاں نہیں بلکہ اگلے شہر میں ملا، لیکن اربندر اب اس کے ساتھ نہیں تھی، کہ دادی نے اسے اپنے ہاتھ سے لکھے خط کے ذریعے اپنے کردار کی ذمہ داری لینے پر آمادہ کر لیا تھا، اور اب وہ اس خط سے صحرا کے سارے مقفل دروازے کھول رہی تھی۔ تیسرے دن اس کی مدبیرہ ٹھکانے ڈاکے سے ہوئی جس نے اسے بتایا کہ وہ کس سمت میں جائے۔

"وہ سمندر کی طرف جا رہے ہیں،" اس نے بتایا۔ "بہتر ہے کہ تم جلدی کرو۔ وہ بدبخت بڑھیا اروبا کے جزیرے میں جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔"

اس سمت میں آدمے دن کے سفر کے بعد یولیس کو وہ چوڑا داغ دار خیمہ نظر آیا جسے دادی نے ایک دیوالیہ سرکس سے خریدا تھا۔ جہاں گرد فوٹو گرافر اس کے پاس لوٹ آیا تھا۔ وہ قائل ہو چکا تھا کہ دنیا واقعی اتنی بڑی نہیں ہے جتنی کہ وہ سمجھتا تھا۔ اس نے اپنے دلکش پردے خیمے کے نزدیک لگا لیے تھے۔ ہسپتال کے باجوں والا بینڈ اربندر کے متعلقین کو دھیسے والے رجا رہا تھا۔

یولیس نے اندر جانے کے لیے اپنی باری کا انتظار کیا۔ پہلی چیز جس نے اس کی توجہ مبذول کرائی، خیمے کے اندر کی ترتیب اور صفائی تھی۔ دادی کی شاہانہ مسہری کا شکوہ بحال ہو چکا تھا اور فرشتے کا مجسمہ امادیوں کی باقیات کے صندوق کے برابر اپنی جگہ رکھا تھا۔ اس کے علاوہ نہانے کا ایک جستی ٹب، جس کے پائے شیر کے پنوں جیسے تھے، خیمے کی زینت بڑھا رہا تھا۔ اپنے بھتر دار پلنگ پر لیٹی ہوئی اربندر اعمیاں اور پُر سکون تھی۔ خیمے میں چھن کر آنے والی روشنی نے اس کے جسم کو ایک معصومانہ چمک دے رکھی تھی۔ وہ کھلی آنکھوں سو رہی تھی۔ یولیس، جس کے ہاتھ میں

ماٹے تھے، اس کے برابر ٹھہر گیا، اس نے دیکھا کہ وہ اسے دیکھے بغیر دیکھ رہی ہے۔ اس نے ارندرا کی آنکھوں کے آگے اپنا ہاتھ پھرایا، اور اس نام سے پکارا جو اسے یاد کرنے کے لیے ایجاد کیا تھا:

"ارندری۔"

ارندرا جاگ اٹھی۔ یولیس کے سامنے خود کو عریاں محسوس کر کے اس کی چیخ ٹھل گئی اور اس نے چادر سے اپنے آپ کو گردن تک ڈھانپ لیا۔

"میری طرف مت دیکھو،" اس نے کہا۔ "میں خوفناک لگ رہی ہوں۔"

"تمہارا رنگ سر سے پاؤں تک مائلوں جیسا ہے،" یولیس نے کہا۔ اس نے پھل اس کی آنکھوں کے مقابل کر دیے کہ وہ خود موازنہ کر لے۔ "دیکھو۔"

ارندرا نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹائے تو دیکھا کہ مائلوں کا رنگ واقعی اس کے اپنے رنگ جیسا تھا۔

"میں نہیں چاہتی کہ تم اس وقت رکو،" وہ بولی۔

"میں تو صرف یہ دکھانے آیا تھا،" یولیس نے کہا۔ "ادھر دیکھو۔"

اس نے ایک ماٹا اپنے ناخنوں سے کھولا، اسے دو حصوں میں چیرا اور اندر جو کچھ تھا، ارندرا کو دکھایا: پھل کے عین قلب میں ایک اصلی بیر رکھا تھا۔

"یہ ماٹے ہیں جو ہم سرحد پار لے جاتے ہیں،" اس نے کہا۔

"لیکن یہ تو جیتے جاگتے ماٹے ہیں!" ارندرا نے کہا۔

"بے شک،" یولیس مسکرایا۔ "انہیں میرے ابا اگاتے ہیں۔"

ارندرا کو اس بات کا یقین نہیں آیا۔ اس نے چہرے سے چادر ہٹائی اور میرے کواٹلیوں سے پکڑ کر حیرت سے دیکھنے لگی۔

"ان جیسے تین ہیروں سے ہم دنیا کا چکر لگا سکتے ہیں،" یولیس نے کہا۔ ارندرا نے مایوسی کے تاثر کے ساتھ بیر اسے لوٹا دیا۔ یولیس کھتا رہا:

"اس کے علاوہ میرے پاس پیک آپ ٹرک بھی ہے۔" وہ بولا۔ "اور اس کے علاوہ۔۔۔"

دیکھو!"

اپنی قمیص کے نیچے سے اس نے ایک پرانے وقتوں کا پستول نکالا۔

"میں ابھی دس سال تک نہیں جاسکتی،" ارندرا نے کہا۔

"تم جاؤ گی،" یولیس نے کہا۔ "آج رات، جب سفید ویل سو جائے گی تو میں باہر آؤں گی"

آواز نکالوں گا۔"

اس نے آواز کی ایسی نچی نقل کی کہ ارندرا کی نظریں پہلی بار مسکرائیں۔

"دادی کو کہا ہے؟" اس نے کہا۔

"آؤ؟"

"ویل۔"

اس غلطی پر دونوں ہنس پڑے، لیکن ارندرا نے بات پھر نکال لی۔

"اپنی دادی کی اجازت کے بغیر کوئی کہیں نہیں جاسکتا۔"

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اسے بہر حال پتا چل جائے گا،" ارندرا نے کہا۔ "وہ خواب میں سب باتیں دیکھ سکتی

ہے۔"

"جب وہ یہ خواب دیکھنا شروع کرے گی کہ تم جا رہی ہو، اس وقت تک ہم سرحد پار کر چکے

ہوں گے۔ ہم اسمگلروں کی طرح نکل جائیں گے،" یولیس نے کہا۔

اس نے کسی فلمی جھگڑے کی طرح اعتماد سے پستول پکڑتے ہوئے ارندرا کو اپنی بے خوفی سے

جوش دلانے کے لیے گولیاں چلنے کی آوازیں نکالیں۔ گوارندرا نے باہمی بھری نہ اٹھا کر کیا، لیکن

نظروں سے آہ بھرتے ہوئے اسے ایک بو سے کے ساتھ رخصت کر دیا۔

یولیس نے متاثر ہو کر سرگوشی کی:

"ہم کل جہازوں کو جاتے ہوئے دیکھ رہے ہوں گے۔"

اس رات، سات بجے کے ذرا بعد ارندرا اپنی دادی کے بالوں میں کنکھی کر رہی تھی کہ اس

کی بدنہی کی ہوا پھر چلنے لگی۔ خیمے میں انڈین خدمت گار اور باجے والوں کا نگران ادائیگی کے منتظر

تھے۔ دادی نے ایک صندوق پر، جو اس کے قریب ہی رکھا تھا، نوٹ گئے اور ایک کھاتا دیکھنے کے

بعد سب سے معراندین کو ادائیگی کر دی۔

"لو سنبالو،" دادی نے اس سے کہا۔ "ایک ہفتے کے ہوئے بیس پیسو۔ کھانے کے آٹھ

پیسو، پانی کے تین، نئی قمیصوں کے پچاس سینٹ، ان سب کو گھٹا کر باقی بچے ساڑھے آٹھ۔ گن

لو۔"

معراندین نے رقم گنی اور وہ سب بندگی کرتے ہوئے چلے گئے۔

"شکریہ، سفید خاتون۔"

اب باجے والوں کے نگران کی باری تھی۔ دادی نے اپنا کھاتا دیکھا اور فوٹو گرافر سے، جو

گٹا پارچا کے ٹکڑوں سے اپنے کیرے کا بیلوز مرمت کر رہا تھا، مخاطب ہوئی۔
 "کیا ارادہ ہے؟" اس نے پوچھا۔ "تم موسیقی کا چوتھائی خرچ ادا کرو گے یا نہیں؟"
 فوٹو گرافر نے جواب دینے کے لیے سر اٹھانے کی بھی زحمت نہیں کی۔
 "موسیقی تصویروں میں نظر نہیں آتی۔"
 "مگر لوگوں کو اپنی تصویریں دکھوانے پر آمادہ تو کرتی ہے،" دادی نے جواب دیا۔
 "اس کے برخلاف،" فوٹو گرافر نے کہا، "موسیقی انہیں روشاں کی یاد دلاتی ہے اور پھر وہ
 تصویروں میں آنکھیں بند کیے نظر آتے ہیں۔"
 باجے والوں کے گلمان نے مداخلت کی۔
 "آنکھیں بند کرنے پر موسیقی مجبور نہیں کرتی،" اس نے کہا، "بلکہ اس کا سبب وہ چکاچوند
 ہے جو تم رات کو تصویریں کھینچتے وقت پیدا کرتے ہو۔"
 "نہیں اس کا سبب موسیقی ہے،" فوٹو گرافر نے اصرار کیا۔
 دادی نے جھگڑا چکایا۔ "نخیل مت بنو،" اس نے فوٹو گرافر سے کہا۔ "دیکھو سینئر
 اونسے سیمو سانچیز کے معاملات کتنے عمدہ طریقے سے چل رہے ہیں اور یہ سب ان سازندوں کی
 بدولت ہے جو اس کے ساتھ ہیں۔" پھر ذرا سخت لہجے میں اس نے بات سمیٹی:
 "لہذا تمہاری طرف جو ٹکٹا ہے وہ ادا کرو یا پھر اپنی قسمت کا پچھا کرو۔ اس غریب بچی کے
 لیے اخراجات کا سارا بوجھ تنہا اٹھانا ٹھیک نہیں ہے۔"
 "میں اپنی قسمت کا پچھا کروں گا،" فوٹو گرافر نے کہا۔ "بہر حال، میں ہوں تو ایک فنکار۔"
 دادی نے اپنے کندھے اچکائے اور موسیقار کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس نے نوٹوں کی ایک
 گڈمی، جو اس کے کھاتے میں درج رقم کے مطابق تھی، موسیقار کے حوالے کی۔
 "دو سو چوٹن دھنیں،" دادی نے اسے بتایا۔ "پچاس سینٹ فی عدد کے حساب سے، اور
 اتواروں اور چھٹیوں کی بنیس دھنیں ساٹھ سینٹ کے حساب سے، یہ کل رقم ہوئی ایک سو چھپن
 ہیں۔"

موسیقار یہ رقم لینے پر آمادہ نہیں تھا۔

"ایک سو بیاسی چالیس بنتے ہیں،" وہ بولا۔ "والز کا نرخ زیادہ ہے۔"
 "وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ والز کی دھن زیادہ اداس ہوتی ہے،" موسیقار نے کہا۔
 دادی نے اسے رقم لینے پر مجبور کر دیا۔

"ٹھیک ہے، میری طرف ٹھکنے والے ہر والز کے بدلے تم اس ہفتے دو طریقہ دھنیں بجا دینا۔ اس طرح ہمارا حساب برابر ہو جائے گا۔"

دادی کی منطق موسیقار کی سمجھ میں نہیں آئی، لیکن اس نے رقم لے لی اور اس گتھی کو سلجھاتا رہا۔ اس لمحے خوفناک ہوانے خیسے کو اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی اور اس خاموشی میں، جو وہ اپنے عقب میں چھوڑ گئی تھی، انوکھی اداس اور واضح آواز سنائی دی۔

ارنندرا نہیں جانتی تھی کہ اپنی پریشانی کس طرح چھپائے۔ اس نے رقم والا صندوق بند کر کے بستر کے نیچے چھپا دیا لیکن جب اس نے چابی دادی کو دی تو وہ اس کے ہاتھ کی لکچکا پٹ کو ہانپ گئی۔ "خوف زدہ مت ہو،" اس نے ارنندرا سے کہا۔ "طوفانی راتوں میں ہمیشہ انو بولتے ہیں۔" لیکن جب اس نے فوٹو گرافر کو کمر پر کیمرہ اٹھائے باہر جاتے دیکھا، تو وہ اپنی بات کی اتنی قائل معلوم نہ ہوتی تھی۔

"چاہو تو کل تک ٹھہر جاؤ،" اس نے فوٹو گرافر سے کہا۔ "آج رات تو موت کی عمل داری ہے۔"

انوکھی آواز فوٹو گرافر نے بھی سنی تھی لیکن اس نے اپنا ارادہ نہیں بدلا۔
"رگ جاؤ بیٹا،" دادی نے اصرار کیا۔ "خواہ اس کا سبب تمہارے لیے میری پسندیدگی ہی کیوں نہ ہو۔"

"لیکن میں موسیقی کا خرچ نہیں دوں گا،" فوٹو گرافر نے کہا۔

"اوہ، نہیں،" دادی نے کہا۔ "اس کا یہ مطلب نہیں۔"

"دیکھا؟" فوٹو گرافر نے کہا۔ "تمہیں کسی سے بھی لگاؤ نہیں۔"

دادی غصے سے آگ بگولا ہو گئی۔

"جاؤ، دفع ہو جاؤ، کھینے،" اس نے کہا۔

دادی نے اس قدر توہین محسوس کی کہ جب ارنندرا نے اسے سُلانے کو لٹایا تو وہ اس وقت بھی فوٹو گرافر پر غصہ نکال رہی تھی۔ "فاحشہ کی اولاد!" وہ بڑبڑاتی۔ "اس حرامی کو کسی دوسرے کے دل کی کیا خبر؟" ارنندرا نے اس کی باتوں پر توجہ نہیں دی کہ ہوا کے وقفوں کے درمیان انو مستحکم اصرار کے ساتھ اسے پکار رہا تھا اور وہ گوگو کے حذاب میں تھی۔ آخر کار دادی، ان ساری رسومات کے ساتھ جو پرانی حویلی میں رائج تھیں، سونے کو لیٹ گئی۔ اس نے اپنی پوتی کے پینچا بلانے کے دوران غصے پر قابو پا لیا اور ایک بار پھر اپنے رائیگاں سانس گنتے لگی۔

"صبح تمہیں جلدی اٹھنا ہے۔" وہ بولی۔ "تاکہ لوگوں کے پیچھے سے پہلے میرے غسل کے

لیے خیداندہ ابال سکو۔"

"اچھا دادی۔"

"تمہارے پاس جو وقت ہے اس میں خدمت گاروں کے میلے کپڑے دھو ڈالو، اس طرح تم اگلے ہفتے ان کی تنخواہ سے مزید کٹوتی کر سکو گی۔"

"اچھا دادی۔" ارندرا نے کہا۔

"آہستہ آہستہ سونا، مبادا تم تک جاؤ کیوں کہ کل جمعرات ہے، ہفتے کا طویل ترین دن۔"

"اچھا دادی۔"

"اور شتر مرغ کو دانہ ڈال دو۔"

"اچھا دادی۔" ارندرا نے کہا۔

اس نے پنکھا مسہری کے سر جانے چھوڑا اور مُردوں والے صندوق کے آگے قربان گاہ کی دو شمعیں جلادیں۔ دادی، جواب سوچتی تھی، اپنی ہدایات سے پیچھے رہ گئی تھی۔

"لامادیوں کے لیے شمعیں جلاتا مست بعول جانا۔"

"اچھا دادی۔"

ارندرا جان گئی کہ دادی نہیں جاگے گی کیوں کہ اس نے بذیان بکنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے ہوا کو خیسے کے گرد چنگھاڑتے سنا، لیکن اس بار بھی نہیں سمجھ سکی کہ یہ اس کی بد بختی کی ہوا ہے۔ وہ منتظر رہی تاوقتیکہ انوک کی آواز پھر سنائی دی پھر آخر کار آزادی کے لیے اس کی تڑپ دادی کے افسوں پر غالب آگئی۔

اس نے خیسے سے باہر ابھی چند قدم کا فاصلہ بھی طے نہیں کیا ہو گا کہ اس کی مدبیرہ فوٹو گرافر سے ہو گئی جو بالسیکل کے بار گیر پر اپنا سامان لا رہا تھا۔ فوٹو گرافر کی رازدارانہ مسکراہٹ نے اسے اطمینان بخشا۔

"میں کچھ نہیں جانتا،" اس نے کہا۔ "میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ اور میں موسیقی کا خرچ نہیں دوں گا۔"

فوٹو گرافر نے سب کے لیے نیک متناؤں کے ساتھ رخصت لی۔ پھر ارندرا ایک بارگی فیصلہ کر کے صمرا کی طرف دوڑ پڑی اور ہوا کے جھکڑوں نے، جہاں سے انو بول رہا تھا، اسے اٹکل لیا۔

اس بار دادی بلاتا خیر شہری حکام کے پاس گئی۔ جب صبح چھ بجے دادی نے سینئیر کا خط اس کے سامنے رکھا تو مقامی دستے کا کمانڈر بستر سے اچھل پڑا۔ یولیس کا باپ دروازے پر انتظار کر رہا تھا۔

"لیکن مجھے کیا معلوم کہ اس میں کیا لکھا ہے! "کمانڈر نے چلا کر کہا۔ "میں پڑھنا نہیں جانتا۔"

"یہ سینیٹر اونیسمو سانچیز کا سفارشی خط ہے،" دادی نے بتایا۔

مزید کوئی سوال کیے بغیر کمانڈر نے اپنے بستر کے قریب رکھی ہوئی رائفل سنبھال لی، اور چلتا چلتا اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگا۔ پانچ منٹ بعد وہ سب ایک فوجی ٹرک میں، اس ہوا کی مخالفت سمت میں اڑے جا رہے تھے جس نے مفروروں کے تمام سراغ مٹا دیے تھے۔ کمانڈر اگلی نشست پر ڈرائیور کے برابر بیٹھا تھا، جبکہ دادی اور ولندیزی عقبی حصے میں تھے۔ ٹرک کے ہر پائیدان پر ایک ایک مسلح سپاہی تھا۔

شہر کے نزدیک انھوں نے تریالوں سے ڈھکے ٹرکوں کے ایک کارواں کو روکا۔ کئی آدمیوں نے جو عقبی حصے میں چھپے ہوئے تھے، تریال اٹھائی اور چھوٹی گاڑی کو مشین گنوں اور فوجی رائفلوں کی زد پر لے لیا۔ کمانڈر نے پہلے ٹرک کے ڈرائیور سے پوچھا کہ انھوں نے پرندوں سے لدے فارم ٹرک کو کتنا پیچھے دیکھا تھا۔

ڈرائیور نے جواب دینے سے پہلے ٹرک چلا دیا۔

"ہم خبر نہیں ہیں،" اس نے بد مزگی سے کہا۔ "ہم اسمگلر ہیں۔"

کمانڈر نے مشین گنوں کی سیاہ نالیں اپنی آنکھوں کے قریب لہراتی دیکھیں تو اپنے بازو اٹھا کر مسکرانے لگا۔

"کم سے کم،" اس نے جھٹکا کر کہا، "تم اتنی شائستگی تو برت سکتے ہو کہ دن دباڑے نہ ٹکلو۔"

آخری ٹرک کے پچھلے بمپر پر لکھا تھا: اریسندرا، میں تمہارے ہی لیے سوچتا ہوں۔

جوں جوں وہ شمال کی طرف بڑھتے گئے ہوا آور زیادہ خشک ہوتی گئی اور دھوپ ہوا سے شدید تر۔ گرمی اور دھول کے باعث بند ٹرک کے اندر سانس لینا دشوار تھا۔

فوٹو گرافر کو سب سے پہلے دیکھنے والی دادی تھی۔ وہ اسی جانب رواں تھا جدھر وہ جا رہے تھے۔ سر پر بندھے ہوئے روال کے سوا اس کے پاس دھوپ سے کوئی بچاؤ نہ تھا۔

"وہ رہا،" اس نے اشارہ کیا۔ "وہ کمینہ ان کا شریک جرم تھا۔"

کمانڈر نے پائیدان پر کھڑے ایک سپاہی کو فوٹو گرافر کی گرفتاری کا حکم دیا۔

"اسے پکڑ لو اور ہمیں ہمارا انتظار کرو۔ ہم آ رہے ہیں،" اس نے کہا۔

سپاہی پائیدان سے چھلانگ لگا کر اترا اور فوٹو گرافر سے دو دفعہ چلتا کر ٹھہر جانے کو کہا۔ فوٹو گرافر مخالفت ہوا کے باعث اس کی آواز سن نہیں سکا۔ ٹرک اس کے قریب سے گزرا تو دادی نے اسے پراسرار سا اشارہ کیا، لیکن وہ اسے سلام سمجھا اور جواب میں مسکراتے ہوئے ہاتھ بلا دیا۔ اس

نے گولی کی آواز نہیں سنی۔ وہ ہوا میں اچھلا اور بے جان ہو کر اپنی بائیکل پر ڈھیر ہو گیا۔ رائفل کی گولی نے اس کا بھیجاڑا دیا تھا، لیکن وہ کبھی نہیں جان سکا کہ گولی کدھر سے آئی تھی۔

دوپہر سے پہلے پہلے انھیں ہوا میں اڑتے ہوئے پر نظر آنے لگے جو نوخیز پرندوں کے تھے۔ ولندیزی نے انھیں پہچان لیا کیوں کہ وہ اسی کے پرندوں کے پر تھے جنہیں ہوا نے نوچ ڈالا تھا۔ ڈرائیور نے سمت بدلی اور ایکسیلریٹر پر پورا دباؤ ڈال دیا۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہ افق پر پریک آپ ٹرک کا ہیولادیکھ رہے تھے۔

یولیس نے عقبی شیشے میں فوجی گاڑی کو نمودار ہوتے دیکھا تو اس نے درمیانی فاصلہ بڑھانے کی کوشش کی لیکن اس کا ٹرک کوئی بہتر کارکردگی نہ دکھایا۔ انھوں نے سونے بغیر سفر جاری رکھا تھا اور ٹکان اور پیاس سے بے حال تھے۔ ارندرا جو یولیس کے شانے پر سر رکھے اونگد رہی تھی، خوف زدہ ہو کر جاگ اٹھی۔ اس نے ٹرک کو دیکھا جو انھیں آہینے کو تھا اور ایک معصومانہ عزم کے ساتھ دوستانوں کے خانے سے پستول نکال لیا۔

"یہ بے کار ہے،" یولیس نے کہا۔ "یہ سرفرانس ڈریک کا پستول ہوا کرتا تھا۔"

ارندرا نے کئی بار پستول کو اٹاپٹا اور پھر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ فوجی گاڑی نے پرندوں سے لدے خستہ حال ٹرک کو پیچھے چھوڑتی ہوئی آگے جا کر تیزی سے گھومی اور ٹرک کا راستا کاٹ دیا۔

اسی زمانے کے آس پاس، جو ان کا بہترین دور تھا، میں نے ان کے بارے میں سنا، لیکن میں ان کی زندگیوں کی تفصیل میں نہیں گیا، حتیٰ کہ کئی سال بعد جب رافیل ایسکالونا نے ایک گیت میں اس ڈرامے کا ہولناک انجام آشکار کیا تو میں نے سوچا کہ یہ کہانی بیان کرنا اچھا رہے گا۔ میں ریوباچا کے صوبے میں گھوم پھر کے انسائیکلوپیڈیا اور طبی کتابیں فروخت کر رہا تھا۔ الوارو سیپیدا سامودیو نے، جو بیئر ٹھنڈی کرنے والی مشینیں چھپنے کے لیے خود بھی اس خطے میں گھوم رہا تھا، راستے میں باتیں کرنے کی غرض سے مجھے اپنے ٹرک میں بٹھالیا تھا۔ ہم صمرائی شہروں میں گھومتے پھرے اور ہم نے اتنی فضول گوئی کی اور اتنی بیسپرپی کہ صمراعبور کرنے اور سرحد پر پہنچنے کا ہمیں علم ہی نہیں ہوا۔ سامنے بھگتی ہوئی محبت کا ڈیرہ تھا۔ خیسے کے اوپر کینوس کی پٹیاں لٹک رہی تھیں: ارندرا بہترین ہے؛ چھوڑو، لوٹ آؤ۔۔۔ ارندرا تمہاری منتظر ہے؛ ارندرا کے بغیر زندگی زندگی نہیں ہے۔ مختلف نسلوں اور رتبوں کے لوگوں پر مشتمل، بل کھاتی ہوئی لانتا ہی قطار انسانی

ریڑھ کی ہڈی رکھنے والے ایسے سانپ سے مشابہ تھی جو خالی جگہوں اور چوراہوں، پُرونیق بازاروں اور پُرشور منڈیوں میں سے اونگھتا ہوا اس شہر کی سرڑکوں پر رنگ رہا تھا جو گزرتے ہوئے تاجروں کے شور سے معمور تھا۔ ہر سرک عوامی جُوانا نہ تھی، ہر گھر شراب خانہ اور ہر دروازہ جگلوٹوں کی پناہ گاہ۔ سمجھ میں نہ آسکنے والے بہت سے گیت اور چٹا چٹا کر اشیا کی قیمتیں پکارنے کا شور، فریبِ نظر پیدا کرتی ہوئی گرمی میں، ہر اس کی ایک واحد اونچی آواز میں ڈھل رہے تھے۔

بے وطن لوگوں کے ازدحام اور نوسر بازوں میں ہلکا مان دی گڈ بھی تھا، جو ایک میز پر بیٹھا اپنے ایجاد کردہ تریاق کو خود اپنے اوپر آزمانے کے لیے اصلی سانپ مانگ رہا تھا۔ پھر وہ عورت تھی جو اپنے والدین کی نافرمانی کرنے پر کمر لپی میں تبدیل ہو گئی تھی، جسے پچاس سینٹ کے عوض بھجوا جا سکتا تھا تاکہ لوگ دیکھ لیں کہ اس میں کوئی چال نہیں ہے، اور جو ان لوگوں کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی جو اس کی بد نصیبی کا سبب جاننے کے مشتاق تھے۔ عدم آباد کا ایک اچلی تھا جو خوفناک آسمانی چمگلاڑ کی جلد آمد کا اعلان کر رہا تھا جس کے جلتے ہوئے دوزخی سانپوں سے نظامِ فطرت الٹ جائے گا اور سمندر کے اسرارِ سطح پر آجائیں گے۔

واحد پُرسکون جگہ چمکے کا علاقہ تھا جہاں شہر کے شور و شغب کی صرف دم توڑتی آوازیں ہی پہنچ پاتی تھیں۔ عورتیں، جن کا تعلق بحری گلوب کے چاروں ربع دائروں سے تھا، ویران کمروں میں اکٹھا ہٹ سے جمائیاں لے رہی تھیں۔ انہوں نے دوپہر کی نیند میٹھے میٹھے پوری کی تھی، کہ لوگوں نے، جن کو ان کی ضرورت تھی، انہیں نہیں جگایا تھا اور وہ جھمٹوں پر گھومتے پتنگوں کے نیچے ابھی تک آسمانی چمگلاڑ کی منتظر تھیں۔ اچانک ان میں سے ایک اٹھ کر سرک پر کھٹنے والے درپے میں گئی جو گھملوں اور پیسنزی کے پھولوں سے سجاتا تھا۔ نیچے ارنڈرا کے چاہنے والوں کی قطار گزر رہی تھی۔ "یہاں آؤ!" عورت نے ان سے چٹا کر کہا۔ "اس کے پاس کیا ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے؟"

"سینیٹر کا خط،" کسی نے جواب دیا۔

اونچی آوازوں اور قہقہوں سے مستوجہ ہو کر دوسری عورتیں درپے میں آگئیں۔ "کئی دنوں سے یہ قطار اسی طرح ہے،" ان میں سے ایک بولی۔ "ذرا سوچو تو، پچاس پیسو کی کس۔"

درپے میں آنے والی پہلی عورت نے ایک فیصلہ کیا:

"اچھا۔ میں معلوم کرتی ہوں کہ اس سات ماہی بچی میں کون سے لعل جڑے ہیں۔"

"میں بھی چلتی ہوں،" ایک اور بولی۔ "یہاں بیٹھ کر مکھیاں مارنے سے تو یہی بہتر ہے۔"

راستے میں دوسری عورتیں بھی شامل ہو گئیں اور جب وہ ارندرا کے خیمے میں پہنچیں تو اچھا خاصا فسادی جلوس بن چکا تھا۔ وہ کسی اطلاع کے بغیر اندر داخل ہو گئیں اور اس آدمی کو کیسے مار مار کر بھگا دیا جو اپنی رقم کے عوض اپنے آپ کو بساط بھر بہتر طور پر صرف کر رہا تھا۔ انھوں نے ارندرا کا پلنگ اٹھایا اور ڈولی کی طرح سرنگ پر لے گئیں۔

"یہ تو دست درازی ہے!" دادی چٹائی۔ "خدار نیو، بٹ مار نیو!" اور پھر قطار میں کھڑے مردوں کی طرف مڑتے ہوئے: "اور تم، زخمو، تمھاری مردانگی کہاں ہے؟ ایک غریب بے کس بچی کے خلاف حملہ ہوتے دیکھ رہے ہو، ملعون اغلام بازو!"

ان سب کو جو اس کی زد میں تھے اپنی لامحی سے ضربیں لگاتی ہوئی وہ اپنی آواز کی آخری حد تک چلاتی رہی، لیکن جہوم کی اونچی آوازیں اور مسخرانہ سیٹیوں میں اس کا غصہ ناقابل سماعت تھا۔ ارندرا اس مسخرے سے بچ سکی، کیوں کہ جب سے اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی، دادی اسے کٹے کی زنجیر سے باندھنے لگی تھی جو اس کے پلنگ سے جڑی ہوئی تھی۔ لیکن عورتوں نے اسے گزند نہیں پہنچایا۔ انھوں نے ہارونق سرنگوں پر، پایہ زنجیر تائب کے تمثیلی سفر کی طرح، چتر دار قربان گاد پر اس کی نمائش کی، اور آخر کار اسے ایک جنازے کی طرح مرکزی چوک کے وسط میں رکھ دیا۔ ارندرا شرم سے سٹی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا، لیکن وہ رو نہیں رہی تھی۔ وہ چوک میں جلتے ہوئے سورج کے نیچے اسی عالم میں شرم اور غصے سے اپنی بد نصیبی کی زنجیر جباتی رہی، تاوقتے کہ کسی نے ترس کھا کر اسے ایک قمیص سے ڈھانپ دیا۔

یہی وہ واحد موقع تھا جب میں نے انھیں دیکھا، لیکن مجھے معلوم ہوا کہ وہ عوامی طاقتوں کے زیر تحفظ اسی سرحدی شہر میں اس وقت تک مقیم رہے جب تک دادی کے صندوق دولت سے لبریز نہ ہو گئے۔ پھر وہ صحرا کو چھوڑ کر سمندر کی طرف روانہ ہو گئے۔ غریبوں کے اس خطے میں اتنی دولت ایک جگہ کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ یہ ہیل گاڑیوں کا جلوس تھا جن پر حویلی کی تباہی میں ضائع ہونے والے سامان کی سستی یادگاریں لدی ہوئی تھیں۔ اور صرف شاہی مہمے اور نادر گھنٹے ہی نہیں، بلکہ ایک پرانا پیا نو اور گئے دنوں کے ریکارڈوں کے ساتھ ایک چابی والا گراموفون بھی۔ مقامیوں کی ایک جماعت اس سازو سامان کو سنبھالے ہوئے تھی اور موسیقارتوں کا ایک جٹھا دیہات میں ان کی فاتحانہ آمد کا اعلان کر رہا تھا۔

دادی اپنی تھیلی میں سے دانے جباتی ہوئی کاغذی حلقوں سے سبھی ایک ڈولی میں سفر کر رہی تھی، جس پر کلیسانی پتھر نے سایہ کر رکھا تھا۔ اس کے حیران کن حجم میں اضافہ ہو گیا تھا، کیوں کہ اس نے بلاؤز کے نیچے مناحوں والے کپڑے کی صدری پہن رکھی تھی جس کی جیبوں میں وہ سونے کی

سلاخیں اس طرح رکھتی تھی جیسے کوئی بیٹی میں کار توں رکھتا ہے۔ بھرک دار کپڑوں میں ملبوس اور آویزاں زیورات سے آراستہ ارندرا اس کے پہلو میں بیٹھی تھی، لیکن کتے کی زنجیر اب بھی اس کے ٹخنے پر تھی۔

"تمہارے پاس شکایت کا کوئی جواز نہیں ہے،" جب انھوں نے سرحدی شہر چھوڑا تو داوی نے اس سے کہا تھا۔ "تمہارے پاس لاکھوں جیسے ملبوسات ہیں، شابانہ مسہری ہے، موسیقاروں کا اپنا دستہ ہے اور خدمت پر مامور چودہ انڈین ہیں۔ تمہارے خیال میں یہ سب شاندار نہیں ہے؟"

"ہاں دادی۔"

"جب میں تمہارے پاس نہیں ہوں گی،" دادی نے سلسلہ جاری رکھا، "تم مردوں کے رحم و کرم پر نہیں رہو گی کیوں کہ ایک اہم شہر میں تمہارا اپنا ذاتی گھر ہو گا۔ تم آزاد اور شاداں ہو گی۔" یہ مستقبل کا نیا اور نا دیدہ تصور تھا۔ دوسری طرف، اب اس نے اصل قرضے کی بات ہی کرنی چھوڑ دی تھی کہ اس کی تفصیلات گڈڈ ہو گئی تھیں اور دھندے کے اخراجات میں پیسہ لگی کے باعث اقساط بڑھ گئی تھیں۔ اس کے باوجود ارندرا اُف تک نہ کرتی تھی، مبادا کوئی اس کے خیالات جان لے۔ وہ شورے کے گڑھوں میں، ساحلی شہروں کی بے حسی میں، آبرق کی کانوں کے دبانوں میں بستر کی اذیت سہتی رہی، اور دادی اسے مستقبل کے سپنے اس طرح دکھاتی رہی گویا تاش کے پتھوں پر قسمت کا حال دیکھ رہی ہو۔ ایک سہ پہر، جب وہ ایک تکلیف دہ گھاٹی سے باہر آ رہے تھے، انھیں ہوا میں قدیم لارل کی مہک محسوس ہوئی اور جمیکا کی بول چال کے متفرق ٹکڑے سنائی دیے تو انھوں نے جینے کی انگٹ اور اپنے دلوں میں گرہ سی محسوس کی۔ وہ سمندر تک پہنچ گئے تھے۔ "وہ رہا،" دادی نے نصف زندگی کی جلاوطنی کے بعد بحیرہ کریہیسن کی بنوری روشنی میں سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اچھا نہیں لگ رہا؟"

"ہاں دادی۔"

انھوں نے وہاں خیمہ لگا دیا۔ دادی نے خواب دیکھے بغیر باتیں کرنے میں دات گزار دی اور بعض اوقات ماضی کی یادوں کو مستقبل یعنی میں گڈڈ کر دیا۔ وہ معمول سے زیادہ سوئی اور سمندر کی آواز سے تازہ دم بیدار ہوئی۔ تاہم جب ارندرا اسے نہلا رہی تھی تو اس نے پھر پیش گوئیاں شروع کر دیں اور یہ ایسی ہرجوش غیب بینی تھی کہ شب بیداری کا ہڈیاں معلوم ہوتی تھی۔ "تم طبقہ آمر کی خاتون بنو گی،" اس نے ارندرا کو بتایا۔ "ایک خاتون خوبی، زیر دست جس کا احترام کریں گے اور اعلیٰ ترین حکام کرم فرمائی اور عزت افزائی۔ جہازوں کے کپتان دنیا کی ہر بندرگاہ سے تمہیں پوسٹ کارڈ بھیجا کریں گے۔"

ارندرا اس کی باتیں نہیں سُن رہی تھی۔ خوشبودار بوٹیوں میں اُبلابو اُگرم پانی جو ایک نلکی کے ذریعے باہر سے آ رہا تھا، ٹب میں گر رہا تھا۔ ارندرا نے، جس کا ذہن جامد تھا اور جو سانس بھی نہیں لے رہی تھی، ایک تونے میں پانی بھرا اور ایک ہاتھ سے دادی پر انڈیل دیا جبکہ دوسرے ہاتھ سے اسے صابن لگانے لگی۔

"تمہاری حویلی کی شہرت انتلیس کے جزیروں سے بالینڈ کی مملکت تک زبان در زبان پرواز کرے گی،" دادی کہہ رہی تھی، "اور اس کی اہمیت صدارتی محل سے زیادہ ہو گی کہ وہاں معاملاتِ حکومت پر بحث ہو گی اور قوم کی قسمت کا فیصلہ ہو گا۔"

اچانک نلکی سے پانی آنا بند ہو گیا۔ ارندرا دیکھنے کے لیے خیمے سے باہر نکلی تو اس نے پانی انڈیلنے والے انڈین کو باورچی خانے کے پاس کٹڑیاں چیرتے پایا۔

"پانی ختم ہو گیا،" انڈین نے کہا۔ "اور پانی ٹھنڈا کرنا ہو گا۔"

ارندرا چولہے کے پاس کئی جہاں ایک اور بڑے برتن میں خوشبودار بوٹیوں والا پانی ابل رہا تھا۔ اس نے ایک کپڑے میں اپنے ہاتھ لیٹے اور دیکھا کہ وہ انڈین کی مدد کے بغیر برتن اٹھا سکتی ہے۔

"تم جاسکتے ہو،" اس نے انڈین سے کہا۔ "پانی میں انڈیلوں گی۔"

انڈین جب تک باورچی خانے سے چلا نہ گیا اس نے توقف کیا۔ پھر اس نے اُبلتے برتن کو چولہے سے اتارا اور بڑی مشکل سے نلکی کی بلندی تک اونچا کیا۔ وہ اس ملک پانی کو نل میں انڈیلنے ہی والی تھی کہ خیمے کے اندر سے دادی چلائی:

"ارندرا!"

ایسا تھا جیسے اس نے دیکھ لیا ہو۔ اس کی آواز سے خوف زدہ ہوتی آخری لمحے پر ہچکتا نہ لگی۔ "آئی دادی!" اس نے کہا۔ "پانی ٹھنڈا کر رہی ہوں۔"

اس رات وہ دیر گئے تک سوچتی رہی جبکہ اس کی دادی سونے کی صدری پہنے نیند میں گاتی رہی۔ ارندرا اسے اپنے بستر سے ایسی تیز نظروں سے دیکھ رہی تھی جو اندھیرے میں بی کی نظروں سے مشابہ تھیں۔ پھر وہ اس شخص کی طرح سونے کو لیٹ گئی جو ڈوب چکا ہو۔ اس کے ہاتھ سینے پر تھے اور آنکھیں کھلی تھیں۔ اس نے اپنی اندرونی آواز کی پوری طاقت سے پکارا:

"یولیس!"

مالٹے کے باغ والے مکان میں یولیس اچانک جاگ اٹھا۔ اس نے ارندرا کی آواز اتنے واضح طور پر سنی تھی کہ وہ اسے کمرے کی پرچائیوں میں ڈھونڈنے لگا۔ لمحہ بھر سوچنے کے بعد اس نے

اپنے کپڑوں اور جوتوں کی گٹھڑی بنائی اور شبِ خوابی کے کمرے سے نکل آیا۔ وہ ڈیورٹی عبور کر چکا تھا کہ باپ کی آواز نے اسے جوتھا دیا:

"مہاں چار ہے ہو؟"

چاند کی روشنی میں وہ یولیس کو نیلا نظر آ رہا تھا۔

"دنیا میں،" اس نے جواب دیا۔

"اس باتیں تمہیں نہیں روکوں گا،" ولندیزی نے کہا۔ "لیکن تمہیں ایک بات سے متنبہ کرتا ہوں: تم جہاں بھی جاؤ گے باپ کی بددعا تمہارا پیچھا کرے گی۔"

"یوں ہی سہی،" یولیس نے کہا۔

اپنے بیٹے کے عزم پر متحیر اور قدرے مستحضر ولندیزی، جس کے چہرے کا تاثر جلد ہی مسکراہٹ میں ڈھل گیا تھا، پیرٹوں کے جھنڈ میں اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ اس کی بیوی انڈین عورتوں کے خوب صورت انداز میں اس کے عقب میں کھڑی تھی۔

یولیس نے پچانک بند کیا تو ولندیزی بولا۔

"زندگی سے بار کر،" اس نے کہا، "وہ تمہارے اندازے سے پہلے لوٹ آئے گا۔"

"تم کتنے احمق ہو،" اس کی بیوی نے آد بھری۔ "وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔"

اس بار یولیس کو کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی کہ ارندر کہاں ہے۔ اس نے خوراک اور آرام کے لیے چھپ کر، اور بعض اوقات محض خطرے سے لطف اندوز ہونے کی خاطر چوریاں کرتے ہوئے، صحرا سے گزرنے والے ٹرکوں میں سفر کیا، حتیٰ کہ اسے خیمہ مل گیا، جو اب ایک ایسے ساحلی شہر میں تھا جے شیشے کی عمارتیں شہر چراغاں کا تاثر دے رہی تھیں، اور جہاں اروبا کے جزیرے کے لیے لنگر اٹھانے والے جہازوں کے شینہ الوداعیے گونجا کرتے تھے۔ ارندرا مسہری سے زنجیر بہ پاسور ہی تھی۔ وہ ساحل پر ڈوبے ہوئے شخص کی اُسی حالت میں تھی جس میں اس نے یولیس کو پکارا تھا۔ یولیس اسے جگانے بغیر تادیر کھڑا دیکھتا رہا، لیکن اس کی نظروں میں ایسی شدت تھی کہ ارندرا جاگ اٹھی۔ انھوں نے اندھیرے میں ایک دوسرے کو چومنا، آہستگی سے سہلایا اور ایک گنگ ملائمت اور پنہاں مسرت کے ساتھ، جو پہلے سے کہیں زیادہ محبت سے مشابہ تھی، ہنسنے کے انداز سے بے لباس ہو گئے۔

خیمے کے پرلے سرے پر سوئی ہوئی دادی نے ایک حیران کن کروٹ لی اور بڑبکنے لگی۔

"یہ اس زمانے کی بات ہے جب یونانی جہاز آیا،" وہ بولی۔ "اس کا عملہ دیوانوں پر مشتمل تھا۔ انھوں نے عورتوں کو شاد کام کیا لیکن انھیں ادائیگی پیسوں سے نہیں بلکہ اسفنج کے ٹکڑوں سے

کی، زندہ اسفنج کے ٹکڑوں سے جو بعد ازاں مریضوں کی طرح کراہتے ہوئے، گھروں میں چلتے پھرتے تھے، جنہیں دیکھ کر ہنستے ہنستے بچوں کے آنسو ٹپک آتے تھے۔
اس نے جُھجھری لی اور بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔
"میرے خدا، یہی زمانہ تھا جب وہ آیا،" وہ چلائی۔ "قوی، دراز قد اور لمبے س سے کہیں زیادہ
مرد۔"

یولیس، جس نے اس وقت تک ہڈیاں پر کوئی توجہ نہیں کی تھی، دادی کو بستر میں بیٹھتے دیکھ کر چپینے کی کوشش کرنے لگا۔ ارندرا نے اسے تسلی دی۔
"ڈرو نہیں،" اس نے یولیس سے کہا۔ "ہر بار جب وہ اس حصے پر پہنچتی ہے تو بستر میں اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے، لیکن جاگتی کبھی نہیں۔"
یولیس اس کے کندھے پر سے جھک کر دیکھنے لگا۔

"میں اس شب مناہوں کے ساتھ گاربی تھی کہ مجھے ایک زلزلہ محسوس ہوا،" دادی کہتی رہی۔
"آوروں نے بھی یہی سمجھا ہو گا کیوں کہ وہ چہنٹے چٹاتے، ہنسی سے بے قابو، ہجاک لیے اور چتر کے نیچے وہ تنہا کھڑا رہ گیا۔ یہ واقعہ مجھے اس طرح یاد ہے جیسے کل ہی گزرا ہو۔ میں وہی گیت گاربی تھی جو ان دنوں ہر ایک کی زبان پر تھا۔ صحن میں طوطے بھی یہی گیت گاتے تھے۔"
تاثر سے خالی، ٹھس آواز میں، جیسے کوئی نیند ہی میں گا سکتا ہے، وہ اپنی تلخی کے یہ مصرعے گانے لگی:

خدا، اے خدا، میری معصومیت کر دے واپس مجھے
کہ میں پھر سے اس کی محبت کو محسوس کرنے لگوں
اب یولیس کو دادی کے نوستلیا میں دل چسپی پیدا ہو چکی تھی۔

"وہ میرے سامنے تھا،" دادی کہہ رہی تھی۔ "اپنے کندھے پر طوطا بٹھائے اور باتھ میں چوڑی نال والی آدم خور مار بندوق لیے۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے گواتارل گیانا میں داخل ہو رہا ہو۔ جب اس نے میرے مقابل کھڑے ہو کر بات کی تو میں نے اس کا نفس مرگ اپنے چہرے پر محسوس کیا: میں دنیا کے گرد ہزاروں چکر لگا چکا ہوں۔ میں نے ہر قوم کی عورتیں دیکھی ہیں، اور میں ذاتی تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ تم روئے زمین پر سب سے پُر غرور اور سب سے خوش خلق، سب سے حسین عورت ہو۔"

وہ پھر سے لیٹ گئی اور نیکیے میں منہ دے کر سبکیاں بھرنے لگی۔ یولیس اور ارندرا دیر تک خاموش رہے۔ ان کی پرچھائیاں سوئی ہوئی بوڑھی عورت کے بے پناہ تنفس سے بل رہی

گا۔ بریل گارسیا مارکیز

تھیں۔ اچانک ارندرا نے، جس کی آواز میں ذرا بھی لرزش نہ تھی، پوچھا:
"تم اسے قتل کر سکتے ہو؟"

حیرت زدہ یولیس سے جواب نہ بن پڑا۔

"کون جانے!" اس نے کہا۔ "تم کر سکتی ہو؟"

"نہیں،" ارندرا نے کہا۔ "وہ میری دادی ہے۔"

یولیس نے ایک بار اور خوابیدہ جسم پر نظر ڈالی، گویا اس کی کیفیتِ حیات کو ناپ رہا ہو،
اور فیصلہ کر لیا:

"تمہاری خاطر میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔"

اس نے ایک پونڈ چو بے مار زہر خرید کر پھینٹی ہوئی کریم اور رس بھری کے جام میں ملا دیا،
اور یہ زہر بلا مادہ ایک پیسٹری میں بھر دیا، جسے اس نے پہلے سے کھوکھلا کر رکھا تھا۔ پھر سطح پر تھوڑی
سی گاڑھی کریم لگا کر اسے چمچے سے اس طرح ہموار کر دیا کہ اس کی سنسنی خیز چال کا کوئی سراغ نہ
رہا، اور یوں اس فریب کو بہتر نسخی گلابی شمعیں لگا کر مکمل کر دیا۔
تخت پر نیم دراز دادی نے جب اسے سالگرہ کا کیک لیے خیمے میں آتے دیکھا تو اپنی خوفناک
لاٹھی گھماتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تم! گستاخ شیطان!" وہ چلائی۔ "تمہیں یہاں قدم رکھنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"
یولیس اپنے ملکوتی چہرے کے پیچھے چھپ گیا۔

"میں معافی مانگنے آیا ہوں،" اس نے کہا۔ "آج آپ کی سالگرہ ہے نا؟"

دادی نے اس کے کارگر جھوٹ سے پسج کر میز اس طرح لگوائی گویا شادی کی دعوت ہو۔
ارندرا جب تک کھانا چنتی، دادی نے یولیس کو اپنے دائیں طرف بٹھایا اور ایک زوردار پھونک
سے شمعیں بجھانے کے بعد کیک کو دو برابر حصوں میں کاٹ دیا۔ اس نے یولیس کو کیک پیش
کیا۔

"جو شخص اپنے آپ کو بخوانا جانتا ہے، سمجھو کہ اس نے آدھی جنت حاصل کر لی،" وہ
بولی۔ "میں کیک کا پہلا حصہ تمہیں دے رہی ہوں، جو اصل میں تمہارا حصہ خوشی ہے۔"
"مجھے یسعی چیزیں پسند نہیں،" یولیس نے کہا۔ "آپ لیجیے۔"

دادی نے ایک ٹکڑا ارندرا کو دیا۔ وہ اسے باورچی خانے میں لے گئی اور کوڑے دان میں

پینک دیا۔

باقی لیک اکیلی دادی نے کھایا۔ لطف سے کراہتی اور اپنی مسرت کے سرور سے یولیس کو دیکھتی ہوئی وہ پورے پورے کھڑے منہ میں رکھتی اور چائے بغیر نگل جاتی۔ جب اس کی پلیٹ خالی ہو گئی تو اس نے وہ بھی کھالیا جس سے یولیس نے انکار کر دیا تھا۔ آخری کھڑا ٹکٹے ہوئے اس نے میز پوش پر سے بچے کچھے ذرے سمیٹے اور انہیں منہ میں رکھ لیا۔

اس نے سسکیا کی اتنی مقدار کھالی تھی جو چوبھوں کی ایک پوری نسل کا قلع قمع کرنے کو کافی تھی۔ اس کے باوجود وہ نصف شب تک پیا نو بجاتی اور گاتی رہی، خوش و خرم سونے کے لیے لیٹی اور معمول کی نیند سوئی۔ کوئی بات خلافِ معمول تھی تو اس کے تنفس میں پتھر جیسی کھڑکھڑاہٹ تھی۔

ارندرا اور یولیس دوسرے بستر پر سے اس پر نظر رکھتے ہوئے تھے۔ وہ اس کے دم واپس کے منتظر تھے۔ لیکن جب اس نے بذیان بکنا شروع کیا تو اس کی آواز ہمیشہ کی طرح جیتی جاگتی تھی۔

"میں پاگل ہو گئی تھی، میرے خدا، میں پاگل ہو گئی تھی!" وہ چلائی۔ "میں نے خواب گاہ کے دروازے پر دو بنیاں لگائیں کہ وہ اندر نہ آسکے۔ دروازے کے آگے الماری اور میز رکھی اور میز پر کرسیاں۔ اور ان تمام حصاروں کے ٹوٹنے کے لیے، کرسیوں کے میز سے خود بخود گرنے کے لیے، میز اور الماری کے خود بخود علیحدہ ہونے کے لیے، بلیوں کے اپنے کھانپوں میں سے خود بخود ٹکٹے کے لیے، اسے صرف اپنی انگوٹھی سے ہلکی سی دستک دینی پڑی۔"

ارندرا اور یولیس فزوں جوتی ہوئی حیرت کے ساتھ اسے دیکھ رہے تھے، کہ بذیان زیادہ گھبرا اور ڈرامائی ہوتا جا رہا تھا اور آواز زیادہ مانوس۔

"میں خوف سے پسینے میں نہائی ہوئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں مر رہی ہوں۔ میں دل ہی دل میں دما مانگ رہی تھی کہ دروازہ کھلے بغیر ہی کھل جائے، وہ اندر آئے بغیر اندر آ جائے، لوٹ کر چلا نہ جائے لیکن واپس بھی نہ آئے، کہ مجھے اس کو قتل نہ کرنا پڑے!"

وہ اس ڈرامے کو، حتیٰ کہ اس کی سب سے نجی جزئیات کو بھی گھنٹوں دہراتی رہی، جیسے انہیں اپنے خواب میں پھر سے جی رہی ہو۔ فجر سے ذرا قبل وہ کسی بھونچال میں زمین کے ہلنے کی طرح بستر میں لوٹنے لگی اور سسکیوں کی بتات سے اس کی آواز بیٹھ گئی۔

"میں نے اسے تنبیہ کی لیکن وہ ہنس دیا۔" وہ چلائی۔ "میں نے اسے پھر تنبیہ کی اور وہ پھر ہنس دیا۔ اور پھر دہشت میں اس نے اپنی آنکھیں یہ کہتے ہوئے کھولیں: آہ، رانی! آہ، رانی۔ لیکن

آواز اس کے منہ سے نہیں، بلکہ اس شگاف سے نکل رہی تھی جو چاقو نے اس کے گلے میں ڈال دیا تھا۔"

دادی کے خوفناک اعتراف سے دہشت زدہ یولیس نے لپک کر ارندرا کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"قاتل بڑھیا!" وہ چلایا۔

ارندرا نے اس پر توجہ نہیں کی، کہ اس لمحے پوچھنے لگی تھی۔ گھڑیاں پانچ بج رہے تھے۔
"جاؤ!" اس نے کہا۔ "وہ اب جاگنے والی ہے۔"

"بڑھیا میں تو باقی سے زیادہ جان ہے۔" یولیس بولا۔ "ایسا ہو نہیں سکتا!"
ارندرا نے اسے نیکی نظروں سے دیکھا۔

"مشکل یہ ہے،" وہ بولی، "کہ تم کسی کو قتل کرنے کے قابل نہیں ہو۔"

یولیس پر اس ملامت کے بھونڈے پن کا اتنا اثر ہوا کہ وہ خیمے سے نکل گیا۔ ارندرا خوابیدہ
دادی کو اپنی چھپی ہوئی نفرت اور مایوسی کے اشتعال سے دیکھتی رہی یہاں تک کہ سورج نکل آیا اور
فضا پرندوں کے شور سے جاگ اٹھی۔ دادی نے آنکھیں کھولیں اور اسے پُر سکون مسکراہٹ سے
دیکھا۔

"خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے، بچی۔"

دادی کے معمولات میں واحد نمایاں تبدیلی بے ترتیبی کی ابتدا تھی۔ اگرچہ وہ بدھ کا دن تھا
لیکن وہ اتوار کا لباس پہننا چاہتی تھی۔ اس نے طے کیا کہ ارندرا گیارہ بجے سے پہلے کسی کا استقبال
نہیں کرے گی۔ اس نے ارندرا سے اپنے ناخن سرخ کرنے کو کہا اور سر کے لیے گرجے والا روال
مانگا۔

"مجھے تصویر کھنپوانے کی اتنی شدید خواہش کبھی نہیں ہوئی،" اس نے بلند آواز میں کہا۔

ارندرا اس کے بال سنبارنے بیٹھی، لیکن جب اس نے بالوں میں لنگھی پھیری تو بالوں کا
ایک گچھا لنگھی کے دانتوں میں پھنسا رہا۔ اس نے چونک کر ٹوٹے ہوئے بال دادی کو دکھائے۔
دادی نے انہیں ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ اس نے اپنی انگلیوں سے ایک اور ٹکڑی کھینچی اور اس کے
ہاتھوں میں بالوں کا ایک اور گچھا آگیا۔ اس نے اسے زمین پر پھینک دیا اور یہی عمل دوبارہ کیا۔ اس
کے ہاتھ میں پہلے سے بھی بڑا گچھا آیا۔ پھر بنسی سے بے قابو ہو کر وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے بال
نوپچنے لگی اور ایک ناقابل فہم مسرت کے ساتھ مٹھیاں بھر بھر کے بال ہوا میں اڑانے لگی حتیٰ کہ
اس کا سر چلے ہوئے ناریل جیسا ہو گیا۔

ارندرا کو یولیس کی خبر نے دہشتے ہو چکے تھے کہ اس نے خیمے کے باہر انوکھی آواز سنی۔

داوی پیا نوبجانے بیٹھ چکی تھی۔ وہ اپنے نوستلیا میں اتنی مومتی کہ اسے حقیقت کی خبر ہی نہیں تھی۔ اس کے سر پر چمک دار پَرّوں کی وگ تھی۔

ارندرا نے آواز کا جواب دیا اور تہی وہ فلیتہ دیکھا، جو پیا نو سے ٹکل کر جھاڑیوں کے نیچے سے ہوتا ہوا تاریکی میں گم ہو رہا تھا۔ وہ اُدھر دوڑ پڑی جہاں یولیس تھا اور اس کے برابر جھاڑیوں میں چھپ گئی۔ وہ دو نو دھڑکتے دلوں کے ساتھ اس ننھے سے نیلے شے کو دیکھتے رہے جو فلیتے پر رہنکتا ہوا، اندھیرے فاصلے کو عبور کرتا ہوا خیے میں داخل ہو گیا۔

”کان ڈھانپ لو،“ یولیس نے کہا۔

ان دونوں نے ایسا ہی کیا، گو اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی، کیوں کہ دھماکا نہیں ہوا۔ خیے کا اندرونی حصہ درخشاں سرنخی کے ساتھ روشن ہو کر خاموشی سے پھٹا اور خم بارود کے بگولے میں غائب ہو گیا۔ ارندرا نے یہ سمجھتے ہوئے کہ داوی مر چکی ہے، جب اندر جانے کی ہمت کی، تو اسے اور اس کی وگ کو چھلکا ہوا اور اس کی شب خوابی کی قمیص کو پرزہ پرزہ پایا۔ لیکن داوی، جو کھل سے اگل بجانے کی کوشش کر رہی تھی، پہلے سے زیادہ جیتی جاگتی لگ رہی تھی۔

یولیس انڈین خدمت گاروں کی چیخ پکار سے فائدہ اٹھا کر کھسک گیا کہ انہیں داوی کے متصاد احکام نے بوکھلادیا تھا اور وہ گوگو کے عالم میں تھے۔ بالآخر جب انہوں نے شعلوں پر قابو پایا اور دھوئیں سے چھٹکارا حاصل کیا تو ان کے سامنے گویا کسی جہاز کی تباہی کا منظر تھا۔

”یہ تو شیطان کی کارستانی لگتی ہے،“ داوی نے کہا۔ ”پیا نو اس طرح نہیں پھٹا کرتے۔“

اس نئی تباہی کی وجوہات معلوم کرنے کے لیے داوی نے ہر طرح کی قیاس آرائی کی، لیکن ارندرا کا ہر مند گریز اور جذبات سے عاری رویہ اس کے الجھاؤ پر ہی منتج ہوا۔ وہ اپنی پوتی کے طرز عمل میں معمولی سی دراڑ بھی نہ پاسکی اور نہ ہی اس نے یولیس کی موجودگی پر غور کیا۔ مفروضات کو جوڑتی ہوئی اور نقصان کا تخمینہ لگاتی ہوئی وہ صبح تک جاگتی رہی۔ وہ کم سوئی اور وہ بھی ٹھیک سے نہیں۔ اگلی صبح جب ارندرا نے سونے کی سلاخوں والی صدری اس کے جسم سے اتاری تو اسے داوی کے شانوں پر چمالے اور سینے پر گوشت نکلا نظر آیا۔ ”میں نیند میں یوں ہی کروٹیں نہیں لے رہی تھی،“ اس نے ارندرا سے کہا جو اس کے جملے ہوئے زخموں پر انڈوں کی سفیدی لگا رہی تھی۔ ”اور اس کے علاوہ میں نے ایک عجیب خواب بھی دیکھا ہے۔“ اس نے عکس تازہ کرنے کے لیے ذہن پر زور ڈالا یہاں تک کہ وہ اس کی یادداشت میں اتنا ہی روشن ہو گیا جتنا خواب میں تھا۔

”وہ سفید جھولنے میں ایک مور تھا،“ اس نے کہا۔

ارندرا حیران رہ گئی لیکن اس نے فوراً ہی ایک بار پھر اپنا روزمرہ کا انداز اختیار کر لیا۔

"یہ تو اچھی علامت ہے،" اس نے دروغ گوئی کی۔ "خوابوں میں مور طویل عمروں والے بانور ہوتے ہیں۔"

"خدا تمہارا کہا قبول کرے،" دادی نے کہا۔ "کیوں کہ ہم وہیں پہنچ گئے ہیں جہاں سے چلے تھے۔ ہمیں پھر سے آغاز کرنا ہو گا۔"

اریندرا نے اپنا تاثر تبدیل نہیں کیا۔ وہ دادی کو چھوڑ کر، جس کا دھڑاندوں کی سفیدی سے تر اور کھوپڑی رائی کے لیپ سے پتی ہوئی تھی، لیپ کا برتن لیے خیمے سے باہر چلی گئی۔ وہ پام کے چیمبر میں، جوان کا باورچی خانہ تھا، مزید اندوں کی سفیدی برتن میں ڈال رہی تھی کہ اس نے چولے کے عقب میں یولیس کی آنکھیں اسی طرح نمودار ہوتے دیکھیں جس طرح پہلی بار اپنے بستر کے پیچھے دیکھی تھیں۔ وہ چونکی نہیں لیکن تھکی ہوئی آوازیں اس سے کہا:

"تم کچھ کر سکتے ہو تو صرف میرے قرض میں اضافہ کر سکتے ہو۔"

یولیس کی آنکھیں شوش سے دھندلا گئیں۔

وہ بت بنا خاموشی سے نظریں جمائے اریندرا کو دیکھ رہا تھا، جو اپنے چہرے پر مکمل حقارت کا مستقل تاثر لیے اس طرح اندھے توڑ رہی تھی گویا وہ موجود ہی نہ ہو۔ لمحہ بھر کے بعد اس کی نظروں نے حرکت کی اور وہ باورچی خانے میں رکھے ہوئے برتنوں، ریشے کی ڈوریوں اور گوشت کاٹنے والے چاقو کو ٹٹولنے لگیں۔ وہ کھڑا ہوا اور اسی خاموشی سے چیمبر کے نیچے جا کر پاقواٹھا لیا۔

اریندرا نے اس پر دوبارہ نظر نہیں ڈالی لیکن جب وہ چیمبر سے نکلا تو اس نے بہت مددحم آوازیں اسے بتایا:

"ذرا احتیاط سے، اسے پہلے ہی موت کی آگاہی ہو چکی ہے۔ اس نے خواب میں سفید جھولنے والامور دیکھا ہے۔"

دادی نے یولیس کو چاقو لیے اندر آتے دیکھا تو ایک انتہائی کوشش سے لاشمی کے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے بازو اٹھا دیے۔

"ڑکے!" وہ چیخی۔ "کیا تو پاگل ہو گیا ہے؟"

یولیس نے اس پر چلائنگ لگائی اور پاقواٹھ کے عریاں سینے میں گھونپ دیا۔ دادی کراہتے ہوئے اس پر گری اور اپنے رچہ پیسے طاقتور بازوؤں میں اس کا گلہ گھونٹنے لگی۔

"کتیا کے جتنے!" وہ غرائی۔ "مجھے بڑی دیر میں بتا چلا کہ تیرا چہرہ کسی غدار فرشتے کا چہرہ ہے۔"

وہ کچھ اور کہنے کے قابل نہ تھی، کہ یولیس نے پاقو چھڑا کر اس کے پہلو میں دوبارہ گھونپ

دیا تھا۔ دادی کے منہ سے ایک مدھم سی کراہ نکلی اور اس نے پہلے سے زیادہ شدت سے اپنے حملہ آور کو بھیج لیا۔ یولیس نے ترس کھائے بغیر اس پر تیسرا وار کیا اور شدید دباؤ سے نکلتا ہوا خون کا فوارہ اس کے چہرے پر چھینٹیں ڈال گیا۔ یہ چکنا خون تھا، چمکیلا اور سبز، بالکل پودینے والے شد جیسا۔

ارندرا ہاتھ میں برتن لیے دروازے پر نمودار ہوئی اور اس کشمکش کو جہان بے حسی سے دیکھنے لگی۔

غصے اور درد سے دباؤتی ہوئی، سنگی ستون کی طرح ٹھوس اور درازقد دادی نے یولیس کے جسم کو بکڑ لیا۔ اس کے بازو، ٹانگیں، حتیٰ کہ گنہی کھوپڑی بھی خون سے سبز تھی۔ اس کے دھوکنی جیسے تنفس کی آواز، جو نزع کے اولین غرغروں سے بگڑ چکی تھی، سارے خیمے میں گونج رہی تھی۔ یولیس، جو ایک بار پھر اپنا ہتھیار والا بازو چھڑوا کر اس کے پیٹ میں شکاف ڈالنے میں کامیاب رہا تھا، خون کے ایک زوردار بہاؤ سے سر سے پاؤں تک سبز ہو گیا۔ دادی نے کھلی ہوا میں پھینچنے کی کوشش کی، جس کی اسے اب زندہ رہنے کے لیے ضرورت تھی، لیکن منہ کے بل گر پڑی۔ یولیس نے اپنے آپ کو اس کے مردہ بازوؤں سے چھڑایا اور ایک لمحہ توقف کیے بغیر اس گرے ہوئے بیماری بھر کم جسم پر آخری وار کیا۔

ارندرا نے برتن میز پر رکھا اور دادی پر جھکتے ہوئے، اسے بھجوتے بغیر دیکھنے لگی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ مر چکی ہے تو یکایک اس کے چہرے نے عمر کی وہ ساری بلوغت حاصل کر لی جو اس کی بیس سالہ بد بختی نے اسے نہیں دی تھی۔ تیز اور بے گم و سکت حرکات کے ساتھ اس نے سونے والی صدی قابو میں کی اور خیمے سے نکل گئی۔

یولیس جو اس جدوجہد سے بری طرح تنک چکا تھا، لاش کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ جتنا زیادہ اپنے چہرے کو صاف کرنے کی کوشش کرتا، وہ اتنا ہی زیادہ اس سبز اور جیتے جاگتے مادے سے لٹھڑا رہا تھا جو اس کی انگلیوں سے بہتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اسے اپنی حالت کا احساس صرف اسی وقت ہوا جب اس نے ارندرا کو سونے والی صدی لیے باہر جاتے دیکھا۔

اس نے ارندرا کو پکارا لیکن اسے جواب نہ ملا۔ وہ گھسٹتا ہوا خیمے کے دروازے تک آیا تو ارندرا ساحل کے ساتھ ساتھ شہر سے دور بھاگتی نظر آئی۔ پھر اس نے دردناک چیخوں کے ساتھ پکارتے ہوئے، جواب عاشق سے زیادہ بیٹے کی تمہیں، تعاقب کرنے کی آخری کوشش کی، تاہم کسی کی مدد کے بغیر ایک عورت کو قتل کرنے کی ہولناک ٹھکان اس پر حاوی آگئی۔ وہ ساحل پر منہ کے بل پڑا تنہائی اور خوف سے رو رہا تھا کہ دادی کے انڈین خدمت گاروں نے اسے آیا۔

ارندرا نے اس کی آواز نہیں سنی تھی۔ وہ ہرن سے سبک تر، ہوا میں دوڑ رہی تھی اور اس دنیا کی کوئی آواز اسے نہیں روک سکتی تھی۔ وہ گردن موڑ کر دیکھے بغیر شورے کے گڑھوں، ابرق کے دبانوں اور جھونپڑوں کی ویرانی کو پیچھے چھوڑتی ہوئی دوڑتی چلی گئی یہاں تک کہ سمندر کا فطری منظر ختم ہو گیا اور صحرا شروع ہو گیا، لیکن وہ سونے کی صدی کے ساتھ بانجھ ہواؤں اور غیر مختتم شاموں سے پرے دوڑتی رہی۔ کسی نے اس کے بارے میں پھر سنا اور نہ کبھی اس کی بدبختی کا کوئی سراغ ملا۔

گا بریٹل گارسیا مارکیز

ترجمہ: راشد مفتی

محبت کے اُس پار منتظر موت

سینیٹر اونیسموسا نجیز کے پاس مرنے سے پہلے چھ مہینے اور گیارہ دن تھے کہ اُسے وہ عورت ملی جو اس کی زندگی کا حاصل تھی۔ ان کی ملاقات روزل دیل ویرے نامی ایک گھمٹام سے گاؤں میں ہوئی جو رات کے وقت اسمگلروں کے جہازوں کے لیے خفیہ بندرگاہ کا کام دیتا تھا اور، دوسری طرف، روز روشن میں کسی انتہائی ناکارہ صحرائی راستے کی طرح ایسے سمندر پر کھلتا نظر آتا تھا جو نہ صرف بے سمت اور بے کیف تھا، بلکہ ہر جگہ سے اتنی دور تھا کہ وہاں کسی ایسے شخص کے رہنے کا خیال بھی نہیں آ سکتا تھا جو کسی کی تقدیر بدلنے پر قادر ہو۔ اس گاؤں کا نام بھی ایک طرح کا مذاق تھا، کہ وہاں دستیاب واحد گلاب کا پھول سینیٹر اونیسموسا نجیز نے۔۔ اُس سہ پہر جب وہ لورافارنا سے ملا۔۔ خود اپنی قمیض میں لگا رکھا تھا۔

یہ اُس استغابی مہم کا ایک ناگزیر پڑاؤ تھا جو سینیٹر ہر چوتھے سال چلایا کرتا تھا۔ تماشے والی گاڑیاں صبح ہی آچکی تھیں۔ ان کے بعد مقامیوں سے بھرے ہوئے ٹرک آئے، جنہیں مختلف قسموں میں جلووں کی حاضری بڑھانے کے لیے کرائے پر لایا جاتا تھا۔ گیارہ بجے سے ذرا قبل موسیقی، آتش بازی اور حواریوں کی جیسپوں کے جلو میں اسٹرابری سوڈے کی سی رنگت والی بڑی سی

وزارتی گاڑی نمودار ہوئی۔ ایر کنڈیشننگ کار میں سینئر اونیسمو سانچیز موسم سے بے نیاز، پرسکون بیٹھا تھا، لیکن جوں ہی اس نے دروازہ کھولا، گرم ہوا کے تھپیڑے نے اسے بلادیا۔ اس کی غافل ریشم کی قمیص ایک طرح کے ٹورنگ سوپ میں بھیگ گئی اور وہ خود کو اپنی عمر سے کئی سال بڑا اور پہلے سے کہیں زیادہ تنہا محسوس کرنے لگا۔ حقیقی زندگی میں وہ ابھی ابھی بیالیس سال کا ہوا تھا۔ اس نے گونگن سے اعزاز کے ساتھ میٹلر جیکل انجینئر کی حیثیت سے گریجویشن کیا تھا۔ وہ ناقص طور پر ترجمہ کی ہوئی لاطینی کلاسیکی کتابوں کا مشتاق قاری تھا، گو اس مطالعے سے اسے کچھ زیادہ حاصل نہ تھا۔ اس نے ایک خوش دل جرمن عورت سے شادی کی تھی، جس سے اس کے پانچ بچے تھے جو سب کے سب اپنے گھر میں مسرور تھے۔ ان سب سے زیادہ مسرور وہ خود تھا، تاآنکہ، تین ماہ قبل، اسے بتایا گیا کہ اگلے کرسمس تک وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے مرجھا ہوگا۔

جب تک جلسہ عام کی تیاریاں مکمل ہوتیں، سینئر نے اس مکان میں جو اس کے لیے مخصوص کیا گیا تھا، آرام کے لیے ایک گھنٹا نکال لیا۔ لیٹنے سے قبل اس نے پانی سے بھرے گلاس میں وہ گلاب ڈال دیا جسے اس نے سارے صحرا کے سفر میں زندہ رکھا تھا، پریرنی غذا کھائی جو وہ ساتھ رکھتا تھا تاکہ بکری کے گوشت کے تلے ہوئے ٹکڑوں سے بچ سکے جو باقی دن میں اس کے سامنے بار بار آنے والے تھے، اور وقت سے پہلے کئی دردگش گولیاں کھائیں تاکہ درد اٹھے تو اس کا مددوا پہلے سے موجود ہو۔ پھر اس نے بجلی کا پینچا چھولنے کے نزدیک کیا اور برہنہ ہو کر پندرہ منٹ کے لیے گلاب کے سائے میں دراز ہو گیا۔ اونگھنے کے دوران موت کے خیال سے دھیان بٹانے کے لیے اسے انتہائی کاوش کرنا پڑی۔ ڈاکٹروں کے سوا یہ بات کسی کو معلوم نہ تھی کہ اسے ایک مقررہ میعاد کی سزا ملی ہے، کیوں کہ اس نے اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی لائے بغیر اس راز کو اکیلے ہی برداشت کرنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن اس کا باعث فخر نہیں بلکہ شرم تھی۔ آرام کرنے اور نہانے دھونے کے بعد جب تین بجے سہ پہر وہ جلے میں آیا تو خود پر مکمل قابو محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کھردری لہن کی پتلون اور پھولوں والی قمیص پہن رکھی تھی، اور اس کی روح دردگش گولیوں سے سبھالا لے چکی تھی۔ تاہم موت کی کاٹ اس کے اندازے سے کہیں زیادہ مضرت رساں تھی کیوں کہ پلیٹ فارم پر چڑھتے ہی اس نے ان لوگوں کے لیے ایک عجیب سی تحقیر محسوس کی جو اس سے ہاتھ ملانے کی خوش بختی کے لیے لڑ رہے تھے، اور گزشتہ کے برعکس اسے ان برہنہ پامتھیوں پر افسوس نہیں ہوا جو چھوٹے سے بچہ چوک میں شور کے گرم ڈولوں کی تپش پہ مشکل برداشت کر پارہے تھے۔ اس نے تالیوں کے شور کو، تقریباً طیش میں آتے ہوئے، اپنے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور گرمی سے ہانپتے سمندر پر نظریں جمائے

ہوے، اپنے ہاتھوں کو حرکت دیے بغیر بولنا شروع کر دیا۔ اس کی پُپی ٹکلی گھری آواز میں پُر سکون پانی کی سی کیفیت تھی۔ لیکن اپنی رٹی ہوئی اور بار بار دوہرائی ہوئی تقریر اس کی زبان پر سچی بات کی طرح نہیں، بلکہ مارکس اور یلینس کے "مراقبات" کی کتاب چہارم میں درج کسی جبریہ فیصلے کے منقاد کے طور پر ابھری تھی۔

"ہم یہاں فطرت کو شکست دینے آئے ہیں،" اس نے اپنے تمام معتقدات کے برعکس آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "اب ہم اپنے ملک میں تا پر ساں نہیں دیں گے، پیاس اور دشوار آب و ہوا کی اس مملکت میں غذائی یتیم نہیں دیں گے، اپنی زمین پر جلاوطن نہیں دیں گے۔ ہم ایک مختلف قوم ہوں گے، خواتین و حضرات، ہم ایک عظیم اور مسرور قوم ہوں گے۔"

اس تماشے کا ایک خاص ڈھب تھا۔ اس کی تقریر جاری تھی کہ اس کے نائبین نے کاغذی پرندوں کے ٹھنڈے ہوا میں اچھال دیے۔ ان مصنوعی مخلوقات میں جان سی پڑ گئی اور وہ تختوں کے بنے ہوئے پلیٹ فارم پر سے اڑتی ہوئی سمندر کی طرف چلی گئیں۔ اسی دوران دوسرے آدمیوں نے گاڑیوں میں سے نمندے کے پتوں والے مصنوعی درخت نکال کر جموں کے عقب میں شور زدہ زمین میں لگا دیے۔ انھوں نے یہ سوانگ گتے کا پیش منظر لگا کر مکمل کیا، جس میں سرخ اینٹوں اور شیشے کی کھڑکیوں والے جھوٹے موٹ کے مکان بنے تھے، اور اس طرح انھوں نے حقیقی زندگی کے خستہ حال جھوپڑوں کو ڈھانپ دیا۔

اس سوانگ کو مزید وقت دینے کے لیے سینٹر نے اپنی تقریر کو لاطینی کے دو اقتباسات کے ذریعے طویل کر دیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ بارش برسانے والی مشینیں، غذائی جانوروں کی افزائش کے دستی آلات، شورے میں سبزیاں اور کھڑکیوں میں پھول اگانے والا روغنِ مسرت فراہم کرے گا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی افسانوی دنیا تیار ہے تو اس کی طرف اشارہ کیا: "ہماری دنیا ایسی ہوگی، خواتین و حضرات!" اس نے بلند آواز سے کہا، "دیکھیے! ہماری دنیا ایسی ہوگی۔"

حاضرین نے مڑ کر دیکھا۔ رنگ دار کاغذ کا بنا ہوا ایک بحری جہاز، جو اس مصنوعی شہر کی بلند ترین عمارتوں سے بھی اونچا تھا، مکافوں کے عقب سے گزر رہا تھا۔ یہ بات صرف سینٹر ہی نے محسوس کی کہ بار بار لگانے، اتارنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے باعث گتے کا شہر شدید موسمی اثرات سے بُری طرح متاثر ہو چکا ہے اور اب اتنا ہی خستہ و خراب ہے جتنا خود یہ روزِ دل و رے کا گاؤں۔

بارہ سال میں یہ پہلا اتفاق تھا کہ نیلسن فارینا سینٹر کا سواگت کرنے نہیں گیا۔ اس نے

اپنے باقی ماندہ قیلو لے کے دوران گھر کے ایک ٹھنڈے کچ میں جمولنے پر لیٹے لیٹے تقریر سنی۔ تاثر شدہ تختوں کا یہ گھر اس نے انہی دواساز باتوں سے بتایا تھا جن سے اپنی پہلی بیوی کو گھسیٹ کر اس کے ٹکڑے کیے تھے۔ وہ ڈیولز آئی لینڈ سے فرار ہو کر معصوم قوتوں سے لدے ہوئے ایک جہاز کے ذریعے روزل دیل ویرے میں وارد ہوا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک خوب صورت اور بے دین سیاہ فام عورت تھی جو اسے پارامارہو میں ملی تھی اور جس سے اس کی ایک بیٹی تھی۔ کچھ عرصے بعد یہ عورت فطری اسباب سے مر گئی اور اس طرح اُس عورت کے انجام سے بچ گئی جس کے ٹکڑوں نے اس کے گوبھی کے قسطے کو زرخیز کیا تھا، اور سالم حالت میں، ولندیزی نام کے ساتھ، مقامی قبرستان میں دفن ہوئی۔ لڑکی کو اپنے باپ کی زرد اور متحیر آنکھوں کے ساتھ اپنی ماں کا رنگ روپ ورٹے میں ملاتا تھا، یوں نیلسن کے پاس یہ تصور کرنے کی معقول وجہ تھی کہ وہ دنیا کی حسین ترین عورت کی پرورش کر رہا ہے۔

سینیٹر او نے سیمو سانچیز سے اُس کی پہلی انتخابی مہم کے دوران ملاقات ہونے کے دن سے نیلسن فارینا، قانون کی پہنچ سے دور ہونے کے لیے، اس سے درخواست کر رہا تھا کہ اسے جعلی شناختی کارڈ بنوادے۔ سینیٹر نے دوستانہ لیکن سخت انداز میں انکار کر دیا تھا، لیکن نیلسن فارینا نے امید کا دامن نہیں چھوڑا۔ وہ کئی سال تک، جب بھی اسے موقع ملتا، اپنی درخواست مختلف انداز سے دہراتا رہا۔ لیکن اس بار وہ قزاقوں کے اس جلتے ہوئے بحث میں اپنے جمولنے میں پڑا سر ہٹا رہا۔ اس نے استقامتی تالیاں سن کر اپنا سر اٹھایا اور، ہارڈ کے تختوں کے اوپر سے نظریں دوڑاتے ہوئے، سوانگ کا عقبی حصہ دیکھا جو عمارتوں کے پیل پائیوں، درختوں کے سہاروں اور بحری جہاز کو دھکیلنے ہوئے پوشیدہ فریب کاروں پر مشتمل تھا۔ اس نے کوئی نفرت محسوس کیے بغیر تھوک دیا۔

"ہونہ! سیاست کا شعبہ باز!" اس نے فرانسیسی میں تبصرہ کیا۔

تقریر کے بعد، جیسا کہ رواج تھا، سینیٹر موسیقی اور آتش بازی کے شور میں شہر کی گلیوں میں گھومنے لگا۔ اپنی اپنی پیتا سنا تے ہوئے شہر کے باسیوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ وہ ان کی شکایتیں خندہ پیشانی سے سن رہا تھا۔ اسے ہر ایک کو، کوئی خاص مہربانی کیے بغیر، مطمئن کرنے کا گڑھ تھا۔ چہ چھوٹے چھوٹے بچوں کے ہمراہ ایک مکان کی چھت پر استادہ عورت نے شور و غل اور آتش بازی کے ہنگامے میں جیسے تیسے اپنی آواز اس کے کانوں تک پہنچائی۔

"میں کوئی برمی چیز نہیں مانگ رہی ہوں، سینیٹر،" وہ بولی۔ "پچانسی پانے والے کے کنوئیں سے پانی لانے کے لیے صرف ایک گدھا۔"

سینیٹر نے چہ سوکھے بچوں پر نظر کی۔ "تمہارے شوہر کا کیا بتا؟" اس نے پوچھا۔
 "وہ قسمت آزمائے اُروبا کے جزیرے میں گیا تھا،" عورت نے خوش مزاجی سے جواب
 دیا، "لیکن وہاں ایک غیر ملکی عورت کا موبہا، اس طرح کی حواپنے دانتوں پر سیرے جڑتی ہیں۔"
 اس جواب نے قہقروں کا طوفان برپا کر دیا۔

"خوب!" سینیٹر نے فیصلہ کیا۔ "تھیں گدھا مل جائے گا۔"
 تھوڑی دیر بعد اس کا ایک نائب عورت کے گھر ایک اچالڈو گدھا چھوڑ گیا جس کے پٹھے
 پر آئٹھ رنگ سے ایک استخابی نعرہ لکھا تھا تاکہ لوگ سینیٹر کے تحفے کو بھول نہ جائیں۔
 گلی کی مختصر طوالت طے کرتے ہوئے اس نے دیگر چھوٹی چھوٹی نوازشات کیں۔ اس نے
 ایک بیمار آدمی کو، جس نے اسے گزرتا دیکھنے کے لیے اپنا بستر گھر کے دروازے پر لگوا لیا تھا،
 چچے سے دوا بھی پلائی۔ آخری ٹکڑ پر بارڈ کے تختوں کی جھریوں میں سے اس نے نیلسن فارمنا کو
 جھولنے میں لیٹے دیکھا جو زرد اور ملول نظر آ رہا تھا۔ تاہم سینیٹر نے کوئی لگاؤ ظاہر کیے بغیر اس
 کی مزاج پر سی کی۔

"ہیلو۔ کیسے ہو؟"

نیلسن فارمنا نے جھولنے میں کروٹ لی اور اپنی نظر کی اداسی سے اسے بھگودیا۔

"کون؟ میں؟ آپ جانتے ہی ہیں،" اس نے فراٹسیسی میں جواب دیا۔

اس کی بیٹی نے علیک سلیک کی آواز سنی تو وہ آنگن میں آگئی۔ اس نے مقامیوں کی گھٹیا
 سی پرانی گواہیرو پوشاک پہن رکھی تھی، سر پر رنگین کپڑے کی تتلیاں سجائیں تھیں اور چہرے پر
 دھوپ سے بچاؤ کے لیے رنگ ملا ہوا تھا؛ لیکن اس خستہ حالی میں بھی یہ تصور کرتا ممکن تھا کہ دنیا
 میں اس سے زیادہ حسین عورت، نہیں رہی ہوگی۔ سینیٹر دم بخود رہ گیا۔ "مارا گیا!" اس نے
 حیرت سے سانس لیا، "خدا بھی عجیب بدحواسیاں کرتا ہے!"

اس رات نیلسن فارمنا نے اپنی بیٹی کو بہترین پوشاک پہنا کر سینیٹر کے پاس بھیجا۔ دو
 راتوں بعد راتوں نے، جو عمارت کی گرمی کی شدت سے اوگتھ رہے تھے، اسے رابداری
 میں پڑی اکلوتی کرسی پر استعار کرنے کو کہا۔

سینیٹر دوسرے کمرے میں تھا جہاں وہ روزل دیل ویرے کے سر کردہ لوگوں سے ملاقات
 کر رہا تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اس غرض سے اکٹھا کیا تھا کہ اپنی تقریروں کے بچے کچھ نکتے ان
 کے کانوں میں اُبل سکے۔ وہ ان سب لوگوں سے جن سے سینیٹر کا صحرا کے سبھی شہروں میں
 ہمیشہ سابقہ پڑتا تھا، اس قدر مشابہ تھے کہ ان مستقل شیعہ اجلاسوں سے وہ خود تنگ آچکا تھا۔ اس

کی قمیص پسینے سے تر تھی اور وہ اسے اپنے بدن پر اس گرم ہوا سے سکھانے کی کوشش کر رہا تھا جو کمرے کی شدید گرمی میں کھردھکھی کی طرح بھنبھناتے ہوئے بجلی کے پتکھے سے آرہی تھی۔

"ہم کاغذی پرندے نہیں کھا سکتے،" وہ کہہ رہا تھا۔ "میں اور تم جانتے ہیں کہ جس دن بھی اس گوبر کے ڈھیر میں درخت اور پھول اُگے، جس دن بھی جوہروں میں کیڑوں کی جگہ مچھلیاں دکھائی دیں، اس دن یہاں تم نظر آؤ گے نہ میں۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

کسی نے جواب نہیں دیا۔ اس اثنا میں سینئٹر نے کیلنڈر سے ایک ورق پھاڑ کر اسے کاغذی تتلی کی شکل دے دی تھی۔ اس نے اس تتلی کو بغیر کسی خاص نشانے کے، پتکھے سے آنے والی ہوا کی رو میں اچھال دیا۔ تتلی کمرے میں ادھر ادھر اڑا کی اور پھر آدھ کھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔ سینئٹر نے موت کی ساز باز سے تقویت پاتے ہوئے ضبط کے ساتھ گفتگو جاری رکھی۔

"لہذا،" اس نے کہا، "مجھے وہ بات دوہرانے کی ضرورت نہیں جو تم پہلے ہی جانتے ہو۔ یعنی میرا دوبارہ انتخاب مجھ سے زیادہ تمہارے لیے سودمند ہے، کیوں کہ میں بند پانی اور پسینے کی بو سے تنگ آچکا ہوں جبکہ دوسری طرف تم لوگ روٹی اسی کی کھاتے ہو۔"

لورا فارینا نے کاغذی تتلی کو باہر آتے دیکھا۔ صرف اسی نے تتلی کو دیکھا کیوں کہ راہداری میں موجود محافظ اپنی رائفلوں کو لپٹائے، سیرمیسوں پر سوچکے تھے۔ چند گردشوں کے بعد کاغذی تتلی کی تہیں مکمل طور پر کھل گئیں اور وہ دیوار کے ساتھ چپک کر دیں جم گئی۔ لورا فارینا نے اسے اپنے ناخنوں سے کھرچ کر اتارنے کی کوشش کی۔ ایک محافظ نے، جو دوسرے کمرے میں تالیوں کی گونج سے جاگ گیا تھا، اس کی رائیگاں کوشش دیکھی۔

"یہ نہیں اترے گی،" وہ غنودگی میں بولا۔ "یہ دیوار پر نقش ہے۔"

لوگ کمرے سے باہر آنے لگے تو لورا فارینا دوبارہ بیٹھ گئی۔ سینئٹر دروازے کی آلی پڑھتا رہے دہلیز پر کھڑا تھا۔ اس نے لورا فارینا کو سچی دیکھا جب راہداری خالی ہو گئی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"مجھے میرے آبا نے بھیجا ہے،" وہ فرانسیسی میں بولی۔

سینئٹر سمجھ گیا۔ اس نے خوابیدہ محافظوں کا جائزہ لیا، پھر لورا فارینا کو بہ غور دیکھا جس کا غیر معمولی حسن اس کے درد سے کہیں زیادہ توجہ طلب تھا، اور تب اسے یقین ہو گیا کہ جو فیصلہ اس کو کرنا تھا وہ موت کر چکی ہے۔

"اندر آ جاؤ،" اس نے لڑکی سے کہا۔

محبت کے اُس پار مستر موت

لورا فارنا دلیز پر قدم رکھتے ہی شہر رہ گئی۔ ہزاروں نوٹ اس تتلی کی طرح پھر پھڑپھڑاتے ہوئے ہوا میں تیر رہے تھے۔ سینئر نے پمکا بند کر دیا اور نوٹ بے ہوا ہو کر گھرے کی مختلف اشیاء پر اتر گئے۔

دیکھا تم نے! "وہ بولا۔ "غلاعت بھی اڑ سکتی ہے۔"

لورا فارنا ایک چھوٹے سے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اس کی جلد، جس کا رنگ اور سٹول یا ہوا گارڈھاپن خام تیل جیسا تھا، ہموار اور تخی ہوئی تھی، اس کے بال کسی نوعمر گھوڑی کی آیاں تھے اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں روشنی سے زیادہ چمک دار تھیں۔ سینئر نے اس کے تارِ نظر کا تعاقب کیا اور بالآخر گلاب تک پہنچ گیا جو شورے میں اپنی چمک کھو چکا تھا۔

"گلاب ہے،" اس نے کہا۔

"ہاں،" لڑکی نے قدرے الجھاو سے کہا۔ "میں نے ریو باپا میں پہلی بار دیکھے تھے۔"

سینئر ایک فوجی چارپائی پر بیٹھ گیا اور، اپنی قمیص کے بٹن کھولتے ہوئے، گلابوں کی باتیں کرتا رہا۔ اس کے سینے پر، اس طرف جہاں اس کے خیال میں اس کا دل تھا، کسی قزاق کی طرح تیرے گدا ہوا دل نقش تھا۔ اس نے گیلی قمیص فرش پر پھیکی اور لورا فارنا سے اپنے جوتے اتارنے میں مدد کرنے کو کہا۔

وہ چارپائی کے مقابل گھٹنوں کے بل جھک گئی۔ سینئر کچھ سوچتے ہوئے اس کا ہانڈہ لیتا رہا اور، جب تک وہ اس کے تسمے کھولتی رہی، حیران ہوتا رہا کہ اس حادثے کی بد نصیبی دونوں میں سے کس کے حصے میں آئے گی۔

"تم تو ابھی بالکل سچی لگتی ہو،" اس نے کہا۔

"اس پر نہ جاؤ،" وہ بولی۔ "میں اپریل میں اٹیس سال کی ہو جاؤں گی۔"

سینئر کی دلچسپی جاگ اٹھی۔

"کس تاریخ کو؟"

"گیارہ،" وہ بولی۔

سینئر بہتر محسوس کرنے لگا۔ "ہم دونوں کا بُرج حمل ہے،" اس نے کہا، اور پھر مسکراتے ہوئے اصرافہ کیا:

"یہ تنہائی کی علامت ہے۔"

لورا فارنا توجہ نہیں دے رہی تھی، کیوں کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُس کے جوتوں کا کیا کرے۔ ادھر سینئر بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ لورا فارنا کا کیا کرے۔ وہ اپنا ک

معاشرے کا عادی نہیں تھا، اور پھر وہ جانتا تھا کہ موجودہ معاملے کی جڑیں تو ذلت میں پیوست ہیں۔ سوچنے کے لیے چند لمحے چرانے کو اس نے لورا فارماتا کو اپنے گھٹنوں کے درمیان مضبوطی سے جکڑ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیے اور پشت کے بل چارپائی پر لیٹ گیا۔ تب اسے احساس ہوا کہ لڑکی اپنی پوشاک کے نیچے برہنہ ہے، کیوں کہ اس کے بدن سے کسی جنگلی جانور کی سی پراسرار خوشبو آ رہی تھی، لیکن اس کا دل خوف زدہ تھا اور اس کی جلد ٹھنڈے پسینے سے نم۔

"ہم لوگوں سے کوئی محبت نہیں کرتا،" سینئر نے آہ بھری۔

لورا فارماتا نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن وہاں صرف اتنی جوتھی کہ وہ سانس ہی لے پائی۔ سینئر نے اسے سبھا لادینے کے لیے اپنے برابر لٹا لیا۔ اس نے روشنی گل کردی اور کمرہ گلاب کے سائے میں آ گیا۔ لڑکی نے اپنے آپ کو قسمت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ سینئر ٹٹولتے ہوئے ہاتھوں سے نرمی کے ساتھ اس کا بدن سہلانے لگا، لیکن جہاں اسے اس کی توانیت پانے کی توقع تھی، وہاں کوئی سخت سی چیز اس کی راہ میں حائل تھی۔

"ارے، یہ کیا ہے؟"

"مثلاً،" لڑکی نے بتایا۔

"لعنت ہو،" سینئر نے مشتعل ہو کر کہا، اور وہ سوال کیا جس کا جواب وہ اچھی طرح جانتا

تھا۔ "چابی کہاں ہے؟"

لورا فارماتا نے سکون کا سانس لیا۔

"میرے آبا کے پاس،" اس نے جواب دیا۔ "انہوں نے کہا ہے کہ آپ چابی کے لیے اپنا آدمی بھیج دیں، اور اس کے ہاتھ یہ تحریری پیغام بھی کہ آپ ان کا مسئلہ حل کر دیں گے۔"

سینئر کا پارہ چڑھ گیا۔ "حرامی مینڈک،" وہ برہمی سے بڑبڑایا۔ اس نے سکون کی خاطر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور امد صبر سے اپنے آپ سے ملا۔ یاد رکھو، اسے یاد آیا، چاہے تم ہو یا کوئی اور، اس میں زیادہ دیر نہیں ہے کہ تم قتا ہو جاؤ گے، اور اس میں بھی زیادہ دیر نہیں ہے کہ تمہارا نام بھی باقی نہیں رہے گا۔

اس نے تھر تھری کے گزرنے کا استعار کیا۔

"ایک بات بتاؤ،" اس نے پوچھا، "تم نے میرے بارے میں کیا سنا ہے؟"

"سچ سنا چاہتے ہو؟"

"سچ۔"

"اچھا،" لورا فارماتا نے جرات کی، "لوگ کہتے ہیں کہ تم دوسروں سے بدتر ہو، کیوں کہ تم

محبت کے اُس پار مستطرموت

مختلف ہو۔"

سینیٹر برہم نہیں ہوا۔ وہ آنکھیں بند کیے کافی دیر خاموش رہا، اور جب اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو اپنی استثنائی پوشیدہ جبلتوں سے ٹوٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔
"اوہ، کیا مصیبت ہے،" اس نے فیصلہ کیا۔ "اپنے حرامی باپ کو بتا دیتا میں اس کا کام کر دوں گا۔"

"آپ چاہیں تو میں خود جا کر چابی لا سکتی ہوں،" لورا فارینا نے کہا۔
سینیٹر نے اسے روک لیا۔

"چابی کو بھول جاؤ،" اس نے کہا۔ "بس کچھ دیر میرے ساتھ لیٹی رہو۔ آدمی تنہا ہو تو کسی کا پاس ہونا اچھا ہوتا ہے۔"

پھر لڑکی نے اپنی نظرس گلاب پر جماتے ہوئے اس کا سراپنے شانے پر رکھ لیا۔ سینیٹر نے اسے کمر سے تمام کر اپنا چہرہ اس کی بغل میں چھپا لیا اور دہشت کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ چھ مہینے اور گیارہ دن بعد، لورا فارینا کے اسکینڈل کے باعث بے قدر اور مسترد ہو کر، اور اس کے بغیر مرنے پر غصے سے روتے ہوئے، وہ اسی حالت میں مر جائے گا۔

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ: آصف فرخی

گم گشتہ وقت کا سمندر

جنوری کے آخر میں سمندر تیز و تند ہو جاتا تھا، کورے کے ڈسیر لالا کر قبضے پر پٹخنے لگتا، اور چند ہشتوں کے بعد ہر چیز اس کی ناقابل برداشت کیفیت سے آلودہ ہو جاتی۔ اس دن کے بعد سے دنیا رہنے کے قابل نہ رہتی، کم از کم اگلے دسمبر تک، چنانچہ کوئی بھی آٹھ بجے رات کے بعد جاگتا ہوا نہیں ملتا تھا۔ مگر جس سال مسٹر ہر برٹ آئے، اس سال سمندر نہیں بدلا، فروری میں بھی نہیں۔ بلکہ اس کے برخلاف وہ پہلے سے بھی زیادہ پرسکون، ہموار اور مسور ہو گیا، اور مارچ کی اولیں راتوں میں سمندر سے گلابوں کی خوشبو آنے لگی۔

تو بیاس نے یہ خوشبو سونگھی۔ اس کا خون کیکڑوں کو اپنی جانب کھینچتا تھا اور وہ آدھی آدھی رات انہیں اپنے بستر سے بھگانے میں گزارتا، یہاں تک کہ جوا تیز ہو جاتی تب وہ سونے پاتا۔ جاگتے پڑے رہنے کے طویل وقفوں میں اس نے ہوا میں ہونے والی تمام تبدیلیوں کو پہچاننا سیکھ لیا تھا۔ چنانچہ جب اسے گلابوں کی خوشبو آئی تو اسے یہ معلوم کرنے کے لیے دروازہ کھول کر باہر نہیں جمانے پڑا کہ خوشبو سمندر سے آئی ہے۔

وہ دیر سے اُٹھا۔ کلوتیلدے آگن میں آگ جلا رہی تھی۔ جوا ٹھنڈی تھی، اور تارے اپنی

اپنی جگہوں پر تھے، مگر انہیں گننا مشکل تھا کیوں کہ افق پر سمندر کی روشنی سے جھوٹ پڑ رہی تھی۔ کافی پینے کے بعد بھی تو یاس کو اپنے طلق میں رات کا بلکا سا ذائقہ چپکا ہوا محسوس ہوا۔

"کل رات ایک عجیب بات ہوئی،" اس نے یاد کیا۔

کلوتیلڈے کو، بلاشبہ، خوشبو سنیں آئی تھی۔ اس کی نیند اتنی گہری تھی کہ اسے اپنے خواب بھی یاد نہ رہتے تھے۔

"گلابوں کی خوشبو تھی،" تو یاس نے کہا، "اور مجھے یقین ہے کہ سمندر سے آرہی تھی۔"

"مجھے سنیں پتا گلابوں کی خوشبو کیسی ہوتی ہے،" کلوتیلڈے نے کہا۔

یہ بھی عین ممکن تھا کہ وہ صحیح کہہ رہی ہو۔ قصبہ بالکل سبوتا تھا، اس کی پتھرلی زمین شورے سے گدی ہوئی تھی، اور کبھی کبھار ہی کوئی باہر سے گل دستہ لے کر آتا کہ سمندر میں ڈال دے جہاں وہ اپنے مُردے پھینکا کرتے تھے۔

"یہ وہی خوشبو ہے جو گواکا مایال کے اُس ڈوبے ہوئے آدمی سے آتی تھی،" تو یاس نے کہا۔

"اچھا!" کلوتیلڈے مسکراتے ہوئے بولی۔ "اگر یہ اچھی خوشبو ہے تو پھر سمجھ لو کہ اس سمندر سے سنیں آ سکتی۔"

یہ سمندر واقعی بے حد سفاک تھا۔ بعض دنوں میں، جب مجھیروں کے جال میں بہتے ہوئے خس و خاشاک کے سوا کچھ نہ آتا، تب بھی پانی اُترنے کے بعد قصبے کی سڑکیں مُردہ مچھلیوں سے بھر جاتیں۔ بارود لگانے سے یہ حاصل ہوتا کہ پرانے غرقاب جہازوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے، سطح تک اُٹھ آتے۔

قصبے میں کلوتیلڈے کی طرح جو چند عورتیں باقی رہ گئی تھیں، وہ تلخی کے مارے کھول رہی تھیں۔ اور، اسی کی طرح، بوڑھے باکوب کی بیوی تھی، جو اس صبح اپنے معمول سے پہلے اُٹھ گئی، گھر کی چیزیں ترتیب سے رکھیں اور ناشتے کی میز پر مختصاً نہ چہرہ لیے بیٹھ گئی۔

"میری آخری خواہش،" اس نے اپنے شوہر سے کہا، "یہ ہے کہ مجھے زندہ دفن کر دیا جائے۔"

اس نے یہ بات اس طرح کہی جیسے وہ بستر مرگ پر پڑی ہو، حالانکہ وہ کھانے کے کمرے میں میز پر بیٹھی تھی، جہاں مارچ کی چمکیلی دھوپ کھڑکیوں میں سے اندر آتی ہوئی پورے گھر میں بھر رہی تھی۔ جو شخص اس کے سامنے بیٹھا اپنی پُرسکون بھوک مٹا رہا تھا، بوڑھا باکوب تھا، جس نے اس سے اتنی محبت کی تھی، اور اتنے طویل عرصے سے کیے جا رہا تھا، کہ اسے کوئی ایسا داکہ

درد یاد نہ رہا تھا جس کا آغاز اس کی بیوی سے نہ ہوا ہو۔

"میں اس یقین کے ساتھ مرنے لگا ہوں کہ مجھے معقول لوگوں کی طرح سے زمین میں دفن کیا جائے گا،" وہ کہتی رہی، "اور اس یقین کا ایک ہی طریقہ ہے کہ میں گھر گھر جا کر لوگوں سے کہوں کہ مجھے پر رحم کھاؤ اور مجھے زندہ دفن کر دو۔"

"تھیں کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں،" بوڑھے ہاکوب نے تمام تر سکونِ قلب کے ساتھ کہا، "میں خود تھیں گاڑاؤں گا۔"

"تو پھر چلو، چلیں،" وہ بولی، "کیوں کہ میں جلد ہی مرنے لگی۔"

بوڑھے ہاکوب نے اس کی طرف دیکھا: اس کی آنکھیں وہ واحد شے تھیں جن میں ابھی تک جوانی کی رَمَق باقی تھی۔ اس کے جوڑوں کی ہڈیوں میں گانٹھیں پڑ گئی تھیں اور اس کے چہرے پر نل پلے ہوئے کھیت کا وہ تار تھا جو سچ پوچھیں تو اس پر ہمیشہ سے طاری تھا۔

"تم پہلے سے زیادہ ٹھیک لگ رہی ہو۔"

"کل رات مجھے گلابوں کی خوشبو آئی،" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

"اس پر قطعی دھیان نہ دو،" بوڑھے ہاکوب نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا۔ "ایسی

چیزیں تو ہم غریبوں کے ساتھ روز بوقت رہتی ہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں،" وہ بولی، "میں نے ہمیشہ یہ دعا مانگی ہے کہ مجھے پہلے سے معلوم

ہو جائے کہ میری موت کب آنے والی ہے تاکہ میں سمندر سے دور جا کر مروں۔ اس قصبے میں

گلابوں کی خوشبو نہ آ سکتی ہے۔"

بوڑھا ہاکوب بس یہی سوچ سکا کہ اس سے چیزیں ٹھیک سے رکھنے کے لیے کچھ مہلت

مانگ لے۔ اس نے سنا تھا کہ لوگ اس وقت نہیں مرتے جب انہیں مرنے کا پتہ ہو بلکہ اس وقت

مرتے ہیں جب وہ مرنے کا ہتے ہیں، اور وہ اپنی بیوی کی پیش گوئی سے بہت پریشان ہو گیا۔ اسے

یہ بھی خیال آیا کہ وہ لمحہ آیا تو کیا وہ اسے زندہ دفن کر سکے گا؟

تو سب کے قریب اس نے وہ جگہ کھولی جہاں اس کی دکان ہوا کرتی تھی۔ اس نے دو

کرسیاں ڈالیں اور چھوٹی سی میز پر بساط بچھا کر دروازے کے پاس رکھ لی اور تمام صبح یہ کرتا رہا کہ جو

بھی وہاں سے گزرتا اس سے ایک بازی کھیل لیتا، اپنے گھر میں بیٹھ کر اس نے کھنڈراتے

ہوئے تباہ مال قصبے کو دیکھا جس میں ان گزشتہ رنگوں کے آثار باقی تھے جنہیں اب دھوپ نے اور

سڑک کے آگے بہتے سمندر نے چبا ڈالا تھا۔

دوپہر کے کھانے سے پہلے وہ ہمیشہ کی طرح دونوں ماکیسو گومیز کے ساتھ کھیلنے بیٹھا۔

بوڑھے باکوب کو اس شخص سے زیادہ نرم و مہربان نہیں مل سکتا تھا جو دو خانہ جنگیوں سے زندہ سلامت، اور تیسری میں ایک آنکھ گنوا کر بچ نکلا تھا۔ ایک بازی جان بوجھ کر بارے کے بعد بوڑھے باکوب نے اسے دوسری کے لیے روک لیا۔

"ایک بات بتاؤ، دون ما کیسو،" تب اس نے پوچھا۔ "کیا تم اپنی بیوی کو زندہ دفن کرنے کا بوتا رکھتے ہو؟"

"یقیناً،" دون ما کیسو گومیز نے جواب دیا۔ "اور میں جو کچھ رہا ہوں اس کا اعتبار کر لو کہ اس وقت میرا ہاتھ ذرا سا بھی نہ کانپے گا۔"

بوڑھا باکوب حیرت زدہ خاموشی میں ڈوب گیا۔ پھر اپنی بہترین گوٹیں گنوا بیٹھنے کے بعد، اس نے ٹھنڈی سانس بھری:

"اچھا، مجھے یہ نظر آ رہا ہے کہ بیترام نے والی ہے۔"

دون ما کیسو گومیز کے چہرے کا تاثر ذرا نہیں بدلا۔ "تو پھر،" اس نے کہا، "اے زندہ دفن کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے دو گوٹیں آؤ پیٹ لیں اور ایک کو بادشاہ بنا دیا۔ پھر اداسی کی نمی سے بھیگی آنکھیں اپنے مد مقابل پر جمادیں۔

"کیا ہوا ہے اُسے؟"

"کل رات،" بوڑھا باکوب سمجھانے لگا، "اے گلابوں کی خوشبو آئی۔"

"تب تو آدھا قصبہ مرنے والا ہے،" دون ما کیسو گومیز نے کہا۔ "صبح سے سب یہی بات

کر رہے ہیں۔"

بوڑھے باکوب کے لیے دشوار تھا کہ اسے تاراض کیے بغیر ایک بازی آور بار جائے۔ وہ میز اور کرسیاں اندر اٹھا لایا، دکان بند کی، اور سارے قصبے میں گھوم کر ان لوگوں کو ڈھونڈتا پھرا جنہوں نے یہ خوشبو سونگھی تھی۔ آخر میں جا کر صرف تو بیاس ہی ملا جسے خوشبو کا یقین تھا۔ سو بوڑھے باکوب نے اس سے درخواست کی کہ مہربانی کر کے اس کے گھر کی طرف سے ہوتا جائے، جیسے اتفاقاً وہاں سے گزر رہا ہو، اور اس کی بیوی کو یہ حال سنا لے۔

تو بیاس نے یہی کیا۔ چار بجے کے قریب، اپنا اتوار والا بہترین لباس پہنے ہوئے، وہ وہاں نمودار ہوا جہاں برساتی کے تلے بوڑھی عورت دوپہر سے بیٹھی بوڑھے باکوب کے لیے رنڈس لے کا جوڑا تیار کر رہی تھی۔

وہ اتنی خاموشی سے چلتا ہوا آیا کہ بڑھیا سٹپٹا گئی۔

"خدا کی پناہ،" اس نے کہا، "میں سمجھی موت کا فرشتہ آ گیا۔"

"اب تو دیکھ لیا کہ موت کا فرشتہ نہیں ہے،" تو بیاس نے کہا، "بلکہ یہ میں ہوں۔ اور میں تمہیں کچھ بتانے آیا ہوں۔"

اس نے عینک سنبھالی اور دوبارہ سلائی میں جُٹ گئی۔

"مجھے پتا ہے کیا بات ہے،" وہ بولی۔

"شرط لگا لو تمہیں نہیں پتا،" تو بیاس نے کہا۔

"تمہیں کل رات گلابوں کی خوشبو آئی تھی۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" تو بیاس نے دھیمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میری جتنی عمر میں،" وہ بولی، "سوچنے کے لیے اتنا وقت بچ رہتا ہے کہ آدمی اچھا خاصا پتہ نمبر بن سکتا ہے۔"

بوڑھا باکوب جو دکان کے پچھوڑے دیوار سے کان لگائے کھڑا تھا، شرمندہ ہو گیا۔

"ارے عورت، دیکھ لیا!" وہ دیوار کے چپچپے سے چلتا یا۔ پھر مڑا اور برساتی میں آ گیا۔ "دیکھ لیا، تم جو سوچ رہی تھیں وہ نہیں نکلا۔"

"یہ لڑکا جھوٹ بول رہا ہے،" وہ سر اٹھائے بغیر بولی۔ "اے کوئی خوشبو نہیں آئی۔"

"کوئی گیارہ بجے ہوں گے،" تو بیاس نے کہا۔ "میں کیکڑے بھگا رہا تھا۔"

بڑھیا نے گریبان ٹرپ کر سی دیا۔

"جھوٹ!" وہ مُصر رہی۔ "سب کو پتا ہے تم بہت چالاک ہو۔" اس نے اپنے دانتوں سے دھاگا توڑا اور عینک کے شیشوں میں سے تو بیاس کو گھورنے لگی۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم نے بالوں میں تیل چھڑک کر اور جوتے چمکا کر یہاں آنے کی زحمت صرف میری بے عزتی کرنے کے لیے کیوں اٹھائی۔"

اس وقت سے تو بیاس سمندر پر نظر رکھنے لگا۔ اس نے اپنا مھولنا آنگن کے پاس برساتی میں ٹانگ لیا اور ساری رات انتظار کرتا اور حیران ہوتا رہا کہ جب لوگ سو جاتے ہیں تو دنیا میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ کئی راتوں تک وہ کیکڑوں کی مایوسانہ کھرکھراہٹ سنا رہا کہ پنہلوں کے بل مکان کی بنیادوں پر چڑھنا چاہ رہے تھے، یہاں تک کہ اتنی راتیں بیت گئیں کہ وہ کوشش کرتے کرتے بار گئے۔ وہ کلوتیلدے کے سونے کا طریقہ جان گیا۔ اسے پتا چلا کہ اس کے سُریلے خزانے کس طرح گرمی کی بڑھتی ہوئی شدت کے ساتھ اونچے ہوتے جاتے، یہاں تک کہ جولائی کی گرم راتوں میں آگسٹی کا ایک طویل، نڈھال سُر بن جاتے۔

تو بیاس نے پہلے پہل سمندر پر اس طرح نظر رکھی جیسے وہ لوگ رکھتے ہیں جو سمندر کو خوب

اچھی طرح جانتے ہیں، اور افق کے ایک مخصوص نقطے پر نظریں جمائے رہا۔ وہ سمندر کو رنگ بدلتے دیکھتا رہا۔ وہ دیکھتا رہا کہ سمندر اپنی روشنیاں گل کر رہا ہے، جہاں گول بھرا اور غلیظ ہوا جا رہا ہے؛ اور جب تندِ حُوطوفانِ بادِ پاراں اس کا بانہہ بگاڑ دیتے تو وہ گندگی بھری اُٹھیاں کرنے لگتا۔ دھیرے دھیرے اس نے ان لوگوں کی طرح نظر رکھتا سیکھ لیا جو سمندر کو زیادہ بہتر طور پر جانتے ہیں، کہ اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے لیکن اسے سوتے میں بھی فراموش نہیں کر سکتے۔

بوڑھے پاکوب کی بیوی اگست میں مر گئی۔ اس کا سوتے میں دم نکل گیا اور لوگوں کو اسے، باقی تمام مردوں کی طرح، پھولوں سے عاری سمندر میں پھینکنا پڑا۔ تو بیاس استعار کرتا رہا۔ وہ اتنے عرصے سے استعار کرتا رہا کہ استعار کرتا اس کے سینے کا ڈھنگ بنتا جا رہا تھا۔ ایک رات وہ اپنے جھولنے میں پڑا اور اگلے رات تو اسے احساس ہوا کہ ہوا بدل گئی ہے۔ وقفے وقفے سے ایک موج سی اُٹھتی، اس وقت کی طرح جب ایک جاپانی جہاز اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے سرٹھی ہوئی پیاز کا لداؤ گودی کے دبائے پر بچ گیا تھا۔ پھر بُوگاڑھی ہوتی گئی اور صبح تک ہوا میں ٹھہر گئی۔ جب اسے یہ احساس ہونے لگا کہ وہ اس بُوگواتھوں سے اٹھا سکتا ہے اور دوسروں کو دھکا سکتا ہے، تبھی وہ اپنے جھولنے میں سے باہر لپکا اور کلوتیلڈے کے کمرے میں آیا۔ اس نے کلوتیلڈے کو جھجھوڑا۔

"یہ رہی،" اس نے اسے بتایا۔

کلوتیلڈے کو یہ بُوگواتھوں کے جالے کی طرح ہاتھ سے بٹانی پڑی، تب وہ اٹھ سکی۔ پھر وہ نیم گرم چادرول پر ڈھیر ہو گئی۔

"خدا کی مار اس پر،" وہ بولی۔

تو بیاس دروازے کی طرف لپکا، گلی میں آیا اور جینے لگا۔ وہ پورا زور لگا کر جینا، لمبا سانس لیا اور پھر جینا، اور پھر خاموشی چھا گئی، پھر اس نے آور گھرا سانس لیا، اور سمندر پر خوشبو چھائی رہی۔ لیکن کسی نے جواب نہ دیا۔ پھر وہ گھر گھر دروازے کھٹکھٹاتا پھرا، ان مکانات کے بھی جن کے مکینوں کا پتا نہ تھا، یہاں تک کہ اس کا واویلا کتوں کے رونے میں غلط ملط ہو گیا اور اس نے سب کو جگا دیا۔

بہت سے لوگ کچھ نہ سو گئے پائے۔ مگر باقی لوگ، خاص طور پر بڑے بوڑھے، اس سے لطیف اندوز ہونے کے لیے ساحل پر چلے گئے۔ یہ ایسی دبیز اور تہ دار بُو تھی کہ ماضی کی کسی آور خوشبو کے لیے ذرا سی بھی گنہائش نہ چھوڑتی تھی۔ بعض لوگ سو گئے سو گئے کر اُکتا گئے اور گھر چلے

گئے۔ زیادہ تر لوگ اپنی باقی ماندہ نیند پوری کرنے کے لیے ساحل پر ٹھہر گئے۔ صبح ہونے تک خوشبو میں اس قدر بھار آ گیا تھا کہ سانس لیتے ہوئے بھی دل دھکتا تھا۔

تو بیاس دن بھر سوتا رہا۔ کلوتیلدے قیلولے کے وقت اس کے ساتھ جاٹھسی اور انھوں نے ساری دوپہر بستر میں خرمستیاں کرتے ہوئے گزاری اور صحن کا دروازہ بھیرٹنے کی بھی پروا نہیں کی۔ پہلے انھوں نے کیمپوں کی طرح کیا، پھر خرگوشوں کی طرح، اور آخر میں کچھوں کی طرح کیا، یہاں تک کہ دنیا پر اداسی چھا گئی اور پھر سے اندھیرا ہو گیا۔ ہوا میں گلابوں کا خفیف سا شائبہ ابھی تک تھا۔ کبھی کبھار موسیقی کی لہر خواب گاہ تک آتی۔

"کاتارہ۔ نو کے ہاں سے آرہی ہے،" کلوتیلدے نے کہا، "کوئی آیا ہو گا قصبہ میں۔" ایک عورت اور تین مرد آئے تھے۔ کاتارہ۔ نو نے یہ سوچ کر کہ شاید بعد میں اور لوگ آئیں، اپنا گراموفون ٹھیک کرنا چاہا۔ جب وہ یہ کام نہیں کر سکا تو اس نے پانچواں پارہ سیدو سے کہا، جو ہر طرح کا کام کر لیا کرتا تھا، کیوں کہ کوئی چیز کبھی اس کی ملکیت نہیں رہی تھی، اور پھر اس کے پاس اوزاروں کا صندوق اور ہاتھوں میں پھرتی تھی۔

کاتارہ۔ نو کا ٹھکانا لکڑی کی ایک الگ تھلگ عمارت میں تھا جو سمندر کے رخ پر تھی۔ اس میں ایک بڑا کمرہ تھا جس میں بچپن اور چھوٹی میزیں بچھی تھیں، اور چیمے کی طرف کئی کمرے شب ب سری کے لیے تھے۔ پانچواں کو کام کرتا دیکھتے، وہ عورت اور تینوں مرد شراب خانے میں میٹھے خاموشی سے پیتے رہے، اور باری باری جمائیاں لیتے رہے۔

کئی دفعہ کی کوٹھوں کے بعد گراموفون بج اٹھا۔ جب لوگوں نے موسیقی کی دور سے آتی ہوئی مگر واضح آواز سنی تو باتیں بند کر دیں۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کے لیے بکا بکا رہ گئے، کہ اس وقت کہیں جا کر انھیں احساس ہوا کہ آخری بار جب انھوں نے موسیقی سنی تھی تب سے لے کر اب تک وہ کتنے بوڑھے ہو چکے ہیں۔

تو بیاس کو تمام لوگ نو بچے کے بعد بھی جاگتے ہوئے ملے۔ وہ اپنے دروازوں کی دہلیز پر میٹھے کاتارہ۔ نو کے پرانے رکارڈ سن رہے تھے اور چہروں پر بچوں کے سے توکل کا تاثر تھا گویا گرمین کو دیکھ رہے ہوں۔ برگیت پر انھیں کچھ نہ کچھ یاد آنے لگا: وہ لوگ جو مر گئے؛ بہت لمبی بیماری سے اٹھ کر کھانا کھانے کا مزہ؛ یا کوئی کام جو برسوں پہلے انھیں اگلے دن کرنا تھا اور کبھی نہ کر پائے کیوں کہ اس کے بارے میں بھول چکے تھے۔

موسیقی گیارہ بجے کے قریب بند ہوئی۔ بہت سے لوگ، یہ سوچ کر کہ بارش ہوگی، جا کر سو گئے کیوں کہ سمندر پر گھٹا بادل چھایا ہوا تھا۔ مگر بادل نیچے اتر آیا، کچھ دیر سطح سمندر پر تیرتا رہا، اور

پھر پانی میں ڈوب گیا۔ اوپر بس ستارے رہ گئے۔ ذرا دیر میں ہوا قصبے سے بابر کی سمت چلی، اور واپس آئی تو گلابوں کی خوشبو لیے ہوئے تھی۔

"دیکھا، میں نے تم سے کیا کہا تھا باکوب!" "دون ما کیسو گو میز چلایا۔" خوشبو ہمارے پاس لوٹ آئی۔ مجھے یقین ہے کہ اب یہ بررات ہمارے ساتھ ہوگی۔"

"خدا نہ کرے،" بوڑھے باکوب نے کہا۔ "یہ خوشبو واحد چیز ہے جو میری زندگی میں اس وقت آئی ہے جب بہت دیر ہو چکی۔"

وہ دونوں موسیقی کے رکارڈوں پر کوئی توجہ دیے بغیر، خالی دکان میں بیٹھے گوٹھیں کھیلنے رہے۔ ان کی یادیں اتنی قدیمی تھیں کہ ان کو جگانے کے لیے اتنے پرانے رکارڈ بھی نہیں تھے۔

"جہاں تک میرا تعلق ہے میں ان چیزوں پر زیادہ یقین نہیں رکھتا،" دون ما کیسو گو میز نے کہا۔ "اتنے برس خاک چھانکنے کے بعد، اور پھول اگانے کی ذرا سی کھلی جگہ کے لیے اتنی عورتوں کے خوابش کرنے کے بعد، یہ عجیب بات نہیں کہ آدمی ایسی خوشبو سونگھنے لگے اور اسے سچ بھی سمجھنے لگے۔"

"مگر ہم سب نے خود اسے اپنی ناک سے سونگھا ہے،" بوڑھے باکوب نے کہا۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا،" دون ما کیسو گو میز نے کہا۔ "جنگ کے زمانے میں، جب انقلاب غارت ہو چکا تھا، تو ہم ایک جنرل کی اتنی شدید ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ ہم نے ڈیوک آف مارلبرو کو گوشت پوست کی حالت میں ظاہر ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں نے خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، باکوب۔"

آدھی رات بیت چکی تھی۔ اکیلے رہ جانے کے بعد باکوب نے دکان بند کی اور لیمنپ لے کر کمرے میں آگیا۔ اسے کھڑکی میں سے، سمندر کی سرخی میں گھری وہ گھٹائی دیکھائی دی جہاں سے لوگ اپنے مردے سمندر میں پھینکا کرتے تھے۔

"ہیتر،" اس نے دھیرے سے پکارا۔

وہ اس کی آواز نہیں سن سکتی تھی۔ اس لمحے وہ دبیر کی چمک دار دھوپ میں تقریباً سطح پر بہتی بہتی غلیج بگال جا پہنچی تھی۔ اس نے ایک بڑے سے بحری جہاز کو دیکھنے کے لیے اپنا سر پانی سے یوں اٹھایا جیسے روشنی سے جنگ کر تے شوکیں میں جہانک رہی ہو۔ مگر وہ اپنے شوہر کو نہیں دیکھ سکی جے اس لمحے دنیا کے دوسرے سرے پر دوبارہ کاتارینو کے گراموفون کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔

"ذرا سوچو،" بوڑھے باکوب نے کہا۔ "صرف چھ مہینے پہلے یہ لوگ تمہیں پاگل سمجھتے تھے اور اب خود اسی خوشبو کا میلہ لگا رہے ہیں جو تمہارے لیے موت کا پیغام تھی۔" اس نے جی بجا دی اور بستر میں لیٹ گیا۔ وہ اس بھونڈے انداز میں دریا کر دھیرے دھیرے رونے لگا جو بوڑھوں سے مخصوص ہے، لیکن جلد ہی اسے نیند آ گئی۔

"میں اس قصبے سے اگر نکل سکتا تو نکل جاتا،" وہ کروٹیں لیتے میں سکایاں بھرتا رہا۔

"میں سیدھا جہنم چلا جاتا، یا کہیں بھی اور، بس اگر میرے پاس بیس پیسو جمع ہو جاتے۔"

اُس رات کے بعد متواتر کئی ہفتوں تک خوشبو سمندر پر طاری رہی۔ خوشبو مکافوں کی لکڑی میں بس گئی، غذا میں، پینے کے پانی میں، کہیں اس سے مفر نہیں تھا۔ کئی لوگ یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گئے کہ یہ خوشبو ان کے فسطے کے انزرات میں موجود تھی۔ وہ تین مرد اور ایک عورت جو کاتارہ نو کے ہاں آئے ہوئے تھے ایک جمعے کو چلے گئے، لیکن ہفتے کو پورا ایک مجمع ساتھ لے کر پھر واپس آ گئے۔ اتوار کے دن اور لوگ آ گئے۔ وہ برجگہ اندر باہر آ جا رہے تھے، چوٹیوں کی طرح، اور کھانا اور سونے کی جگہ ڈھونڈتے پھر رہے تھے، یہاں تک کہ گلیوں میں چلنا ناممکن ہو گیا۔

اور لوگ آنے لگے۔ وہ عورتیں جو قصبے کے مردہ پڑ جانے کے بعد چلی گئی تھیں، کاتارہ نو کے ہاں لوٹ آئیں۔ وہ پہلے سے زیادہ فریہ ہو گئی تھیں، زیادہ سنگھار کیے ہوئے تھیں، اور تازہ ترین گیتوں کے رکارڈ لے کر آئی تھیں، جنہیں سن کر کسی کو کوئی پرانی بات یاد نہ آتی تھی۔ قصبے کے بعض پرانے باشندے واپس آ گئے، جو غلاطت کی حد تک دولت مند ہونے کہیں اور چلے گئے تھے، اور واپس آ کر اپنی اپنی جمع پونجی کی باتیں کرنے لگے، مگر کپڑے وہی پہنے ہوئے تھے جو پہن کر یہاں سے گئے تھے۔ سازندے اور کھیل تماشے آنے لگے، قسمت کے پتھر، تقدیر کا حال بتانے والے اور بدوق باز اور گردن پر موٹے موٹے سانپ لپیٹے ہوئے سپرے جو بوتلوں میں آبِ حیات بیچ رہے تھے۔ ہفتوں ان کی آمد کا سلسلہ رہا، موسم کی پہلی بارشوں کے بعد بھی جب سمندر طوفانی ہو گیا اور خوشبو غائب ہو گئی۔

ایک پادری آخری آنے والوں میں تھا۔ وہ سارے میں پھرتا پھرتا، ہلکی کافی میں روٹی ڈبو ڈبو کر کھاتا رہا، اور ایک ایک کر کے اس نے ہر چیز کو جو اس کے سامنے آئی، خلافِ شرع قرار دے دیا: داوا لگانے والے کھیل، نئے گیتوں کی موسیقی اور اس پر ناچنے کی گت، اور ساحل پر سونے کی نئی رسم۔ ایک شام، میلپور کے گھر، اس نے سمندر کی خوشبو کے موضوع پر ایک وعظ کیا۔

"شکر ادا کرو، میرے بچو،" اس نے کہا، "کہ یہ خدا کی خوشبو ہے۔"

کسی نے اسے بیچ میں ٹوک دیا۔

"آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں، مقدس باپ؟ آپ نے تو ابھی اسے سو گھٹانک نہیں۔"

"خدا کا کلام،" اس نے جواب دیا، "خوشبو کے باب میں بہت واضح ہے۔ ہم خدا کے

مستحب گاؤں میں رہ رہے ہیں۔"

تو بیس اس میلے میں یوں آتا جاتا رہا جیسے نیند میں چل رہا ہو۔ وہ کلوتیلڈے کو یہ دکھانے کے لیے لے گیا کہ پیسا کیا ہوتا ہے۔ انھوں نے سوانگ رچایا کہ وہ رولٹ پر بے تحاشا رقم لگا رہے ہیں، اور وہ یوں ہی فرض کرنے لگے اور یہ سوچ کر کہ وہ اتنا بہت سا روپیا جیت سکتے ہیں، اپنے آپ کو بہت دولت مند سمجھنے لگے۔ مگر ایک رات، انھوں نے جی نہیں تمام مجھے نے اتنا پیسا ایک جگہ دکھا کہ وہ اس کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

یہ وہ رات تھی جب مسٹر ہر برٹ کی آمد ہوئی۔ وہ اچانک آگئے، گلی کے پسوں بیچ میز بچائی، اور میز پر دو بڑے بڑے صندوق رکھ دیے جو چوٹی تک نوٹوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اتنا زیادہ روپیا تھا کہ پہلے پہل کسی نے اس پر توجہ نہیں دی، کیوں کہ انھیں یقین ہی نہیں آیا کہ یہ حقیقت ہو سکتی ہے۔ لیکن جب مسٹر ہر برٹ نے چھوٹی سی گھنٹی بجانی شروع کر دی تو لوگوں کو اعتبار کرنا پڑا اور وہ سینے چلے آئے۔

"میں دنیا کا امیر ترین آدمی ہوں،" انھوں نے کہا۔ "میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میرے پاس رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ اور پھر میرا دل اتنا بڑا ہے کہ میرے سینے میں اس کے لیے جگہ نہیں بچی ہے، اس لیے میں دنیا کے سفر پر نکلا ہوں تاکہ انسانیت کی مشکلیں آسان کروں۔"

ان کا قد اونچا اور رنگت سرخ و سفید تھی، وہ ر کے بغیر اونچی آواز میں بولتے اور بولنے کے دوران اپنے نیم پر جوش، سست ہاتھوں کو گردش دیتے رہتے، اور ان کے ہاتھ یوں لگتے جیسے ابھی ابھی ان کے بال مُوندے گئے ہوں۔ وہ پندرہ منٹ تک بولتے رہے، پھر آرام کرنے لگے۔ پھر انھوں نے گھنٹی بجائی اور دوبارہ بولنے لگے۔ تقریر کے عین درمیان میں مجھے میں سے کسی نے ٹوپی لہرائی اور بول پڑا۔

"چلو میاں، اتنی باتیں نہ بناؤ۔ مال بانٹنا شروع کرو۔"

"اتنی جلدی نہیں،" مسٹر ہر برٹ نے جواب دیا۔ "یوں بلا بات کے پیسے بانٹنا نہ صرف

کام کرنے کا نامناسب طریقہ ہے بلکہ اس میں کوئی نیک بھی نہیں ہے۔"

آنکھوں آنکھوں میں انھوں نے مجھے میں سے اس آدمی کو ڈھونڈ نکالا جو ان کی تقریر کے بیچ

میں بول پڑا تھا، اور اس کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ مجھے نے اسے آگے آنے کا راستہ دے دیا۔
 "بلکہ،" مسٹر ہربرٹ نے کہا، "ہمارے یہ بے صبرے دوست خود ہمیں یہ موقع فراہم
 کریں گے کہ ہم لوگوں کو دولت کی تقسیم کا سب سے زیادہ منفیٰ طریقہ سمجھائیں۔" انھوں نے
 اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور اس آدمی کو اوپر بلایا۔
 "تمہارا نام کیا ہے؟"

"پیٹر پیجیو۔"
 "اچھا تو پیٹر پیجیو،" مسٹر ہربرٹ نے کہا، "سب لوگوں کی طرح تمہاری بھی کوئی مشکل ہے
 جو تم بہت دیر سے حل نہیں کر پا رہے ہو۔"
 اس نے ٹوپی اتار دی اور اثبات میں سر ہلایا۔
 "کیا مشکل ہے؟"

"سیری مشکل یہ ہے،" پیٹر پیجیو نے کہا، "کہ سیرے پاس پیسے بالکل نہیں ہیں۔"
 "تمہیں کتنے کی ضرورت ہے؟"
 "اڑتالیس پیسہ۔"

مسٹر ہربرٹ نے فاتحانہ نعرہ مارا۔ "اڑتالیس پیسہ،" انھوں نے دوہرایا۔ مجمع تالیاں بجانے
 میں ان کا ساتھ دینے لگا۔
 "بہت خوب، پیٹر پیجیو،" مسٹر ہربرٹ نے کہا۔ "اب ہمیں ایک بات بتاؤ، تم کر کیا سکتے
 ہو؟"

"بہت سی چیزیں۔"
 "ایک کا فیصلہ کر لو،" مسٹر ہربرٹ نے کہا۔ "جو تم سب سے اچھی طرح کر سکتے ہو۔"
 "اچھا،" پیٹر پیجیو بولا۔ "چڑیاں بننا!"
 مسٹر ہربرٹ نے ایک بار پھر دادو تمہیں کے ڈونگرے برائے اور مجھے کی طرف رخ
 پھیرا۔

"اچھا تو خواتین و حضرات، ہمارے دوست پیٹر پیجیو، جو پرندوں کی نقل اتارنے کا کام
 غیر معمولی مہارت سے کرتے ہیں، اس وقت اڑتالیس مختلف پرندوں کی نقل اتاریں گے اور اس
 طرح اپنی زندگی کی مشکل آسان کر لیں گے۔"
 تب، مجمع کی حیرت زدہ خاموشی کے سامنے، پیٹر پیجیو چڑیاں بننے لگا۔ کبھی سیٹی بجاتا، کبھی
 حلق سے گلٹا، اس نے تمام جانے پہچانے پرندوں کی نقل اتاری، اور پھر ایسی آوازیں نکال کر یہ تعداد

مکمل کی جنہیں کوئی نہ پہچان سکا۔ جب وہ یہ کام کر چکا تو مسٹر ہر برٹ نے مجھے سے تالیاں بجانے کو کہا اور اڑتالیس پیسہ اس کے حوالے کر دیے۔

"اور آب،" وہ بولے، "ایک ایک کر کے آتے جاؤ۔ میں کل اسی وقت تک یہاں لوگوں کی مشکلیں آسان کرتا رہوں گا۔"

بوڑھے باکوب کو اس افراتفری کا اندازہ اپنے گھر کے سامنے سے گزرنے والوں کی بات چیت سے ہوا۔ ہر فقرے کے ساتھ اس کا دل بڑھتا گیا، بڑھتا گیا یہاں تک کہ اسے لگا پھٹ جائے گا۔

"تمہارا کیا خیال ہے اس گرہنگو کے بارے میں؟" اس نے پوچھا۔

دون ماکسیمو گومیز نے کندھے اچکا دیے۔ "کوئی سنی سیٹھ ہو گا۔"

"کاش میں بھی کچھ کر سکتا،" بوڑھا باکوب بولا، "میں بھی اپنی جھوٹی سی مشکل آسان کر لیتا۔"

زیادہ نہیں ہے، صرف بیس پیسہ۔"

"تم گوٹیں اچھی کھیل سکتے ہو،" دون ماکسیمو گومیز نے کہا۔

بظاہر بول لگا کہ بوڑھے باکوب نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی، لیکن اکیلا ہوتے ہی اس نے گوٹوں کا ڈنبا اور بساط اخبار میں لیٹیٹ، اور مسٹر ہر برٹ کو مقابلے کی دعوت دینے چل دیا۔ وہ آدمی رات تک اپنی باری کا انتظار کرتا رہا۔ آخر کار مسٹر ہر برٹ نے اپنے صندوق بند کروا دیے اور اگلی صبح تک کے لیے خدا حافظ کہہ دیا۔

وہ سونے کے لیے نہیں گئے۔ وہ ساتھ میں صندوق اٹھانے والوں کو لیے کاتارینو کے ہاں پہنچ گئے، اور مجمع سارے راستے ان کے پیچھے پیچھے اپنی مشکلیں لیے چلتا رہا۔ آہستہ آہستہ وہ ان کی مشکلیں حل کرتے گئے اور انھوں نے اتنی مشکلیں آسان کیں کہ آخر میں دکان کے اندر صرف عورتیں اور چند مرد رہ گئے تھے، اور ان کی بھی مشکلیں آسان ہو چکی تھیں۔ اور کمرے کے پچھلے حصے میں ایک تنہا عورت گئے کے اشتہار سے اپنے آپ کو دھیرے دھیرے پنکھا جھل رہی تھی۔

"اور تم،" مسٹر ہر برٹ نے چلا کر اس سے پوچھا۔ "تمہاری کیا مشکل ہے؟"

عورت نے پنکھا جھلنا بند کر دیا۔

"مجھے اپنے تماشے میں پھانسنے کی کوشش نہ کرو مسٹر گرہنگو،" وہ کمرے کے دوسرے کمرے سے چلائی۔ "میری کسی قسم کی کوئی مشکل نہیں ہے، اور میں رنڈی ہوں کیوں کہ میرے پیڑوں کی آنچ بہت تیز ہے۔"

مسٹر ہر برٹ نے کندھے اچکا دیے۔ وہ اپنے کھلے صندوق کے ساتھ بیٹھے ٹھنڈی بیس پیتے

رہے اور اور مشکلوں کا انتظار کرتے رہے۔ انہیں پسینا آ رہا تھا۔ ذرا دیر بعد ایک عورت ان لوگوں سے کٹ کر آگئی جو اس کے ساتھ میز پر بیٹھے ہوئے تھے اور نیچی آواز میں اس سے کچھ کہنے لگی۔ اسے پانچ سو پیسو کی شکل تھی۔

"تم اس کا حساب کیسے کرو گی؟"

"پانچ پانچ کر کے۔"

"ذرا سوچو،" مسٹر ہربرٹ نے کہا۔ "یہ سو آدمی ہو گئے۔"

"کوئی بات نہیں،" وہ بولی۔ "اگر مجھے یہ پوری رقم مل جائے تو یہ میری زندگی کے آخری سو مرد ہوں گے۔"

مسٹر ہربرٹ نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ کافی نو عمر تھی۔ اس کی ہڈیاں نرم تھیں مگر آنکھوں میں سیدھا سادا عزم جھلک رہا تھا۔

"ٹھیک ہے،" مسٹر ہربرٹ نے کہا۔ "اپنے کمرے میں جلی جاؤ اور میں تمہارے پاس آدمی بھیجنا شروع کرتا ہوں۔ ہر ایک تمہیں پانچ پیسو دے گا۔" وہ گلی میں آئے اور گھنٹی بجانے لگے۔

صبح سات بجے تو بیاس کو کاتارینو کی دکان کھلی ہوئی ملی۔ ساری بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ مسٹر ہربرٹ، نیند میں ڈوبے ہوئے اور بیسر سے پھولے ہوئے، لڑکی کے کمرے میں مردوں کے داخلے کی نگرانی کر رہے تھے۔

تو بیاس اندر چلا گیا۔ لڑکی نے اسے پہچان لیا اور اسے وہاں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ "تم بھی؟"

"انہوں نے مجھ سے کہا کہ اندر چلے جاؤ،" تو بیاس بولا۔ "مجھے پانچ پیسو دیے اور کہا کہ زیادہ دیر نہ لگانا۔"

لڑکی نے بستر پر سے گیلی چادر اتاری اور تو بیاس سے کہا کہ دوسرا سرا پکڑ لے۔ چادر ترپال کی طرح بھاری ہو رہی تھی۔ وہ اس کے دونوں سرے مروڑ کر اسے نیپوڑنے لگے یہاں تک کہ وہ پہلے کی طرح ہلکی ہو گئی۔ پھر انہوں نے گدا پٹا اور گدے کی دوسری طرف سے پسینا پٹنے لگا۔ تو بیاس جو کچھ کر سکتا تھا اس نے کیا۔ جاتے وقت اس نے پانچ پیسو نوٹوں کے اس دھیر پر رکھ دیے جو بستر کے پاس دھیرے دھیرے بلند ہوتا جا رہا تھا۔

"جس جس کو بھیج سکتے ہو بھیج دو،" مسٹر ہربرٹ نے اس سے کہا۔ "دیکھیں اگر یہ معاملہ دوپہر سے پہلے نبھ جائے۔"

لڑکی نے دروازہ ذرا سا کھولا اور ٹھنڈی سیر مانگی۔ اس وقت تک کئی لوگ منتظر کھڑے تھے۔
"کتنے آور رہ گئے؟" اس نے پوچھا۔

"تریسٹھ" مسٹر ہر برٹ نے جواب دیا۔

بورٹھا باکوب تمام دن بغل میں ڈبا تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے پھرتا رہا۔ اس کی باری کہیں رات گئے آئی اور اس نے اپنی مشکل بیان کر دی، اور مسٹر ہر برٹ اس کی بات مان گئے۔ انھوں نے دو کرسیاں اور ایک چھوٹی میز گلی میں بھیجی ہوئی بڑی سیز پر رکھ دیں اور بورٹھے باکوب نے پہلی چال چلی۔ یہ آخری بازی تھی جس کی وہ پیش بندی کر سکا۔ وہ بار گیا۔

"پالیس پیسو،" مسٹر ہر برٹ نے کہا۔ "اور اس دفعہ میں تمہیں دو چالوں سے مات دوں گا۔" وہ پھر جیت گئے۔ ان کے ہاتھ گوٹوں پر پڑتے ہوئے بھی نظر نہ آتے۔ پھر وہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر، محض اپنے مد مقابل کی چالوں کا اندازہ لگا کر کھیلنے لگے، اور پھر بھی جیت گئے۔ مجمع کھیل دیکھتے دیکھتے اکٹا گیا۔ جب بورٹھے باکوب نے بار مانی تو اس وقت تک وہ کوئی پانچ ہزار سات سو بیالیس پیسو اور تین سینٹ کے برابر رقم کا مقروض ہو چکا تھا۔

ان کے چہرے کا تاثر ذرا نہیں بدلا۔ انھوں نے یہ رقم کاغذ کے بُرزے پر لکھ لی، جو ان کی جیب میں پڑا ہوا تھا۔ پھر انھوں نے بساط تہ کی، گوٹیں ڈبے میں ڈالیں، اور ساری چیزیں اخبار میں لپیٹ لیں۔

"میرے ساتھ جو جی پاسے کرو،" اس نے کہا، "مگر یہ چیزیں میرے پاس رہنے دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمام زندگی محنت کر کے تمہارا ایک ایک سینٹ چکا دوں گا۔"
مسٹر ہر برٹ نے گھڑمی دیکھی۔

"مجھے بہت افسوس ہے،" وہ کہنے لگے۔ "تمہارے پاس صرف بیس منٹ ہیں۔" وہ انتظار کرتے رہے یہاں تک کہ انھیں یقین ہو گیا کہ ان کے حریت کو کوئی حل نہیں ملا۔ "تمہارے پاس داؤ پر لگانے کے لیے کوئی اور چیز نہیں ہے؟"
"میری عزت۔"

"میرا مطلب ہے،" مسٹر ہر برٹ نے سمجھایا، "کوئی ایسی چیز جس پر رنگ میں ڈوبا ہوا برش پھیرا جائے تو اس کا رنگ بدل جائے۔"
"میرا مکان،" بورٹھے باکوب نے کہا، "جیسے کوئی پہیلی بوجھ رہا ہو۔" زیادہ مالیت کا نہیں ہے، لیکن مکان تو ہے۔"

تو اس طرح مسٹر ہر برٹ نے بورٹھے باکوب کے مکان کا قبضہ سنبھال لیا۔ انھوں نے ان

لوگوں کے مکان اور جائیدادیں بھی حاصل کر لیں جو اپنے قرضے ادا نہیں کر سکے، لیکن انھوں نے ہفتے بھر کے لیے گانے بجانے، آتش بازی اور ٹٹوں کے کھیل تماشوں کا اعلان کیا اور سارے انتظامات خود سنبھال لیے۔

یہ بہت یادگار دن تھے۔ مسٹر ہربرٹ نے قصبے کی قسمت میں معجزانہ تبدیلی کی بات کی بلکہ مستقبل کے شہر کا نقشہ کھینچ ڈالا، شیشے کی عظیم الشان عمارتیں جن کی اوپری منزلوں پر رقص گاہیں تھیں۔ وہ مجھے کو یہ نقشہ دکھاتے رہے۔ لوگ حیران ہو کر دیکھتے رہے، اپنے آپ کو ان پیدل راہ گیروں میں تلاش کرتے رہے جن کا خاکا مسٹر ہربرٹ نے اپنے رنگوں میں کھینچا تھا، مگر اس تصویر کے لوگ اتنے عمدہ کپڑے پہنے ہوئے تھے کہ یہ لوگ خود کو پہچان نہ پاتے۔ انھیں مسٹر ہربرٹ سے یوں فائدہ اٹھاتے ہوئے دکھ ہوا۔ وہ یہ بات یاد کر کے ہنستے رہے کہ وہ اکتوبر میں روئے دے رہے تھے، اور امید کے دھندلے میں رہتے رہے، یہاں تک کہ مسٹر ہربرٹ نے گھنٹی بجا کر تماشے کے ختم ہونے کا اعلان کیا۔ تب ہمیں جا کر مسٹر ہربرٹ کو آرام کرنے کا موقع ملا۔

"تم اس طرح زندگی گزارتے رہے تو مر جاؤ گے،" بوڑھے باکوب نے کہا۔

"میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میرے مرنے کی کوئی وجہ نہیں،" مسٹر ہربرٹ نے کہا۔ وہ بستر پر طعیر ہو گئے۔ وہ بہت دنوں تک سوتے، شیر کی طرح خزاٹے لیتے رہے، اور اتنے دن گزر گئے کہ لوگ ان کے جاگنے کا انتظار کرتے کرتے تنک گئے۔ لوگوں کو غذا کی تلاش میں لیکڑے کھود کر نکالنے پڑے۔ کاتارینو کے ننھے رکاوڑ اتنے پرانے ہو گئے کہ جو بھی انھیں سننا اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے، اور اسے اپنی دکان بند کرنی پڑی۔

مسٹر ہربرٹ کو سوتے ہوئے بہت وقت بیت چکا تھا کہ پادری نے بوڑھے باکوب کے دروازے پر دستک دی۔ گھر کا دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ چوں کہ سوتے ہوئے آدمی کے تنفس نے تمام ہوا کھینچ کر استعمال کر لی تھی، اس لیے چیزیں بے وزن ہو کر فضا میں تیرتی پھر رہی تھیں۔

"مجھے ان سے ایک بات کہنی ہے،" پادری نے کہا۔

"آپ کو انتظار کرنا پڑے گا،" بوڑھے باکوب نے کہا۔

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"تشریف رکھیے پادری صاحب، اور انتظار کیجیے،" بوڑھے باکوب نے دوہرایا۔ "اور براہ مہربانی اس وقت تک مجھ سے باتیں کیجیے۔ بہت دن ہو گئے مجھے پتا نہیں چلا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔"

"سب لوگ بکھر گئے،" پادری نے کہا۔ "زیادہ دن نہیں جاتے کہ قصبہ بالکل ویسا ہی ہو جائے گا جیسا پہلے تھا۔ بس یہی ایک خبر ہے۔"

"لوگ پھر واپس آ جائیں گے جب سمندر سے گلابوں کی خوشبو آنے لگے گی،" بوڑھے باکوب نے کہا۔

"لیکن اس دوران ہمیں یہاں رہ جانے والوں کے فریب نظر کو کسی نہ کسی چیز سے برقرار رکھنا ہوگا،" پادری نے کہا۔ "یہ بہت ضروری ہے کہ ہم فوراً گرجا کی تعمیر شروع کر دیں۔"

"تو آپ اس لیے مسٹر ہربرٹ سے ملنے آئے ہیں،" بوڑھے باکوب نے کہا۔

"بالکل درست،" پادری نے کہا۔ "گرینگولڈ کے بہت سخی ہوتے ہیں۔"

"تو پھر ذرا انتظار کیجیے، مقدس باپ،" بوڑھے باکوب نے کہا۔ "شاید وہ جاگ ہی جائیں۔"

وہ گولٹیں کھیلنے لگے۔ یہ بہت طویل اور پیچیدہ بازی تھی جو کئی دنوں تک چلتی رہی، مگر مسٹر ہربرٹ سو کر نہ اٹھے۔

پادری مایوسی کے ہاتھوں الجھن میں پڑ گیا۔ وہ تانبے کی ٹشتری لیے گرجے کی تعمیر کے لیے چند ماگلتا سارے میں پھرتا رہا لیکن اسے کوئی خاص رقم نہیں ملی۔ وہ اتنی بھیک مانگنے سے روز بروز پُر نور ہوا جا رہا تھا، اس کی بڈیوں میں آوازیں سما جی تھیں، اور ایک اتوار کو وہ زمین سے دوبارہ اوپر اٹھ گیا، مگر کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ پھر اس نے ایک سوٹ کپڑوں میں اپنے کپڑے ڈالے، دوسرے میں جمع کی ہوئی رقم ڈالی اور ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا۔

"وہ خوشبو واپس نہیں آئے گی،" اس نے ان دوستوں سے کہا جنہوں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ "تم لوگوں کو اس حقیقت کا سامنا کرنا چاہیے کہ قصبہ گناہ میں مبتلا ہو گیا ہے۔"

جب مسٹر ہربرٹ جاگے تو قصبہ ویسا ہی تھا جیسے پہلے ہوا کرتا تھا۔ بارش نے کوڑے کے ان ڈھیروں کو سر اڑایا تھا جو ہجوم گلیوں میں چھوڑ گیا تھا، اور زمین ایک بار پھر نمبر اور اینٹ کی طرح سخت ہو گئی تھی۔

"میں بہت دیر سوتا رہا،" مسٹر ہربرٹ نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"صدیوں تک،" بوڑھے باکوب نے کہا۔

"بھوکے میرا دم ٹکلا جا رہا ہے۔"

"سب کی یہی حالت ہے،" بوڑھے باکوب نے کہا۔ "اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ساحل پر جائیں اور لکڑی ڈھونڈنے کے لیے زمین کھودیں۔"

جب تو بیاس کی ان سے ملاقات ہوئی تو وہ زمین کھود رہے تھے اور ان کے منہ سے جھاگ نکل

ربا تھا، اور تو بیاس کو یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ جب دولت مند لوگ فالتے میں مبتلا ہوتے ہیں تو وہ بڑی حد تک غریبوں کی طرح لگتے ہیں۔ مسٹر ہر برٹ کو زیادہ لکڑے نہیں ملے۔ رات پڑنے پر انھوں نے تو بیاس کو کھانے کی چیزیں ڈھونڈنے کے لیے سمندر کی تہوں میں چلنے کی دعوت دی۔

"سنو،" تو بیاس نے انھیں خبردار کیا، "صرف مُردوں کو معلوم ہے کہ وہاں گہرائی کے اندر کیا ہے۔"

"سائنس دانوں کو بھی پتا ہے،" مسٹر ہر برٹ نے کہا۔ "ڈوبے ہوئے لوگوں کے سمندر کی تہ میں کھجورے ہیں جن کا گوشت بہت عمدہ ہوتا ہے۔ چلو، کپڑے اتارو اور چلتے ہیں۔"

وہ چلے گئے۔ پہلے پہل وہ سیدھے سیدھے تیرتے رہے، پھر نیچے بہت گہرائیوں میں جہاں پہلے سورج کی روشنی ختم ہوئی اور پھر سمندر کی، اور چیزیں اپنی ہی روشنی میں نظر آنے لگیں۔ وہ ایک غرقاب گاؤں کے پاس سے گزرے جہاں مرد اور عورتیں گھوڑوں پر بیٹھے موسیقی کی تال پر گھوم رہے تھے۔ وہ ایک شان دار دن تھا اور برآمدوں میں شوخ رنگ پتوں کھلے تھے۔

"گیارہ بجے صبح ڈوبا ہوا ایک اتوار،" مسٹر ہر برٹ نے کہا۔ "تالبا کوئی طغیانی آئی ہوگی۔" تو بیاس گاؤں کی طرف مڑنے لگا مگر مسٹر ہر برٹ نے اسے اشارہ کیا کہ نیچے ہی نیچے جانا ہے۔

"وہاں گلاب ہیں،" تو بیاس بولا۔ "میں چاہتا ہوں کہ کھو تیلدے کو بھی پتا لگ جائے کہ گلاب کیسے ہوتے ہیں۔"

"تم یہاں کسی اور دن فرصت سے آ جانا،" مسٹر ہر برٹ نے کہا۔ "اس وقت تو میں بھوک سے مراجار بابوں۔"

مسٹر ہر برٹ باتھوں اور بازوؤں کو آہستہ آہستہ حرکت دیتے ہوئے، آکٹوپس کی طرح نیچے جاتے رہے۔ تو بیاس جو پوری کوشش کر رہا تھا کہ انھیں آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دے، یہ سوچنے لگا کہ امیر آدمیوں کے تیرنے کا یہی طریقہ ہوتا ہوگا۔ رفتہ رفتہ وہ معمولی آفات کے سمندر کو پیچھے چھوڑتے جا رہے تھے اور مُردوں کے سمندر میں داخل ہو رہے تھے۔

وہاں اتنی بڑی تعداد میں مُردے تھے کہ تو بیاس نے سوچا کہ میں نے دنیا میں اتنے آدمی کبھی نہیں دیکھے۔ سارے مُردے بے حس و حرکت بستے چلے جا رہے تھے، چہرے اوپر کیے، مختلف سطحوں پر بیٹھے ہوئے، اور ان سب پر بھولی بھری ارواح کا تاثر تھا۔

"یہ سب بہت پرانے مُردے ہیں،" مسٹر ہر برٹ نے کہا۔ "انھیں صدیاں لگ گئیں تب

جا کر استراحت کی اس حالت کو پہنچے۔
اس سے آور بچے، تازہ تر مُردوں کے پانیوں میں پہنچ کر مسٹر ہر برٹ رک گئے۔ تو بیاس اس لمحے ان کے پاس آکر رکھا جب ایک بہت نو عمر عورت ان کے سامنے سے گزری۔ وہ پہلو کے بل تیر رہی تھی، اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور پیچھے پیچھے پھولوں کی موج تھی۔
مسٹر ہر برٹ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی اور اس وقت تک رکھے رہے جب تک کہ آخری پھول سامنے سے بہہ نہ گئے۔

"میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ حسین عورت نہیں دیکھی،" انہوں نے کہا۔
"یہ بوڑھے باکوب کی بیوی ہے،" تو بیاس بولا۔ "اس کی عمر پچاس سال کم ہو گئی ہے، مگر یہ بے وہی۔ مجھے یقین ہے۔"
"اس نے بہت سفر کیا ہے،" مسٹر ہر برٹ نے کہا۔ "اس کے پیچھے دنیا کے تمام سمندروں کے پھول ہیں۔"

وہ تہ تک پہنچ گئے۔ مسٹر ہر برٹ نے زمین پر دو تین چکر لگائے جو چمک دار چٹان کی طرح لگ رہی تھی۔ تو بیاس نے ان کی پیروی کی۔ جب وہ تہ کی نیم روشنی میں دیکھنے کا عادی ہو گیا تو اس نے دیکھا کہ ارد گرد کچھوے ہی کچھوے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں، تہ میں چپکے ہوئے اور اس قدر بے حس و حرکت کہ پتھر اُٹے ہوئے لگ رہے تھے۔

"یہ زندہ ہیں،" مسٹر ہر برٹ نے کہا۔ "مگر یہ ہزاروں لاکھوں برس سے سو رہے ہیں۔"
انہوں نے ایک کچھوے کو پٹا۔ ہولے سے اسے جھو کر اوپر کی طرف دھکیلا، اور سوتا ہوا حیوان ان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر اوپر کی طرف ہٹا گیا۔ تو بیاس نے اسے جانے دیا۔ پھر اس نے سطح سمندر کی طرف دیکھا اور اسے پورا سمندر اٹا نظر آیا۔
"یہ تو بالکل خواب کی طرح ہے،" اس نے کہا۔

"تمہارے حق میں بہتر ہو گا کہ کسی کو اس کے بارے میں نہ بتاؤ،" مسٹر ہر برٹ نے کہا۔
"ذرا سوچو کہ دنیا میں کتنا انتشار برپا ہو جائے گا اگر لوگوں کو ان چیزوں کے بارے میں پتا چل گیا۔"

جب وہ واپس قصبے میں پہنچے تو رات آدھی بیت چکی تھی۔ انہوں نے کھو تیلدے کو جگایا کہ پانی اُبال دے۔ مسٹر ہر برٹ نے کچھوے کا گوشت بنا دیا، مگر وہ تینوں ساتھ لگے تب جا کر کچھوے کے دل کا پتھا کر کے اسے ایک بار پھر بلاک کر سکے، جو اس وقت اچھل کر آنگن میں آگیا تھا جب وہ گوشت کے پارچے کاٹ رہے تھے۔ انہوں نے اتنا کھالیا کہ ان سے سانس نہ لیا جاتا تھا۔

"اچھا تو بیاس،" تب مسٹر ہر برٹ نے کہا۔ "ہمیں حقیقت کا سامنا کرنا ہے۔"

"بے شک۔"

"اور حقیقت یہ کہتی ہے،" مسٹر ہر برٹ بولے، "کہ خوشبو واپس نہیں آئے گی۔"

"ضرور آئے گی۔"

"نہیں آئے گی،" کلوتیلڈے نے دخل دیا، "علاوہ اور وجوہات کے اس لیے بھی کہ خوشبو اصل میں آئی ہی نہیں تھی، یہ تم ہی تھے جس نے سب لوگوں میں ہنگامہ مچا دیا۔"

"تم نے خود بھی تو سونگھی تھی،" تو بیاس نے کہا۔

"میں اُس رات مدہوش ہو رہی تھی،" کلوتیلڈے بولی، "مگر اب، اس وقت، میں کسی بھی ایسی چیز کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی جس کا تعلق اس سمندر سے ہو۔"

"اچھا، تو میں اپنی راہ لوں،" مسٹر ہر برٹ بولے۔ پھر ان دونوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ "اور تمہیں یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔ دنیا میں کرنے کے لیے اتنا کچھ ہے کہ تم یہاں پڑے فاقے نہیں کر سکتے۔"

وہ چلے گئے۔ تو بیاس آنگن میں بیٹھا افق کی آخری حدوں تک تارے گنا کیا، اور اسے معلوم ہوا کہ پچھلے دسمبر کے مقابلے میں اس مرتبہ تین تارے زیادہ ہیں۔ کلوتیلڈے نے اسے خواب گاہ میں بلایا مگر اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔

"یہاں آؤ، مٹی کے مادحو،" کلوتیلڈے نے اصرار کیا۔ "کتنے سال گزر گئے ہم نے خرگوشوں کی طرح نہیں کیا۔"

تو بیاس بست در تک انتشار کرتا رہا۔ آخر کار جب وہ اندر گیا تو وہ سوچتی تھی۔ اس نے اسے کچھ کچھ جگایا مگر وہ اس قدر تھکی ہوئی تھی کہ وہ دونوں گڑبڑا گئے اور بس کیپوں ہی کی طرح کر پائے۔

"تم پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہے ہو،" کلوتیلڈے نے بد مزاجی سے کہا۔ "کسی اور چیز کے بارے میں سوچنے کی کوشش کرو۔"

"میں کسی اور چیز ہی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

کلوتیلڈے نے معلوم کرنا چاہا کہ وہ کوئی اور چیز کیا ہے اور تو بیاس نے اس شرط پر اسے بتانے کی ہامی بھری کہ وہ کسی کے سامنے اس کا ذکر نہیں کرے گی۔ کلوتیلڈے نے وعدہ کر لیا۔

"سمندر کی تہ میں ایک گاؤں ہے،" تو بیاس نے بتایا، "جس میں چھوٹے چھوٹے سفید گھر ہیں اور ان کے برآمدوں میں لاکھوں پھول کھلے ہیں۔"

محم گنتہ وقت کا سمندر

کلو تیلدے نے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔

"ارے تو بیاس،" وہ بولی۔ "ارے تو بیاس، خدا کے واسطے، اب یہ باتیں پھر سے شروع نہ کرو۔"

تو بیاس کچھ نہ بولا۔ وہ کروٹ بدل کر بستر کے کنارے پر آ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ صبح سویرے تک نہیں سو سکا جب ہوا کا رخ بدلا اور لیکڑوں نے اسے چین سے سونے دیا۔

گا بریتل گارسیا مارکیز

ترجمہ: عطا صدیقی

بڑے بڑے پروں والا ایک بوڑھا پھوس

(بچوں کے لیے ایک کہانی)

لگاتار بارشوں کے تیسرے دن وہ اتنے بہت سے کیکڑے ٹھکانے لگا چکے تھے کہ پیلا یو کو اپنا پانی بھرا صحن پار کر کے ان سب کو سمندر میں پھینکنے کے لیے جانا پڑا۔ بات یہ تھی کہ نومولود بچے کو تیز بخار تھا، اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اس کا سبب ان کیکڑوں کی بساند ہے۔ مشکل کے دن سے سارا عالم اداس اداس سا تھا۔ کیا سمندر اور کیا آسمان، سب ایک جیسے گدے گدے دکھائی دے رہے تھے، اور ساحل کی وہ رست جو مارچ کی راتوں میں مثل افشاں کے جھلایا کرتی تھی، اس وقت کیچڑ اور سڑے بے گھو گلوں کی گاد بن چکی تھی۔ عین دوپہر میں بھی روشنی اتنی کم کم تھی کہ پیلا یو جب کیکڑے پھینک کر گھر واپس آ رہا تھا تو اس کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ آخر وہ کیا شے ہے جو صحن کے پچھواڑے رینگ رہی ہے اور کراہ رہی ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ ایک بدحشا ہے، اسے اس کے بہت ہی قریب جانا پڑا؛ ایک پیر فرقت جو منہ کے بل کیچڑ میں پڑا ہے اور سر توڑ کوشش کے باوجود اپنے بڑے بڑے پروں کی وجہ سے اُٹھ نہیں پارا۔

اس کا بوس سے دہشت زدہ ہو کر پیلا یو اپنی بیوی ایللی سیندا کو بلا نے لپکا، جو کہ بیمار بچے

کے ماتھے پر گیلی پٹیاں رکھ رہی تھی، اور اس کو لے کر صحن کے پچھواڑے تک آیا۔ وہ دونوں زمین پر پڑے ہوئے اس جسم کو گم سم، پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ وہ چندیاں بٹورنے والوں کا سالباس پہنے تھا۔ اس کی سپاٹ چندیا پر چند گینے چنے بال رہ گئے تھے اور منہ میں دانت بھی اکادکا تھے، اور اس کی تَر تَر، سگروداؤں والی افسوس ناک حالت نے اس کی رہی سہی شان کو، جو اس میں کبھی رہی ہوگی، خاک میں ملا دیا تھا۔ اس کے میلے، آدھ بچے، بڑے بڑے، عقاب جیسے پنکھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کیچڑ میں لت پت ہو چکے تھے۔ دونوں اس کو اتنی دیر تک اور اتنے غور سے دیکھا کہ پیلایو اور ایللی سیندا کی حیرانی دھیرے دھیرے جاتی رہی، اور ہوتے ہوتے وہ ان کو مانوس سا لگنے لگا۔ تب انھوں نے اس سے بات کرنے کی ہمت کی، جس کا جواب اس نے ملٹاحوں کی سی بجماری آواز میں کسی آن جانی زبان میں دیا۔ یوں انھوں نے پندوں والی دقت کو نظرا انداز کرتے ہوئے، اپنی دانت میں بڑی دانش مندی سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ طوفان کے مارے کسی شکستہ فرنگی جہاز کا آخری بچ جانے والا ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے پڑوس کی اُس عورت کو بلالیا جو زندگی اور موت کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی، تاکہ وہ اس کا معائنہ کر لے۔ ان کے غلط اندازے کو ٹھٹھلانے کے لیے اس عورت کا اس کو بس ایک نظر دیکھنا کافی تھا۔

"یہ تو فرشتہ ہے،" اس نے ان کو بتایا۔ "وہ بچے کے لیے آ رہا ہوگا، پر بے چارہ اتنا بوڑھا ہے کہ بارش نے راستہ ہی میں ڈھیر کر دیا۔"

اگلے دن سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ ایک جیتا جاگتا فرشتہ پیلایو کے گھر میں بند ہے۔ پڑوس کی سیانی عورت کی رائے کے برخلاف، جس کا کہنا تھا کہ آج کل کے فرشتے دراصل ایک آسمانی سازش کے بعد بچ جانے والے بھگوڑے ہیں، ان کا دل نہ مانا کہ وہ ڈنڈے مار مار کر اس کی جان نکال دیں۔ اپنا بیلٹ والا ڈنڈا اٹھائے اٹھائے پیلایو ساری سہ پہر باورچی خانے میں بیٹھا اس کی نگرانی کرتا رہا، اور رات کو سونے سے قبل اس نے اسے کیچڑ میں سے گھسیٹا اور لے جا کر جالی دار درڑے میں مرغیوں کے ساتھ بند کر دیا۔ آدھی رات گئے جس وقت بارش تھمی تو پیلایو اور ایللی سیندا ابھی کیچڑ سے ہی مار رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بچے کی آنکھ کھل گئی؛ اس کو بخار نہیں تھا اور وہ کچھ کھانے کو مانگ رہا تھا۔ تب ان کی دریاہلی نے جوش مارا اور انھوں نے طے کر لیا کہ وہ فرشتے کو تازہ پانی اور تین دن کی رسد دے کر، ایک تختے پر سوار کرا کے، سمندر میں تن بہ تقدیر چھوڑ آئیں گے۔ مگر جب وہ منہ اندھیرے صحن میں گئے تو کیا دیکھا کہ پورا محنت ٹولا درڑے کے سامنے جمع، فرشتے کے ساتھ دل لگی بازی میں لگا ہے۔ وہ ٹوٹی ہوئی جالی میں سے کھانے کی چیزیں ذرا سے بھی ادب و احترام کے بغیر اس کی طرف اس طرح پھینک رہے تھے جیسے وہ کوئی

علوی وجود نہ ہو بلکہ سرکس کا کوئی جانور ہو۔

اس عجیب و غریب خبر سے گھبرا کر پادری گون زاگا کوئی سات بجے سے پہلے ہی پہلے آ گئے۔ اس وقت تک صبح والوں سے ذرا کم شرر تماش بین آپکے تھے، اور قیدی کے مستقبل کے بارے میں جو منہ میں آ رہا تھا رائے زنی کر رہے تھے۔ ان میں سب سے بھولے کا خیال تھا کہ اس کو ساری دنیا کا میٹر نامزد کر دیا جائے۔ ذرا زیادہ عقل کے پورٹھوں نے محسوس کیا کہ اس کو جیج ستاری جنرل بنوایا پیسے کہ ساری جنگیں فتح کر لے۔ چند خیال پرستوں نے آس لگائی کہ اس سے نسل کشی کا کام بھی لیا جاسکتا ہے کہ وہ روئے زمین پر پردار سیافوں کی ایک ایسی نسل پیدا کر دے جو پوری کائنات کا چارج سنبھال سکے۔ لیکن پادری گون زاگا پادری بننے سے پہلے ایک تنومند لکڑبارے رہ چکے تھے۔ جالی کے پاس کھڑے کھڑے انھوں نے جھٹ پٹ غلط دنیا کے تمام سوالات و جوابات کو دماغ میں تازہ کیا اور ان لوگوں سے کہا کہ دروازہ کھولیں تاکہ وہ قریب سے اس دیکھیا آدمی کو دیکھیں جو حیران پریشان، مرغیوں کے درمیان خود ایک بڑی سی خستہ حال مرغی لگ رہا تھا۔ وہ ایک کونے میں پہلوں کے پھلکوں اور بچے کچھے ناشتے کی چیزوں کے درمیان، جو صبح کو آنے والے پینک گئے تھے، پڑا اپنے پھیلے ہوئے پروں کو دھوپ میں سکھا رہا تھا۔ جس وقت پادری گون زاگا نے دڑبے میں داخل ہو کر لاطینی زبان میں صبح بخیر کہا تو اس نے دنیا کی گستاخیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بس اپنی عمر رسیدہ نظریں اٹھائیں اور اپنی بولی میں کچھ منمنایا۔ جب پادری گون زاگا نے دیکھا کہ نہ تو وہ خدا کی زبان جانتا ہے اور نہ اس کے خادموں کے استقبال کے آداب سے واقف ہے، تو ان کو پہلی بار اس پر جعلیابو نے کاشبہ ہوا۔ پھر انھوں نے غور کیا کہ بہت قریب سے دیکھنے پر وہ بالکل آدمیوں جیسا ہے۔ اس کے پاس سے کھلے میں رہنے والوں کی سی ناقابل برداشت بو آ رہی تھی، اس کے پروں میں جوئیں بچک رہی تھیں اور زمینیں ہواؤں نے اس کے اصل پروں کا براشر کر دیا تھا؛ اور اس میں کوئی بات بھی تو ایسی نہیں تھی جو فرشتوں کے قابلِ فخر و تار کے معیار پر پوری اترتی ہو۔ پھر وہ دڑبے میں سے باہر آئے اور ایک مختصر خطبے کے ذریعہ متجسس نفوس کو طباع بننے کے خطرات سے خبردار کیا۔ انھوں نے ان کو یاد دلایا کہ شیطان کی ایک بری عادت کار نیوالی کر تبوں کا استعمال کرنا بھی ہے تاکہ غافلوں کو دھوکا دے سکے۔ انھوں نے دلیل پیش کی کہ اگر ہوائی جہاز اور عقاب میں فرق کرنے کے لیے پتکے لازمی عنصر نہیں، تو فرشتوں کی پہچان کے لیے تو ان کی اہمیت اور بھی کم ہوگی۔ پھر بھی انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے اُسقف کو عربیہ روانہ کریں گے، تاکہ وہ اپنے اُسقف اعظم کو اس بابت لکھیں، تاکہ وہ پاپائے روم کو لکھیں، اور یوں اعلیٰ ترین عدالت سے قول فیصل حاصل ہو

جائے گا۔

ان کی دانش مندی چکنے گھڑوں پر صنائع گئی۔ اسیر فرشتے کی خبر اتنی تیزی سے پھیلی کہ چند گھنٹوں کے اندر اندر صحن میں بازار کی سی چل پھل ہو گئی اور سنگین بردار سپاہی بُلوانے پڑے تاکہ اس مجمعے کو منتشر کریں جو کہ مکان کو تلیٹ کیے دے رہا تھا۔ اہلی سید اکو، جس کی کمر اتنا سارا بازاری گند جھاڑتے جھاڑتے دوہری ہو چکی تھی، یہ سوجھ گئی کہ صحن میں کھڑا لگاؤ اور فرشتے کو دیکھنے کے لیے ہر ایک سے پانچ پانچ سینٹ وصول کر لے۔ مشتاقان دید دور دور سے آنے لگے۔ ایک گشتی کار نیوال نے پھیرا لگایا؛ اس میں ایک اُڑان بھرنے والا نٹ مجمعے کے سروں پر بار بار پھر پھرتا پھرا، مگر کسی نے اسے ٹھاس نہ ڈالی کیوں کہ اس کے پَر فرشتوں کے مانند نہیں تھے بلکہ چمکا دروں جیسے تھے۔ زمانے بھر کے بد نصیب ترین معذور لوگ تندرستی کی آس میں آنے لگے: ایک دکھیااری جو بچپن سے دل کی دھڑکنیں شمار کر رہی تھی اور گنتے گنتے جس کی گنتی ہی ختم ہو گئی تھی؛ ایک پُر ٹکالی مرد جو اس لیے سو نہیں سکتا تھا کہ ستاروں کا شور اس کو تنگ کرتا تھا؛ ایک نیند میں پٹنے والا جو راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اپنے دن میں کیے ہوئے کام بگاڑا کرتا تھا؛ اور دوسرے بہت سارے جن کے مرض ان سے ذرا کم تشویش ناک تھے۔ پیروں تلے کی زمین بلا دینے والی، ڈوبتے جہاز جیسی اس بڑبونگ کے بیچ پیلا یو اور اہلی سید اپنی ٹھکن میں بھی مگن تھے، کیوں کہ ایک ہفتے سے بھی کم مدت میں انھوں نے اپنا گھر رقم سے ٹھسا ٹھس بھر لیا تھا اور اب بھی اپنی باری کے مستظر زائرین کی قطار افق کے اُس پار تک پہنچی ہوئی تھی۔

فرشتہ ہی فقط ایک واحد ہستی تھا جو خود اپنے تماشے میں کوئی حصہ نہیں لیتا تھا۔ جالی کے نزدیک رکھے گئے تیل کے چراغوں اور عٹائے ربانی والی موم بتیوں کی جھنمی تمازت سے چکرایا چکرایا سا، وہ اپنا وقت اپنے مانگے کے ٹھکانے میں اپنی آسائش کی جستجو میں گزارتا۔ اول اول انھوں نے اس کو کپڑوں میں رکھنے والی گولیاں کھلانے کی کوشش کی، جو سیانی پڑوسن کے علم کے مطابق فرشتوں کی غذا تھی، لیکن اس نے کھانے سے انکار کر دیا، بالکل اسی طرح جیسے اس نے پوپ کا وہ خاصہ کھانے سے انکار کر دیا تھا جو تائب لوگ لاتے تھے۔ وہ اتنا کبھی نہ جان سکے کہ اس کا سبب اس کا فرشتہ ہونا تھا یا یہ کہ وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ اور آخر کو وہ بیٹنگن کے گودے کے سوا کچھ نہیں کھاتا تھا۔ اس کی قوت برداشت ہی ایک اکیلی خارق عادت نظر آتی تھی، خاص کر ابتدائی ایام میں، جب مرغیاں ان سداوی جویوں کی تلاش میں جو اس کے پروں کے اندر بڑھی چلی جا رہی تھیں ٹوٹ گئیں مارا کرتیں، اور اپنا کھانے اپنے ناقص اعصاب سے بھوانے کے لیے اس کے پَر نوچا کرتے، اور سب سے زیادہ مہربان لوگ تک اس کو کھڑل کرنے کی کوشش میں پتھر مار دیا کرتے

تاکہ وہ اس کو کھڑے قد دیکھ سکیں۔ وہ صرف ایک بار اس کو اپنی جگہ سے ہلانے میں کامیاب ہو سکے تھے، جب انھوں نے پھڑوں کو داغنے والے لوہے سے اس کے پہلو میں چرکا لگا دیا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہ اتنے گھنٹوں سے بے حس و حرکت پڑا تھا کہ انھوں نے سوچا کہ میں مرنے گیا ہوں۔ وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور آنکھوں میں آنسو بھرے بھرے اپنی جتنی زبان میں بلبلانے لگا اور دو ایک بار اپنے پر پھر پھڑپھڑائے تو مرغیوں کی سیٹ اور قمری خاک کا بگولہ ناچنے لگا اور دہشت کا وہ جھکڑ چلا جو اس دنیا کا تو لگتا نہیں تھا۔ گو بہتوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ خفگی کا نہیں بلکہ تکلیف کا مظاہرہ تھا، مگر اس دن کے بعد سے وہ سب احتیاط کرنے لگے کہ اس کو ناراض نہ کریں کیوں کہ اکثر لوگ سمجھ چکے تھے کہ اس کی مفعولیت اُس سورما کی سی نہیں جو اگلے حملے کے لیے سستا رہا ہو، بلکہ کسی خوابیدہ فتنے کی سی ہے۔

قیدی کی اصلیت کے بارے میں قول فیصل آنے کے انتظار کے دوران پادری گون زاگا نے مجھے کی شرارتوں کو خادماؤں کی سی سوچہ بوجہ والے چٹکوں سے قابو میں رکھا۔ مگر روم کی ڈاک نے آنے میں کوئی غلٹ نہ دکھائی؛ کبھی وہ لوگ یہ دیکھتے کہ اس کی ناف ہے یا نہیں، کبھی یہ سوچتے کہ اس کی بولی کا تعلق آرامی زبان سے تو نہیں، کبھی یہ کہ ایک سوئی کی گھنڈی پر وہ کتنی مرتبہ سما سکتا ہے، یا یہ کہ کہیں وہ محض کوئی پردار ناروے والا نہ ہو، اور یوں وہ لوگ اپنا وقت بتایا کرتے تھے۔ اگر رحمت خداوندی نے آڑے آکر پادری کی زحمتموں کا خاتمہ نہ کر دیا ہوتا تو یہ مختصر سے عریضے قیامت تک آتے جاتے رہتے۔

ہوا یہ کہ اُنھی دنوں میں آنے والے بہت سے کھیل تماشوں میں ایک ایسی عورت کا گشتی تماشا بھی آیا جس کو والدین کی نافرمانی کرنے پر مکڑی بنا دیا گیا تھا۔ اس کو دیکھنے کی قیمت نہ صرف یہ کہ فرشتے کی دید کی رقم سے کم تھی، بلکہ لوگوں کو اس بات کی بھی اجازت تھی کہ وہ اس کی مضحکہ خیز حالت کے بارے میں قسم قسم کے سوالات بھی پوچھ سکیں اور سر سے پیر تک اس کو جھوکر معائنہ بھی کر سکیں تاکہ کسی کو بھی اس بولناک حقیقت پر کوئی شک و شبہ نہ رہے۔ وہ مینڈھے جتنی ایک ڈراونی ترن ٹولا مکڑی تھی جس کا سر ایک غم زدہ دوشیزہ کا سا تھا۔ تاہم سب سے بڑھ کر دل بلا دینے والی شے اس کی نامانوس بیست نہ تھی بلکہ وہ پُر خلوص اندازیاں تھا جس میں وہ اپنی پیتا کی ایک ایک تفصیل سناتی تھی۔ ابھی وہ پالی ہی تھی کہ ایک بار ناچ رنگ میں حصہ لینے کے لیے گھر سے چھپ کر چپ چاپ نکل گئی تھی، اور جب وہ بغیر اجازت لیے ساری رات ناچ لینے کے بعد جنگل میں سے ہوتی ہوئی گھر لوٹ رہی تھی تو ایک بولناک کڑا کے نے آسمان کو دو کر دیا، اور شکاف میں سے لڑوے کا برقی تیر سالپکا جس نے اسے مکڑی بنا دیا۔ اس کا

ان کوفتوں سے بھرتا تھا جو سنی لوگ اس کے منہ میں ڈال دیتے تھے۔ ایک ایسے لڑکے میں اتنی انسانی سچائی بھری ہو اور اتنی خوف دلانے والی نصیحت ہو، کوشش کیے ایسے نگ چڑھے فرشتے کی نمائش پر غالب رہتا ہی تھا جو فانی انسانوں کی طرف آنکھ نوازا نہ کرتا تھا۔ علاوہ ازیں جو تھوڑی بہت کرامات فرشتے سے منسوب کی گئیں ان میں کچھ عقل کا فتور نظر آیا؛ مثلاً وہ ناپیدتا جس کو بینائی تو نہ ملی مگر تین نئے دانت نکل جہ مغلوج جو پل تو نہ سکا لیکن لاٹری تفریباً جیت لی، اور وہ کورھی جس کے زخموں کے اندر مکھی پھوٹ نکلے۔ ان بھلانے والی کرامات کے سبب، جو کہ ہنسی دل لگی سے زیادہ کیا فتنے کی ساکھ گر تو پچی ہی تھی کہ مکھی بن جانے والی عورت نے آکر آخر کار اس کو بالکل لردیا، اور یوں پادری گون زاکا کا بے خوابی کا روگ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جاتا رہا، اور اُن بھی پھر سے اتنا ہی خالی خالی رہنے لگا جتنا وہ اس تین دن کی بارشوں کے زمانے میں بڑے کمروں میں رہ سکا کرتے تھے۔

مرد والوں کے لیے گڑھنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ جو رقم انھوں نے اس دوران جمع کر لی ہے انھوں نے چھتوں اور پھلواریوں والی دو منزلہ حویلی کھڑی کر لی جس میں اونچی اونچی گئی تھیں کہ جاڑوں میں کیکڑے نہ گھس آئیں، اور درہچوں میں لوہے کی سلاخیں لگوانی بہ فرشتے اندر نہ آجائیں۔ پیلاہو نے بستی کے قریب ہی خرگوش پالنے کا کاروبار جمالیا لی نوکری ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دی اور اہلی سیندا نے ساٹن کے اونچی ایڑی والے ورست رنگی ریشم کی پوشاکیں خریدیں، وہی جو اس زمانے کی من موہنی عورتیں اتوار بابتن کیا کرتی تھیں۔ بس مرغیوں کا درباہی ایک ایسی چیز تھا جس پر کوئی توجہ نہیں دے۔ جو وہ کبھی کبھار اس کی دھلائی کریولن سے کر دیتے تھے اور اس کے اندر مَر اور لوہان تھے تو یہ کوئی فرشتے کی عقیدت میں نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد گھٹنے کی اس سرٹاند سے ہوتا تھا جو آسیب کی طرح بروقت لپٹی رہتی تھی اور ان کے نئے مکان کو بھی پرانا کیے گی۔ جب بچے نے چلنا سیکھ لیا تو پہلے پہلے انھوں نے احتیاط کی کہ وہ دڑبے کے بہت بانے پائے؛ پھر رفتہ رفتہ ان کا خوف دور ہوتا گیا، اور وہ بدبو کے عادی ہوتے گئے، اور نہ نکلنے سے پہلے ہی بچہ کھیلنے کے لیے جہاں سے جالی ٹوٹ رہی تھی دڑبے میں گھس بچے سے بھی اتنا ہی لیے دیے رہا جتنا وہ دوسرے لوگوں سے رہتا تھا، مگر وہ اس کی نت بیوں کو اس کتے کے سے صبر سے برداشت کرتا رہتا جس کو کوئی خوش فہمیاں نہ ہوں۔ یک ساتھ خسرہ نکل آئی۔ جس ڈاکٹر نے بچے کا علاج کیا وہ فرشتے کے دل کی دھڑکن

سننے کے شوق کو دبا نہ سکا، اور اس نے اس کے دل میں اس قدر سیٹیاں بجتی اور گردے میں اتنی آوازیں سنیں کہ اس کو فرشتے کا زندہ رہنا محال نظر آیا۔ پروں کی ٹپک نے اس کو سب سے زیادہ حیرت میں ڈالا۔ اس مکمل انسانی بدن پر وہ اتنے فطری لگتے تھے کہ ڈاکٹر کی سمجھ میں یہ نہ آ سکا کہ آخر سب انسانوں کے جسم پر وہ کیوں نہیں ہوتے۔

جس وقت بچے نے اسکول جانا شروع کیا تو مرغی خانے کو دھوپ اور ہاشوں کی وجہ سے تباہ ہوئے کچھ عرصہ گزر چکا تھا۔ فرشتہ ایک بھٹکتے ہوئے جاں بہ لب آدمی کی طرح یہاں وہاں گھسٹتا پھرتا تھا۔ وہ اسے جھاڑو مار مار کر خواب گاہ میں سے نکالتے تو پکل بھر بعد وہ باورچی خانے میں نظر آتا؛ وہ بیک وقت اتنے مقامات پر نظر آنے لگا کہ وہ یہ سوچنے لگے کہ وہ ایک سے دو ہو گیا ہے، کہ وہ گجر بھر میں اپنی پی نوع کو بڑھاتا پھر رہا ہے؛ اور بھٹائی اور بولائی ہوئی ایللی سیندا چیخ پڑی کہ اس فرشتوں بھرے جہنم زار میں جینا دو بھر ہو گیا۔ وہ اب مشکل ہی سے کھا پاتا تھا، اور اس کی بوڑھی آنکھیں اتنی دھندلا گئی تھیں کہ وہ ستونوں سے ٹکراتا پھرتا تھا۔ اب اس کے پاس تھرے ہوئے آخری پروں کے ننگے سرے ہی رہ گئے تھے۔ پیلا یو اس پر کمبل ڈال دیتا اور اتنا احسان آور کرتا کہ اس کو سائبان میں پڑ رہے دیتا۔ اور تب ہی انھوں نے دیکھا کہ رات کو اسے بخار ہو جاتا اور وہ بذیانی سا بو کر بوڑھے ناروے والوں کی طرح زبان گھمایا کرتا۔ یہ چند موقعوں میں سے ایک موقع تھا جب وہ پریشان ہو گئے، کیوں کہ انھوں نے سوچا کہ اس کا آخری وقت آ گیا؛ اور پڑوس کی سیانی عورت بھی یہ بتانے سے قاصر تھی کہ وہ مرے ہوئے فرشتے کے لیے کیا کریں۔

اس کے باوجود وہ نہ صرف یہ کہ اپنا بدترین موسم سرما جھیل گیا بلکہ دھوپ سے روشن دنوں کے شروع ہوتے ہی سب خال لیتا ہوا نظر آنے لگا۔ وہ صحن کے پرلے سرے پر، سب کی نظروں سے دور، کئی دنوں تک چپ چاپ پڑا رہا، اور دسمبر شروع ہوتے ہی چند لمبے اور سخت پر اس کے شہروں پر نمودار ہونے لگے؛ بچو کے کے پر جو اس سے کہیں زیادہ، ناقوانی کی ایک اور نموست دکھائی دیتے تھے۔ مگر وہ اپنی تبدیلیوں کی وجہ ضرور جانتا ہوگا، اسی لیے وہ اس بات کا بہت خیال رکھتا تھا کہ کوئی ان تبدیلیوں کو دیکھ نہ لے، کوئی وہ سمندری گیت نہ سن لے جو وہ وقتاً فوقتاً تاروں کی چھاؤں میں لگنٹا کرتا تھا۔ ایک صبح ایللی سیندا بیٹھی پیاز کتر رہی تھی کہ بوا کا ایک جھوٹکا، جو سمندروں پر سے ہوتا ہوا آ رہا تھا، باورچی خانے میں در آیا۔ وہ اٹھ کر در بچے کے پاس گئی اور تب ہی اس نے فرشتے کو اڑان بھرنے کی ابتدائی کوششیں کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ یہ کوششیں اس قدر بھونڈی تھیں کہ اس کے ناخنوں نے سبزی کی کیاری میں گھرا نشان ڈال دیا تھا، اور اپنے پروں کی بھدی سی پھر پھر ٹھٹھ سے، جو بوا میں تک نہیں پار رہے تھے، وہ سائبان کو

بڑے بڑے پروں والا ایک بوڑھا پھوس

گرا نے ہی والا تھا۔ پھر بھی وہ تھوڑا بہت اوپر اٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔ ابلی سیندا نے جب اس کو ایک پھوس عقاب کی طرح تشویش ناک انداز میں پَرِ بِلَا بِلَا کر، اور کسی نہ کسی طرح خود کو ہوا میں سبٹھالے سبٹھالے، آخری مکافوں کے اوپر سے دور ہوتے دیکھا تو اس نے خود اپنے لیے اور اس کی قاطر اطمینان کا سانس لیا۔ وہ اے دیکھتی رہی، پیاز کترنے سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ تکتی رہی، اور اس وقت تک نظریں جمائے رہی جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ کیوں کہ اب وہ اس کے جی کا جنجال نہ تھا بلکہ سمندری افق پر ایک خیالی نقطہ تھا۔

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ: عناصدیقی

دنیا بھر کا حسین ترین ڈوب مرنے والا

(بچوں کے لیے ایک کہانی)

پہلے پہل جن بچوں نے اس پراسرار ڈولتے اُبھار کو سمندر کی جانب سے اپنی طرف بہہ کر آتے دیکھا انہوں نے خیال کیا کہ دشمن کا کوئی جہاز ہوگا۔ پھر ان کو نظر آیا کہ اس پر نہ تو کوئی مستقل ہے اور نہ کوئی پھرے را تو اس کو وہیل سمجھا۔ مگر جب وہ کنارے آگیا اور جب انہوں نے اس پر سے سمندری جہاز جھٹکا، جیلی فش کے منجے، مچھلیوں کے بچے کچے حسے اور تیرنے والا کبارڈ صاف کر لیا، تب ہی ان کو معلوم ہوا کہ وہ کوئی ڈوب کر مر جانے والا ہے۔

ساری سہ پہر وہ اس سے کھیلنے رہے؛ کبھی اس کو بالوں میں دبا دیتے، کبھی اس کو نکال لیتے، کہ اتفاقاً کسی کی نظر ان پر پڑ گئی اور اس نے گاؤں میں خبر پھیلادی۔ جو لوگ اس کو اٹھا کر قریب ترین گھر تک لائے انہوں نے دیکھا کہ وہ ان تمام مردوں سے کمزور زیادہ بیماری بھر کم ہے جن سے اب تک ان کا سابقہ پڑا تھا۔ وہ قریب قریب گھوڑے جتنا لدھڑکتا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ ہو سکتا ہے کافی عرصے تک پانی میں رہنے کی وجہ سے پانی اس کی ہڈیوں تک میں اتر گیا ہو۔ جب ان لوگوں نے اس کو فرش پر لٹا دیا تو بولے کہ یہ تو باقی سب لوگوں سے زیادہ دراز قد

نکلا، کیوں کہ گھر کے اندر اس کی سہائی کے لیے جگہ ناکافی تھی، مگر انہیں خیال آیا کہ شاید مر جانے کے بعد بھی بالیدگی کی صلاحیت بعض ڈوب مرنے والوں کی فطرت میں شامل ہو۔ اُس میں سے سمندری بسا ند اُٹھ رہی تھی اور صرف اس کی بناوٹ ہی سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کہنی انسانی لاش ہے کیوں کہ اس کی جلد مٹی کی پپر ٹیلوں اور مچھلیوں کے سفوفوں سے دھکی ہوئی تھی۔

اتنا معلوم کرنے کے لیے کہ مرنے والا کوئی اجنبی ہے، انہیں اس کا چہرہ صاف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ گاؤں میں کوئی بیس ایک پتھر پٹی انگٹائیوں والے چوہی مکانات تھے جن میں پھول پودے نام کو نہیں تھے اور سب کے سب ایک ریتیلی راس کے کنارے کنارے پھیلے ہوئے تھے۔ وہاں زمین اتنی کم تھی کہ مائیں بروقت ڈری سہمی رہتی تھیں کہ کوئی جھکڑ نہیں ان کے بچوں کو اُڑا نہ لے جائے، اور وقتاً فوقتاً مرنے والوں کو ساحلی چٹانوں کے کنارے لے جا کر سمندر میں ٹھنڈا کر دیا جاتا تھا۔ مگر سمندر پر سکون اور بڑا سخی داتا تھا اور گاؤں کے نخل مردسات کشتیوں میں سما جاتے تھے۔ اس لیے لاش ملنے کے بعد انہوں نے بس ایک نظر ایک دوسرے پر ڈال کر تسلی کر لی کہ وہ سب کے سب موجود ہیں۔

اس رات وہ اپنی روزی کی تلاش میں سمندر کی طرف نہیں گئے۔ مرد آس پاس کی بستیوں میں یہ معلوم کرنے نکل گئے کہ کہیں کوئی لپٹتا تو نہیں، اور عورتیں ڈوب مرنے والے کی دیکھ بھال کے لیے چھتے رہ گئیں۔ انہوں نے گھاس کی کوچیوں کی مدد سے اس کے بدن پر لگی ہوئی کیچڑ کو صاف کیا، اس کے بالوں میں پھنسی سمندری بالو کو نکالا اور مٹی کے پتروں کو مچھلیوں کے سفنے اُتارنے والے اوزاروں سے کھرچا۔ یہ کام کرتے کرتے انہوں نے بجانب لیا کہ جو جھاڑ جھنکار اس کے جسم سے چمٹا ہوا ہے وہ دور دراز کے گھر سے پانیوں سے آیا ہے اور اس کے بدن پر لیریاں لگی ہوئی ہیں جیسے وہ مونگوں کی بھول بھلیوں میں سے ڈبکنیاں بھاتا ہوا آیا ہو۔ انہوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ وہ اپنی موت کو خود داری کے ساتھ سہ رہا ہے؛ نہ تو اس کا منہ دوسرے ڈوب مرنے والوں کی مانند اُجاڑا ہوا تھا اور نہ دریا میں غرق ہونے والوں کی طرح ہنک منگوں کا سا اُترا اُترتا تھا۔ اس کو پوری طرح پاک صاف کر لینے کے بعد ہی یہ عیاں ہوسکا کہ وہ گس قسم کا آدمی تھا، اور ان کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ نہ صرف یہ کہ وہ ان سب مردوں میں جو آب تک ان کی نظر سے گزرے تھے سب سے زیادہ دراز قد، سب سے زیادہ توانا، سب سے زیادہ زور آور اور سب سے زیادہ خوش اندام تھا بلکہ اتنا نکلے جانے کے باوجود وہ ان کے تصور میں سامنے نہیں پارہا تھا۔

گاؤں بھر میں نہ تو اتنا بڑا پلنگ دستیاب تھا جس پر اُس کو لٹایا جا سکتا اور نہ کوئی میز اتنی سخت تھی جو اس کی سوگ ناگ کے لیے استعمال کی جا سکتی۔ اس کے بدن پر نہ تو سب سے لائے آدمی کا کوئی بڑھیا پتلون چڑھا، نہ سب سے موٹے آدمی کی اتوار کو پہنی جانے والی قمیض اور نہ سب سے بڑے پیر والے کے جوتے۔ اس کے پہاڑ سے تن و توش اور اس کے حسن سے مسکرمو کر عورتوں نے طے کیا کہ وہ بادبان کے کسی بڑے ٹکڑے سے اس کے لیے پتلون بنائیں اور عروسی لینے سے قمیض تیار کریں، تاکہ وہ راہِ عدم کا سفر اپنی حیثیت کے مطابق طے کر سکے۔ جب وہ جھرمٹ مارے سلائی میں جٹی تھیں اور ٹانگے بھرتے بھرتے نگر نگر اس کو دیکھتے جا رہی تھیں تو ان کو یوں لگا کہ نہ تو ہوا کبھی اتنی یکساں یکساں رفتار سے جلی اور نہ سمندر کبھی اس قدر بے چین بے چین سا رہا جس قدر وہ آج رات ہے، اور انھوں نے فرض کر لیا کہ ہونہ جو مرنے والے کا اس تبدیلی سے کوئی واسطہ ضرور ہے۔ انھیں خیال آیا کہ اگر وہ عظیم الشان انسان ان کے گاؤں میں رہتا ہوتا تو اس کے مسکن کے دروازے سب سے کشادہ، چھت سب سے بلند اور فرش سب سے مضبوط ہوتا؛ اس کی مسہری کسی جہازوں والی لکڑی کی بیٹھیوں سے بنی ہوتی جن کو لوہے کے پیمپوں سے کسا گیا ہوتا، اور اس کی بیوی خورِ سندرین عورت رہی ہوتی۔ انھوں نے سوچا کہ اس کا اس قدر رعب و دبدبہ ہوتا کہ وہ مچھلیوں کو نام بہ نام پکار کر سمندر میں سے بلالیا کرتا۔ اور اس نے اپنی زمینوں پر اس قدر محنت کی ہوتی کہ چٹانوں میں سے چشمے ابل پڑے ہوتے اور یوں اس نے سمندر کے ساحلی کراڑوں کو پھولوں کی تختہ بندی کے قابل بنالیا ہوتا۔ دل ہی دل میں انھوں نے اس کا موازنہ اپنے اپنے مردوں سے کر ڈالا اور سوچا کہ وہ سب ساری عمر بھی کریں تو وہ سب کچھ نہیں کر سکتے جو وہ ایک رات میں کر گزرا ہوتا، اور انھوں نے اپنے اپنے دلوں کی گھڑائیوں میں اپنے اپنے انھوں کو زمانے بھر میں سب سے زیادہ بُودا، سب سے زیادہ گھٹیا اور سب سے زیادہ بچھا آدمی ٹھہرا کر دل سے نکال دیا۔ وہ اپنے تصورات کی بھول بھلیوں میں گم تھیں کہ اتنے میں ان میں سے سب سے بڑی عمر والی عورت، جو عمر رسیدہ ہونے کے باعث ڈوب مرنے والے کو محبت سے زیادہ شفقت بھری نظر سے دیکھ رہی تھی، بولی: "عورت تو اس کی ایسے بان نامی شخص کی سی ہے۔"

بات پتے کی تھی۔ اس کا کوئی اور نام ہو ہی نہیں سکتا، اتنی بات مان لینے کے لیے ان میں سے اکثر کو اس پہ بس ایک نظر آور ڈالنی پڑی۔ وہ عورتیں جو عمر میں سب سے کم تھیں اور خود سر بھی، چند گھنٹے اس تصور میں مگن رہیں کہ جب وہ اس کو نئے کپڑے پہنا دیں گی اور وہ چمک دار جوتے ڈاٹے، پھولوں کے ریچ لیٹا ہو گا تو لاتارو نام شاید اُس پر زیادہ بچے، مگر یہ ایک خام خیال

تھا۔ ان کے پاس کیونوس خاطر خواہ نہیں تھا، پھر بُرا بُوتا گیا اور خراب ٹُرا گیا پتلون تنگ بھی بہت تھا، اور درون دل کسی دینی قوت سے اس کی قمیص کے بٹن بھی پٹ پٹ کھل گئے تھے۔ ہوا کی سائیں سائیں بند ہو چکی تھی اور سمندر کو بھی اپنی بدھ کے دن والی اونگھ آگئی تھی۔ اس سکوت نے گویا ان کے آخری شبہات بھی دور کر دیے وہ ایستے بان ہی تھا۔ جب ان کو اس کا فرش پر گھسیٹا جانا مجبوراً برداشت کرنا پڑا تو وہ عورتیں جنھوں نے اس کے کپڑے بدلائے تھے، بال سنوارے تھے، ناخن تراشے تھے اور حجامت بتائی تھی، ترس کے مارے کپکپانے سے باز نہ رہ سکیں۔ اس وقت کہیں جا کر ان کی سمجھ میں آیا کہ وہ اپنے اس جہاز کے جہاز ڈیل ڈول کے ہاتھوں کتنا تنگ رہتا ہو گا جب کہ مرنے کے بعد بھی اس قباحت نے اس کا پیچھا لے رکھا ہے۔ وہ اس کو جیتا جاگتا دیکھ سکتی تھیں؛ دروازوں میں سے ترچا ہو کر گزرنے کی سزا بھگتتے ہوئے، چست کی کڑیوں سے سرنگھڑاتے ہوئے؛ کہیں ملنے گیا تو کھڑا رہنے پر مجبور، اس الجھن میں مبتلا کہ اپنے نرم گلابی سیل نما ہاتھوں کا کیا کرے، جب کہ فاقون فاقہ گھر بھر کی سب سے مضبوط کرسی چُن کر اپنا دم خشک کیے کیے اس کو پیش کرتی، لو ایستے بان اس پر بیٹھ جاؤ، اور وہ دیوار سے ٹیک لگائے لگائے مسکراتا، نہیں مادام تکلف کی ضرورت نہیں، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں؛ ہر ملاقات پر بار بار یہی کرتے کرتے اس کے تلوے چھلنی اور پیٹھ سوختہ ہو چکی ہوتی مگر کرسی توڑ دینے کی شرمندگی سے بچنے کے لیے ہمیشہ وہی ایک بات، نہیں مادام تکلف کی ضرورت نہیں، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں، اور غالباً اس بات سے قطعی نا آشنا رہتے ہوئے کہ جوابی ابھی یہ کہتیں کہ رگوا ایستے بان، کافی تیار ہونے تک تو رک جاؤ، وہی پیٹھ مڑتے ہی زیر لب بول اُٹھتیں، آخر کار ٹل گیا دیو بیکر بوک، اچھا ہوا خوبصورت بھونڈو گیا۔ دن نکلنے سے ذرا پہلے لاش کے چاروں طرف بیٹھی ہوئی عورتیں یہی کچھ سوچ رہی تھیں۔ بعد میں جب انھوں نے رومال سے اس کا منہ اس لیے دھک دیا کہ دھوپ اس کو کہیں نہ ستائے، تو وہ ان کو جنم جنم کا مرا ہوا لگا، بے یار و مددگار، بالکل ان کے اپنے مردوں کا سا، اور رقت نے ان کے کلیجوں میں ابتدائی دراڑیں ڈال دیں۔ وہ کوئی نوجوان عورت تھی جس نے پہلے پہل رونا شروع کیا؛ دوسری عورتیں بھی اس کی دیکھا دیکھی ٹھنڈی آہوں سے لے کر بین تک کرنے لگیں، اور جتنی زیادہ وہ سکیاں بھرتیں اتنا ہی زیادہ ان کا دل امند تھا کہ ڈوب مرنے والا اب ان کی نظروں میں عین عین ایستے بان ہوتا جا رہا تھا؛ چنانچہ وہ خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں، کیوں کہ وہی تو دنیا بھر میں سب سے زیادہ محروم، سب سے زیادہ صلح کل، سب سے زیادہ بامروت تھا، بے پارہ ایستے بان۔ اس لیے جب مرد لوگ یہ خبر لے کر لوٹے کہ مرنے والا آس پاس کی کسی ہستی کا نہیں تو عورتوں کو اپنے آنسوؤں کی تھڑکی میں مسرت پھونتی محسوس ہوئی۔

"خداوند کی حمد ہو،" انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میرا پنا ہے!"

مردوں نے اس کھرام کو زمانہ خرافات جانا۔ رات بھر کی کھن پوچھ تاجہ سے بے حال ہو پکنے کے بعد وہ تو بس اتنا چاہتے تھے کہ کسی طرح اس خشک اور ہوا بند دن، دھوپ چڑھ جانے سے پہلے پہلے، اس فوارہ کے جھنجھٹ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فارغ ہو جائیں۔ انھوں نے فالتو پڑے ہوئے باد بانوں اور ماہی گیری کے نیزوں کو جوڑھاڑ کر ایک ڈولاسا بتایا اور اس کو رسیوں سے خوب کس کس کر باندھا تاکہ وہ اس کا بوجھ اس وقت تک برداشت کر لے جائے جب تک وہ چٹانوں کے کنارے تک نہ پہنچ جائیں۔ وہ بار بار درجہ جہاز کا لنگر بھی باندھنا چاہتے تھے تاکہ وہ آسانی سے دریا میں اتر جائے جہاں مچھلیوں کو بھی کچھ سبھائی نہیں دیتا اور جہاں غوطہ خور تک خشکی کی بڑک میں ختم ہو جاتے ہیں، اور پھر اس لیے بھی کہ ٹھنڈی لہریں اس کو دوبارہ کنارے پر نہ لے آئیں، جیسا کہ دوسری کئی لاشوں کے ساتھ ہو چکا تھا۔ مگر مرد جتنی جتنی غفلت کرتے، عورتیں وقت ٹالنے کی اتنی اتنی ترکیبیں نکالتیں؛ اپنے سینوں پر سمندری تعویذ چٹھائی وہ بے چین مرغیوں کی مانند کڑکڑاتی پھر رہی تھیں۔ کچھ ایک جانب سے مداخلت کرتیں کہ مرنے والے کو مبارک ہو والا امتی احرام پہنایا جائے تو چند دوسری جانب سے رائے دیتیں کہ اس کی کلائی پر قطب نما باندھا جائے؛ اور "ایک طرف ہو جانی بی، راستے سے ہٹ، دیکھو دیکھو مجھے مردے پر گرا بی دیا تھا" کی کافی سے زیادہ چل پھل کے بعد آخر کار مردوں کے دلوں میں شکوک سر اٹھانے لگے اور انھوں نے بڑبڑاتا شروع کر دیا کہ ایک اجنبی کی خاطر بڑی قربان گاہ والے اتنے سارے چڑھاوے آخر کیوں، کیوں کہ چاہے جتنی بھی مینیں چڑھاؤ اور متبرک پانی کے پتنے چاہو اتنے برتن چڑھاؤ، پر شارک بہر صورت اس کو چٹ کر جائیں گی۔ مگر عورتیں تھیں کہ لپک جھپک کرتی پڑتی اپنے تبرکات کا سارا کبارڈ لالہ کر اس پر نچاؤ کیے جا رہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ جو کچھ اپنے آنسوؤں سے ظاہر نہیں کر پا رہی تھیں وہ ٹھنڈی آہوں کی صورت نکال رہی تھیں۔ یہاں تک کہ مرد لوگ آپے سے باہر ہو گئے، "ارے ایک بھگتی لاش، ایک انجانے بے حقیقت آدمی، ایک بدحواری ٹھنڈے گوشت کی خاطر اتنے چو پھلے کبھی کا ہے کو ہوے تھے جو آب ہونے لگے۔" احترام کی اس کمی سے دل برداشتہ ہو کر ان میں سے ایک عورت نے مرنے والے کے منہ پر سے رومال بٹھا دیا، اور پھر تو مردوں کی بھی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

وہ ایسے بان تھا۔ اس کو پہچان لینے کے لیے ان کے سامنے اس کا نام دوبارے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر کہا جاتا کہ سردا لٹرریلے، تو وہ شاید اس کے فریجی لیجے، اس کے کندھے پر بیٹھتے تو تے، اس کی آدم خوروں کو مارنے والی توڑے دار بندوق کے رعب میں آگئے ہوتے،

مگر ایسے بان تو سارے عالم میں بس ایک ہی تھا، اور وہ سامنے پڑا تھا بالکل سفید ویل کی طرح، جو تے اتارے، کسی بونے کا پتلون چڑھائے، سخت سخت ناخونوں والا، جن کو چاقو سے تراشا پڑا تھا۔ یہ جان لینے کے لیے بس اس کے چہرے سے رومال ہٹنے کی دیر تھی کہ وہ بہت تادم ہے، یوں کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں کہ وہ اتنا جہاز کا جہاز، اتنا بجاری بھر کم اور اتنا صورت دار ہے، اور جو کہیں اس کو یہ معلوم ہو جاتا کہ سب کچھ یوں ہو گا تو اس نے اپنی غرقابی کے لیے کوئی الگ تھلگ سی جگہ دیکھی ہوئی۔ مذاق نہیں، میں تو بلکہ حالات سے بیزار ہو جانے والے آدمی کی طرح اپنے گلے میں کسی جنگی جہاز کا لنگر باندھ بوندھ کر کسی کراڑ پر سے جائز ٹھکتا کہ اب تو اس بدحواری لاش کی طرح لوگوں کو پریشان نہ کروں، بقول آپ لوگوں کے، ٹھنڈے گوشت کے اس غلیظ و تھوڑے سے کسی کا تاک میں دم کیوں کیا جائے جس سے اب میرا کوئی واسطہ بھی نہ ہو۔ اس کے انداز میں اس قدر کھری صداقت تھی کہ نہ صرف ان سب سے زیادہ وہی لوگوں کے، جو کہ سمندر میں گزاری ہوئی ان بے انت راتوں کی تلخیوں کو محسوس کر سکتے تھے جن میں ان کو یہ خوف کھائے جاتا تھا کہ کہیں ان کی عورتیں ان کے خواب دیکھتے دیکھتے ٹھک بار کر غرق ہو جانے والوں کے خواب نہ دیکھنے لگی ہوں، بلکہ دوسرے ان سے بھی بڑھ کر سخت لوگوں تک کے تن بدن کے رو گئے ایسے بان کی بے ریائی پر کھڑے ہو گئے۔

اور یوں انھوں نے اپنی ذہنی اڑان کے مطابق ایک للوارٹ ڈوب مرنے والے کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے اٹھایا۔ جب کچھ عورتیں پھولوں کی تلاش میں قریب کے گاؤں میں گئیں تو وہاں سے ان عورتوں کو ساتھ لے آئیں جن کو سنی سنائی پر اعتبار نہ آیا تھا، اور جب انھوں نے مرنے والے کے دیدار کر لیے تو وہ مزید پھول لانے چل دیں اور پھر تو آور آتے گئے، اور آتے گئے، یہاں تک کہ وہاں اس قدر پھول اور اتنی زیادہ خلقت جمع ہو گئی کہ پیر سرکانے بھر کی جگہ نہ رہی۔ آخری لمحات میں ان کا دل اس بات پر دھکا کہ اس کو یتیمی کی حالت میں پانی کے سپرد کر دیا جائے، اور انھوں نے اپنے معتبرین میں سے اس کے باپ اور ماں کو مستحب کیا، اور خالائیں اور پھوپھیاں اور چچا اور ماموں اور خلیہ اور چچیرے اور میرے بیانی، بند، یہاں تک کہ اس کے توسط سے گاؤں کا گاؤں ایک دوسرے کا قرابت دار بن گیا۔ چند ملاح جنھوں نے دور سے ان کے بین سے، اپنے راستے سے بھٹک گئے، اور لوگوں نے ایک کے بارے میں یہاں تک سنا کہ اس نے قدیم داستانوں کی سائرین عورتوں کا گمان کرتے ہوئے خود کو مرکزی مسئول سے کس کر بندھوا لیا۔ جس وقت وہ سب چٹانوں کی کھڑواں رپٹ پر اس کو اپنے اپنے کاندھوں پر اٹھانے کے شرف کے لیے ٹوٹے پڑ رہے تھے، اس وقت اپنے ڈوب مرنے والے کے کروفر اور حسن کا سامنا

کرتے ہوئے، کیا مرد اور کیا عورتیں، سب ہی کو پہلی بار اپنی گلیوں کی ویرانی، اپنی انگلیوں کی بے برگ و باری اور اپنے خوابوں کی تنگ دامن کی احساس ہوا۔ انھوں نے اس کو لنگر کے بغیر ہی جانے دیا تاکہ اگر وہ آتا چاہے تو واپس آ سکے، جب بھی وہ آتا چاہے۔ اور جگہوں کے اس مختصر ترین پل تک وہ سب دم سادھے رہے جب تک کہ لاش گھرائی میں نہ پہنچ گئی۔ یہ جان لینے کے لیے کہ وہ سب نہ آب و ہاں موجود ہیں اور نہ کبھی ہوں گے، انھیں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مگر وہ اتنا ضرور جان گئے تھے کہ اس وقت کے بعد ہر چیز کی کایا پلٹ جائے گی؛ اب ان کے گھروں کے دروازے کشادہ، چھتیں بلند اور فرش مضبوط ہوا کریں گے، تاکہ ایستہ بان کی یاد جہاں چاہے کڑیوں سے سر ٹکرائے بغیر آ جا سکے اور آئندہ کسی کو بھی زیرِ لب یہ کہنے کی ہمت نہ ہو کہ دیوے بیکر بوبک آخر کار مر گیا، بہت برا ہوا خوبصورت بخوندہ انجام کار جاتا رہا، کیوں کہ اب وہ ایستہ بان کی یاد کو ہمیشہ ہمیشہ تازہ رکھنے کے لیے اپنے گھروں کو باہر سے چٹھیلے رنگوں سے رنگنے جارہے تھے اور چٹانوں کے درمیان سے چشمے نکالنے اور کراڑوں پر پھولوں کی تختہ بندی کرنے کے لیے جی توڑ مشقت کرنے جارہے تھے، تاکہ آنے والے زمانوں میں صبح سویرے بڑے بڑے جہازوں کے مسافر سمندر پر آتی ہوئی پھولوں کی مہکار سے گھٹ کر جاگ اٹھیں، اور کپتان کو اپنی پوری وردی، اپنے اسطرلاب، اپنے قطب تارے اور جنگ میں کھائے ہوئے اپنے تمغوں سمیت عرشے پر اتر کر آتا پڑے، اور پھر سامنے افق پر گلابوں کی پتی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وہ چودہ زبانوں میں کہے، اُدھر دیکھو جہاں ہوا اتنی پُر سکون رہے جیسے کیاریوں میں پڑی نیند لے رہی ہو، اُدھر جہاں دھوپ اتنی روشن روشن ہے کہ سورج مکھی بھی حیران ہے کہ کدھر منہ کرے، وہاں اُس طرف، وہی ایستہ بان کا گاؤں ہے۔



مارکیز کی آٹھ کہانیوں پر مشتمل مجموعہ *Big Mama's Funeral* جس کا مکمل ترجمہ انتخاب کے اس حصے میں پیش کیا جا رہا ہے، ۱۹۶۱ میں شائع ہوا، اور انگریزی مجموعے *No One Writes to the Colonel* میں شامل ہے۔

یہ کہانیاں مارکیز کی ادبی نشوونما میں بے حد اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں مارکیز کے خیالی قصبے ماکوندو کے خود خال رفتہ رفتہ اُجاگر ہونا شروع ہوتے ہیں، جس کے بسنے اور اُجڑنے کا رزمیہ بعد میں "تنہائی کے سو سال" میں سامنے آیا۔ اس کے علاوہ یہ کہانیاں اپنے ارد گرد کی زندگی اور لوگوں سے مارکیز کے گہرے شغف کی آئینہ دار ہیں۔

اس مجموعے کی آخری کہانی "بڑی ماما کا جنازہ" میں مارکیز نے جمہوریت کی بازی گری کے پہلو پہ پہلو آمریت کی کارفرمائی کے موضوع کو نادر حس مزاح اور داستانوی اسلوب کے ساتھ برتا ہے۔

گا بریٹل گارسیا مارکیز

ترجمہ: فاروق حسن

مشکل کے دن کا قیلوہ

ریل گاڑی ریٹیلے پتھروں کی مُرتعش سرنگ میں سے برآمد ہوئی اور کیلوں کے لامتناہی اور متناسب کاشت کیے ہوئے باغوں میں سے گزرنے لگی۔ ہوا زیادہ بوجھل ہو گئی، اور آب انہیں سمندر کی جانب سے آنے والی ہوا کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ دھویں کا ایک دم گھونٹنے والا جھوٹا گاڑی کے ڈبے کے اندر داخل ہوا۔ گاڑی کی پٹری کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی تنگ سڑک پر کچے کیلوں سے لدی بیل گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ سڑک سے پرے، غیر مزروعہ زمین پر، غیر یکساں فاصلوں پر قائم، دفتروں کی بجلی کے پتھروں سے آراستہ عمارتیں، سرخ اینٹوں کے مکان اور بنگلے دکھائی دینے لگے تھے جن میں میزوں اور چھوٹی چھوٹی سفید کرسیاں گرد آلود کھجور کے پودوں اور گلاب کی جھاڑیوں کے درمیان چبوتروں پر پڑی ہوئی تھیں۔ ابھی صبح کے گیارہ بجے تھے اور گرمی شروع نہیں ہوئی تھی۔

"بہتر ہے کہ کھڑکی بند کر دو،" عورت نے کہا۔ "تمہارے بالوں میں کالک بھر جائے

گی۔"

لڑکی نے کوشش کی مگر ذنگ کی وجہ سے کھڑکی بل نہ سکی۔

گاڑی کے تیسرے درجے کے ڈبے میں صرف سی دونوں مسافر تھیں۔ گاڑی کا دھواں لگاتار ڈبے کے اندر آ رہا تھا، اس لیے لڑکی کھڑکی کے پاس سے اٹھ گئی۔ اپنا اسباب، جس میں کھانے کے سامان والی پلاسٹک کی تھیلی تھی اور اخبار کے کاغذوں میں لپٹا ہوا ایک گل دستہ، اس نے وہیں نشست پر رہنے دیا اور خود، کھڑکی سے دور، اپنی ماں کے سامنے والی نشست پر جا کر بیٹھ گئی۔ دونوں سادہ اور غریبانہ ماتمی لباس پہنے ہوئے تھیں۔

لڑکی بارہ سال کی تھی، اور پہلی بار ریل گاڑی کا سفر کر رہی تھی۔ عورت اتنی عمر رسیدہ تھی کہ اس کی ماں نہ لگتی تھی؛ اس کے پپوٹوں پر نیلی رنگیں ابھرنے لگی تھیں، اس کا جسم مختصر، نرم اور بے ڈھب تھا، اور لباس کسی پادری کے جیبے کی وضع کا تھا۔ وہ اپنی ریڑھ کی ہڈی کی ٹیک مضبوطی سے کرسی کی پشت کے ساتھ لگا کر بالکل سیدھی بیٹھی تھی اور گود میں اس نے چمک دار نقلی چمڑے کا دستی تھیلا دونوں ہاتھوں سے تمام رکھا تھا۔ تھیلے کا چمڑا کئی جگہ سے پھٹ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسے متقی لوگوں کی سی استقامت تھی جو غربت اور تنگ دستی کے عادی ہوں۔

بارہ بجے تک گرمی شدید ہو چکی تھی۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر، جس کے ساتھ کوئی قصبہ نہ تھا، پانی لینے کے لیے دس منٹ ٹھہری۔ باہر، باغوں کی پُر اسرار خاموشی میں، سائے زیادہ گہرے لگ رہے تھے۔ ڈبے کے اندر رکی ہوئی ہوا میں تپتے چمڑے کی سی بو تھی۔ گاڑی نے رفتار نہ پکڑی۔ وہ دو باہم مشابہ اسٹیشنوں پر رکی جن کے ارد گرد شوخ رنگوں والے لکڑی کے بنے گھر تھے۔ عورت سر جھکا کر اونگھنے لگی۔ لڑکی نے اپنے جوتے اتار دیے۔ پھر وہ غسل خانے میں جا کر گل دستے پر پانی چھڑکنے لگی۔

جب وہ اپنی نشست پر واپس آئی تو اس کی ماں کھانا کھانے کے لیے اس کی منتظر تھی۔ اس نے پنیر کا ٹکڑا، مکئی کی آدھی روٹی اور ایک بسکٹ لڑکی کو دیا اور اپنے لیے بھی اتنی ہی مقدار میں کھانا پلاسٹک کی تھیلی میں سے نکالا۔ جس وقت وہ دونوں کھانا کھا رہی تھیں، گاڑی نے آہستہ رفتار سے لوہے کا ایک پُل پار کیا اور ایک قصبے میں سے گزری جو کہ پہلے دو قصبوں جیسا ہی تھا، صرف اس کے چوک میں لوگوں کا ہجوم اکٹھا تھا۔ شدید دھوپ میں ایک بینڈ گھگھٹتے سی دھن بجا رہا تھا۔ قصبے کے دوسرے سرے پر، جہاں باغ ختم ہوتے تھے، زمین خشک سالی کے سبب ترخ چکی تھی۔

عورت نے کھانا ختم کیا۔

"جوتے پہن لو،" اس نے کہا۔

لڑکی نے کھرٹی سے باہر دیکھا۔ جہاں سے گاڑی کی رفتار تیز ہوتا شروع ہوئی تھی وہاں بے آباد زمین کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ تاہم اس نے بسکٹ کا ٹکڑا تھیلی میں رکھ دیا اور جلدی سے جوتے پہن لیے۔ عورت نے اس کے ہاتھ میں کھینچی تھمادی۔

"اپنے بال بھی ٹھیک کر لو،" اس نے کہا۔

جس وقت لڑکی بالوں میں کھینچی کر رہی تھی، گاڑی نے سیٹی بجاتا شروع کر دی۔ عورت نے اپنی گردن پر سے پیسٹا پونچا اور انگلیوں سے چہرے پر لگی چکناٹی کو صاف کیا۔ جب لڑکی بال سنوارنے سے فارغ ہوئی، گاڑی کسی قصبے کے مضافات میں سے گزر رہی تھی۔ یہ قصبہ پہلے تمام قصبوں سے بڑا تھا مگر ان سب سے زیادہ اداس بھی دکھائی دے رہا تھا۔

"اگر تمہیں کچھ اور کرنا ہے تو ابھی کر لو،" عورت نے کہا۔ "بعد میں خواہ پیاس سے تمہارا دم نکل رہا ہو کسی کے گھر پانی کا گھوٹ تک نہیں پیتا۔ اور یاد رکھو، رونا نہیں ہے۔"

لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا۔ خشک اور گرم ہوا کا جھوٹا، گاڑی کی سیٹی اور پرانے ڈبوں کی کھٹکھٹ کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ عورت نے پلاسٹک کی تھیلی میں بچانے کی چیزیں رکھ کر، اسے تہ کر کے، اپنے تھیلے میں ڈال لیا۔ ایک لمحے کے لیے قصبے کا مکمل عکس، اگست کے اس روشن مٹھل کے دن، کھرٹی کے شیشے میں اجاگر ہوا۔ لڑکی نے گل دستے کو اخبار کے گیلے کانڈوں میں پیٹا اور کھرٹی سے تھوڑی دور کھرٹی ہو کر اپنی ماں کو ٹکھی باندھ کر دیکھنے لگی۔ ماں جواباً مسکرائی۔ گاڑی نے سیٹی دی اور آہستہ ہونے لگی، اور تھوڑی دیر بعد رک گئی۔

اسٹیشن پر کوئی نہ تھا۔ سڑک کی دوسری جانب، بادام کے درختوں کے سائے میں، صرف بلیئر ڈال کھلاتا۔ سارا قصبہ گرمی میں تھیر رہا تھا۔ گاڑی سے اتر کر انھوں نے ویران اسٹیشن کو عبور کیا۔ اسٹیشن کے فرش کی ٹائلیں درمیان میں گھاس اگنے سے پھٹ رہی تھیں۔ وہ دونوں دوسری جانب، سڑک کی سایہ دار سمت میں چلی گئیں۔

اس وقت تقریباً دو بجے کا عمل تھا اور غنودگی کے بوجھ تلے دبا ہوا قصبہ قیلولہ کر رہا تھا۔ دکانیں، دفتر، اسکول، سب گیارہ بجے بند ہو جاتے تھے اور چار بجے سے پہلے، جب گاڑی واپس جاتی تھی، نہیں کھلتے تھے۔ صرف اسٹیشن کے سامنے والا بوٹل، اپنے بلیئر ڈال اور شراب خانے سمیت، اور چوک کے ایک کونے میں واقع تارگھر دوپہر میں کھلے رہتے تھے۔ قصبے کے گھر، جن میں سے زیادہ تر بنانا کمپنی کے ماڈل کے مطابق ایک ہی وضع کے بنے ہوئے تھے، اندر سے بند تھے اور ان کے پردے گرے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض گھروں کے اندر اتنی گرمی ہوتی تھی کہ گھر کے باسی باہر آگن میں بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھایا کرتے تھے۔ باقی لوگ اپنی کرسیاں بادام

کے درختوں کے سائے میں، دیوار کے ساتھ ٹکا کر سرک پر بی قیلوہ کر لیا کرتے تھے۔
 بادام کے درختوں کے پُر حفاظت سائے میں چلتے پلتے، اور قیلوہ میں خلل ڈالے
 بغیر، عورت اور لڑکی قصبے میں داخل ہوئیں۔ وہ سیدھی پادری کے گھر گئیں۔ عورت نے اپنے
 ناخن سے گھر کے باہر لوہے کے جھنگے کو کھڑپا، پھر ایک لمحہ استعار کرنے کے بعد دوبارہ یہی
 عمل دوبارہ کیا۔ اندر بجلی کا پیمچا گھول گھول کر رہا تھا، اور ماں بیٹی اندر سے آنے والی قدموں کی
 آہٹ کو بھی نہ سن سکیں۔ انھوں نے بہ مشکل دروازے کی بلکی سی چرچراہٹ اور اس کے فوراً بعد
 کی ممتا آواز سنی، جو جھنگے کے قریب سے آئی تھی اور جس نے دریافت کیا تھا: "کون ہے؟"
 عورت نے جھنگے کے درمیان میں سے گھر کے اندر دیکھنے کی کوشش کی۔
 "مجھے پادری سے ملتا ہے،" اس نے کہا۔
 "وہ آرام کر رہے ہیں۔"

"معاملہ بہت بنگامی نوعیت کا ہے،" عورت کی آواز میں ٹھہراؤ والا عزم تھا۔
 دروازہ آواز پیدا کیے بغیر تھوڑا سا کھلا اور اندر سے بڑی عمر کی ایک خربہ عورت باہر آئی
 جس کے چہرے کی جلد پتیلی اور سر کے بال فولاد کے رنگ کے تھے۔ موٹے شیشوں والی عینک
 کے عقب میں اس کی آنکھیں بہت چھوٹی لگ رہی تھیں۔
 "اندر آ جاؤ،" اس نے کہا، اور دروازہ پورا کھول دیا۔

وہ کمرے کے اندر داخل ہوئیں۔ اندر پرانے پھولوں کی بو بسی ہوئی تھی۔ وہ عورت انھیں
 ایک لکڑی کی بیچ کی طرف لے گئی اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لڑکی تو بیٹھ گئی، مگر ماں، غیر جانبدار سی،
 دونوں باتھوں میں تھیلے کو تھامے کھڑی رہی۔ بجلی کے پتھکے کی آواز اتنی زیادہ تھی کہ گھر کے اندر
 کوئی اور آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

کمرے کے دوسرے سرے پر دروازے میں گھر والی عورت پھر نمودار ہوئی۔ "وہ کمرہ رہے
 ہیں کہ تین بچے کے بعد آتا،" اس نے دبی زبان سے کہا۔ "ابھی پانچ منٹ پہلے وہ سونے کے
 لیے لیٹے ہیں۔"

"ناڑی ساڑھے تین بچے واپس چلی جاتی ہے،" عورت نے کہا۔

یہ جواب مختصر تھا، لیکن وثوق اور خود اعتمادی سے دیا گیا تھا، اور جواب دیتے وقت عورت
 کا لہجہ خوش گوار اور دھیما تھا۔ گھر والی عورت پہلی بار مسکرائی۔
 "ٹھیک ہے،" اس نے کہا۔

جب کمرے کے دوسرے سرے پر دروازہ پھر بند ہو گیا تو عورت اپنی بیٹی کے نزدیک

مشکل کے دن کا قیلوہ

بیٹھ گئی۔ استتار کا تنگ سا کمرہ غریبانہ، مگر نہایت صاف ستھرا تھا۔ لکڑی کے ایک کٹھرے نے کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ کٹھرے کے دوسری جانب ایک سادہ سی میز تھی جس کے مومی میزپوش کے اوپر ایک قدیم طرز کا ٹائپ رائٹر گل دان کے نزدیک رکھا تھا۔ ذرا دور مسیحی طلقے کے تمام کوائف رکھے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی غیر شادی شدہ عورت نے اس دفتر کا انتظام سنبھال رکھا ہو۔

سامنے والا دروازہ کھلا اور پادری اپنی عینک کے شیشے رومال سے صاف کرتا ہوا اندر داخل ہوا۔ عینک پسینے پر ہی اس کی مشابہت سے ظاہر ہوا کہ دروازہ کھولنے والی عورت اس کی بہن تھی۔

"میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟" اس نے پوچھا۔

"قبرستان کی کنجیاں،" عورت نے جواب دیا۔

لڑکی گود میں گل دستہ سنبھالے بیٹھی تھی اور بچ کے نیچے اس کے پیر ایک دوسرے کو قطع کر رہے تھے۔ پادری نے اس کی طرف، اور پھر عورت کی طرف دیکھا اور پھر کھڑکی کی لوہے کی جالی میں سے روشن اور بادلوں سے خالی آسمان کو دیکھ کر کہا:

"اس گرمی میں؟ سورج غروب ہونے کا استتار کر لیا ہوتا۔"

عورت نے آہستگی سے سر ہلایا۔ پادری کٹھرے کے دوسری جانب چلا گیا۔ وہاں الماری میں سے اس نے ایک کاپی جس پر مومی کاغذ چڑھا ہوا تھا، لکڑی کا قلم دان اور سیاہی کی دوات نکالی اور میز کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھوں کی پشت پر اتنے بال تھے کہ سر پر بالوں کی کمی کی کافی حد تک تلافی ہو رہی تھی۔

"کس کی قبر پر جانا چاہتی ہو؟" پادری نے پوچھا۔

"کارلوس سینتینو کی،" عورت نے جواب دیا۔

"کس کی؟"

"کارلوس سینتینو،" عورت نے دوہرایا۔

پادری کے پلے اب بھی کچھ نہ پڑا تھا۔

"وہ چور جو پچھلے ہفتے یہاں مارا گیا تھا،" عورت نے اسی لہجے میں کہا۔ "میں اس کی ماں

ہوں۔"

پادری نے غور سے عورت کا جائزہ لیا۔ عورت نظریں جما کر پُر سکون اعتماد کے ساتھ اسے دیکھتی رہی، حتیٰ کہ پادری جھیمپ گیا۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا اور لکھنے لگا۔ صفحہ بھرتے بھرتے

اس نے عورت سے کہا کہ اپنی شناخت کرائے۔ بغیر حیل و حجت کے، عورت نے وضاحت اور تفصیل سے بات کی جیسے کوئی لکھی ہوئی عبارت پڑھ رہی ہو۔ پادری کا پسینا ہستا شروع ہو گیا۔ لڑکی نے اپنے بانیں جوتے کا بکوا کھولا اور ایرٹھی جوتے میں سے نکال کر منج کے نیچے لگی ہوئی لکڑی پر رکھ لی۔ پھر دائیں پاؤں کے ساتھ یہی کیا۔

اس واقعے کا آغاز پچھلے ہفتے کے سوموار کو صبح کے وقت یہاں سے چند بلاک پرے ہوا تھا۔ بیوہ ربیکا نے، جو عجیب اگر کم بگرم چیزوں سے بھرے ہوئے گھر میں تنہا رہتی تھی، اس روز بوند بامدی کی آواز سے بلند، باہر سے کسی کے دروازہ کھولنے کی آواز سنی۔ وہ اٹھی اور الماری میں سے ڈھونڈ کر ایک قدیم ریوالور نکالا، جسے کر نل اور یلیا نو بوندیا کے زمانے کے بعد سے کسی نے استعمال نہ کیا تھا۔ ریوالور لے کر، اور گھر کی بٹیاں جلائے بغیر، وہ نشت کے کمرے میں آ گئی۔ اس کا یہ رد عمل دروازے کے تابلے کے کھولے جانے کی آواز کے باعث کم، اور اس دہشت کی وجہ سے زیادہ تھا جو اٹھائیس برسوں کی تنہائی نے اس کے دل میں پیدا کر دی تھی۔ اپنے ذہن میں اس نے نہ صرف دروازے کی جگہ کا، بلکہ تالے کی زمین سے اونچائی کا بھی قطعی حساب لگایا، اور دونوں ہاتھوں میں ریوالور پکڑ کر، آنکھیں بند کر کے گھوڑا دبا دیا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کوئی آتشیں ہتھیار چلایا تھا۔ دھماکے کے فوراً بعد اسے جت کی چھت پر بارش کی کین من کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہ دی۔ پھر اسے باہر انگٹائی کے سیمنٹ والے فرش پر کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز آئی اور کسی نے آہستہ سے، تلخی کے بغیر، مگر سخت تھکے ہوئے لہجے میں "بائے ماں" کے الفاظ ادا کیے۔ جو شخص اس صبح ربیکا کے گھر کے باہر مردہ پایا گیا (اس کی ناک کے پر نیچے اڑ گئے تھے) اس نے فلائین کی رنگ دار دھاریوں والی قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کی پتلون روزمرہ والی تھی جسے اس نے پیٹھی کی بجائے رسی سے باندھا ہوا تھا اور وہ نیچے پاؤں تھا۔ قصبے میں اسے کوئی نہیں جانتا تھا۔

"تو اس کا نام کارلوس سینتینو تھا؟" پادری نے لکھنے کا کام ختم کر کے کہا۔

"سینتینو ایالا،" عورت نے کہا۔ "وہ میرا اکلوتا بیٹا تھا۔"

پادری دوبارہ الماری کی طرف چلا گیا۔ الماری کے دروازے کے اندر دو رنگ آلود بڑی کنجیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ لڑکی نے سوچا، جیسے کہ اس کی ماں نے اپنے لڑکپن میں سوچا تھا، اور جیسے کہ پادری نے بھی کسی نہ کسی وقت سوچا ہوگا، کہ وہ حضرت پطرس کی کنجیاں ہیں۔ پادری نے کنجیوں کو کیل سے اتارا، انہیں کٹھرے پر رکھی کھلی ہوئی کاپی کے صفحے پر رکھ کر اپنی شہادت کی انگلی سے صفحے پر ایک جگہ اشارہ کیا، اور عورت سے کہا:

"یہاں دستخط کرو۔"

عورت نے تھیلے کو بغل میں دبا کر اپنا نام اس جگہ پر گھسیٹ کر لکھنا شروع کر دیا۔ لڑکی نے گل دستہ ہاتھ میں اٹھایا اور پاؤں رگڑتی ہوئی کٹہرے کے پاس آکر ماں کو غور سے دیکھنے لگی۔

پادری نے آہ بھری:

"تم نے کبھی اے سیدھے راستے پر لانے کی کوشش نہیں کی؟"

عورت نے دستخط ختم کرنے کے بعد پادری کو جواب دیا:

"وہ بہت اچھا آدمی تھا۔"

پادری نے پہلے عورت کی طرف اور پھر لڑکی کی جانب دیکھا اور صلح تھیر کے ساتھ باور کیا کہ ماں بیٹی دونوں میں سے کسی کا آنسو بہانے کا ارادہ نہیں ہے۔ عورت نے اسی انداز میں بات جاری رکھی: "میں نے اے کما تھا کہ جو چیز کسی کے کھانے کی ہو اے چوری نہ کرے، اور اس نے ہمیشہ میرا کما مانا۔ اس کے برعکس، پہلے، جب وہ مٹکے بازی کیا کرتا تھا، مار کھا کھا کر بے حال ہوجانے کے باعث اس کے تین تین دن بستر پر گزرتے تھے۔"

"اور اے اپنے دانت بھی تو ٹکوانے پڑے تھے،" لڑکی نے اضافہ کیا۔

"ہاں،" عورت نے اتفاق کیا۔ "ان دنوں میرے ہر نوالے میں اُس مار کا ذائقہ ہوتا تھا جو

میرے پیٹے نے ہفتے کی راتوں کو کھائی ہوئی تھی۔"

"خدا کی منشا کو کون جان سکتا ہے!" پادری نے کہا۔

مگر یہ اس نے بغیر کسی یقین کے کہا تھا، کچھ تو اس لیے کہ اس کو زندگی کے تجربے نے ذرا شک میں ڈال دیا تھا اور کچھ گرمی بھی بہت زیادہ تھی۔ اس نے انھیں مشورہ دیا کہ سرسام سے بچنے کے لیے اپنے سروں کو ڈھانپ کر باہر جائیں۔ جمائیاں لیتے ہوئے اور تقریباً سوتے سوتے اس نے انھیں کارلوں سینٹیو کی قبر تک پہنچنے کا راستا سمجھایا اور کہا کہ کنجیاں لوٹانے کے لیے واپسی پر انھیں دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت نہیں؛ باہر کے دروازے کے نیچے کنجیاں رکھ دیں، اور اگر ممکن ہو تو گرے کے لیے نذر نیاز بھی دیں چھوڑ دیں۔ عورت نے بہت توجہ سے پادری کی ہدایات کو سنا، لیکن شکر یہ ادا کرتے وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔

سرٹک والا دروازہ کھولنے سے پیشتر ہی پادری نے بجانب لیا تھا کہ کوئی شخص لوہے کے جھنگلے سے ٹاک لگائے گھر کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ باہر بہت سارے بچے جمع ہو گئے تھے۔ جب دروازہ کھلا تو وہ سب ادھر ادھر ہو گئے۔ عموماً دپہر کے اس وقت سرٹک پر کوئی نہ ہوتا تھا۔ آج نہ صرف وہاں بچے تھے، بلکہ بادام کے درختوں کے نیچے بالغوں کے گروہ بھی موجود

تھے۔ پادری نے گرمی میں تیرتی ہوئی سرک کا جائزہ لیا اور ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔

"ایک منٹ ٹھہرو،" اس نے عورت کی طرف دیکھے بغیر اس سے کہا۔

پادری کی بہن پر لے دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس نے شب خوابی کے کپڑوں پر کالی جیکٹ پہن رکھی تھی اور بال ٹائفل پر کھلے چھوڑے ہوئے تھے۔

"کیا بات ہے؟" پادری نے اس سے پوچھا۔

"لوگوں کو پتا چل گیا ہے،" اس کی بہن نے سرگوشی کی۔

"بہتر ہو گا کہ تم دونوں انگٹائی والے دروازے سے باہر جاؤ،" پادری نے کہا۔

"وہاں بھی وہی مال ہے،" پادری کی بہن نے کہا۔ "سب لوگ کھڑکیوں میں سے جھانک رہے ہیں۔"

اس وقت تک بات عورت کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ اس نے لوہے کے جھنگے میں سے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ تب اس نے لڑکی کے ہاتھ سے گل دستہ لے لیا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ لڑکی بھی اس کے چپکے چپکے چلنے لگی۔

"سورج غروب ہونے تک رک جاؤ،" پادری نے مشورہ دیا۔

"تم پچھل جاؤ گی،" پادری کی بہن نے کہا، جو کمرے کے عقب میں بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ "ٹھہرو، میں تمہیں اپنا چھاتا دیے دیتی ہوں۔"

"نہیں، شکریہ،" عورت نے جواب دیا۔ "ہم یوں ہی ٹھیک ہیں۔"

اس نے لڑکی کا ہاتھ تھاما اور دروازہ عبور کر کے سرک پر نکل گئی۔

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ: فاروق حسن

ایک نہ ایک دن

سوموار کی گرم صبح بغیر بارش کے طلوع ہوئی۔ علی الصباح بیدار ہونے کے عادی، بغیر ڈگری کے دندان ساز، اور یلیو ایسکوبار نے چھ بجے اپنا دفتر کھولا۔ پلاسٹر کے سانچے میں نصب چند نقلی دانت اُس نے شیشے کی الماری میں سے نکالے اور مٹھی بھر اوزاروں کو اُن کی قامت کے مطابق ترتیب دے کر میز پر رکھا، یوں جیسے اُن کی منائش کی جانے والی ہو۔ اور یلیو ایسکوبار نے بے کالر کی قمیض پہن رکھی تھی جس کا گلا سونے کی کیل سے بند تھا اور اُس کی پتلون کو گارٹرز نے اپنی جگہ پر سنبھالا ہوا تھا۔ جسمانی لحاظ سے وہ سوکھا ہوا آدمی تھا جو ہر وقت عموداً سیدھا کھڑا رہتا تھا اور اُس کے چہرے پر ایسا تاثر رہتا تھا جیسا عموماً ہرے لوگوں کے چہروں پر ہوتا ہے، حالانکہ اس تاثر کی اصل صورت حال سے مطابقت کم ہی تھی۔

اوزار میز پر ترتیب دینے کے بعد دانتوں کی صفائی کی مشین کو اپنی طرف کھینچ کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور نقلی دانتوں کو چمکانے کے کام میں مصروف ہو گیا۔ اُس کا ذہن اپنی اس مصروفیت کے بارے میں ہر طرح کی سوچ سے عاری لگتا تھا، لیکن وہ انہماک اور باقاعدگی سے، ضرورت

بے ضرورت، مشین کو پاؤں کے پیدل سے بلاتا اور دانتوں کو چمکاتا رہا۔
 آٹھ بجے کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا۔ گھر کی بے باہر جھانک کر اُس نے آسمان کا جائزہ لیا، اور پڑوس کے گھر کی چھت پر نصب آڑی چوب پر وہ مغموم نگہوں کو بیٹھے سورج کی گرمی میں اپنے پروں کو سکھاتے دیکھا۔ اُس نے اندازہ لگایا کہ دوپہر کے کھانے کے وقت سے قبل بارش ہونے کا امکان ہے، پھر وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اُس کے گیارہ سالہ بیٹے کی چھنتی ہوئی آواز نے اُس کے انہماک کا تسلسل توڑا:

"پاپا۔"

"ہاں؟"

"باہر قصبے کا میسر آیا ہے، وہ پوچھتا ہے آپ اُس کا ایک دانت نکال دو گے؟"
 "اُسے کبہ دو میں موجود نہیں ہوں۔"

وہ سونے کے ایک دانت کو چمکاتا رہا۔ ہاتھ بھر کے فاصلے پر رکھ کر اور آنکھیں آدھی بند کر کے اُس نے دانت کو غور سے دیکھا۔ اُس کے بیٹے نے استار کے کمرے سے دوبارہ آواز لگائی:

"پاپا وہ کہتا ہے آپ موجود ہو، کیوں کہ وہ آپ کی آواز سن سکتا ہے۔"
 دندال ساز دانت کے معائنے میں مصروف رہا۔ کچھ دیر بعد اُس نے دانت کو دوسرے پالش کیے ہوئے دانتوں کے قریب میز پر رکھا اور بیٹے کو جواب دیا:
 "تب تو آؤر بھی بہتر ہے۔"

اُس نے دوبارہ مشین کو چلانا شروع کیا۔ گتے کے ایک ڈبے میں سے، جس میں سب طرح کی نامکمل چیزیں پڑی رہتی تھیں، اُس نے دانتوں کے پُل کا ایک حصہ نکالا اور اُس کے سونے کو چمکانے لگا۔

"پاپا۔"

"ہاں؟"

اُس کے چہرے کے تاثر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔
 "میسر کہتا ہے اگر آپ اُس کا دانت نہیں نکالو گے تو وہ آپ کو گولی مار دے گا۔"
 کسی قسم کی عجلت دیکھائے بغیر اس نے اطمینان سے مشین کے پیدل کو بلاتا بند کیا اور اُسے پرے دھکیلا۔ تب اُس نے میز کی ایک دراز کو پورا باہر نکالا، وہاں ایک ریوالور پڑا تھا۔
 "ٹھیک ہے،" اُس نے کہا۔ "اُسے کھوا کر گولی مار دے مجھے۔"

کرسی کو دھکیل کر اُس نے دروازے کے سامنے کر دیا اور اپنا ہاتھ میز کی دراز پر ہی رکھا۔ میسر دروازے میں نمودار ہوا۔ اُس کے چہرے کا بایاں حصہ شیو کیا ہوا تھا لیکن اُس کے سوجے بوسے اور درد کرتے ہوئے دائیں گال پر پانچ دن کی دارھی بڑھی ہوئی تھی۔ دندان ساز نے میسر کی بے حس آنکھوں میں یاس اور بے بسی کی متعدد راقول کو جھانکتے ہوئے پایا۔ اُس نے اپنی نگاہیں کے پوروں سے دراز کو بند کر دیا اور نرمی سے بولا:

"بیٹھ جاؤ۔"

"صبح بخیر،" میسر نے کہا۔

"صبح بخیر،" دندان ساز نے کہا۔

دانت نکالنے کے اوزار پانی میں اُبل رہے تھے۔ میسر نے اپنا سر کرسی کی پشت کے ہاتھ لٹکا دیا، یوں تھوڑا سا آرام محسوس ہوا۔ اُس کا سانس سچ تھا۔ اُس نے دفتر کا جائزہ لیا؛ نہایت ریبا نہ سا انتظام تھا۔ لکڑی کی ایک پرانی کرسی، ہیڈل والی مشین اور شیشے کی ایک الماری جس میں خالی بوتلیں رکھی تھیں۔ کرسی کے مقابل کھڑکی میں ٹائفون کی اونچائی پر کپڑے کا پردہ لٹک رہا تھا۔ دندان ساز کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میسر نے ایرٹیاں مضبوطی سے جوڑیں اور منہ کھول دیا۔ اور یلیو ایسکو بار نے اُس کا چہرہ روشنی کی طرف موڑا اور اُس کے متاثرہ دانت کو دیکھا۔ پھر

س نے جبرٹا انگلیوں کے محتاط دباؤ سے بند کر دیا اور کہا:

"تھیں بے ہوش کیے بغیر یہ دانت نکالنا پڑے گا!"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ دانت کے نیچے پیپ بھری ہوئی ہے۔"

میسر نے ڈاکٹر کی آنکھوں میں جھانکا۔ "ٹھیک ہے،" اُس نے کہا، اور مسکراتے کی دھش کی۔ دندان ساز نے اُس کی مسکراہٹ کا جواب نہ دیا۔ اُبالے ہوئے اوزاروں والا گرم تسلا اُس نے میز پر رکھا اور ایک ٹھنڈی چٹھی سے، کسی عجلت کے بغیر، اوزار باہر نکالے۔ جوتے کی ایک سے اگال دان کو ہلکا کر اُس نے ٹھیک جگہ رکھا اور ہاتھ دھونے کے لیے نلکے کے آگے جا بڑھا ہوا۔ ان سب کاموں کے دوران میں اُس نے ایک بار بھی میسر کی طرف نہ دیکھا۔ لیکن میسر نے ایک لمحے کے لیے بھی ڈاکٹر کو اپنی نظر سے اوچھل نہیں ہونے دیا۔

متاثرہ دانت پچھلے جبرٹے کی عقل دار تھی۔ دندان ساز نے اپنے پاؤں پھیلائے اور گرم نبور سے دانت کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میسر نے اپنی تمام قوت سے دونوں ہاتھوں سے کرسی کے بازوؤں کو جکڑا اور پاؤں اکڑا کر بیٹھ گیا۔ اُسے اپنے گردوں میں سچ آلود خلا کی موجودگی کا احساس

ہوا، لیکن اُس نے آواز نہ نکالی۔ دندان ساز فقط اپنی کلائی کو حرکت دے رہا تھا۔ کسی کیسے کے بغیر، بلکہ ایک ترشی آمیز ملائمت سے اُس نے میسر سے کہا:

"ہمارے بیس آدمیوں کے قتل کا حساب تم اب چکاؤ گے۔"

میسر نے اپنے جبرٹے میں ہڈی کی کرڈر اٹھ کو محسوس کیا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ لیکن جب تک دانت منہ سے باہر نہ آ گیا اُس نے سانس تک نہ لیا۔ آنسوؤں کے عقب سے اُس نے دانت کو دیکھا۔ اُسے یہ دانت اپنی ساری تکلیف سے اس قدر غیر متعلق لگا کہ وہ ہچکلی پانچ راتوں کی اذیت کو سمجھنے میں ناکام رہا۔

پسینے میں خرابور، کانپتا ہوا، وہ اگل دان کے اوپر جھکا رہا۔ اُس نے اپنے کوٹ کے بٹن کھولے اور پتلون کی جیب میں سے رومال نکالنے کی کوشش کی۔ دندان ساز نے صاف کپڑا اُس کی طرف بڑھایا۔

"اپنے آنسو صاف کرو،" اُس نے کہا۔

میسر نے آنسو پونچھے۔ وہ کانپ رہا تھا۔ جب تک دندان ساز باتہ دھوتا رہا، میسر بوسیدہ چھت کو دیکھتا رہا جس پر گرد آلود ہالے لگے ہوئے تھے جن میں مکڑیوں کے انڈے اور مردہ کیڑے مکوڑے لٹکے ہوئے تھے۔ دندان ساز باتہ پونچھتا ہوا واپس آیا۔ "گھر جا کر آرام کرو،" وہ بولا، "اور نمک کے پانی سے غرارے کرتے رہو۔"

میسر اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے تقریباً فوجیوں کے سے سرسری انداز میں دندان ساز کو سلیوٹ کیا اور دروازے کی طرف چلا۔ چلتے ہوئے اُس نے اپنی ٹانگوں کو جھٹک کر سیدھا کیا اور کوٹ کے بٹن بند کیے۔

"بل بھجوا دیتا،" اس نے کہا۔

"کس کے نام؟ تمہارے یا ماڈن کمیٹی کے؟"

میسر نے اس کی طرف دیکھے بغیر کلیتہً کا دروازہ بند کیا۔ حالی کے دروازے کے باہر سے اُس کی آواز آئی:

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سالی ایک جی بات ہے۔"

گا بریٹل گارسیا مارکیز

ترجمہ: فاروق حسن

اس قصبے میں کوئی چور نہیں

داماسو نور کے تڑکے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کی بیوی آنا، چھ ماہ کی حاملہ، کپڑے اور جو تے پسینے بستر میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ تیل کا لیمپ بجھنے کے قریب تھا۔ داماسو کو احساس ہوا کہ اس کی بیوی لمحہ لمحہ کر کے ساری رات اس کا انتظار کرتی رہی ہے، بلکہ اب بھی، جب وہ اس کے سامنے موجود ہے، وہ انتظار کیے جا رہی ہے۔ اس نے انگلی سے آنا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا، جس کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آنا کی خوف زدہ آنکھیں سُرخ کپڑے کے اس ہنڈل پر مرکوز تھیں جو داماسو نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا؛ اس کے ہونٹ سختی سے بچھنچ گئے اور وہ ایک لخت کا پینے لگی۔ داماسو نے خاموشی مگر درشتی کے ساتھ اس کو قمیص سے پکڑ لیا۔ داماسو کے پاس سے گڑوی سی بو آ رہی تھی۔

داماسو نے آنا کو تفریباً بوا میں اٹھالیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اس کے جسم کا سارا بوجھ آگے کو جھک گیا اور وہ اپنے خاوند کی سرخ دھاریوں والی قمیص سے چمٹ کر، ہاتھ اس کی کمر کے گرد لے جا کر اسے گردوں کے قریب پکڑ کر رونے لگی، اور اس وقت تک روتی رہی جب تک اسے قرار نہ آ گیا۔

"میں میٹھے میٹھے سو گئی تھی،" اس نے کہا۔ "یک دم دروازہ کھلا اور کسی نے تمہیں خون میں تر بتر اندر دھکیل دیا۔"

کچھ لمحے بغیر داماسو نے اسے ہاتھ کے فاصلے پر روکے رکھا۔ پھر اس نے اسے بستر پر بٹھا دیا اور بندل اس کی گود میں رکھ کر باہر صحن میں پیشاب کرنے چلا گیا۔ آنا نے ڈوری کو کچھ اور دیکھا: بندل کے اندر بلیئرڈ کی تین گیندیں تھیں، دو سفید اور ایک سرخ، اور تینوں کثرت استعمال سے بدرنگ سی ہو رہی تھیں۔

داماسو جب کمرے میں واپس آیا تو وہ بیٹھی کسی سوچ میں غرق تھی۔

"اور ان کا کیا فائدہ ہو گا؟" اس نے پوچھا۔

داماسو نے کندھے اچکا ئے: "بلیئرڈ کھیلنے کے کام آئیں گی۔"

اس نے بندل کو دوبارہ ڈوری سے باندھا اور دوسری چیزوں، ٹارچ، چاقو اور ساختہ کنبی، کے ہمراہ ٹرنک کی تہ میں رکھ دیا۔ آنا کپڑے تبدیل کیے بغیر دیوار کی جانب منہ کر کے بستر میں لیٹ گئی۔ داماسو نے صرف اپنی پتلون اتاری۔ بستر میں لیٹ کر سگڑٹ پیتے ہوئے وہ صبح کاؤب کی بکھری ہوئی سرسراہٹ میں اپنی مہم کے خدوخال کا جائزہ لینے لگا، یہاں تک کہ اسے احساس ہوا کہ اس کی بیوی ابھی جاگ رہی ہے۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں،" وہ بولی۔

آنا کی آواز، جو عموماً دھیمی ہوتی تھی، غصے اور عناد کی بدولت اس وقت بباری ہو گئی تھی۔ داماسو نے سگڑٹ کا آخری کش لیا اور ٹکڑے کو فرش پر مسل کر بچھا دیا۔

"وہاں کچھ اور تھابی نہیں،" داماسو نے آہ بھری۔ "میں تقریباً گھنٹا بھر اندر رہا۔"

"اگر تمہیں کوئی گولی مار دیتا تو؟" اس نے پوچھا۔

داماسو خوف سے کانپ اٹھا۔ "لعنت ہو تم پر،" اس نے اپنی انگلیوں کے جوڑے کے ڈنڈے پر مارتے ہوئے کہا۔ وہ نیچے فرش پر سگڑٹ اور دیاسلائی تلاش کرنے لگا۔

"تم گدھوں کی طرح بے حس ہو،" آنا نے کہا۔ "اتنا تو سوچا ہوتا کہ میں یہاں سو نہیں پا رہی۔ سڑک پر کوئی آواز آتی تھی تو لگتا تھا جیسے ابھی کوئی تھماری الماش لے کر اندر داخل ہو گا۔" اس نے آہ بھر کر اضافہ کیا:

"اور اس سارے عذاب سے حاصل کیا ہوا؟ بلیئرڈ کی تین گیندیں!"

"دراز میں صرف پچیس سینٹ کا سگڑٹ پڑا تھا۔"

اس قصبے میں کوئی چور نہیں

"تو پھر کچھ بھی لے کر نہ آتے۔"
"مشکل کام تو اندر داخل ہونے کا تھا،" داماسو نے کہا۔ "وہاں سے بالکل خالی ہاتھ لوٹ آتا؟"

"کچھ اور اٹھا لاتے!"
"وہاں اور کچھ بھی نہیں تھا،" داماسو نے کہا۔
"جتنی چیزیں بلیر ڈھال میں ہوتی ہیں اور کہاں ہوتی ہوں گی!"
"ہاں، گنتا سی ہے،" داماسو نے کہا۔ "لیکن ایک بار اندر داخل ہو کر تلاش کرنا اور ہر چیز کو دیکھنا شروع کرو تو پتا چلتا ہے کہ وہاں کوئی جگہ کے مول کی چیز بھی نہیں۔"
وہ دیر تک خاموش لیٹی رہی۔ داماسو کو لگا جیسے وہ آنکھیں کھولے، اپنی یادداشت کے اندھیرے میں کسی قیمتی چیز کو تلاش کر رہی ہو۔
"ہاں شاید!" وہ بولی۔

داماسو نے سگریٹ سلگا لیا۔ رات کی پی ہوئی شراب کا نشہ لہر کے بعد لہر بن کر اُس کے جسم سے زائل ہو رہا تھا، اور اسے دوبارہ اپنے اعصاب کے وزن، حجم اور فرائض منصبی کا احساس ہونے لگا تھا۔ "وہاں ایک پتی تھی،" آخر اس نے کہا۔ "ایک بہت بڑی سفید پتی۔" آتا نے بستر میں کروٹ لی، اپنا پھولا ہوا پیٹ اپنے خاوند کے پیٹ کے ساتھ لگا دیا اور ٹانگ اس کے گھٹنوں کے درمیان رکھ دی۔ اس کے پاس سے پیاز کی بو آرہی تھی۔
"بہت ڈر لگا تھا؟" آتا نے پوچھا۔
"مجھے؟"

"ہاں تمہیں،" آتا نے کہا۔ "سنا ہے مردوں کو بھی ڈر لگتا ہے۔"
اُسے احساس ہوا کہ وہ مسکرا رہی ہے۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ "ہاں، تھوڑا سا،" اُس نے کہا۔
"مجھے اتنے زور کا پیشاب آ رہا تھا کہ برداشت کرنا مشکل تھا۔"
آتا نے اُسے چوما مگر اس نے جواباً کچھ نہ کیا۔ تب، اس احساس کے باوجود کہ وہ اپنے جرم کا اعتراف کرنے لگا ہے، جو خطرے سے خالی بات نہ تھی، تاہم بغیر کسی تاسف کے، اس نے تمام واقعہ، تفصیل کے ساتھ آتا کو سنایا، یوں جیسے کسی پرانے سفر کی یاد تازہ کر رہا ہو۔
طویل خاموشی کے بعد آتا نے کہا:

"تھا تو پاگل پن ہی!"
"بس شروع کرنے کی ہمت چاہیے،" داماسو نے آنکھیں میچتے ہوئے کہا۔ "اور پھر پہلی

کوشش کے لحاظ سے معاملہ بُرا تو نہیں رہا۔"

سورج کی تپش دیر سے شروع ہوئی۔ آنا داماسو کے بیدار ہونے سے بہت پہلے جاگ چکی تھی۔ داماسو نے چند منٹ کے لیے اپنا سر صحن میں لگے ٹکے کی ٹونٹی کے نیچے ٹکائے رکھا حتیٰ کہ پانی کی دھار سے وہ پوری طرح بیدار ہو گیا۔ اس کا کمرہ بہت سارے ایک جیسے مگر الگ الگ کمروں میں سے ایک تھا۔ صحن میں، جو تمام کمروں کا مشترکہ تھا، کپڑے سکھانے کی رسی بندھی ہوئی تھی۔ عقبی دیوار کے پاس والے حصے میں، جسے ٹین کی ایک چادر صحن سے الگ کرتی تھی، آنا نے کھانا پکانے اور استریاں گرم کرنے کے لیے ایک سفری چولہا، اور کھانا کھانے اور کپڑے استری کرنے کے لیے ایک چھوٹی میز رکھی ہوئی تھی۔ اپنے خاوند کو قریب آتا دیکھ کر اس نے استری کیے ہوئے کپڑے ایک طرف رکھ دیے اور استریاں چولہے پر سے اتار دیں تاکہ کافی گرم کر سکے۔ آنا اپنے خاوند سے عمر میں بڑی تھی، اس کی جلد کی رنگت پتیلی تھی اور حرکات و سکنات میں ایسے لوگوں کی سی نرم روی اور اہلیت تھی جن کا حقیقت سے روزانہ واسطہ رہتا ہو۔

سر درد کی دھند میں سے اسے احساس ہوا کہ آنا نظروں ہی نظروں میں اس سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس وقت تک داماسو نے صحن میں دوسرے لوگوں کی آوازوں کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

"ان سب نے صبح سے اور کوئی بات ہی نہیں کی،" آنا اسے کافی دیتے ہوئے بڑبڑائی۔
"مرد لوگ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہاں گئے ہیں۔"

داماسو نے خود دیکھا، صحن میں سے مرد اور بچے غائب تھے۔ کافی پیتے ہوئے وہ خاموشی سے اُن عورتوں کی گفتگو سننے اور سمجھنے کی کوشش میں لگا رہا جو رسی پر کپڑے لٹکا رہی تھیں۔ آخر اس نے سگریٹ سلگایا اور باورچی خانے میں سے باہر نکل آیا۔
"تیریا! اس نے پکارا۔"

جسم کے ساتھ چپکے ہوئے گیلے کپڑے پہنے ایک لڑکی نے اس کی آواز کا جواب دیا۔ "ذرا احتیاط سے بات کرنا،" آنا نے سرگوشی کی۔ لڑکی چل کر داماسو کے قریب آئی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" داماسو نے پوچھا۔

"رات کو بلیر ڈال میں چوری ہوئی ہے۔ چور سب کچھ لے گئے۔"

لڑکی کو جیسے تمام تفصیلات کا علم تھا۔ اس نے وضاحت سے بتایا کہ چوروں نے رات کس

اس قصبے میں کوئی چور نہیں

طرح بال میں سے یکے بعد دیگرے ساری چیزیں اکھاڑیں، حتیٰ کہ بلیر ڈکھیلنے کی بجاری میز بھی۔ وہ اتنے تیشٹن سے بات کر رہی تھی کہ خود داماسو کو لگا جیسے اُسے ہر بات کا صحیح علم ہو۔

"لعلت ہے!" باورچی خانے میں کوٹتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔

آنا دانت بھینچ کر گنگنا نے لگی۔ داماسو اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش میں کرسی دیوار کے ساتھ ٹکا کر بیٹھ گیا۔ تین ماہ قبل، جب وہ بیس برس کا ہوا تھا، اس کی لکیر جیسی مونچھ کی بدولت، جس کی نگہداشت وہ نہ صرف ایثار کے پوشیدہ جذبے کے تحت بلکہ کچھ کچھ شفقت سے کرتا تھا، اس کا چپک کے داغوں سے بھرا چہرہ قدرے پختہ لگنے لگا تھا۔ تب سے اس نے خود کو بالغ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن آج صبح، جبکہ کل رات کے واقعے کی یاد اس کے سر درد کی دلدل میں تیرتی پھر رہی تھی، اسے یہ بھی معلوم نہ ہو پا رہا تھا کہ بلوغت تو کجا، وہ زندگی کے کس مقام سے اپنے آپ کو زندہ تصور کرنا شروع کرے۔

استری ختم کرنے کے بعد آنا نے کپڑوں کو ایک جیسی قامت کے دو ڈھیروں میں بانٹا اور باہر جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔

"زیادہ دیر نہ لگنا،" داماسو نے کہا۔

"نہیں، روز سے زیادہ نہیں۔"

وہ اس کے چپچہ کمرے میں آیا۔ "تمہاری چارٹا نے والی قمیص وہاں رکھی ہے،" آنا نے کہا۔ "بستر ہو گا کہ آج دھاریوں والی قمیص نہ پہنو۔" آنا نے اپنے خاوند کی لمبی جیسی شفاف آنکھوں میں دیکھا۔ "سیا پتا کل کسی کی نظر تم پر پڑ گئی ہو!"

داماسو نے ہتھیلیوں کا پسینا پتلون پر رگڑ کر صاف کیا۔ "نہیں، مجھے کسی نے نہیں

دیکھا۔"

"پگتا پتا تو نہیں،" آنا نے دوبارہ کہا۔ وہ دونوں بازوؤں پر کپڑوں کا ایک ایک بندل اٹھائے ہوئے تھی۔ "ویسے بھی تمہیں آج باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ کچھ دیر رکو، میں باہر کا چکر لگا کر آتی ہوں، جیسے مجھے کسی بات سے کوئی غرض نہیں۔"

قصبے میں لوگوں کی زبانوں پر کسی اور بات کا ذکر ہی نہ تھا۔ آنا کو بار بار اسی ایک واقعے کی مختلف بلکہ ایک دوسرے کی تردید کرتی ہوئی تفصیلات سننی پڑیں۔ لوگوں کے دُسلے ہوئے کپڑے ان کے حوالے کرنے کے بعد وہ، ہر سنچر کی طرح مارکیٹ جانے کی بجائے، سیدھی چوک کی جانب ہوئی۔

بلیر ڈال کے سامنے اس کے خیال کے برعکس کم لوگ تھے۔ کچھ لوگ بادام کے درخت

کے نیچے کھڑے گشتگو کر رہے تھے۔ شامیوں نے دوپہر کے کھانے کے بعد دسترخوان اٹھا دیا تھا، اور دکانیں اپنے کیمنوس کے سانبانوں کے نیچے اونچھتی ہوئی لگ رہی تھیں۔ ایک شخص بوٹل کے ملاقات کے کمرے میں جھولنے والی کرسی میں ٹانگیں پھیلائے اور منہ کھولے سو رہا تھا۔ دوپہر کی گرمی میں ہر چیز مفلوج سی لگتی تھی۔

آنا بلیر ڈہال کی دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتی گئی، اور جب وہ گودی کے مقابل زمین کے خالی قطعے پر سے گزر رہی تھی تو اسے لوگوں کا جھوم نظر آیا۔ تب اسے وہ بات یاد آئی جو داماسو نے اسے بتائی تھی، اور یہ وہ بات تھی جس کا علم تو سب کو ہو گا مگر یہ بلیر ڈہال کے گاہکوں کے سوا کسی کے ذہن میں نہ رہی ہو گی: بلیر ڈہال کا عقبی دروازہ زمین کے ایک خالی قطعے پر کھلتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ، اپنے بازو پھولے ہوئے پیٹ کے اوپر باندھے، لوگوں سے باتوں میں لگ گئی؛ اس کی نظریں اس دروازے پر گرمی تھیں جسے رات کو توڑا گیا تھا۔ تالا تو اپنی جگہ موجود تھا لیکن ایک طرف کا گنڈا ایسے اُکھیر لیا گیا تھا جیسے کسی کا دانت نکالا جاتا ہے۔ کچھ دیر تک آنا اس نقصان کا جائزہ لیتی رہی جو اُس تنہا اور معمولی سی کوشش کے نتیجے میں ہوا تھا، اور ترحم کے احساس کے ساتھ اسے اپنے خاوند کا خیال آیا۔

"کون تھا؟" اس نے پوچھا۔

اُس میں ادھر اُدھر دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔

لوگوں نے جواب دیا، "کسی کو معلوم نہیں۔ سنا ہے کوئی اجنبی تھا۔"

"ہاں، اجنبی ہی ہو سکتا ہے،" اس کے عقب میں کھڑی ایک عورت بولی۔ "اس قصبے میں تو کوئی چور نہیں ہے۔ یہاں تو ہر کوئی دوسرے کو جانتا ہے۔"

آنا نے مڑ کر اسے دیکھا۔ "ہاں، یہ تو ہے،" اس نے کہا اور ہلکے سے مسکرائی۔ وہ پسینے میں تر ہو رہی تھی۔ اس کے نزدیک ایک بوڑھا شخص کھڑا تھا جس کی گردن کی پشت پر تھریاں پڑی ہوئی تھیں۔

"کیا وہ سب کچھ لے گئے؟" آنا نے پوچھا۔

"دو سو پیسو، اور بلیر ڈکی گیندیں،" بوڑھے نے جواب دیا۔ وہ قدرے غیر معمولی دلچسپی سے آنا کو دیکھ رہا تھا۔ "آئندہ سے ہمیں آنکھیں کھول کر سونے کی عادت ڈالنی پڑے گی۔"

آنا نے نظریں پھیر لیں۔ "ہاں، یہ تو ہے،" اس نے دوسری بار کہا۔ سر کے اوپر رومال باندھ کر وہ چل پڑی۔ چلتے وقت وہ ذہن سے یہ خیال نکالنے سے قاصر رہی کہ وہ بوڑھا اسے گھورے جا رہا ہے۔

اس قصبے میں کوئی چور نہیں

خالی قصبے پر جمع لوگ پندرہ منٹ تک تو باتمیز انداز میں بات چیت کرتے رہے جیسے دروازے کے عقب میں کسی کا جنازہ رکھا ہو۔ پھر وہ سب اضطراب کے عالم میں واپس مڑ کر چوک کی جانب چل دیے۔

بلیر ڈبال کا مالک، قصبے کے میئر اور دو پولیس والوں کے ساتھ، بال کے دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ ٹھگنا اور گول مٹول آدمی تھا، اس کی پتلون پیٹ کے دباؤ کے باعث اپنی جگہ پر ٹکی ہوئی تھی، اور ٹینک ایسی تھی جیسے عموماً بچے تاروں سے بنالیا کرتے ہیں، لیکن وہ قصبے کا بے حد معزز آدمی گردانا جاتا تھا۔

ہجوم نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ دیوار کے ساتھ لگی ہوئی آنا اس کا بیان سنتی رہی، حتیٰ کہ ہجوم آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگا۔ تب، گرمی سے مضطرب، وہ اپنے کمرے میں لوٹ آئی، جس کے گرد اس کے شور مچاتے ہوئے پڑوسی جمع تھے۔

بستر میں دراز داماسو سو بار اس سوال پر غور کر چکا تھا کہ پچھلی رات آنا نے سگریٹ پیے بغیر اتنی دیر تک اس کا استتار کیسے کر لیا تھا۔ اسے مسکراتے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہوتے اور سر پر سے پسینے میں بھیگا رومال اتارتے دیکھ کر اس نے تقریباً آن پیا سگریٹ بچے فرش پر بچھا کر سگریٹ کے آور بہت سے بچھے ہوئے نگوڑوں کے درمیان ڈال دیا، اور بڑھتے ہوئے اضطراب کے ساتھ استتار کرنے لگا۔

"تو کیا پتا چلا؟"

آنا بستر کے نزدیک گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

"پتا یہ چلا کہ تم چوری کرنے کے علاوہ جھوٹ بھی بولتے ہو،" اس نے کہا۔
"کیسے؟"

"ایسے کہ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ دراز میں کچھ بھی نہیں تھا۔"

داماسو کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔

"کچھ تھا ہی نہیں۔"

"وہاں دو سوپیو تھے،" آنا نے کہا۔

"بالکل جھوٹ،" وہ زور سے بولا۔ وہ بستر میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور دو بارہ رازدارانہ لہجے میں

بات کرنے لگا۔ "صرف پچیس سینٹ تھے۔"

اس نے آنا کو اپنی بات کا یقین دلادیا۔ "رُوک بہت بد معاش آدمی ہے،" داماسو نے

مٹھیاں بھیپتتے ہوئے کہا۔ "اس کی خواہش یہ ہے کہ میں جا کر اس کا جبراً توڑوں۔" آنا زور سے

بہن پڑی۔

"بے وقوف مت ہو۔"

داماسو بھی ہنسنے لگا۔ جس وقت وہ شیو بنا رہا تھا، آنا نے اسے وہ تمام باتیں بتائیں جو وہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ پولیس والے کسی اجنبی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ "کہتے ہیں وہ جمہرات کو قصبے میں وارد ہوا تھا اور کل رات گودی کے ارد گرد گھومتا ہوا دیکھا گیا تھا،" وہ بولی۔ "لیکن اب پتا نہیں کہاں غائب ہو گیا ہے۔" داماسو اس اجنبی کے بارے میں سوچنے لگا جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا، ایک لمحے کے لیے اسے یقین ہو گیا کہ واقعی وہ اجنبی ہی اصل مشتبہ کردار ہے۔

"شاید وہ قصبے سے چلا ہی گیا ہو،" آنا نے کہا۔

ہمیشہ کی طرح داماسو کو تیار ہونے میں تین گھنٹے لگے۔ اولین کام نفاست سے مونچھوں کی مناسب حد تک تراش کا تھا۔ پھر صحن میں نلکے کے نیچے غسل۔ آنا اسی دلچسپی کے ساتھ جس میں اُس رات سے لے کر، جب اس نے پہلی بار داماسو کو دیکھا تھا، آج تک کسی چیز کے باعث کوئی کمی نہیں آئی تھی، اس کے بالوں میں لنگھی کرنے کے دشوار اور پُر مشقت عمل کا نظروں سے قدم بہ قدم تعاقب کرتی رہی۔ آنا نے جب اسے گھر سے باہر جانے سے قبل سرخ چارٹانے والی قمیض پہنے، آئیے میں اپنا معائنہ کرتے دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے وہ خود عمر رسیدہ اور ناقص بونچکی ہو۔ داماسو نے کسی مشتاق باکسر کی سی چستی کے ساتھ آنا کو دوچار جھوٹ موٹ کے مٹکے لگانے کی ادا دکھائی۔ آنا نے اسے کلانیوں سے پکڑ لیا۔

"پاس خرچ کے لیے بھی کچھ ہے؟"

"ارے میں امیر آدمی ہوں،" داماسو نے خوش مزاجی سے جواب دیا۔ "میرے پاس دو سو

پیو ہیں۔"

آنا نے دیوار کی طرف منہ کر کے اپنی چہلی میں سے کچھ مڑے ہوئے نوٹ نکالے اور ان میں سے ایک پیو کا نوٹ داماسو کو تھماتے ہوئے بولی: "یہ رکھ لو، بڑے آئے ویلنٹیو!"

اس رات داماسو اپنے چند دوستوں کے ہمراہ چوک میں تھا۔ اتوار کے روز گرد و آفاق کے دیہات سے جو لوگ مال اسباب فروخت کرنے قصبے کے بازار میں آتے تھے، وہ آلو کے قتلے اور لاٹری کے ٹکٹ بیچنے والے اسٹالوں کے درمیان اپنے سامان نصب کر رہے تھے۔ شام کے اوائل ہی سے ان کے خراٹوں کی آوازیں سنائی دینے لگتی تھیں۔ داماسو کے دوستوں کو بلیر ڈال میں چوری کا اتنا افسوس نہ تھا جتنا ریڈیو پر بیس بال کے مقابلوں کی کمنٹری کے نہ سن پانے کا

اس قصبے میں کوئی چور نہیں

تھا۔ بلیر ڈال بند ہونے کی وجہ سے وہ کمشنری سے محروم ہو گئے تھے۔ بیس ہال کے بارے میں باتیں کرتے کرتے وہ سنیا ہال میں چلے گئے؛ انھوں نے یہ بھی دریافت نہ کیا، اور نہ ان میں سے کسی کو یہ جاننے کی خواہش تھی، کہ کون سی فلم چل رہی ہے۔

کاتین فلاس کی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ بالکنی کی پہلی قطار میں بیٹھا داماسو بے شرمی سے بنے جا رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے جذبات سے صحت یاب ہو رہا ہو۔ وہ جون کی ایک خوش کن رات تھی، اور فلم کے لمبے خاموش وقفوں میں، جب پرو جیکٹر کی دودھیا شعاع کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، بغیر چمت کے اس ہال میں ستاروں کی خاموشی اپنا بوجھ ڈالتی محسوس ہونے لگتی۔

اپانک اسکرین پر ہلتے ہوئے نقش مدح ہو کر تھم گئے اور آر کسٹرا کے عقب سے شور سنائی دیا۔ بٹیوں کے اپانک جل اٹھنے کی چکاچوند میں داماسو کو یوں لگا جیسے اس کی چوری کا راز فاش ہو گیا ہو اور اس پر سرعام الزام لگایا جا رہا ہو۔ اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن ایک دم اس نے دیکھا، آر کسٹرا کے قریب سامعین جیسے مفلوج سے ہو گئے تھے، اور پولیس کا ایک سپاہی کسی شخص کو اپنی منجھنی کے گرد لپیٹی ہوئی پیٹی کے تانبے کے وزنی بکسے سے بے رحمی کے ساتھ مارے جا رہا تھا۔ مار بھانے والا ایک دیوقامت کالا تھا۔ عورتوں نے چیخ پکار شروع کر دی، اور پولیس والا، جو کالے کو پیٹ رہا تھا، عورتوں کی چیخوں سے بلند آواز میں چلتا یا: "یہ چور ہے! چور!" کالے نے لڑکھ کر کرسیوں کی دو قطاروں کے درمیان رہ گستا شروع کر دیا لیکن پولیس نے اس کا تعاقب نہ چھوڑا اور دو سپاہی اس کے چپھے بھاگتے اور اس کے گردوں پر ضربیں لگاتے رہے، حتیٰ کہ وہ اسے کمر سے قابو کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تب اس سپاہی نے جو اسے پیٹی سے مار رہا تھا، اس کی کلاںیاں کمر کے چپھے رسی سے باندھ دیں اور تین سپاہی اسے دھکیلتے ہوئے دروازے کی طرف لے گئے۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ داماسو کو تب ہی پتا چلا جب وہ اس کے قریب سے گزرے۔ کالے آدمی کی قمیص پھٹ چکی تھی اور اس کا چہرہ دھول، پسینے اور خون کے آمیزے سے لتھڑا ہوا تھا۔ وہ سکیاں بھر رہا تھا اور پولیس والوں کو قاتل اور خون کی القاب سے پکار رہا تھا۔ تب پرو جیکٹر دوبارہ چلا دیا گیا اور فلم جاری ہو گئی۔

داماسو دوبارہ نہیں بنسا۔ اس نے باقی کی فلم ٹکڑوں میں دیکھی جن کا ایک دوسرے سے کم ہی تعلق تھا، اور وہ لگاتار سگریٹ پھونکتا رہا، یہاں تک کہ بال کی بتیاں جلادی گئیں اور حاضرین نے ایک دوسرے کی جانب یوں دیکھا جیسے حقیقت سے خوف زدہ ہوں۔ "اچھی فلم تھی،" کسی نے، جو داماسو کے قریب تھا، کہا۔ داماسو نے اسے مرٹر نہ دیکھا۔

"کاتین فلاس اچھا ایکٹر ہے،" اس نے جواب دیا۔

لوگوں کی رو کے ساتھ بستے بستے وہ دروازے تک آگیا۔ چھٹیوں پر خوردو نوش کا سامان پہنچنے والے گھروں کو جا رہے تھے۔ گیارہ کے بعد کا عمل تھا لیکن بازار میں بہت سے لوگ کھڑے اس انتظار میں تھے کہ فلم دیکھنے والے باہر آئیں تاکہ ان سے کالے کی گرفتاری کی تفصیل دریافت کی جاسکے۔

اس رات کمرے میں داخل ہوتے وقت داماسو اتنا محتاط تھا کہ آنا کو، جو آدھی سوئی ہوئی تھی، اس کی موجودگی کا پتا اس وقت چلا جب وہ بستر میں لیٹ کر دوسرا سگریٹ پی رہا تھا۔

"بھانا چولھے پر رکھا ہے،" وہ بولی۔

"مجھے بھوک نہیں ہے،" داماسو نے جواب دیا۔

آنا نے آہ بھری اور بیدار ہوئے بغیر کہا، "میں خواب دیکھ رہی تھی کہ تورا مکھن سے پتلیاں بنا رہی ہے۔" پھر یک دم اسے احساس ہوا کہ وہ سونے کی نیت سے نہیں لیٹی تھی تاہم سو گئی تھی۔ وہ بستر میں پلٹی، چہرہ داماسو کی جانب موڑا اور خیرہ ہو کر اپنی آنکھیں ملنے لگی۔

"وہ اجنبی پکڑا گیا ہے،" آنا نے کہا۔

داماسو نے بولنے سے قبل ذرا توقف کیا۔

"کس نے خبر دی ہے؟"

"انھوں نے اسے سنیما ہال میں سے پکڑا ہے،" وہ بولی۔ "سب لوگ وہیں گئے ہوئے"

ہیں۔"

آنا نے اجنبی کی گرفتاری کی غلط سلط روداد داماسو کو سنائی۔ داماسو نے اس کی تصحیح کرنے

کی ضرورت محسوس نہ کی۔

"بائے بے چارہ!" آنا نے آہ بھری۔

"بے چارہ کیوں؟" داماسو غصے میں آتے ہوئے بولا۔ "تمہارا دل تب خوش ہوتا اگر اُس کی

جگہ میں ٹکجنے میں ہوتا؟"

آنا اس کی طبیعت کے اتار چڑھاؤ سے خوب واقف تھی، اس لیے خاموش رہی۔ پوچھنے تک

وہ اسے بستر میں لیٹے، سگریٹ پیتے اور دے کے مریضوں کی طرح سانس لیتے محسوس کرتی رہی۔

ایک بار اسے لگا جیسے وہ بستر سے نکلے اور کسی غیر واضح تلاش میں، جس میں وہ بصارت سے زیادہ حس

لامرے سے کام لیتا معلوم ہو رہا تھا، کمرے کی تمام چیزوں کو الٹ پلٹ کرنے لگا، پھر پندرہ منٹ

سے زیادہ دیر تک بستر کے نیچے کی زمین کھرچتا رہا۔ پھر آنا نے اندھیرے میں اسے کپڑے تبدیل

اس قصبے میں کوئی چور نہیں

کرتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ ہر کام حتیٰ الامکان خاموشی سے کر رہا تھا، یہ جانے بغیر کہ آنا، اس سارے عمل کے دوران، اسے یہ احساس دلا کہ وہ سو رہی ہے، اس کی گائنا مدد کر رہی تھی۔ آنا کے ذہن میں کوئی قدیم، خوابیدہ حس بیدار ہوئی اور وہ جان گئی کہ داما سو پچھلی رات فلم دیکھنے گیا ہوا تھا اور یہ بھی سمجھ گئی کہ اس نے گیندیں ابھی ابھی بستر کے نیچے کیوں دفن کی ہیں۔

سوموار کو جب بلیر ڈال کھلا، تو پر جوش گاہکوں کے ایک ہیوم نے اس پر ہلکا بول دیا۔ بلیر ڈال کی میز جاسنی کپڑے سے ڈھکی رکھی تھی جیسے وہ منظر کسی بلیر ڈال کا نہیں بلکہ جنازہ گاہ کا ہو۔ دیوار پر ایک اعلان چسپاں تھا: "گیندیں ختم، بلیر ڈال ہضم۔" لوگوں نے اندر آ کر اس اعلان کو یوں پڑھا جیسے وہ اخبار کی کوئی خبر ہو۔ چند ایک تو اس کے سامنے کھڑے کافی دیر تک ناقابلِ فہم عقیدت کے ساتھ اس کا مطالعہ کرتے رہے۔

داما سو بلیر ڈال میں داخل ہونے والے اولین گاہکوں میں سے تھا۔ اپنی زندگی کا ایک حصہ وہ ان بچوں پر بیٹھے گزار چکا تھا جو بال میں تماشا نیوں کے لیے مخصوص تھیں، اور دروازہ کھلتے ہی وہ وہاں موجود تھا۔ آج بال میں موجود ہونا البتہ اتنا ہی مشکل، لیکن اتنا ہی غیر ارادی کام تھا جتنا تعزیت کے لیے کہیں جانا۔ اس نے کاؤنٹر کی دوسری جانب کھڑے مالک کی کمر تھپتھپائی اور کہا۔

"کتنی اذیت کی بات ہے، روک!"

مالک نے افسردگی سے سر ہلایا۔ اس کے ہونٹوں پر دکھی سی مسکراہٹ تھی۔ آدھ بھر کر اس نے جواب دیا، "ہاں بھئی، وہ تو ہے۔" اور وہ دوبارہ گاہکوں کو مشروبات فراہم کرنے میں لگ گیا، جبکہ داما سو کو نے میں دھرے اسٹول پر کاؤنٹر کے سامنے بیٹھا جاسنی کفن میں لپٹی بلیر ڈال کی میز کے بارے میں سوچ بچار کرتا رہا۔

"کیسی عجیب بات ہے،" اس نے کہا۔

"ہاں،" ایک اور شخص نے، جو داما سو کے برابر والے اسٹول پر بیٹھا تھا، اس سے اتفاق کیا۔ "لگتا ہے جیسے یہ ماتم کا منہ ہو۔"

جب گاہکوں کی اکثریت دوپہر کے کھانے کے لیے گھر جا چکی، تو داما سو نے رکاوٹوں کی مشین میں چوٹی ڈالی اور میکینیکو کے ایک گیت کا انتخاب کیا جس کی جگہ اسے مشین کے کارڈ پر زبانی یاد تھی۔ روک میز کرسیاں اٹھا اٹھا کر بال کی پچھلی دیواروں کے ساتھ رکھنے لگا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" داما سو نے پوچھا۔

"تاش کے لیے میزیں لگا رہا ہوں،" روک نے کہا۔ "جب تک نئی گیندیں نہیں آتیں، کچھ نہ کچھ تو کرنا ہو گا۔"

دونوں باتھوں میں ایک ایک کر سی اٹھائے رک رک کر پلتا ہوا وہ کسی نئے نئے رندوے کی طرح لگ رہا تھا۔

"کب آرہی ہیں گیندیں؟" داماسو نے پوچھا۔
"میرا خیال ہے ایک مہینا لگ جائے گا۔"

"اس وقت تک تو پرانی گیندیں بھی برآمد ہو چکی ہوں گی،" داماسو نے کہا۔
روک نے چھوٹی چھوٹی میزوں کی قطاروں کو تحمین کی نظر سے دیکھا۔ "نہیں، وہ نہیں ملیں گی،" اس نے ماتھے کا پسینا استین سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "کالے کو جتنے کے دن سے بھوکا پیاسا رکھا ہوا ہے مگر وہ بتا کر ہی نہیں دیتا کہ گیندیں کہاں ہیں۔" اس نے پسینے سے دھندلے عینک کے شیشوں میں سے داماسو کو غور سے دیکھا۔

"مجھے یقین ہے اس نے دریا میں پھینک دی ہیں۔"
داماسو نے دانٹوں میں اپنے ہونٹ دبالیے۔
"اور دو سو پیسو؟"

"وہ بھی،" روک نے کہا۔ "اس کے پاس سے صرف تیس ہی برآمد ہوئے ہیں۔"
دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔ داماسو شاید کبھی بھی اس احساس کی وضاحت نہ کر پاتا کہ اس ایک نظر نے عیسے ان دونوں کے درمیان ایک مہمانہ سا تعلق قائم کر دیا۔ اس دوپہر آنا نے غسل خانے کی کھڑکی میں سے داماسو کو کئے بازوں کی طرح ناچتے ہوئے گھر لوٹتے دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے کمرے کے اندر آگئی۔

"سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے،" داماسو نے کہا۔ "بڈھے نے صبر شکر کر کے نئی گیندوں کا آرڈر بھی دے دیا ہے۔ اب صرف اس وقت تک انتظار کرنے کی ضرورت ہے جب تک لوگ یہ قصہ بھول نہیں جاتے۔"

"اور کالے کا کیا بنے گا؟"

"کیا بنے گا؟" داماسو نے کندھے اچکائے۔ "اگر اس کے پاس سے گیندیں برآمد نہ ہوں تو اسے رہا کرنے کے سوا کیا چارہ رہ جائے گا؟"

کھانے کے بعد وہ دونوں گھر کے سامنے والے دروازے کے آگے بیٹھ کر ہمسایوں سے باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ سنیما ہال کا لاؤڈ سپیکر بند ہو گیا۔ بستر میں دراز ہوتے وقت داماسو پر جوش تھا۔

"ابھی ابھی مجھے ایک نہایت زبردست کام کا خیال آیا ہے،" اس نے کہا۔

اس قصبے میں کوئی چور نہیں

آنا کو لگا جیسے وہ سورج غروب ہونے کے وقت سے اسی کام کے بارے میں سوچ بچار کر رہا تھا۔

"میں ایک قصبے سے دوسرے، اور دوسرے سے تیسرے تک سفر کرتا رہوں گا،" داماسو نے بات جاری رکھی، "اور ایک سے بلیرڈ کی گیندیں چرا کر دوسرے میں بیٹھا جاؤں گا۔ ہر قصبے میں بلیرڈ بال تو ہوتا ہی ہے۔"

"یہاں تک کہ کوئی تمہیں گولی مار دے گا۔"

"کیسی گولی؟" اس نے کہا۔ "وہ سب تو فلموں میں ہوتا ہے۔" کمرے کے درمیان میں کھڑا وہ اپنے ہی جوش و جذبے سے بے حال ہوا جا رہا تھا۔ آنا کپڑے بدلنے لگی۔ وہ بظاہر لائق تھی، لیکن دراصل گھری سمردانہ توجہ کے ساتھ اس کی باتیں سن رہی تھی۔

"میں سوٹوں کی ایک پوری قطار خریدوں گا،" داماسو نے ایک دیوار سے دوسری دیوار تک پھیلی ہوئی ایک خیالی الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "یہاں سے وہاں تک۔ اور پچاس جوڑی جوڑے۔"

"اگر خدا کو منظور ہوا تو،" آنا نے کہا۔

داماسو سنجیدگی سے آنا کو دیکھنے لگا۔

"تمہیں میرے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں،" اس نے کہا۔

"ان کا میرے حالات سے دور کا بھی واسطہ نہیں،" آنا نے جواب دیا۔ اس نے لیمپ بجا دیا، دیوار کے ساتھ لگ کر بستر پر لیٹ گئی اور واضح تلی سے بولی، "جب تم تیس برس کے ہو گے تو میں سینتالیس کی ہو جاؤں گی۔"

"فضول باتیں مت کرو،" داماسو نے کہا۔

وہ اپنی جیبوں میں دیاسلائی ڈھونڈ رہا تھا۔ "تمہیں لوگوں کے کپڑوں سے کشتی لڑنے کی ضرورت نہیں رہے گی،" اس نے قدرے چکرا کر کہا۔ آنا نے اس کے لیے ماچس کی تیلی جلائی اور اس وقت تک شعلے کو جلتا دیکھتی رہی جب تک وہ بجھ نہ گیا۔ تب اس نے تیلی زمین پر پھینک دی۔

داماسو بستر میں لیٹا، باتیں کرتا رہا۔

"پتا ہے بلیرڈ کی گیندیں کس چیز سے بنتی ہیں؟"

آنا نے کوئی جواب نہ دیا۔

"باتی دانت سے،" وہ کھتا رہا۔ "اور پتا ہے، وہ دنیا میں اتنی کم ہیں کہ انہیں منگوانے میں ایک مہینا لگتا ہے۔"

"سو جاؤ،" آنا نے قطع کلاوی کی۔ "مجھے صبح پانچ بجے اٹھنا ہے۔"

داماسو اب اپنے روزمرہ کے معمول کی جانب لوٹ چکا تھا۔ تمام دن وہ بستر میں لیٹے لیٹے گزارتا اور قیلوے کے بعد باہر جانے کے لیے تیار ہونے لگتا۔ رات کو وہ بلیئر ڈال میں بیٹھ کر بیس بال کی کھنٹری سنا کرتا۔ جتنے جوش و خروش سے وہ نت نئے منصوبے سوچتا تھا، اتنے ہی جوش و خروش سے انہیں فراموش بھی کر دیا کرتا تھا۔

سنیپر کے دن اس نے اپنی بیوی سے پوچھا، "تمہارے پاس کچھ رقم ہے؟"

"گیارہ پیسہ ہیں،" اس نے کہا، اور نرمی کے ساتھ اضافہ کیا، "مکان کا کرایہ۔"

"میں تمہارے ساتھ ایک سودا کرتا ہوں۔"

"کیا؟"

"وہ رقم مجھے ادھار دے دو۔"

"ہمیں کرایہ ادا کرنا ہے۔"

"بعد میں دے دیں گے۔"

آنا نے نفی میں سر ہلایا۔ داماسو نے اس کی کلائی دبوچ کر اسے اٹھنے سے روک دیا۔ وہ میز کے پاس بیٹھی تھی، جہاں ابھی دونوں نے ناشتہ ختم کیا تھا۔

"چند دنوں کی بات ہے،" اس نے پریشان ملامت سے اس کا بازو تھپتپایا۔ "گیندیں بیک جائیں گی تو ریل پیل ہو جائے گی۔"

آنا رضی نہ ہوئی۔

اس رات داماسو اسے فلم دکھانے لے گیا اور سارا وقت اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھے رہا حتیٰ کہ اُس وقت بھی جب وہ وقفے کے دوران میں اپنے دوستوں سے گفتگو میں مصروف تھا۔ فلم بھی انھوں نے توجہ سے نہ دیکھی۔ فلم ختم ہوئی تو داماسو بے تاب سا تھا۔

"تب تو مجھے کہیں ڈاکا مارنا پڑے گا،" اُس نے کہا۔

آنا نے کندھے اچکائے۔

"جو بھی پہلا شخص مجھے نظر آیا میں اُس کا بھیجا کال دوں گا۔" فلم سے باہر آنے والے مجھے میں داماسو اسے پیچھے سے دھکیل رہا تھا۔ "اور قتل کے جرم میں مجھے جیل بھیج دیا جائے گا۔" آنا اندر ہی اندر ہنستی رہی مگر مٹس سے مس نہ ہوئی۔ اگلی صبح، ایک طوفانی رات گزرنے کے بعد داماسو صریحی سرعت سے، اور آنا کو خوفزدہ کرنے کی نیت سے، باہر جانے کے لیے تیار ہوا۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ غرایا:

اس قصبے میں کوئی چور نہیں

"میری واپسی کی توقع نہ رکھنا۔"

آنانے خفیف سا ڈرموس کیے بغیر نہ رہ سکی۔

"خدا کرے تمہارا سفر اچھا کٹے،" اس نے بلند آواز میں دعا دی۔

دروازہ دھڑ سے بند ہونے کے وقت سے داماسو کے لیے اتوار کا خالی اور نہ ختم ہونے والا دن شروع ہوا۔ بڑے بازار میں بچے چمک دار برتن، اور رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس عورتیں، جو اپنے بچوں کو ہمراہ لیے آٹھ بجے کی عبادت کے لیے گرجے کی طرف روانہ تھیں، چوک کو ایک خوش کن تاثر دے رہی تھیں، لیکن گرمی کے باعث فضا میں گھٹن صبح سویرے ہی شروع ہو چکی تھی۔ داماسو نے سارا دن بلیر ڈال میں گزارا۔ صبح کے وقت لوگ گروہوں میں بیٹھے تاش کھیلتے رہے اور دوپہر کے کھانے سے قبل تھوڑی دیر کے لیے ہال میں گاہکوں کا خاصا ہیوم ہو گیا۔ لیکن یہ بات مسلم تھی کہ لوگوں کی نظر میں بلیر ڈال کی کش ختم ہو گئی تھی۔ صرف سورج ڈھلنے پر جب بیس ہال کی کھمٹری شروع ہوئی، تب بلیر ڈال کی تھوڑی بہت پرانی چمپ پھل اور زندگی دوبارہ دیکھنے میں آئی۔

بلیر ڈال کے بند ہونے پر داماسو کو احساس ہوا کہ اس کے پاس جانے کو کوئی جگہ نہیں ہے اور چوک میں سے تمام زندگی نچڑچکی ہے۔ اس نے گھاٹ کے متوازی سرک پر چلنا شروع کر دیا۔ کہیں دور سے خوش کن موسیقی کی آواز آرہی تھی، وہ اس جانب بڑھتا گیا۔ سرک کے اختتام پر ایک بہت وسیع لیکن خالی ناچ گھر تھا، جس کی کاغذ کے پھولوں سے سجاوٹ کی گئی تھی جن کے رنگ اڑ چکے تھے۔ اس کے ہال کے عقب میں لکڑی کے بنے پلیٹ فارم پر ایک بینڈ تھا۔ میک اپ کی دم گھونٹنے والی بو ہوا میں تیر رہی تھی۔

داماسو جا کر کاؤنٹر پر بیٹھ گیا۔ جب گانا ختم ہوا، مجیرے بجانے والا لڑکا ناچنے والوں کے درمیان پھر پھر کر ان سے کئے گئے کرنے لگا۔ ایک لڑکی اپنے ہم رقص کو ہال کے فرش پر اکیلا چھوڑ کر داماسو کی جانب بڑھی۔

"اور، جان من، کیا خبریں ہیں؟"

داماسو نے بیٹھنے کے لیے اسے اپنے ساتھ کی جگہ پیش کی۔ شراب فروش، چہرے پر پوڈر لگائے اور کان میں کارنیشن کا پھول اڑے، ان کے پاس آیا۔ باریک اور تیز آواز میں اس نے پوچھا۔

"کیا پیو گے؟"

لڑکی نے مڑ کر داماسو کی جانب دیکھا۔

"ہم کیا پیس گے؟"

"کچھ نہیں۔"

"پلو میں پلا دیتی ہوں۔"

"نہیں، یہ بات نہیں،" داماسو نے کہا۔ "مجھے بھوک لگی ہے۔"

"ہائے،" شراب فروش نے آدھ کر کہا۔ "اتنی خوبصورت آنکھوں والے بھی بھوکے؟"

داماسو اور وہ لڑکی دونوں اٹھ کر بال کے دوسرے سرے پر کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ جسم کی بناوٹ کے لحاظ سے لڑکی بہت ہی کم عمر لگ رہی تھی۔ لیکن سرخی پوڈر اور بناؤ سنگھار کی وجہ سے اس کی اصل عمر کا پتا لگانا ممکن تھا۔ کھانا کھانے کے بعد داماسو لڑکی کے پیچھے پیچھے اندھیرے برآمدے کے عقب میں ایک کمرے میں چلا گیا جہاں باہر سونے ہوئے جانوروں کے سانس لینے کی آواز ان کے کانوں میں آرہی تھی۔ بستر پر ایک شیرخوار بچہ لیٹا ہوا تھا جس کے جسم پر رنگ برنگے جیتھڑے لپٹے ہوئے تھے۔ لڑکی نے وہ جیتھڑے اٹھا کر لکڑی کے ایک صندوق میں ڈال دیے اور بچے کو ان کے اوپر لٹا کر صندوق فرش پر رکھ دیا۔

"چوبے اسے کاٹ کھائیں گے،" داماسو نے کہا۔

"نہیں، وہ اسے نہیں کاٹتے۔"

تب لڑکی نے جو سرخ لباس پہن رکھا تھا اسے اتار کر دوسرا بڑے بڑے پیلے پھولوں والا لباس پہن لیا جس کا گلا خاصا کھلا اور نیچا تھا۔

"اس بچے کا باپ کون ہے؟" داماسو نے دریافت کیا۔

"خدا جانے،" کہہ کر وہ دروازے کی جانب بڑھی۔ "میں ابھی آتی ہوں۔"

داماسو نے دروازے کی چٹخنی چڑھائے جانے کی آواز سنی۔ کپڑے پہنے پہنے بستر پر دراز ہو کر اس نے یکے بعد دیگرے کئی سگڑٹ پھونک ڈالے۔ بال میں بیٹنے والے ڈھولوں کی دھمک سے بستر کی کھانیاں تک جھنجھنا رہی تھیں۔ اسے پتا نہ چلا کہ اسے کس وقت نیند آگئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی، موسیقی بند ہو جانے کے سبب کمرہ پیلے کی نسبت بڑا اور کھلا کھلا لگ رہا تھا۔ لڑکی بستر کے قریب کھڑی اپنا لباس اتار رہی تھی۔

"کیا وقت ہوا ہے؟"

"چار بجے ہوں گے،" لڑکی نے کہا۔ "بچہ رویا تو نہیں؟"

"نہیں، میرے خیال میں تو نہیں،" داماسو نے جواب دیا۔

لڑکی بستر میں اس کے ساتھ، بہت ہی قریب لیٹ گئی۔ اس کی قمیص کے بٹن کھولتے

اس قصبے میں کوئی چور نہیں

ہوے وہ ایسی ٹکاہوں سے جو پوری طرح داماسو پر مرکوز نہ تھیں، اسے گھورتی رہی۔ داماسو کو احساس ہوا کہ لڑکی نے خاصی شراب پی رکھی ہے۔ اس نے بتی بجانے کی کوشش کی۔

"رہنے دو،" لڑکی نے کہا۔ "میں تمہاری آنکھوں کو دیکھتے رہنا چاہتی ہوں۔"

ٹڑکے کے بعد سے کمرہ ایسی آوازوں سے بھر گیا جیسی عموماً دیہاتوں میں آیا کرتی ہیں۔ بچے رونے لگا۔ لڑکی اسے اٹھا کر بستر میں لے آئی اور دودھ پلانے لگی۔ اس دوران میں وہ ایک سہل سی لوری بھی لگاتی رہی حتیٰ کہ وہ تینوں دوبارہ سو گئے۔ داماسو کو پتا ہی نہ چلا کہ سات بجے کے قریب لڑکی بیدار ہو کر کمرے سے باہر گئی تھی اور بچے کو کہیں چھوڑ آئی تھی۔

"سب لوگ گھاٹ پر جا رہے ہیں،" لڑکی نے کہا۔

داماسو کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ رات بھر میں ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں سویا۔

"کس لیے؟" اس نے پوچھا۔

"اس کا لے کو دیکھنے جس نے گیندیں چرائی تھیں،" لڑکی نے کہا۔ "آج وہ اسے کہیں آور

لے جا رہے ہیں۔"

داماسو نے سگریٹ سلگایا۔

"بے چارہ!" لڑکی نے آدھری۔

"بے چارہ کیوں؟" داماسو نے کہا۔ "اسے چوری کرنے کو کس نے کہا تھا؟"

لڑکی نے ایک لمحے کو اپنا سر اس کے سینے میں چھپایا۔ پھر آہستہ سے بولی:

"وہ چور نہیں ہے۔"

"کون کہتا ہے؟"

"مجھے پتا ہے،" لڑکی نے کہا۔ "جس رات بلیر ڈال میں چوری ہوئی، وہ گوریہ کے ساتھ تھا۔

حتیٰ کہ اس سے اگلے روز بھی وہ شام پڑنے تک اسی کے کمرے میں تھا۔ لیکن پھر پتا چلا کہ اسے

سنیہا بال میں سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔"

"تو گوریہ نے پولیس کو بتایا کیوں نہیں؟"

"کالے نے بتایا تھا۔ لیکن قصبے کا میسر گوریہ کے کمرے میں آیا، اس کا سارا سامان اُلٹ

پلٹ کر دیا اور اسے دھمکی دی کہ اسے بھی شریک جرم کے طور پر دھر لیا جائے گا۔ آخر کار بیس

پیسودے کر بے چاری نے اپنی جان چھڑائی۔"

اٹھ بجے داماسو اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں ردہ جاؤ،" لڑکی نے کہا۔ "آج دوپہر تمہارے لیے مرغاذب کر کے پکاؤں گی۔"

داماسو نے لنگھی کو اپنی پتلون کی جیب میں اُڑسنے سے پہلے ہتھیلی پر دو تین بار جھٹکا۔ "مشکل ہے،" اس نے لڑکی کو کھانسیوں سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچتے ہوئے کہا۔ لڑکی نے ابھی ابھی منہ دھویا تھا اور وہ واقعی بہت کم عمر تھی۔ اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں کی وجہ سے اس کے چہرے پر بے بسی کا تاثر تھا۔ وہ بازو داماسو کی کمر کے گرد حماہل کیے کھڑی رہی۔

"نہیں، یہیں رہ جاؤ،" لڑکی نے اصرار کیا۔

"ہمیشہ کے لیے؟"

لڑکی شرملا کر داماسو سے الگ ہو گئی۔

"مسخرہ!" اس نے کہا۔

آنا اس صبح تنگی ہوئی تھی، لیکن قصبے میں پھیلا ہوا جوش و خروش متعدی بیماری کی طرح اسے بھی لگ گیا۔ سابقہ دنوں کی نسبت اس ہفتے کی دھلائی اس نے زیادہ تیزی سے اٹھی کی، اور گھاٹ پر کالے کی روانگی کا منظر دیکھنے کے لیے چل دی۔ لوگوں کا بے صبرا جھوم دُغانی کشتیوں کے قریب منتظر تھا، جو روانہ ہونے والی تھیں۔ داماسو بھی وہیں تھا۔

آنا نے انگلیوں سے اس کے گردوں کے پاس ٹوکا دیا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" داماسو نے چونک کر پوچھا۔

"تمہیں خدا حافظ کہنے آئی تھی،" آنا نے کہا۔

داماسو نے نزدیک کے ایک کھمبے کو کس کر مٹکا لگایا۔

"لغت ہو تم پر،" اس نے کہا۔

سگریٹ سلا کر خالی بیگٹ اس نے دریا میں پھینک دیا۔ آنا نے ایک نیا بھرا ہوا بیگٹ اپنی اسکرٹ کے اندر سے نکال کر داماسو کی قمیص کی جیب میں ڈال دیا۔

"بھال ہے جو تم نے زندگی سے کچھ سیکھا ہو،" داماسو نے کہا۔

آنا زور سے ہنسی۔

تھوڑی دیر کے بعد کالے کو لا کر عرشے پر کھڑا کر دیا گیا۔ اسے چوک کے عین درمیان میں سے لے جایا گیا تھا اور اس کی کھانسیاں کمر کے پیچھے رسی سے بندھی ہوئی تھیں جسے پولیس کے ایک سپاہی نے باتھ میں تمام رکھا تھا۔ دو آور سپاہی بندوقیں اٹھائے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ کالے کا اوپر کا دھڑنٹا تھا، نچلا ہونٹ پٹھا ہوا تھا اور کسی کٹے باز کی طرح اس کی ایک آنکھ سوچی ہوئی تھی۔ وہ

اس قصبے میں کوئی چور نہیں

منفعل وقار کے ساتھ جہوم کے مذاق اور فقروں کو نظر انداز کر رہا تھا۔ بلیر ڈہال کے دروازے پر، جہاں اس تماشے کے دونوں حصے دیکھنے کے لیے زیادہ جہوم جمع تھا، بال کا مالک، خاموشی سے سر ہلاتے ہوئے، کالے کو گزرتا دیکھ رہا تھا۔ باقی لوگ ایک طرح کے اشتیاق سے اس پر نظر جمائے ہوئے تھے۔

کشتی فوراً ہی روانہ ہو گئی۔ کالا عرشے پر کھڑا تھا؛ اس کے ہاتھ پاؤں تیل کے ایک بڑے سے ڈرم کے ساتھ باندھ دیے گئے تھے۔ جب دریا کے درمیان میں پہنچ کر کشتی نے آخری بار سیٹی بجائی اور مٹی تو کالے کی کمرچمک اٹھی۔
 "بے چارہ،" آٹا نے سرگوشی کی۔

"جرائم پیشہ، حرام خور،" آٹا کے قریب ہی کسی نے پولیس والوں کو گالی دی۔ "کسی انسان کا جسم کتنی دیر تک دھوپ کی تپش سہہ سکتا ہے؟"
 داماسو نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ یہ آواز ایک بے حد موٹی عورت کی تھی۔ وہ چوک کی طرف چل دیا۔ "تم زیادہ ہی بکواس کرتی ہو،" اس نے آٹا کے کان میں سرگوشی کی۔ "چلتا چلتا کر سب کو ساری کہانی کیوں نہیں سنا دیتیں؟" وہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی بلیر ڈہال تک آئی۔
 "گھر چل کر کپڑے تو تبدیل کر لو،" اس سے جدا ہوتے وقت آٹا نے کہا۔ "فقیریوں جیسے لگ رہے ہو۔"

کالے کے واقعے کی بدولت بلیر ڈہال کے اندر بہت سے جوشیلے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ روک ان سب کو ایک ساتھ مشروبات فراہم کرنے کی کوشش میں کئی میزوں کے آرڈر اٹھے لے رہا تھا۔ داماسو منتظر رہا کہ کب روک اس کے قریب سے گزرے۔
 "میری مدد کی ضرورت ہے؟" داماسو نے پوچھا۔
 روک نے میسر کی آدھی درجن بوتلیں اس کے سامنے رکھ دیں۔ گلاس بوتلوں کے اوپر اوندھے رکھے تھے۔

"خدا تمہارا بھلا کرے،" روک نے کہا۔

داماسو بوتلیں اٹھا کر مختلف میزوں تک لے گیا اور دوپہر کے کھانے کے وقت تک، جب گاہک آخر کار گھروں کو روانہ ہو گئے، لوگوں کے آرڈر لیتا اور بوتلیں لٹا لے جاتا رہا۔ جب وہ گھر پہنچا، آٹا نے ایک ہی نظر میں جانپ لیا کہ اس نے پی رکھی ہے۔ اس نے داماسو کا ہاتھ اٹھا کر اپنے پھولے ہوئے پیٹ پر رکھا۔

"یہاں ممسوس کرو،" اس نے کہا۔ "کچھ حرکت ممسوس ہوئی؟"

داماسو نے کسی جذبے یا شوق کا اظہار نہ کیا۔

"اندروہ لاتین چلا رہا ہے،" آنا نے کہا۔ "ساری رات یہی کرتا رہتا ہے۔"

لیکن اس نے کوئی رد عمل نہ دکھایا۔ اپنے آپ میں گم، دوسرے روز وہ صبح سویرے ہی گھر سے باہر نکل گیا اور آدھی رات کے بعد لوٹا۔ پورا ہفتہ یوں ہی گزرا۔ جو چند لمبے وہ گھر میں بسر کرتا ان میں بھی بستر میں لیٹا سگریٹ چھوکتا رہتا اور گفتگو سے گریز کرتا۔ آنا نے بھی اپنے کام میں انہماک بڑھا دیا۔ ان دونوں کے تعلق کے آغاز میں بھی ایک موقع پر اس نے اسی طرح کا روزہ اختیار کر لیا تھا، لیکن تب آنا اسے اچھی طرح نہیں جانتی تھی اور اسے معلوم نہیں تھا کہ ایسے حالات میں داماسو کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ اس وقت داماسو نے اس کے پیٹ پر چڑھ کر اسے اتنی زور زور سے کٹے مارے تھے کہ وہ لولہمان ہو گئی تھی۔

اس بار وہ انتظار کرتی رہی۔ رات کو وہ لیپ کے نزدیک سگریٹوں کا ایک پیکیٹ رکھ دیا کرتی، کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ داماسو بھوک پیاس برداشت کر سکتا ہے مگر اسے سگریٹ کی طلب کی سہار نہیں۔ بالآخر، جولائی کے وسط میں ایک روز داماسو شام پڑتے ہی گھر لوٹ آیا۔ آنا اسے دیکھ کر سخت مضطرب ہوئی۔ اس کے اتنی جلدی گھر واپس آنے کا مطلب یہ تھا کہ اسے کوئی پریشانی لاحق ہے جس کے بارے میں وہ آنا سے بات کرنا چاہتا ہے۔ دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا، لیکن بستر میں داخل ہونے سے پہلے داماسو کھویا کھویا لگ رہا تھا اور نرمی سے باتیں کر رہا تھا۔ یک وقت اس نے کہا:

"میں جانا چاہتا ہوں۔"

"کہاں؟"

"کہیں بھی۔"

آنا نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ رسالوں کے سرورق جنہیں اس نے خود رسالوں سے اتار کر دیواروں پر چسپاں کیا تھا اور جن پر مختلف فلم اسٹاروں کی تصویریں تھیں، اب پھیکے اور بدرنگ ہو چکے تھے۔ اب اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ ان میں سے کتنے مرد بستر پر سے روزانہ لگاتار دیکھے جاتے رہنے کی وجہ سے اب نا سب ہو چکے ہیں اور جاتے جاتے اپنی تصویروں کے رنگ بھی ساتھ لے گئے ہیں۔

"مجھ سے اکتا گئے ہو؟" آنا نے پوچھا۔

"نہیں، یہ بات نہیں۔ اس قصبے سے اکتا گیا ہوں۔"

"باقی تمام قصبے بھی اسی جیسے ہیں۔"

اس قصبے میں کوئی چور نہیں

"گیندیں بھی نہیں بیچ سکتا۔"

"گیندوں کی فکر چھوڑو،" آنا نے کہا۔ "جب تک خدا نے مجھے کپڑوں سے کشتی لڑنے کی طاقت دے رکھی ہے، تمہیں کوئی خطرہ مول لیتے پھرنے کی کیا ضرورت ہے؟" پھر اس نے نرمی سے اصرافہ کیا، "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے یہ کام کیا کیوں؟"

بولنے سے پہلے داماسو نے سگریٹ ختم کیا۔

"وہ اتنا آسان کام تھا کہ مجھے تعجب تھا کہ کسی اور کو کیوں نہیں سوجھا،" اس نے کہا۔

"پیسے کی خاطر تو ٹھیک تھا،" آنا نے اعتراف کیا، "لیکن کوئی اور گیندیں چرانے کی حماقت نہ کرتا۔"

"وہ تو میں نے سوچے بغیر ہی کیا تھا،" داماسو نے کہا۔ "میں واپس آنے لگا تھا جب مجھے گیندیں کاؤنٹر کے پیچھے ایک ڈبے میں رکھی دکھائی دیں، اور میں نے سوچا اتنی محنت کے بعد خالی ہاتھ کیوں واپس جاؤں۔"

"یہی تمہاری غلطی تھی،" آنا نے کہا۔

داماسو کو کچھ اطمینان کا احساس ہوا۔ "اور نئی گیندیں آہی نہیں چکتیں،" وہ بولا۔ "بلکہ اب تو یہ پتا چلا ہے کہ وہ اور بھی مہنگی ہو گئی ہیں اس لیے روک نے آرڈر ہی منسوخ کر دیا ہے۔" اس نے ایک اور سگریٹ سلگایا، اور جیسے جیسے وہ باتیں کرتا گیا، اسے اپنے دل پر سے تیرہ خیالات کا بوجھ ہٹاتا ہوا محسوس ہوا۔

اس نے آنا کو بتایا کہ بال کا مالک بلیرڈ کی میز پر فروخت کرنے کے درپے ہے۔ میز زیادہ قیمتی نہیں تھی۔ نو آموز کھیلنے والوں کی بے ڈھنگی حرکتوں سے میز کا کپڑا کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا اور اس پر رنگارنگ کپڑوں کے پیوند لگے ہوئے تھے۔

میز کو مکمل نئے کپڑے کی ضرورت تھی۔ بال کے گاہکوں کے لیے، جو بلیرڈ کھیلتے کھیلتے بوڑھے ہوئے تھے، اس دوران میں سوائے بیس بال کی گھنٹری سننے کے اور کوئی شغل نہیں تھا۔

"سو،" داماسو نے اپنا بیان ختم کرتے ہوئے کہا، "نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے تمام قصبے کی حق تلفی کی ہے۔"

"اور کچھ حاصل بھی نہیں ہوا۔"

"اگلے ہفتے بیس بال کے مقابلے بھی ختم ہو جائیں گے،" داماسو نے کہا۔

"یہ تو اتنی پریشانی کی بات نہیں،" آنا نے کہا۔ "یہ سوچو کہ اُس بے چارے کا لے کا کتنا برا حشر ہوا ہے!"

جب وہ داما سو کے کندھے سے لگی بستر پر دراز تھی، جیسے اس کے ساتھ تعلقات کے اوائل میں کبھی ہوا کرتی تھی، اسے معلوم تھا کہ اس کا خاوند کیا سوچ رہا ہے۔ اس نے اس کے سگریٹ ختم کرنے کا انتظار کیا، تب محتاط آواز میں بولی:

"داما سو۔"

"ہاں، کیا بات ہے؟"

"گیندیس واپس کر دو۔"

اس نے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔

"میں خود کئی دن سے یہی سوچ رہا ہوں،" اس نے کہا۔ "مگر یہ پتا نہیں چل رہا کہ کیسے کروں۔"

انہوں نے طے کیا کہ گیندوں کو کسی ایسی جگہ رکھ دیا جائے جہاں لوگوں کا عام گزر ہو۔ مگر پھر آنا نے سوچا کہ اس حرکت سے بلیر ڈال کا مسئلہ تو حل ہو جائے گا مگر کالے کا معاملہ یوں ہی اٹھا رہے گا۔ پولیس والے پتا نہیں گیندوں کی برآمدگی سے کیا مطلب نکالیں اور کالے آدمی کو شک کا ذرا سا بھی فائدہ نہ دیں۔ اور یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ گیندیں کسی ایسے آدمی کے ہاتھ بھی لگ سکتی ہیں جو انہیں واپس کرنے کی بجائے خود بیچ کھانے کا ارادہ کر لے۔

"اگر یہ کام کرنا ہی ہے تو بہتر یہی ہو گا کہ اسے ٹھیک سے کیا جائے،" آنا نے بات مکمل کی۔

انہوں نے فرش کھود کر گیندیں نکالیں۔ آنا نے انہیں اخبار کے کانڈوں میں پیٹھا، ایسے کہ باہر کے کانڈ کی تھوں سے پیکٹ کے اندر ملفوف اشیا کی شکل کا اندازہ نہ کیا جاسکے، اور انہیں صندوق کے اندر رکھ دیا۔

"مناسب موقع کا انتظار ضروری ہے،" آنا نے کہا۔

لیکن اس مناسب موقع کا انتظار کرتے کرتے ہفتوں گزر گئے۔ بیس اگست کی رات کو، گیندوں کے چوری ہونے کے دو ماہ بعد، جب داما سو نے روک کو دیکھا تو وہ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا پینے سے مچھروں کو بھگانے میں مصروف تھا۔ ریڈیو بند ہونے کے باعث اُس کی تنہائی اور زیادہ شدید لگ رہی تھی۔

"میں نے تمہیں کیا بتایا تھا؟" روک نے یوں جیسے اپنی پیشین گوئی کے پورا ہونے پر مسرور ہو، داما سو سے کہا۔ "دیکھ لو، کاروبار کا کپڑا ہو گیا ہے!"

داما سو نے رکارڈوں کی مشین میں ایک سکھ ڈالا۔ گانے کی اونچی آواز اور مشین کے رنگوں کی

اس قصبے میں کوئی چور نہیں

نمائش داماسو کی نظر میں گویا اس کی اپنی وفاداری کا پُر شور ثبوت تھے۔ لیکن اس کا تاثر یہ تھا کہ یہ بات روک کے ذہن میں نہیں آتی تھی۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور اٹے سیدھے دلائل سے روک کی دہلوانی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن جوں ہی وہ کوئی دلیل دیتا، روک جذبہ باقی ہوئے بغیر اور اپنے ہاتھ کے نیچے کی اٹھل پتھر حرکت کا تواتر قائم رکھتے رکھتے اس کی دلیل کی دھجیاں اڑا دیتا۔

"گنچہ نہیں کیا جاسکتا،" وہ کہہ رہا تھا۔ "بیس بال کے مقابلے قیامت تک تو جاری نہیں رہ سکتے۔"

"ہو سکتا ہے گیندیں برآمد ہو جائیں۔"

"نہیں ہوں گی۔"

"وہ کالا انھیں کھا تو نہیں گیا ہوگا۔"

"پولیس نے ہر جگہ تلاشی لے لی تھی،" روک نے زچ کر دینے والے یقین کے ساتھ کہا۔

"اس نے انھیں دریا برد کر دیا ہے۔"

"معجزہ بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"بد بختی گھونگٹے کی رفتار سے چلتی ہے۔ تم معجزوں پر ایمان رکھتے ہو؟"

"ہاں، کبھی کبھار،" داماسو نے کہا۔

جب داماسو وہاں سے روانہ ہوا، اس وقت تک فلم ختم نہیں ہوئی تھی۔ لاؤڈ سپیکر پر طویل اور ٹوٹے پھوٹے مکالمے تاریک ہوتے ہوئے قصبے میں گونج رہے تھے۔ چند سکونت گاہیں جو ابھی کھلی تھیں عارضی سی لگ رہی تھیں۔ داماسو نے چند قدم سنیما ہال کی طرف اٹھائے لیکن پھر مڑ کر ناچ گھر کی طرف چل دیا۔

ناچ کے ہال میں بینڈ ایک اکیلے گاہک کے لیے، جس کے ساتھ دو عورتیں تھیں، دُھن بجا رہا تھا۔ باقی سب لوگ معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے دیواروں کے ساتھ یوں لگے بیٹھے تھے جیسے ڈاک کا انتظار کر رہے ہوں۔ داماسو بھی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور اس نے شراب فروش لڑکے کو اشارہ کیا کہ اسے ایک بیئر لادے۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں سے سانس لینے کے لیے رک رک کر بوتل ہی سے بیئر پیتا رہا اور اس شخص کو جو دو عورتوں کے ساتھ فرش پر ناچ رہا تھا، یوں دیکھتا رہا جیسے شیشے کی اوٹ سے دیکھ رہا ہو۔ وہ شخص قدمیں ان دونوں عورتوں سے چھوٹا تھا۔

آدھی رات کو وہ تمام عورتیں جو فلم دیکھنے گئی ہوئی تھیں، آہستہ آہستہ مردوں کا ایک گروہ ان کے تعاقب میں تھا۔ داماسو کی دوست لڑکی جو ان کے ہمراہ تھی، انھیں چھوڑ کر داماسو کے ساتھ آ بیٹھی۔

داماسو نے اس کی جانب نہ دیکھا۔ وہ اب تک بستر کی نصف درجن بوتلیں پی چکا تھا اور اس شخص کو گھورے جا رہا تھا جواب تین عورتوں کے ساتھ ناچ رہا تھا، لیکن ناچ کے دوران ان عورتوں کی نسبت اپنے پاؤں کی پیچیدہ حرکات پر زیادہ توجہ دے رہا تھا۔ وہ خوش دکھائی دے رہا تھا، اور یہ ظاہر تھا کہ اگر اس کے پاس ٹانگوں اور بازوؤں کے ساتھ ساتھ ایک دُم بھی ہوتی تو وہ اور زیادہ خوش ہوتا۔

"مجھے یہ آدمی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"
"تو اس کی طرف مت دیکھو،" لڑکی نے کہا۔

لڑکی نے بھی اپنے لیے شراب کا گلاس منگوایا۔ فرش ناچنے والے جوڑوں سے بھرنے لگا، لیکن تین عورتوں کے ساتھ ناچنے والے شخص نے اپنا ناچ جاری رکھا، جیسے وہ بال میں اکیلا ہو۔ ایک بار ناچ میں مڑتے ہوئے اس کی آنکھیں داماسو سے چار ہوئیں، اور وہ اور زیادہ شہود سے ناچنے لگا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور اس کے خرگوش جیسے دانت نظر آنے لگے۔ داماسو پلک جھپکائے بغیر اسے گھورتا رہا، حتیٰ کہ اس شخص کو بھی سنبیدگی اختیار کرنا پڑی اور اس نے اپنا سندھ پھیر لیا۔

"اس کا خیال ہے کہ وہ بہت خوش ہے،" داماسو نے کہا۔
"وہ واقعی بہت خوش ہے،" لڑکی نے کہا۔ "وہ جب بھی قصبے میں آتا ہے، دوسرے سفری تاجروں کی طرح یہاں کی موسیقی کے تمام اخراجات برداشت کرتا ہے۔"
داماسو نے اپنی نظریں اس شخص کی طرف سے ہٹا کر لڑکی کی طرف کیں۔
"تو تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟" اس نے کہا۔ "اس کے پاس جلی باؤ۔ جہاں تین کے لیے جگہ ہے، چار کے لیے بھی بن جائے گی۔"

داماسو کی بات کا جواب دیے بغیر لڑکی ناچ کے فرش کی طرف دیکھنے لگی اور گلاس سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتی رہی۔ زرد لباس اس کے شرمیلے پن کو اور نمایاں کر رہا تھا۔
اگلے ناچ داماسو اور لڑکی نے مل کر ناچا۔ جب ناچ ختم ہوا تو داماسو اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔
"میں تو بھوک سے مری جا رہی ہوں،" لڑکی بولی، اور داماسو کا ہاتھ پکڑ کر اُسے کاؤنٹر کی جانب لے چلی۔ "تمہیں بھی تو کھانا کھانا ہے۔" وہ خوش و خرم آدمی دوسری جانب سے اپنی تین عورتوں کے ہمراہ آتا دکھائی دیا۔

"اے، سنو،" داماسو نے اسے پکارا۔
وہ داماسو کی طرف دیکھ کر رُکے بغیر مسکرایا۔ داماسو نے اپنی ساتھی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اس آدمی کا راستاروک کر کھڑا ہو گیا۔

اس قصبے میں کوئی چور نہیں

"مجھے تمہارے دانتوں کی نمائش اچھی نہیں لگتی۔"

آدمی کا رنگ سفید پڑ گیا مگر وہ مسکراتا رہا۔

"مجھے خود بھی،" اس نے جواب دیا۔

پیشتر اس کے کہ لڑکی اسے روک سکتی، داماسو نے کس کر ایک مٹا اس آدمی کے جھڑپے پر ٹکا دیا۔ وہ آدمی فرش کے درمیان میں بیٹھ گیا۔ کسی اور گاہک نے مداخلت نہ کی۔ اُن تینوں عورتوں نے داماسو کو کمر سے جکڑ لیا اور چپخنے چلانے لگیں۔ داماسو کی دوست اسے دھکیل کر بال کی دوسری جانب لے گئی۔ وہ آدمی فرش پر سے اٹھا۔ کئے کی بدولت اُس کا منہ ٹیرٹا ہو رہا تھا۔ وہ بندر کی طرح اچلتا ہوا فرش کے وسط میں جا پہنچا اور بینڈ کو حکم دیا کہ موسیقی دوبارہ شروع کریں۔

دو بجے کے قریب بال تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ وہ تمام عورتیں جنہیں رات کے لیے گاہک نہیں لے تھے، اب بیٹھ کر کھانا کھانے لگی تھیں۔ داماسو کی دوست بھلیوں، تلے ہوئے گوشت اور چاولوں کی ایک قاب لے کر میز پر آئی اور چچ سے سارے کا سارا کھانا خود کھانے لگی۔ داماسو مدہوش سا بیٹھا اسے نکتا رہا۔ لڑکی نے چچ میں بھر کر ایک قلمہ اس کی طرف بڑھایا۔

"منہ کھولو۔"

داماسو نے ٹھوڑی جھکا کر سینے پر ٹکالی اور نفی میں سر ہلایا۔

"یہ عورتوں کی خوراک ہے۔ مردوں کی نہیں۔"

کھڑے ہونے کے لیے داماسو کو ہاتھوں سے میز کا سہارا لینا پڑا۔ جب اس کا جسمانی توازن درست ہوا، شراب فروش بازو سینے پر باندھے اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"نواسی پیو تمہارے ذمے نکلتے ہیں،" وہ بولا۔ "شراب مفت کی نہیں تھی۔"

داماسو نے اسے ایک جانب دھکیل دیا۔

"مجھے جھڑپے اچھے نہیں لگتے۔"

لڑکے نے اسے آستین سے دبوچ لیا، لیکن لڑکی کے اشارہ کرنے پر چھوڑ دیا، اور بولا:

"تمہیں ابھی بہت سی چیزوں کا مزہ معلوم نہیں ہے۔"

داماسو لڑکھڑاتا ہوا باہر آیا۔ دریا کی سطح پر چاند کی پراسرار چمک دیکھ کر اُس کے ذہن میں تابندگی کی ایک لکیر سی ابھری، لیکن فوراً ہی غائب ہو گئی۔ قصبے کے دوسرے سرے پر، اپنے گھر کے آگے پہنچ کر، اپنے دروازے کو دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ وہ نیند میں چل کر وہاں پہنچا ہے۔ اس نے سر کو دو تین بار جھٹکا اور پریشانی کے عالم میں اسے سرعت سے یہ احساس ہوا کہ اسے اگلا ہر قدم احتیاط کے ساتھ اٹھانا ہے۔ دروازے کو اس نے نہایت آہستگی سے دھکیلا تا کہ

قبضوں کی چرچراہٹ کی آواز نہ آئے۔

آنا کو احساس ہوا کہ وہ صندوق میں کچھ تلاش کر رہا ہے۔ لیمپ کی روشنی سے بچنے کے لیے اس نے بستر میں اپنا رخ دیوار کی جانب کر لیا، لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ اس کا خاوند کھڑے نہیں بدل رہا ہے۔ تب جیسے اس کے ذہن میں وجدان کا کوند الپکا اور وہ بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ داماو صندوق کے قریب ٹارچ اور گیندوں کا بیگٹ ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا۔ داماو نے انگلی ہونٹوں پر رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

آنا بستر میں سے کود کر باہر آئی۔ "تم پاگل ہو گئے ہو،" وہ بڑبڑائی اور دروازے کی طرف دوڑی۔ جلدی سے اس نے کندھی چڑھا دی۔ داماو نے ٹارچ اپنی پستوں کی جیب میں اڑھی، ساتھ ہی چھوٹا چاقو اور چند ریتیاں بھی جیب میں رکھیں، اور بیگٹ کو بغل میں دبائے دروازے کی جانب بڑھا۔ آنا دروازے سے پیٹھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"میرے جیتے جی تم باہر نہیں جا سکتے،" وہ آہستہ سے بولی۔

داماو نے اسے ایک طرف دھکیلنے کی کوشش کی۔ "پرے ہٹو،" اس نے کہا۔ آنا نے دروازے کے پانچوں کو دونوں ہاتھوں سے بکڑ لیا۔ پلکیں چپکائے بغیر دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ "تم بالکل گدھے ہو،" آنا نے سرگوشی کی۔ "خدا نے تمہیں خوبصورتی تو دے دی مگر دماغ دیتے وقت سخت کنجوسی سے کام لیا۔" داماو نے اسے بالوں سے پکڑ لیا اور اس کی کلائی مروڑنے لگا۔ آنا کا سر جھک گیا۔ بچنے ہوئے دانتوں کے ساتھ داماو نے ابے دھمکایا، "میں نے کہا ہے پرے ہٹ جاؤ۔" آنا نے سر موڑ کر آنکھ کے کونے سے اسے یوں دیکھا جیسے بل میں جُٹا ہوا بیل دیکھتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے آنا کو یوں محسوس ہوا جیسے اسے کوئی جسمانی ضرر نہیں پہنچا یا جا سکتا، اور وہ اپنے خاوند سے زیادہ طاقت ور ہے، لیکن داماو نے اس کے بالوں کو اتنے بل دیے کہ اُس کا گلا آنسوؤں سے رُند ہو گیا۔

"تم بچے کو مار ڈالو گے،" آنا نے کہا۔

کچھ گھسیٹتے اور کچھ بازوؤں میں اٹھائے ہوئے وہ آنا کو بستر تک لے گیا۔ لیکن جب اس نے اُسے چھوڑا تو وہ اس کی کمر پر سوار ہو گئی، اور اپنی ٹانگوں سے اسے بکڑ لیا۔ وہ دونوں بستر پر گر گئے۔ دونوں کا سانس پھول رہا تھا۔ "میں چیخنا شروع کر دوں گی،" آنا نے سرگوشی میں کہا۔ "تم یہاں سے ہلے تو میں چیخنا شروع کر دوں گی۔" داماو غصے میں پھٹکار رہا تھا۔ اس نے گیندوں کا بیگٹ اٹھا کر آنا کے گھٹنے پر مارا۔ آنا کے ہونٹوں سے ایک چیخ نکلی اور اس کی ٹانگوں کی گرفت دھیلی پڑ گئی، لیکن داماو کو دروازے تک جانے سے روکنے کے لیے وہ اس کی کمر سے چمٹ گئی۔ پھر اس نے التجا

اور منت سماجت شروع کر دی، "میں قسم کھاتی ہوں میں کل خود گیندیں وہاں لے جاؤں گی،" وہ کہہ رہی تھی، "اور وہاں ایسے چھوڑ کر آؤں گی کہ کسی کو پتا نہیں چلے گا۔" دروازے کی جانب گھسٹتے گھسٹتے داماسو اس کے ہاتھوں پر گیندوں کے پیکٹ سے ضربیں لگاتا رہا۔ وہ ایک لٹپٹے کے لیے اپنی گرفت ڈھیلی کرتی تاکہ چوٹ کے درد پر قابو پا سکے، لیکن پھر اس سے چمٹ جاتی اور التجائیں کرنے لگتی۔

"میں یہاں تک کہہ دوں گی کہ گیندیں میں نے چرائی تھیں،" وہ کہہ رہی تھی۔ "میری اس حالت میں کوئی مجھے جیل میں نہیں ڈالے گا۔"

بالآخر داماسو نے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ "سارا قصبہ تمہیں دیکھ لے گا،" آنا نے کہا۔ "تم اتنے بے وقوف ہو کہ تمہیں یہ بھی پتا نہیں کہ آج پورے چاند کی رات ہے۔" پیشتر اس کے کہ وہ چٹخنی کھولتا، آنا نے ایک بار پھر اسے پکڑ لیا اور آنکھیں بند کر کے اس کی گردن اور چہرے پر کٹے مارنے لگی۔ ساتھ ہی وہ چیخ بھی رہی تھی، "وحشی! درندہ!" جب داماسو نے مکوں کی بوچھاڑ سے اپنا چہرہ بچانا چاہا تو آنا نے لپک کر ایک ہاتھ سے چٹخنی کو قافہ میں کر لیا اور دوسرے سے کس کر مٹا اس کے سر پر لگا لیا۔ داماسو جب وار سے بچنے کے لیے جھکا تو چٹخنی اس کے شانے کی ہڈی سے ٹکرا کر یوں گونجی جیسے کھڑکی کے شیشے سے ٹکرائی ہو۔

"کتیا،" وہ زور سے چیخا۔

اس لمبے اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ وہ کتنا شور کر رہا ہے۔ ہاتھ کی پشت سے اس نے زور سے آنا کو کپٹی پر مارا اور اس کے درد سے کراہنے اور پورے جسم کے زور کے ساتھ دیوار سے ٹکرانے کو محسوس کیا، لیکن مڑ کر اسے دیکھے بغیر، دروازہ کھلا چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

درد اور تکلیف سے بے سدھ آنا فرش پر پڑی اپنے پیٹ میں کچھ ہونے کی منتظر رہی۔ دیواروں کی دوسری جانب سے ہمایوں نے اسے آواز دی جیسے کہیں قبر کے اندر سے بول رہے ہوں۔ اس نے اپنے رونے کی آواز روکنے کی خاطر ہونٹ کاٹ لیے۔ تب وہ فرش سے اٹھی اور کپڑے بد لے۔ اس کے ذہن میں بھی یہ خیال نہ گزرا، جیسے ماضی میں بھی ایک بار ایسے ہی ایک موقع پر نہیں گزرا تھا، کہ داماسو ہنوز کمرے کے باہر کھڑا اپنے آپ کو یہ احساس دلانے میں مصروف ہو گا کہ اس کا منصوبہ ناکام ہو چکا ہے اور وہ آنا کے تھوڑی دیر میں جینے پتے پکارے ہوئے باہر آنے کا منتظر ہو گا۔ آنا نے پرانی غلطی کا اعادہ کیا اور اپنے خاوند کے پیچھے باہر بھاگنے کی بجائے جوتے کپڑے پہن کر دروازہ بند کیا اور بستر پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔

دروازہ بند ہو جانے پر داماسو کو اندازہ ہوا کہ وہ واپس نہیں جا سکے گا۔ کتوں کے شور و غوغا نے

گلی کے آخر تک اس کا تعاقب کیا مگر اس کے بعد وحشت ناک خاموشی چھا گئی۔ وہ اپنے قدموں کی آواز کے خوف سے فٹ پاتھ پر پلٹنے سے گریز کر رہا تھا جو اس خوابیدہ قصبے میں مسیب اور انجانی لگ رہی تھی، لیکن بلیر ڈپال کے عقبی دروازے کے مقابل زمین کے خالی قطعے تک پہنچنے تک اس نے کسی احتیاط کا مظاہرہ نہیں کیا۔

اس بار اسے اپنی مارچ استعمال کرنے کی بھی ضرورت نہ پڑی۔ دروازہ جہاں سے ٹوٹا تھا صرف وہیں سے ٹھیک کیا گیا تھا۔ اینٹ کے حجم اور شکل کا لکڑی کا ٹکڑا نکال کر ایک نیا ٹکڑا دروازے میں نصب کر کے وہی پرانی کندھی اور قبضہ دوبارہ وہاں لگا دیا گیا تھا۔ باقی سب کچھ وہی تھا۔ دالماس نے بائیں ہاتھ سے تالے کو کھینچا اور رہتی کو کندھی کے ان قبضوں کے درمیان پھنسا دیا جو نئے نہیں تھے، اور قدرے زور سے، لیکن تشدد کے بغیر، رہتی کو موڑ کر گیسر کی طرح جھٹکے دینے لگا حتیٰ کہ لکڑی عمکین سی آواز کے ساتھ پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی اور قبضے باہر نکل آئے۔ دروازے کو دھکیلنے سے قبل اس نے اسے تھوڑا سا اونچا اٹھالیا تاکہ اس کے فرش پر گرے جانے کی آواز مدہم پڑ جائے۔ دروازہ اس نے صرف آدھا کھولا۔ اپنے جوتے اتار کر گیندوں کے پیکٹ کے ساتھ اندر گھسا دیے اور چاندنی سے روشن کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔

اس کے عین مقابل بوتلوں اور خالی ڈبوں سے بھرا ہوا ایک نیم تاریک برآمدہ تھا۔ آگے، چھت کے شیشے میں سے جھن کر آتی چاندنی میں بلیر ڈکی میز پڑی تھی، اس کے بعد الماریوں کی پشت تھی اور سب سے آخر میں، صدر دروازے کے سامنے چھوٹی چھوٹی کرسیوں اور میزوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ہر چیز، سوائے چاندنی کے سیلاب اور خاموشی کے خستہ پن کے، پچھلی باری کی طرح تھی۔ دالماس اب تک اپنے اعصاب کو قابو میں رکھے ہوئے تھا، لیکن اب آکر عجیب سحر میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس بار اس نے اکھڑی ہوئی اینٹوں کے بارے میں بھی احتیاط نہ کی۔ کھلے دروازے کے درمیان اس نے اپنے جوتے رکھ دیے اور چاندنی کو عبور کر کے مارچ جلائی اور کاؤنٹر کے عقب میں اُس چھوٹے سے ڈبے کو تلاش کرنے لگا جس میں گیندیں رکھی جاتی تھیں۔ یہ تمام کام وہ بغیر کسی احتیاط کے کر رہا تھا۔ مارچ کی ادھر ادھر گھومتی ہوئی روشنی میں اس نے گرد آلود شیشیاں، گھوڑے کی رکاب اور ممیز، موٹر کے تیل میں لتھڑی ہوئی گول کر کے رکھی ہوئی ایک قمیض، اور آخر کار وہ ڈبا دیکھا جس میں گیندیں رکھی جاتی تھیں۔ ڈبا عین اسی جگہ پڑا تھا جہاں پچھلی بار تھا۔ مارچ کی روشنی کو حرکت دیتے ہوئے وہ کاؤنٹر کے آخر تک لے گیا۔ وہاں وہی بلی تھی۔

بغیر کسی اسرار کے بلی نے اسے مارچ کی روشنی کے مقابل دیکھا۔ دالماس نے روشنی کی شعاع اس پر مرکوز رکھی حتیٰ کہ اسے قدرے خوف کے ساتھ یاد آیا کہ دن کے وقت اس نے کبھی بلی کو

اس قصبے میں کوئی چور نہیں

اس جگہ میٹھے نہیں دیکھا۔ اس نے شمع کو جھٹکا دے کر اور بجلی کو "بش" سمجھ کر بجھانے کی کوشش کی، مگر اس جانور پر اس حرکت کا مطلق کوئی اثر نہ ہوا۔ تب یک نعت اس کے ذہن میں ایک خاموش سادھما کا ہوا اور بجلی اس کے ذہن سے یکسر محو ہو گئی۔ جب تک وہ یہ باور کر سکتا کہ کیا واقعہ رونما ہوا ہے، مارچ اس کے ہاتھ سے گر چکی تھی اور وہ گیندوں کے پیکٹ کو سینے سے لٹائے کھڑا تھا۔ بال کی روشنیاں جل اٹھی تھیں۔

"خوب!"

اس نے روک کی آواز پہچان لی۔ وہ آہستہ آہستہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے گردوں میں گھری سٹکن اترتی آئی تھی۔ روک کمرے کے عقب سے چلتا ہوا اس کی جانب آیا، وہ زیر جامہ پہنے ہوئے تھا، اس کے ہاتھ میں لوہے کا سریا تھا اور اس کی آنکھیں بجلی کی روشنی سے چند حیا کی ہوئی تھیں۔ بوتلوں اور خالی ڈبوں والے برآمدے میں، جہاں سے داماسو گزر کر آیا تھا، ایک جھولنے والا بستر لٹکا ہوا تھا۔ یہ بستر پچھلی بار وہاں موجود نہیں تھا۔

داماسو سے تیس قدم کے فاصلے پر پہنچ کر روک تھوڑا سا اچھلا اور اپنا دفاع کرنے کے انداز میں کھڑا ہو گیا۔ داماسو نے اپنا ہاتھ جس میں گیندیں تھیں، کمر کے پیچھے چھپا لیا۔ روک نے ناک سکیرٹی اور سر آگے نکال کر عینک کے بغیر داماسو کو پہچاننے کی کوشش کی۔

"تم؟" وہ چلایا۔

داماسو کو لگایا جیسے کوئی لانتناہی بات آخر اپنے انجام کو پہنچ گئی ہو۔ روک سریلے کو جھکا کر چلتا ہوا داماسو کے قریب آیا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا، اور نقلی دانتوں کے بغیر اس کا چہرہ کسی عورت کا لگ رہا تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں،" داماسو نے جواب دیا۔

اس نے جسم کی خفیف، غیر محسوس سی حرکت سے پہلو بدلا۔

"یہ تمہارے پاس کیا ہے؟"

داماسو ایک قدم پیچھے ہٹا۔ "کچھ نہیں،" وہ بولا۔ روک کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ کانپنے لگا۔ "یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟" وہ چیخ کر بولا اور سریا ہاتھ میں اٹھائے اس کی طرف بڑھا۔ داماسو نے پیکٹ اس کے حوالے کر دیا۔ روک نے بائیں ہاتھ سے پیکٹ پکڑ لیا اور انگلیوں سے اسے جانچنے لگا۔ وہ اب بھی جو کس تھا۔ تب آخر کار اسے پتا چل گیا۔

"یہ ناممکن ہے!" اس نے کہا۔

وہ اتنا حیرت زدہ تھا کہ اس نے سر یا کاؤنٹر پر رکھ دیا اور تھوڑی دیر کے لیے دماسو کی موجودگی کو بھول کر بیسٹ کو کھولنے میں لگ گیا۔ خاموشی سے وہ گیندوں کو دیکھتا رہا۔
 "میں انہیں واپس رکھنے آیا تھا،" دماسو نے کہا۔

"یقیناً،" روک بولا۔

داماسو کا جسم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ شراب کا اثر اس کے جسم سے یکسر زائل ہو چکا تھا؛ اس کی زبان پر بھری سی گاد باقی تھی اور ذہن میں لکیلے پن کا مبہم احساس تھا۔ "تو یہ تباہ معجزہ!" روک نے گیندوں کو دوبارہ کاغذ میں لپیٹتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اتنے بے وقوف بھی ہو سکتے ہو۔" جب اس نے سر اوپر اٹھایا تو اس کے چہرے کا تاثر بدل چکا تھا۔

"اور میرے دو سو پیسے؟"

"دراز خالی تھی،" دماسو نے کہا۔ روک نے غور سے، خالی منہ چلاتے ہوئے دماسو کو دیکھا اور مسکرایا۔ "اچھا تو دراز خالی تھی،" اس نے کئی بار دوہرایا۔ "دراز میں کچھ نہیں تھا؟" اس نے سر یا پھر پکڑ لیا۔

"اس واقعے کی اطلاع تو میسر کو فوراً ملنی چاہیے۔"

داماسو نے اپنی ہتھیلیوں کا پسینا پتلون پر رگڑ کر خشک کیا۔

"تمہیں پتا ہے کہ دراز میں کچھ نہیں تھا۔"

روک مسکراتا رہا۔

"وہاں دو سو پیسے تھے،" اس نے کہا۔ "اور اب وہ رقم تمہاری چمڑی ادھیر کر نکالی جائے گی۔"

اس لیے نہیں کہ تم نے چوری کی تھی بلکہ اس لیے کہ تم جیسا احمق آج تک پیدا نہیں ہوا۔"

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ: آصف فرخی

بالتازار کی حیرت انگیز سہ پہر

پنجرہ تیار ہو چکا تھا۔ بالتازار نے اسے اپنی عادت کے مطابق چھتے سے لٹکا دیا اور جب دوپہر کا کھانا کھا کر واپس آیا تو لوگ کہہ رہے تھے کہ یہ دنیا کا خوبصورت ترین پنجرہ ہے۔ پنجرے کو دیکھنے کے لیے اتنے لوگ آئے کہ گھر کے سامنے مجمع لگ گیا، اور بالتازار کو اسے نیچے اتار کر دکان بند کرنی پڑی۔

"دارمھی بنا لو،" اس کی گھروالی اُرسلا نے کہا، "بالکل کا پوچین لگ رہے ہو!"

"مچانے کے بعد حمایت بنانا برا ہوتا ہے،" بالتازار نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر کوئی دوہفتے کی دارمھی بڑھی ہوئی تھی۔ گھوٹے کی آیال جیسے چھوٹے چھوٹے سنت اور کھردرے بال تھے اور چہرے پر سسے ہوئے لڑکے کا سا تاثر تھا۔ مگر یہ تاثر جھوٹا تھا۔ فروری میں وہ تیس سال کا ہو چکا تھا۔ چار سال سے وہ اُرسلا کے ساتھ رہا تھا؛ نہ اس سے شادی کی تھی نہ کوئی اولاد ہوئی تھی؛ زندگی نے اسے محتاط تو بنادیا تھا مگر ڈرایا نہیں تھا۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس نے ابھی ابھی جو پنجرہ مکمل کیا ہے وہ بعض لوگوں کے نزدیک دنیا کا خوبصورت ترین پنجرہ ہے۔ وہ بچپن سے پنجرے بنانے کا عادی تھا اور یہ پنجرہ اس کے لیے دوسرے پنجروں سے زیادہ مشکل ثابت

نہیں ہوا تھا۔

"پھر کچھ دیر آرام کر لو،" ارسلانے کہا، "اس دارمھی کے ساتھ تو تم کہیں بھی اپنا منہ نہیں دکھا سکتے۔"

آرام کرنے کے دوران کئی دفعہ اسے پڑوسیوں کی خاطر جھولنے سے اتر کر انہیں پنجرہ دکھانا پڑا۔ ارسلانے اس وقت تک پنجرے پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ وہ اس بات پر چڑھی ہوئی تھی کہ اس کے شوہر نے اپنی بڑھئی کی دوکان کو نظر انداز کر کے سارا وقت اس پنجرے میں لگا دیا، وہ دو بھتے سے چین کی نیند نہیں سویا، رات بھر کروٹیں بدلتا رہتا ہے، بڑبڑاتا رہتا ہے، اور اسے دارمھی مونڈنے کا خیال تک نہ آیا۔ مگر اس کی خفگی پنجرے کو دیکھ کر بڑا ہو گئی۔ بالتازار نیند لے کر اٹھا تو وہ اس کے لیے پتلون اور قمیص پر استری کر چکی تھی؛ اس نے انہیں جھولنے کے پاس کر سی پر رکھ دیا تھا اور پنجرے کو کھانے کی میز پر لے گئی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی پنجرے کو گھور رہی تھی۔

"اس کے کیا دام لگاؤ گے؟" وہ پوچھنے لگی۔

"معلوم نہیں"، بالتازار نے جواب دیا، "تیس پیسہ مانگوں گا تاکہ بیس تو مل جائیں۔"
"پچاس مانگو!" ارسلانے کہا، "دو بھتے تم نے اپنی نیندیں حرام کی ہیں، اور پھر یہ بڑا بھی بہت ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں اس سے بڑا پنجرہ نہیں دیکھا۔"
بالتازار دارمھی مونڈنے لگا۔

"تمہارے خیال میں وہ مجھے اس کے پچاس پیسہ دیں گے؟"

"جیسے موتی مکمل صاحب کے لیے تو یہ کوئی بات ہی نہیں۔ اور یہ پنجرہ واقعی اس لائق ہے،" ارسلانے کہا۔ "تمہیں ساڑھے مانگنے چاہییں۔"

گھر پر گھٹی گھٹی چھاؤں پھیلی ہوئی تھی۔ اپریل کا پہلا بھفتہ تھا اور مڈوں کی چرچراہٹ کی وجہ سے گرمی اور بھی ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ کپڑے بدل کر بالتازار نے صحن کے کوارٹھکھول دیے کہ مکان ٹھنڈا جائے، اور بچوں کی ٹولی گھر میں گھس آئی۔

پنجرے کی خبر پھیل چکی تھی۔ بورٹھا معلق ڈاکٹر اوکتا ویو حیرالودو، زندگی سے مطمئن لیکن اپنے پیشے سے بے زار، اپنی مفلوج بیوی کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھاتے ہوئے اس پنجرے کے بارے میں سوچتا رہا۔ اندر برآمدے میں، جہاں گرم دنوں میں وہ میز بچھالیا کرتے تھے، پھولوں کے بہت سے گٹلے رکھے ہوئے تھے، اور دو پنجرے تھے جن میں سنہری پروں والی کیمری چڑیاں پکی ہوئی تھیں۔ اس کی بیوی کو پرندے بہت پسند تھے، اور اس حد تک پسند تھے کہ اسے بلیوں

سے نفرت ہو گئی تھی، کیوں کہ بلیاں پر ندوں کو کھاجاتی ہیں۔ اُس کے بارے میں سوچتے سوچتے ڈاکٹر حیر الدو دوپہر کے وقت ایک مریض کو دیکھنے گیا، اور واپسی میں بالتازار کے گھر کی طرف ہوتا گیا کہ پنجرے کا معائنہ کر لے۔

کھانے کے کمرے میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ میز پر پنجرہ نمائش کے لیے رکھا ہوا تھا۔ تار کا بنا ہوا بے حد بڑا گنبد، تین متر لیں، راستے، الگ الگ خانے، سونے اور کھانے کے خانے الگ، اور چڑیوں کے لیے ایک مخصوص جگہ میں محولے بھی لگے ہوئے۔ یہ پنجرہ چھوٹے پیمانے پر کسی دیو میکمل برف کے کارخانے کا نمونہ معلوم ہوتا تھا۔ ڈاکٹر نے بہت غور سے اس کا معائنہ کیا، جھوٹے بغیر، اور یہ سوچتا رہا کہ جیسا سا تھا پنجرہ اس سے بھی بہتر تھا۔ اتنا خوبصورت کہ اپنی بیوی کے لیے اس نے کبھی ایسے پنجرے کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔

"یہ تو تخیل کی کار فرمائی کا نمونہ ہے،" اس نے کہا۔ اس نے لوگوں کے جھوم میں بالتازار کو ڈھونڈ نکالا اور مادرانہ شفقت سے بھرپور نظریں اس پر جماتے ہوئے کہا، "تم تو غیر معمولی ماہر تعمیر ثابت ہوتے۔"

بالتازار کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"شکریہ،" اس نے کہا۔

"یہ بالکل سچ ہے،" ڈاکٹر نے کہا۔ وہ گول مٹول تھا اور اس کے مٹاپے میں کسی عورت کی سی نزاکت تھی جو اپنی جوانی میں حسین رہی ہو، اور اس کے ہاتھ بہت نازک تھے۔ اس کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی پادری لاطینی بول رہا ہو۔ "تھیں اس میں چڑیاں پالنے کی بھی ضرورت نہیں،" اس نے کہا، اور پنجرہ حاضرین کی نظروں کے سامنے گھمانے لگا جیسے اس کا نیلام کر رہا ہو۔ "اے تو بس پیڑ میں لٹکا دو اور یہ خود بخود چھپانے لگے گا۔" اس نے پنجرہ واپس میز پر رکھ دیا؛ ایک لمحے کو سوچا، پنجرے کی طرف دیکھا اور کہا:

"ٹھیک ہے، پھر میں اسے لے لوں گا۔"

"یہ بک چکا ہے،" ارسلہ بولی۔

"یہ جیسے موتی کی شکل صاحب کے بیٹے کا ہے،" بالتازار نے کہا۔ "اس نے خاص طور پر آرڈر

دیا تھا۔"

ڈاکٹر یہ سنتے ہی باآدب ہو گیا۔

"اس کا نمونہ اسی نے تھیں دیا تھا؟"

"نہیں،" بالتازار نے کہا۔ "اس نے تو یہ کہا تھا کہ اے بڑا سا پنجرہ چاہیے، تو پیالوں

کے جوڑنے کے لیے۔"

ڈاکٹر نے پنجرے کی طرف دیکھا۔

"مگر یہ تروپیالوں کے لیے نہیں ہے۔"

"اور کیا؟ بالکل ہے!" ہاتھ ازار نے میز کے قریب آتے ہوئے کہا۔ بچے اس کو گھیرے ہوئے تھے۔ "اس کی پیمائش کا بڑی احتیاط سے حساب لگایا گیا ہے،" اس نے انگلی سے مختلف خانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے پنجرے کے گنبد پر انگلیوں کے گنتوں سے چوٹ لگائی اور سارے پنجرے میں سر گونجنے لگے۔

"اس سے زیادہ مضبوط تار مل نہیں سکتا، اور ہر جوڑ پر اندر باہر لوہے کا ٹاٹا لگایا گیا ہے،" اس نے کہا۔

"یہ تو توتے کے لیے بھی کافی ہوگا،" بچوں میں سے کوئی بولا۔

"بالکل!" ہاتھ ازار نے کہا۔

ڈاکٹر نے گھوم کر دیکھا۔

"ٹھیک ہے، لیکن اس نے تمہیں یہ نمونہ تو نہیں دیا تھا،" اس نے کہا۔ "اس نے تمہیں کوئی ہدایات تو نہیں دی تھیں، سوا اس کے کہ اتنا بڑا پنجرہ بنا دو جو دو تروپیالوں کے لیے کافی ہو۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے،" ہاتھ ازار نے کہا۔

"بس پھر کوئی مسئلہ نہیں،" ڈاکٹر نے کہا۔ "ایک چیز موبی تروپیالوں کے لیے بڑا سا پنجرہ۔ اور یہ پنجرہ جو تم نے بنایا ہے یہ دوسری چیز ہے۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ وہی پنجرہ ہے جو تم سے بنانے کے لیے کہا گیا تھا۔"

"یہی تو ہے وہ!" ہاتھ ازار نے پریشان ہو کر کہا۔ "اسی وجہ سے تو میں نے بنایا تھا۔"

ڈاکٹر نے بے صبری سے ہاتھ ہلا دیا۔

"تم ایک اور بنا لیتا،" اُس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، اور پھر ڈاکٹر سے کہنے لگی، "آپ کو جلدی تو نہیں ہے؟"

"میں نے اپنی بیوی سے آج دوپہر کا وعدہ کیا تھا،" ڈاکٹر نے کہا۔

"مجھے بہت افسوس ہے ڈاکٹر صاحب!" ہاتھ ازار بولا، "مگر میں آپ کے ہاتھ اسی چیز نہیں فروخت کر سکتا جو پہلے ہی بک چکی ہو۔"

ڈاکٹر نے اپنے کندھے اچکائے۔ رومال سے گردن کا پسینا پونچھتے ہوئے وہ اس طرح

بالتازار کی حیرت انگیز سہ پہر

خاموشی کے ساتھ پنجرے کو نکلنے لگا جیسے وہ شخص جو گھٹکی باندھ کر دھندلی نظروں سے جہاز کو سمندر میں دور جاتا دیکھ رہا ہو۔

"انہوں نے تمہیں اس کے کتنے پیسے دیے ہیں؟"

بالتازار نے جواب دیے بغیر ارسلہ کی طرف دیکھا۔

"ساتھ پیسہ،" وہ بولی۔

ڈاکٹر پنجرے کو دیکھتا رہا۔ "بہت خوب صورت ہے!" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "حد سے زیادہ خوب صورت۔" دروازے کی طرف جاتے ہوئے وہ بہت مستعدی سے اپنے آپ کو پہنچا جھلنے اور مکرانے لگا، اور اس واقعے کے تمام نشان اس کی یادداشت سے ہمیشہ کے لیے مٹ گئے۔

"مونتینیل کے پاس بہت پیسہ ہے،" اس نے کہا۔

سچ پوچھو تو حوزے مونتینیل اتنا پیسے والا تھا نہیں جتنا نظر آتا تھا، مگر وہ دولت حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ وہاں سے چند گلیاں آگے، سازو سامان سے آٹے ایک گھر میں، جہاں کسی نے آج تک ایسی بونہیں سوئچی تھی جو برائے فروخت نہ ہو، وہ پنجرے کی اطلاع سے لا تعلق رہا۔ اس کی بیوی نے، جسے موت کا خوف دن رات عذاب میں مبتلا رکھتا تھا، دوپہر کے کھانے کے بعد دروازے کھڑکیاں بند کر دیں اور اپنی آنکھیں کمرے کے سائے پر جمائے ہوئے دو گھنٹے کے لیے لیٹ گئی، اور حوزے مونتینیل قیلوہ کرنے لگا۔ اس کی بیوی کو کئی آوازوں کے شور نے چوٹا دیا۔ وہ اٹھ کر بڑے کمرے کا دروازہ کھولنے لگی اور دیکھا کہ گھر کے سامنے مجمع لگا ہوا ہے اور مجمع کے درمیان بالتازار پنجرہ لیے، اُبلے کپڑے پہنے، داڑھی بنائے اور چہرے پر خوش سلیقہ بے باکی کا وہ تاثر لیے کھڑا ہے جو غریب غربا کے چہروں پر اس وقت آ جاتا ہے جب وہ کسی دولت مند کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔

"کیا عمدہ چیز ہے!" حوزے مونتینیل کی بیوی پکار اٹھی، اور اس کا چہرہ جگمگا اٹھا۔ اس نے خوشی خوشی بالتازار کو اندر بلا لیا۔ "میں نے زندگی میں ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی۔" لیکن دروازے پر جمع ہونے والی بجیرے چڑکر یہ بھی کہا:

"اندر لے آؤ اے، اس سے پہلے کہ یہ لوگ کمرے کو گھر دوڑ کر تماشا گاہ بنا دیں۔"

حوزے مونتینیل کے گھر کے لیے بالتازار اجنبی نہ تھا۔ مختلف موقعوں پر اسے اس کی مہارت اور معاملے کا پکا ہونے کی وجہ سے بڑھئی کے چھوٹے موٹے کام کاج کے لیے یہاں بلایا جا چکا تھا۔ مگر اسے دولت مند لوگوں کے درمیان بے چینی جوتی تھی۔ وہ ان کے بارے میں سوچا

کرتا، ان کی بد صورت جھنکی بیویوں کے بارے میں، ان ہولناک بیماریوں کے بارے میں جو ان لوگوں کو لاحق رہتیں، اور اس کے اندر رحم کا جذبہ بیدار ہو جاتا۔ جب وہ ان کے گھروں میں داخل ہوتا تو پیر گھسیٹے بغیر نہیں چل سکتا تھا۔

"پیسے گھر پر ہے؟"

اس نے پنجرہ کھانے کی میز پر ٹکا دیا۔

"وہ اسکول گیا ہوا ہے،" حوزے مونیٹل کی بیوی نے کہا، "مگر آج ہی ہو گا۔" اور ساتھ ہی وہ یہ بھی کہنے لگی، "مونیٹل نہ رہا ہے۔"

اصل میں مونیٹل کو نہانے کی مہلت نہیں ملی۔ وہ جلدی جلدی اپنے بدن پر الکل ملنے لگا کہ جا کر دیکھے کیا ہو رہا ہے۔ وہ اس قدر محتاط آدمی تھا کہ بجلی کا پینچا پلائے بغیر سوتا تھا تاکہ گھر کی ایک ایک آواز پر کان دھر سکے۔

"ایڈیلیدے! وہ چلایا۔" کیا ہو رہا ہے؟

"بابر آر دیکھو کیا شاندار چیز ہے!" اس کی بیوی نے پکار کر کہا۔

حوزے مونیٹل، موٹا تازہ اور تھمرا سا آدمی، گردن پر تولیا ڈالے خواب گاہ کی کھرکی میں نمودار ہوا۔

"یہ کیا ہے؟"

"پیسے کے لیے پنجرہ،" بالتازار نے کہا۔

مونیٹل کی بیوی حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کس کا؟"

"پیسے کا،" بالتازار نے جواب دیا، اور پھر حوزے مونیٹل کی طرف مڑ کر کہا، "پیسے نے

اس کا آرڈر دیا تھا۔"

اس لمحے کچھ نہیں ہوا، مگر بالتازار کو یوں لگا جیسے کسی نے اس پر غسل خانے کا دروازہ

کھول دیا ہو۔ حوزے مونیٹل خواب گاہ سے زیر جامہ پہنے ہوئے نکلا۔

"پیسے!" وہ دہرایا۔

"وہ ابھی نہیں آیا،" اس کی بیوی نے سرگوشی کی۔ وہ دم سادھے کھڑی تھی۔

پیسے دروازے میں نمودار ہوا۔ وہ کوئی بارہ سال کا بوجا، اور اُس کی ویسی ہی مڑی ہوئی گھنٹی

پلکیں اور قابل رحم انداز تھا جو اُس کی ماں کا تھا۔

"یہاں آؤ!" حوزے مونیٹل نے اس سے کہا۔ "اس کا آرڈر تم نے دیا تھا؟"

بچے نے سر جھکا لیا۔ اس کو بالوں سے پکڑ کر حوزے مونتینل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"میری بات کا جواب دو۔"

بچے نے کچھ کہنے بغیر اپنا مونٹ دانتوں میں دبالیہ۔

"مونتینل! اس کی بیوی نے سرگوشی کی۔"

مونتینل نے بچے کو چھوڑ دیا، اور غضب ناک ہو کر بالتازار کی طرف مڑا۔ "مجھے افسوس ہے بالتازار،" اس نے کہا، "لیکن کام کرنے سے پہلے تمہیں مجھ سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔ یہ تمہارے ہی دماغ میں آ سکتی تھی کہ نابالغ سے معاہدہ کر لو۔" اور یہ کہتے کہتے اس کے چہرے پر سکون لوٹ آیا۔ اس نے پنجرہ اٹھایا اور دیکھے بغیر بالتازار کو پکڑا دیا۔

"اے فوراً لے جاؤ، اور جس کے ہاتھ بچ سکتے ہو بچ ڈالو،" اس نے کہا۔ "اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میری درخواست ہے مجھ سے بحث نہ کرنا۔" اس نے بالتازار کی پیٹھ تھپتھپائی اور اسے سمجھایا، "ڈاکٹر نے مجھے غصہ کرنے سے منع کیا ہے۔"

بچہ بالکل ساکت کھڑا تھا اور پلک تک نہیں جھپکا رہا تھا، کہ بالتازار نے ہاتھ میں پنجرہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر بچے کے حلق سے ایک آواز نکلی، کتے کے غرائز جیسی، اور وہ فرش پر گر کر چیخنے لگا۔

حوزے مونتینل نے کوئی اثر قبول کیے بغیر اسے دیکھا، اور ماں اسے چپ کرانے لگی۔ "اے اٹھاؤ بھی مت!" اس نے کہا، "اے فرش پر اپنا سر پھوڑ لینے دو، پھر اس پر لیموں اور نمک تعویذ دیتا تاکہ دل بھر کے روپیٹ لے۔" بچہ آنسو بہائے بغیر چلا رہا تھا اور اس کی ماں اسے کلانیوں سے پکڑے ہوئے تھی۔

"اے چھوڑ دو!" حوزے مونتینل نے اصرار کیا۔

بالتازار بچے کو یوں دیکھتا رہا جیسے سگ گزیدہ جانور کی جاں کنی کا عالم دیکھ رہا ہو۔ چار بج رہے تھے۔ اس گھر میں اس کے گھر میں اُسلا ایک بہت ہی پرانا گیت گاربی تھی اور پیاز کے چھلکے اتار رہی تھی۔

"پپے!" بالتازار نے کہا۔

وہ مسکراتا ہوا بچے کے پاس آیا اور پنجرہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ بچہ اچھلا اور پنجرے سے لپٹ گیا، جو قد میں تقریباً اس کے برابر تھا۔ وہ اس کے تاروں میں سے بالتازار کو جھانکتا رہا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہیں نکلا تھا۔

"بالتازار!" حوزے مونیٹل نے دھیسے لمبے میں کہا، "میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اے لے جاؤ۔"

"واپس دو!" اس کی بیوی نے بچے سے کہا۔

"رکھ لو!" بالتازار نے کہا۔ اور پھر حوزے مونیٹل سے بولا، "بتایا تو میں نے اسی کے لیے تھا۔"

حوزے مونیٹل اس کے چپھے چپھے بڑے کمرے میں آ گیا۔

"بے وقوف مت بنو بالتازار!" اس نے راستاروک کر کہا، "اپنا یہ ٹیم ٹماق اٹھا کر اپنے گھر لے جاؤ۔ میں تمہیں ایک دھیلا بھی دینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔"

"کوئی بات نہیں!" بالتازار نے کہا۔ "میں نے یہ خاص طور پر پیسے کو تحفہ دینے کے لیے بنایا تھا۔ میں اس کے دام وصول کرنے کی توقع بھی نہیں رکھتا۔"

جب بالتازار ہجوم میں سے راستا بناتا ہوا واپس جا رہا تھا تو حوزے مونیٹل کمرے میں کھڑا ہوا چیخ رہا تھا۔ اس کا رنگ ارگیا تھا اور اس کی آنکھیں سرخ ہونے لگی تھیں۔

"احمق!" وہ چلا رہا تھا، "اپنا یہ کھلونا لے جاؤ یہاں سے۔ ہمیں نہیں ضرورت کہ کوئی ہمارے گھر میں آکر ہم پر حکم چلائے۔ کتنے کے بچے!"

سنا گھر میں بالتازار کا باقاعدہ استقبال ہوا۔ اب تک اس نے یہی سوچا تھا کہ اس نے پہلے سے بہتر پنجرہ بنایا ہے اور حوزے مونیٹل کے بیٹے کو دے دیا ہے کہ وہ روتا نہ رہے، اور ان

میں سے کوئی بات بھی بہت اہم نہیں تھی۔ مگر پھر اسے احساس ہوا کہ ان سب باتوں کی بہت سے لوگوں کے نزدیک خاصی اہمیت تھی، اور وہ کچھ پرجوش ہو گیا۔

"تو انھوں نے تمہیں پنجرے کے پچاس پیسے دیے؟"

"ساتھ،" بالتازار نے کہا۔

"تم نے خوب کام کر دکھایا،" کسی نے کہا۔ "تم واحد شخص ہو جو مونیٹل صاحب سے اتنی بڑی رقم وصول کر سکے ہو۔ اس کا جشن منانا چاہیے۔"

انھوں نے اسے بیئر لاکر دی، اور بالتازار نے سب کے لیے ایک ایک گلاس کا آرڈر دے دیا۔ اب چون کہ یہ پہلی دفعہ تھی جو وہ باہر پیسے نکالتا تھا تو ٹھٹ پٹے کے وقت تک بالکل دھت ہو گیا اور نہایت عظیم الشان منصوبے کی باتیں کرنے لگا جس میں ایک ہزار پنجرے تھے، ساٹھ پیسے

کا ایک، پھر ایک لاکھ پنجرے، اور اس کے پاس ساٹھ لاکھ پیسے آ گئے۔ "ہمیں بہت سی چیزیں

بنانی ہیں، امیروں کے ہاتھ پیچنے کے لیے، اُن کے مرنے سے پہلے۔" تھے میں دھت وہ کہہ رہا

تھا۔ "وہ سب بیمار ہیں، وہ مر جائیں گے۔ وہ اس قدر مشکل میں ہیں کہ غصہ بھی نہیں کر سکتے۔" وہ دو گھنٹے سے جیوک باکس کی موسیقی کے دھام ادا کیے جا رہا تھا، اور موسیقی مسلسل بچے جا رہی تھی۔ تمام لوگوں نے بالتازار کی صحت، خوش قسمتی اور امیروں کی موت کے لیے جام تجویز کیے اور پی گئے، لیکن کھانے کا وقت آیا تو سب اسے سٹاگھر میں اکیلا چھوڑ گئے۔

ارسلا آٹھ بجے تک، تلے ہوئے گوشت پر پیاز کے قتلے سجائے، بیٹھی اس کی راہ دیکھتی رہی۔ کسی نے اسے بتایا کہ اس کا شوہر سٹاگھر میں ہے اور خوشی کے مارے بدحواس ہو کر سب کو میسر خرید کر پلا رہا ہے، مگر ارسلا نے یقین نہیں کیا، کیونکہ بالتازار نے کبھی نشہ نہیں کیا تھا۔ جب آدھی رات کے قریب وہ بستر میں لیٹ گئی تو اس وقت بالتازار ایک روشن کمرے میں تھا جہاں چھوٹی چھوٹی میزیں بچھی ہوئی تھیں اور ہر میز کے ساتھ چار کرسیاں، اور باہر کھلی رقص گاہ تھی جہاں پلوور پرندے پھدک رہے تھے۔ اس کے چہرے پر غازہ پھیل گیا تھا، اور چوں کہ وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا تھا تو اسے خیال آیا کہ وہ دو عورتوں کے ساتھ ایک ہی بستر میں لیٹ جائے۔ اس نے اتنے پیسے خرچ کیے تھے کہ وہاں سے جانے کے لیے اسے اپنی گھڑی گروی رکھ کر اگلے دن ادائیگی کا وعدہ کرنا پڑا۔ اگلے ہی لمحے گلی میں دھیر پڑے پڑے اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے جوتے اتار رہا ہے، مگر اس کا جی نہیں چاہا کہ اپنی زندگی کے حسین ترین خواب سے چوٹ لے۔ صبح پانچ بجے والی عبادت کے لیے گرجے جانے والی عورتوں کو وہاں سے گزرتے ہوئے ہمت نہیں پڑی کہ اس کی طرف دیکھ لیں، اس خیال سے کہ وہ مرا ہوا پڑا ہے۔

گا بریتل گارسیا مارکیز

ترجمہ: فاروق حسن

مونتینیل کی بیوہ

حوزے مونتینیل کے مرنے پر، اُس کی بیوی کے سوا، ہر شخص نے ایک پُرکینہ اطمینان محسوس کیا، لیکن ہر شخص کو یہ باور کرنے میں کئی گھنٹے لگے کہ وہ واقعی مر چکا ہے۔ کئی لوگوں کو تو اُس کی نقش کو گرمی سے تپے کمرے میں، تربوز کی طرح گول کیے ہوئے کناروں والے پتلے تابوت میں لہن کی چادروں میں لپٹے اور تکیوں کے سہارے لیٹے ہوئے دیکھنے کے بعد بھی اُس کی موت کا یقین نہیں آیا۔ اس کی دارمعی نہایت اچھی طرح شیو کی گئی تھی اور سفید کپڑوں میں ملبوس، چمک دار نقلی چمڑے کے جوتے پہنے، وہ اتنا صحت مند اور زندہ لگ رہا تھا کہ زندگی بھر نہ لگا تھا۔ یہ شخص وہی پیسے مونتینیل صاحب تھا جو ہر اتوار کو گرے میں آٹھ بجے صبح کی عبادت کے لیے موجود ہوتا تھا، صرف اس موقع پر اُس نے ہاتھ میں گھڑسواری کی چھڑی کی بجائے صلیب تھام رکھی تھی۔ جب اس کے تابوت کا ڈھکنا میٹھی ٹھونک کر بند کر دیا گیا، اور اسے اس کے ٹیپ ٹاپ والے خاندانی قبرستان میں دفن کر دیا گیا، تب ہی لوگوں کو مکمل یقین آ سکا کہ وہ مرنے کی اداکاری نہیں کر رہا تھا۔

تدفین کے بعد اُس کی بیوی کے سوا ہر ایک کے لیے تعجب کی بات صرف یہ رہ گئی تھی

کہ حوزے مونٹینسل طبعی موت کیسے مر گیا۔ جب کہ ہر شخص کے دل میں یہی توقع تھی کہ وہ گھات میں بیٹھے کسی شخص کی گولی پشت پر لگنے سے مرے گا، اس کی بیوی کو یہ یقین تھا کہ مونٹینسل کو اُس کی نظروں کے سامنے، بوڑھے بوکر، اپنے بستر میں اعترافات کرنے کے بعد، آج کل کے زمانے کے کسی پہنچے ہوئے بزرگ کی طرح اذیت کے بغیر موت آئے گی۔ صرف چند تفصیلات میں اس کا خواب پورا نہ ہو سکا تھا۔ حوزے مونٹینسل اپنے جھولنے والے بستر میں، دو اگست ۱۹۵۱ کو دوپہر کے دو بجے برہی اور غصے کے ایک دورے کے سبب مرا۔ ایسے دوروں کے خطرناک نتائج سے ڈاکٹر اُسے پہلے ہی آگاہ کر چکا تھا۔ اس کی بیوی کو یہ بھی توقع تھی کہ جنازے کو کندھا دینے کے لیے پورا قصبہ آمد آئے گا اور یہ کہ مختلف جگہوں سے آئی ہوئی پھولوں کی چادروں کے لیے اس کا گھر ناکافی ثابت ہو گا۔ لیکن فی الواقع صرف خاندان کے چند لوگ اور مونٹینسل کی مذہبی برادری کے ارکان ہی جنازے میں شریک ہوئے، اور اُس کی قبر کے لیے پھولوں کی چادریں صرف وہی تھیں جو میونسپل کمیٹی والوں نے بھجوائیں۔ مونٹینسل کے بیٹے نے، جو جرمنی میں کونسل کے عہدے پر فائز تھا، اور دو بیٹیوں نے، جو پیرس میں مقیم تھیں، تین تین صفحے کے تار بھجوائے تھے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اُن سب نے تار گھر میں کھڑے ہو کر، وہاں کی وافر سیلابی استعمال کر کے وہ تار رقم کیسے ہوں گے، اور یہ بھی کہ تاروں کی آخری عبارت ترتیب دینے میں انھوں نے کتنے ہی فارم پھاڑ کر بھینکے ہوں گے، اور یوں ہر تار میں بیس بیس ڈالر کی قیمت کے الفاظ جمع کیسے ہوں گے۔ اُن میں سے کسی نے بھی واپس آنے کی ہامی نہ بھری تھی۔ اُس رات، باسٹھ سال کی عمر میں، نیکے پر سر رکھ کر اُس شخص کے لیے روتے ہوئے جس نے اُسے خوشی سے ہلکا کر دیا تھا، مونٹینسل کی بیوہ نے پہلی بار آرزو کی کامرہ چکھا۔ میں اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے گھر میں قید کر لوں گی، وہ سوچ رہی تھی۔ میرے بچوں نے اپنی دانت میں مجھے بھی اپنے باپ کے ساتھ ہی دفن کر دیا ہے۔ میں اس دنیا کے بارے میں کچھ اور جاننا نہیں چاہتی۔

مونٹینسل کی بیوہ، نازک، اپنی توہم پرستی کے باتھوں لاپار، مگر مخلص عورت تھی۔ اُس کے ماں باپ نے اُس کی شادی بیس برس کی عمر میں اُس پہلے شخص سے کر دی تھی جسے تیس فٹ سے کم فاصلے سے دیکھنے کی اُسے اجازت ملی تھی۔ دنیا کے حقائق سے براہِ راست تعلق قائم کرنے کا اُسے کبھی موقع نہ ملا تھا۔ اپنے خاوند کا جنازہ اٹھانے جانے کے تین دن بعد اُسے اپنے آپ کو سنبھالنے کی ضرورت کا احساس ہوا، لیکن وہ اپنی زندگی کی سمت کا تعین کرنے سے قاصر تھی۔ اُسے از سر نو پیدا شروع کرنا تھا۔

اُن بے شمار رازوں میں جو حوزے مونٹینسل اپنے ساتھ قبر میں لے گیا تھا، گھر میں رکھی

تجوری کو کھولنے کی ترکیب بھی تھی۔ قصبے کے میسر نے تجوری کھلوانے کا کام اپنے ذمے لیا۔ اُس نے حکم دیا کہ تجوری کو صحن میں دیوار کے ساتھ لگا کر رکھ دیا جائے اور دو سپاہی تالے پر قافہ کریں۔ پوری صبح مونٹینیل کی بیوہ اپنے سونے کے کمرے میں لیٹی میسر کے پُرشور احکام کے جواب میں سپاہیوں کی دہی دہی آوازیں سنتی رہی۔

یہ تو حد ہو گئی، اس نے سوچا۔ میں نے پانچ سال خدا سے دعائیں کرنے میں گزارے ہیں کہ قصبے میں گولیاں پلنی بند ہوں اور آج میرے بی گھر میں گولیاں پل رہی ہیں، اور ان گولیوں کے لیے مجھے لوگوں کا شکر گزار بھی ہونا پڑے گا!

اُس روز مونٹینیل کی بیوہ نے اپنے تمام احساسات اور قوتیں مجتمع کر کے موت کو اپنی جانب راغب کرنے کی کوشش کی، مگر اس کی کوشش بار آور نہ ہوئی۔ جب وہ سونے کو تھی، اُس وقت آنگن سے ایک زوردار دھماکے کی آواز نے سارے گھر کو بلادیا۔ تجوری کے تالے کو بارود سے اڑا تا پڑا تھا۔

مونٹینیل کی بیوہ نے آہ بھری۔ اکتوبر کا مہینا اپنی بارشوں اور کیڑھسمیت طویل ہوتا جا رہا تھا۔ حوزے مونٹینیل کی، ابتری کی شکار لیکن لامحدود جائیداد پر موجود، بغیر تحریک اور سمت کے زندگی بسر کرتے ہوئے وہ اپنے آپ کو راہِ گم کردہ محسوس کر رہی تھی۔ خاندان کے ایک پرانے اور محنتی دوست، مسٹر کارمائیکل نے جائیداد کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ جب مونٹینیل کی بیوہ نے اس ٹھوس حقیقت کا سامنا کیا کہ اُس کا خاوند مر چکا ہے، تب وہ خود گھر کی دیکھ بھال کی خاطر سونے کے کمرے سے برآمد ہوئی۔ گھر میں سب نمائشی چیزوں کو اُس نے نکال کر پھینک دیا، فرنیچر پر ماتمی رنگوں کے خلاف چرم حودادیے اور دیواروں پر آویزاں، مرحوم کی تمام تصویروں کے گرد تعزیتی رہن باندھ دیے۔ تدفین کے بعد کے دو ماہ کے وقفے میں اس نے دانتوں سے ناخن کترنے کی نئی عادت ڈال لی تھی۔ ایک روز جب دیر تک رونے سے اس کی آنکھیں سُوجی ہوئی اور سرخ تھیں، اُسے احساس ہوا کہ مسٹر کارمائیکل کھلا چھاتا لیے گھر کے اندر داخل ہو رہا ہے۔

"مسٹر کارمائیکل، چھاتا بند کرو،" اس نے کہا۔ "پہلے ہی اس گھر میں کم بد قسمتی ہے کہ تمہارے کھلا چھاتا اندر لے کر آنے کی کسر باقی ہے؟"

مسٹر کارمائیکل نے چھاتا ایک کونے میں رکھ دیا۔ وہ ایک عمر رسیدہ نیگرو تھا، جس کی جلد چمک دار اور لباس ہمیشہ سفید ہوتا تھا اور اس نے اپنے جوتوں کے چمڑے پر پاقو سے گھاؤ کر رکھے تھے تاکہ اس کے پوروں کی وجہ کو چمڑے کی رگڑ سے زیادہ تکلیف نہ ہو۔

"صرف سکھانے کی خاطر چھاتا کھلا رکھا ہے۔"

خاوند کی موت کے بعد پہلی بار اُس کی بیوہ نے کھرکی کھولی۔

"پہلے ہی اتنی بد قسمتی کا سامنا ہے، اوپر سے یہ سردی کا موسم!" اس نے دانتوں سے ناخن کترتے ہوئے کہا، "لگتا ہے بارش کبھی بند نہیں ہوگی۔"

"آج یا کل تو مطلع صاف ہونے سے رہا،" جائیداد کے منتظم نے کہا۔ "کل رات میرے پوروں کی سوجن نے مجھے بالکل سونے نہیں دیا۔"

موسم کے بارے میں مسٹر کارمائیکل کے پاؤں کی سوجن کی پیشین گوئیوں کی وہ مکمل طور پر قائل تھی۔ اُس نے کھرکی کے باہر سُنان چوک کو دیکھا اور اُن بے حد اگھروں کو جن کے دروازے حوزے مونٹیل کا جنازہ دیکھنے کے لیے وَا نہیں ہوئے تھے، اور اپنی ناخن کترنے کی عادت سے، اپنی بے انتہا زمینوں سے اور اپنے خاوند سے ورٹے میں ملے ہوئے متعدد فرائض سے، جنہیں سمجھنے سے وہ قطعی قاصر تھی، ناامیدی محسوس کی۔

"دنیا کا سارا انتظام ہی غلط ہے،" وہ سسکی بھر کر بولی۔

اُن دفن اس کے گھر آنے والے مہمانوں کے پاس یہ سمجھنے کی بہت سی وجوہ تھیں کہ وہ پاگل ہو گئی ہے۔ لیکن اُس کا ذہن اتنی واضح سوچ کے قابل پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ قصبے میں سیاسی استبداد اور خوں ریزی سے قبل، وہ اکتوبر کی صبحیں اپنے کمرے کی کھرکی کے سامنے بیٹھ کر، مرے ہوئی کی روحوں کے لیے دعا کرنے اور یہ سوچنے میں گزارا کرتی تھی کہ اگر خداوند خدا نے اقوام کے دن آرام نہ کیا ہوتا تو شاید اس نے دنیا کی زیادہ بستر طور پر تکمیل کی ہوتی۔ "اُسے چاہیے تھا کہ اقوام کا دن دنیا کی چھوٹی موٹی غلطیاں اور بے ترتیبیاں درست کرنے میں صرف کرتا،" وہ کہا کرتی۔ "کیا مضائقہ تھا۔ بعد میں اس کے پاس ابد تک آرام کرنے کا وقت تھا۔" اس کے خاوند کی وفات کے بعد صرف اتنا فرق پڑا تھا کہ اُس وقت اس کے پاس ایسی تیرہ سوچوں کے لیے ٹھوس دلیل موجود ہوا کرتی تھی۔

سو جس زمانے میں ناامیدی مونٹیل کی بیوہ کو ٹھن کی طرح کھائے جا رہی تھی، مسٹر کارمائیکل ڈوبتے ہوئے سفینے کو بچانے کی کوشش میں جُٹا ہوا تھا۔ کاروبار اور جائیداد کا انتظام از حد خراب تھا۔ حوزے مونٹیل نے تشدد اور دہشت پسندی کی مدد سے قصبے کی تمام تجارت پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ اُس کے خوف سے آزاد ہونے پر اب سارا قصبہ اس سے انتظام لینے کے درپے تھا۔ گاہکوں کے استخار میں، جو ہشتوں ادھر کا رخ نہ کرتے تھے، صحن میں رکھے بڑے بڑے برتنوں میں دودھ پھٹ جاتا، شد چھتوں میں پڑا پڑا خراب ہو جاتا، اور پنیر کے کمرے کی تاریک الماریوں

میں رکھے پنیر میں کیرٹے ریگنے لگتے۔ حوزے مونٹینیل بجلی کے قمتقوں سے روشن مزار میں، نقلی سنگ مرمر کے بنے فرشتوں کے پروں کے سائے میں لیٹا اب اپنے پچھلے چھ برسوں کے جبر اور قتل و غارت کا حساب چکا رہا تھا۔ ملک کی تاریخ میں کوئی شخص اتنے کم عرصے میں اتنا زیادہ مالدار نہ ہوا تھا۔ جس زمانے میں آمریت کا نامزد کیا ہوا پہلا میسر قصبے میں وارد ہوا، حوزے مونٹینیل اپنی آدھی عمر، زیر جامے میں ملبوس، اپنی پاؤلوں کی مل کے سامنے بیٹھے گزار چکا تھا، اور ہر طرح کی حکومت کا پوشیدہ حامی رہا تھا۔ ایک وقت تھا کہ اسے لوگوں کی نظروں میں ایک خوش قسمت شخص اور ایک اچھے مسیحی کی شہرت حاصل تھی، مثلاً ایک بار اُس نے علانیہ کہا تھا کہ اگر اُسے لائبریری میں انعام مل گیا تو وہ گرجے میں سینٹ جوزف کا قد آدم مجسمہ نصب کروائے گا۔ اس اعلان کے دو ہفتے بعد، جب اُسے انعام کی بری سی رقم وصول ہوئی تو اُس نے اپنا وعدہ مکمل طور پر نبھایا تھا۔ پہلی بار جوتے پہنے ہوئے اُسے روز دیکھا گیا تھا جس روز نیا میسر، جو کہ نہایت وحشی اور بد طبیعت پولیس سارجنٹ تھا، قصبے میں آیا۔ نئے میسر کا پہلا کام حکومت کے خلاف ہر طرح کی مزاحمت کا قلع قمع کرنا تھا۔ حوزے مونٹینیل نے میسر کا خفیہ مخبر بن کر اپنی زندگی کا دھارا بدلا۔ اس معمولی سے تاجر نے، جس کی موٹے آدمیوں کی سی مزاح کی جس نے کبھی کسی کو رنجیدہ نہیں کیا تھا، مخبر بننے کے بعد اپنے دشمنوں کو امیروں اور غریبوں کے دو طبقوں میں بانٹ دیا۔ غریبوں کو تو قصبے کے چوک میں گولی مار دی گئی اور امیروں کو قصبے سے نکل جانے کے لیے چوبیس گھنٹے کا نوٹس دے دیا گیا۔ اس قتل و غارتگری کے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کی خاطر حوزے مونٹینیل میسر کے ساتھ اپنے چھوٹے سے گھٹے ہوئے دفتر میں کئی کئی دن مقید رہتا، اور اُس کی بیوی قصبے کے مردوں کے لیے دوائے خیر میں مصروف رہتی۔ جب میسر اس کے گھر سے نکل کر باہر جاتا تو وہ اپنے خاوند کا راستاروکتی۔ "یہ آدمی قاتل ہے،" وہ اُسے بتاتی۔ "حکومت سے اپنا اثر و رسوخ کام میں لا کر اس سے اس قصبے کی جان چھڑاؤ۔" یہ سماں ایک شخص کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ "حوزے مونٹینیل، جو اُن دنوں نہایت مصروف آدمی تھا، اپنی بیوی کی طرف دیکھے بغیر اسے بھڑک دیتا، "بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔" اصل میں مونٹینیل کا بنیادی کام غریبوں کا قلع قمع کرنا نہ تھا بلکہ قصبے سے امیروں کا اخراج کروانا تھا۔ چنانچہ جب میسر کی پولیس نے امرا کے دروازے گولیوں سے چھلنی کر دیے اور انھیں چوبیس گھنٹے کا نوٹس دے دیا تو حوزے مونٹینیل نے اُن کی جائیداد، مویشی اور مال اسباب اپنی مرضی سے طے کی ہوئی قیمتوں پر اُن سے خرید لیے۔ "یہ کیا فضول حرکت ہے،" اس کی بیوی نے اس سے کہا۔ "تم ان لوگوں پر احسان کرتے کرتے، کہ وہ کسی اور جگہ جا کر بجو کے نہ مریں، خود کو تباہ کر لے"

گے، اور ان میں سے کوئی تمہارا شکر گزار بھی نہ ہوگا۔" حوزے مونٹیسل نے، جس کے پاس اُن دنوں مسکرا نے کے لیے بھی وقت نہ تھا، اُسے ڈانٹ دیا اور کہا، "تم باورچی خانے میں جا کر اپنا کام کرو اور میرا دماغ مت چاٹو۔" اس رفتار سے ایک سال کے اندر اندر قصبے سے مخالفت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنی بیٹیوں کو پیرس بھجوا یا، لڑکے کو جرمنی میں کونسل کی نوکری دلوائی، اور خود کو اپنی سلطنت مستحکم کرنے کے لیے وقف کر دیا۔ لیکن اسے اپنی بے پناہ دولت سے لطف اندوز ہونے کے لیے چھ سال کی مہلت بھی نصیب نہ ہوئی۔

اس کی پہلی برسی کے بعد اُس کی بیوہ کے گھر کی سیر محیوں میں صرف اُسی لمبے چرچر ہاٹ ہوتی جب کوئی شخص بُری خبر لے کر آتا۔ ایسے لوگ عموماً شام کے وقت آیا کرتے۔ "ایک بار پھر ڈاکا پڑ گیا ہے،" وہ کہتے۔ "کل پچاس پچھپائیں لے کر بھاگ گئے۔" اپنی جھولنے والی کرسی میں بے بغیر، مونٹیسل کی بیوہ دانتوں سے ناخن کترتی رہتی اور دنیا سے بدشمن اور کشیدہ خاطر ہوتی رہتی۔

"حوزے مونٹیسل، میں نے تمہیں کیا کہا تھا؟" وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ "یہ قصبہ ناگھرے لوگوں کا ہے۔ ابھی قبر میں تمہارا جسم بھی ٹھنڈا نہیں ہوا اور ان لوگوں نے آنکھیں پھیر لی ہیں۔"

اس کے گھر کوئی نہیں آتا تھا۔ اُن دنوں میں جب لگاتار بارش ہوتی رہتی تھی، صرف ایک انسان جو باقاعدگی سے اُس کے گھر آتا رہا وہ مسٹر کارمائیکل تھا، اور وہ ہمیشہ کھلا چھاتا لیے اندر داخل ہوتا تھا۔ کاروبار کے حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہو رہی تھی۔ مسٹر کارمائیکل حوزے مونٹیسل کے بیٹے کو کتنے ہی خط لکھ چکا تھا۔ اُس نے مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ قصبے میں واپس آ کر کاروبار کا انتظام سنبھال لے تو سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے؛ حتیٰ کہ اس نے مرحوم کی بیوہ کی صحت کی خرابی کے بارے میں بھی اپنے تاثرات لکھ ڈالے تھے۔ مگر مونٹیسل کے بیٹے کی جانب سے اُسے ہمیشہ ٹال مٹول والے جواب ہی موصول ہوئے۔ آخر کار مونٹیسل کے بیٹے نے لکھا کہ واقعہ یہ ہے کہ وہ قصبے میں واپس آنے سے خوف زدہ ہے؛ اسے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی اُسے گولی سے اڑا دے گا۔ تب مسٹر کارمائیکل کو خواب گاہ میں بیوہ کے سامنے جا کر اعتراف کرنا پڑا کہ اُس کی مالی حالت تباہ ہو چکی ہے۔

"یہی بہتر ہے،" اُس نے جواب دیا۔ "میں تو مکھیوں اور چنیر سے تنگ آ چکی ہوں۔ تمہارا بھی جو جی چاہے یہاں سے لے لو اور مجھے چین کی موت مرنے دو۔"

اس کے بعد بیوہ کا دنیا سے تعلق صرف اُن خطوں کے ذریعے قائم رہا جو وہ اپنی بیٹیوں کو

برماہ کے اختتام پر لکھا کرتی تھی۔ "یہ نہایت منہوس، جھلسا ہوا، پالا لگا قصبہ ہے،" وہ اُنہیں لکھتی۔ "تم ہمیشہ کے لیے وہیں رہو اور میرے بارے میں فکر مند نہ ہو۔ میں یہ جان کر مطمئن ہوں کہ تم وہاں خوش ہو۔" اس کی بیٹیاں باری باری اس کے خطوں کا جواب دیتیں۔ اُن کے خط ہمیشہ مسرت اور شادمانی سے پُر ہوتے اور صاف محسوس ہوتا کہ وہ خط گرم اور روشن جگہوں میں بیٹھ کر لکھے گئے ہیں، اور یوں لگتا جیسے دونوں لڑکیاں جب سوچنے کو رکتی ہوں گی تو اُنہیں مختلف آئینوں میں اپنے عکس نظر آتے ہوں گے۔ اُنہیں بھی وطن واپس آنے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ "تہذیب صرف یہیں ہے،" وہ اپنی ماں کو لکھتیں۔ "وہاں تمہارے ملک میں ہمارے لیے ماحول اچھا نہیں ہے۔ کسی ایسے وحشی ملک میں رہنا قطعی ناممکن ہے جہاں لوگ سیاسی وجوہات پر قتل کر دیے جاتے ہوں۔" ان خطوں کو پڑھ کر مونٹیسل کی بیوہ کو خوشی اور بہتری کا احساس ہوتا اور وہ خطوں کے ہر جملے کے ساتھ رضامندی میں اپنا سر ہلاتی رہتی۔

ایک موقع پر اس کی بیٹیوں نے اسے پیرس کے قصا ہوں کی دکانوں کے بارے میں لکھا۔ انہوں نے بتایا کہ کیسے گلابی رنگ کے سالم سؤر وہاں دروازوں میں لٹکے رہتے ہیں، اور کیسے اُنہیں پھولوں کے باروں سے سجا کر رکھا جاتا ہے۔ خط کے آخر میں کسی اور نے، جس کا لکھنے کا انداز اُس کی بیٹیوں کے انداز سے مختلف تھا، اس جملے کا اضافہ کیا ہوا تھا: "ذرا غور کریں کہ کارنیشن کا سب سے بڑا اور سب سے خوبصورت پھول سؤر کے چوڑوں میں ٹکا ہوا ہوتا ہے۔"

یہ جملہ پڑھ کر مونٹیسل کی بیوہ دو سال کے عرصے میں پہلی دفعہ مسکرائی۔ گھر کی بیٹیاں جلائے بغیر، وہ اپنے سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ بستر پر دراز ہونے سے پہلے اس نے بجلی کے سیکھے کا رخ موڑ کر دیوار کی طرف کر دیا۔ پھر اس نے چھوٹی میز کی دراز میں سے قینچی، پٹی اور اپنی تسبیح نکالی اور دائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر، جہاں ناخن کترتے رہنے سے اُسے درد کا احساس ہو رہا تھا، پٹی باندھی۔ تب اس نے تسبیح پھیرنا شروع کی لیکن دوسرے ہی منٹ پر اس نے تسبیح کو بائیں ہاتھ میں لے لیا کیوں کہ دائیں انگوٹھے پر پٹی کی وجہ سے تسبیح کے دانے اُسے محسوس ہی نہ ہو رہے تھے۔ ایک لمحے کو اس نے دور سے طوفان کی گرج کی آواز سنی، لیکن جلد ہی اس کا سر سینے پر جھک گیا اور وہ سو گئی۔ اس کا تسبیح والا ہاتھ ایک طرف گر گیا، اور خواب میں اُس نے "بڑی ماما" کو دیکھا جو سفید چادر لپیٹے اس کے گھر کے صحن میں بیٹھی تھی؛ اُس کی کنجشکی اُس کی آغوش میں پڑی تھی اور وہ اپنے ناخنوں سے جونیں مارنے میں مشغول تھی۔ اُس نے بڑی ماما سے پوچھا:

"مجھے موت کب آنے لگی؟"

موتیئل کی بیوہ

بڑی ماما نے اپنا سر اٹھایا۔
"جب تھکن تمہارے بازو میں اتر آئے گی۔"

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ: فاروق حسن

سینچر کے بعد کے دن

ساری مصیبت جولائی میں شروع ہوئی جب ربیکا پر، جو دو غلام گردشوں اور نو خواب گاہوں والے بے انتہا بڑے گھر میں تنہا رہنے والی ایک تلخ مزاج بیوہ تھی، یہ انکشاف ہوا کہ اس کے گھر کی کھڑکیوں کی جالیاں ایسے پھٹی ہوئی ہیں جیسے کسی نے باہر سے ان پر پتھر اڑا دیا ہو۔ پہلی بار جب اس نے اپنی خواب گاہ کی جالی ٹوٹی ہوئی دیکھی تو اس نے سوچا کہ آرنے نیدا سے بات کرے جو نہ صرف اس کی ملازمہ تھی بلکہ جب سے ربیکا کے خاوند کا انتقال ہوا تھا، اس کی ہم راز بھی تھی۔ کچھ دیر بعد کمروں کی چیزیں ہلانے جلانے سے (عرصہ دراز سے ربیکا نے گھر کی چیزیں ادھر سے ادھر رکھنے کے سوا کوئی کام نہ کیا تھا) اسے پتا چلا کہ صرف اسی کمرے کی نہیں بلکہ گھر کی تمام کھڑکیوں کی جالیاں پھٹی ہوئی ہیں۔ ربیکا کو اپنے اقتدار کا ایک نظری قسم کا احساس تھا، جو شاید اسے اپنے سگڑا دادا سے وراثت میں ملا تھا۔ وہ جنوبی امریکا کا پیدا نشی ہسپانوی تھا جو جنگ آزادی میں شاہ پرستوں کی جانب سے شریک ہوا تھا اور بعد ازاں نہایت کھن سفر طے کر کے صرف اس مقصد سے ہسپانیہ گیا تھا کہ اُس غالی شان محل کا دیدار کر سکے جسے چارلس سوم نے سان الڈے فونسو میں تعمیر کیا تھا۔ لہذا جب ربیکا کو گھر کی جالیوں کی صورتِ حال کا پتا چلا تو اس نے

آرخے نیدا سے بات کرنے کے خیال کو رد کر دیا اور اس کی بجائے وہ اپنی تنکوں کی بنی ہوئی ٹوپی پہن کر، جس پر نعل کے چھوٹے چھوٹے پھول تھے، ٹاؤن ہال کی طرف روانہ ہو گئی تاکہ اپنے گھر پر محلے کے خلاف شکایت درج کرا سکے۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچی تو اس نے دیکھا کہ قصبہ کا میئر خود، قمیص کے بغیر، بالوں بھرے جسم کے ساتھ، اپنے وجود کا ٹھوس پن عیاں کرتے ہوئے جو ربیکا کو حیوانی محسوس ہوا، ٹاؤن ہال کی کھڑکیوں کی جالیاں مرمت کرنے میں مصروف تھا، جو ربیکا کے گھر کی جالیوں کی طرح پھٹی ہوئی تھیں۔

ربیکا کا ٹھہ کباڑے بھرے اس گندے دفتر کے اندر چلی آئی، اور جس چیز پر سب سے پہلے اس کی نظر پڑی وہ میز پر مردہ پرندوں کا ڈھیر تھا، لیکن کچھ گرمی اور کچھ جالیوں کی تباہی پر برہبی کی وجہ سے وہ اتنی بدحواس تھی کہ اسے میز پر پڑے مردہ پرندوں کے ناقابل یقین منظر کو دیکھ کر لرزنے کا وقت ہی نہ ملا۔ نہ ہی وہ عہدے اور منصب کی توہین سے دل برداشتہ ہوئی جس کا مالک اس کی آنکھوں کے سامنے سیر مھیوں کے اوپر کھڑا، جالی کا بندل اور پیچ کس ہاتھ میں لیے، کھڑکیوں کی جالیاں ٹھیک کر رہا تھا۔ اس وقت اس کے دل میں اپنے مرتبے اور اپنی کھڑکیوں کے نقصان کے سوا کوئی خیال نہ تھا اور اسی انسماک کی بدولت وہ اپنی کھڑکیوں اور ٹاؤن ہال کی کھڑکیوں کے درمیان کسی اشتراک کا تعین نہ کر سکی۔ وہ دروازے سے دو قدم اندر، تیز دارانہ سنجیدگی سے کھڑکی ہو گئی اور اپنے چھاتے کے طویل اور مڑھ دستے پر وزن ڈالتے ہوئے بولی:

"میں ایک شکایت درج کرا نے آئی ہوں۔"

سیر مھیوں کے اوپر کھڑے میئر نے اپنا گرمی سے تپا ہوا چہرہ موڑا۔ بیوہ کی اس وقت دفتر میں بے وجہ موجودگی پر اس نے کسی جذبے کا اظہار نہ کیا۔ مغمومانہ لاطعلقی کے ساتھ ٹوٹی ہوئی جالیوں کو اکھیر تا جاری رکھتے ہوئے، اس نے سیر مھیوں کے اوپر ہی سے پوچھا:

"کیا شکایت ہے؟"

"محلے کے لڑکوں نے میرے گھر کی تمام جالیاں توڑ دی ہیں۔"

میئر نے ایک بار پھر بیوہ کی طرف دیکھا۔ اس بار اس نے، نعل کے پھولوں سے لے کر پرانی چاندی کے رنگ کے جو تلوں تک، اس کا احتیاط سے جائزہ لیا جیسے اُسے زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ جسمانی حرکت کی از حد کفایت کرتے ہوئے اور اپنی نظریں بیوہ پر سے ہٹائے بغیر وہ سیر مھیوں سے اترا۔ نیچے پہنچ کر اُس نے ایک ہاتھ اپنی پتلون کی پیٹی پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے، جس میں پیچ کس پکڑا ہوا تھا، ڈیسک کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"سنیورا، یہ کارگزاری پرندوں کی ہے، لڑکوں کی نہیں۔"

تب، آخر کار، ربیکا کو ڈیسک پر پڑے مردہ پرندوں، سیرمضیوں کے اوپر کھڑے آدمی اور اپنے گھر کے کمروں کی شکستہ چالیلوں کے درمیان تعلق کا احساس ہوا، اور اپنے گھر کی خواب گاہوں میں مردہ پرندوں کے ڈھیر کا سوچ کر وہ کانپ اٹھی۔

"پرندوں کی؟" اس نے چیخ کر کہا۔

"جی، پرندوں کی،" میسر نے اُس سے اتفاق کیا۔ "تعجب ہے کہ یہ بات اب تک آپ کے مشاہدے میں نہیں آئی، جب کہ پچھلے تین روز سے ہمیں پرندوں کے کھڑکیوں سے اندر گھسنے اور گھروں کے اندر آکر مرنے کا مسئلہ درپیش ہے۔"

ٹاؤن ہال سے نکلنے وقت ربیکا شرمندہ سی تھی اور آرنے نیدا سے کچھ ناراض بھی جو شہر کی باقی تمام بکواس گھر میں لے آیا کرتی تھی مگر اس نے ربیکا سے پرندوں کا ذکر تک نہ کیا تھا۔ اگست سے قبل کی دھوپ سے ربیکا کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ اس نے اپنا چہرہ کھول لیا۔ سنان اور دم گھونٹنے والی گلی میں چلتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوا جیسے تمام گھروں کی خواب گاہوں میں سے مرے ہوئے پرندوں کی تیز اور چبھتی ہوئی سرانداٹھ رہی ہے۔

یہ جولائی کا آخر تھا اور قصبے کی تاریخ میں آج تک اتنی شدید گرمی نہ پڑی تھی۔ لیکن قصبے کے باسیوں کو، جو پرندوں کے مرنے سے گھبرائے ہوئے تھے، گرمی کی شدت کا پتا نہ چلا تھا۔ اس عجیب و غریب واقعے نے بستی والوں کے روز کے معمول میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی تھی، تاہم لوگوں کی اکثریت اگست کے اوائل میں اس واقعے کے باعث ٹھنڈے میں تھی۔ اس اکثریت میں قصبے کے روکھے پھیکے پادری، عظمت مآب اینتونی ازابیل کا شمار نہیں تھا، جو کاستا نینیدا ای موئیر کی مقدس قربان گاہ سے تعلق رکھتا تھا، اور جس نے، چورانوے برس کی عمر میں، لوگوں کو یقین دلایا تھا کہ وہ تین بار ابلیس سے مل چکا ہے؛ تاہم ابھی تک اُس نے صرف دو مردہ پرندے دیکھے تھے اور اُن کی موت سے کوئی اہمیت وابستہ نہیں کی تھی۔ پہلا مردہ پرندہ اسے ایک مشکل کو، عبادت کے بعد کلیسا کے مخزن میں نظر آیا تھا۔ اُس نے سوچا شاید مٹلے کی کوئی بجلی اُسے گھسیٹ کر وہاں لے آئی ہوگی۔ دوسرا اُسے بدھ کے دن اپنے گھر کے دالان میں پڑا ملا تھا، جسے اس نے جوتے کی نوک سے دھکیل کر، یہ سوچتے ہوئے کہ بلیاں نہایت فالتو اور غیر ضروری مخلوق ہیں، سڑک کے سیموں پر پھینک دیا تھا۔

لیکن جمعے کے دن جب وہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو اس بیچ پر جس پر اس نے بیٹھنے کا ارادہ کیا، اسے تیسرا مردہ پرندہ دکھائی دیا۔ جب وہ پرندے کو چھوٹی چھوٹی ٹانگوں سے اٹھا کر اپنی آنکھوں کے سامنے لایا اور الٹ پلٹ کر غور سے اس کا معائنہ کیا، تو اسے اپنے اندر بجلی کا سا کرما

محسوس ہوا اور اس نے سخت متعجب ہو کر سوچا: خدارحم کرے، ایک ہفتے میں یہ تیسرا مردہ پرندہ مجھے نظر آیا ہے۔

اس لمحے کے بعد سے اس نے قصبے میں ہونے والے واقعات کا مشاہدہ شروع کیا، لیکن بہت ہی غیر واضح طریقے سے، اس لیے کہ قادر ایمنٹونی ازابیل، کچھ تو اپنی عمر کے سبب اور کچھ اس باعث کہ وہ تین بار ابلیس سے ملنے کا بیان دے چکا تھا (جو لوگوں کے خیال میں تھوڑا سا غیر موزوں تھا)، اپنے مسیحی حلقے والوں کی نظر میں دماغی طور پر عادتاً غیر حاضر جانا جاتا تھا، باوجود اس کے کہ لوگ اس کی نیکوکاری، امن پسندی اور خوش خلقی کے بھی قائل تھے۔ اسے احساس ہوا کہ پرندوں کے ساتھ کچھ ہو رہا ہے لیکن وہ جو کچھ بھی تھا اتنا اہم نہیں تھا کہ اس کے آئندہ خطبے کا موضوع بن سکے۔ قادر ایمنٹونی وہ پہلا شخص تھا جسے قصبے میں پھیلی ہوئی بوکا احساس ہوا تھا۔ جمعے کی رات کو وہ خوف زدہ ہو کر اٹھ بیٹھا تھا۔ اس کی بلکی نیند مردہ پرندوں کی جی متلا دینے والی سراند سے اڑ گئی تھی، لیکن وہ یہ باور نہ کر سکا کہ آیا اس بدبو کو کسی خواب بد سے منسوب کرے یا ابلیس سے جس نے اس کی نیند خراب کرنے کے لیے کوئی نیا اور اٹوٹھا حربہ وضع کیا تھا۔ اس نے چاروں طرف سوچا اور بستر میں کروٹیں بدلتا رہا۔ یہ تجربہ اس کے خیال میں ایک ڈرامائی وعظ کا موضوع بننے کے لائق تھا کہ ابلیس کس طرح حواسِ خمسہ میں سے کسی ایک کے ذریعے، لوگوں کے دلوں میں سرایت کرنے کا اہل تھا۔

دوسرے روز عبادت سے قبل جب وہ صحن میں چل قدمی کر رہا تھا تو اس نے پہلی بار کسی کو مردہ پرندوں کا ذکر کرتے سنا۔ وہ اپنے خطبے، ابلیس اور ان گناہوں کے بارے میں غور و فکر کر رہا تھا جن کا حسِ سامعہ کے ذریعے ارتکاب کیا جاسکتا ہے، جب اس نے کسی کو کہتے سنا کہ قصبے میں پھیلی بدبو ان مردہ پرندوں کی وجہ سے ہے جو پچھلے ہفتے کے دوران میں اکٹھے کیے گئے ہیں۔ اس کے دماغ میں انجیلی تنبیہات، کرسیمہ بدبوؤں اور مردہ پرندوں کا ملفو بہ ساجینے لگا، حتیٰ کہ اتوار کے روز خطبے کے دوران اسے خیرات کے موضوع پر ایک طویل پیرا گراف فی البدیہ گھڑنا پڑا جس کا مطلب خود اس پر بھی مکمل طور پر واضح نہ تھا، اور یوں ابلیس اور حواسِ خمسہ کا ربط ہمیشہ کے لیے اس کے ذہن سے فراموش ہو گیا۔

تاہم اس کی فکر کے کسی دورِ اقتادہ کو نے میں یہ تجربات ضرور پوشیدہ رہ گئے ہوں گے۔ یہ اس کے ساتھ ہمیشہ ہوتا تھا، نہ صرف مذہبی دارالعلوم میں، جہاں وہ تشریف سال قبل طالب علم رہا تھا، بلکہ اب، نوے سال کی عمر پانے کے بعد، یہ سب کچھ خاص طرح سے ہو رہا تھا۔ دارالعلوم میں ایک چمکدار سہ پہر کو، جب بادل گرے بغیر موسلا دھار بارش ہوئی تھی، وہ سوفو کلیز کا ایک انتخاب

اصل زبان میں پڑھنے میں مشغول تھا۔ جب بارش تھمی تو اس نے کھڑکی سے باہر نکلے ہوئے میدان اور نئی دھلی دھلائی سہ پہر کو دیکھا تھا اور اس لمحے یونانی تھیٹر اور کلاسیکی ادب کو یکسر بھول گیا تھا۔ ویسے بھی ان دونوں میں اس نے کبھی زیادہ امتیاز نہ کیا تھا بلکہ انہیں عمومی طور پر "پرانے وقتوں کی قدیم چیزیں" ہی کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ تیس چالیس برس بعد ایک بے بارش کی سہ پہر کو، کسی نئے قصبے میں جہاں وہ دورے پر گیا ہوا تھا، اینٹوں والے چوک کو عبور کرتے ہوئے اس نے بغیر خواہش کے سوفوکلیز کا وہی قطعہ دوہرایا تھا جو وہ اس روز دارالعلوم میں پڑھ رہا تھا۔ اسی ہفتے اس نے باتوں کے رسیا اور اثر پذیر ایک بوڑھے نائب پادری سے "پرانے وقتوں کی قدیم چیزوں" کے بارے میں طویل گفتگو بھی کی تھی۔ وہ نائب پادری ایک خاص طرز کے پسمیدہ معمول کا شوقین تھا جن کے بارے میں اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اس نے خود ایجاد کیے ہیں، بعد ازاں وہی معنی "کراس ورڈ" کے نام سے خاصے مشہور ہوئے تھے۔

نائب پادری کے ساتھ گفتگو سے اس کا یونانی علوم کے ساتھ پہلے بیسادی لگاوا ایک بار پھر لوٹ آیا تھا۔ اسی سال کرسمس کے موقع پر اسے ایک خط موصول ہوا تھا۔ اور اگر اس وقت تک اس کے مبالغہ آمیز تخیل، تشریحات کی دلیری اور وعظوں میں بے وقوفی کی مکمل شہرت نہ ہو چکی ہوتی تو اس موقع پر اسے شپ کا عمدہ دے دیا گیا ہوتا۔

لیکن اس نے تو اپنے آپ کو ۱۸۸۵ء کی جنگ سے قبل ہی اس قصبے میں زندہ دفن کر دیا تھا، اور ان دنوں جب پرمدول نے خواب گاہوں میں مرنا شروع کیا تھا، اس بات کو ایک مدت گزر چکی تھی کہ قصبے والوں نے، خصوصاً اس کے اہلیس سے ملاقاتوں کے دعوے کے بعد، اس کی جگہ کسی کم عمر پادری کے لیے درخواست دے رکھی تھی۔ اس کے بعد سے انہوں نے اس کی طرف دھیان دینا ہی چھوڑ دیا تھا، اور یہ بات اس کی اپنی نظر سے پوشیدہ رہی تھی حالانکہ اس کی بصرات اب بھی ایسی تیز تھی کہ وہ دعاؤں کی کتاب کے باریک حروف نینک کے بغیر پڑھ سکتا تھا۔

اس کی عادات ہمیشہ سے مخصوص اور معین رہی تھیں۔ چھوٹے قد اور غیر اہم شخصیت، نمایاں اور مضبوط ہڈیوں، اور پُر سکون حرکات والے اس شخص کی آواز گفتگو میں آسودگی دینے والی تھی، لیکن خطبے کے دوران ضرورت سے زیادہ ہی آسودگی بہم پہنچایا کرتی تھی۔ وہ دوپہر کے کھانے کے وقت تک صرف اپنی سوچی پتلون میں ملبوس، جس کے پانچے پنڈلیوں تک مڑے ہوتے تھے، کینوس کی کرسی میں سہل انگاری سے دراز، دن سپنے دیکھا کرتا تھا۔

عبادت میں وعظ کرنے کے سوا اس کا کوئی کام نہ تھا۔ ہفتے میں دو مرتبہ وہ اعتراف کی

سینہ کے بعد کے دن

کوٹھری میں جا بیٹھتا، لیکن عرصہ دراز سے کوئی شخص اعتراف کے لیے نہ آیا تھا۔ اس نے محض یہ سمجھا کہ نئے زمانے کے طور طریقوں کے باعث اس کے مسیحی حلقے کے لوگوں کا ایمان کمزور ہوتا جا رہا ہے، اور اسی لیے اس کے حساب سے، ابلیس سے اس کی تین بار ملاقات ایسا تجربہ تھا جو وقت اور زمانے کے عین مطابق تھا۔ تاہم اسے یہ بھی معلوم تھا کہ لوگ اس کی باتوں پر کم ہی کان دھرتے ہیں اور یہ بھی کہ وہ خود بھی ان تجربات کا ذکر کرتے وقت زیادہ قابل یقین نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے لیے خود اپنے آپ یہ دریافت کر لینا حیران کن بات ہوتی کہ پچھلے پانچ سالوں کے دوران، خاص طور پر ان غیر معمولی لمحوں میں جب اس نے پہلے دو مردہ پرندے دیکھے تھے، وہ مُردہ رہا تھا۔ اس میں زندگی کی تھوڑی سی رمق اس وقت پیدا ہوئی جب اس نے تیسرا مردہ پرندہ دیکھا، لہذا اب، پچھلے چند دنوں سے، وہ بین کثرت سے اسٹیشن کی سچ پر پائے گئے پرندے کے بارے میں غور و فکر میں مصروف تھا۔

گر جے سے دس قدم کے فاصلے پر اس کا بغیر جالیوں کا چھوٹا سا گھر تھا، جس کا برآمدہ سڑک کی طرف تھا اور چپچپے دو کمرے تھے جو اس کے دفتر اور خواب گاہ کا کام دیتے تھے۔ کبھی کبھی، شاید ایسے لمحوں میں جب اس کا ذہن غیر واضح ہوتا، وہ سوچتا کہ دنیا میں اگر گرمی کا وجود نہ ہوتا تو خوشی کا حصول ممکن تھا، اور یہ خیال اس کے ذہن کو الجھا دیتا۔ مابعد الطبیعیات کی دشوار گزار راہوں میں بھٹکتا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ بر صبح اپنی خواب گاہ میں، دروازہ بھیرے، آنکھیں موندے اور جسم کے پٹھے اکڑائے بیٹھا وہ یہی کیا کرتا تھا۔ تاہم اسے یہ احساس نہ تھا کہ اس کی سوچ اس قدر لطیف ہو چکی ہے کہ پچھلے تین برس سے اپنے مراقبے کے لمحوں میں وہ کسی بھی چیز کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا ہوتا۔

ٹھیک بارہ بجے دوپہر ایک لڑکا ہاتھوں پر خانوں والا طشت اٹھائے، برآمدہ عبور کیا کرتا، جس میں ہمیشہ وہی چیزیں ہوتی تھیں: یعنی بڈیوں کا سوپ، پکا کا ایک ٹکڑا، اُبلے ہوئے چاول، بغیر پیاز کا گوشت، تلاموا کیلایا مکئی کی روٹی اور تھوڑی سی دال، جسے مقدس قربان گاہ کا ستا نیسیدا ای فوٹیرو کے پادری ایمنتونی ازابیل نے کبھی چکے کر نہ دیا تھا۔

لڑکا طشت کو اس کرسی کے نزدیک رکھ دیتا جس پر پادری بیٹھا ہوتا تھا، لیکن پادری اپنی آنکھیں اس وقت تک نہ کھولتا جب تک کہ برآمدے میں واپس جاتے ہوئے قدموں کی آواز ختم نہ ہو جاتی۔ اس کی اس عادت کے باعث قصبے میں مشہور ہو چکا تھا کہ پادری دوپہر کے کھانے سے قبل ہی قیلوہ کر لیتا ہے (جو کہ نہایت فضول حرکت سمجھی جاتی تھی)۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ بے چارے پادری کورات میں بھی ٹھیک سے نیند نہ آتی تھی۔

اس عمر میں اس کی عادتیں کم پیچیدہ، بلکہ بالکل غیر مہذب سی ہو گئی تھیں۔ مثلاً وہ دوپہر کا کھانا اپنی کیفوس کی کرسی ہی میں بیٹھے بیٹھے کھا لیا کرتا، خوراک کو طشت میں سے باہر بھی نہ نکالتا اور رکابیاں اور چھری کانٹے بھی استعمال نہ کرتا۔ ایک ہی چمچ سے، جس سے وہ سوپ پیتا تھا، سارا کام چلاتا۔ بعد ازاں وہ اٹھتا، تھوڑا سا پانی سر پر انڈیل کر اپنی سفید عبا پہنتا، جس میں بڑی بڑی چوکور کھڑیاں تھیں، اور نہیں اس وقت جب باقی کا قصبہ قیلو لے کے لیے لیٹ رہا ہوتا، وہ ریلوے اسٹیشن کا رخ کرتا۔ پچھلے کئی ماہ سے وہ ایک ہی راستے سے، ایک خاص دنا پرٹھتا ہوا، آ جا رہا تھا جو اس نے خود ہی اس وقت وضع کی تھی جب اہلیس سے اس کی آخری بار ملاقات ہوئی تھی۔

ایک سینچر کو۔۔۔ مردہ پر ندوں کی بارش شروع ہونے کے نو دن بعد۔۔۔ جب مقدس قربان گاہ کا پادری اینتونی ازابیل یوں ہی چلا جا رہا تھا تو، ریکا کے گھر کے عین سامنے، ایک مڑتا ہوا پرندہ آسمان سے اس کے پیروں میں آ کر گرا۔ اس کے دماغ میں وجدان کا کوندا سا پلکا اور اسے احساس ہوا کہ باقی پر ندوں کے برعکس اس مرتے ہوئے پرندے کی جان بچائی جا سکتی ہے۔ اس نے پرندے کو ہاتھوں میں اٹھایا اور ریکا کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ریکا اس لمحے، قیلو لے کرنے کی خاطر، اپنا شلوک اتارنے میں مصروف تھی۔

اپنی خواب گاہ میں سے ریکا نے دروازہ کھٹکھٹائے جانے کی آواز سنی اور جلتی طور پر جالیوں کی طرف دیکھا۔ پچھلے دو روز سے کوئی پرندہ اس کی خواب گاہ میں داخل نہ ہوا تھا لیکن حالی اب تک پھٹی ہوئی تھی۔ جالیوں کی مرمت کرانا، جب تک پر ندوں کی یورش جاری تھی جس سے اس کے اعصاب میں ستاو رہنے لگا تھا، بالکل فضول ہوتا۔ اس نے دروازے پر، بجلی کے پیکھے کی آواز سے اوپر اٹھتی ہوئی دستک کی آواز سنی اور بے صبری سے اسے یاد آیا کہ آرنے نیدا برآمدے کے دوسرے کونے والے کمرے میں قیلو لے کر رہی ہے۔ اس نے اس بابت بالکل غور نہ کیا کہ اس لمحے اپنی موجودگی اس پر مسلط کرنے والا کون شخص ہو سکتا ہے۔ اپنا شلوک اس نے دوبارہ پہن لیا، حالی کا دروازہ کھول کر تے ہوئے انداز میں سیدھے چلتے ہوئے پورا برآمدہ طے کیا اور نشت کے کمرے میں سے گزر کر، جس میں مختلف زیبائشی اشیاء اور فرنیچر کی بھرمار تھی، دروازہ کھولنے سے قبل ہیٹل کی حالی میں سے باہر جھانکا۔ باہر کم گوفادر اینتونی ازابیل آنکھیں بند کیے اور ہاتھوں میں ایک پرندہ اٹھائے کھڑا تھا۔ ابھی اس نے دروازہ نہیں کھولا تھا کہ پادری نے کہا، ”اگر اے تھوڑا سا پانی پلا کر تھالی کے نیچے رکھ دیا جائے تو مجھے یقین ہے یہ اچھا ہو جائے گا۔“ اور جب ریکا نے دروازہ کھولا تو اسے لگا جیسے خوف کے مارے وہ ویں ڈھیر ہو جائے گی۔

پادری پانچ منٹ سے زیادہ وہاں نہیں ٹھہرا۔ ربیکا کو احساس ہوا جیسے اس کی کسی بات نے پادری کے قیام کو مختصر کر دیا ہو، لیکن دراصل پادری نے خود ہی ملاقات کو مختصر کیا تھا۔ ربیکا اگر اسی لمحے غور کرتی تو اسے احساس ہو جاتا کہ پادری پچھلے تیس برسوں میں، جب سے وہ اس قصبے میں مقیم تھا، کبھی اس کے گھر میں پانچ منٹ سے زیادہ دیر کے لیے نہ رکا تھا۔ پادری کو اس گھر میں رکھی چیزوں کی فراوانی میں گھر کی مالکہ کی شہرت پرست روح کا عکس صاف دکھائی دیتا تھا، باوجود اس کے کہ، جیسا کہ ہر ایک کو معلوم تھا، ربیکا کی ہشپ سے دور کی قرابت داری بھی تھی۔ اس کے علاوہ ربیکا کے خاندان کے بارے میں ایک روایت (یا محض ایک کہانی) مشہور تھی جو یقیناً، پادری کے خیال میں، کلیسائی محل والوں کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی، حالانکہ ربیکا کے ایک دور کے عم زاد، کرئل اور پلینا نو بونسندیا نے، جسے ربیکا خاندانی شفقت سے قطعی عاری سمجھتی تھی، ایک بار قسم کھا کر بیان دیا تھا کہ ہشپ نے اس پوری صدی میں قصبے میں اس لیے قدم نہ رکھا تھا کہ وہ اپنے رشتے داروں سے ملنے سے گریز کرنا چاہتا تھا۔ بہر حال، یہ خواہ تاریخی واقعہ تھا یا من گھڑت کہانی، حقیقت یہ تھی کہ مقدس قربان گاہ کے پادری اینٹونی ازابیل کو اس گھر میں ہمیشہ بے آرامی کا احساس ہوا تھا، جس میں تنہا رہنے والی مالکہ نے کبھی خدا ترسی نہیں دکھائی تھی اور جو سال بھر میں صرف ایک بار اعتراف کے لیے گرجے جاتی تھی، اور اس اعتراف کے دوران میں بھی ہر اس سوال کا جو اس کے خاوند کی موت کے حیرت ناک حادثے کے بارے میں ہوتا تھا، گول مول جواب دیا کرتی تھی۔ اگر پادری اس موقع پر اس گھر میں موجود تھا اور ہاتھ میں پرندہ تھا، ربیکا کے پانی کا گلاس لاکر پرندے کو ڈبکی لگوانے کا مستقر تھا تو اس کا باعث چند اتفاقات تھے جن کے لیے وہ ہرگز جواب دہ نہ تھا۔

بیوہ کی واپسی کا انتظار کرتے ہوئے، چوبی کام والی آرام کرسی میں دھنسے ہوئے، پادری نے اس گھر کی عجیب و غریب سیلن کو محسوس کیا۔ اس لمحے سے بیس برس پہلے ایک دن، اس گھر میں پستول چلنے کی آواز گونجی تھی اور حوزے آرکادیو بونسندیا (کرئل اور پلینا نو اور اپنی بیوی کا عم زاد) گولی لگنے سے چکرا کر، مہمیزوں اور بکسوں کے ڈھیر کے درمیان اپنے اتارے ہوئے چرمی موزوں پر گرا تھا، انھی موزوں پر جن میں اس کے جسم کی گرمی ابھی موجود تھی۔ اس دن سے اس گھر کو سکون کا ایک لمحہ بھی نصیب نہ ہوا تھا۔

ربیکا جب دوبارہ نشست کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے پادری کو آرام کرسی میں بیٹھے دیکھا، اس کے چہرے پر ایسی دھندلاہٹ تھی کہ وہ دہشت زدہ ہو گئی۔

"خداوند خدا کو ایک پرندے کی زندگی بھی اتنی ہی عزیز ہے جتنی ایک انسان کی،" پادری

نے کہا۔

لیکن یہ کہتے وقت اس کے ذہن میں حوزے آرکادیو بونڈیا کا خیال نہ آیا تھا اور نہ ہی بیوہ نے یہ سن کر اپنے مرحوم خاوند کو یاد کیا تھا۔ لیکن بیوہ کو پادری کی باتوں پر اعتقاد نہ کرنے عادت ہو چکی تھی، خاص طور پر اس وقت سے جب پادری نے گرجے کے منبر پر کھڑے ہو کر ابلیس کے تین بار اس کے سامنے ظاہر ہونے کا ذکر کیا تھا۔ اس کی بات پر زیادہ دھیان نہ دیتے ہوئے ریکا نے پرندے کو ہاتھوں میں پکڑا، اسے پانی میں ڈبکی دی اور پھر جھنجھوڑا۔ پادری نے غائر نظر سے دیکھا کہ اس عورت کے طریق کار میں خدا ترسی اور احتیاط کا فقدان تھا اور اسے پرندے کی زندگی کی ذرہ بھر پروا نہ تھی۔

"تھیں پرندے اچھے نہیں لگتے!" پادری نے نرمی سے مگر اثبات کے لہجے میں کہا۔ بیوہ نے بے صبری اور مخالفت کے انداز سے آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ "ایک وقت ایسا تھا کہ مجھے پرندے پسند تھے،" وہ بولی، "مگر جب سے انھوں نے ہمارے گھروں کے اندر آکر مرنا شروع کیا ہے مجھے زہر لگنے لگے ہیں۔"

"بہت سے پرندے مر گئے ہیں،" پادری کٹر پن سے بولا۔ لیکن کسی شخص کو یہ گمان بھی ہو سکتا تھا کہ اس کے ہموار لہجے میں بہت چالاکی چھپی ہوئی ہے۔

"سب مر گئے ہیں،" بیوہ نے کہا۔ اور ساتھ ہی ناگواری سے ہاتھ میں تھامے پرندے کو زور سے دبا کر تنہا کے نیچے رکھتے ہوئے اضافہ کیا، "مجھے ان کے مرنے کی بھی پروا نہ ہوتی اگر وہ میری جالیاں نہ توڑتے۔"

پادری نے باور کیا کہ اس نے اپنی تمام زندگی میں اس سے زیادہ سنگ دلی کا مظاہرہ نہیں دیکھا۔ ایک لمحے بعد، پرندے کے مختصر سے بے مدافعت جسم کو ہاتھ میں اٹھانے پر اسے پتا چلا کہ اس کی سانس بند ہو چکی ہے۔ اس وقت اس کے ذہن سے سب کچھ فراموش ہو گیا۔ گھر کی سیلن، گھر کی مالکہ کی شہرت پرستی، حوزے آرکادیو بونڈیا کے جسم سے اٹھتی ہوئی بارود کی ناقابل برداشت بو۔۔۔ اور اس پر وہ عظیم الشان حقیقت آشکار ہوئی جو اس ہفتے کے آغاز سے اس کے قُرب و جوار میں موجود تھی۔ بیوہ نے اسے مردہ پرندہ ہاتھوں میں تھامے اور دہشت دلانے والا اشارہ کرتے ہوئے گھر سے نکلے دیکھا، لیکن پادری اس وقت ایک حیرت انگیز کشف سے گزر رہا تھا کہ قصبے پر مردہ پرندوں کی بارش ہو رہی ہے اور وہ خود، خداوند خدا کا برگزیدہ اور منتخب خدمت گار، جس کا زندگی میں خوشی سے اُسی وقت واسطہ رہا تھا جب گرمی نہ پڑ رہی ہو، قُرب قیامت کے بارے میں سب کچھ فراموش کر چکا ہے۔

اس روز بھی وہ حسب سابق ریلوے اسٹیشن پر گیا، مگر اس روز وہ اپنی حرکات سے باخبر نہ تھا۔ اے میم طور پر احساس تھا کہ دنیا میں کچھ ہو رہا ہے مگر اس کا ذہن گدگد اور ساکت تھا اور وہ خود حالات کا سامنا کرنے سے قطعی قاصر تھا۔ سچ پر بیٹھے ہوئے اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ آیا قرب قیامت کے آثار میں مُردہ پر مدوں کی بارش کا ذکر بھی تھا، لیکن اے کچھ یاد نہ آیا۔ ایک دم اے خیال آیا کہ شاید ریکا کے گھر میں رکنے کے سبب اس نے دیر کر دی ہو اور گاڑی آکر چلی گئی ہو، لیکن اس نے کھرکی کے ٹوٹے ہوئے اور گرد آلود شیشے کے اوپر سے گردن اٹھا کر گھنٹے پر نظر ڈالی تو اے پتا چلا کہ ابھی بارہ بجنے میں پانچ منٹ باقی ہیں۔ جب وہ دوبارہ سچ پر بیٹھا تو اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس وقت اے یاد آیا کہ آج سنیچر ہے۔ کھجور کے پتوں کے دستی پتکھے سے اپنے آپ کو ہوا کرتے وقت وہ ذہن کی تاریک دھند میں کھویا رہا۔ کچھ دیر وہ اپنی عبا، اپنے جوتوں اور اپنی پادریوں والی لمبی آرام دہ پتلون کے پٹنوں کے بارے میں جھنجھلاہٹ کا شکار رہا۔ تب اس نے ٹھہرا کر محسوس کیا کہ آج تک اے اتنی گرمی نہ لگی تھی جتنی اس وقت لگ رہی ہے۔

دیس بیٹھے بیٹھے اس نے اپنی عبا کے پٹن کھولے، آستین میں سے رومال نکال کر اپنا تپا ہوا چہرہ صاف کیا اور جذبے کی بصیرت والے ایک عارضی لمحے میں سوچا کہ شاید وہ کسی زلزلے کی تہیں کھلنے کا منظر دیکھ رہا ہے۔ یہ عبارت اس نے کمپیں پڑھی تھی۔ مگر آسمان بالکل صاف تھا؛ نیلا اور شفاف آسمان جس میں سے تمام پرندے پراسرار طور پر غائب ہو چکے تھے۔ اس نے آسمان کے رنگ اور شفاف پن کو تو دیکھا مگر ایک لمحے کے لیے پرندوں کو بھول گیا۔ اب وہ کسی اور چیز کے بارے میں سوچ رہا تھا؛ شاید کوئی طوفان آنے والا ہے۔ لیکن آسمان سترہا ہوا، پرسکون اور بے حرکت تھا جیسے بہت دور کے کسی اور قصبے کا آسمان ہو جہاں اے گرمی کا کبھی احساس نہ ہوا ہو، اور جیسے اس کی اپنی آنکھیں کسی اور کی آنکھیں ہوں جو اس آسمان کو دیکھ رہی ہوں۔ تب اس نے شمال کی جانب نظر دوڑائی اور وہاں کھجور کے پتوں اور زنگ آلود جست کی چھتوں سے پرے، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کے اوپر، خوشی، آہستگی اور روانی سے اڑتے ہوئے شکرلوں کا ایک دھبہ سادیکھا۔

کسی نامعلوم وجہ سے اس لمحے پادری اُسی کیفیت سے گزرا جس سے ایک اتوار کو دارالعلوم میں اپنے ادنیٰ مدارج حاصل کرنے سے کچھ روز پہلے گزرا تھا۔ ریکٹر نے اے اپنا ذاتی کتب خانہ استعمال کرنے کی اجازت دے رکھی تھی اور وہ روزانہ (خصوصاً اتواروں کو) گھنٹوں وہاں بیٹھا مسلی ہوتی ہوئی کتابیں پڑھتا رہتا تھا، جن میں سے پرانی لکڑی کی بو آیا کرتی تھی اور جن میں لاطینی زبان کے چھوٹے چھوٹے خمدار حروف میں ریکٹر نے اپنے ہاتھ سے حاشیہ آرائی کی ہوئی ہوتی تھی۔

ایک اتوار کو، جب وہ صبح سے مطالعے میں مصروف تھا، ریکٹر شام کے وقت کمرے میں داخل ہوا اور تیزی سے آگے بڑھ کر برافروختہ سا ہو کر اس نے ایک کارڈ فرش پر سے اٹھا لیا جو اُس کتاب میں سے گرا تھا جسے پادری پڑھ رہا تھا۔ پادری نے رتبے میں اپنے سے برتر اس شخص کی ذہنی ابتری کو پوشیدہ لا تعلقی سے دیکھا اور اس دوران میں کارڈ پر لکھی عبارت بھی پڑھ لی۔ کارڈ پر جامنی روشنائی میں صاف اور سیدھے خط میں ایک ہی فقرہ درج تھا: "مادام امی ویت آج رات مر گئی۔" تقریباً نصف صدی کے بعد آج شگروں کے ایک دھبے کو ایک بھولے ہوئے قصبے کے آسمان پر دیکھ کر پادری کو اُس اتوار کو اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ریکٹر کی مغموم کیفیت یاد آگئی جب غروب آفتاب کے مقابل ریکٹر کا چہرہ عثمانی ہو رہا تھا اور اس کی سانس تیز ہو گئی تھی۔

یادداشت کے اس تعلق سے لرز کر، پادری کو اس وقت گرمی کا نہیں بلکہ اس کے برعکس پیروں کے تلووں میں اور زیر ناف برف کی کاٹ محسوس ہوئی۔ وہ یہ جانے بغیر دہشت زدہ تھا کہ کس مخصوص وجہ سے دہشت زدہ ہے، اور پراگندہ خیالات کے جال میں گرفتار تھا جن میں یہ تمیز کرنا ناممکن تھا کہ کون سا خیال کس خیال سے بڑھ کر کریہہ المنظر ہے، آیا ابلیس کے کچھڑ میں دھسنے ہوئے سموں کا یا آسمان سے مُردہ پرندوں کی دھیروں دھیر بارش کا، اگرچہ وہ خود، مقدس قربان گاہ کا قادرِ امتوتی ازابل، اس موخر الذکر واقعے سے لا تعلقی محسوس کر رہا تھا۔ تب وہ ایک دم سیدھا ہو بیٹھا، اپنا سہما ہوا ہاتھ ہوا میں اوپر اٹھایا جیسے ایسی تنہیت کا بیان شروع کرنے والا ہو جو خالی فضا میں غائب ہو چکی ہو، اور حواس باختہ ہو کر چٹا:

"گردش زده یهودی!"

عین اس وقت ریل کی سیٹی بجی۔ اتنے برسوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ اسے سیٹی کی آواز سنائی نہ دی۔ اس نے گاڑھے دھوئیں میں لپٹی ریل گاڑی کو اسٹیشن میں داخل ہوتے دیکھا اور رنگ آلود جست کی چادروں پر برسے کوئلے کے ذروں کی آواز سنی۔ لیکن یہ ایک دور افتادہ اور ناقابلِ فہم خواب کی طرح تھا، جس سے وہ اس سہ چہر، چار سبجے کے بعد تک بھی، پوری طرح بیدار نہ ہوا تھا جب وہ اپنے ذہن میں اس متاثر کن وعظ کی نوک پلک سفار رہا تھا جو اسے اگلے دن، اتوار کو، کرنا تھا۔ آٹھ گھنٹے بعد اسے ایک عورت کے لیے آخری دعائیں پڑھنے جانا پڑا۔

نتیجہ یہ کہ پادری کو معلوم نہ ہو سکا کہ اس سہ چہر ریل گاڑی سے کون اتر رہا ہے۔ بہت عرصے سے وہ گاڑی کے چار بے رنگ اور بودے ڈبوں کو دیکھتا آ رہا تھا جن میں سے اسے یاد نہیں تھا کہ کوئی شخص پچھلے کئی برسوں میں ٹھہرنے کے لیے یہاں اتر رہا ہو۔ پرانے وقتوں میں معاملہ مختلف تھا جب وہ ساری سہ چہر کیلوں سے بحری گاڑی کو گزرتے دیکھتا رہتا تھا۔ اس گاڑی

کے ایک سو چالیس ڈبے ہوتے تھے، اور پھلوں سے لدی وہ گاڑی لامتناہی وقت تک گزرتی رہتی تھی، حتیٰ کہ سورج ڈھلتے سے اس کا آخری ڈبہ گزرتا جس میں سے ایک آدمی سبز بتی بابر لٹکائے ہوئے ہوتا تھا۔ تب کہیں اے قصبے کاریل کی پٹری کی دوسری طرف والا حصہ نظر آتا، جہاں اب بتیاں روشن ہو چکی ہوتیں، اور اے یوں لگتا جیسے گاڑی کو دیکھنے ہی میں وہ کسی دوسرے قصبے میں جا پہنچا ہو۔ شاید اسی وجہ سے اس نے برسہ پر اسٹیشن پر موجود ہونے کی عادت ڈال لی تھی جواب بھی قائم تھی حالانکہ بعد ازاں انھوں نے کیلے کے باغوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو گولی مار دی تھی، اور باغ بھی ختم ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ ایک سو چالیس ڈبوں والی گاڑی بھی، اور اس کی جگہ یہ پہلے ڈبوں والی گرد آلود گاڑی رہ گئی تھی جو کسی کو لاتی تھی نہ لے جاتی تھی۔

لیکن اس سنیچر کو بہر حال ایک شخص اس گاڑی سے آیا تھا۔ جب مقدس قربان گاہ کا پادری ایمنٹونی ازائیل اسٹیشن سے بابر نکل رہا تھا تو ایک خاموش سے لڑکے نے، جس کے چہرے پر بھوک کے آسمار کے سوا کوئی خاص بات نہ تھی، گاڑی کے آخری ڈبے کی کھڑکی میں سے اُسے دیکھا تھا اور عین اسی وقت اُسے یہ بھی یاد آیا تھا کہ پچھلی دوپہر سے اس نے کچھ نہیں کھایا۔ اس نے سوچا، اس قصبے میں اگر پادری ہے تو یقیناً کوئی کھانے پینے کی جگہ بھی ہوگی۔ اور وہ گاڑی سے اتر آیا اور سڑک پار کر کے، جس پر اگست کے دہکتے سورج کی گرمی سے چھالے پڑے ہوئے تھے، اسٹیشن کے عین سامنے ایک عمارت میں داخل ہو گیا۔ اس عمارت کے اندر سامنے میں کچھ ٹھنڈک تھی اور وہاں سے ایک نگھے ہوئے گراموفون رکارڈ کی آواز آرہی تھی۔ اس کی حسِ شامہ نے جو دو روز کی بھوک سے اور بھی تیز ہو چکی تھی، اسے بتایا کہ یہ ہوٹل ہے۔ اور وہ "ہوٹل ماکوندو" کے سائن بورڈ کو دیکھے بغیر اندر چلا گیا، وہ سائن بورڈ جسے پڑھنے کا اسے زندگی میں کوئی اور موقع نہیں ملنے والا تھا۔

ہوٹل کی مالکہ کو پانچ ماہ سے زیادہ کا حمل تھا۔ اس کا رنگ مسروں کی طرح پیلا تھا، بالکل ویسا ہی جیسا اُس کی ماں کا تھا جب وہ اس کے پیٹ میں تھی۔ لڑکے نے کھانے کا آرڈر دیا اور کہا، "جتنی جلدی ہو سکے!" لیکن اس عورت نے جلدی دکھائے بغیر سوپ کا پیالا اس کے آگے رکھا۔ سوپ میں بغیر گوشت کی ایک بڈمی تھی اور کچے کیلے کے کٹے ہوئے چند ٹکڑے تھے۔ اسی وقت گاڑی نے سیٹی دی۔ سوپ کی گرم اور صحت مند بھاپ میں منہمک لڑکے نے ہوٹل سے اسٹیشن تک کے فاصلے کا ذہنی طور پر اندازہ لگایا اور یکدم افراتفری سے پیدا ہونے والے اس ہول کا شکار ہو گیا جس سے وہ لوگ دوچار ہوتے ہیں جن کی گاڑی بھوٹ گئی ہو۔

اس نے دوڑنے کی کوشش کی۔ وہ کرب کی حالت میں دروازے تک پہنچا، لیکن ابھی اس

نے دہلیز کے باہر ایک قدم بھی نہ رکھا تھا کہ اسے احساس ہو گیا کہ وہ گاڑی نہ پکڑ سکے گا۔ جب وہ میز پر واپس آیا تو وہ اپنی بھوک فراموش کر چکا تھا؛ اس نے گراموفون کے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھا جو اسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسا دم ہلاتے ہوئے کسی کتے کے چہرے پر ہوتا ہے۔ تب سارے دن میں پہلی بار اس نے اپنے سر سے بیٹ اتار دیا جو اس کی ماں نے اسے دو ماہ قبل تحفے کے طور پر دیا تھا، اور کھانے کے دوران وہ بیٹ کو گھٹنوں میں دبائے بیٹھا رہا۔ جب وہ میز سے اٹھا تو گاڑی چھوٹ جانے کے باعث پریشان نظر نہ آتا تھا، اور نہ اس امکان سے رنجیدہ تھا کہ اسے اگلے دو روز اس قصبے میں گزارنے ہوں گے جس کا نام تک جاننے کی اس نے کوشش نہیں کی تھی۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں، اپنی بیٹھ کو ایک کرسی کی سیدھی اور سخت پشت سے ٹکا کر بیٹھ گیا، اور دیر تک گراموفون پر بجتے ہوئے رکارڈوں کو سننے بغیر وہاں بیٹھا رہا، حتیٰ کہ رکارڈوں کا انتخاب کرتی ہوئی لڑکی نے اسے مخاطب کر کے کہا:

"باہر برآمدے میں گرمی کم ہے۔"

اس نے خود کو بے آرام موس کیا۔ اجنبیوں کے ساتھ گفتگو شروع کرنا اس کے لیے ہمیشہ سے مشکل رہا تھا۔ لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے سے وہ خوف زدہ رہتا تھا، اور جب بات کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ جاتا تو اسے یوں لگتا جیسے الفاظ اس طرح ادا نہیں ہو سکے جیسے وہ چاہتا تھا۔ "ہاں"، اس نے جواب دیا اور اسے خفیف سی لچکی آئی۔ اس نے کرسی کو جھلانے کی کوشش کی مگر یہ بھول گیا کہ وہ جھولنے والی کرسی میں نہیں بیٹھا۔

"جو لوگ بھی یہاں آتے ہیں وہ کرسی برآمدے میں لے جاتے ہیں، اس لیے کہ وہاں ٹخنہ بکھرتی ہے،" لڑکی نے کہا۔ اس کی بات سننے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ کتنی شدت سے گفتگو کرنے کی خواہش مند تھی۔ اس نے لڑکی پر ایک اُپٹتی ہوئی نگاہ ڈال لی، اس وقت جب وہ گراموفون کو چابی دے رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ مہینوں، بلکہ شاید برسوں سے وہیں بیٹھی ہے اور وہاں سے بٹنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ وہ گراموفون کو چابی تو دے رہی تھی مگر اس کی پوری جان لڑکے ہی پر مرکوز تھی۔ پھر وہ مسکرانے لگی۔

"شکریہ"، لڑکے نے جواب دیا اور اٹھنے میں اور اپنی دوسری حرکات میں کچھ روانی اور بے ساختگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لڑکی اپنی نظریں اس پر گاڑے رہی اور بولی، "اور وہ لوگ اپنے بیٹ کھونٹے پر ٹھادیا کرتے ہیں۔"

اس بار اسے اپنے کان جلتے ہوئے موس ہوئے۔ لڑکی کے تجاویز دینے کے انداز کے بارے میں سوچ کر اسے لچکی سی آئی۔ اس نے تکلیف دہ حد تک اپنے آپ کو گھرا ہوا موس کیا اور وہ

ایک بار پھر گاڑی چھوٹ جانے کے ہول کا شکار ہو گیا۔ لیکن اسی وقت مالک کمرے میں داخل ہوئی۔
"تم کیا کر رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"یہ کرسی گھسیٹ کر برآمدے میں لے جا رہا ہے، جیسے سب کرتے ہیں،" لڑکی نے کہا۔
لڑکی کے لمبے سے اسے لگا جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہی ہو۔

"کرسی گھسیٹنے کی ضرورت نہیں،" مالک نے کہا۔ "میں تمہیں اسٹول لائے دیتی ہوں۔"

لڑکی، ہنسی اور وہ مزید بدحواس ہو گیا۔ گرمی کافی تھی، خشک اور مسلسل پڑنے والی گرمی، اور اس کا پسینا بہہ رہا تھا۔ مالک ایک چمڑے کی فست والا کرسی کا اسٹول کھینچ کر برآمدے میں لے گئی۔ وہ کمرے سے باہر جانے ہی والا تھا کہ لڑکی نے دوبارہ بات کی۔
"مشکل یہ ہے کہ باہر اسے پرندے خوفزدہ کر سگے،" وہ بولی۔

لڑکے نے مالک کی اس سخت نگاہ کو دیکھ لیا جو اس نے لڑکی پر ڈالی تھی۔ وہ نگاہ مختصر، گر درشت تھی۔ "تمہارے لیے منہ بند رکھنا زیادہ مناسب ہو گا،" اس نے لڑکی سے کہا اور پھر لڑکے کی طرف مڑ کر مسکرائی۔ لڑکے کا اکیلے پن کا احساس کم ہو گیا اور اسے بات کرنے کی خواہش ہوئی۔
"اس نے کیا کہا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"یہ اس کا اپنا وہم ہے،" مالک نے کہا اور جبکہ کمرے کے درمیان رکھی چھوٹی سی میز پر پڑے کاغذی پھولوں کے گلدان کو ٹھیک کرنے میں لگ گئی۔ اعصابی اضطراب سے اس کی انگلیاں اینٹھ رہی تھیں۔

"میرا وہم ہے؟ نہیں،" لڑکی نے کہا۔ "پرسوں تم نے خود جھاڑو سے برآمدے میں سے دو مُردہ پرندوں کو پھینکا تھا۔"

مالک نے زچ اور لالچار ہو کر لڑکی کو دیکھا۔ لڑکی کے چہرے پر قابلِ رحم تاثر تھا، اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ہر بات کو اتنی تفصیل سے بیان کرے کہ شک کی گنجائش نہ رہ جائے۔

"بھائی، ہوا یہ تھا کہ کچھ لڑکوں نے اسے ستانے کی خاطر پرسوں دو مرے ہوئے پرندے یہاں ہال میں ڈال دیے اور اس سے کہا کہ آسمان سے مردہ پرندے گر رہے ہیں۔ اسے توجہ کوئی کچھ بتانے اس پر ایمان لے آتی ہے۔"

لڑکا مسکرایا۔ واقعے کی یہ جزئیات اسے مضحکہ خیز لگیں۔ وہ باتھ روم لڑکی کو دیکھنے کے لیے مڑا جو کرب کی حالت میں اسے دیکھنے جا رہی تھی۔ گراموفون چلنا بند ہو گیا تھا۔ مالک دوسرے کمرے میں چلی گئی، اور جب وہ ہال سے گزر کر باہر آنے لگا تو لڑکی نے وحشی آواز میں اصرار کیا:
"میں نے خود انہیں گرتے دیکھا تھا۔ یقین کرو، ہر ایک نے دیکھا ہے۔"

لڑکے کو محسوس ہوا جیسے اسے لڑکی کے گراموفون کے ساتھ چمٹے ہونے اور مالک کی بے چارگی کی وجہ سمجھ میں آگئی ہو۔ "ہاں،" اس نے ہمدردانہ لہجے میں سمجھا، اور بال کی جانب مڑتے ہوئے اضافہ کیا: "میں نے بھی دیکھا ہے۔"

باہر بادام کے درختوں سے گرمی کم تھی۔ اسٹول کو ٹیڑھا کر کے اس نے دروازے کی چوکھٹ سے ٹیک لگالی اور سر پیچھے ڈال کر اپنی ماں کے بارے میں سوچنے لگا۔ کام کاج سے تنگ کر وہ جمونے والی کرسی میں بیٹھی جھاڑو کے لمبے ڈنڈے سے مرغیوں کو پرے بٹانے میں مشغول ہو گئی اور اسے پہلی بار یہ احساس ہوا جو گا کہ اس کا بیٹا گھر میں نہیں ہے۔

ایک ہفتہ پہلے تک اس لڑکے کو یہی گمان تھا کہ اس کی زندگی ایک سیدھے تار کی طرح ہے جو پھیلی خانہ جنگی کے زمانے کے اس بارش کے دن سے لے کر، جب اس نے صبح سویرے قصبائی اسکول کی مٹی اور بھوسے سے بنی چار دیواری میں آنکھ کھولی تھی، اس کے پائیسویں جسم دن، جون کی اس صبح تک سیدھا کھینچا ہوا تھا، جب اس کی ماں نے اس کے جمونے تک آکر اسے ہیٹ کا تحفہ اور ایک کارڈ دیا تھا جس پر لکھا تھا: "میرے پیارے بیٹے کے لیے اس کے اپنے دن پر۔" کبھی کبھی وہ اپنی بے حرکت زندگی کا زنگ اتار کر اپنے اسکول کے دنوں کو یاد کیا کرتا: کلاس کے تختہ سیاہ کی اور اس ملک کے نقشے کی یاد جو کھسیوں کے گند سے گنجان تھا، اور دیوار پر لٹھی پیالیوں کی قطار کی یاد، جس میں ہر پیالی کے نیچے ایک بچے کا نام لکھا ہوا تھا، اسے ستایا کرتی۔ جس قصبے میں وہ رہتا تھا وہاں گرمی نہیں پڑتی تھی۔ وہ سرسبز، پرسکون سا قصبہ تھا جہاں خاکستری رنگ کی لمبی ٹانگوں والی مرغیاں اسکول کے اندر آ جایا کرتی تھیں اور ہاتھ منہ دھونے والے چبوترے کے نیچے بیٹھ کر انڈے دیا کرتی تھیں۔ اس کی ماں ان دنوں اداس اور کم گو عورت ہوا کرتی تھی۔ غروب آفتاب کے وقت وہ بیٹھ کر کافی کے باغوں سے نتھر کر آنے والی ہوا میں سانس لیا کرتی اور کہتی تھی کہ "نا نورے دنیا کا سب سے خوبصورت قصبہ ہے۔" اور پھر اس کی طرف مڑ کر، جو ان دنوں اپنے جمونے میں لیٹا روز بہ روز بڑا ہو رہا تھا، اس سے کہتی: "بڑے ہو کر یہ بات تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔" لیکن اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں، جب وہ اپنی عمر سے بڑا لگتا تھا اور سست روز زندگی کی ودیعت کی ہوئی گستاخانہ اور بے حرکت صحت سے پھٹا پڑ رہا تھا، اُس وقت بھی وہ سمجھ سے غاری تھا۔ اس کی بیسویں سالگرہ تک اس کی زندگی میں، سوائے اپنے جمونے والے بستر میں سونے کے انداز میں تبدیلی کے، کوئی اہم تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ لیکن انہی دنوں اس کی ماں کو جوڑوں کے درد کے باعث اٹھارہ سال کی نوکری کے بعد مددنی چھوڑنی پڑی تھی، نتیجے کے طور پر اسے اور اس کی ماں کو دو کمروں اور کشادہ آنگن والے مکان میں جا کر رہنا پڑا تھا۔ وہاں وہ

ناکسٹری رنگ کی لمبی ٹانگوں والی وہی مرغیاں پالنے لگے تھے جیسی کسی زمانے میں اسکول کے اندر ٹھس آیا کرتی تھیں۔

مرغیوں کی نگہداشت اس کا حقیقت کے ساتھ پہلا ربط تھا، اور جولائی کے مہینے تک وہی کلوتا ربط تھا۔ جولائی میں اس کی ماں نے اپنی رٹا رمنٹ کے متعلق سوچا تھا اور اپنے بیٹے کو اس بات کا اہل جانا تھا کہ اس بارے میں عرضی دعویٰ کرے۔ لڑکے نے نہایت موثر طریقے سے سروری کاغذات کی تیاری میں ہاتھ بٹایا تھا، حتیٰ کہ مناسب موقع شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے بھٹکے کے پادری کو ماں کی ہنستے کی تاریخ چھدا پیچھے کرنے پر بھی رضامند کر لیا تھا کیوں کہ اس تبدیلی کے بغیر اس کی ماں کی عمر ابھی رٹا رمنٹ کی نہیں بنتی تھی۔ جمعات کو اسے آخری ہدایات ملی تھیں جن میں اس کی ماں کی مدرسے کے تجربے کی تفصیلات انتہائی احتیاط سے بتائی گئی تھیں۔ تب اس نے بارہ پیسو جیب میں ڈال کر، کپڑوں کا ایک جوڑا اور کاغذات کا پلندا ساتھ لے کر شہر کی رف سفر شروع کیا تھا۔ لفظ رٹا رمنٹ سے اس نے بنیادی اور خاص طور پر یہ مراد لی تھی کہ لومت اسے کچھ رقم دے گی تاکہ وہ سوڑ پالنے کا کاروبار شروع کر سکے۔

ہوٹل کے برآمدے میں اونگھتے ہوئے، شدید گرمی سے بے سُدھ، اسے ابھی اپنی صورت ال کی سنگینی کا مکمل ادراک نہ ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگلے روز تک اس کی ساری پریشانی صرف اس حد تک تھی کہ اتوار کے روز سفر دوبارہ جاری کرنے کا انتظار کرے اور ہمیشہ کے لیے اس قصبے و فراموش کر دے جہاں اتنی شدید گرمی پڑتی تھی۔ چار بجے سے کچھ پہلے اسے اسٹکس والی مگر بے آرامی کی نیند آگئی اور وہ یہ سوچتے ہوئے سو گیا کہ اسے جھولنے والا بستر ساتھ لانا چاہیے تھا۔ اسی وقت اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے کپڑوں کی گٹھری اور ماں کی رٹا رمنٹ کے کاغذات گاڑی ہی میں بول آیا ہے۔ وہ خوف کے مارے چونک کر اٹھ بیٹھا اور اپنی ماں کے بارے میں سوچتے ہوئے بس بار پھر بول کا شمار ہو گیا۔

جس وقت وہ اسٹول کو گھسیٹ کر دوبارہ کھانے کے کمرے میں لایا، قصبے کی بتیاں جل اٹھی ہیں۔ اس نے کبھی بجلی کی روشنیاں نہ دیکھی تھیں اس لیے وہ ہوٹل میں غلط جگہوں پر لگے ب دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ اسے یاد آیا کہ اس کی ماں نے بجلی کے بارے میں اسے ایک بار بتایا تھا۔ ٹکڑیوں سے پختے ہوئے، جو گولیوں کی طرح شیشوں سے گمراہی تھیں، وہ اسٹول کو گھسیٹ کھانے کے کمرے کے اندر لے آیا۔ اس نے کھانا کھایا، مگر اس کی بھوک مرچکی تھی۔ کچھ تو اپنی ورت حال سے، کچھ شدید گرمی کی وجہ سے اور کچھ اپنے لکیلے پن کی تلمی سے، جس سے وہ پہلی بار شناس ہوا تھا، وہ تذبذب میں تھا۔ نو بجے کے بعد اسے عمارت کے عقبی حصے میں لکڑی کے بنے

ایک کمرے میں لے جایا گیا جس کی دیواروں پر اخباروں اور رسالوں کے کاغذ چپکے ہوئے تھے۔ آدھی رات کے وقت تک وہ ایک پہچانی اور بخار کی سی نیند میں ڈوب چکا تھا، جبکہ وہاں سے پانچ بلاک پر سے مقدس قربان گاہ کا پادری اینٹونی ازابیل بیٹسا سوچ رہا تھا کہ اس شام کو ہونے والے واقعات سے اس خطبے کو جو اس نے دوسرے دن صبح سات بجے کے لیے تیار کیا تھا، خاصی تقویت ملی ہے۔ بارہ بجے سے کچھ دیر پہلے وہ پورا قصبہ پار کر کے ایک عورت کے لیے آخری دنیاوی رسوم ادا کر کے آیا تھا اور ابھی تک برا لگینے اور مضطرب تھا، جس کے نتیجے میں رسوم ادا کرنے کی مقدس اشیا اس نے اپنے بستر کے قریب ہی چھوڑ دیں اور لیٹ کر صبح کے خطبے کے بارے میں سوچ بچار کرنے لگا۔ وہ کئی گھنٹے بستر میں یوں ہی اوندھا لیٹا رہا حتیٰ کہ اسے صبح کے وقت لمبی ٹانگوں والے پلوور پرندوں کی صدائیں سنائی دینے لگیں۔ تب اس نے بیدار ہونے کی کوشش کی اور تکلیف میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بستر سے نیچے اترتے ہوئے اس کا پاؤں مقدس گھنٹی پر پڑا اور وہ سیدھا سر کے بل اپنے کمرے کے ٹھنڈے اور سخت فرش پر جا گرا۔

بوش میں آتے ہی اسے اپنے جسم کے بائیں حصے میں رختے کا سا احساس ہوا جو اسے اوپر کی جانب اٹھتا ہوا لگا۔ اس لمحے میں وہ اپنے وجود کے بوجھ سے، جس میں اس کے جسم، گناہوں اور عمر کا بوجھ سب شامل تھے، مکمل طور پر آگاہ تھا۔ اپنے رخساروں کے نزدیک اسے پتھر لے کر فرش کے جمود کا احساس ہوا۔ جب وہ اپنے خطبے تیار کیا کرتا تھا تو اسی فرش کے ٹھوس پن سے اسے اسے راستے کا واضح تعین کیا کرتا جو جسم کی طرف جاتا تھا۔ ”خداوند،“ وہ خوف سے بڑبڑایا اور سوچنے لگا، اب میں کبھی نہیں اٹھ سکوں گا۔

اسے احساس نہیں تھا کہ وہ گر کر کتنی دیر زمین پر لیٹا رہا، نہ اس دوران میں اس نے کچھ سوچا، حتیٰ کہ اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ اسے نیک موت کے لیے دعا کرنی چاہیے۔ بس یوں تھا جیسے وہ ایک لمحے کے لیے حقیقتاً مر گیا ہو۔ لیکن جب اسے مکمل بوش آیا تو اسے کسی خوف یا درد کا کوئی احساس نہ رہا تھا۔ دروازے کے نیچے سے اسے صبح کا اُجالا دکھائی دیا۔ اس نے دور سے مرغوں کی افسردہ اور بھرائی ہوئی آواز سنی اور اسے معلوم ہوا کہ وہ زندہ ہے اور خطبے کے الفاظ اسے پوری طرح یاد ہیں۔

جب اس نے دروازے کے کواڑوں کے آگے آگئی ہوئی لکڑی بٹائی اس وقت صبح ہو رہی تھی۔ اسے اب کہیں درد کی شکایت نہ تھی، بلکہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گرنے کی چوٹ نے اسے بڑھاپے کے بوجھ سے آزاد کر دیا ہو۔ قصبے کی تمام اچھائی، بدکرداری اور اذیت اس کے جسم میں اُس وقت داخل ہوئی جب اس نے مرغوں سے بھری سیلی نمی والی ہوا میں پہلا سانس لیا۔ تب اس

سنیچر کے بعد کے دن

نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا جیسے خود کو تنہائی سے ہم آہنگ کرنا چاہتا ہو، اور صبح کے پرسکون سائے میں برآمدے میں ایک، دو، تین، مردہ پرندوں کو پڑے دیکھا۔

گومنٹ تک وہ ان تین پرندوں کے خیال میں مستغرق رہا، اور اپنے تیار کردہ خطبے کی روشنی میں سوچتا رہا کہ ان تین پرندوں کی انسانی موت کفارے کی آرزو مند ہے۔ پھر وہ چلتا ہوا برآمدے کے دوسرے کونے تک گیا اور تینوں مردہ پرندوں کو اٹھا کر واپس پانی کے مٹکے تک لے آیا۔ پھر اس نے اپنی حرکت کا مقصد جانے بغیر تینوں پرندوں کو یکے بعد دیگرے مٹکے کے اندر سبز اور ساکت پانی میں ڈال دیا۔ تین اور تین مل کر نصف درجن پرندے ہو گئے، وہ سوچنے لگا، اور وہ بھی ایک ہفتے کے اندر، اور ذہنی درخندگی کے معجزاتی شعلے نے اسے احساس دلایا کہ وہ اپنی زندگی کا سب سے اہم دن گزارنے والا ہے۔

سات بجے گرمی شروع ہو گئی۔ ہوٹل میں اکیلا کرایہ دار ناشتے کا منتظر تھا۔ گراموفون والی لڑکی ابھی بیدار نہ ہوئی تھی۔ مگر اس کے قریب آئی، اور اس وقت یوں لگا جیسے گھنٹے کے ساتھ جانے کی آوازیں اس کے بجولے ہوئے پیٹ کے اندر سے آئی ہوں۔

”تو تمہاری گاڑی چھوٹ گئی،“ اس نے تاخیر سے کیے گئے افسوس کے لہجے میں کہا۔ اس نے ناشتہ لڑکے کے سامنے رکھا۔ ناشتے میں دو دودھ والی کافی، تھلا ہوا انڈا اور کچے کیلے کے قتلے تھے۔ لڑکے نے کھانے کی کوشش کی مگر اسے بالکل بھوک نہ تھی۔ وہ ڈر رہا تھا کہ گرمی ابھی سے پڑنی شروع ہو گئی ہے۔ بالٹیوں کے حساب سے اس کا پسینا بندہ رہا تھا اور دم گھٹ رہا تھا۔ وہ کپڑے پہنے پہنے رات ٹھیک سے سویا بھی نہ تھا اور اب اسے کچھ بخار سا تھا۔ اسے پھر ہول سا اٹھا اور اپنی ماں کی یاد آئی، عین اس وقت جب مالک نے آکر میز پر سے برتن اٹھانے شروع کیے۔ اس نے بڑے بڑے سبز پھولوں والا نیا لباس پہن رکھا تھا اور بہت تابندہ لگ رہی تھی۔ اس کے لباس سے لڑکے کو یاد آیا کہ آج اتوار ہے۔

”کیا یہاں عبادت ہوتی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں ہوتی تو ہے،“ مالک نے جواب دیا۔ ”مگر نہ ہونے کے برابر۔ کوئی عبادت کے لیے جاتا ہی نہیں۔ بات یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں نیا پادری ہی نہیں بھیجا۔“

”اس والے میں کیا خرابی ہے؟“

”ایک تو وہ سو سال کا ہے اور دوسرے آدھا پاگل ہے،“ عورت نے کہا۔ وہ ساکت، کچھ سوچتے ہوئے، ایک ہی بات میں تمام برتن تھامے کھڑی تھی۔ پھر وہ بولی: ”کچھ روز پہلے کی بات ہے اس نے منبر پر قسم کھا کر کہا تھا کہ اس نے ابلیس کو دیکھا ہے۔ اس دن سے لوگوں نے عبادت

کے لیے جانا چھوڑ دیا ہے۔

جہاں چہ کچھ تو اپنی امید شکن صورت حال کی وجہ سے اور کچھ سوسا آدمی کو دیکھنے کے تجسس میں وہ لڑکا گرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے احساس ہوا کہ یہ ایک مردہ قصبہ ہے جس کی گلیاں ختم نہ ہونے والی اور گرد آلود ہیں اور جس کے لکڑی کے بنے، جست کی چھتوں والے اندھیرے گھر، غیر آباد لگتے ہیں۔ اتوار کے دن قصبے کی یہ حالت تھی: گھاس سے خالی گلیاں، بغیر جالیوں کے گھر، نیچے متمنائی ہوئی گرمی اور اوپر شان دار آسمان۔ اس نے سوچا کہ یہاں کوئی ایسی علامت نہیں ہے جس سے اتوار اور کسی دوسرے دن کا فرق معلوم ہو سکے۔ ویران گلیوں میں چلتے ہوئے اسے اپنی ماں کی بات یاد آئی: "سارے قصبوں میں ساری گلیاں لازماً یا تو گرے کو جاتی ہیں یا قبرستان کو۔" وہ پتھر کی اینٹوں کے بنے ایک چھوٹے سے چوک میں داخل ہوا جس میں ایک سفیدی کی ہوئی عمارت تھی، جس کا ایک مینار تھا اور اوپر ایک مرغ بانما بنا ہوا تھا اور ایک گھڑیال تھا جس کی سونیاں چار بج کر دس منٹ پرر کی ہوئی تھیں۔

چوک کو عبور کرنے میں جلدی کیے بغیر وہ گرے کی ڈیوڑھی کی تین سیرٹھیاں چڑھا، اور اسے پرانے پسینے اور لوبان کی ملی جلی بو آئی۔ وہ تقریباً خالی گرے کے اندر کے نیم گرم سائے میں داخل ہو گیا۔

مقدس قربان گاہ کا پادری اینٹوئی ازابیل ابھی منبر پر کھڑا ہی ہوا تھا۔ وہ اپنا وعظ شروع کرنے والا تھا جب اس نے ایک لڑکے کو ہیٹ پہنے گرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ لڑکے نے اپنی بڑی بڑی، شفاف اور پُر سکون آنکھوں سے خالی گرے کا بغور جائزہ لیا۔ پھر اس نے اسے آخری بچ پر بیٹھتے دیکھا۔ اس نے مشاہدہ کیا کہ لڑکا قصبے میں نیا نیا آیا ہے۔ وہ پچھلے تیس برس سے اس قصبے میں رہ رہا تھا اور وہاں کے ہر باسی کو اس کی بو سے پہچان سکتا تھا۔ اس لیے اسے یقین تھا کہ یہ لڑکا جوا بھی گرے میں داخل ہوا ہے، قصبے میں اجنبی ہے۔ ایک ہی مختصر اور گہری نظر میں اس نے جان لیا کہ وہ خاموش طبع اور اداس سا ہے اور اس کے کپڑے گندے اور شکن آلود ہیں جیسے وہ انھیں پہنے پہنے دیر تک سوتا رہا ہو۔ یہ بات سوچتے ہوئے اسے لڑکے سے گھٹن بھی آئی اور اس پر ترس بھی آیا۔ ساتھ ہی اسے بچ پر بیٹھے دیکھ کر اس کا دل تنگتر سے بھی بھر گیا اور وہ اپنا وہ خطبہ دینے کے لیے تیار ہوا جو اس کی زندگی کا سب سے اہم خطبہ تھا۔ خداوند، اس نے اس دوران میں سوچا، لڑکے کو اپنا ہیٹ اتارنا یاد رہ جائے اور یہ نہ ہو کہ مجھے اسے گرے سے بے دخل کرنا پڑے۔ اور اس نے اپنا خطبہ شروع کر دیا۔

شروع میں یہ جانے بغیر کہ وہ کیا کہہ رہا ہے وہ بولتا چلا گیا۔ وہ اپنی بات خود نہیں سن رہا

تھا۔ وہ ہموار، ہستا ہوا صاف نغمہ جو دنیا کے آغاز سے اس کی روح کی گہرائی میں رواں تھا، اس نے مشکل ہی سے سنا۔ اسے مبہم سا احساس ضرور تھا کہ وہ لفظ جو اس کے ہونٹوں سے ادا ہو رہے ہیں، صبح، مناسب اور بر محل ہیں اور متوقع ترتیب میں ہیں۔ اسے یوں لگا جیسے نیم گرم بخارات اسے اندر سے دبا رہے ہوں، لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کی روح نمود و نمائش کے جذبے سے پاک ہے اور یہ کہ خوشی کا احساس جو اسے مغلوج کیے دے رہا ہے اُس کا تکبر، سرکشی یا خود نمائی سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ وہ اس کی روح کی خداوند خدا سے محض شادمانی کا اظہار ہے۔

اپنے سونے کے کمرے میں ریبا، یہ جانتے ہوئے کہ چند ہی لمحوں میں گرمی ناقابلِ برداشت ہو جائے گی، بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔ اگر اسے نئی جگہوں سے گھرے خوف کی بنا پر اس قصبے میں گڑے ہوئے ہونے کا احساس نہ ہوتا تو اپنے پردادا کی طرح، جس کے بارے میں اس نے سن رکھا تھا، کب کی ایک صندوق میں اپنا مال اسبابِ بند کر کے اور صندوق میں فینائیل کی گولیاں ڈال کر وہاں سے سدھار گئی ہوتی۔ لیکن اسے علم تھا کہ اسے موت یہیں آنی ہے، لمبی غلام گردشوں اور تو خواب گاہوں والے اسی گھر میں جس کی جالیوں کی جگہ گرمی کا موسم ختم ہونے پر اس کا خیال تھا کہ نیم شفاف شیشے لگوا لے گی۔ لہذا اس کا وہیں رہنے کا ارادہ تھا (اور یہ ارادہ، وہ جب بھی الماری میں اپنے کپڑے قرینے سے رکھتی، ہمیشہ دوہرایا کرتی تھی)، اور اس کا یہ بھی ارادہ تھا کہ اپنے "عالی مرتبت عم زاد" کو بھی لکھے گی کہ اس قصبے کے لیے کوئی جوان پادری بھیجا جائے تاکہ وہ ایک بار پھر اپنا نخل کے پھولوں والا ہیٹ پہن کر گرے میں جا سکے اور باربطِ عبادت کر سکے اور معقول اور اصلاحی وعظ سن سکے۔ کل سوموار ہے، اس نے سوچا، اور چپ کو نوشتہ لکھنے کے لیے مناسب القاب کی تلاش شروع کر دی (وہ القاب جنہیں کرنل بوئندیا نے بیسودہ اور گستاخانہ کہا تھا)۔ عین اس وقت آرنے نیدا نے جالی کا دروازہ کھولا اور چیخ کر کہا:

"سنیورا، لوگ کبہ رہے ہیں کہ فادر منبر پر کھڑے کھڑے پاگل ہو گیا ہے!"

بیوہ نے اپنا تلخ اور غیر معمولی طور پر پڑمردہ چہرہ دروازے کی جانب پھیرا۔ "وہ تو پچھلے پانچ سال سے پاگل ہے،" اس نے کہا۔ وہ کپڑے ترتیب سے رکھنے میں مصروف رہی، اور پھر بولی، "اس نے ایک بار پھر ابلیس کو دیکھ لیا ہو گا؟"

"اس بار ابلیس نہیں ہے، سنیورا،" آرنے نیدا نے کہا۔

"تو کون ہے؟" ریبا نے سنجیدگی اور لاتعلقی سے پوچھا۔

"اس بار وہ کھتا ہے کہ اس نے گردشِ زندہ یہودی کو دیکھا ہے۔"

بیوہ کو اپنی جلد پر کپڑے کپڑے ریگتے موسوس ہوئے۔ اس کے ذہن میں الجھے ہوئے

خیالات کا انبوهہ، جس میں پھٹی ہوئی جالیوں، گرمی، مردہ پرندوں اور طاعون کے درمیان تمیز کرنا مشکل تھا، "گردش زدہ یہودی!" کے الفاظ سن کر اس کے ذہن سے گزرا، جو اسے اپنے دور دراز بچپن کی کسی دوپہر میں سننے کے بعد سے یاد بھی نہ رہے تھے۔ تب اس نے برہم ہو کر اور سرد مہری سے اُس جانب قدم بڑھائے جدھر آرنے نیا اپنا منہ پیڑے کھڑی تھی۔

"بال، یہ سچ ہے،" اس نے کہا، اور اس کی آواز وجود کی گھرائی میں سے برآمد ہوئی۔ "مجھے اب پتا چلا کہ پرندے کیوں مر رہے ہیں۔"

دہشت کے مارے اس نے اپنے آپ کو کڑھائی والی چادر میں لپیٹا اور وہ چشم زدن میں طویل برآمدہ اور چیزوں سے بھرا خست کا کمرہ پار کر کے، گلی کا دروازہ کھول کر اور دو بلاک کا راستا طے کر کے گرے میں داخل ہو گئی، جہاں مقدس قربان گاہ کا پادری اینٹونی ازابیل اپنی نئی بست میں بیان دے رہا تھا: "میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اسے دیکھا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آج صبح جب میں حوناں بڑھئی کی بیوی کی آخری رسوم ادا کر کے واپس آ رہا تھا تو اس نے میرا راستا کاٹا، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کا چہرہ یسوع مسیح کی بدعا سے تیرہ ہو چکا تھا اور وہ جس جس راستے سے گزر رہا تھا وہاں اپنے پیچھے جلتے ہوئے انگارے چھوڑتا جا رہا تھا۔"

خطبے کے الفاظ ہوا میں تیرتے تیرتے رک گئے۔ پادری کو احساس ہوا کہ وہ اپنے ہاتھوں کے رخنے پر قابو پانے سے قاصر ہے، اس کا سارا جسم لکپکا رہا ہے اور پسینے کا ایک ٹھنڈا قطرہ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر لکیر سی بناتا ہوا نیچے سفر کر رہا ہے۔ رخنے اور پیاس اور انٹڑیوں میں شدید مروڑ کے باعث اور ایک آواز سن کر جو آگن پر کھرج کے سر جیسی تھی، اسے لگا جیسے وہ سنت علیل ہو۔ لیکن اس وقت اصل حقیقت اس پر آشکار ہوئی۔

اس نے دیکھا کہ گر جا لوگوں سے بھر چکا ہے، اور ربیکا، دکھاوے اور بناوٹ کی شوقین وہی حسرت ناک عورت، بازو کھولے اور اپنا درشت اور سرد چہرہ آسمان کی طرف اٹھائے، ناف کلیسا میں بجلی آرہی ہے۔ پریشانی کے عالم میں اسے یہ تواندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے سامنے کیا ہو رہا ہے، اور اسے اب اتنی سمجھ بھی تھی کہ اس واقعے کو معجزہ سمجھنا خود پسندی کی بات ہوگی۔ انگسار کے ساتھ اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ منبر کے چوٹی کنارے پر رکھ دیے اور خطبہ دوبارہ جاری کیا۔

"تب وہ میری طرف بڑھا،" اس نے کہا۔ اس بار اسے اپنی جذبے سے بھرپور اور یقین دلانے والی آواز سنائی دی۔ "وہ میری طرف بڑھا، اور اس کی آنکھیں زمرد کی طرح تھیں، اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کے پاس سے ایسی بو آرہی تھی جیسی سمیر بکریوں کے پاس سے آیا کرتی ہے۔ تب میں نے اپنا ہاتھ اٹھا کر اسے یسوع مسیح کے نام پر ملاست کی اور کہا: "رک جاؤ، اتوار

کا دن قربانی کے لیے مناسب نہیں ہوتا۔"

جب وہ خطبے سے فارغ ہوا گرمی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، اگست کے مہینے کی شدید، جامد، سوخت کرنے والی ناقابل فراموش گرمی، لیکن پادری اینٹونی ازابیل کو اب گرمی کا احساس نہیں تھا۔ اسے علم تھا کہ اس کی پشت پر پورا قصبہ اس کے خطبے کے اثر سے ایک بار پھر منکسر اور بے زبان بن چکا ہے، مگر یہ بات اس کے لیے باعث انبساط نہ تھی۔ نہ ہی اسے اس امکان سے خوشی ہوئی تھی کہ شراب کا ایک گلاس اس کے گلے کی غار گرمی کا علاج کر دے گا۔ وہ بے آرام اور مضطرب تھا۔ اس کا داغ ادھر ادھر بھٹک رہا تھا اور وہ قربانی کے بُر عظمت لے پر دھیان نہ دے پا رہا تھا۔ یہ قصہ اس کے ساتھ عرصے سے ہو رہا تھا، لیکن آج اس کے ذہن کی ابتری مختلف تھی کیوں کہ آج اس کا ہر احساس واضح بے چینی کا شکار تھا۔ تب، زندگی میں پہلی مرتبہ، اسے تکبر کا تجربہ ہوا۔ اور عین اسی طرح جیسے اس نے تکبر کو جانا تھا اور اپنے وعظوں میں بیان کیا تھا، اسے احساس ہوا کہ تکبر بھی پیاس کی طرح جسم کی ایک ضرورت ہے۔ اس نے تبرکات رکھنے کے صندوق کا ڈھکلنا زور سے بند کیا اور پکارا:

"فیڈا غورٹ!"

مددگار ملازم، مُنڈے ہوئے چمکدار سروالا ایک لڑکا، جو کہ پادری اینٹونی ازابیل کا لے پالک تھا اور جس کا اس نے خود یہ نام رکھا تھا، قربان گاہ کی جانب بڑھا۔
"لوگوں سے نذر کے پیسے اکٹھے کرو،" پادری نے کہا۔
لڑکے نے آنکھیں جھپکائیں اور ایڑیوں پر پورا گھوم گیا اور پھر بے حد وحشی آواز میں بولا،
"مجھے پتا نہیں کہ نذر والی تمالی کدھر ہے۔"

یہ ٹھیک بھی تھا۔ مہینوں ہو گئے تھے کہ کسی نے کبھی نذر اکٹھی نہ کی تھی۔

"تو مخزن میں سے ایک تھیلا لے آؤ اور جتنی رقم اکٹھی کر سکتے ہو، کرو،" پادری نے کہا۔

"اور لوگوں سے کھنا کیا ہے؟" لڑکے نے پوچھا۔

اب پادری کی آنکھیں جھپکانے کی باری تھی۔ وہ غور سے لڑکے کی منڈی ہوئی نیلی کھوپڑی اور اس کے سر کی ہڈیوں کے جوڑوں کا مطالعہ کرتا رہا۔

"لوگوں سے کھو کہ یہ رقم گردش زدہ یہودی کو خارج کرنے کے لیے ہے۔" یہ کہتے وقت اسے محسوس ہوا جیسے وہ اپنے دل میں بہت بڑے بوجھ کو منہال رہا ہو۔ چند لمحے تک اس نے خاموش معبد میں موم بتیوں کے جل کر پانی بننے کی، اور اپنی براکینٹز اور دشوار سانس کی آمدورفت کی آواز سنی۔ پھر مددگار ملازم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر، جو اسے اپنی گول پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھے

جابر با تھا، پادری نے اس سے کہا:
"اور پھر ساری رقم اکٹھی کر کے جا کر اس لڑکے کو دے دینا جو خطبے کے شروع میں اکیلا بیٹھا
تھا۔ اسے کہنا کہ یہ پادری کی طرف سے ہے اور یہ کہ وہ اپنے لیے نیا ہیٹ خرید لے۔"

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ: آصف فرخی

کاغذی گلاب

صبح سویرے کی اُداسی میں اپنا راستا تلاش کرتے ہوئے، میتا نے بغیر آستینوں والا وہ لباس پہن لیا جو ایک رات پہلے اس نے مسمری کے پاس ٹانگ رکھا تھا، اور بڑے صندوق کے اندر اس کی الگ ہو جانے والی آستینیں ڈھونڈنے لگی۔ پھر اس نے انھیں دیوار پر لگی کیلوں پر تلاش کیا، دروازوں کے چبھتے ڈھونڈا، اس احتیاط کے ساتھ کہ شور نہ مچے تاکہ اس کی اندھی تانی نہ جاگ اٹھیں جو اس کمرے میں سو رہی تھیں۔ مگر جب وہ اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو گئی تو اس نے دیکھا کہ تانی تو پہلے ہی سے اٹھی ہوئی ہیں، اور باورچی خانے میں چلی آئی کہ ان سے آستینوں کے بارے میں دریافت کرے۔

"غسل خانے میں ہیں،" ناینا عورت نے کہا۔ "میں نے کل انھیں دھو ڈالا تھا۔" وہیں تھیں وہ، ایک تار پر لکڑی کی دو چنگیوں سے ٹپکی ہوئی تھیں۔ وہ ابھی تک گیلی تھیں۔ میتا واپس باورچی خانے میں گئی اور آستینوں کو آتش دان کے پتھروں پر پھیلا دیا۔ اس کے سامنے ناینا عورت بیٹھی کافی پیمینٹ رہی تھی؛ اس کی مردہ پتلیاں برآمدے کی پتھرلی حد پر جمی ہوئی تھیں، جہاں گملوں کی ایک قطار میں جڑی بوٹیاں اگ رہی تھیں۔

"آئندہ سے میری چیزیں مت لینا،" میدا نے کہا۔ "آج کل دھوپ کا کوئی بھروسا نہیں۔"

نایدتا عورت نے اپنا چہرہ آواز کے رخ پر کر لیا۔

"میں بھول گئی تھی کہ آج پہلا جمعہ ہے۔"

لمبا سانس بھر کے، یہ دیکھنے کے بعد کہ کافی تیار ہے یا نہیں، اس نے برتن آگ پر سے اتار دیا۔

"کاغذ کا ٹکڑا نیچے رکھ لو، کیوں کہ یہ پتھر میلے ہیں۔" میدا نے اپنی انگشت شہادت آتش دان کے پتھروں پر پھیر کر دیکھی۔ وہ میلے تھے مگر ان پر جی ہوئی راکھ کی تہہ سخت پڑ چکی تھی جو آستینوں کو اس وقت تک میلانہ کرتی جب تک انہیں پتھروں پر رگڑا نہ جاتا۔

"اگر یہ میلی ہو گئیں تو تم ذمہ دار ہو گی،" اس نے کہا۔

نایدتا عورت نے اپنے لیے ایک پیالی کافی انڈیل لی۔ "تم غصے میں ہو،" اس نے برآمدے کی طرف کرسی گھسیٹتے ہوئے کہا۔ "غصے کی حالت میں عشاءے ربانی حاصل کرنا بے حرمتی ہے۔" وہ صحن میں گلابوں کے سامنے کافی پینے بیٹھ گئی۔ جب گرہا کی رسم عبادت کے لیے تیسری گھنٹی بجی تو میدا نے آتش دان پر سے آستینیں اٹھائیں جو آب تک گیلی تھیں، مگر اس نے پس لیں۔ فادر اسٹبل اُسے برہنہ ٹانگوں کے ساتھ عشاءے ربانی وصول کرنے نہیں دیں گے۔ اس نے منہ نہیں دھویا۔ اس نے چہرے پر سرخی کے آثار تو لیے سے مٹائے، دعاؤں کی کتاب اور مثال اٹھائی، اور سرک پر ٹکل آئی۔ کوئی پاؤ گھنٹے بعد وہ واپس آگئی۔

"تم وہاں کتاب مقدس کی تلاوت کے بعد ہی پہنچ پاؤ گی،" نایدتا عورت نے صحن میں گلابوں کے سامنے بیٹھے بیٹھے کہا۔

میدا سیدھی بیت الخلا میں گھس گئی۔ "میں عبادت میں نہیں جاسکتی،" اس نے کہا۔ "میری آستینیں گیلی ہیں اور سارے لباس پر سلوٹیں ہیں۔" اسے احساس ہوا جیسے سب کچھ جاننے والی نگاہیں اس کا ہچکا کر رہی ہیں۔

"پہلا جمعہ ہے اور تم عبادت کے لیے نہیں جا رہیں،" نایدتا عورت پکار اٹھی۔ بیت الخلا سے واپس آ کر میدا نے اپنے لیے پیالی میں کافی انڈیلی اور تازہ سفیدی کیے ہوئے دروازے کی چوکھٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی، نایدتا عورت کے پاس۔ مگر وہ کافی نہ پی سکی۔

"سارا قصور تمہارا ہے،" وہ دبے دبے کینہ توڑ لہجے میں بولی، اس احساس کے ساتھ کہ وہ اپنے آنسوؤں میں ڈوبی جا رہی ہے۔

"تم رورہی ہو،" تائینا عورت نے پکار کر کہا۔

اس نے پانی ڈالنے کا فوارہ اور لگانو کے گھلے کے پاس رکھ دیا، اور یہ دوہراتے ہوئے کہ "تم رورہی ہو،" برآمدے میں چلی آئی۔ میتا نے اپنی پیالی زمین پر گکادی اور تن کر بیٹھ گئی۔

"میں غصے کے مارے رورہی ہوں،" اس نے کہا، اور تانی کے پاس آتے ہوئے بولی،

"تمہیں گرے میں جا کر اعتراف کرنا پڑے گا کہ تمہاری وجہ سے مجھے پہلے جمعے کا عشاء نے ربانی چھوڑنا پڑا۔"

تائینا عورت ساکت بیٹھی رہی، اس انتظار میں کہ میتا خواب گاہ کا دروازہ بند کر دے۔ پھر وہ برآمدے کے سرے تک چلتی ہوئی گئی۔ وہ رک رک کر جھکی، یہاں تک کہ اسے زمین پر رکھی ہوئی پیالی مل گئی، جسے بھجوا بھی نہ گیا تھا۔ پیالی کی کافی گھلے میں اندھیلے ہوئے وہ کہتی رہی:

"خدا جانتا ہے میرا ضمیر صاف ہے۔"

میتا کی ماں خواب گاہ سے نکل آئی۔

"تم کس سے باتیں کر رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کسی سے بھی نہیں،" تائینا عورت نے کہا۔ "میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ میں پاگل ہوتی جا رہی ہوں۔"

اپنے کمرے میں محفوظ ہو کر میتا نے اپنی چولی کے بند کھولے اور تین چھوٹی چابیاں نکالیں جو وہ سیفٹی پن میں لگائے رکھتی تھی۔ ان میں سے ایک چابی سے اس نے سنگھار میز کی نجلی دراز کھولی اور لکڑی کی چھوٹی سی صندوقچی نکالی۔ صندوقچی کو دوسری چابی سے کھولا۔ اس کے اندر رنگ دار کاغذ پر لکھے گئے خطوں کا ایک پُلند تھا جس پر ربر برینڈ چڑھا ہوا تھا۔

اس نے انہیں اپنی چولی میں چھپا لیا، صندوقچی جگہ سے رکھی، اور دراز میں تالا لگا دیا۔ پھر وہ بیت الخلاء گئی اور خط پھینک دیے۔

"میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم گرے گئی ہو،" جب میتا باورچی خانے میں آئی تو اس کی ماں نے کہا۔

"یہ جانیں سکی،" تائینا عورت بیچ میں بول اٹھی۔ "میں بھول گئی کہ آج پہلا جمعہ ہے، اور میں نے کل دوپہر اس کی آستینیں دھو ڈالیں۔"

"اب تک گیلی ہیں،" میتا بڑبڑائی۔

"آج کل مجھے بری محنت کرنی پڑتی ہے،" تائینا عورت نے کہا۔

"مجھے ایسٹر کے لیے پچاس اوپر سو درجن گلاب تیار کر کے دینے ہیں،" میتا نے کہا۔

دھوپ جلدی تیز ہو گئی۔ سات بجے سے پہلے مینا نے بڑے کمرے میں کاغذی گلابوں کی دکان سجائی: ایک ٹوکری بھر کر پتھر ٹیاں اور تار، ایک ڈبا کرپ کے کاغذ، دو قینچیاں، دھاگے کی ایک لچھی اور لٹی کا برتن۔ ایک لمحے بعد ترینیداد بغل میں دفقی کا ڈبا دبائے آ گئی، اور اس سے پوچھنے لگی کہ وہ عبادت کے وقت کیوں نہیں آئی۔

"میرے پاس آستینیں نہیں تھیں،" مینا نے کہا۔

"کوئی بھی تھیں اُدھار دے دیتا،" ترینیداد بولی۔

اس نے کرسی کھینچی اور پتھر ٹیوں کی ٹوکری کے پاس بیٹھ گئی۔

"بہت دیر ہو چکی تھی،" مینا کہنے لگی۔

اس نے ایک گلاب مکمل کیا۔ پھر ٹوکری اپنے پاس کر لی کہ پتھر ٹیوں میں قینچی سے چنٹ ڈال سکے۔ ترینیداد نے دفقی کا ڈبا زمین پر رکھ دیا اور کام میں شامل ہو گئی۔ مینا نے ڈبے کی طرف دیکھا۔

"تم نے جو تے خرید لیے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ مرے ہوئے چوبے ہیں،" ترینیداد نے کہا۔

چوں کہ ترینیداد پتھر ٹیوں میں چنٹ ڈالنے کی ماہر تھی، مینا تار کو بک دے کر پھولوں کی ڈنڈیاں بنانے اور ان پر سبز کپڑا چڑھانے کا کام پورا کرتی۔ دونوں خاموشی سے کام کرتی رہیں، اس بات پر توجہ دیے بغیر کہ دھوپ، چھپے ہوئے مناظر اور خاندانی تصاویر سے بچے ہوئے کمرے کے اندر برہمی آرہی ہے۔ ڈنڈیاں ختم کر کے مینا نے اپنا چہرہ، جو کسی غیر مادی شے سے مکمل ہوتا ہوا لگ رہا تھا، ترینیداد کی طرف کر لیا۔ ترینیداد ٹانگیں جوڑے بیٹھی تھی اور پتھر ٹی کا کنارہ انگلیوں کے درمیان ذرا ذرا سرکاتے ہوئے بہت صفائی کے ساتھ چنٹ ڈال رہی تھی۔ مینا اس کے مردانہ جوتے کی طرف دیکھنے لگی۔ ترینیداد سر اٹھائے بغیر اپنے پیر ذرا سا چھچھے کیے ہوئے، اور کام روکے بغیر اس سے نظر چرا گئی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

مینا اس کی طرف جھکی۔

"وہ چلا گیا،" اس نے کہا۔

ترینیداد کی قینچی چھوٹ کر اس کی گود میں گر پڑی۔

"نہیں!"

"وہ چلا گیا،" مینا نے دوبارہ کہا۔

ترینیداد ٹکٹھی باندھے اسے دیکھتی رہی۔ اس کی آپس میں میں ملی ہوئی بھنوں کو ایک سیدھی لکیر تقسیم کر رہی تھی۔

"اور اب؟" اس نے پوچھا۔

مینا نے مضبوط لہجے میں جواب دیا:

"اب کچھ نہیں۔"

ترینیداد نے دس بجے سے پہلے الوداع کہہ دیا۔

اس قربت کے بوجھ سے آزاد ہو کر مینا نے ایک لمحے کے لیے کام روکنے کے بعد مردہ چوہے بیت الخلا میں پھینک دیے۔ نائینا عورت گلاب کی جھاڑی کی پچھٹائی کر رہی تھی۔

"میں شرط لگاتی ہوں کہ تم کو یہ نہیں معلوم کہ میرے پاس اس ڈبے میں کیا ہے،" مینا نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔ وہ چوہوں کو بلانے لگی۔

نائینا عورت متوجہ ہو گئی۔ "پھر سے ہلاؤ،" اس نے کہا۔ مینا نے وہی عمل دوہرایا، مگر نائینا عورت کان کی کو انگشت شہادت سے دبا کر تیسری دفعہ سننے کے بعد بھی ڈبے میں موجود اشیا کو نہیں پہچان سکی۔

"چوہے ہیں، جو گزشتہ رات گر جا کے چوہے دانوں میں پکڑے گئے،" مینا نے کہا۔

جب وہ واپس آئی تو نائینا عورت کے پاس سے کچھ کچھ بغیر گزر گئی۔ مگر وہ اس کے پیچھے بلی آئی۔ جب وہ بڑے کمرے میں داخل ہوئی تو مینا بند کھڑکی کے پاس اکیلی بیٹھی کاغذی گلاب مکمل کر رہی تھی۔

"مینا،" نائینا عورت نے کہا، "اگر تم خوش رہنا چاہتی ہو تو اجنبیوں کے سامنے اعتراف مت کیا کرو۔"

مینا نے کچھ کچھ بغیر اس کی طرف دیکھا۔ نائینا عورت اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور اس کے کام میں مدد دینے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر مینا نے اسے روک دیا۔

"تم گھبراہی ہو،" نائینا عورت نے کہا۔

"تم عبادت کے لیے کیوں نہیں گئیں؟" نائینا عورت نے پوچھا۔

"تم اس کی وجہ خوب اچھی طرح جانتی ہو۔"

"اگر صرف آستینوں کی وجہ ہوتی تو تم گھر سے باہر ہی نہ نکلتیں،" نائینا عورت نے کہا۔ "راستے میں کوئی تمہارا منتظر تھا جس نے تمہیں مایوس کیا۔"

مینا نے اپنے ہاتھ تانی کی آنکھوں کے سامنے یوں ہلانے جیسے کسی نادیدہ شیشے کو صاف کر

رہی ہو۔

"تم چڑیل ہو،" اس نے کہا۔

"تم آج صبح دو مرتبہ بیت الخلا گئیں،" تائینا عورت نے کہا۔ "تم ایک دفعہ سے زیادہ کبھی نہیں جاتیں۔"

میتا کاغذی گلاب بناتی رہی۔

"تم مجھے دکھانے کی ہمت کرو گی کہ تم نے سنگھار میز کی دراز میں کیا چھپا رکھا ہے؟"

تائینا عورت نے پوچھا۔

بہت آہستگی سے میتا نے گلاب کھڑکی میں دھرا، چولی میں ہاتھ ڈال کر تینوں چھوٹی پابیاں نکالیں اور تائینا عورت کے ہاتھ پر رکھ دیں اور اپنے ہاتھوں سے اس کی مصیبت بند کر دی۔
"ہاؤ خود اپنی آنکھوں سے جا کر دیکھ لو،" اس نے کہا۔

تائینا عورت اپنی انگلیوں سے ٹٹول کر پابیوں کا معائنہ کرتی رہی۔

"میری آنکھیں بیت الخلا کی تالی کے اندر نہیں دیکھ سکتیں۔"

میتا نے سر اٹھایا، اور اسے ایک نیا احساس ہوا: اسے یوں لگا جیسے تائینا عورت کو معلوم ہے کہ وہ اسے دیکھ رہی ہے۔

"اپنے آپ کو نالی میں گرا کر دیکھ لو، اگر تمہیں اتنی ہی دلچسپی ہے کہ میں کیا کرتی ہوں۔"

تائینا عورت نے اس گستاخی کو نظر انداز کر دیا۔

"تم بستر میں لیٹے لیٹے صبح تک جاگ کر لکھتی رہتی ہو،" اس نے کہا۔

"تم خود جتنی بجاتی ہو،" میتا نے کہا۔

"اور تم فوراً ٹارچ بجلا لیتی ہو،" تائینا عورت نے کہا۔ "میں تمہارے سانپوں کی آواز سے پہچان سکتی ہوں کہ اس وقت تم لکھ رہی ہو۔"

میتا نے کوشش کی کہ پرسکون رہے۔ "بہت اچھا،" اس نے سر اٹھائے بغیر کہا، "فرض کرو ایسا ہی ہے، تو پھر کیا خاص بات ہے اس میں؟"

"کچھ نہیں،" تائینا عورت نے جواب دیا۔ "صرف یہ کہ اس وجہ سے تم نے پہلے جمعے کی عشا نے ربانی چھوڑ دی۔"

دونوں ہاتھوں سے میتا نے دھاگے کی لچھی، قینچیوں اور آدھ بنے گلابوں اور ڈنڈیوں کو سمیٹ لیا۔ اس نے یہ سب چیزیں ٹوکری میں ڈال دیں، اور اپنا رخ تائینا عورت کی طرف کر لیا۔ "تم سننا چاہتی ہو کہ میں نے بیت الخلا میں کیا کیا؟" اس نے پوچھا۔ دونوں بے چینی سے

سانس روکے رہیں جب تک کہ میتا نے اپنے پوچھے ہوئے سوال کا جواب نہیں دے دیا:
"میں پانا نہ کرنے لگی تھی۔"

ناییتا عورت نے تینوں چھوٹی چابیاں ٹوکری میں پھینک دیں۔ "اچھا بہانہ ہے،" باورچی خانے میں جاتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔ "مجھے تمہاری بات کا اعتبار آ جاتا اگر تم نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایسا لفظ منہ سے نہ نکالا ہوتا۔" میتا کی ماں برآمدے میں مخالف سمت سے آرہی تھی؛ اس کے بازو کانٹے دار پھولوں کے گچھوں سے بھرے ہوئے تھے۔

"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"میں پاگل ہوں،" ناییتا عورت بولی، "مگر ظاہر بات ہے تمہیں تو مجھ کو پاگل خانے بھجوانے کا خیال اس وقت تک نہیں آئے گا جب تک میں پتھر نہ مارنے لگوں۔"

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ: فاروق حسن

برٹی ماما کا جنازہ

تو لیجیے حضرات، یہ رہی مغل عالم کے منکرین کے لیے، ماکوندو کی سلطنت کی مطلق العنان فرماں روا، برٹی ماما کی سچی داستان، جو بانوے برس بقید حیات رہی اور گزشتہ ستمبر کے ایک منگل کے روز، تحریم کی خوشبو میں لپٹی ہوئی، دنیا سے رخصت ہوئی، اور جس کے جنازے میں پاپائے اعظم نے بنفس نفیس شرکت فرمائی۔

ناظرین، اب جب کہ اس سانحے سے بدحواس قوم کا ذہنی توازن بحال ہو چکا ہے؛ اب جب کہ سان باسنتو کے بین بجانے والے، گواہی را کے اسمگلر، سینو کے چاولوں کے کاشتکار، گواکامایال کی طوائفیں، سیرپے کے ہادوگر اور اراکاتاکا کے کیلے کے باغوں کے مزدور، طویل اور مدّحال کر دینے والے ماتم سے فارغ ہو کر اپنے اپنے خیمے سمیٹ چکے ہیں، اور ان کی استقامت لوٹ آئی ہے؛ اب جب کہ جمہوریہ کے صدر، ان کے کابینہ کے ارکان اور سرکاری اور غیر مرئی طاقتوں کے تمام نمائندے، جو تایدخ کے ابواب میں رقم کیے جانے والے اس عالی شان جنازے میں شریک تھے، اپنی اپنی جاگیروں پر اپنا تسلط دوبارہ قائم کر چکے ہیں؛ اب جب کہ تقدسِ آب پاپائے اعظم اپنی روح اور جسم سمیت عرشِ بریں کی سمت سفر کر گئے ہیں؛ اور اب جب کہ

ماکوندو خالی بوتلوں اور ڈبوں، مجھے ہوئے سگہ ٹوں، چبائی ہوئی ہڈیوں، چیتھڑوں، اور غلاطت کے انباروں سے، جو جنازے میں شریک جم غفیر اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے، اٹ گیا ہے، حتیٰ کہ کوچہ و بازار میں چلتا پھرتا محال ہو چکا ہے؛ اب موقع آن پہنچا ہے کہ آدمی صدر دروازے کے آگے اسٹول ٹکا کر بیٹھے اور شروع سے لے کر اس قومی افراتفری کی داستان کو، پیشتر اس کے کہ یہ تاریخِ ذہنوں کے پیچھے چڑھ جائے، پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دے۔

چودہ ہفتے قبل، بڑی ماما نے، جو کہ اُن گنت راتوں سے پُلمٹوں، سرسوں کے پلاسٹروں اور جُلوکوں کا ہدف بنی رہی تھی، اور جو نزع کے عالم میں ہڈیاں کا شکار ہو چکی تھی، حکم دیا تھا کہ اسے اس کی بید کی جھولنے والی کرسی میں بٹھا دیا جائے تاکہ وہ اپنا وصیتی فرمان جاری کر سکے۔ یہی واحد کام ایسا تھا جو وہ مرنے سے قبل ادا کرنا ضروری سمجھتی تھی۔ اس صبح اس نے پادری اینتونی ایزابیل کی اعانت سے اپنے روحانی معاملات کو سنبھال لیا تھا، اور اب اپنے نو بھتیجے بھتیجیوں کی موجودگی میں، جو کہ اس کی سلطنت کے بلا شرکت غیرے وارث تھے اور اس کے بستر کے گرد جمع تھے، اپنے دنیاوی معاملات سے فراغت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ پادری جس کی سوئیں سالگرہ نزدیک تھی، اور جو اپنے آپ سے گفتگو کرتے رہنے کا عادی تھا، اسی کمرے میں مقیم تھا۔ دس آدمی اسے بڑی ماما کی خواب گاہ میں لے کر آئے تھے اور یہی مناسب سمجھا گیا تھا کہ وہ وہیں قیام کرے تاکہ ان آدمیوں کو اسے نیچے لے جانے اور پھر بڑی ماما کے آخری لمحات میں دوبارہ اوپر لانے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔

بڑی ماما کا سب سے بڑا بھتیجا، ٹکانور، دیومیکل اور وحشی آدمی، خاک کی کپڑوں میں ملبوس، ممیز لگے جوتے پہنے اور ۳۸ قطر کا ریوالور قمیص کے اندر لٹکانے، وکیل کی تلاش میں نکل گیا۔ عظیم الشان دومترہ حوصلی، جس میں اجوائن اور گڑ کے شیرے کی خوشبو رچی ہوئی تھی، اور جس کے تاریک حجرے صندوقوں اور پچھلی چار نسلوں کی، جو خاک ہو چکی تھیں، یادگاروں سے آٹے پڑے تھے، اُس متوقع لمحے کے انتظار میں مفلوج پڑی تھی۔ طویل مرکزی بال میں، جہاں اگلے زمانوں میں کھوٹوں پر ہلاک کیے ہوئے سؤر ٹنگے رہتے تھے یا جہاں برن اگست کے خوابیدہ اتواروں کو ذبح کیے جاتے تھے، اب چہرہ اسی نمک کی بوریلوں اور زراعتی سامان پر خوابیدہ تھے، اور احکام کے منتظر کہ کب چٹروں پر زینیں کسیں اور انہیں دوڑا کر وسیع و عریض جاگیر کے چاروں کونوں میں بُری خبر کی منادی کریں۔ خاندان کے باقی افراد دیوان خانے میں موجود تھے۔ عورتیں کم خوابی اور وراثت کی تقسیم کی طویل کارروائی سے تنک کر ادھ موٹی ہو رہی تھیں۔ وہ ایک سخت سوگ میں تھیں جو بے شمار جمع شدہ سوگوں کا نقطہ عروج تھا۔ بڑی ماما کی مادرانہ سخت

گہری اس کی خوش بختی اور شہرت کو چاروں جانب سے مقدس حفاظتی بارڈھ کی طرح گھیرے رہی تھی، اور اس بارڈھ کے عقب میں چھوں نے اپنی بختیجیوں کی اولادوں سے، عم زادوں اور خالہ زادوں نے اپنی خالوؤں سے، اور بھائیوں نے اپنی سالیوں سے شادیاں رچائی تھیں، حتیٰ کہ قرابت داریوں کا ایک گنجلک تانا بانا بن گیا تھا، جس نے افزائش نسل کے فریضے کو ایک شیطانی چکر بنا دیا تھا۔ صرف بڑی ماما کی سب سے چھوٹی بختیجی ماگدا لینا اس چکر سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکی تھی۔ اپنی وہی بد خوابی سے دہشت زدہ ہو کر اس نے پادری اینتونی ازابیل سے جن بھوت نکلوانے کا عمل کروایا تھا اور اپنا سرمند کر، دنیا کی شان و شوکت اور ظاہری بناوٹ کو تھک کر، مبلغوں کے علاقے کی مبتدی راہبواؤں کے گروہ میں شامل ہو گئی تھی۔

بنا بنا پٹہ خاندان کی سرحدوں پر مردوں نے، جاگیر دارانہ حقوق کو استعمال میں لاتے ہوئے، جاگیر کی نئی آبادیوں، دیہاتوں اور مویشی خانوں میں تاجاز اولاد کی ایک کھپپ پیدا کر دی تھی، اور یہ نسل، خاندانی نام کے بغیر، بڑی ماما کے نوکروں کے درمیان اس کی خادم، منظور نظر یا متوسل بنی زندگی گزار رہی تھی۔

بڑی ماما کی موت کی قربت نے ایک تھکا دینے والی توقع کو جنم دیا تھا۔ دوسروں سے اطاعت اور تعظیم حاصل کرنے کی خوگر، مرنے والی عورت کی آواز کسی بند کمرے میں کھرج کے سُر بھاتے ہوئے آرگن سے زیادہ بلند نہ تھی، مگر اس کی گونج جاگیر کے دور دراز کونوں میں بھی سنائی دے رہی تھی۔ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اس کی موت سے لا تعلق رہا ہو۔ اس پوری صدی کے دوران بڑی ماما ماکوندو کی کششِ ثقل کا مرکز بنی رہی تھی، اپنے ماں باپ، بھائیوں اور آباؤ اجداد کی طرح جو ماخنی میں دو سو برس سے حکمرانی کرتے چلے آ رہے تھے۔ شہر کا نام بھی اس کے خاندانی نام پر رکھا گیا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ بڑی ماما نے اپنی جاگیر کہاں سے حاصل کی تھی اور نہ کسی کو اس کی دولت اور جائیداد کی حد اور قیمت کا صحیح علم تھا۔ سب نے یہی سمجھ رکھا تھا کہ بڑی ماما، تمام بہتے ہوئے یا ساکن پانیوں، تمام بارشوں، خشک سالی کے دنوں، ضلع کی تمام شاہراہوں، بجلی کے کھمبوں، لپ کے برسوں اور گرم ہواؤں کی مالک ہے، اور مزید یہ کہ زندگی اور املاک پر اس کا موروثی حق ہے۔ جب وہ پچھلے پھر کی جنگ ہوا میں بالکنی میں براجمان ہوتی، اور اس کے سارے اقتدار اور اس کی بوجھل توند کا وزن بید کی جھولنے والی پرانی کرسی میں سمٹا ہوا ہوتا تو اس کی قوت اور دولت لامتناہی لگتی اور یوں محسوس ہوتا جیسے وہ دنیا کی امیر ترین اور طاقتور ترین آن بیابھی خاتون ہے۔

قیلے کے چند لوگوں کے اور بڑی ماما کے اپنے ذہن کے سوا، جسے پادری اینتونی ازابیل

اپنے سال خوردہ اندیشوں سے کچھ کے دیتا رہتا تھا، کسی اور کے ذہن میں یہ بات نہ آئی تھی کہ بڑی ماما فانی ہستی ہے۔ بڑی ماما کا اپنا خیال یہ تھا کہ وہ سو برس سے اوپر زندہ رہے گی، اپنی اس ثانی کی طرح جس نے ۱۸۸۵ء کی جنگ میں اپنے باورچی خانے میں مورچہ بندی کر کے کرل اور یلیانو بوندیا کے گشتی دستے کا مقابلہ کیا تھا۔ صرف اس سال اپریل کے مہینے میں آن کر بڑی ماما پر انکشاف ہوا تھا کہ اس کے مقدر میں خداوند نے یہ نہیں لکھا کہ وہ وفاق پرست میسٹر سے کھلے میدان میں جنگ کر کے اپنے ہاتھوں سے انھیں تس تس کر کے مار دے۔

تکلیف کے پہلے ہفتے میں خاندانی معالج نے بڑی ماما کو سرسوں کے پلاسٹروں اور اُون کی جرابوں میں جکڑ کر زندہ رکھا تھا۔ یہ موروثی معالج تھا۔ اس نے مونت پیئیرے میں تعلیم پائی تھی اور اپنے فلسفیانہ یقین کی بنیاد پر علم طب میں ترقی کے سخت خلاف تھا۔ بڑی ماما کے جانب سے اسے عمر بھر کے لیے یہ اختیار حاصل ہو چکا تھا کہ اپنے جیسے جی ماکو دوسری کسی دوسرے معالج کے پاؤں نہ جسے دے۔ کسی زمانے میں وہ گھوڑے کی پیٹھ پر شہر کا دورہ کیا کرتا تھا اور شام کے چھٹیے میں دُکھی اور بیمار لوگوں کے گھروں میں جاتا تھا۔ قدرت کی جانب سے اسے بہت سے لوگوں کے بے شمار بچوں کا باپ ہونے کی سعادت بھی حاصل ہو چکی تھی۔ اب وہ گھٹیا کے ہاتھوں بستر کا قیدی تھا، اس کے جوڑا بیٹھ گئے تھے، اور اب وہ مریضوں کا علاج انھیں دیکھنے بغیر، معائنے کی جگہ مفروضوں، نامہ بروں اور ملازموں کے بھروسے پر، کر لیا کرتا تھا۔ بڑی ماما کا بلاوا آیا تو دو چھڑیوں کے سارے پلٹے ہوئے، اپنے شب خوابی کے لباس ہی میں، اس نے قصبے کا چوک عبور کیا اور حویلی میں پہنچ کر غلیل عورت کی خواب گاہ بی میں اپنا ڈیرا ڈال دیا۔ جب اسے یہ احساس ہو گیا کہ بڑی ماما کا وقت آن پہنچا ہے، تب ہی اس نے اپنا صندوقچہ منگوا یا جس میں تمام جینی کے مرتبان رکھے تھے جن پر لاطینی زبان میں لیبل چسپاں تھے۔ تین ہفتے تک ہر طرح کے مہم لگا لگا کر اور اعلیٰ قسم کی محرک ادویات اور اینسے دے دے کر اس نے بڑی ماما کا اندر باہر ایک کر دیا۔ پھر اس نے بڑی ماما کے متورم اعضا پر پھولے ہوئے مینڈک ملکوائے اور اس کے گردوں پر جُونکیں لگوائیں۔ لیکن آخر کار ایک صبح اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ یا تو وہ کسی جراح سے بڑی ماما کی قصد کھلوائے یا پادری اینتونی ازابیل سے بڑی ماما پر آسیب اتارنے کا عمل کروائے۔

اس وقت ٹکانور نے پادری کو بلوا بھیجا۔ ٹکانور کے دس بہترین آدمی پادری کو گرجے سے ملحق اس کے گھر سے اٹھا کر بڑی ماما کی خواب گاہ میں لے آئے۔ وہ بید کی چرخ چوں کرتی ہوتی جھولنے والی کرسی میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سر پر کائی لگا جھترسا یہ کیے ہوئے تھا، جو صرف

غیر معمولی موقعوں کے لیے مخصوص تھا۔ ستمبر کی نیم گرم صبح کو سفری قربان گاہ کی ننھی سی گھنٹی کی آواز ما کوئندو کے ساکنوں کے لیے متوقع حادثے کی اولین اطلاع تھی۔ سورج طلوع ہونے تک بڑی ماما کی حوصلی کے سامنے والا چھوٹا سا چوک کسی دیہاتی میلے کا منظر پیش کرنے لگا۔

یہ منظر کسی دوسرے عہد کی یاد دلانا تھا۔ ستر برس کی عمر تک بڑی ماما اپنا جنم دن بر سال ایسی دھوم دھام سے اور اتنے دنوں تک مناتی رہی تھی کہ اس کی مثال شاید ہی حافظے میں موجود ہو۔ شہر کے باسیوں کے لیے رَم کے منگوں کی سبیل لگائی جاتی۔ عوامی چوک میں ہانوروں کی قربانی کی جاتی۔ موسیقاروں کا ایک طائفہ، ایک بڑے سے تحت پوش پرایستادہ، تین روز تک ایک لمبے کور کے بغیر لوگوں کا دل بہلاتا رہتا۔ بادام کے جن گرد آلود درختوں کے نیچے اس صدی کی پہلے ہفتے میں کرئل اور یلیانو بوندیا کے دستوں نے خیسے لگائے تھے، وہاں دکائیں گھٹیں جن پر کیلے کی شراب، گوشت کے تلے ہوئے پارچے، چھوٹی گول روٹیاں، خون کی پڈنگ، بھننا ہوا گوشت، کیلے کی روٹیاں، گوشت کے سموے، ساج، تیل میں تلے کیک، مکئی کی روٹیاں، پیسٹریاں، اوجھڑی، نارمل کے گول گپے، کالے سیاہ سیج کباب اور تازہ جیسی خورد و نوش کی اشیاء دوسری الم غم چیزوں، چھوٹے چھوٹے کھلونوں، نمائشی زیوروں اور مرغوں کی لڑائی اور لاٹری کے ٹکٹوں کے ہمراہ بکیتیں۔ پُر جوش ہجوم کی پیدا کردہ افراقری میں بڑی ماما کی شبیہ والے پرنٹ بکتے اور شانہ پٹیاں بھی فروخت ہوتیں۔

تقریباً دو دن پہلے شروع ہو جائیں اور جنم دن کو گرج دار آتش بازی اور بڑی ماما کی حوصلی کے اندر خاندان کے افراد کے رقص پر ختم ہوتیں۔ اس رقص میں احتیاط سے مستحب اور مدعو کیے گئے مہمانوں کے ساتھ خاندان کے افراد اور ان کی خدمت پر مامور ناہائز اولاد، سب شرکت کرتے اور ایک قدیم پیانو لا کی جدید ترین دھنوں پر رقص کرتے۔ بڑی ماما بال کے عقب میں، لین کے گدیوں والی آرام دہ کرسی میں بیٹھ کر اس تقریب کی صدارت کرتی، اور اپنے دائیں ہاتھ کے اشارے سے، جس کی تمام انگلیاں انگوٹھیوں سے آراستہ ہوتیں، موقع بہ موقع ہدایات جاری کرتی۔ اس رات آئندہ برس میں ہونے والی تمام شادیاں طے ہوتیں۔ گو بعض شادیوں میں فریقین کی خفیہ مرضی کا دخل ہوتا لیکن ان کے فیصلے بڑی ماما اپنے دل کے مشورے کے مطابق کرتی۔ جشن کے اختتام پر وہ پانی قندیلوں اور پھولوں کے گجروں سے سبھی بالکنی میں نمودار ہو کر ہجوم پر سکتے نچھاور کرتی۔

خاندان میں یکے بعد دیگرے متعدد اموات، اور ملک میں سیاسی عدم استحکام کے باعث پچھلے چند برسوں سے اس روایت کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ نئی نسلوں نے توان شان دار تقریبات

کے صرف قصے ہی سن رکھے تھے؛ انھوں نے تو عائشہؓ نے ربانی کی پر تکلف رسم میں بڑی ماما کی شرکت کا تقارہ بھی نہ دیکھا تھا جس میں شہری استقامیہ کا کوئی نہ کوئی افسر اسے پٹکھا جھٹلا رہتا، اور جہاں بڑی ماما کو اختیار حاصل تھا کہ وہ چاہے تو گھٹنوں پر بھی نہ جھکے، حتیٰ کہ رکوع کے دوران بھی نہیں، تاکہ اس کا ولندیزی اسکرٹ اور کلف لگے کیمرہ کے کاپیٹی کوٹ میلا نہ ہو۔ صرف بڑے بوڑھوں کو، جوانی کے کسی دھندلے خواب کی طرح، وہ دن یاد تھا جب حویلی سے لے کر قربان گاہ تک دو سو گز لمبا قالین بچھایا گیا تھا جس پر چل کر ماریا دیل روزاریو کا ستانینیدا ای موتیہ سُرُونے اپنے والد کی تجیز و تکفین کی رسومات میں شرکت کی تھی، اور پھر سُرُونے اور تابناک وقار کے ساتھ اسی قالین سے آراستہ گلی میں چل کر حویلی میں واپس آئی تھی اور بائیس برس کی عمر ہی میں بڑی ماما کھلائی جانے لگی تھی۔ وہ قرون وسطیٰ کا سامنٹر نہ صرف بڑی ماما کے خاندان کی روایات میں شامل تھا بلکہ پوری قوم کے ماضی کا حصہ بن گیا تھا۔ اپنی رعایا سے بتدریج دست کش ہوتی، ان کے لیے غیر اہم بنتی اور اپنی بالکنی میں بہ مشکل دکھائی دیتی ہوئی بڑی ماما، محنتی دوپہروں میں جیر-نینم کے پھولوں کی خوشبو میں مرجھاتی ہوئی، اپنی داستانی عظمت میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔ عملاً تمام اختیارات ٹکا نور کے ہاتھوں میں تھے۔ خاندان کے افراد کے درمیان ایک خاموش معاہدہ چلا آ رہا تھا کہ جس روز بڑی ماما کی وصیت سر بہ مہر کی جائے گی، اس کے جانشین تین دن کے عوامی جشن کا اعلان کریں گے۔ دوسری طرف سب کو بڑی ماما کے اس فیصلے کا بھی علم تھا کہ وہ اسی وقت اپنی آخری خواہشات کا اظہار کرنے کی جب اس کے مرنے میں صرف چند گھنٹے باقی رہ جائیں گے۔ مزید برآں کبھی کسی نے سنجیدگی سے یہ سوچا ہی نہ تھا کہ بڑی ماما بھی فانی مخلوق ہے۔ صرف اس صبح جب قربانی کی مدم گھنٹی نے ماکوندو کے باسیوں کو بیدار کیا تو انھیں احساس ہوا کہ بڑی ماما نہ صرف فانی ہے بلکہ موت کے دروازے پر ہے۔

اس کا وقت آپہنچا تھا۔ مشرق سے درآمد کیے ہوئے کرپ سے بنے اور گردوغبار سے آٹے چھتر کے نیچے، اسے اپنے لہن کے بستر پر دراز اور کانوں تک ایلوے کی پلٹس میں لتھڑا ہوا دیکھ کر یہ کہنا ناممکن تھا کہ اس کی بوڑھی چچا تئیں حسین رواں نحیف سانس میں زندگی کی کوئی رستہ باقی ہے۔ پچاس برس کی عمر پانے تک بڑی ماما نے شادی کے ہر امیدوار کی پیش کش کو رد کر دیا تھا، حالانکہ قدرت نے اسے ایسا جسم ودیعت کیا تھا کہ اپنی تمام آل اولاد کو اکیلے دودھ پلا کر پال سکتی تھی۔ نتیجتاً آج وہ کنواری اور بے اولاد اس جہان سے جا رہی تھی۔ پادری اینتونی ازابیل کو اس کی ہتھیلیوں پر مقدس روغنات کی مالش کرنے کے لیے دوسروں سے مدد لینا پڑی، کیوں کہ نزع کا عالم شروع ہوئے ہی بڑی ماما نے اپنی مٹھیاں کس کے بند کر لی تھیں۔ بھانجیوں

بختیجیوں کی کمرے میں حاضری بے فائدہ تھی۔ اس کشمکش میں، ہفتے بھر میں پہلی بار، مرنے والی نے قیمتی جواہر سے لدے ہوئے ہاتھ کو سینے پر بھینچ کر اپنی بے رنگ آنکھوں سے بجانجیوں بختیجیوں کو گھورا اور انھیں چور اور ڈاکو کہہ کر پکارا، لیکن پھر اس کی نگاہ پادری اینتونی ازابیل پر پڑی، جس نے مذہبی فرائض کی ادائیگی والا لباس زیب تن کر رکھا تھا، اور اس کے مددگار ملازم پر جو مذہبی رسوم کا سامان اٹھائے کھڑا تھا۔ تب اس نے پرسکون یقین کے ساتھ آہستہ آواز میں کہا، "میرا وقت آن پہنچا ہے۔" پھر اس نے بڑے بیرے والی انگوٹھی اپنی انگلی سے اتار کر ماگدالینا کے حوالے کر دی جو اس کے وارثوں میں سب سے کم عمر ہونے کے باعث انگوٹھی کی حق دار تھی۔ یہ ایک روایت کا خاتمہ تھا: ماگدالینا اپنے ورثے سے کلیسا کے حق میں دست بردار ہو چکی تھی۔

صبح سویرے بڑی ماما نے ٹکانور کے ہمراہ تنہا چھوڑ دیے جانے کی خواہش ظاہر کی تاکہ آخری ہدایات جاری کر سکے۔ نصف گھنٹے تک اس کے ہوش و حواس پوری طرح قائم رہے اور اس نے جاگیر سے متعلق معاملات پر استفسار کیا اور اپنے جسدِ خاکی کی تیاری کی بابت خصوصی ہدایات دیں۔ آخر میں اس نے شب بیداری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ٹکانور سے کہا، "تمہیں ہر لمحے اپنی آنکھیں کھلی رکھنا ہوں گی۔ ہر قیمتی چیز کو تالا لگا کر رکھنا ہو گا۔ بہت سے لوگ چوری کرنے کی خاطر شب بیداریوں میں شامل ہوتے ہیں۔" چند لمحوں بعد اس نے پادری کے سامنے لمبا چوڑا آخری اعتراف کیا جو مفضل بھی تھا اور دیا نیدارا نہ بھی۔ بعد ازاں اس نے بختیجیوں اور بجانجیوں کی موجودگی میں عشاءِ رے ربانی کی رسم ادا کی۔ اسی موقع پر اس نے حکم دیا کہ اسے بید کی جھولنے والی کرسی میں بٹھا دیا جائے تاکہ وہ اپنی آخری خواہشات کا اظہار کر سکے۔

ٹکانور نے چوبیس پرتوں پر مشتمل، اور خوشخط حروف میں مرقوم، اس کی املاک کی بے عیب اور صاف فہرست بڑی احتیاط سے تیار کی تھی۔ سکون سے سانس لیتے ہوئے، اور پادری اینتونی ازابیل اور اپنے معالج کو شاید بتا کر، بڑی ماما نے وکیل کو اپنی جائیداد کی تفصیل لکھوائی۔ اس جائیداد ہی پر اس کے تمام شکوہ اور اقتدار کا دار و مدار تھا۔ حقیقتاً اس کی جائیداد تین اضلاع پر مشتمل تھی۔ یہ اضلاع نوآبادی کے قیام کے وقت شاہی فرمان کی رو سے اس کے خاندان کو عطا ہوئے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ، اور متعدد سہولت کی شادیوں کے پیچیدہ تانے بانے کی بدولت، بڑی ماما کے زیرِ انتظام املاک اور جائیداد میں اضافہ ہوتا رہا تھا۔ اب یہ جائیداد پانچ اضلاع پر پھیل چکی تھی۔ اس غیر مزروعہ زمین پر، جس کی صحیح حدیں کبھی متعین نہ ہوئی تھیں، تین سو ہاون کرایہ دار مزارعوں کے کنبے قیام پذیر تھے اور اس تمام علاقے میں مالکوں کے خرچ

پر کبھی ایک بھی فصل نہ بوئی گئی تھی۔ ہر سال اپنے نام کے دن بڑی ماما وہ واحد استقامی قدم اٹھاتی تھی، جس کے باعث یہ علاقہ دوبارہ ریاست کی تحویل میں نہیں جاسکتا تھا؛ وہ قدم اپنے مزارعوں سے کرایہ وصول کرنے کا تھا۔ حویلی کے عقبی برآمدے میں بیٹھ کر وہ بنفس نفیس اپنی زمین پر قیام کے حق کا معاوضہ وصول کرتی تھی، جیسے اس کے آباؤ اجداد اس کے مزارعوں کے آباؤ اجداد سے سو برس سے زیادہ عرصے سے وصول کرتے چلے آئے تھے۔ تین دن بعد جب وصولی کا سلسلہ ختم ہوتا تو اس کا برآمدہ مختلف تحائف سے، جن میں سور، مرغیاں، فیل مرغ، فصل کے اولین اثمار اور دوسری اجناس کے عشر شامل ہوتے، پٹ چکا ہوتا۔ حقیقت یہ تھی کہ پیمائش کی رو سے تقریباً ایک لاکھ ہیکٹیر اراضی سے، جو ابتدائی سے منجر تھی، پیداوار کے طور پر صرف یہی کچھ بڑی ماما کے خاندان کو حاصل ہوا تھا۔ اسے تاریخ کی ستم طریفی ہی کہا جاسکتا ہے کہ اسی علاقے کی حدود کے اندر ماکوندو کے چھ قسبات پھل پھول رہے تھے اور ضلعی دارالحکومت قائم ہو چکا تھا، حالانکہ وہاں کے کسی مکین کو صحیح معنوں میں حق ملکیت حاصل نہیں تھا، سوائے اُس حق کے جو مکان کی چار دیواری تک محدود تھا۔ زمین کی اصل مالک بڑی ماما تھی جو اس کا کرایہ وصول کرتی تھی، اُسی طرح جیسے خود حکومت کو عوام کے تصرف میں آئی ہوئی گلیوں کے استعمال کے لیے اُسے کرایہ ادا کرنا پڑتا تھا۔

ان آبادیوں کے اطراف میں متعدد مویشی، جن کی تعداد کا کسی کو علم نہیں تھا اور نہ جن کی کوئی دیکھ بھال کرتا تھا، آوارہ پھرتے رہتے تھے۔ ان کے پٹھوں پر تالے کا نشان ثبت تھا۔ یہ مویشی نشان دور دراز کے علاقوں میں معروف ہو چکا تھا، لیکن اس کی شہرت کی وجہ مویشیوں کی کثرت نہ تھی بلکہ مالکان کی بد استقامی تھی جس کے باعث جانور ادھر ادھر کے علاقوں میں نکل جاتے، وہاں بھٹکتے پھرتے اور گرمیوں کے دنوں میں پیاس سے دم توڑ دیتے تھے۔ مویشیوں کا گلہ وہ ٹھوس ستون تھا جس پر خاندان کی داستانی عظمت استوار تھی۔ چند ایسے اسباب کی بنا پر جن کی وضاحت کرنے کی کسی نے زحمت گوارا نہ کی تھی، خاندان کے وسیع و عریض اصطبل پچھلی خانہ جنگی کے بعد سے بتدریج خالی ہوتے گئے تھے، اور وہاں مویشیوں کے بجائے ٹیشکر کھنے اور دودھ دہننے کی مشینیں اور چاول کے کارخانے کام کرنے لگے تھے۔

مذکورہ اشیا کے علاوہ بڑی ماما نے اپنی وصیت میں سونے کی مُہروں سے بھری ہوئی تین دیگوں کا بھی ذکر کیا۔ جنگ آزادی کے دوران یہ دیگیں حویلی کے کسی حصے میں دفن کر دی گئی تھیں۔ ان کو ڈھونڈنے کے لیے کئی جگہ محنت سے کھدائی کی گئی تھی مگر انھیں ابھی تک برآمد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس وصیت کی رو سے نئے وارثوں کو جہاں کرائے پر دی ہوئی زمین سے

استفادہ کرنے، عشر اور اٹھارہ اول اور کئی دوسرے غیر معمولی نوعیت کے تحفے وصول کرنے کے حقوق تفویض ہوئے تھے، وہاں ساتھ ہی ایک نقشہ بھی مرحمت ہوا تھا جو ایک نسل سے دوسری نسل کو مستقل ہوتا تھا۔ ہر نسل اسے مکمل حالت میں رکھنے کی ذمہ داری تھی تاکہ مدفون خزانے کی بازیافت میں سہولت پیدا ہو سکے۔

اپنی مملوکہ اشیاء کی تفصیلات بیان کرنے میں بڑی ماما کے تین گھنٹے صرف ہوئے۔ خواب گاہ کے گھٹے ہوئے ماحول میں بڑی ماما ہر چیز کو اس کا ذکر کر کے عزت بخشی رہی۔ جوں ہی اس نے اپنے لرزاں ہاتھ سے وصیت پر دستخط کیے اور گواہوں نے اس کی تصدیق کی، حوصلی کے سامنے چوک میں بادام کے گرد آلود درختوں کے سائے میں جمع ہوتے ہوئے ہجوم کے دل ایک ان جانے خوف سے لرز اٹھے۔

گنتی میں ایک چیز کی کمی رہ گئی تھی۔ ابھی تک بڑی ماما کی "غیر مادی" املاک کا بیان نہ آیا تھا۔ بڑی ماما کے ہر پیشرو نے اپنی موت سے قبل خاندان کا اقتدار یقینی طور پر بحال رکھنے کی سر توڑ کوشش کی تھی، اسی طرح بڑی ماما بھی اٹھ کر اپنے بھاری بھر کم چوڑوں پر بیٹھ گئی اور تھکا نہ اور مخلص آواز میں وکیل کو اپنی غیر مادی جائیداد کی تفصیل لکھوانے لگی۔ اس جائیداد میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل تھیں:

زیر زمین دولت، علاقائی پانی، جھنڈے کے رنگ، قومی خود مختاری، روایتی جماعتیں، انسانی حقوق، شہری حقوق، قوم کی قیادت، اپیل کا حق، کانگریس کی سماعتیں، سفارشی خطوط، تاریخی مسودے، آزاد استغاثات، ملکہ حسن کا استحباب، مابعد الطبیعیاتی تقاریر، عظیم عوامی مظاہرے، ممتاز نوجوان خواتین، معزز شریف مرد، تکلفات کے نادان عسکری، تقدس آج حضور عالی مقام، عدالت عالیہ، مسعودہ درآمدی سامان، آزادی پسند خواتین، مسند گوشت، زبان کی پاکیزگی، اچھی مثالوں کا قیام، آزاد مگر ذمہ دار پریس، جنوبی امریکا کا استعتر، رائے عامہ، جمہوریت کے سبق، مسیحی اخلاقیات، زرمبادلہ کی کمی، پناہ کا حق، استمالیوں کی دہشت پسندی، ریاست کا سفینہ، بڑھتی ہوئی مہنگائی، ری پبلکن روایات، غیر مراعات یافتہ طبقہ، سیاسی حمایت کے بیانات، وغیرہ وغیرہ۔

بڑی ماما کو یہ گنتی مکمل کرنے کی مہلت نصیب نہ ہوئی۔ یہ پُر مشقت کام اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ دوسروں سے خاندان کے اقتدار کا اخلاقی جواز جن تجربیدی کٹیوں پر قائم تھا، ان کے شور و غل میں غرق ہوتے ہوئے اس نے ایک زور کی ڈکار لی اور سدھار گئی۔

اس سے پہلے دور اُٹھادہ، خاموش اور افسردہ دار الحکومت میں شائع ہونے والے اخباروں کے ضمیموں کے صفحاتِ اول پر ایک بیس سالہ خاتون کی تصویر شائع ہوئی، جسے وہاں کے باشندوں نے

نئی ملکہ حسن کی تصویر سمجھا۔ اس تصویر کی مطلوبہ ری چنگ کر کے، گھنیرے بالوں کو اوپر اٹھا کر، ان میں ہاتھی دانت کی گنگھی اٹس کر، اور فیتے کے کار میں پھولوں کا تاج آویزاں کر کے، اسے چار کالموں پر پھیلایا گیا تھا، اور یوں بڑی ماما کی جوانی لحاظی طور پر دوبارہ وجود میں آ گئی تھی۔ سرک پر دکان سجانے والے کسی فوٹو گرافر کے ہاتھوں، جو اس صدی کے اولین برسوں میں ماکونڈو سے گزرا تھا، اتری ہوئی، سالہا سال سے اخبار کے غیر شناخت یافتہ افراد کے شعبے کے سردخانے میں رکھی ہوئی یہ تصویر آئندہ نسلوں کی یاد میں محفوظ ہو جانے والی تھی۔ پرانی شکستہ بسوں میں، وزارت خانوں کے اہلی و میٹروں میں، دھندلی اور پیلی ہوتی ہوئی سجاوٹ کی اشیا سے آراستہ تاریک چائے خانوں میں، ہر جگہ لوگ مرحومہ کے بارے میں سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ ملیریائی، ٹوزدہ علاقے سے تعلق رکھنے والی، اور چند گھنٹے قبل تک ملک کے دوسرے حصوں میں بالکل غیر معروف اس شخصیت کا احترام اور عزت کے ساتھ ذکر ہو رہا تھا۔ اخباروں میں چھپے ہوئے حروف نے اس کے گرد تقدس کا باد بن دیا تھا۔ بلکی بلکی بوند اباندی نے راہگیروں کو وسوسوں اور کھرے میں ڈھانپ رکھا تھا۔ تمام گرجوں کی گھنٹیاں مرحومہ کے لیے نوہ کناں تھیں۔ صدر جمہوریہ کے لیے، جو اس وقت نئے بھرتی کیے گئے سپاہیوں کی جنگی مشقوں کے افتتاح کے لیے جا رہے تھے، یہ خبر غیر متوقع حیرت کا باعث تھی۔ موصولہ تار کی پشت پر صدر مملکت نے اپنے ہاتھ سے وزیر جنگ کے نام یہ پیغام درج کیا کہ خطبے کے اختتام پر بڑی ماما کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے چند لمحوں کی خاموشی اختیار کی جانی چاہیے۔

بڑی ماما کی موت سے لگتا تھا جیسے معاشرتی نظام پر خراش آ گئی ہو۔ صدر مملکت خود شہری آبادی کے جذبات سے، جو کسی مقطر کے ذریعے پاک صاف ہو کر صدر کے دل تک پہنچ گئے تھے، متاثر معلوم ہوتے تھے۔ کار میں گزرتے ہوئے، صدر نے شہر کے اضطراب کا عارضی مگر قدرے سفاک رویا دیکھ لیا تھا۔ شہر میں صرف چند گھنٹیا قہودہ خانے کھلے تھے۔ میٹرو پولیٹن گر جائنڈون تک مرگ کی رسوم ادا کرنے کے لیے تیار کیا جا چکا تھا۔ قومی دار الحکومت کی عمارت میں، جہاں بیکاری، اخباروں میں لپٹے پٹٹے، یونانی ستونوں اور جمہوریہ کے آل جہانی صدور کے خاموش مجسموں کے زیر سایہ، شب بسمری کیا کرتے تھے، کانگریس روشنیوں سے جگمگا رہی تھی۔ صدر مملکت، جن کا دل شہر میں سوگواری کی فضا دیکھ کر پگھل چکا تھا، جس وقت اپنے دفتر میں داخل ہوئے، ان کی کابینہ کے ارکان ہاتھی لبادوں میں ملبوس ان کے منتظر تھے۔ ان کے چہرے معمول سے زیادہ زرد اور سنبھیدہ تھے۔

اُس رات، اور اس کے بعد آنے والی راتوں میں، رونما ہونے والے واقعات، بعد از آل،

تاریخی سبق قرار دیے جانے والے تھے، کیوں کہ ان راتوں میں نہ صرف شہری اقتدار کے عالی نفس کارکنان مسیحی جذبے سے سرشار نظر آتے تھے بلکہ وہاں ایثار کی فضا قائم ہو گئی تھی، جس کے زیر اثر بڑی ماما کے عالی مرتبت تین خاکی کے دفنائے جانے کے مشترک مقصد نے مخالفت مفادات اور متصادم آرا میں مصالحت کرا دی تھی۔ عرصہ دراز سے بڑی ماما کا وجود اپنے زیر اقتدار علاقے میں سیاسی ہم آہنگی اور معاشرتی امن کا ضامن رہا تھا، جس کی بنیاد ان تین صندوقوں پر تھی جو جعلی انتخابی کاغذوں سے بھرے ہوئے تھے اور جو بڑی ماما کی خفیہ بنیاد میں شامل تھے۔ بڑی ماما کے ملازم، اس کے پروردگان، اس کے مزارعے، بوڑھے یا جوان، اپنا حق رائے دہی استعمال کرتے وقت ان لوگوں کے ووٹ بھی ڈالا کرتے تھے جو سو سال قبل آں جہانی ہو چکے تھے۔ بڑی ماما کی ذات کی بدولت روایتی اور دیرپا اقتدار کو عارضی اور ناپائیدار اقتدار پر سبقت حاصل تھی؛ طبقوں کو عوام پر فوقیت، اور حکمت خداوندی کو عقل انسانی کی برجستگی پر فضیلت تھی۔ امن و امان کے زمانے میں بڑی ماما کی غالب منشا سے کلیسا کے عہدوں اور اوقاف اور جاگیروں کے بٹوارے کی تصدیق یا تردید ہوتی تھی، اور بڑی ماما کے طرف داروں کی فلاح و بہبود کی نگرانی؛ اور ایسے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے وہ ہسٹنگڈوں کے استعمال اور انتخابات میں جعل سازی کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتی تھی۔ بے اسنی کے دنوں میں بڑی ماما اپنے حامیوں کو خفیہ ذریعوں سے ہتھیار فراہم کرتی تھی، لیکن عوام کے سامنے وہ جبر کا نشانہ بننے والے لوگوں کی مدد کا اہتمام کیا کرتی تھی۔ اس انداز کے پرجوش جذبہ حب الوطنی کے سبب وہ اعلیٰ ترین اعزاز کی مستحق قرار پاتی تھی۔

اس معاملے میں صدر جموریہ کو اپنی ذمہ داری کی اہمیت اور سنجیدگی کا احساس کرنے کے لیے اپنے مشیروں سے مشورہ کرنے کی حاجت نہ تھی۔ محل کے استقبالیہ ہال اور سیمنٹ کے فرش والے عقبی والان کے درمیان سرو کے درختوں سے بھرا ایک باغیچہ تھا، جسے وائسرائے پوریچ کے طور پر استعمال کرتے رہے تھے، اور جہاں کالونی کے آخری دنوں میں ایک پرتگالی راہب نے عشق میں ناکامی کے باعث خودکشی کر لی تھی۔ غروب آفتاب کے وقت اس باغیچے میں سے گزرتے ہوئے صدر محترم، تمنگوں سے بو جمل، شور کرتے ہوئے مشیروں کی رفاقت کے باوجود ایک ان جانے خوف کی لرزش محسوس کیا کرتے تھے۔ اس مخصوص شام کو وہ لرزش بدشگونی کا روپ و حارچی تھی۔ اس وقت صدر محترم کو اپنے تاریخی مقدر سے مکمل طور پر آگاہی ہوئی۔ نتیجتاً انھوں نے بڑی ماما کا سوگ نودن تک قومی سطح پر منانے کا فرمان جاری کیا، اور بڑی ماما کو اس اعزاز سے نوازا جو میدان جنگ میں وطن کی خاطر شہید ہونے والی بستیوں کے لیے مختص ہوتا ہے، اور بعد از شہادت عطا کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں، جیسا کہ صدر محترم نے صبح کے وقت ٹیلیوژن اور ریڈیو پر اپنے ہم وطنوں

سے ایک ڈرامائی خطبے میں فرمایا، انھیں محکم یقین تھا کہ بڑی ماما کی رسوم مرگ کی ادائیگی دنیا بھر کے لیے ایک نئی مثال قائم کرے گی۔

اس ارفع عزم اور چند گھمبیر عملی زحماتوں میں نکلنا ہونا ناگزیر تھا۔ ملک کا عدلی نظام، جس کی تشکیل بڑی ماما کے قدیم پیش رووں ہی نے کی تھی، ان حالات سے نمٹنے سے قاصر تھا جو رونما ہونے شروع ہوئے۔ زیرک قانون دان اور مستند دستوری کیسایگر، مقدس کتب کی تفسیرات اور علم منطق کی قیاس آرائیوں کے مطالعے میں غرق ہو گئے کہ کوئی فارمولا ایسا وضع کر لیں جس کی رو سے صدر جمہوریہ کا رسوم تمیز و تکلف میں شامل ہونا ممکن ہو جائے۔ سطح اعلیٰ کے سیاست دان، دینی علما اور اصحاب ثروت دن دن بھر دہشت زدہ رہنے لگے۔ ایک صدی سے تجریدی قانون سازی کرنے کی سعی میں خود مجرّد بنی ہوئی، اور قومی سوراخوں کی روغنی تصویروں اور یونانی مفکروں کے مجسموں کے سامنے میں واقع، کانگریس کے وسیع حلقوں کی نظر میں بڑی ماما کے منصب کی اہمیت اتنی بڑھ چکی تھی کہ پہلے کبھی دیکھنے سننے میں نہ آئی تھی۔ اس دوران میں ماکوندو کے درشت ستمبر کی گرمی میں بڑی ماما کی نعش میں بلبے اٹھنے شروع ہو چکے تھے۔ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ عوام بڑی ماما کو وقت اور عمر کی قید سے آزاد، منزہ اور داستانی ہستی کے طور پر دیکھ رہے تھے، اور اس کی بید کی جھونکنے والی کرسی، اس کے سر پر رکے قیلو لول اور سرسوں کے پلاسٹروں کو ذہن میں لائے بغیر اسے یاد کر رہے تھے۔

پوری جمہوریہ میں ہر جگہ الفاظ نے حکمرانی حاصل کر لی تھی۔ اُن گنت گھنٹے لفظوں کی گونج کی نذر ہو چکے تھے۔ یہ لفظ وہ تھے جنہیں نشر و اشاعت کے اداروں کے نمائندوں نے پُر وقار بنا دیا تھا، اور یہ ساری گفتگوئیں اس وقت تک جاری رہیں جب تک اس حقیقت کے ذکر نے، لفظوں کی چاند ماری میں مشغول قانون دانوں کے مصفا گروہ کو یہ یاد دہانی نہ کرا دی کہ بڑی ماما کا مردہ جسم سامنے میں ایک سو چار درجے کی گرمی میں رکھا ان کے فیصلے کا منتظر ہے۔ عقل سلیم کے اس دھماکے سے تحریری قانون کی پاکیزہ فصاحت کسی کو آنکھ جھپکنا تک یاد نہ رہا۔ جسد خاکی کو محفوظ کرنے کے فوری احکام جاری کیے گئے۔ اس اثنا میں قانونی موٹا فیلوں کا استنباط جاری رہا۔ مختلف مدرسہ ہائے فکر کو ہم آہنگ کرنے کی تدبیریں ہوئیں اور دستور میں ترمیمیں کی گئیں تاکہ صدر جمہوریہ کو کفن و دفن کی رسوم میں شرکت کرنے کی اجازت حاصل ہو جائے۔

اس موضوع پر اتنا کچھ بھما گیا کہ بمشملہ ملکی سرحدوں کو پار کر کے سمندر عبور کر گئی اور ایک شگلوں کی طرح قصر گوند و لٹو میں پاپائے روم کے خلوت خانے میں جا گھسی۔ اگست کے کالت کے دنوں کی غنودگی سے افادہ حاصل کرنے کے بعد پاپائے اعظم کھڑکی کے قریب کھڑے خلیج کا نظارہ

کر رہے تھے، جہاں اس وقت غوطہ خور ایک مقتول نوجوان لڑکی کے جسم سے علیحدہ کیے ہوئے سر کو برآمد کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ پچھلے چند ہفتوں سے شام کے اخباروں کو اس سربریدہ لڑکی کی موت کے سوا کسی دوسرے معاملے سے سروکار نہ تھا، اور پاپائے اعظم اس لاشِ نعل سے جوان کے گمائیِ مستمر کے گرد و نواح میں وقوع پذیر ہوا تھا، لا تعلق نہ رہ سکے تھے۔ لیکن اس شام اخباروں نے غیر متوقع رد و بدل کر کے ممکنہ مقتولین کی تصویروں کی بجائے ایک اکیس سالہ خاتون کی تصویر کالے حاشیوں میں شائع کر دی۔ ”بڑی ماما!“ پاپائے اعظم نے حیرت زدہ ہو کر پکارا۔ انھوں نے اس دھندلی ڈگری وٹا سب تصویر کو فوراً پہچان لیا۔ یہ انہیں بہت سال پہلے اس موقع پر پیش کی گئی تھی جب انھوں نے سینٹ پیٹر کی گدی سنبالی تھی۔ کارڈینلز کے مدرسے کے ارکان نے بھی اپنے اپنے خلوت خانوں میں ہم نوا ہو کر ”بڑی ماما، بڑی ماما“ کا الاپ شروع کر دیا۔ بیس صدیوں کے عرصے میں یہ صرف تیسرا موقع تھا کہ عیسائیت کی لامحدود مملکت میں انتشار، جھنجھلاہٹ اور دورِ دھوپ کی یہ ساعت آئی تھی اور یہ حالات اس وقت تک قائم رہے جب تک پاپائے اعظم اپنی طویل سیارہ یومزین میں ممکن ہو کر بڑی ماما کے انوکھے اور بعید السافت جنازے میں شمولیت کے لیے روانہ نہ ہو گئے۔

چمکیلے آڑوؤں کے باغ پیچھے رہ گئے اور آپیا اینتیکا کی شاہراہ بھی، جہاں گھروں کے چبوتروں پر دھوپ سے گائے ہوئے فلی ستارے اس لبلب سے بے خبر اپنے جسموں کو سنولانے میں لگے تھے، حتیٰ کہ قصر سان آنجلو کی راس آپہنپی جو دریائے تے ویرے کے کنارے واقع ہے۔ آخر شام کے دھندلے میں سینٹ پیٹر کے کلیسا کی گونج دار گھنٹیوں کی آواز ماکوندو سے بلند ہونے والی پھٹی ہوئی ٹن ٹن سے ہم آغوش ہونے لگی۔ باہم الجھے ہوئے سر کندھوں اور بے صدا دلہلوں سے اُدھر، جو کہ سلطنتِ روما اور بڑی ماما کے مویشی ہارٹوں کے درمیان حفاصل تھیں، پاپائے اعظم اپنے گھٹن بھرے خیمے کے اندر تمام رات گزرتے لوگوں سے مشغول ہوتے ہوئے بندروں کا شور و غل سنتے رہے۔ رات کے سفر کے دوران ان کا ڈوٹنگا یگا سے بھرے تھیلوں، کچے کیلوں کے ڈنٹھلوں اور مرغوں کے ٹوکروں سے لدا ہوا تھا۔ ساتھ ہی اس میں وہ عورتیں اور مرد بھی سوار تھے جو اپنے معمول کے کاروبار ترک کر کے، بڑی ماما کی رسومِ مرگ کی ادائیگی کے دنوں میں دوسرے کاروبار کرنے اور اپنی قسمت آڑانے جا رہے تھے۔ کلیسا کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ مقدس پاپائے اعظم کو اس رات بے خوابی کے ٹپ اور مچھروں کی اذیت سے پالا پڑا، لیکن بڑی ماما کی سلطنت پر دلفریب طلوعِ صبح کے منظر، یکسانی سیہوں اور اگوانوں کے ازلی نظارے نے پاپائے اعظم کی ساری تکلیف کی تلافی کر دی اور سفر کی کوفت کو ان کی یادداشت سے یکسر مٹا کر دیا۔

دروازے پر تین بار دستک نے، جو پاپائے مقدس کی آمد کا اعلان تھی، ٹکانور کو نیند سے بیدار کیا۔ حویلی موت کی گرفت میں تھی۔ صدر محترم کی تاڑتوڑ اور نہایت اہم تقریروں سے اور بیچانی تنازعات کی تپش سے، جو اب قدرے سرد پڑ چکی تھی مگر ابھی تک روایتی علامتوں کے ذریعے اظہار پارسی تھی، متاثر ہو کر دنیا بھر کے افراد اور عوام کے جتھوں نے اپنے سب کاموں سے منحہ موڑ کر تاریک گیلریوں، پُرجموم دالانوں اور تنگ بالغانوں میں جمع ہونا شروع کر دیا تھا۔ در سے پہنچنے والے، گرجے کی نیچی چار دیواری پر، کٹھروں پر، مٹیوں اور منڈیروں پر، جہاں کمبیں انھیں جگہ ملی تھی، چڑھ گئے تھے۔ بڑی ماما کا حنوط ہوتا ہوا جسم، ٹیلیگرموں کے مرتعش ڈھیر میں پوشیدہ اہم فیصلوں کا منتظر تھا۔ اس کے کوہیتجے بجائے جو رو کر نڈحال ہو چکے تھے، نقش کے پہلو میں بیٹھے باری باری سے وجد آور نگرانی میں مشغول، شب بیداری کی رسم ادا کر رہے تھے۔

لیکن کائنات کو ابھی اور بہت دن اس انتظار کو طول دینا تھا۔ بلدیہ کا بال چڑھے کے چار اسٹولوں، مقطر پانی کے جگ اور ریشوں سے بنے جھولنے والے بستر سے مزین کر دیا گیا تھا، جہاں پاپائے اعظم پسینے میں شرابور، بے خوابی میں مبتلا، طویل دم گھونٹنے والی راتوں میں انتظار کے احکام اور یاد دہانیوں کو پڑھ پڑھ کر اپنا دھیان بٹا رہے تھے۔ دن کے دوران میں وہ بچوں میں، جو انھیں دیکھنے کے لیے کھڑکی میں سے جھانکتے رہتے تھے، اطالوی مسٹائیاں بانٹتے اور دوپہر کا کھانا عموماً پادری اینتونی ایزابیل کے ہمراہ ہے۔ بکس کے کچ میں تناول کرتے۔ کبھی کبھار یہ شرف ٹکانور کو بھی حاصل ہو جاتا۔ انھوں نے بے شمار دن اور ہفتے، جنھیں گرمی کی حدت اور شدید انتظار نے اور بھی طویل کر دیا تھا، وہیں گزارے حتیٰ کہ ایک روز پادری پاسترانا اپنے طبیلیوں کے ہمراہ چوک کے درمیان نمودار ہوا اور یہ فرمان پڑھ کر سنایا کہ ملکی نظم و نسق میں خلل واقع ہونے کے باعث، دھن دھنا دھن، صدر جمہوریہ کو، دھن دھنا دھن، ایسے ہنگامی اختیارات حاصل ہو گئے ہیں کہ، دھن دھنا دھن، کہ جن کی رو سے وہ بڑی ماما کے جنازے میں شامل ہو سکتے ہیں، دھن دھنا دھن، دھن دھنا دھن، دھن دھن دھن۔

بالآخر وہ عظیم دن آن پہنچا۔ کوچہ و بازار میں لوگوں کا ازدحام تھا۔ ہر طرف ریڑھیاں اور چابڑیاں سبب تھیں۔ بانگنیں لگا لگا کر خوراک چپنے والے لوگ تھے۔ جگہ جگہ لاٹری کے کھوکھے لگے تھے۔ چند لوگ گردنوں میں سانپ لپیٹے، روغن اکسیر بیچ رہے تھے اور دعوے کر رہے تھے کہ ان کا روغن داد اور جنبل کا تیر ہدف علاج ہے، اور مریضوں کو حیات ابدی دینے کا اہل ہے۔ مختصر سے بچہ رگنے چوک میں، جہاں لوگوں نے جگہ جگہ خیمے گاڑے ہوئے تھے یا بستر پھیلا لیے تھے، مستعد کھان بردار سپاہی افسرانِ بالا کے لیے راستا بن رہے تھے۔

وہ سب کے سب وہاں اس عظیم لمحے کے منتظر تھے: سان خورنہ کی دھوئیں، کا بو دلاویلا کے موتیوں کے غوطہ طور، سیہ ناگا کے ماہی گیر، تاسا بیرا کے لیکڑے پکڑنے والے، موخا خانہ کے جادوگر، مانورے کے نمک کی کانوں میں کام کرنے والے، والیدوپار کے اکارڈین بجانے والے، ایاییل کے نفیس شسوار، سان پیلا یو کے بینڈ کے سازندے، لاکویو کے نسلی مرغ پالنے والے، ساپاناس دے بولیوار کے کرشمہ ساز، رے بولو کے ہانکے، ماگدالینا کے کشتی ران، مون پاکس کے جعلی وکیل۔ یہ سب ان کے علاوہ تھے جن کا ذکر اس سرگزشت کے آغاز میں کیا جا چکا ہے۔ کچھ اور لوگ بھی وہاں موجود تھے جن میں کرنل اوریلیانو بونڈیا کی فوج کے آزمودہ کار سپاہی تھے، جو بڑی ماما اور اس کی آل اولاد کے خلاف اپنی صد سالہ نفرت کو وقتی طور پر بے سربطان رکھ کر جنازے میں شامل ہونے کے لیے چلے آئے تھے۔ ان کی سربراہی ڈیوک آف مارلبورو کر رہا تھا جس نے اپنی شان و شوکت کی نمود کی خاطر جیتے کی کھال اور شیر کے دانت اور ہنجرے جسم پر بھار رکھے تھے۔ یہ بوڑھے سپاہی صدر محترم سے اپنی پنشن کے بارے میں درخواست کرنے آئے تھے جس کے جاری ہونے کے انتظار میں وہ ساٹھ برس سے زیادہ عرصہ گزار چکے تھے۔

گیارہ بجے سے ذرا پہلے، چلیلاتی دھوپ میں آپے سے باہر ہوتے ہوئے اور بھی سجائی وردیوں والے مشاق سپاہیوں کے دستے کے ہاتھوں تھے ہوئے، ہجوم نے نشاط و مسرت سے سرشار ایک گرج دار نعرہ بلند کیا۔ سنبیدہ، باوقار، اپنے بلند ہیٹ اور لمبے کوٹ زب تن کیے، صدر جمہوریہ، ان کی کابینہ کے ارکان، قومی اسمبلی کے مندوبین، عدالت عالیہ کے جج، مشیران مملکت، روایتی جماعتوں اور کلیسا کے کارکن اور صنعت و تجارت اور بینکوں کے نمائندے تارگھر کے کونے پر جلوہ افروز ہوئے۔ معمر، فریبی کی جانب مائل، گنبد اور علیل صدر مملکت عوام کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے موجود تھے۔ عوام نے انہیں صدارت کا عہدہ سنبالتے تو دیکھا تھا لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کون اور کیسی ہستی ہیں؛ صرف آج وہاں انہیں دیکھ کر وہ ان کے بارے میں شہادت دینے کے اہل تھے۔ اپنے فرائض دینی کی متانت کے ہاتھوں نڈھال مذہبی عہدے داروں، اور چوڑے چکلے، تمغوں سے بوجھل سینوں والے فوجیوں کے درمیان چلتے پھرتے قائد عوام کے پور پور سے قوت کے سرچشمے پھوٹے معلوم ہوتے تھے۔ دوسری قطار میں ماسی کرپ میں لمبوس خاموش قومی لکائیں مومنائش تھیں۔ وہ ماضی، حال، مستقبل کی ہر چیز کی لکائیں تھیں اور آج پہلی بار اپنی ارضی شان و شوکت کے بغیر عالمی ملک کی رہنمائی میں پریڈ کرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ان میں لوسیہ کی ملکہ، ہرے پیٹھے کی ملکہ، کیلوں کی ملکہ، یگا کے پھلوں کی ملکہ، امرودوں کی ملکہ، ناریل کی ملکہ، سویا کی پھلیوں کی ملکہ، چھپکلیوں کے انڈوں کے دو سو بچپن میل لمبے ہار کی ملکہ، اور بہت سی دوسری لکائیں

تھیں جن کا ذکر اس سرگزشت کی طوالت کے خوف سے حذف کر دیا گیا ہے۔
اس لمبے اپنے تابوت میں قرمزی کنن میں لپٹی برٹی ماما کو تابوت کے تانبے کے آٹھ گندوں نے دنیا سے حقیقت سے علیحدہ کر رکھا تھا۔ وہ جراثیم کش دواؤں سے وضع کی ہوئی ابدیت میں اتنی کھوئی ہوئی تھی کہ اسے اپنے جادو جلال کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ جاہ و حشم کے جو خواب وہ گرمی کی شدت سے پیدا کردہ بے خوابی کی حالت میں اپنی حویلی کی بالکنی میں بیٹھ کر دیکھا کرتی تھی، وہ تمام خواب ان شہرہ آفاق اٹالیں گھنٹوں میں پورے ہو چکے تھے جن میں اس کے عہد کی ہر علامتی ہستی نے اسے خراج عقیدت پیش کیا تھا، حتیٰ کہ خود پاپائے اعظم نے بھی، جنہیں برٹی ماما اپنی بدنیانی کیفیت میں دیکھ کر ہنس کر کے باغات کے اوپر ایک نورانی گنجی میں پرواز کرتے دیکھا کرتی تھی، گھمبور کے پتوں سے بنے چٹائی والے ایک دستی پتھر کی مدد سے گرمی پر قمع حاصل کر لی تھی اور دنیا کے اس عظیم ترین جنازے کو اپنے برتر درجہات سے سرفراز فرمایا تھا۔

طاقت کی اس نمائش سے مہسوت عوام کو اس حریصانہ سرگرمی کے بارے میں کچھ علم نہ ہو سکا جو اس چوب پر رونما ہوئی جس پر حویلی کی چھت قائم تھی۔ اس سرگرمی کے نتیجے کے طور پر قصبے کے جھگڑالو بزرگوں کو مفاہمت پر مجبور کر دیا گیا، اور اسی کی بدولت قصبے کا سب سے معتبر بزرگ تابوت کو کندھا دے کر حویلی سے باہر لایا تھا۔ عوام میں سے کسی نے گدھوں کے ان چوکس سایوں کو بھی نہ دیکھا تھا جو ماکوندو کی گرمی سے تپتی ہوئی تنگ گلیوں میں تابوت کی گاڑی کے تعاقب میں روانہ ہوئے تھے، اور نہ کسی کو یہ معلوم ہوا کہ قصبے کے بزرگ اپنے جلو میں قصبے کے بازاروں میں مسلک گندگی کا کتنا طویل سلسلہ چھوڑ گئے تھے۔ کسی کو یہ بھی علم نہ ہوا کہ برٹی ماما کا جنازہ حویلی سے نکلنے ہی اس کے بھانجوں بھتیجیوں، پوتوں دوستوں، خادموں ملازموں اور پروردوں نے، حویلی کو بانٹنے کی غرض سے، باہر کے دروازے بند کر کے اندرونی دروازے اکھاڑ ڈالے، ان کے تختوں میں سے کیلیں نکال لیں اور دیواروں کی بنیادیں تک کھود ڈالیں۔ البتہ ایک بات ایسی تھی جو جنازے کے غل غپاڑے کے باوجود کسی کی نظر سے اوجھل نہ رہی، جو یہ تھی کہ وہاں پر موجود جم غفیر نے، جو در روز کی منت سماجت، وصفت و ثنا اور بد مستانہ گائیکی کے انجام پر، اور پچھلے ہوسے سیسے سے برٹی ماما کی قبر کے سر پر مہر ہونے پر اطمینان کا زور دار سانس لیا تھا۔

اس موقع پر موجود لوگوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی آگہی کی بدولت یہ محسوس کر چکے تھے کہ ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ اب پاپائے مقدس اپنی ارضی زندگی کا واحد مقصد پورا کرنے کے بعد اپنے جسم اور روح سمیت عرش بریں کی جانب پرواز کر سکتے تھے؛ اب صدر مملکت اپنی صوابدید کے مطابق کاروبار حکومت چلا سکتے تھے؛ اب تمام موجودہ اور آئندہ اشیاء کی ملکائیں

شاویاں رچا سکتی تھیں، خوش و خرم زندگی بسر کر سکتی تھیں، حاملہ ہو سکتی تھیں اور دھیروں بیٹے پیدا کر سکتی تھیں؛ اب عوام کھلے بندوں بڑی ماما کی بے کراں سلطنت میں جہاں جی چاہے خیمہ زن ہو سکتے تھے؛ کیوں کہ وہ فردِ واحد جو انہیں پابند کرنے کی اہل تھی اور مرضی کا کام کرنے سے روکنے کی طاقت رکھتی تھی، زیرِ زمین، پگھلے ہوئے سیسے کی چار دیواری کے اندر، بند گلنا سرٹنا شروع ہو گئی تھی۔ صرف ایک کام باقی رہ گیا تھا، جو یہ تھا کہ کوئی شخص اب اپنے دروازے کے آگے اسٹول ٹکا کر بیٹھ جائے اور آئندہ نسلوں کے لیے یہ کہانی، سبق اور مثال کے طور پر، بیان کر دے تاکہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہ رہ جائے جو بڑی ماما کی کہانی کی شنید سے منکر ہو سکے، کیوں کہ کل، بروز بدھ، گندگی اٹھانے والا عملہ قصبے میں وارد ہو گا اور اس تمام کورٹے کرکٹ کورہتی دنیا تک کے لیے سمیٹ کر لے جائے گا جو بڑی ماما کے جنازے کی بدولت ہر جانب پھیل چکا ہے۔

منتصر ناول "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" (No One Writes to the Colonel) جس کا مکمل ترجمہ انتخاب کے اس حصے میں شامل ہے، مارکیز کی اہم، نمائندہ، اور ذاتی طور پر پسندیدہ ترین تحریروں میں سے ہے۔ یہ کولومبیا کی خانہ جنگی کے ایک آزمودہ کار کرنل کی امیدو-بیم اور اس کے ختم نہ ہونے والے انتشار کی کہانی ہے۔ وہ خانہ جنگی ختم ہونے کے بعد چھپن برس سے اپنی پنشن کا منتظر ہے اور انتشار کی اس ابدیت کو اپنی دے کی شمار بیوی اور ایک لڑاکا مرغ کے ساتھ بسر کر رہا ہے جو اس کے مقتول بیٹے کی نشانی ہے۔ ماہرانہ بیانیے کا یہ شاہکار، جسے مارکیز نے پیرس کے لیٹن کوارٹر میں واقع ایک سرد فلیٹ میں گزارے ہوئے عُسرت اور کس میرسی کے دنوں میں، اپنے زیرِ تحریر ناول "منوس وقت" پر کام روک کر لکھا، نومر تبہ لکھے جانے کے بعد اپنی حتمی شکل کو پہنچا اور ۱۹۶۱ میں شائع ہوا۔

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ: فاروق حسن

کرئل کو کوئی خط نہیں لکھتا

کافی کے ڈبے کا دھکن اٹھانے پر کرئل کو پتا چلا کہ ڈبے میں صرف بچ بھر کافی باقی ہے۔ اس نے کیتلی کو چولھے سے اتارا اور اس میں سے آدھا پانی مٹی کے فرش پر گرا دیا، پھر وہ پاقولے کر ڈبے کی دیواروں پر لگی ہوئی کافی ٹھہر چنے لگا؛ کافی کے ساتھ زنگ بھی اتر کر کیتلی میں گرے لگا۔

جب کرئل، کافی اُبلنے کے استعار میں، پتھر کے آتش دان کے سامنے مطمئن مگر معصوم توقع کے ساتھ بیٹھا تھا، اسے اپنی اسڑیوں میں ٹھمبیوں اور سوسن کے زبریلے پھولوں کے اُگنے کا احساس ہوا۔ اکتوبر کا مینا آن پہنچا تھا۔ یہ ایک دُشوار صبح تھی، اُس جیسے شخص کے لیے بھی جو ایسی بے شمار صبیحیں گزار چکا تھا۔ تقریباً ساٹھ برس سے، یعنی خانہ جنگی کے فائدے کے بعد سے، کرئل نے سوائے استعار کے کچھ نہ کیا تھا۔ اکتوبر کا مینا اس کے پاس آنے والی گنی چنی چیزوں میں سے ایک تھا۔

کرئل کی بیوی نے اسے کافی کا پیالا اٹھائے خواب گاہ میں داخل ہوتے دیکھا تو بھر دانی کا کوٹا اٹھا دیا۔ پچھلی رات اسے دسے کا دورہ پڑا تھا اور وہ ابھی تک غنودگی کی حالت میں تھی۔ لیکن

کافی کا پیالا لینے کے لیے اٹھ بیٹھی۔

"اور تمہاری کافی کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں پی چکا ہوں،" کرئل نے جھوٹ بولا۔ "اس کے بعد بھی چچ بھر کافی بچ رہی تھی۔" اسی وقت گرہے کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئیں۔ کرئل جنازے کے بارے میں بھول چکا تھا۔ جب اس کی بیوی کافی پی رہی تھی، اس نے اپنے جھولانچھوٹے کو ایک جانب سے اتار کر اور گول کر کے چمچے رکھ دیا۔ عورت کو مرنے والے کا خیال آیا۔

"وہ ۱۹۲۲ میں پیدا ہوا تھا،" وہ بولی۔ "سات اپریل کو، ہمارے بیٹے کی پیدائش کے ایک ماہ بعد۔"

اپنے اکھڑے ہوسے سانہوں کے درمیانی وقفوں میں وہ کافی کے گھونٹ بھرتی رہی۔ اس کی خمیدہ، بے لوج ریڑھ کی ہڈی پر بہت کم گوشت رہ گیا تھا۔ سانس لینے میں دشواری کے باعث اس کے سوالیہ فقرے بھی یوں لگتے تھے جیسے کوئی دعویٰ کیا جا رہا ہو۔ کافی ختم کرنے کے بعد بھی وہ مرنے والے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

"اکتوبر کے مہینے میں دفنایا جانا کس قدر بیت ناک ہوتا ہوگا،" اس نے کہا۔ مگر اس کے خاوند نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا۔ اس نے کھڑکی کھول دی۔ اکتوبر کا مینا گھر کے صحن تک آپہنچا تھا۔ سبزے کی بالیدگی پر غور کرتے ہوئے، جو ہر جگہ گھرے سبز رنگ میں عیاں تھی، اور مٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کو دیکھتے ہوئے، جو کینپوں نے ہر سمت بتا رکھے تھے، کرئل نے دوبارہ اپنی اسڑیوں میں اکتوبر کے نمودار زدہ مہینے کے وجود کو محسوس کیا۔

"میری ہڈیاں تک سیل گئی ہیں،" اس نے کہا۔

"سردی کا موسم ہے،" عورت نے جواب دیا۔ "جب سے بارشیں شروع ہوئی ہیں، میں تم سے کچھ رہی ہوں کہ جرابیں پہن کر سویا کرو۔"

"ایک ہفتے سے تو پہن رہا ہوں۔"

بارش، ہلکی ہلکی مگر لگاتار جو رہی تھی۔ کرئل کا جی چاہا کہ اوٹی کھیل اور کچھ دوبارہ بستر میں جا لیٹے۔ مگر گرہے کی کوئی ہوئی گھنٹیوں کی مسلسل آواز نے اسے جنازے کی یاد دلائی۔ "اف یہ اکتوبر!" اس نے سرگوشی میں کہا، اور گھرے کے وسط میں آگیا۔ تب ہی اسے مرغ یاد آیا جو بستر کے پائے سے بندھا ہوا تھا۔ وہ ایک لڑکا مرغ تھا۔

کافی کا خالی پیالا باورچی خانے میں رکھنے کے بعد کرئل نے ہندو لم والی گھڑمی کو، جو بیٹھک کی دیوار پر آویزاں تھی، چابی دی۔ خواب گاہ کے برعکس جو خاصی تنگ تھی اور جس میں دسے کے

کرئل کو کوئی خط نہیں لکھتا

مریض کا سانس ناحق رکنے لگتا تھا، بیٹھک کشادہ اور ہوادار تھی۔ مہرے میں ایک چھوٹی میز کے ارد گرد چار مضبوط جھولنے والی کرسیاں رکھی تھیں۔ میز پر غلاف، بچا ہوا تھا اور اس پر مٹی کی مٹی ہوئی تیلی رکھی تھی۔ گھر میں کے سامنے والی دیوار پر ایک تصویر تھی جس میں ایک عورت نے باریک کپڑے کا سفید لباس پہن رکھا تھا، عورت کے ارد گرد چھوٹے چھوٹے کیوڈ گلابوں سے بھری کشتی میں بیٹھے تھے۔

جب کرئل نے گھر میں کو پانی دینا ختم کیا تو سات بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ وہ مرغ کو باورچی خانے میں لے گیا، اسے چولہے کے پائے سے باندھ کر اس نے ڈبے کا پانی تبدیل کیا اور مسمی بھر مکتی اس کے سامنے رکھی۔ صحن کی باڑھ کے ایک سوراخ میں سے مٹلے کے چند بچے اندر آ گئے اور خاموشی سے مرغ کے ارد گرد بیٹھ کر اسے کھاتے ہوئے دیکھنے لگے۔

"مرغ کو ایسے مت گھورو،" کرئل نے کہا۔ "مرغوں کو دیر تک یوں دیکھتے رہیں تو وہ گھس جاتے ہیں۔"

بچے وہیں بیٹھے رہے۔ ایک بچہ ماؤتھ آرگن پر ایک مشور گانے کے سُر ٹکالنے لگا۔ "آج اے مت بجاؤ،" کرئل نے اسے منع کیا۔ "قبے میں ایک موت ہو گئی ہے۔" بچے نے باجا ہونی پتھون کی جیب میں رکھ لیا، اور کرئل جنازے کے لیے تیار ہونے خواب گاہ میں چلا گیا۔

اس کی بیوی کے دے کے دورے کے باعث اس کا سفید سوٹ استری نہ ہو سکا تھا۔ اس لیے کرئل کو اپنا پرانا کالا سوٹ ہی پہننا پڑا، جو شادی کے بعد سے اب تک اس نے صرف چند خاص موقعوں ہی پر پہنا تھا۔ بڑے صندوق میں کپڑوں کے نیچے اخبار میں لپٹے ہوئے اس سوٹ کو ڈھونڈنے میں کرئل کو کچھ دقت ہوئی، کپڑوں سے بچانے کے لیے صندوق میں نشتر لہین کی گولیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کرئل کی بیوی بستر میں دراز ابھی تک مرنے والے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

"اب تک وہ ہمارے آگستین سے مل چکا ہوگا،" وہ بولی۔ "ممکن ہے وہ ہمارے بیٹے کو یہ نہ بتائے کہ اس کے مرنے کے بعد سے ہمارا کیا حال ہے۔"

"اس وقت وہ دونوں شاید مرغوں کے بارے میں گفتگو کر رہے ہوں گے،" کرئل نے

کہا۔

سوٹ ڈھونڈتے ڈھونڈتے کرئل کو صندوق میں ایک بڑی سی چتری نظر آ گئی۔ یہ کرئل کی بیوی نے اس قرعہ اندازی میں جیتی تھی جو کرئل کی پارٹی کے لیے چند اکٹھا کرنے کی خاطر منعقد کی گئی تھی۔ تقریب کی رات، وہ گھر کے باہر بیٹھ کر تماشا دیکھتے رہے تھے جو بارش کے

باوجود جاری رہا تھا۔ کرئل، اس کی بیوی اور ان کے بیٹے آگستین نے۔۔ جو اس وقت آٹھ برس کا تھا۔۔ اس چھتری کے نیچے بیٹھ کر آخر تک تماشا دیکھا تھا۔ اب آگستین مرچکا تھا اور چھتری کی چمک دار سائیں میں کیرٹوں نے سوراخ کر دیے تھے۔

"ہماری سرکس کے مسخروں والی چھتری کا دیکھو کیا حال ہو گیا ہے!" کرئل نے اپنا پرانا فقرہ دوہرایا۔ چھتری کو کھولنے پر اس کے اوپر بہت ساری پراسرار سی سلاخیں نمودار ہو گئیں۔ "اب تو یہ صرف آسمان کے تارے گننے کے کام کی رہ گئی ہے۔"

وہ مسکرایا۔ مگر عورت نے مڑ کر چھتری کو دیکھنے کی زحمت نہ کی۔ "ہر چیز کا یہی حال ہے،" وہ سرگوشی میں بولی۔ "ہم خود ہی تہی گل سرڑ رہے ہیں۔" اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تاکہ مرنے والے کے بارے میں پورے انہماک سے سوچ سکے۔

ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر شیو کرنے کے بعد۔۔ کیوں کہ اس کے پاس عرصے سے کوئی آئینہ نہیں تھا۔۔ کرئل نے خاموشی سے کپڑے پہنے۔ اس کی پتلون، جو اس کی ٹانگوں پر لمبے زیر ہارے کی طرح کسی بوٹی تھی اور ٹخنوں پر فیتوں سے گانٹھ لگا کر بند کی جاتی تھی، کمر پر گردوں کے قریب اسی طرح کے فیتوں سے سنبلی رہتی تھی جو ملتے کیے ہوئے دو بکھوؤں میں سے گزرتے تھے۔ کرئل پیٹی نہیں باندھتا تھا۔ اس کی قمیض جو منیلا کے پرانے کانڈ کے رنگ کی تھی اور اُسی جیسی سخت بھی، تانبے کے گول بٹن کے ساتھ کارلے جوڑی جاتی تھی۔ قمیض کا الگ کارلہ اتنا بوسیدہ ہو چکا تھا کہ کرئل نے ٹائی لگانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

کرئل ہر عمل اس طرح کر رہا تھا جیسے کوئی ارفع کام انجام دے رہا ہو۔ اس کی انگلیوں کے جوڑوں کی گھنٹی بوٹی اور شفاف کمال پر سفید دھبے تھے جیسے اس کی گردن کی کمال پر تھے۔ اپنے نقلی چمڑے کے جوتے پہننے سے پہلے اس نے ان کی سیون میں گھسی بوٹی خشک مٹی کو کھرچ کر صاف کیا۔ اس کی بیوی نے اُس وقت اسے دیکھا، اس نے وہی لباس پہن رکھا تھا جو شادی کے روز پہنا تھا۔ تب ہی اس کی بیوی کو احساس ہوا کہ وہ کس قدر عمر رسیدہ ہو چکا ہے۔

"یوں لگتا ہے جیسے تم کسی خاص موقع کے لیے بن سو رہے ہو،" وہ بولی۔ "یہ جنازہ ایک خاص موقع ہی ہے،" کرئل نے کہا۔ "برسوں بعد اس قبے میں یہ پہلا آدمی ہے جو طبعی موت مرا ہے۔"

نوجوان کے بعد مطلع صاف ہو گیا۔ کرئل باہر نکلنے کے لیے تیار تھا جب اس کی بیوی نے اسے آستین سے پکڑ لیا۔

"بالوں میں کنگھی کر لو،" اس نے کہا۔

کر نل کو کوئی خط نہیں لکھتا

کر نل نے اپنے فولاد کے رنگ کے سخت بالوں کو کنگھی سے بٹھانے کی کوشش کی۔ مگر یہ ایک ناکام کوشش تھی۔

"میں ضرور توتے جیسا لگ رہا ہوں گا،" اس نے کہا۔

عورت نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ توتے کی طرح نہیں لگ رہا تھا۔ کر نل ابھرے جسم کا آدمی تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے اس کی ہڈیوں کا ڈھانچا نٹ بولٹ سے کس کر تیار کیا گیا ہو۔ لیکن اس کی آنکھوں میں جان تھی، جس کے بغیر وہ شاید فارمالین میں محفوظ کیا ہوا نمونہ لگتا۔

"تم ٹھیک لگ رہے ہو،" اس نے جواب دیا، اور جب کر نل گھر سے باہر قدم رکھنے لگا تو اضافہ کیا: "ڈاکٹر سے ملو تو پوچھنا کہ کیا ہم نے کبھی اس کے سر پر کھولتا ہوا پانی اُٹھایا تھا؟"

کر نل اور اس کی بیوی قصبے کے سرے پر ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے جس کی چھت پر کھجور کے پتوں کا بنا چھپر تھا، اور دیواروں سے چُونّا گرتا رہتا تھا۔ اس وقت ہوا میں نمی اسی طرح تھی لیکن بارش بند ہو چکی تھی۔ کر نل ایک تنگ گلی میں سے گزر کر، جس کے دونوں جانب گھر تھے، قصبے کے چوک کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ بڑی سڑک پر پہنچا تو اسے کپکپی سی آئی۔ سڑک پر جہاں تک نظر جاتی تھی، پھولوں کا فرش بچھا تھا۔ گھروں کی دہلیزوں پر کالے کپڑوں میں ملبوس عورتیں جنازے کے گزرنے کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔

جب کر نل چوک میں پہنچا تو بوند باندی پھر شروع ہو گئی۔ بلیڈ بال کے مالک نے اپنے دروازے میں سے کر نل کو آتے دیکھا، اور وہیں سے بازو پھیلا کر چلایا:

"کر نل! ٹھہرو میں تمہیں اپنی چھتری دے دوں۔"

کر نل نے مڑے بغیر اسے جواب دیا۔

"شکریہ، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔"

جنازے کا جلوس ابھی گرجے سے باہر نہیں آیا تھا۔ مرد، سفید لباس پر کالی ٹائیاں لگائے، نیچی راہداری میں اپنی اپنی چھتریوں کے نیچے کھڑے باتوں میں مشغول تھے۔ ان میں سے ایک آدمی نے کر نل کو چوک میں پانی اور کیمچڑ کے چھوٹے چھوٹے جوہڑ پھلانگتے دیکھا۔

"ادھر چھتری کے نیچے آ جاؤ دوست!" اس نے پکار کر کہا۔

اس نے کر نل کے لیے چھتری کے نیچے جگہ بنائی۔

"مہربانی، دوست،" کر نل نے کہا۔

لیکن اس نے دعوت قبول نہ کی۔ وہ سیدھا مرنے والے کے گھر میں داخل ہو گیا تاکہ اس

کی ماں سے تغذیت کر سکے۔ وہاں جس چیز کا اسے سب سے پہلے احساس ہوا وہ مختلف پھولوں کی مہک تھی۔ پھر گرمی کی ایک لہر اٹھی۔ لوگوں کے درمیان میں سے راستا بنا کر کرنل نے سونے کے کمرے کی طرف جانا چاہا۔ مگر کسی نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا، اور اسے، لوگوں کے متعجب چہروں کے درمیان سے، کمرے کے عقبی حصے کی طرف دھکیلتے لگا، جہاں مرنے والا کھلے اور گھرے نتھنوں کے ساتھ یا گیا تھا۔

مرنے والے کی ماں وہاں کھڑی ہوئی گھجور کے پتے کے لاش پر سے مکھیاں اڑا رہی تھی۔ دوسری عورتیں کالے کپڑے پہنے لاش کو ایسی ہی مومت سے دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی دریا کے دھارے کو دیکھتا ہے۔ یک دم کمرے کے دوسری جانب سے کسی کی آواز آئی۔ کرنل ایک عورت کو باتھ سے پرے ہٹا کر مرنے والے کی ماں کے قریب جا پہنچا، اور اس کے پاس کھڑے ہو کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مجھے بہت افسوس ہے،" وہ بولا۔

"مجھے بہت افسوس ہے،" وہ بولا۔

عورت نے مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس نے منہ کھول کر زور سے چیخ ماری۔ کرنل لرز اٹھا۔ اسے لگا کہ تھر تھراقی آواز میں آدہ وزاری کرتا ہوا بے ہیئت جھوم اسے لاش کی جانب دھکیل رہا ہے۔ اس نے کسی مضبوط چیز کا سہارا لینے کی کوشش کی مگر اس کے نزدیک کہیں کوئی دیوار نہ تھی۔ ہر طرف لوگ ہی لوگ تھے۔ کسی نے اس کے کان میں آہستہ سے سرگوشی کی، "کرنل! احتیاط سے۔" کرنل نے سر گھمایا، اور اپنے سامنے مرنے والے کو پایا۔ لیکن کرنل نے اسے نہیں پہچانا کیوں کہ وہ سفید کپڑوں میں ملفوف، بگل ہاتھ میں لیے، اکڑ ہوا اور متحرک تھا، اور کرنل جی کی طرح گھبراہٹا ہوا لگا رہا تھا۔ جب کرنل نے تازہ ہوا میں سانس لینے کی خاطر اپنا چہرہ اوپر کیا تو اس نے دیکھا کہ بند تابوت سیرٹھیوں سے پھسلتا، پھولوں کو کچلتا ہوا پیچھے آ رہا ہے۔ اسے پسینا آ گیا۔ اس کے جوڑوں میں درد ہونے لگا۔ ایک لمحے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ باہر نگلی میں کھڑا ہے، کیوں کہ بارش کے قطرے پلکوں پر گرنے سے اسے تکلیف محسوس ہوئی۔ کسی نے اسے بازو سے پکڑ لیا، اور کہا:

"جلدی کرو دوست، میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

یہ سب اس تھا، اس کے مرحوم بیٹے کا دینی باپ، اور پارٹی کا واحد رہنما جو سیاسی مکافات سے بچ نکلا تھا اور قصبے ہی میں مقیم تھا۔ ”شکر یہ دوست، ”حمہ کہ کر کر نل اس کی چھتری کے نیچے آگیا اور خاموشی سے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ سینڈ ماتمی دھن بجانے لگا۔ کر نل نے بنیڈ میں بگل بجانے والے کو مومو جود نہ پایا، اور اسے پہلی بار مکمل طور پر متعین ہوا کہ مرنے والا واقعی مر چکا ہے۔

"بے چارہ!" اس نے آہستہ سے کہا۔

ساباس نے اپنا گلا صاف کیا۔ وہ چھتری کو بائیں ہاتھ میں یوں تھامے ہوئے تھا کہ چھتری کا دستہ اس کے سر کے برابر پہنچ رہا تھا، کیوں کہ اس کا قد کرنل سے چھوٹا تھا۔ جب جنازہ چوک سے باہر آیا تو دونوں باتیں کرنے لگے۔ تب ساباس کرنل کی طرف مڑا، اس کے چہرے پر فکر مندی کے آثار تھے، اس نے کرنل سے پوچھا:

"دوست، مُرغ کی کیا خبر ہے؟"

"ابھی تک موجود ہے،" کرنل نے جواب دیا۔

عین اس وقت کسی کے زور سے بولنے کی آواز سنائی۔

"یہ لوگ جنازے کو کہاں لے جا رہے ہیں؟"

کرنل نے نظریں اوپر اٹھائیں۔ اسے بیرک کی بالکنی پر قصبے کا میسر پھیل کر کھڑا نظر آیا۔ وہ اپنے فلائین کے لمبے زیرجامے میں ملبوس تھا، اس کا ایک گال سو جا ہوا تھا اور اس نے اس گال کی حمایت نہیں بنوائی تھی۔ ایک لمبے بعد کرنل کو فادر-نجل کی چیخ کر میسر سے بات کرنے کی آواز سنائی دی۔ چھتری پر بارش کی ٹپا ٹپ کے باوجود کرنل نے گشتگو کی غایت سمجھ لی۔

"کیا ہے؟" ساباس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں،" کرنل نے جواب دیا۔ "جنازے کو پولیس کی بیرکوں کے سامنے سے

گزرنے کی اجازت نہیں ہے۔"

"ہاں میں بھول گیا تھا،" ساباس بولا۔ "میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں کہ مارشل لا لگا ہوا ہے۔"

"وہ تو ہے۔" لیکن یہ کون سا باغیوں کا جلوس ہے؟ ایک بے چارے غریب موسیقار کا جنازہ

ہی تو ہے۔"

جلوس نے راستا تبدیل کر لیا۔ غریب محلوں میں عورتیں جنازے کو گزرتے خاموشی سے دیکھتی رہیں اور دانتوں سے اپنے ناخن کترتی رہیں، مگر تھوڑی دیر بعد وہ سڑک کے درمیان میں آگئیں اور تحسین، تشکر اور الوادع کے نعرے لگانے لگیں، جیسے ان کے خیال میں مرنے والا تابوت کے اندر ان کی بات سن رہا ہو۔ قبرستان میں پہنچ کر کرنل نے خود کو بیمار محسوس کیا۔ جب ساباس نے اسے دیوار کی طرف دھکیل کر تابوت برداروں کے لیے راستا بتایا تو اس نے مسکرا کر کرنل کی طرف دیکھا، لیکن اس کے چہرے پر ایک جامد تاثر تھا۔

"کیا بات ہے دوست؟" ساباس نے پوچھا۔

کرنل نے آہ بھری۔

"وہی اکتوبر کی مصیبت۔"

وہ اسی سڑک سے واپس آئے جس سے قبرستان گئے تھے۔ مطلع اب صاف ہو چکا تھا۔ آسمان کارنگ گھرا نیلا تھا۔ اب شاید بارش نہیں ہوگی، کرنل نے سوچا، اور اس کی طبیعت جیسے بجال ہو گئی۔ لیکن وہ اب تک آزدہ تھا۔ سا باس کی بات نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا:

"ڈاکٹر کو کیوں نہیں دیکھا تے؟"

"میں بیمار نہیں ہوں،" کرنل نے کہا۔ "صرف اکتوبر میں ایسا لگتا ہے جیسے میری انٹریوں میں جاندار پکڑ رہے ہوں۔"

"آہ!" سا باس کے منہ سے نکلا۔ اس نے کرنل کو اپنے گھر کے دروازے پر خدا حافظ کہا۔ اس کا مکان نیا اور دوسرہ تھا، جس کی کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں نصب تھیں۔ کرنل اپنے سوٹ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خاطر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن کڑکی دکان سے کافی کا ڈبا اور مرغ کے لیے آدھ پونڈ مکئی خریدنے کے لیے اسے ایک بار پھر گھر سے نکلنا پڑا۔

جمعرات کے روز وہ عموماً اپنے جھولنے میں لیٹا رہتا تھا، لیکن اس جمعرات کو وہ سارا دن مرغ کی تواضع میں لگا رہا۔ بارش کئی دن سے ہو رہی تھی۔ پورے ہفتے اس کی انٹریوں میں نباتات اگتے رہے تھے۔ اس کی کئی راتیں بیوی کے دے کی سیٹیوں کے باعث بے خوابی میں گزری تھیں، لیکن جمعے کی سہ پہر کو اکتوبر نے اپنی معرکہ آرائی سے توقف کر لیا تھا۔ آگستین کے ساتھی -- جو اس کے ساتھ درزی کی دکان پر کام کرتے رہے تھے اور مرغوں کی لڑائی کے رسیا تھے -- موقع سے فائدہ اٹھا کر مرغ کا معائنہ کرنے چلے آئے۔ وہ اچھی حالت میں تھا۔

لڑکوں کے رخصت ہونے کے بعد جب کرنل اکیلارہ گیا تو خواب گاہ میں لوٹ آیا۔ اس کی بیوی کی طبیعت بھی آج قدرے بہتر تھی۔

"لڑکے کیا کہہ رہے تھے؟" اس نے پوچھا۔

"بہت جوش و خروش دیکھا رہے تھے،" کرنل نے اسے اطلاع دی۔ "سب کے سب مرغ پر لگانے کے لیے پیسے بچا رہے ہیں۔"

"خدا جانے اس بد صورت مرغ میں سب کو کیا نظر آتا ہے؟" عورت بولی۔ "مجھے تو وہ عجیب الخلق لگتا ہے؛ اس کا سر ٹانگوں کے لحاظ سے کتنا چھوٹا ہے۔"

"سب کہتے ہیں کہ ایسا مرغ سارے علاقے میں نہیں ہے،" کرنل نے جواب دیا۔ "مجم از ہم بچاس پیسو کے برابر قیمت ہے اس کی!"

کرنل کو یقین تھا کہ اس دلیل میں اس کے مرغ کی دیکھ بھال جاری رکھنے کے عزم کا مکمل

کر نل کو کوئی خط نہیں لکھتا

جواز موجود ہے۔ مرغ ایک لحاظ سے ان کے بیٹے کی وراثت تھا؛ آگستین کو مرغوں کی لڑائی کے دن ہی آج سے نو ماہ قبل ممنوعہ لٹریچر پڑھتے ہوئے گولی مار دی گئی تھی۔ "یہ ایک مہینگی خام خیالی ہے،" عورت نے کہا۔ "مکئی ختم ہونے کے بعد ہم اسے اپنا کلیجہ ہی کھلا کر پال سکیں گے۔" الماری میں اپنے کپڑے ڈھونڈنے کے دوران کر نل نے سوچنے کے لیے کافی وقت لیا۔

"چند مہینوں کی بات ہے،" اس نے جواب دیا۔ "جنوری میں مرغوں کی لڑائی ہے۔ اس کے بعد ہم اسے زیادہ قیمت پر فروخت کر سکیں گے۔"

کر نل نے جو پتلون صندوق سے نکالی اسے استری کی ضرورت تھی۔ عورت نے پتلون کو چولہے کے اوپر پھیلا دیا، جہاں دو استریاں دہکتے ہوئے کونلوں پر گرم ہو رہی تھیں۔ "باہر جانے کی کیا جلدی ہے تمہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ڈاک کا دن ہے۔"

"ہاں میں تو بھول ہی گئی تھی کہ آج جمعہ ہے،" اس نے سونے کے کمرے میں واپس جاتے ہوئے تبصرہ کیا۔ کر نل نے پتلون کے سوا باقی سب کپڑے پن لیے تھے۔ اس کی بیوی نے اس کے جوتوں کی طرف دیکھا۔

"یہ تو اب پھینکنے کے لائق ہیں،" وہ بولی۔ "بہتر ہے کہ وہی نقلی چمڑے کے جوتے پہنے رہو۔"

کر نل کو سخت ناامیدی محسوس ہوئی۔

"وہ تو کسی یتیم کے جوتے دکھائی دیتے ہیں،" اس نے احتجاج کیا۔ "میں جب بھی انہیں پہنتا ہوں کسی پاگل خانے سے بھاگا ہوا لگتا ہوں۔"

"ہم اپنے بیٹے کے یتیم ہی تو ہیں،" عورت نے کہا۔

اس بار بھی اس نے کر نل کو قائل کر لیا۔ لاناؤں کے سیٹیاں بجانے سے قبل ہی کر نل بندرگاہ تک پیدل پہنچ گیا۔ وہ نقلی چمڑے کے جوتوں، بغیر پیٹنی کی تنگ موری والی سفید پتلون اور بغیر کارلر قمیص میں ملبوس تھا جو گردن پر تانبے کے بٹن سے بند کی گئی تھی۔ موسیٰ شامی کی دکان پر سے وہ لاناؤں کو یکے بعد دیگرے ساحل تک آتے دیکھتا رہا۔ آٹھ گھنٹوں کی بے حرکتی سے اڑے ہوئے مسافر اترے۔ اترنے والے وہی تھے جو ہمیشہ اتر کر تے تھے: یعنی گھر گھر جا کر چیزیں بیچنے والے اور وہ لوگ جو پچھلے جمعے کو قصبے سے گئے تھے اور اب واپس آرہے تھے۔

آخری لانچ ڈاک والی لانچ تھی۔ کر نل نے اذیت تاک بے چینی سے اسے بخاری پر لگتے دیکھا۔ اسے لانچ کی چھت پر چمنی سے بندھا ہوا، روغنی کپڑے میں لپٹا ڈاک کا تھیلا دکھائی دیا۔

پندرہ برس کے استہار نے اس کے وجدان کو تیز کر دیا تھا۔ مرغ نے اس کی بے پیمانی میں اضافہ کر دیا تھا۔ جب پوسٹ ماسٹر لانچ پر گیا، اور تھیلے کو کھول کر اپنے کندھے پر رکھا، کرنل اس پر مستقل نظریں جمائے رہا۔

پھر وہ بندرگاہ کے متوازی سڑک پر، جودکانوں اور اسٹالوں کی ایک بھول بھلیاں تھی جن میں رنگ برنگی چیزیں بھی ہوئی تھیں، پوسٹ ماسٹر کے چھتے پلنے لگا۔ ہر بار اس مرطے سے گزرتے ہوئے اسے خوف سے مختلف، مگر اتنی ہی جاہلانہ، بے پیمانی کا احساس ہوتا تھا۔ ڈاکٹر ڈاک خانے میں اپنے اخباروں کا منتظر تھا۔

"میری بیوی نے کہا ہے کہ میں تم سے دریافت کروں کہ کیا ہم نے، جب تم ہمارے مہمان تھے، تمہارے سر پر کھولتا ہوا پانی پھیٹا تھا؟" کرنل نے کہا۔

ڈاکٹر جوان آدمی تھا اور اس کا سر کالے اور چمکدار بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے دانتوں کی ہمواری میں کوئی ناقابل یقین بات تھی۔ اس نے کرنل سے دسے کی مرینہ کا حال پوچھا۔ کرنل نے اپنی بیوی کے دسے کی مکمل رپورٹ دی لیکن اس دوران میں پوسٹ ماسٹر پر مستقل نظریں جمائے رہا جو تھیلے میں سے خط نکال کر لکڑی کے چوکور ڈبوں میں رکھ رہا تھا۔ اس کی آہستہ روی سے کرنل براؤنگھتہ ہوتا رہا۔

ڈاکٹر نے اپنے خط اور اخبار وصول کیے۔ دواؤں کے اشتہار اس نے ایک جانب رکھ دیے۔ پھر وہ اپنے ذاتی خطوط دیکھنے لگا۔ اس عرصے میں پوسٹ ماسٹر ان لوگوں میں جو ڈاک خانے میں موجود تھے، ڈاک بانٹتا رہا۔ کرنل نے اس خانے کو دیکھا جس پر اس کے نام کا پہلا حرف درج تھا۔ اس میں نیلے کناروں والا ہوائی ڈاک کا ایک لفافہ پڑا تھا جسے دیکھ دیکھ کر کرنل کے اعصابی تناؤ میں اضافہ ہونے لگا۔

ڈاکٹر نے اخباروں کے بندل پر لگی مہر کو توڑا۔ وہ اخبار کی سرخیاں پڑھنے لگا، جبکہ کرنل، اپنے نام والے خانے پر نظریں جمائے، پوسٹ ماسٹر کے اس خانے کے آگے رکنے کا منتظر رہا۔ مگر پوسٹ ماسٹر اس کے پاس سے گزر کر آگے نکل گیا۔ ڈاکٹر نے اخبار کا مطالعہ روک کر کرنل کو، اور پھر پوسٹ ماسٹر کو دیکھا جو آب ٹیلیگراف کے آلے کے سامنے بیٹھ چکا تھا۔ اس نے پھر کرنل کو دیکھا۔

"ہم جارہے ہیں،" وہ بولا۔

"پوسٹ ماسٹر نے سراٹھائے بغیر کہا:

"کرنل کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

کرنل کو حقیقت کا احساس ہوا۔

"مجھے ڈاک کی توقع بھی نہیں تھی،" اس نے جھوٹ بولا۔ پھر ڈاکٹر کی طرف مڑ کر وہ بالکل بچوں کے سہ لہجے میں بولا: "مجھے کوئی خط نہیں لکھتا۔"

وہ دونوں خاموشی سے لوٹ گئے۔ ڈاکٹر کی توجہ ابھی اخبار ہی پر تھی۔ کرنل اپنے مخصوص انداز میں چل رہا تھا، کسی ایسے شخص کے انداز میں جو زمین پر کھویا ہوا سگہ ڈھونڈنے کے لیے اپنے راستے پر واپس آ رہا ہو۔ یہ ایک دھوپ بھری روشن سہ پہر تھی۔ چوک میں بادام کے درختوں سے آخری گلے سڑے پتے گر رہے تھے۔ جب وہ دونوں ڈاکٹر کے دفتر کے دروازے پر پہنچے تو اندھیرا چمانے لگا تھا۔

"خبروں میں کیا ہے؟" کرنل نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ میں چند اخبار تھما دیے۔

"کوئی نہیں جانتا،" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "جو خبریں سنسکر کی زد سے بچ جاتی ہیں، ان کے بین السطور پڑھنے سے بھی کچھ پتا نہیں چلتا۔"

کرنل نے اخبار کی سرخیاں پڑھیں جو سب بین الاقوامی خبروں کی تھیں۔ اوپر پارکالم میں نر سویز پر رپورٹ تھی۔ پہلا صفحہ تقریباً سارے کا سارا مرگ اور جنازوں کے اشتہاری اعلانات سے بھرا ہوا تھا۔

"الیکشن ہونے تو ناممکن ہیں،" کرنل نے کہا۔

"کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو کرنل،" ڈاکٹر نے کہا۔ "ہماری زندگی میں تو کسی مسیحا کے پیدا ہونے کی توقع نہیں ہے۔"

کرنل نے ڈاکٹر کو اخبار واپس کرنے چاہے، مگر ڈاکٹر نے انکار کر دیا۔

"گھر لے جاؤ،" اس نے کہا۔ "پڑھ کر کل صبح واپس کر دیتا۔"

سات بجے کے بعد فلم سنسکر کی درجہ بندی کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئیں۔ فادر ائبل کا دستور تھا کہ گرہے کے میدان سے گھنٹیوں کے ذریعے، ڈاک سے موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق، فلموں کی اخلاقی درجہ بندی کا اعلان کیا کرتا تھا۔ اس شام کرنل کی بیوی نے بارہ گھنٹیاں سنیں۔

"سب کے لیے نامناسب،" اس نے کہا۔ "سال ہو چلا ہے کوئی فلم ایسی نہیں آئی جسے لوگ دیکھ سکیں۔"

مچھردانی گراتے ہوئے اس نے منہ ہی منہ میں کہا، "ساری دنیا کا اخلاق خراب ہو گیا

ہے۔ "کر نل نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ بستر پر لیٹنے سے پہلے اس نے مرغ کو بستر کے پائے سے باندھ دیا۔ اس نے دروازے کی کنڈی چڑھائی اور خواب گاہ میں کیرے مار دوا چھڑکی۔ پھر لیمپ فرش پر رکھا، اپنا جھولنا لٹکایا اور لیٹ کر اخبار پڑھنے لگا۔

اس نے سب اخبار ترتیب وار، پہلے صفحے سے آخری صفحے تک پڑھے۔ حتیٰ کہ اشتہار بھی پڑھ ڈالے۔ گیارہ بجے کر فیو کا بگل بجا۔ آدھ گھنٹے بعد کر نل نے اخبارات کا مطالعہ ختم کیا، اٹھ کر صحن کا دروازہ کھولا اور گھپ اندھیری رات میں باہر نکل کر دیوار کے ساتھ لگ کر پیشاب کیا۔ پھر اس کا گھیراؤ کیے ہوئے تھے۔ جب وہ خواب گاہ میں واپس آیا تو اس کی بیوی جاگ رہی تھی۔

"رٹا رڈ جی سپامیوں کے بارے میں کوئی خبر تھی؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں،" کر نل نے اپنے بستر میں دراز ہوتے ہوئے کہا۔ "پہلے کم از کم نئے پنشن حاصل کرنے والوں کی فہرست ہی شائع کر دیا کرتے تھے۔ پانچ سال سے وہ بھی چھپنی بند ہو گئی ہے۔" آدھی رات کے بعد بارش شروع ہو گئی۔ کر نل تھوڑی دیر تو سویا مگر پھر اپنی استریوں کے خوف سے جاگ گیا۔ کمرے کی چھت کہیں سے ٹپک رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اونی کمبل میں کانٹن تک لپیٹ کر ادھر ادھر ٹپکاؤ کے مقام کو ڈھونڈتا رہا۔ ٹھنڈے پسینے کی ایک لکیر اس کی ریڑھ کی ہڈی پر بہنے لگی۔ اسے بھارت تھا۔ اسے لگا جیسے وہ جمیلی کے تالاب میں پکر کھا رہا ہو۔ کوئی بولا۔ اپنے اتکابی بستر سے کر نل نے اسے جواب دیا۔

"کس سے باتیں کر رہے ہو؟" اس کی بیوی نے پوچھا۔

"اس انگریز سے جو پیسے کا بھیس بدل کر کر نل اور یلیانو بوندیا کے کیمپ میں آگیا تھا،" کر نل نے جواب دیا۔ اس نے بھار میں تپتے ہوئے، اپنے بستر میں کروٹ لی۔ "وہ ڈیوک آف مارلبرو تھا۔"

صبح تک آسمان صاف ہو گیا تھا۔ گر جے کی عبادت کی دوسری گھنٹی بننے پر وہ جھولنے سے کود کر اتر آیا، اور ایک الجھی ہوئی حقیقی دنیا میں پاؤں جمائے گا جے مرغ کی بانگ اور الجھاری تھی۔ اس کا سر اب تک پکرا رہا تھا۔ اسے متلی مور رہی تھی۔ وہ صحن میں چلا گیا اور موسم سرما کی دھیمی سرگوشیوں اور گھمیری خوشبوؤں میں سے گزر کر غسل خانے کی طرف پکا۔ جست کی چھت والے، لکڑی کے تختوں کے بنے غسل خانے کے اندر آسویا کی بو سے ہوا لطیف ہو گئی تھی۔ کر نل نے پیشاب کی نالی کا ڈسکن اٹھایا تو اس میں سے ہزاروں کھیاں ایک ٹکونے بادل کی صورت میں برآمد ہوئیں۔

اس کا اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ کھر درے تختوں پر اکڑوں میٹھے ہوئے، اسے کسی خواہش میں

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

ناکامی کا احساس ہوا۔ اس کے اعضائے باضمہ میں اب کند سے درد نے جگہ پالی تھی۔ "ہر اکتوبر میں یہی ہوتا ہے،" وہ بڑبڑایا۔ لیکن جب تک اس کی انٹریوں میں اگنے والی ٹھمبیوں کو سکون نہ آیا، وہ پُر اعتماد اور معصوم توقع کے ساتھ وہیں بیٹھا رہا۔ آخر کار مرغ کو دیکھنے کی خاطر وہ واپس خواب گاہ میں لوٹ آیا۔

"کل رات بخار سے تمہیں بذیان ہو رہا تھا،" اس کی بیوی نے کہا۔
 ہفتے بھر کے دے کے دورے کے ختم ہوتے ہی وہ اٹھ کر کمرے کی صفائی میں مصروف ہو گئی تھی۔ کرنل نے یاد کرنے کی کوشش کی۔
 "بخار نہیں تھا،" اس نے جھوٹ بولا۔ "مجھے دوبارہ مکرٹی کے بالوں کے خواب آرہے تھے۔"

ہمیشہ کی طرح عورت دے کے دورے کے اختتام پر اعصابی قوت اور جوش سے بھرپور تھی۔ پوری صبح وہ مارے مکان کو الٹ پلٹ کرتی رہی۔ گھڑی اور نوجوان لڑکی کی تصویر کے علاوہ اس نے ہر چیز کی جگہ تبدیل کر دی۔ وہ اتنی دہلی اور گھٹے ہوئے بدن کی تھی کہ جب اپنے کپڑے کے چپلوں اور ہر سمت سے بند کالے لباس میں چلتی تھی تو لگتا تھا جیسے اس میں دیواروں کے پار ٹھل جانے کی قوت ہو۔ لیکن بارہ بجے سے پہلے اس کے وجود نے، جو بستر میں چند انچ سے زیادہ جگہ نہیں گھیرتا تھا، اپنا تن و توش اور انسانی وزن دوبارہ حاصل کر لیا تھا۔ اب، بیگنیا اور قرن کے گھملوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس کی موجودگی سے پورا گھر معور معلوم ہوتا تھا۔ "اگر آگستین کے سوگ کا برس پورا ہو گیا ہوتا تو آج میں گانا گاتی،" اس نے جھڈیا میں جھجے ہلاتے ہوئے کہا، جس میں منطقہ حارہ میں اگنے والی ہر سبزی کٹی ہوئی تھی اور پک رہی تھی۔
 "گانے کو جی چاہ رہا ہے تو ضرور گاؤ،" کرنل نے کہا۔ یہ تمہاری تیلی کے لیے بھی مفید ہو گا۔"

دوپہر کے کھانے کے بعد ڈاکٹر آیا۔ کرنل اور اس کی بیوی باورچی خانے میں بیٹھے کافی پی رہے تھے، جب اس نے دھکیل کر لگی والادروازہ کھولا اور آواز لگائی:

"کیا سب فوت ہو گئے ہیں؟"

کرنل اسے خوش آمدید کہنے کو اٹھا۔

"لگتا تو ایسا ہی ہے،" بیٹھک کی طرف جاتے ہوئے اس نے ڈاکٹر کو مخاطب کر کے کہا،
 "تم نے بھی اپنی گھڑی گدھوں سے ملارکھی ہے۔"

عورت معائنے کے لیے تیار ہونے خواب گاہ میں چلی گئی۔ ڈاکٹر کرنل کے ساتھ بیٹھک ہی

میں رہا۔ گرمی کے باوجود ڈاکٹر کے لیٹن کے کپڑوں میں تازگی کی محک تھی۔ جب عورت نے اعلان کیا کہ وہ تیار ہے تو ڈاکٹر نے کرنل کو کاغذ کے تین پرچے دیے جو ایک لفافے میں بند تھے۔ "یہ وہ خبریں ہیں جو کل اخباروں نے شائع نہیں کی تھیں،" اس نے کہا، اور خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔

کرنل کو اندازہ تھا۔ ان پرچوں میں ملکی حالات کا خلاصہ تھا جو خفیہ ترسیل کی خاطر میموریاں گراف کیا گیا تھا۔ ملک کے اندرونی حصوں میں مسلح بغاوت کے بارے میں چند نئے انکشافات۔ اس نے خود کو نہایت شکست خوردہ آدمی محسوس کیا۔ دس سال تک خفیہ خبریں پڑھنے کے باوجود وہ یہ سمجھنے کے قابل نہ ہوا تھا کہ ہر نئی خبر گزشتہ خبروں سے زیادہ حیران کن ہوتی ہے۔ جب تک ڈاکٹر واپس آیا وہ پرچے پڑھنا ختم کر چکا تھا۔

"میری یہ مریضہ تو مجھ سے بھی زیادہ صحت مند ہے،" اس نے کہا۔ "مجھے ایسا دمہ ہو تو سو برس تک جی سکتا ہوں۔"

کرنل پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈاکٹر کو دیکھتا رہا۔ اس نے کچھ کچھ بغیر لفافہ اسے واپس کرنا چاہا، مگر ڈاکٹر نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔
"آگے بڑھاؤنا،" اس نے کہا۔

کرنل نے لفافے کو پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔ عورت خواب گاہ سے باہر آئی، اور بولی، "مجھے پتا ہے کسی روز میں بیٹھے بیٹھے مری جاؤں گی، اور تمہیں بھی ساتھ لے کر جہنم میں جاؤں گی، ڈاکٹر!" ڈاکٹر نے حسب معمول اپنی ہنسی دکھا کر خاموشی سے بات کی داد دی۔ پھر وہ کرسی گھسیٹ کر میز کے نزدیک بیٹھ گیا، اور اپنے چرمی تھیلے میں سے دواؤں کے مفت نمونوں کی بہت سی شیشیاں نکال لیں۔ عورت باورچی خانے میں چلی گئی۔

"کافی گرم کر رہی ہوں۔ پی کر جانا،" اس نے وہاں سے کہا۔
"نہیں۔ بہت بہت شکریہ،" ڈاکٹر بولا۔ وہ ایک کاغذ پر دواؤں کی ترکیب استعمال لکھ رہا تھا۔ "میں تمہیں موقع نہیں دوں گا کہ مجھے زہر پلاؤ۔"

وہ باورچی خانے میں بیٹھی ہنستی رہی۔ ڈاکٹر نے لکھنا بند کیا اور بلند آواز سے اپنے لکھے کو پڑھا، کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ اس کا لکھا کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ کرنل نے غور سے ڈاکٹر کی ہدایات سننے کی کوشش کی۔ باورچی خانے سے باہر آتے ہوئے، عورت کو اس کے چہرے پر گزشتہ رات کی اذیت کے اثرات دکھائی دیے۔

"آج صبح اسے بخار تھا،" اس نے اپنے شوہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "رات میں دو

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

گھنٹے تک یہ خانہ جنگی کے بارے میں الٹی سیدھی بانٹتا رہا۔
کرنل یہ سن کر چوٹا۔

"نہیں بخار نہیں تھا،" اس نے اپنی بڑبڑاہٹ پر قابو پاتے ہوئے اصرار کیا۔ "جس دن بیمار ہوں گا، خود ہی اپنے آپ کو کوڑے دان میں ڈال دوں گا۔"
وہ اٹھ کر خواب گاہ میں سے اخبار لانے چلا گیا۔
"تعریف کا شکر یہ،" ڈاکٹر نے کہا۔

وہ دونوں گھر سے نکل کر چوک کی طرف روانہ ہو گئے۔ آج ہوا میں خشکی تھی۔ گرمی سے سڑکوں پر بچھاتا رکول پگھلنے لگا تھا۔ جب ڈاکٹر نے کرنل کو الوداع کہا تو کرنل نے اس سے اس کی فیس کے بارے میں پوچھا۔

"فی الحال کچھ دینے کی ضرورت نہیں،" اس نے کرنل کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "مرغ جیت جائے گا تو بڑا سا بل بھیج دوں گا۔"

کرنل آگستین کے ساتھیوں کو خفیہ اخبار پہنچانے درزی کی دکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب سے کرنل کے اپنے رفیق اور خانہ جنگی کے شریک کار بارے گئے یا ملک بدر کر دیے گئے تھے اور اس کا اپنا کام جمعے کے جمعے خط کا انتظار کرنا رہ گیا تھا، درزی کی دکان ہی اس کی واحد پناہ گاہ تھی۔
سہر کی گرمی کے باعث کرنل کی بیوی کی قوت بحال ہو گئی تھی۔ برآمدے میں بیگونیا کے گھملوں کے پاس پھٹے پرانے کپڑوں کا صندوق ساٹنے رکھے، وہ بغیر کسی سامان کی مدد کے نئے لباس تیار کرنے کے ابدی مغزے میں مستغرق تھی۔ وہ پرانی قمیصوں کی آستینوں میں سے کار، اور چھوٹی چھوٹی، گو مختلف رنگوں کی، کترینوں میں سے پیوند بنارہی تھی۔ ایک جمینگر نے والان میں اپنا راگ الپنا شروع کیا۔ سورج ڈھل چکا تھا۔ مگر اس نے اسے بیگونیا کے پودوں کے پیچھے غروب ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ جب شام ڈھلے کرنل گھر واپس آیا تب اس نے اپنا سلائی کا شغل بند کیا۔ اپنی گردن کو دونوں ہاتھوں سے تمام کر اس نے اپنی انگلیاں چٹائیں اور بولی:
"سیری گردن تھتے کی طرح اکڑ گئی ہے۔"

"تمہاری گردن ہمیشہ سے ایسی ہی ہے،" کرنل نے کہا، مگر جب اس نے اپنی بیوی کے کپڑوں اور جسم پر ہاروں طرف چھوٹی چھوٹی رنگ دار کترینیں دیکھیں تو اضافہ کیا، "تم نیل کنٹھ کے گھونٹے میں سے نکلی لگتی ہو۔"

"تمہارا لباس تیار کرنے کے لیے آدھا نیل کنٹھ تو بننا ہی پڑتا ہے،" اس نے جواب دیا۔
اس نے تین مختلف رنگوں کے کپڑوں سے تیار کی ہوئی کرنل کی قمیص اسے دکھائی، صرف قمیص

کے کار اور استین کے لیے ایک ہی رنگ کا کپڑا استعمال کیا گیا تھا۔ "کار نیوال میں مسخرہ بننے کے لیے تعین صرف اپنا کوٹ اتارنے کی ضرورت ہوگی۔"

گر بے سے چھ بے شام کی گھنٹیاں اس کی بات میں دخل انداز ہوئیں۔ "خداوند خدا کے فرشتے نے مریم کو خبر دی،" اس نے بلند آواز میں دعا پڑھنی شروع کی اور خواب گاہ کی جانب چلی گئی۔ کرنل دالان میں بیٹھا بچوں سے باتیں کرتا رہا جو اسکول کی چھٹی ہونے پر مرغ کو دیکھنے پھر آ گئے تھے۔ تب اسے یاد آیا مرغ کے لیے اگلے روز کی کمی نہیں تھی، اور وہ اپنی بیوی سے پیسے لینے اندر چلا گیا۔

"میرا خیال ہے صرف پچاس سینٹ باقی ہیں،" وہ بولی۔
وہ پیسے گدے کے نیچے، رفال کے کونے میں باندھ کر رکھتی تھی۔ یہ آگستین کی سلائی مشین بیچ کر حاصل کی ہوئی رقم تھی۔ اسی سے وہ پچھلے نو مہینوں سے، پانی پانی کر کے، اپنی اور مرغ کی ضرورتیں پوری کر رہے تھے۔ اب بیس سینٹ کے دو اور دس سینٹ کا ایک سکہ باقی بچا تھا۔
"آدھا سیر کمٹی خرید لو،" عورت نے کہا، "اور باقی کے پیسوں سے کل کے لیے کافی اور چار اونس پنیر لے آنا۔"

"ہاں، اور دروازے میں لٹکانے کے لیے سونے کا باتھی بھی لے آؤں گا،" کرنل نے جواب دیا۔ "بیالیس سینٹ کی تو کمٹی ہی آنے لگی۔"

دونوں کچھ دیر سوچتے رہے۔ "مرغ ایک آدھ روز بھوکا بھی رہ سکتا ہے، آخر جانور ہی تو ہے،" عورت نے بات شروع کی۔ مگر کرنل کے چہرے کی کیفیت نے اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ کرنل اپنی کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے بستر پر بیٹھا، سکوں کو اپنے ہاتھوں میں کھینکھتا رہا تھا۔
"یہ سب میں اپنے لیے نہیں کر رہا ہوں،" وہ ایک لمحے بعد بولا۔ "صرف اپنی بات ہوتی تو آج ہی اسے بھون کر کھا گیا ہوتا۔ پچاس پیسوں کی بدبھنی بھی کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔" وہ بات کرتے کہتے اپنی گردن پر میٹھے ایک مچھر کو مارنے کے لیے رکا۔ پھر اس کی ٹکا میں کھرے میں عورت کا تعاقب کرنے لگیں۔

"اپنے سے زیادہ مجھے ان بچوں کا خیال ہے جو پیسے جوڑ رہے ہیں۔"
عورت نے اس کی بات پر تھوڑی دیر غور کیا۔ پھر بات میں کیرٹے مار دوا کا اسپرے لیے ہوئے پوری گھوم گئی۔ کرنل کو اس کا انداز کچھ غیر حقیقی سا لگا، جیسے وہ گھر کی نگہبان روحوں سے صلاح مشورہ کر رہی ہو۔ بالآخر اس نے اسپرے کو چھوٹے کارنس پر رکھ دیا، جہاں تصویروں رکھی تھیں، اور اپنی شربتی رنگ کی آنکھیں کرنل کی شربتی رنگ کی آنکھوں پر جمادیں۔

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

"لے آؤ کمٹی،" اس نے کہا۔ "خدا ہی جانتا ہے ہمارا گزارا کیسے ہو گا۔"

"یہ روٹیوں کی افزائش کا معجزہ ہے،" اگلے ہفتے کے دوران ہر روز دوپہر کو میز پر کھانے کو موجود پایا کرنل یہی دوہراتا رہا۔ اپنی رفوگری اور سلائی کڑھائی کی حیرت انگیز صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ شاید اس کی بیوی نے پیسے کی مدد کے بغیر گھر چلانے کا گڑبھی دریافت کر لیا تھا۔ کرنل کے ساتھ اکتوبر کی عارضی صلح ابھی جاری تھی۔ ہوا میں نمی کی جگہ غنودگی نے لے لی تھی۔ تانبی دھوپ لی آسودگی میں عورت نے تین سہ پہریں اپنے بالوں کی آرائش کے پیچیدہ عمل میں صرف کیں۔ بڑی عبادت شروع ہو چکی ہے، "کرنل نے اسے ٹوٹے لنگروں والی لنگھی سے اپنے لمبے نیلگوں بالوں کی گرہیں سلجھاتے دیکھ کر کہا۔ دوسرے روز وہ دالان میں بیٹھی، گود میں سفید چادر پھیلے باریک لنگھی سے جوئیں نکالنے میں مگن رہی، جو اس کی بیماری کے دنوں میں جو گئی ہو گئی تھیں۔ آخر کار اس نے سنبل کے عرق سے اپنے بال دھوئے اور، ان کے سوکھنے کے انتظار میں انہیں دو دفعہ گول کر کے تولیے کے ساتھ گردن کے اوپر باندھ رکھا۔ کرنل انتظار کرتا رہا۔ رات کو اپنے بھولنے میں بے خواب لیٹا وہ مرغ کے بارے میں فکرمند رہا۔ لیکن بدھ کے روز جب مرغ کا وزن کیا گیا تو وہ ٹھیک ٹھاک نکلا۔

اسی سہ پہر کو جب آگستین کے ساتھی، مرغ کی قح سے ہونے والے اپنے مفروضہ منافعوں کا حساب لگاتے ہوئے اس کے گھر سے رخصت ہوئے تو کرنل بھی خود کو چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ اس کی بیوی نے اس کے بال تراشے۔ "تم نے میری عمر کے بیس سال کم کر دیے ہیں،" کرنل نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اس کی بیوی کو لگا کہ وہ درست کہہ رہا ہے۔

"جب میری صحت ٹھیک ہو تو میں مردوں کو بھی زندہ کر سکتی ہوں،" اس نے کہا۔ لیکن اس کی خود اعتمادی صرف چند گھنٹے قائم رہ سکی۔ گھر میں اب دیوار گھڑی اور تصویر کے سوا کچھ نہ بچا تھا۔ جمعرات کی شام تک، جب وہ اپنے وسائل کی آخری حد کو پہنچ چکے تھے، عورت نے صورت حال پر تنویش کا اظہار کیا۔

"فکرمت کرو،" کرنل نے اسے تسلی دی۔ "کل ڈاک کا دن ہے۔"

دوسرے روز وہ ڈاکٹر کے دفتر کے سامنے کھڑا لابیوں کا انتظار کر رہا تھا۔

"ہوائی جہاز کمال شے ہے،" کرنل ڈاک کے تھیلے پر نظریں جمائے جمائے بولا۔ "سنا ہے

ایک ہی رات میں آدمی یورپ پہنچ سکتا ہے؟

"درست ہے،" ڈاکٹر نے ایک باتسور رسالے سے اپنے آپ کو پکھا جھلتے ہوئے کہا۔ کرنل نے ان بہت سے لوگوں کے درمیان پوسٹ ماسٹر کو ڈھونڈ لیا جو لانچ کے گودی پر لگنے کے منتظر تھے تاکہ اس کے لگتے ہی کود کر چڑھ جائیں۔ لانچ پر چڑھنے والا سب سے پہلا شخص پوسٹ ماسٹر تھا۔ اس نے لانچ کے کپتان سے ایک مہر لگا لفافہ وصول کیا۔ پھر وہ لانچ کی چھت پر پہنچ گیا۔ ڈاک کا تھیلا تیل کے دو کنستروں کے درمیان بندھا ہوا تھا۔

"مگر ہوائی سفر میں خطرہ تو ضرور ہوتا ہوگا،" کرنل نے کہا۔ کچھ دیر کو پوسٹ ماسٹر اس کی نظروں سے اوجھل ہوا، لیکن جلد ہی وہ اسے شربت والے ریڑھے پر سبی ہوئی رنگ برنگی بوتلوں کے درمیان کھڑا نظر آگیا۔ "انسانیت کو ترقی کی کچھ قیمت تو ادا کرنی ہی پڑتی ہے۔"

"حالانکہ ہوائی سفر نئی ایجاد ہے مگر لانیوں کے مقابلے میں اب بھی محفوظ ہے،" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "آدمی بیس ہزار فٹ کی بلندی پر سفر کر رہا ہو تو موسم کے اثرات سے اوپر ہوتا ہے۔"

"بیس ہزار فٹ؟" کرنل نے پریشان ہو کر دوبارہ فرمایا۔ اس کا ذہن اس بند سے کے معنی سے نا آشنا تھا۔

ڈاکٹر کو دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس نے باتسور رسالے کو پھیل کر اپنے دونوں ہاتھوں پر لٹکایا۔

"یہ مکمل سکوت اور توازن ہے،" اس نے کہا۔

لیکن کرنل کی توجہ پوسٹ ماسٹر پر مرکوز تھی۔ اس نے اسے بائیں ہاتھ میں گلاس تھامے گلابی رنگ کا شربت پیتے دیکھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ڈاک کا تھیلا تھا۔

"مزید یہ کہ رات کو پرواز کرنے والے جہاز سمندر میں لنگر ڈالے ہوئے ہر جہاز سے رابطہ قائم رکھتے ہیں،" ڈاکٹر بولتا رہا۔ "ان احتیاطی تدابیر کی وجہ سے ہوائی جہاز لانچ سے کہیں زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔"

کرنل نے اس کی طرف دیکھا۔

"ظاہر ہے،" وہ بولا۔ "جہاز کا سفر یقیناً اڑنے والے قالین پر سفر کی طرح ہوتا ہوگا۔"

پوسٹ ماسٹر سیدھا ان کی طرف آیا۔ کرنل بے تابانی سے ایک قدم پیچھے ہٹا، اور مہر لگے لفافے پر لکھا ہوا نام پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ پوسٹ ماسٹر نے ڈاک کا تھیلا کھولا۔ اس نے اخباروں کا پلندا نکال کر ڈاکٹر کے حوالے کیا۔ پھر اس نے لوگوں کے ذاتی خطوط والا پیکٹ کھولا اور رسید کی صحت جانچنے کے بعد خطوں پر لکھے نام بلند آواز میں پکارنے شروع کیے۔ ڈاکٹر نے اخباروں کا پلندا کھولا۔

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

"سویز میں جنگ ابھی جاری ہے،" اس نے سرخیاں پڑھتے ہوئے کہا۔ "مغرب کے قدم اکھڑ رہے ہیں۔"

کرنل نے سرخیاں نہیں پڑھیں۔ وہ اپنی انٹریوں پر قابو پانے کی کوشش میں لگا رہا۔ "جب سے سنسر لگا ہے اخباروں میں صرف یورپ کی خبریں آتی ہیں،" وہ بولا۔ "بہتر یہ ہو گا کہ یورپ کے لوگ یہاں آجائیں اور یہاں کے سب لوگ یورپ میں جا بسیں۔ اس طرح ہر ایک کو معلوم ہوتا رہے گا کہ اس کے اپنے ملک میں کیا ہو رہا ہے۔"

"یورپ کے لوگوں کی نظر میں لاطینی امریکا ایک مونچھوں والا شخص ہے جس کے ایک ہاتھ میں گٹار اور دوسرے میں پستول ہے،" ڈاکٹر اخبار کے عقب سے ہنستے ہوئے بولا۔ "انہیں مسکے کا کچھ بتا نہیں۔"

پوسٹ ماسٹر نے ڈاکٹر کی ڈاک اس کے حوالے کی۔ باقی خط تھیلے میں رکھے اور اسے بند کر دیا۔ ڈاکٹر نے اپنے ذاتی خط کھول کر پڑھنے سے قبل کرنل کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے پوسٹ ماسٹر سے پوچھا، "کرنل کے لیے کچھ نہیں ہے؟"

کرنل کا دل دہل گیا۔ پوسٹ ماسٹر تھیلہ اپنے کندھے پر ڈال کر پلیٹ فارم سے اترا اور ان کی طرف رخ کیے بغیر بولا:

"کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا۔"

اپنی عادت کے برخلاف، کرنل سیدھا گھر واپس نہیں گیا۔ اس نے درزی کی دکان پر بیٹھ کر کافی پی، اس دوران آگستین کے ساتھی اخبار کے صفحے الٹتے رہے۔ کرنل خود کو فریب خوردہ محسوس کر رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ خالی ہاتھ اپنی بیوی کے سامنے جانے کی بجائے اگلے جمعے تک وہیں بیٹھا رہے۔ لیکن جب درزی کی دکان بند ہونے لگی تو اسے حقیقت کا سامنا کرنا ہی پڑا۔ اس کی بیوی اس کی منتظر تھی۔

"کچھ نہیں آیا؟" اس نے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں،" کرنل نے جواب دیا۔

اس سے اگلے جمعے کو وہ پھر لاپرواہ ہو کر دیکھنے لگا۔ اور ہر جمعے کی طرح خط کے بغیر لوٹ آیا۔ "ہم نے کافی انتظار کر لیا،" اس رات اس کی بیوی نے اس سے کہا۔ "پندرہ سال تک کسی خط کا انتظار کرنے کے لیے بیل کا ماصبر چاہیے، جیسا تم میں ہے۔" کرنل اخبار پڑھنے کی غرض سے پنے بھولنے میں لیٹ گیا۔

"ہمارا نمبر ۱۸۳۰ ہے،" اس نے کہا۔ "باری آتے آتے وقت لگے گا۔"

"جب سے ہم انتظار کر رہے ہیں، لاٹری میں بھی یہ نمبر دو دفعہ ٹکل چکا ہے،" اس کی بیوی نے جواب دیا۔

کرنل نے حسب معمول اخبار پہلے صفحے سے آخری صفحے تک، اشتہاروں سمیت پڑھا۔ لیکن آج وہ پڑھتے وقت خبروں پر دھیان دینے کی بجائے پرانے سپاہیوں کی پیش کش کے بارے میں سوچتا رہا۔ انیس برس قبل، جب کانگریس نے قانون بنایا تھا، آٹھ برس اسے اپنا دعویٰ منوانے میں لگے تھے۔ مزید چھ سال بعد اس کا نام پیش کش کے حقداروں کی فہرست میں درج کیا گیا تھا۔ وہ آخری خط تھا جو اسے موصول ہوا۔

کرفیو کے بگل کے بعد کرنل نے اخبار پڑھنا بند کیا۔ جب وہ جی بھاگا تو اسے احساس ہوا کہ اس کی بیوی ابھی تک جاگ رہی ہے۔

"تمہارے پاس وہ اخبار کا تراشہ ابھی تک ہے؟"

عورت سوچنے لگی۔

"ہاں، باقی تمام کاغذات کے ساتھ ہی پڑا ہوگا،" اس نے جواب دیا۔

وہ پھر دانی میں سے باہر آئی اور الماری میں سے لکڑی کا صندوق نکالا، جس میں خطوں کا ایک ترتیب وار بندل ربرٹ کے فیٹے سے بندھا رکھا تھا۔ بندل میں سے اس نے وکلا کی ایک فرم کا اشتہار ڈھونڈ نکالا جس میں سپاہیوں کی پیش کش پر جلد از جلد کارروائی کرانے کا یقین دلایا گیا تھا۔

"جتنا وقت میں نے تمہیں وکیل تبدیل کرنے پر آمادہ کرنے میں لگایا ہے، اتنے عرصے میں ہم رقم وصول کر کے خرچ بھی کر چکے ہوتے،" عورت نے اشتہار اپنے خاوند کو تھماتے ہوئے کہا۔

"جان بوجھ کر اپنے مقدمے کو انڈین لوگوں کے مقدموں کی طرح طاق پر رکھوائے رہنے سے ہمیں کیا حاصل ہوا؟"

کرنل نے تراشے پر نظر ڈالی جو دو برس پرانا ہو چکا تھا۔ اس نے اسے اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ دیا جو دروازے کے پیچھے ٹنگی ہوئی تھی۔

"مصیبت یہ ہے کہ وکیل تبدیل کرنے میں پیسے خرچ ہوتے ہیں۔"

"بالکل بھی نہیں،" عورت فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "تم انہیں لکھو کہ وہ اپنی فیس جتنی بھی ہو پیش کرنے پر اس میں سے کاٹ لیں۔ صرف اسی شرط پر وہ مقدمہ لیں گے۔"

چنانچہ جتنے کی سہ ہر کو کرنل اپنے وکیل سے ملنے گیا۔ اس نے اسے کابلی کے ساتھ اپنے جھولنے میں دراز پایا۔ وہ ایک عظیم الجثہ نیگرو تھا جس کے صرف اوپر کے دو دانت سلامت تھے۔ کرنل کو دیکھ کر اس نے اٹھ کر اپنی کھڑکی پر نہیں، اور پیانو لا کے پیچھے والی کھڑکی کھول دی۔ پیانو لا

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

گرد آلود تھا اور اس کے مختلف خانوں میں، جہاں پہلے موسیقی کے کاغذات کے گول بندل ہوتے تھے، اب رجسٹروں میں چسپاں سرکاری گزٹ کے تراشے اور حساب کتاب کے بھی کھاتے بے ترتیب حالت میں رکھے ہوئے تھے۔ یوں بغیر کنبیوں کا پیا نولاڈیک کا کام بھی دیتا تھا۔ وکیل اپنی گھومنے والی کرسی میں بیٹھ گیا۔ ملاقات کا مقصد بیان کرنے سے قبل کرنل کے چہرے پر بے اطمینانی اور گھبراہٹ کے آثار تھے۔

"میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس مقدمے میں وقت لگے گا،" کرنل کی بات ختم ہونے پر اس نے کہا۔ گرمی کے باعث وکیل کا جسم پسینے سے تر تھا۔ اس نے کرسی کو پیچھے دھکیل کر متوازن کیا اور ایک رسالے سے اپنے آپ کو پینچا جھلنے لگا۔ "میرے کارندے اکثر مجھے خط لکھتے رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس معاملے میں بے صبری سے کام نہیں چلے گا۔"

"پندرہ سال ہو گئے ہیں،" کرنل نے کہا۔ "اب تو یہ مقدمہ خفی مرغ کی کہانی کی طرح لگنے لگا ہے۔"

وکیل نے کرنل کی اطلاع کے لیے انتظامی امور کی جزئیات کی تفصیلی نقشہ کشی کی۔ کرسی اس کے کولہوں کے پھیلاؤ کے لیے ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ "پندرہ سال پہلے معاملہ پھر بھی آسان تھا،" وہ بولا۔ "اُس وقت شہر کے پرانے سپاہیوں کی انجمن موجود تھی جس میں دونوں پارٹیوں کے لوگ شامل تھے۔" اس کے پیچھے بڑے کمرے کی دم گھونٹنے والی ہوا سے بھر گئے، اور اس نے اگلا فقرہ یوں ادا کیا جیسے اسے ابھی ابھی ایجاد کیا ہو:

"اتحاد میں طاقت ہوتی ہے۔"

"اس معاملے میں تو نہیں تھی،" کرنل نے کہا۔ پہلی بار اسے اپنے لیکلے پن کا احساس ہوا۔

"میرے تو مارے حاتھی ڈاک کا انتظار کرتے کرتے مر گئے۔"

وکیل کے چہرے کے تاثر میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔

"دراصل قانون بہت دیر میں جاری ہوا تھا،" اس نے کہا۔ "ہر کوئی تمہاری طرح خوش قسمت نہیں ہوتا کہ بیس سال کی عمر میں کرنل کا عہدہ حاصل کر لے۔ مزید یہ کہ پنشنوں کے لیے کوئی رقم تو مختص کی نہیں گئی تھی، اس لیے حکومت کو بجٹ میں گنجائش نکالنی پڑتی ہے۔"

یہ وہی پرانا قصہ تھا۔ کرنل کو وکیل کی گفتگو سن کر ہر بار ایک ہی طرح کی بے جان سی آزدگی کا احساس ہوتا تھا۔ "ہم خیرات تو نہیں مانگ رہے،" اس نے کہا۔ "اور نہ حکومت ہم پر کوئی احسان کر رہی ہے۔ ریپبلک کو بچانے میں ہم نے اپنا ستیاناس کر لیا تھا۔"

"یہی ہوتا آیا ہے،" وکیل نے جواب دیا۔ "انسان کے ناشکرے پن کی کوئی حد نہیں

ہے۔"

اس منطق سے بھی کرنل کی پرانی آشنائی تھی۔ نیرلاندیا کے معاہدے کے، جس کی رو سے حکومت نے دو سو انقلابی افسروں کو قانونی تحفظ اور سفر خرچ کی ضمانت دی تھی، دوسرے ہی دن لوگ اس انداز میں گفتگو کرنے لگے تھے۔ نیرلاندیا میں سیمل کے عظیم درخت کے نیچے ڈیرا ڈالے انقلابی افسروں کی ایک بٹالین نے، جو زیادہ تر اسکول سے فارغ ہوئے نوجوانوں پر مشتمل تھی، تین ماہ تک انتظار کیا تھا۔ پھر وہ اپنے اپنے وسائل سے گھر پہنچ کر وہاں انتظار کرتے رہے تھے۔ اس واقعے کے تقریباً ساٹھ سال بعد، کرنل آج بھی منتظر تھا۔

پرانے واقعات کی یادوں سے جوش میں آ کر اس نے ایک ماورائی رویہ اختیار کر لیا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنی ران پر رکھ لیا، جو اب صرف ریٹے چڑھی ہڈی رہ گئی تھی، اور بڑبڑایا:

"خیر، اب مجھے اس کا بندوبست کرنا ہے۔"

وکیل بات پوری ہونے کا منتظر رہا۔

"کیا بندوبست؟"

"میں وکیل تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔"

ایک بطن اپنے متعدد چوزوں کے ساتھ دفتر میں گھس آئی۔ وکیل انہیں باہر ٹھانے کے لیے اٹھا۔ "جیسی تمہاری مرضی، کرنل،" اس نے جانوروں کو باہر ٹھاتے ہوئے کہا۔ "بیسے تم چاہو۔ میں اگر کلمات کر سکتا تو آج اس غلے کی کوٹھری میں نہ رہ رہا ہوتا۔" لکڑی کا ایک جنگلاٹھا اس نے دروازے کے آگے آڑا دیا، اور واپس آ کر اپنی کرسی میں دھنس گیا۔

"میرا بیٹا ساری زندگی کام کرتا رہا،" کرنل بولا۔ "میرا گھر رہیں ہے۔ اس رٹا رمنٹ کے قانون سے وکیلوں کی زندگی بھر کی پنشن کا انتظام ہو گیا ہے۔" کرنل نے کہا۔

"غلط ہے،" وکیل نے احتجاج کیا۔ "مجھے اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ میرے تو مقدمے کے اخراجات بھی مشکل سے پورے ہوئے۔"

کرنل یہ سوچ کر پشیمان ہوا کہ شاید اس نے نا انصافی سے کام لیا ہے۔

"میرا بھی یہی مطلب تھا،" اس نے اپنے بیان کی تصحیح کی۔ اس نے قمیص کی آستین سے ماتھے کا پسینا پونچھا۔ "گرمی سے میرے داغ کے پرزے دھیلے ہو گئے ہیں۔"

تھوڑی دیر میں وکیل مختار نامہ ڈھونڈنے میں سارے دفتر کو تلپٹ کر چکا تھا۔ لکڑی کے کھردرے تختوں سے بنے اس چھوٹے سے کمرے میں دھوپ درمیان تک آ چکی تھی۔ چیزوں کے اوپر چاروں طرف ڈھونڈنے اور مختار نامہ نہ پانے کے بعد وکیل ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل، ہانپتا

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

کانپتا، پیا نولا کے نیچے گھس گیا اور تھوڑی دیر بعد کاغذوں کا ایک گول بندل نکال لایا۔
"یہ رہا تمہارا مختار نامہ!"

اس نے کرنل کے ہاتھ میں ایک کاغذ، جس پر مہر ثبت تھی، پکڑا دیا۔ "میں اپنے کارندوں کو لکھ دوں گا کہ وہ اس مختار نامے کی نقلوں کی تیخ کر دیں۔" وکیل نے اپنی بات مکمل کی۔ کرنل نے کاغذ سے گرد جھاڑی اور اسے تہ کر کے اپنی قمیص کی جیب میں رکھ لیا۔
"اسے خود پیار ڈونا،" وکیل نے کہا۔

"نہیں،" کرنل نے جواب دیا۔ "یہ بیس برس کی یادیں ہیں۔" اور وہ منتظر رہا کہ وکیل باقی کاغذات بھی اس کے حوالے کر دے۔ مگر وکیل اپنے جھولنے کے پاس جا کر پسینا پونچھنے لگا۔ وہاں سے اس نے چھپاتی روشنی میں سے کرنل کی طرف دیکھا۔
"مجھے باقی دستاویزات بھی چاہئیں،" کرنل نے کہا۔
"کون سی؟"

"میرے دعوے کے ثبوت کے کاغذ۔"

وکیل نے دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھا دیے۔

"انہیں تلاش کرنا تو ناممکن ہے، کرنل۔"

کرنل یہ سن کر پریشان ہو گیا۔ ماکوندو کے علاقے میں انقلابی فوجوں کے خزانچی کی حیثیت سے، اس نے خانہ جنگی کا تمام سرمایہ دو ٹرنکوں میں تجر کی بیٹھ پر لا کر چھ دن کا صبر آزما سفر طے کیا تھا۔ وہ معاہدے پر دستخط ہونے سے آدھے گھنٹے قبل، قریب المرگ تجر کو کھینچتا ہوا نیرلاندیا کے خیمے میں پہنچا تھا۔ کرنل اور یلیانو بوندیا نے، جو براوقیانوس کے ساحل پر انقلابی فوجوں کا کوارٹراسٹر جنرل تھا، دونوں ٹرنکوں کی رسید دی تھی اور دستبرداری کے لیے تیار کی گئی فہرست میں انہیں شامل کرایا تھا۔

"ان دستاویزات کی قیمت کا تو اندازہ لگانا ہی ناممکن ہے،" کرنل نے کہا۔ "اور ان میں کرنل اور یلیانو بوندیا کے ہاتھ کی لکھی رسید بھی ہے۔"

"درست ہے،" وکیل نے کہا۔ "مگر سینکڑوں ہاتھوں اور ہزاروں دفتروں سے گزر کر اب وہ کاغذات خدا جانے محکمہ جنگ کے کس شعبے میں ہوں گے۔"

"کوئی سرکاری افسران کاغذات کی اہمیت سے بے خبر نہیں رہ سکتا،" کرنل نے کہا۔

"لیکن پچھلے پندرہ برسوں میں کتنے سرکاری افسر تبدیل کیے جا چکے ہوں گے؟" وکیل نے کہا۔ "حساب لگالو۔ اب تک سات صدر حکومت کی باگ ڈور سنبھال چکے ہیں، اور ہر صدر نے کم از

کم دس دفعہ اپنی کابینہ بدلی ہے، اور ہر وزیر نے کم از کم سو دفعہ اپنے اہلکار تبدیل کیے ہیں۔"

"لیکن کوئی ان کاغذات کو گھر تو نہیں لے گیا ہوگا،" کرنل نے کہا۔ "ہر نئے افسر کو وہ مخصوص فائل میں نظر آئے ہوں گے۔"

وکیل کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"اور اگر آپ یہ کاغذات محکمہ جنگ سے نکال لیے گئے، تو ان کو نئے سرے سے رجسٹرول پر چڑھانے کے لیے مزید انتظار کرنا پڑے گا،" اس نے کہا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا،" کرنل نے جواب دیا۔

"اس میں صدیاں لگ جائیں گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ اگر آدمی بڑے مسائل کے حل ہونے کا انتظار کر سکتا ہے تو چھوٹے مسائل کے حل ہونے کا بھی کر سکتا ہے۔"

کرنل نے لکیریوں والے کاغذوں کا پیڈ، قلم، دوات اور سیاہی چوس اٹھا کر بیٹنگ کی چھوٹی میز پر رکھے۔ خواب گاہ کا دروازہ اس نے کھلا چھوڑ دیا، تاکہ اگر اپنی بیوی سے کچھ پوچھنا چاہے تو پوچھ سکے۔ وہ بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔

"آج کیا تاریخ ہے؟"

"ستائیس اکتوبر۔"

کرنل کا خط ستمرا تھا اور وہ نہایت محنت اور اہتمام سے لکھتا تھا۔ لکھتے وقت اس کا قلم والا ہاتھ سیاہی چوس کے اوپر ٹکا ہوتا تھا، اور وہ سیدھا بیٹھتا تھا تاکہ اس کے سانس کی آمدورفت یکساں رہے، جیسا کہ اسے اسکول میں سکھایا گیا تھا۔ چھوٹے سے بند کمرے میں گرمی ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ پسینے کا ایک قطرہ خط کے اوپر گرا۔ کرنل نے سیاہی چوس سے اسے خشک کر لیا۔ جو لفظ نمی سے پھیل گئے تھے، انہیں مٹانے میں کرنل نے خط پر مزید دھبے ڈال لیے۔ لیکن وہ اس بات سے چندال پریشان نہ ہوا۔ صبح تحریر کے نزدیک ستارے کا نشان لگا کر اس نے حاشیے پر وہی الفاظ دوبارہ لکھ دیے، اور پورے پیرے کو پڑھا۔

"میرا نام حق داروں کی فہرست پر کب چڑھا تھا؟"

عورت نے اپنی عبادت کا تسلسل توڑے بغیر جواب دیا: "بارہ اگست انیس سو انچاس کو۔"

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہو گئی۔ کرنل نے بچانہ سے انداز میں صفحے کے حاشیوں کو لمبے ٹیڑھے خطوط سے خاکہ کشی کر کے بھر دیا، جو اس نے مانورے کے پبلک سکول ہی میں سیکھی تھی۔ اس کے بعد اس نے دوسرے صفحے کے نصف تک لکھا اور اپنے دستخط کر دیے۔ پھر اس نے اپنی بیوی کو خط پڑھ کر سنایا۔ بیوی نے ہر فقرے کی سر بلا کر توثیق کی۔ خط پڑھنے کے بعد کرنل نے لفافہ بند کر دیا، اور لیمپ بجھا دیا۔

"کسی سے کہہ کر اسے ٹائپ کرا لو۔"

"نہیں،" کرنل نے جواب دیا۔ "میں لوگوں کے احسان اٹھا کر تنگ آچکا ہوں۔"

آدھ گھنٹے تک وہ کھجور کے پتوں کی چھت پر بارش کی آواز سنتا رہا۔ قصبہ بارش کے طوفان میں غرق ہو رہا تھا۔ کرفیو کے بگل کے بعد کہیں سے چھت کے ٹپکنے کی آواز آنے لگی۔

"یہ قدم تمہیں بہت پہلے اٹھالینا چاہیے تھا،" عورت نے کہا۔ "آدمی اپنے معاملات کو خود ہی نپٹائے تو ٹھیک رہتا ہے۔"

کرنل کے کان چھت کے ٹپکنے کی طرف لگے ہوئے تھے۔ "خیر زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ ہو سکتا ہے مکان کے رہن کی ادائیگی کی تاریخ سے پہلے پہلے یہ معاملہ طے ہو ہی جائے۔"

"دو سال میں،" عورت نے کہا۔

چھت کا سوراخ دھونڈنے کے لیے کرنل نے لیمپ روشن کیا۔ مرع کا پانی والا ڈبا ٹپکاؤ کے نیچے رکھ کر وہ خواب گاہ میں واپس آ گیا؛ خالی ڈبے میں بوندوں کے ٹپکنے کی کرخت آواز نے اس کا تعاقب کیا۔

"یہ بھی ممکن ہے کہ حکومت اپنی رقم پر سود بچانے کی خاطر مقدمے کا فیصلہ جنوری سے قبل ہی کر دے،" وہ بولا، اور خود ہی قائل ہو گیا۔ "تب تک آگستین کے سوگ کا برس بھی پورا ہو چکا ہو گا، اور ہم فلم دیکھنے جا سکیں گے۔"

عورت دبی دبی ہنسنے لگی۔ "مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ کارٹون کیسے ہوا کرتے تھے،" اس نے کہا۔ کرنل نے پھر دانی میں سے اسے دیکھنے کی کوشش کی۔

"آخری دفعہ تم نے کب فلم دیکھی تھی؟"

"انیس سو اکتیس میں،" اس نے جواب دیا۔ "مردے کی وصیت دکھائی جا رہی تھی۔"

"اس میں کوئی لڑائی بھی تھی؟"

"پتا ہی نہیں چلا۔ بھوت لڑکی کا نیلکس چرانے والا تھا کہ طوفان آ گیا، اور فلم بند کر دی گئی۔"

بارش کی آواز نے دونوں کو رفتہ رفتہ سُلا دیا۔ کرنل نے انٹریوں میں بے چینی سی محسوس کی۔ لیکن وہ خوف زدہ نہ ہوا۔ ایک اور اکتوبر ختم ہونے کو تھا۔ اس نے خود کو اونی کمبل میں لپیٹ لیا، اور ایک لمحے کو دور سے اپنی بیوی کے سانسوں کی، بھرپوری آواز کو کسی اور خواب کی رو پر بستے ہوئے سنتا رہا۔

تب اس نے بات کی؛ بولتے وقت وہ پورے ہوش میں تھا۔
عورت جاگ گئی۔

"کس سے باتیں کر رہے ہو؟"

"کسی سے نہیں،" کرنل نے کہا۔ "میں یہ سوچ رہا تھا کہ ماکوندو کے جلے میں جب ہم نے کرنل اور یلیانو بوئندیا سے کہا تھا کہ ہتھیار نہ ڈالے، تو ہم نے اسے غلط مشورہ نہیں دیا تھا۔ ساری تباہی اسی سے شروع ہوئی۔"

بارش پورے ہفتے ہوتی رہی۔ نومبر کی دو تاریخ کو، کرنل کی خواہش کے برعکس، عورت آگستین کی قبر پر پھول چڑھانے گئی۔ قبرستان سے واپس آتے ہی اس پر دمے کا حملہ ہو گیا۔ یہ ایک کٹھن ہفتہ تھا۔ اکتوبر کے ان چار ہفتوں سے بھی زیادہ کٹھن جنھیں جھیل جانے کی کرنل کو امید نہیں تھی۔ ڈاکٹر مریض کو دیکھنے آیا، اور کمرے سے چلتا ہوا باہر نکلا، "مجھے ایسا دمہ ہو تو سارے قصبے کو دفن کرنے کے بعد بھی زندہ رہوں۔" لیکن اس نے علیحدگی میں کرنل سے بات کی، اور مریض کے لیے خاص خوراک تجویز کی۔

کرنل کا اپنا مرض پھر عود کر آیا۔ وہ دیر تک پانانے میں بیٹھا زور لگاتا رہا، اسے ٹھنڈے پسینے آتے رہے اور یوں محسوس ہوتا رہا جیسے وہ گل سرٹ رہا ہو اور اس کی انٹریوں میں آگے زہریلی نہاتات ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی ہوں۔ "اب تو سردی آگئی ہے،" اس نے خود کو اطمینان دلایا۔ "بارش رک جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اور اسے واقعی یقین آ گیا کہ جب پنشن کا خط آئے گا تو وہ اسے وصول کرنے کے لیے زندہ ہو گا۔

اس بار کرنل کو گھریلو اخراجات میں پیوند لگانے پڑے۔ ارد گرد کی دکانوں سے اسے کسی مرتبہ دانت کچھکا کر ادھار مانگنا پڑا۔ "صرف ایک ہفتے کی بات ہے،" وہ دکان داروں سے کہتا رہا، حالانکہ اسے خود بھی یقین نہ تھا کہ یہ سچ ہے، "پچھلے جمعے کو مجھے رقم مل جانی چاہیے تھی۔" دورے کے گزر جانے کے بعد، عورت اسے غور سے دیکھنے پر دہشت زدہ رہ گئی۔

"تم تو بڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گئے ہو،" اس نے کہا۔

"نہیں، میں اپنا خاص خیال رکھ رہا ہوں، تاکہ اپنے آپ کو فروخت کر سکوں،" کرنل نے

جواب دیا۔ "مجھے ایک کلار نیٹ فیکٹری والوں نے پہلے ہی رکھ لیا ہے۔" لیکن حقیقت یہ تھی کہ خط کی امید نے اسے معمولی سا سہارا دے رکھا تھا۔ ٹھکن اور بے خوابی سے چُور، وہ اپنی اور مرغ کی ضرورتوں کی خبر گیری بیک وقت نہیں کر پا رہا تھا۔ نومبر کے دوسرے ہفتے میں اسے خیال ہوا کہ مرغ کو دو دن اور مکئی نہ ملی تو وہ چل بے گا۔ تب اسے یاد آیا کہ اس نے جولائی کے مہینے میں چھنی کے اندر مٹی بھر لوہا سنبال کر رکھا تھا۔ لوہے کی پمیلیوں سے دانے نکال کر اس نے ہسپتال کے ڈبے میں ڈالے اور مرغ کے آگے رکھ دیے۔

"ادھر آؤ،" اس کی بیوی نے اسے آواز دی۔

"ایک منٹ ٹھہرو،" کرنل نے جواب دیا، اور لوہا کے دانوں کے بارے میں مرغ کے رد عمل کا جائزہ لینے لگا۔ "بیک منگلوں کو انتخاب کا حق نہیں ہوتا۔"

اس نے اپنی بیوی کو بستر میں اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے پایا۔ اس کے بیماری سے لاغر جسم میں سے دواؤں اور جڑی بوٹیوں کی بو آرہی تھی۔ اس نے ہر لفظ ٹھہر ٹھہر کر اور پنے تلے انداز میں ادا کیا:

"اس مرغ سے ابھی فوراً چھٹکارا حاصل کرو۔"

کرنل اس لمحے کی توقع کرتا رہا تھا۔ وہ اس کا اُس سر پہر سے منتظر تھا جب اس کے پیٹھ کو گولی باردی گئی تھی اور اس نے مرغ کی نگہداشت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس موضوع پر سوچ بچار کا اسے خاصا وقت مل چکا تھا۔

"ابھی کیا فائدہ؟" اس نے کہا۔ "دو مہینوں میں مرغوں کی لڑائی ہے، اس کے بعد ہم اس کے اچھے پیسے حاصل کر سکیں گے۔"

"پیسوں کا سوال نہیں ہے،" عورت نے کہا۔ "آج جب لڑکے آئیں تو انہیں کہو کہ مرغ کو لے جائیں اور اس کے ساتھ جو کرنا ہو کریں۔"

"یہ آکستین کی خاطر ہے،" کرنل نے پہلے سے سوچی ہوئی دلیل پیش کی۔ "اس کی شکل یاد کرو جب وہ ہمیں بتانے آیا تھا کہ مرغ جیت گیا ہے۔"

در اصل کرنل کی بیوی نے اپنے پیٹھ کے بارے میں سوچا تھا۔

"ان بد بخت مرغوں ہی کی وجہ سے اس کی جان گئی،" اس نے چیخ کر کہا۔ "تین جنوری کو وہ اگر گھر میں ٹکا رہتا تو اس پر برا وقت کیوں آتا۔" وہ اپنی سوکھی ہوئی شہادت کی انگلی سے دروازے کی طرف اشارہ کر کے بولی:

"مجھے یاد ہے جب وہ مرغ کو بغل میں دبا کر گھر سے باہر نکلا تھا میں نے اسے کہا تھا کہ

مرغوں کی لڑائیوں میں شامل ہو کر خواہ مخواہ اپنے لیے عذاب مول نہ لے، مگر اس نے ہنس کر اور ڈانٹ کر مجھے خاموش کر دیا تھا، اور کہا تھا کہ شام تک ہم دولت میں لوٹیں گے۔ بولے گے۔"

وہ نڈھال ہو کر پیچھے کو گر گئی۔ کرنل نے نرمی سے کھینچ کر اسے نیکے کے قریب کر دیا۔ اپنی جیسی شہرہ بستی رنگ کی آنکھوں پر اس کی نظر پڑی۔ "ہلنے کی کوشش نہ کرو،" وہ بولا، اور اسے یوں لگا جیسے اس کی بیوی کے سانس کی سیٹیاں اس کے اپنے سینے سے برآمد ہو رہی ہیں۔ عورت تھوڑی دیر کے لیے بے مدد رہی ہو گئی۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ جب اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو اس کا سانس کچھ کچھ ہموار ہو گیا تھا۔

"یہ سب ہماری حالت کی وجہ سے ہے،" وہ بولی۔ "اپنے منہ کا نوالا چھین کر ایک مرغ کو ڈال دینا گناہ نہیں تو اور کیا ہے؟"

کرنل نے چادر سے اس کے ماتھے کا پسینا خشک کیا۔

"تین مہینوں میں کوئی نہیں مرتا۔"

"اور ان مہینوں میں ہم کھائیں گے کیا؟" عورت نے پوچھا۔

"چتا نہیں،" کرنل نے کہا۔ "لیکن ہمیں اگر بھوک کے ہاتھوں مرنا پڑتا تو بہت پہلے مر گئے ہوتے۔"

مرغ زندہ اور بھلا چٹکا اپنے پیٹل کے خالی ڈبے کے پاس موجود تھا۔ کرنل کو دیکھ کر وہ گلے سے تھریبا انسانی آواز نکالتے ہوئے خود کھای سی کرنے لگا، اور اس نے اپنا سر پیچھے کو جھٹھا۔ کرنل ساز باز کے انداز میں مسکرایا، اور بولا:

"زندہ رہنا آسان نہیں ہے، دوست۔"

کرنل باہر لگی میں نکل آیا۔ جس وقت لوگ قیلوہ کر رہے تھے، وہ بے مقصد اوجڑا دھڑکھوٹتا رہا، اس دوران میں اس نے کچھ سوچنے کی کوشش نہ کی، حتیٰ کہ اپنے آپ کو یہ باور کرانے سے بھی باز رہا کہ اس کی مشکلات کا کوئی حل نہیں ہے۔ وہ بھولی ہوئی گلیوں اور سڑکوں پر پھرتا رہا، یہاں تک کہ چل چل کر نڈھال ہو گیا۔ تب وہ گھر لوٹ آیا۔ عورت نے اس کے گھر میں داخل ہونے کی آواز سنی اور اسے اندر خواب گاہ میں بلایا۔

"کیا بات ہے؟"

عورت نے اسے دیکھے بغیر جواب دیا۔

"ہم گھر ہی بیچ سکتے ہیں۔"

کرنل کو بھی یہ خیال آچکا تھا۔ "مجھے یقین ہے آوارہ تمہیں اس کے چالیس پیسو تو باتہ کے

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

بات دے دے گا، "عورت بولی۔" "یاد ہے اس نے سلائی مشین ہم سے کتنی جلدی خرید لی تھی۔"
آوارو وہ درزی تھا جس کی دکان میں آگستین سلائی کا کام کیا کرتا تھا۔

"کل صبح اس سے بات کروں گا،" کرنل نے ہامی بھری۔

"کل صبح کا کیا مطلب؟ اسے ابھی اس کے پاس لے جاؤ، اسے اس کے کاؤنٹر پر رکھو، اور
کھوہ الوارو، میں یہ گھڑمی تمہارے ہاتھ بیٹنا چاہتا ہوں۔ وہ فوراً سمجھ جائے گا۔"
کرنل کو ہر مندگی کا احساس ہوا۔

"اسے قصبے میں لے کر پھرنا ایسا ہی ہے جیسے آدمی حضرت عیسیٰ کے مزار کا گنبد لیے پھر رہا
ہو،" اس نے احتجاج کیا۔ "رافیل ایکالونا نے مجھے اس گھڑمی کے ساتھ دیکھ لیا تو میرے بارے میں
گانے ایجاد کر لے گا۔"

لیکن اس بار بھی اسے اپنی بیوی کی بات ماننا پڑی۔ عورت نے خود گھڑمی دیوار سے اتاری،
اخبار میں لیڈی اور کرنل کے حوالے کی۔ "چالیس پیسو کے بغیر گھر مت واپس آنا،" اس نے کہا۔
کرنل بندل کو بغل میں لیے درزی کی دکان کی سمت روانہ ہو گیا۔ اس نے آگستین کے ساتھیوں کو
دکان کی دہلیز کے باہر بیٹھے ہوئے پایا۔

ان میں سے ایک نے کرنل کو بیٹھنے کی دعوت دی۔ "شکریہ،" وہ بولا، "میں جلدی میں
ہوں۔" الوارو دکان سے باہر آیا۔ دکان کے اندر ایک تار پر لٹین کا ایک گیلانکڑا سکمانے کے لیے
لٹکا ہوا تھا۔ وہ دبے، بے لوج جسم والا لڑکا تھا جس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ اس نے بھی کرنل کو
بیٹھنے کو کہا۔ کرنل کے دل کو تھوڑا سا قرار آیا۔ اسٹول کو تھوڑا سا جھکا کر دروازے کے پانچھے کے
ساتھ ٹیک لگا کر وہ بیٹھ گیا، اور منتظر رہا کہ الوارو کو فرصت ہو، تاکہ وہ علیحدگی میں اس سے بات کر
سکے۔ یکدم اسے احساس ہوا کہ وہ بہت سارے بے تاثر چہروں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔

"میں تمہارے کام میں مغل تو نہیں ہو رہا ہوں؟" اس نے پوچھا۔

انہوں نے جواب دیا، "نہیں۔" ان میں سے ایک لڑکا اس کی طرف جھکا۔ اس نے دھیمی،

تقریباً ناقابل سماعت آواز میں کہا:

"آگستین کا خط آیا ہے۔"

کرنل نے سنان سرکل پر نظر دوڑائی۔

"کیا لکھا ہے؟"

"کوئی نئی بات نہیں۔"

انہوں نے اسے خفیہ اخبار تمہا دیا۔ کرنل نے اسے اپنی پستوں کی جیب میں رکھ لیا۔ پھر وہ

ناموش بیٹھا، انگلیوں سے بندل کو کھٹکھٹاتا رہا حتیٰ کہ ایک کارندے کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی۔ شوش ہو کر کرنل نے بندل سے کھینا بند کر دیا۔

"اس میں کیا ہے کرنل؟" ایرنان نے پوچھا۔

کرنل نے ایرنان کی تیز عقاب کی سی آنکھوں سے آنکھیں ملانے سے گریز کیا۔

"کچھ نہیں،" اس نے جھوٹ بولا۔ "حیر من کے پاس گھڑی مرمت کرانے لے جا رہا تھا۔"

"دیوانے ہوئے ہو کر کرنل؟" ایرنان نے بندل اس کے ہاتھ سے لینے کی کوشش کرتے

ہوئے کہا۔ "مجھے دو، میں دیکھتا ہوں۔"

لیکن کرنل نے بندل پکڑے رکھا۔ وہ بولا کچھ نہیں، مگر اس کے پیوٹے عتابی ہو گئے۔ باقیوں نے بھی اصرار کیا۔

"اسے دیکھ لینے دو، کرنل۔ ایرنان پر زوں مشینوں کا ماہر ہے۔"

"میں اسے خواہ مخواہ تکلیف نہیں دینا چاہتا۔"

"تکلیف کیسی؟" ایرنان نے جھٹ کی۔ اس نے گھڑی اٹھالی۔ "حیر من تم سے دس پیسہ

دمروا لے گا اور گھڑی ویسے کی ویسی رہے گی۔"

گھڑی کو اٹھائے ایرنان دکان کے اندر چلا گیا۔ الوارو مشین پر سلائی میں مصروف تھا۔ دکان

کے عقب میں دیوار پر ٹنگے ہوئے گٹار کے نیچے ایک لڑکی بیٹن ٹانگ رہی تھی۔ گٹار کے اوپر سائن

چسپاں تھا: "سیاسی گفتگو کرنا منع ہے۔" باہر بیٹھے کرنل کو اپنا جسم بالکل بے مصرف لگا۔ اس نے

اپنے پاؤں اٹھا کر اسٹول میں لگی سلاح پر رکھ لیے۔

"خدا تمہیں غارت کرے، کرنل۔"

وہ چونک پڑا۔ "گالی دینے کی کیا ضرورت ہے؟" اس نے کہا۔

الفانسو نے ناک پر اپنی عینک ٹھیک سے جمائی اور کرنل کے جوتوں کا معائنہ کرنے لگا۔

"تمہارے جوتوں کے بارے میں کہا ہے،" وہ بولا۔ "یہ مردود جوتے کہاں سے لے لیے تم

نے؟"

"یہ بات تم گالی دیے بغیر بھی کہہ سکتے ہو،" کرنل نے کہا، اور اپنے نقلی چہرے کے جوتوں

کے تلے دکھائے۔ "یہ عجوبہ روزگار جوتے چالیس سال پرانے ہیں، لیکن انھوں نے اپنی زندگی میں

پہلی بار گالیاں کھائی ہیں۔"

"ٹھیک ہو گیا،" دکان کے اندر سے ایرنان نے نعرہ لگایا، اور ساتھ ہی گھڑی نے گھنٹا بجایا۔

برابر والے گھر سے ایک عورت نے دیوار پر کئے مارے، اور چٹا کر کہا:

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

"گٹار کا پچھا چھوڑ دو! آگستین کے سوگ کا برس ابھی پورا نہیں ہوا۔"

درزی کے کارندوں میں سے ایک نے زور کا قہقہہ لگایا۔

"یہ گھڑی ہے گٹار نہیں۔"

ایرنان بندل لے کر دوکان سے باہر آیا۔

"کوئی خاص بات نہیں تھی،" اس نے کہا۔ "اگر چاہو تو تمہارے گھر چل کر اس کی سطح بھی

برابر کروں؟"

کرنل نے ایرنان کی پیشکش کو قبول نہ کیا۔

"کتنے پیسے دوں؟"

"فکرمات کرو کرنل،" ایرنان نے باقیوں کی صف میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔ "تمہارا مرغ

جنوری میں سب قرضوں کی ادائیگیاں کر دے گا۔"

کرنل کو اب وہ موقع ملا جس کی اسے تلاش تھی۔

"میں تمہارے ساتھ ایک سودا کرتا ہوں،" اس نے کہا۔

"کیسا سودا؟"

"میں مرغ تمہیں دے دیتا ہوں،" کرنل نے چہروں کے نیم دائرے کو دیکھا۔ "میں اسے

تم سب کو دے دیتا ہوں۔"

ایرنان بھونچکا ہو کر کرنل کو دیکھنے لگا۔

"میری عمر اب مرغ لڑانے کی نہیں رہی،" کرنل نے اپنی بات جاری رکھی۔ اس نے اپنی

آواز میں وثوق اور سنجیدگی کا تاثر پیدا کیا۔ "یہ بہت کڑی ذمہ داری ہے۔ کئی روز سے مجھے لگ رہا

ہے کہ مرغ قریب المرگ ہے۔"

"کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں، کرنل!" الفانو نے کہا۔ "اس کے پر جھڑ رہے ہیں۔

اس کے پروں میں بخار ہو گیا ہو گا۔"

"اگلے مہینے تک ٹھیک ہو جائے گا،" ایرنان نے کہا۔

"بہر حال میں اب اس کی رکھوالی نہیں کرنا چاہتا،" کرنل بولا۔

ایرنان نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کرنل کو دیکھا۔

"معاذے کو سمجھنے کی کوشش کرو، کرنل!" اس نے اصرار کیا۔ "تمہارا فرض ہے کہ آگستین

کے مرغ کو تم اپنے ہاتھ سے پالی میں اتارو۔"

کرنل نے اس بات پر غور کیا۔

"مجھے معلوم ہے،" اس نے کہا۔ "اسی لیے میں اب تک اسے رکھے ہوئے ہوں۔" اس نے دانت بھینچے، اور سوچا کہ اس موضوع پر مزید بات کی جا سکتی ہے:

"وقت یہ ہے کہ لڑائی میں ابھی دو مہینے باقی ہیں۔"

ایرمان اصل بات سمجھ گیا۔

"اگر صرف یہی وقت ہے تو اس کا حل تو آسانی سے مل سکتا ہے،" اس نے کہا۔

اور اس نے اپنی ترکیب بتائی۔ اس کے ساتھیوں نے اسے قبول کر لیا۔ شام کو جب کرنل بندل تھامے گھر واپس آیا تو اس کی بیوی اسے دیکھ کر طیش میں آگئی۔

"کچھ نہیں ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں،" کرنل نے جواب دیا۔ "لیکن اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ لڑکوں نے مرغ کی خوراک کا ذمہ لے لیا ہے۔"

"ٹھہرو دوست، میں تمہیں اپنی چھتری دیے دیتا ہوں۔"

ساباس نے دفتر کی دیوار میں نصب الماری کھولی۔ اندر بے ترتیب چیزوں کا انبار لگا ہوا تھا: گھڑسواری کے جوتے، رکابیں، لٹائیں اور المونیم کی ہالٹی میں پڑی مہمیزیں۔ اوپر کے حصے میں ایک زنانہ اور آدمی درجن مردانہ چھتریاں لٹک رہی تھیں۔ کرنل کے ذہن میں آسمانی آفت کے بعد کسی شہر کے بلے کا نقشہ ابھرا۔

"شکریہ دوست،" کرنل نے کھڑکی میں جھک کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں بارش کے تمہنے کا انتظار کروں گا۔" ساباس نے الماری کے پٹ کھلے رہنے دیے۔ وہ جا کر میز کے پاس، بجلی کے پٹھے کی ہوا کے نیچے بیٹھ گیا۔ تب اس نے دراز میں سے روئی میں لپیٹی ہوئی ایک سرنج نکالی۔ کرنل بارش میں بھیگتے ہوئے بادام کے درختوں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک سنان سہ پہر تھی۔

"اس کھڑکی سے بارش منتفٹ لگتی ہے،" اس نے کہا، "ییسے کسی اور شہر میں ہو رہی ہو۔"

"بارش ہر جگہ سے بارش ہی لگتی ہے،" ساباس نے جواب دیا۔ اس نے سرنج کو میز کے اوپر لگے شیشے پر ابلنے کو رکھ دیا۔ "یہ قصبہ ہی متعفن ہے،" اس نے اضافہ کیا۔

کرنل نے اپنے کندھے اچکائے۔ وہ پلتا ہوا دفتر کے درمیان تک آیا: کمرے کے فرش پر سبز مائل لگی تھیں اور فرنیچر کے غلاف شوخ رنگ کے تھے۔ کمرے کے عقب میں نمک کے

کرئل کو کوئی خط نہیں لکھتا

تھیلے، شمد کے چھتے اور کاٹھیاں بے ترتیبی کے عالم میں پڑی تھیں۔ ساہاس بالکل خالی ٹکاہوں سے کرئل کا تعاقب کر رہا تھا۔

"اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس قصبے کے بارے میں یوں نہ سوچتا،" کرئل نے کہا۔
وہ بیٹھ گیا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر سکون کے ساتھ میز پر جھکے شخص کو گھورنے لگا۔ ساہاس
چھوٹے سے قد کا، بہت موٹا آدمی تھا، اس کا گوشت پیللا تھا اور تھل تھل کرتا تھا، اور آنکھوں
سے پینڈل جیسی اداسی جھلکتی تھی۔
"کسی ڈاکٹر سے معائنہ کراؤ، دوست!" ساہاس نے کہا۔ "جنارے کے دن کے بعد سے تم
کچھ اداس لگ رہے ہو۔"

کرئل نے اپنا چہرہ اٹھایا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

ساہاس سرنج کے ایلنے کا منتظر تھا۔ "کاش میں بھی اپنے بارے میں یہ کہہ سکتا،" اس نے
شکایت کے لہجے میں کہا۔ "تم خوش قسمت آدمی ہو کیوں کہ تمہارا معدہ فولاد کا ہے۔" وہ اپنے
ہاتھوں کی پشت کی بالوں بھری کھال کو دیکھنے لگا جس پر جگہ جگہ کالے دھبے پڑے ہوئے تھے۔
شادی کے چھپنے والی انگلی میں اس نے چھلنے کے ساتھ ایک کالے نگ والی انگلی بھی پس رکھی تھی۔
"ہاں وہ تو ہے،" کرئل نے تسلیم کیا۔

دفتر اور گھر کے درمیانی دروازے میں سے ساہاس نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ پھر وہ کرئل
کو اپنی غذا کی تفصیلات کی پرورد داستان سنانے لگا۔ اپنی جیب سے اس نے ایک بوتل نکالی اور
اس میں سے مٹر کے دانے جتنی سفید گولی نکال کر میز پر رکھ دی۔

"ہر جگہ اسے ساتھ لیے پھرنا بہت بیزاری کا کام ہے،" ساہاس نے کہا، "ییسے آدمی موت
کو اپنی جیب میں لیے پھر رہا ہو۔"

کرئل میز کے قریب آیا اور گولی کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ ساہاس نے
اسے گولی چھکنے کی دعوت دی۔

"یہ کافی کو میٹھا کرنے کے لیے ہے،" اس نے وضاحت کی۔ "بے تو یہ ٹکڑ، مگر ٹکڑ کے
بغیر۔"

"واقعی،" کرئل نے کہا۔ اس کے منہ میں اداس سی مٹھاس کا مزہ تھا۔ "یہ ایسا ہی ہے جیسے
آدمی گھنٹیوں کے بغیر گھنٹیوں کی آواز پیدا کر لے۔"

بیوی سے میٹھا لگوانے کے بعد ساہاس نے اپنی کھنیاں میز پر رکھ لیں اور ہاتھوں سے اپنا منہ

ڈھانچ کر بیٹھ گیا۔ کرنل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے جسم کا کیا کرے۔ ساہاس کی بیوی نے پٹنچے کا سوچ ٹال کر پٹنچے کو تبوری کے اوپر رکھ دیا اور الماری کی طرف چل دی۔

"چتریلوں کا موت سے کچھ نہ کچھ تعلق ہوتا ہے،" اس نے کہا۔

کرنل نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا۔ وہ ڈاک دیکھنے کے لیے چار بجے گھر سے نکلا تھا، مگر بارش نے اسے ساہاس کے دفتر میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے لانیوں کی سیٹی کی آواز سنائی دی، مگر بارش بدستور جاری تھی۔

"ہر ایک کا خیال ہے کہ موت ایک عورت ہے،" ساہاس کی بیوی نے بات جاری رکھی۔ وہ فرہ عورت تھی، اس کا قد اپنے خاوند کے قد سے نکلتا ہوا تھا، اور اوپر کے ہونٹ پر ایک موٹا سا منہ تھا جس پر بال اگے ہوئے تھے۔ اس کی گفتگو کے انداز سے آدمی کو بجلی کے پٹنچے کی گھر گھر اہٹ کا دھوکا ہوتا تھا۔ "لیکن میں نہیں سمجھتی کہ موت عورت ہے۔" اس نے الماری کے پٹ بند کر دیے اور کرنل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"میرے خیال میں موت ایک پنہوں والا جانور ہے۔"

"ممکن ہے،" کرنل نے اعتراف کیا۔ "بعض اوقات بہت عجیب و غریب باتیں ہوتی ہیں۔"

اس نے پوسٹ ماسٹر کے بارے میں سوچا جو موم جامے کا لبادہ پہنے لانچ پر کودنے والا ہوگا۔ کرنل کو اپنا وکیل تبدیل کیے ایک ماہ گزر چکا تھا۔ اب تک وہ جواب کا مستحق ہو گیا تھا۔ ساہاس کی بیوی موت کے بارے میں باتیں کرتی رہی، حتیٰ کہ اسے اندازہ ہوا کہ کرنل کے چہرے پر غائب دعا کا تاثر ہے۔

"دوست!" وہ بولی، "تم پریشان لگتے ہو!"

کرنل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"درست ہے، دوست!" اس نے جھوٹ بولا۔ "میں سوچ رہا تھا کہ پانچ بج رہے ہیں اور مرغ

کے ٹیکے کا اب تک انتظام نہیں ہو سکا۔"

ساہاس کی بیوی حیران ہو گئی۔

"مرغ کا ٹیکا؟ جیسے وہ کوئی انسان ہو!" وہ چلائی۔ "سنت بے دینی کی بات ہے!"

ساہاس اب اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا، اور اپنا غصے سے تھمایا ہوا چہرہ اٹھا کر بولا:

"تم ایک منٹ کے لیے اپنا منہ بند رکھ سکتی ہو؟" اس حکم سے ڈر کر اس کی بیوی نے

واقعتاً اپنا منہ ڈھانپنے کو ہاتھ اٹھا لیا۔ "پچھلے آدھے گھنٹے سے تم میرے دوست کا داغ چاٹ رہی

ہو۔"

"نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں،" کرنل نے احتجاج کیا۔
ساباس کی بیوی گھر کے اندر چلی گئی اور زور سے دروازہ بند کر دیا۔ ساباس نے لیونڈر میں تر
رومال سے اپنی گردن کا پسینا پونچا۔ کرنل اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ لمبی ٹانگوں والا ایک مرغ
خالی چوک میں ایک طرف سے چلتا ہوا دوسری طرف جا رہا تھا۔

"کیا مرغ کو واقعی ٹیلے لگ رہے ہیں؟"

"یاں،" کرنل نے کہا۔ "اُس کی مشق اگلے منٹے سے شروع ہوگی۔"

"یاگل بن ہے،" ساباس نے کہا۔ "یہ سب کچھ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔"

"صحیح ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مرغ کی گردن مروڑی جائے۔"

"تمہاری خواہ منواہ کی بٹ دھرمی ہے،" ساباس نے کھڑکی کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔
کرنل نے اسے دھوکنی کی طرح آد بھرتے ہوئے سنا۔ اپنے دوست کی آنکھوں پر اسے بے حد رحم
آیا۔

"ابھی میں اتنا گیا گزرا نہیں ہوں،" کرنل نے کہا۔

"نا سمجھی کی بات نہ کرو،" ساباس نے زور دیا۔ "اگر مرغ کو بیچ دو تو تمہارا دوبرا فائدہ ہے۔
ایک تو اس سردردی سے نجات ملے گی، اور دوسرے نو سو پیسو جیب میں آئیں گے۔"
"نو سو پیسو؟" کرنل چلایا۔

"نو سو پیسو!"

کرنل نے اپنے ذہن میں نو سو پیسو کا تصور باندھا۔

"تمہارا خیال ہے کہ ایک مرغ کی خاطر لوگ اتنی دولت خرچ کرنے کو تیار ہو سکتے ہیں؟"

"خیال ہی نہیں،" ساباس نے جواب دیا، "مکمل یقین ہے۔"

انقلاب کا خزانہ واپس کرنے کے بعد سے کرنل کے ذہن میں آنے والی یہ سب سے بڑی
رقم تھی۔ ساباس کے دفتر سے نکلنے وقت اس کے پیٹ میں مروڑاٹھا، مگر اسے یقین تھا کہ اس بار
اس کی وجہ موسم نہیں۔ ڈاک گھر پہنچ کر وہ سیدھا پوسٹ ماسٹر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"مجھے ایک بہت آرجنٹ خط کی توقع ہے،" کرنل نے کہا۔ "ایر میل سے آیا ہوگا۔"

پوسٹ ماسٹر نے خانوں میں دیکھا۔ خطوں کے نام پتے پڑھ کر اس نے انہیں مناسب
خانوں میں واپس رکھ دیا، لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔ اپنے ہاتھ جھاڑ کر اس نے معنی خیز نظروں سے
کرنل کو دیکھا۔

"آج اس خط کو یقیناً آنا چاہیے تھا،" کرنل نے کہا۔
پوسٹ ماسٹر نے کندھے اچکائے۔
"صرف موت ہی ایسی چیز ہے جو یقیناً آتی ہے، کرنل۔"

کرنل گھر پہنچا تو اس کی بیوی نے کمٹی کے دیے کی رکابی اس کے سامنے رکھ دی۔ وہ رک رک کر، خاموشی سے کھاتا رہا۔ اس کے مقابل بیٹھی عورت کو احساس ہوا کہ کرنل کے چہرے پر کوئی تبدیلی آچکی ہے۔

"کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں اس ملازم کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کا کام پنشن کے کاغذ تیار کرنا ہے،" کرنل نے جھوٹ بولا۔ "انگلے پچاس برس میں ہم تو اطمینان سے چھ فٹ مٹی کے نیچے سو رہے ہوں گے، مگر وہ غریب آدمی اپنی رہائش گاہ کی پنشن کے انتظار میں ہر جمعے کو بلکان ہوتا رہے گا۔"

"یہ تو برا شکون ہے،" عورت نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی قسمت پر قناعت کرتے جا رہے ہو۔" وہ دلیا کھاتی رہی۔ لیکن ایک لمحے بعد اسے احساس ہوا کہ اس کا خاوند اب تک اس سے بہت دور سوچوں میں کھویا ہوا ہے۔

"کم از کم کھانا تو اطمینان سے کھاؤ۔"

"ہاں، بہت مزے کا ہے،" کرنل نے کہا۔ "کمٹی کہاں سے آئی تھی؟"

"مرغ سے،" عورت نے جواب دیا۔ "اڑکے اس کے لیے اتنی زیادہ لے آئے تھے کہ اس نے زائد کمٹی میں ہمیں شریک کر لیا۔ زندگی اسی کا نام ہے۔"

"ٹھیک ہے،" کرنل نے آہ بھری۔ "تمام ایجادوں میں زندگی بہترین ایجاد ہے۔"

اس نے چولہے کے پائے سے بندھے مرغ کو دیکھا۔ اس بار وہ اسے پہلے سے منتہت لگا۔ عورت بھی مرغ کو دیکھ رہی تھی۔

"آج دوپہر کو مجھے بچوں کو ڈنڈے مار کر گھر سے بھگانا پڑا،" اس نے کہا۔ "وہ ایک بورٹھی مرغی کو مرغ سے میل کرانے لائے تھے۔"

"یہ کوئی نئی بات نہیں،" کرنل نے کہا۔ "کرنل اور بلیا نو بوندیا کے ساتھ بھی اُن قصبوں میں یہی ہوتا تھا۔ لوگ کہیں لڑکیوں کو اس سے میل کرانے لایا کرتے تھے۔"

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

وہ اس مذاق سے بہت مغلوظ ہوئی۔ مرغ نے اپنے گلے سے آواز نکالی جو کمرے میں انسانی کلام کی طرح سنائی دی۔ "کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے یہ جانور ابھی باتیں کرنا شروع کر دے گا،" عورت نے کہا۔ کرنل نے دوبارہ مرغ کی جانب دیکھا۔

"سو نے میں تو نے کے لائق ہے،" اس نے کہا۔ اس نے پیچھے سے دلیا کھاتے ہوئے دل ہی دل میں کچھ ہند سے جمع تفریق کیے۔ "مجھے توقع ہے کہ یہ مرغ ہماری تین سال کی خوراک کا انتظام کر دے گا۔"

"توقع سے پیٹ تو نہیں بھر سکتا،" عورت نے کہا۔

"نہ سہی، مگر آدمی کی ہمت تو قائم رہتی ہے،" کرنل نے جواب دیا۔ "میرے دوست سا باس کی حیرت انگیز گولیوں کا بھی یہی حال ہے۔"

اس رات ہندسوں کو ذہن سے نکالنے کی کوشش میں کرنل کو ٹھیک سے نیند نہ آ سکی۔ دوسرے روز دوپہر کو عورت نے مکئی کا دلیا دو رکابیوں میں ڈالا، اور اپنے حصے کا دلیا سر جھکا کر کھانے لگی۔ کرنل کو اس کی غناک کیفیت کا سا یہ خود پر پڑنا محسوس ہوا۔

"کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں،" عورت نے کہا۔

کرنل کو لگا کہ اب اس کی بیوی کی جھوٹ بولنے کی باری ہے۔ اس نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔ مگر اس کی کیفیت میں تبدیلی نہ آ سکی۔

"کوئی ایسی خاص بات نہیں،" وہ بولی۔ "میں سوچ رہی تھی کہ موسیقار کو مرے دو ماہ ہو چکے ہیں اور میں ابھی تک اس کے خاندان کے پاس تعزیت کے لیے نہیں گئی۔"

لہذا اس رات وہ اس کے گھر گئی۔ کرنل اسے وہاں چھوڑ کر خود لاؤڈ سپیکر سے سنائی دینے والی موسیقی کی جانب کھنچا ہوا سنیمیا گھر کی طرف چل دیا۔ پادری انجل اپنے دفتر کے باہر بیٹھا سنیمیا گھر کے دروازے پر نظر رکھے ہوئے تھا تاکہ اسے پتا چل سکے کہ بستی میں سے کون کون گھنٹے کی بارہ ضربوں کی تنبیہ کے باوجود فلم دیکھنے سے باز نہیں رہ سکا۔ روشنی کے سیلاب، کرخت موسیقی اور بچوں کے شور و غل نے اس علاقے کی فضا میں ایک باقاعدہ رکاوٹ پیدا کر دی تھی۔ ایک چھوٹے سے لڑکے نے اپنی لکڑی کی بندوق سے کرنل کو دھمکایا۔

"مرغ کے بارے میں کیا خبر ہے کرنل؟" اس نے رعب دار آواز میں پوچھا۔

کرنل نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھالیے۔

"ابھی موجود ہے۔"

سنیما گھر کے سامنے کی پوری دیوار پر چار رنگوں میں "آدھی رات کی دوشیزہ" کا اشتہار چسپاں تھا۔ اشتہار میں ایک عورت نے شام کا ڈھیلا ڈھالا گاؤں پہن رکھا تھا، اور اس کی ایک ٹانگ ران تک ننگی تھی۔ کرنل اس علاقے میں گھومتا پھرتا رہا حتیٰ کہ کہیں دور گرج چمک شروع ہو گئی۔ تب وہ اپنی بیوی کو لینے چلا گیا۔

اس کی بیوی مرنے والے کے گھر پر نہ تھی۔ نہ وہ اپنے گھر پر تھی۔ کرنل نے اندازہ لگایا کہ کرفیو شروع ہونے میں تھوڑا ہی وقت باقی ہو گا، مگر گھڑی بند تھی۔ بارش کے طوفان کو آہستہ آہستہ قصبے کی جانب بڑھتا موس کرتے ہوئے وہ انتظار کرتا رہا۔ وہ تیار ہو کر دوبارہ باہر جانے ہی والا تھا کہ اس کی بیوی گھر میں داخل ہوئی۔

وہ مرغ کو خواب گاہ میں لے گیا۔ اس کی بیوی نے اپنے کپڑے تبدیل کیے اور پیٹنگ میں پانی پینے لگی۔ کرنل نے اسی وقت گھڑی کو چابی دی تھی اور اب کرفیو کے بگل کا منظر تھا تاکہ وقت ملا سکے۔

"تم کہاں تھیں؟" اس نے پوچھا۔

"میں کہیں"، عورت نے جواب دیا۔ اس نے گلاس کو گھڑی پر رکھ دیا، اور اپنے خاوند کی طرف دیکھے بغیر خواب گاہ میں چلی گئی۔ "کے توقع تھی کہ بارشیں اتنی جلدی پھر شروع ہو جائیں گی۔" کرنل نے اس پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ جب کرفیو کا بگل بجا تو کرنل نے گھڑی میں گیارہ بجے کا وقت دیکھا، اس کے تحتے بند کیے اور کرسی کو اٹھا کر اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی تسبیح پڑھنے میں مصروف ہے۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا،" کرنل نے کہا۔
"کیا؟"

"تم کہاں تھیں؟"

"وہیں بیٹھی باتیں کر رہی تھی،" اس نے کہا۔ "اتنے عرصے بعد تو گھر سے باہر قدم رکھا تھا۔"

کرنل نے اپنے جھونکا لٹایا۔ اس نے گھر کی کنڈیاں لگائیں اور کمرے میں دوا چھڑکی۔ پھر وہ لیمپ کو فرش پر رکھ کر بستر میں لیٹ گیا۔

"مجھے معلوم ہے،" وہ اداس لہجے میں بولا۔ "بُری حالات کی بدترین بات یہ ہے کہ انسان جوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

کرنل کی بیوی نے لمبی آد بھری۔

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

"میں یادری انجیل کے پاس گئی تھی،" اس نے کہا۔ "اس سے اپنی شادی کی انگوٹھی کے بدلے قرض مانگنے۔"

"کیا کہا اس نے؟"

"مقدس چیزوں کا لین دین کرنا گناہ ہے۔"

مچھردانی کے اندر سے اس نے بات جاری رکھی۔ "دو روز ہوئے میں نے گھڑی جینے کی کوشش کی تھی،" وہ بولی، "مگر کسی کو اس سے دلچسپی نہیں ہے۔ سب لوگ قسطوں پر نئے جھکتے ہندسوں اور سوئیوں والے ہلاک خرید رہے ہیں۔ ان میں اندھیرے میں بھی وقت نظر آ جاتا ہے۔"

کرنل کو احساس ہوا کہ چالیس برس کی رفاقت، اور بھوک اور تکلیف میں حصہ داری نے بھی اپنی بیوی کو پوری طرح سمجھنے میں اس کی مدد نہیں کی۔ اسے لگا جیسے ان کی محبت میں بھی کوئی شے سال خوردہ ہو چکی ہے۔

"تصویر خریدنے کو بھی کوئی تیار نہیں ہے،" عورت نے کہا۔ "ہر ایک کے پاس یہی تصویر پہلے سے موجود ہے۔ حتیٰ کہ ٹرک نے بھی انکار کر دیا۔"

کرنل کو تلخی محسوس ہوئی۔

"تو اب ہر ایک کو بتا چل گیا کہ ہم فاقے کر رہے ہیں۔"

"میں تنگ گئی ہوں،" عورت نے کہا۔ "مردوں کو گھرداری کے مسائل کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔ کئی بار مجھے پتھر ابلانے کو رکھنے پڑے ہیں تاکہ ہمسایوں کو یہ پتا نہ چل سکے کہ ہم کئی کئی دن باندھی چڑھائے بغیر رہتے ہیں۔"

کرنل کو یہ بات بری لگی۔

"یہ تو واقعی ذلت ہے۔"

اس کی بیوی مچھردانی سے نکلی اور کرنل کے بستر کے پاس گئی۔ "میں اس گھر کی ظاہر داری اور بناوٹ سے دستبردار ہو رہی ہوں،" اس نے کہا۔ اس کی آواز غصے سے تیرہ ہونے لگی۔ "میں قناعت اور رکھ رکھاؤ سے عاجز آ چکی ہوں۔"

کرنل نے مطلق جنبش نہ کی۔

"بیس سال تک ان رنگین پرندوں کا انتظار کرنا جن کے وعدے ہر الیکشن پر کیے جاتے ہیں،" اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اس سے ہمیں کیا ملا ہے؟ ایک مردہ بیٹے کے سوا کیا ملا ہے؟"

کرنل اس قسم کے طعنوں کا عادی تھا۔

"ہم نے اپنا فرض پورا کیا تھا۔"

"اور انہوں نے اپنا فرض پورا کیا، بیس سال تک سینیٹ سے ہر مہینے ہزار پیسو کی تنخواہ وصول کر کے،" عورت نے جواب دیا۔ "عزیز دوست سا باس کا حال دیکھ لو۔ اس کا گھر دو منزلہ ہے لیکن اس کی ساری دولت رکھنے کے لیے پھر بھی ناکافی ہے۔ جب اس قصبے میں آیا تھا تو گلے میں سانپ لپیٹے دو انیس بیچا کرتا تھا۔"

"بیچارہ ذیابیطس کے ہاتھوں مر رہا ہے،" کرنل نے کہا۔

"اور تم بھوک کے ہاتھوں مر رہے ہو،" عورت نے کہا۔ "اب تک تمہیں علم ہو جانا چاہیے تھا کہ اپنی شان سے تم اپنا پیٹ نہیں بھر سکتے۔"

بجلی کی کرکٹ نے اس کا سلسلہ کلام منقطع کیا۔ سرنگ پر دھماکا ہوا اور بجلی کمرے میں داخل ہو کر بستر کے نیچے سے یوں گزری جیسے پتھر لٹک رہے ہوں۔ کرنل کی بیوی اپنی تسبیح اٹھانے کے لیے مچھروانی کی طرف لپکی۔
کرنل مسکرایا۔

"اپنی زبان قابو میں نہیں رکھو گی تو تمہارے ساتھ ہی ہوگا،" اس نے کہا۔ "میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ خدا میرے ساتھ ہے۔"

لیکن حقیقت میں وہ شدید تنگی محسوس کر رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے لیمپ بجھا دیا، اور اس اندھیرے میں جو بجلی کی چمک سے بار بار چاک ہو رہا تھا، گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اسے ماکونڈو یاد آیا۔ نیرلاندیا کے مقام پر کیے ہوئے وعدوں کے پورا ہونے کے انتظار میں کرنل کو دس برس گزر چکے تھے۔ ایک سہ پہر نیند کی غنودگی میں اس نے ایک پہلی گرد آلود ریل گاڑی کو قصبے میں داخل ہوتے دیکھا۔ گاڑی کے ڈبوں کے اندر باہر حتیٰ کہ چھتوں پر بھی مرد عورتیں اور جانور لدے ہوئے تھے۔ یہ کیلوں کی فصل سے کھائی کی دیوانگی تھی۔

جو بیس گھنٹوں کے اندر اندر نواردوں نے قصبے کی کایا کھپ کر دی تھی۔ "میں یہاں سے جا رہا ہوں،" کرنل نے اس وقت کہا تھا۔ "کیلوں کی بومیرمی انٹریاں چاٹ رہی ہے۔" اور اس نے ماکونڈو کو، واپسی کی گاڑی پر، بدھ ۲۷ جون ۱۹۰۶ کے دن، دوپہر دو بج کر اٹھارہ منٹ پر، ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں تھریبا نصف صدی لگی کہ نیرلاندیا میں اطاعت قبول کرنے کے وقت سے لے کر اب تک اسے سکون کا ایک لمحہ بھی نصیب نہیں ہوا۔
کرنل نے آنکھیں کھولیں۔

"اب اس بارے میں زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں ہے،" وہ بولا۔

"کس بارے میں؟"
"مرغ کے بارے میں،" کر نل نے کہا۔ "کل میں اسے سا باس کے ہاتھ نو سو پیسہ میں فروخت کر دوں گا۔"

خصی جانوروں کی چھٹیں سا باس کی چیخ پکار میں شامل ہو کر دفتر کی کھڑکی میں سے اندر آرہی تھیں۔ اگر سا باس اگلے دس منٹوں میں اندر نہ آیا تو میں یہاں سے چل دوں گا، کر نل نے دو گھنٹے کے انتظار کے بعد اپنے آپ سے عہد کیا۔ لیکن اس نے مزید بیس منٹ انتظار کیا۔ وہ اٹھ کر چلنے کو تھاجب سا باس کارکنوں کے غول کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ کئی بار وہ کر نل کی طرف دیکھے بغیر اس کے سامنے آتا جاتا رہا۔

"میرا انتظار کر رہے ہو دوست؟"
"ہاں دوست،" کر نل نے کہا۔ "لیکن اگر تم بہت مصروف ہو تو میں کسی اور وقت آ جاؤں گا۔"

دروازے کے عقب سے سا باس کو اس کی بات سنائی نہ دی۔
"میں ابھی آتا ہوں،" سا باس نے کہا۔
دوپہر کی گرمی دم گھونٹے دستی تھی۔ سرک کی روشنی سے دفتر تھمرا رہا تھا۔ گرمی کی کسالت سے کر نل نے بلا ارادہ آنکھیں بند کر لیں، اور یک دم اپنی بیوی کے بارے میں خواب دیکھنے لگا۔ سا باس کی بیوی دبے پاؤں دفتر میں داخل ہوئی۔
"جاگومت، دوست!" وہ بولی۔ "میں کھڑکی کے پردے گرانے آئی تھی۔ دفتر جنم کی طرح تپ رہا ہے۔"
کر نل خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پردے گرانے کے بعد، سا باس کی بیوی کمرے کے اندھیرے میں بولی۔

"کیا تم اکثر خواب دیکھتے ہو؟"
"کبھی کبھی،" کر نل نے اپنے اوگھنے پر پشیمان سا ہو کر جواب دیا۔ "مجھے تقریباً ہمیشہ ایک ہی خواب آتا ہے کہ میں مکڑی کے جالوں میں پھنستا جا رہا ہوں۔"
"مجھے ہر رات ڈراو نے خواب آتے ہیں،" سا باس کی بیوی نے کہا۔ "اب میرے داغ

میں یہی بات سمائی ہوئی ہے کہ کسی طرح خواب میں آنے والے لوگوں کے بارے میں پتا کیا جائے کہ وہ کون ہیں۔"

اس نے ہنسی چلا دیا۔ "پچھلے ہفتے میں نے ایک عورت کو دیکھا جو میرے سرہانے کھڑی تھی،" وہ بولی۔ "میں نے پوچھ ہی لیا کہ تم کون ہو۔ اس نے کہا میں وہ عورت ہوں جو بارہ برس پہلے اسی کمرے میں فوت ہوئی تھی۔"

"لیکن اس گھر کو بنے تو مشکل سے دو برس ہوئے ہوں گے،" کرنل نے کہا۔
 "درست ہے،" ساہاس کی بیوی نے جواب دیا۔ "اس سے پتا چلتا ہے کہ مردے بھی حساب میں غلطی کر جاتے ہیں۔"

پچھلے کی گھول گھول سے کمرے کا اندھیرا اور گھبراگئے گا۔ ساہاس کی بیوی خوابوں سے بھٹ کر اب آواگوں کے مسئلے پر اظہار خیال کر رہی تھی۔ اپنی غنودگی اور اس عورت کی بے یمنی گفتگو سے کرنل بے چین ہونے لگا۔ وہ گفتگو میں تھوڑا سا وقفہ پڑنے کا منتظر تھا تا کہ رخصت چاہے، کہ ساہاس اپنے فور میں کے ہمراہ دفتر میں داخل ہوا۔

"میں تمہارا سوپ چار دفعہ گرم کر چکی ہوں،" اس کی بیوی نے کہا۔
 "چاہے دس دفعہ گرم کر لو،" ساہاس نے کہا، "لیکن اس وقت میرا پیچھا چھوڑ دو۔"
 ساہاس نے تجوری کھول کر فور میں کو نوٹوں کی ایک گدھی اور کاغذ پر لکھی ہدایات کی فہرست تھمائی۔ فور میں نے نوٹ گننے کے لیے کھڑکی کا پردہ سرکایا۔ ساہاس نے دفتر کے عقبی حصے میں کرنل کو بیٹھے دیکھا، مگر کوئی تاثر ظاہر نہ کیا۔ وہ فور میں سے باتوں میں مصروف رہا۔ جس وقت ساہاس اور فور میں دوبارہ دفتر سے باہر جانے والے تھے، کرنل اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازہ کھولنے سے قبل ساہاس رکا۔

"میں تمہاری کیا خدمت کروں دوست؟"
 کرنل نے دیکھا کہ فور میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔
 "کچھ نہیں دوست،" وہ بولا۔ "میں تم سے صرف بات کرنا چاہتا تھا۔"
 "جو کتنا ہے جلدی سے کہو،" ساہاس نے کہا۔ "مجھے ایک منٹ کی فرصت نہیں ہے۔"
 وہ دروازے کے دستے پر ہاتھ رکھ کر ذرا رکا۔ کرنل کو اپنی زندگی کے پانچ طویل ترین سیکنڈ گزرنے کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے دانت بھینچ لیے۔
 "مرغ کے بارے میں،" وہ بڑبڑایا۔

اب تک ساہاس دروازہ کھول چکا تھا۔ "مرغ کے بارے میں،" اس نے دوبارہ کہا، مسکرا کر

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

فورین کو بال کی طرف دھکیلا۔ "یہاں آسمان گرنے والا ہے اور میرے دوست کو مرغ کی پڑی ہے۔" اور پھر کرنل سے مخاطب ہو کر بولا:

"ٹھیک ہے دوست، میں ابھی آتا ہوں۔"

کرنل دفتر کے وسط میں ساکت کھڑا رہا یہاں تک کہ اسے دونوں آدمیوں کے پیروں کی چاپ بال کے سرے پر پہنچ کر سنائی دینی بند ہو گئی۔ تب وہ دفتر سے باہر نکلا اور قصبے میں گشت کرنے لگا جو اتوار کے قیلوے میں مغلوں پر پڑا تھا۔ درزی کی دکان پر کوئی نہ تھا۔ ڈاکٹر کا دفتر بند تھا۔ شامی کی دکان کے تختوں پر پڑے مال کی حفاظت کرنے کو بھی کوئی موجود نہ تھا۔ دریا فولاد کی چادر جیسا لگ رہا تھا۔ کنارے پر ایک آدمی تیل کے چار پیپوں پر لیٹا، اپنا چہرہ میٹ سے ڈھانپے سو رہا تھا۔ کرنل کو لگا جیسے سارے شہر میں وہی متحرک ہے۔ وہ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

اس کی بیوی دوپہر کا باقاعدہ کھانا سامنے رکھے اس کی منتظر تھی۔

"یہ سب میں نے ادھار لیا ہے، کل پیسے دینے کا وعدہ کر کے،" اس نے وضاحت کی۔

کھانا کھانے کے دوران کرنل نے اسے پچھلے تین گھنٹوں کا ماجرا سنایا۔ وہ بے چینی کے ساتھ

اس کی بات سنتی رہی۔

"تمہارے ساتھ وقت یہ ہے کہ تم میں کردار نام کو بھی نہیں ہے،" وہ آخر کار بولی۔ "تم اپنے آپ کو یوں پیش کرتے ہو جیسے خیرات مانگ رہے ہو جب کہ تمہیں وہاں سر اٹھا کر جانا چاہیے تھا، اور ہمارے دوست کو ایک طرف لے جا کر اس سے صاف صاف کھنا چاہیے تھا کہ دوست، میں نے مرغ تمہارے ہاتھ پیچھے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"تمہارے حساب سے تو زندگی ہوا کی طرح سبک ہے،" کرنل نے کہا۔

عورت کے رویے سے یحییٰ جی کا اظہار ہوتا تھا۔ صبح صبح اس نے گھر کو صاف کیا تھا اور اپنا حلیہ عجیب و غریب بنا رکھا تھا۔ اس نے کرنل کے پرانے جوتے پہن رکھے تھے، کمر کے گرد موم جاسے کا اپرن باندھ رکھا تھا، اور بالوں پر کپڑے کی دھجی، جس میں کانوں کے اوپر دونوں جانب گرہیں تھیں۔ "تم میں کاروبار کی ذرا سوجھ بوجھ نہیں ہے،" وہ بولی۔ "کوئی چیز پیچھے وقت آدمی کے چہرے پر وہی کیفیت ہونی چاہیے جو خریدتے وقت ہوتی ہے۔"

کرنل اس کے حلیے سے خاصا مظلوظ ہوا۔

"تم نے اپنی جو شکل بنا رکھی ہے اسے قائم رکھنا،" کرنل نے مسکرا کر اس کی بات کاٹی۔

"تم کو یکراں اگلے کے ڈبے پر بنے ہوئے آدمی کی طرح لگ رہی ہو۔"

اس نے سر سے کپڑے کی دھجی اتار پھینکی۔

"میں سنبیدگی سے بات کر رہی ہوں،" اس نے کہا۔ "میں مرغ کو ابھی سا باس کے پاس لے جا رہی ہوں، اور تم جتنی رقم کی چابو شرط لگا لو، آدھ گھنٹے میں نو سو پیسو کے ساتھ واپس آ جاؤں گی۔"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے،" کرنل نے کہا۔ "ابھی سے تم مرغ کی رقم سے شرطیں بدنے لگی ہو۔"

بہت مشکل سے کرنل نے اسے سا باس کے ہاں جانے سے باز رکھا۔ عورت نے ساری صبح اپنے ذہن میں، ہر جمعے کی مسلسل کوفت کے بغیر، اگلے تین برس کے اخراجات کا تخمینہ لگانے میں صرف کی تھی۔ اس نے گھر کے لیے ضرورت کی چیزوں کی فہرست بنائی تھی جس میں اس نے کرنل کے لیے جوتوں کے نئے جوڑے کو فراموش نہیں کیا تھا۔ خواب گاہ میں نیا آئینہ لٹکانے کے لیے اس نے جگہ کا انتخاب بھی کر لیا تھا۔ اپنے منصوبوں کی وقتی شکست نے اسے پشیمان اور آرزوہ کر دیا۔

تھوڑی دیر کے لیے وہ جا کر سو رہی۔ جب وہ اٹھی تو کرنل آنگن میں بیٹھا تھا۔

"اب تم کیا کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"سوچ رہا ہوں،" کرنل نے جواب دیا۔

"تب تو مسئلہ حل ہو گیا۔ اگلے پچاس برس تک ہم مرغ کی رقم حاصل کرنے کی توقع رکھ سکتے ہیں۔"

لیکن حقیقت میں کرنل اسی شام مرغ فروخت کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اسے سا باس کا خیال آیا، جو اس وقت دفتر میں اکیلا پینچے کے آگے بیٹھا اپنا روز کا ٹیکا لگوانے کی تیاری کر رہا ہو گا۔ اس کا جواب تیار تھا۔

"مرغ کو ساتھ لے جاؤ،" باہر نکلتے ہوئے کرنل کی بیوی نے اسے مشورہ دیا۔ "اے جیتا جاگتا اپنے سامنے دیکھ کر سا باس پر حیرت انگیز اثر ہو گا۔"

کرنل کو مرغ کو اپنے ساتھ لے جانے پر اعتراض تھا۔ وہ، مایوس اضطراب میں، اس کے ساتھ ساتھ دروازے تک آئی۔

"دفتر میں پوری فوج بھی موجود ہو تو گھبرانے کی ضرورت نہیں،" اس نے کہا۔ "تم سا باس کو بازو سے پکڑ لینا اور اس وقت تک نہ چھوڑنا جب تک وہ نو سو پیسو تمہارے حوالے نہ کر دے۔"

"وہ سمجھیں گے کہ ہم نے ڈاکا ڈالنے کا منصوبہ بنایا ہے۔"

کرنل کی بیوی نے اس فقرے پر دھیان نہ دیا۔

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

"یہ یاد رکھنا کہ تم مرغ کے مالک ہو،" اس نے اصرار کیا۔ "اور اس پر احسان کر رہے ہو۔"
"اچھا۔"

ساباس ڈاکٹر کے ہمراہ خواب گاہ میں تھا۔ "اب موقع ہے،" اس کی بیوی نے کرنل سے کہا۔ "ڈاکٹر اسے تین چار روز کے سفر کے لیے تیار کر رہا ہے۔ ساباس اب کا گیا جمعات کو لوٹے گا۔" کرنل دو متضاد قوتوں سے نبرد آزما تھا: مرغ کو بیچ دینے کے عزم کے باوجود وہ سوچ رہا تھا کہ اچھا ہوتا اگر وہ ایک گھنٹے دیر سے آیا ہوتا، اور اس سے ملاقات نہ کر پاتا۔
"میں انتظار کر سکتا ہوں،" وہ بولا۔

لیکن ساباس کی بیوی مصر رہی۔ وہ اسے خواب گاہ میں لے گئی، جہاں ساباس اپنے تخت جیسے بستر پر، زیر جامہ پہنے، اپنی بے رنگ آنکھیں ڈاکٹر کے چہرے پر جمائے بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر نے ساباس کے پیشاب کا نمونہ شیشے کی نالی میں گرم کیا، اس کی بوسہ لگھی اور اثبات میں سر ہلایا۔ کرنل اس سارے عمل کے ختم ہونے کا منتظر رہا۔

"اسے گولی مارنی پڑے گی،" ڈاکٹر نے کرنل کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ذیابیطس امیر آدمیوں کو ختم کرنے میں بہت دیر لگاتی ہے۔"

"تمہارے انمولین کے ملعون ٹیکوں نے خاصی کوشش کی ہے،" ساباس نے کہا اور اپنے کولہوں کے بل تھوڑا سا اوپر اٹھا۔ "لیکن مجھ سے چھٹا راحاصل کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔" پھر وہ کرنل سے مخاطب ہوا:

"اندر آ جاؤ دوست۔ دوپہر کو جب میں تمہیں دیکھنے باہر نکلا تو تم کیا تمہاری ٹوپی بھی کہیں نظر نہیں آئی۔"

"میں پہنتا ہی نہیں تاکہ ہر ایک کے سامنے سر سے اتارنی نہ پڑے۔"
ساباس کپڑے پہننے لگا۔ ڈاکٹر نے خون کے نمونے والی شیشے کی ٹیوب اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالی۔ پھر اپنے بیگ میں چیرزوں کو ترتیب سے رکھا۔ کرنل نے سوچا ڈاکٹر وہاں سے رخصت ہونے والا ہے۔

"میں تمہاری جگہ ہوں تو اپنے دوست کو ایک لاکھ پیسہ کا بیل بھیج دوں، ڈاکٹر" کرنل نے کہا۔ "اتنی رقم جانے سے ساباس کی پریشانی بہت حد تک کم ہو جائے گی۔"

"میں پہلے ہی اسے ایک کروڑ پیسہ کا بیل بھیجنے کی تجویز دے چکا ہوں،" ڈاکٹر نے کہا۔
"غربت ذیابیطس کا بہترین علاج ہے۔"

"تجویز کا شکریہ،" ساباس نے اپنا ضخیم پیٹ گھڑسواری کی تنگ پتلون کے اندر ٹھونسنے کی

کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن تمہیں امارت کے عذاب سے بچانے کی خاطر، میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔" ڈاکٹر کو اپنے چرمی بیگ کے چمکدار تالے کی سطح پر اپنے دانتوں کا عکس دکھائی دیا۔ بے صبری دکھائے بغیر ڈاکٹر نے کلاک کی طرف دیکھا۔ ساپاس بوٹ پہنٹے پہنٹے اپنا کمر کر نل کی طرف مڑا:

"تو پھر دوست، مرغ کا کیا بن رہا ہے؟"
کر نل نے موس کیا کہ ڈاکٹر بھی اس کے جواب کا منتظر ہے۔ اس نے اپنے دانت سختی سے بھینچ لیے۔
"کچھ نہیں بن رہا، دوست" وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "میں تمہارے پاس اس کا سودا کرنے آیا ہوں۔"

ساپاس بوٹ پہن چکا تھا۔
"ٹھیک ہے، دوست،" اس نے کسی جذبے کے بغیر جواب دیا۔ "نہایت معقول بات ہے۔"

"میری عمر اب ان پچیسیدگیوں میں پڑنے کی نہیں رہی،" کر نل نے ڈاکٹر کے چہرے پر مبہم قسم کا تاثر دیکھ کر توجیہ پیش کرنے کی کوشش کی۔ "میری عمر بیس سال کم ہوتی تو اور بات تھی۔"

"کر نل، تمہاری عمر ہمیشہ بیس سال کم ہی رہے گی،" ڈاکٹر نے جواب دیا۔
کر نل کے حواس کچھ بحال ہوئے۔ وہ ساپاس کے مزید کچھ بات کرنے کا منتظر رہا، مگر وہ کچھ نہ بولا۔ وہ اپنی چمڑے کی زپ والی جیکٹ پہن کر کمرے سے باہر جانے کو تیار ہو گیا۔
"اگر تم چاہو تو ہم اگلے ہفتے اس بارے میں بات کر سکتے ہیں،" کر نل نے کہا۔
"ہاں میں بھی یہی کہنے والا تھا،" ساپاس نے کہا۔ "ایک خریدار میری نظر میں ہے جو مرغ کے چار سو پیسودے دے گا لیکن جمعرات تک انتظار کرنا پڑے گا۔"
"کتنے پیسے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"چار سو۔"
"مجھے تو پتا چلا تھا کہ مرغ کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ہے،" ڈاکٹر نے کہا۔
"تم نے خود نو سو پیسہ کا ذکر کیا تھا،" کر نل نے ڈاکٹر کی حیرت سے حوصلہ پا کر کہا۔ "وہ مارے علاقے کا بہترین مرغ ہے۔"
ساپاس نے ڈاکٹر کو جواب دیا۔

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

"کوئی اور وقت ہوتا تو اس کے ہزار پیسو بھی مل جاتے،" اس نے وضاحت کی۔ "مگر اتنے قیمتی مرغ کو کوئی نہیں لڑاتا۔ ہمیشہ یہ خطرہ رہتا ہے کہ وہ پالی سے زندہ باہر نہ آ سکے گا۔" پھر وہ بناوٹی مایوسی سے کرنل کی طرف مڑا۔

"دوست، میں تمہیں یہی بتانا چاہتا تھا۔"

کرنل نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے،" وہ بولا۔

وہ سا باس کے پیچھے پیچھے بال میں آ گیا۔ ڈاکٹر قست کے کمرے میں سا باس کی بیوی سے مصروف گفتگو رہا جو اس سے ان کیفیتوں کا علاج دریافت کر رہی تھی جو بقول اس کے آدمی پر اچانک وارد ہو جاتی ہیں اور جن کے بارے میں آدمی کو علم نہیں ہوتا کہ وہ کیا ہیں۔ کرنل دفتر میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ سا باس نے تجوری کھولی، اپنی تمام جیبیں نوٹوں سے بھریں اور چار نوٹ کرنل کی طرف بڑھا دیے۔

"یہ لو، یہ ساٹھ پیسو ہیں دوست،" اس نے کہا۔ "جب مرغ بک جائے گا تو حساب کر لیں گے۔"

کرنل ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ دریا کے کنارے پر دکانوں کے پاس سے گزرے، جن پر بعد دوپہر کی خنکی کے باعث رونق ہونی شروع ہو گئی تھی۔ گنتوں سے لدا ایک بھرا پانی کے بساؤ کے رخ آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ کرنل نے ڈاکٹر کو غیر معمولی طور پر اپنے خیالوں میں گم پایا۔

"اور تمہارا کیا حال ہے ڈاکٹر؟" کرنل نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے اپنے کندھے اچکائے۔

"ویسا ہی جیسا پہلے تھا،" اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے مجھے بھی کسی ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔"

"اس کی وجہ سردی ہے،" کرنل نے کہا۔ "یہ مجھے بھی اندر سے کھاتی رہتی ہے۔"

ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ دلچسپی سے عاری نظر سے کرنل کا جائزہ لیا۔ پھر اس نے دکانوں پر بیٹھے شامیوں سے یکے بعد دیگرے دعا سلام کی۔ ڈاکٹر کے دفتر کے دروازے پر کرنل نے مرغ کی فروخت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا،" کرنل نے توضیح کی۔ "اس جانور کی غذا انسانی گوشت ہے۔"

"واحد جانور جس کی غذا انسانی گوشت ہے وہ سا باس ہے،" ڈاکٹر نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے

وہ مرغ کو نو سو میں آگے بیچ دے گا۔"

"اچھا، تمہارا یہ خیال ہے؟"

"مجھے پکا یقین ہے،" ڈاکٹر بولا۔ "یہ اتنا ہی نفع بخش سودا ہے جتنا اس کا میسر کے ساتھ حب الوطنی کا مشہور معاہدہ تھا۔"

کرنل نے ڈاکٹر کی بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ "مگر میرے دوست نے وہ معاہدہ اپنی جان کے خوف سے کیا تھا،" کرنل نے کہا۔ "وہ اسی طرح اس قصبے میں رہ سکتا تھا۔"

"اور اسی طرح اپنے ساتھیوں کی جائیداد آدھی قیمت پر خرید سکتا تھا جنہیں میسر نے نکال باہر کیا تھا،" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا، کیوں کہ اسے اپنی جیب میں چابیاں نہیں ملیں۔ تب اس نے کرنل کی بے یقینی کا سامنا کیا۔

"اتنے بے عقل مت بنو،" اس نے کہا۔ "ساباس کو اپنی جان کے مقابلے میں پیسے سے زیادہ دلچسپی ہے۔"

اس رات کرنل کی بیوی خریداری کرنے بازار گئی۔ شامیوں کی دکانوں تک وہ بھی اس کے ساتھ گیا، اور ڈاکٹر کے انکشافات پر غور کرتا رہا۔

"لوگوں کو تلاش کر کے انہیں فوراً بتا دو کہ مرغ بک گیا ہے،" اس نے کرنل سے کہا۔ "انہیں خواہ مخواہ امید دلانے رکھنے سے کیا فائدہ؟"

"مرغ اس وقت تک نہیں بکے گا جب تک میرا دوست ساباس واپس نہیں آجاتا،" کرنل نے جواب دیا۔

اس نے الوارو کو بلیر ڈال میں روٹیٹ کھینٹے پایا۔ اس اتوار کی رات بلیر ڈال تپ رہا تھا۔ اونچی آواز میں جتے ریڈیو کے ارتعاش کی وجہ سے گرمی اور بھی شدید لگ رہی تھی۔ کرنل موم جانے کے بڑے سے میز پوش پر رہ گئے ہوئے، اور میز کے درمیان ایک ڈبے پر رکھی تیل کی لالٹین کی روشنی میں جگمگاتے ہوئے ہندسوں کو دیکھ دیکھ کر اپنا جی خوش کرتا رہا۔ الوارو بار بار تیس کے ہند سے پر پیسے لاکر ہارنے پر مسر تھا۔ اس کے شانے پر سے کھیل کا جائزہ لیتے ہوئے، کرنل نے مشاہدہ کیا کہ پچھلی نو دفعہ کے گھمانے میں گیارہ کا ہند سچا بار ظاہر ہوا ہے۔

"گیارہ پر لگاؤ،" کرنل نے الوارو کے کان میں کہا۔ "یہی بار بار آ رہا ہے۔"

الوارو نے میز کو غور سے دیکھا۔ اگلی بار اس نے رقم نہیں لگائی۔ اس نے اپنی پتلون کی جیب سے کچھ نقدی، اور کاغذ کا ایک پرزہ نکالا۔ اس نے پرزہ میز کے سچے سے کرنل کو دیا۔ "آگستین نے بھیجا ہے،" اس نے کہا۔

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

کرنل نے خفیہ تحریر اپنی جیب میں ڈال لی۔ الوارو نے گیارہ پر خاصی بڑی رقم لگا دی۔
"تھوڑے پیسوں سے شروع کرو،" کرنل نے کہا۔

"کیا پتا تمہارا قیاس درست ہو،" الوارو نے جواب دیا۔ پاس کھڑے چند جوار یوں نے دوسرے ہندسوں سے رقمیں اٹھا کر گیارہ پر لگا دیں، حالانکہ رنگدار پیسے نے گھومنا شروع کر دیا تھا۔ کرنل نے اپنے آپ کو مجبور محسوس کیا۔ اسے پہلی مرتبہ جوئے کی کشش، اضطراب اور تلمی کا احساس ہوا۔

اس بار پانچ نمبر آیا۔

"مجھے افسوس ہے،" کرنل نے احساسِ جرم اور شرمندگی سے بے اختیار ہو کر الوارو سے کہا، اس کی نظریں لکڑی کی اس جھانپی پر لگی ہوئی تھیں جس سے میز پر سے الوارو کی لگائی ہوئی رقم سمیٹی جا رہی تھی۔ "جس بات سے میرا کوئی واسطہ نہیں، اس میں مجھے ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے تھی۔"
الوارو کرنل کی طرف دیکھے بغیر مسکرایا۔

"کوئی پروا نہیں کرنل۔ سب چلتا ہے۔"

اچانک، مامبو بجاتے ہوئے بگل خاموش ہو گئے۔ کھلاڑی اپنے ہاتھ ہوا میں اٹھائے شرشر ہو گئے۔ کرنل کو اپنے عقب میں بندوق کا گھوڑا چڑھائے جانے کی واضح، کرخ اور سرد آواز سنائی دی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ پولیس کے چھاپے میں پھنس گیا ہے، اور اس کی جیب میں خفیہ اخبار ہے۔ وہ اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے بغیر تھوڑا سا مڑا۔ تب اس نے بہت قریب سے، زندگی میں پہلی بار، اس شخص کو دیکھا جس نے اس کے پیٹے کو گولی ماری تھی۔ وہ شخص کرنل کے بالکل سامنے تھا اور اس کی بندوق کی نالی کا رخ کرنل کے پیٹ کی طرف تھا۔ وہ چھوٹے سے قد کا، اندھین خدوخال اور موسموں سے سنولائی جلد والا آدمی تھا جس کے سانس سے بچوں جیسی بو آرہی تھی۔ کرنل نے اپنے دانت کچکچائے اور آہستگی سے بندوق کی نالی کا رخ اپنی انگلیوں سے موڑ کر دوسری جانب کر دیا۔

"گستاخی معاف،" اس نے کہا۔

اس نے چمگاڑ کی سی دو چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں کا سامنا کیا۔ لمبے بھر میں اسے محسوس ہوا جیسے وہ آنکھیں اسے گل رہی ہوں، اور پھر فوراً ہی انھوں نے اسے کچل کر بضم کر کے باہر نکال دیا ہو۔

"تم جاسکتے ہو کرنل۔"

یہ بتانے کے لیے کہ یہ دسمبر کا مہینا ہے، اسے کھرٹکی کھولنے کی ضرورت نہ تھی۔ جب وہ باورچی خانے میں مرغے کے ناشتے کے لیے پھل کاٹ رہا تھا، اس نے اسے اپنی ہڈیوں میں محسوس کیا۔ تب اس نے دروازہ کھولا، اور صحن کی سمت ایک نظر نے اس کے احساس کی تصدیق کر دی۔ یہ ایک حیرت انگیز صحن تھا، جس میں گھاس اور درخت تھے، اور ڈبے جیسا غسل خانہ جو زمین سے ایک ملی میٹر اوپر تیرتا لگتا تھا۔

عورت نو بجے تک بستر میں رہی۔ جس وقت وہ باورچی خانے میں داخل ہوئی، اس وقت تک کرنل گھر کی صفائی کر چکا تھا، اور مرغ کے ارد گرد اُڑے کی شکل میں بیٹھے ہوئے بچوں سے باتوں میں مشغول تھا۔ عورت کو چولہے تک پہنچنے کے لیے لمبا چکر کاٹنا پڑا۔ "راستے سے ہٹ جاؤ،" وہ چلائی۔ اس نے تھر آؤد نظروں سے مرغ کی سمت دیکھا۔ "پتا نہیں اس منوس سے کب چھٹارا حاصل ہوگا!"

کرنل نے مرغ کے اوپر سے اپنی بیوی کی کیفیت کا جائزہ لیا۔ مرغ سے خفگی بے ہاتھی۔ وہ لڑائی کی مشق کے لیے تیار تھا۔ اس کی گردن اور جاسنی پروں والی ٹانگیں، اس کی آرمی کے دندائوں والی کلنی؛ اس کا بدن چھریا ہو گیا تھا، اس کا انداز بے بدافعت تھا۔ "کھرٹکی سے باہر دیکھو، اور مرغ کو بھول جاؤ،" بچوں کے جانے کے بعد کرنل نے کہا۔ "ایسی صبح ہے کہ آدمی کا تصویر کھنچوانے کو جی چاہتا ہے۔"

اس نے کھرٹکی سے باہر جھانکا، مگر اس کے چہرے پر کوئی جذبہ ظاہر نہ ہوا۔ "میں گلاب لانا چاہتی ہوں،" چولہے کی طرف لوٹتے ہوئے وہ بولی۔ کرنل نے شیو بنانے کے لیے آئینہ دیوار پر لٹکایا۔

"گلاب لانے کو جی چاہ رہا ہے تو لگا لو،" اس نے کہا۔ وہ اپنی حرکات کو آئینے کے ہلنے کے مطابق رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ "مگر انہیں سوز کھا جاتے ہیں،" وہ بولی۔

"آؤر بھی اچھی بات ہے،" کرنل نے کہا۔ "گلابوں پر پکے ہوئے سوز زیادہ لذیذ ہونے چاہئیں۔"

اس نے آئینے کے کونے میں اپنی بیوی کو دیکھنے کی کوشش کی، اور اسے محسوس ہوا کہ اس کی تلی برقرار ہے۔ چولہے کی آگ کی روشنی میں اس کا چہرہ چولہے ہی کی طرح کے مادے کا بنا لگتا

کرئل کو کوئی خط نہیں لکھتا

تھا۔ آئینے میں اپنا عکس دیکھے بغیر، اپنی بیوی پر نظریں جمائے، وہ ہمیشہ کی طرح چہرے کو ٹٹول
ٹٹول کر شیو بناتا رہا۔ عورت، ایک طویل خاموشی کے دوران، سوچ میں غرق رہی۔

"لیکن میں گلاب نہیں لگانا چاہتی،" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے،" کرئل نے کہا، "تو پھر مت لگاؤ۔"

کرئل کی طبیعت ٹھیک تھی۔ دسمبر کے آنے سے اس کی انٹریوں میں اگنے والے
نباتات مرجھا گئے تھے۔ صبح صبح اسے نئے جوتے پہننے کی کوشش میں مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کئی
دفعہ کوشش کرنے کے بعد جب اسے احساس ہوا کہ یہ فضول ہے تو اس نے اپنے نقلی چمڑے کے
جوتے ہی پہن لیے۔ اس کی بیوی نے اس تبدیلی کو محسوس کر لیا۔

"نئے جوتے پہنو گے نہیں تو وہ کبھی ڈھیلے نہیں پڑیں گے،" اس نے کہا۔

"یہ تو کسی معذور کے جوتے ہیں،" کرئل نے احتجاج کیا۔ "لوگوں کو چاہیے کہ ایسے جوتے
بیچا کریں جو ایک ماہ تک استعمال کیے جا چکے ہوں۔"

اُس دوپہر خط کی آمد کے احساس سے بے تاب ہو کر وہ گلی میں ٹکل آیا۔ چوں کہ لانبوں کے
آنے میں ابھی دیر تھی، وہ سا باس کے دفتر میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ اسے بتایا گیا کہ
سا باس سوموار سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔ اس غیر متوقع رکاوٹ کے باوجود کرئل نے صبر کا
دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ "جلد یا بدیر اسے واپس تو آنا ہی ہے،" اس نے اپنے آپ سے کہا، اور
بندرگاہ کی طرف چل پڑا؛ یہ ایک حیرت انگیز لمحہ تھا، جس میں اس کی ہوشمندی سالم اور بے داغ
تھی۔

"دسمبر کا مہینا سارے سال چلنا چاہیے،" موسیٰ شامی کی دکان میں بیٹھے ہوئے وہ منہ ہی منہ
میں بولا۔ "آدمی کو یوں لگتا ہے جیسے وہ کالج کا بنا ہوا ہو۔"

موسیٰ کو یہ تصور اپنی بھولی بھری عربی میں ترجمہ کرنے میں قدرے محنت کرنا پڑی۔ وہ
ہموار، کھنٹی ہوئی جلد میں اپنے کانوں تک لپٹا، ایک حلیم الطبع مشرقی تھا، اور اس کی حرکات کسی
ڈوبتے ہوئے شخص کی حرکات کی طرح کدھب تھیں۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اسے ابھی کھینچ کر
پانی سے باہر نکالا گیا ہو۔

"پہلے یوں ہی ہوتا تھا،" اس نے کہا۔ "وہی حال رہتا تو میری عمر اس وقت آٹھ سو ستانوے
سال کی ہوتی۔ اور تمہاری؟"

"ہیچٹر سال،" کرئل نے کہا، اس کی آنکھیں پوسٹ ماسٹر کا پچھا کر رہی تھیں۔ اس وقت
اسے سرکس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے ڈاک والی لانچ کی چھت پر بہت سی رنگ برنگی

چیزوں کے درمیان سرکس کے پیوند لگے خیمے کو پہچان لیا۔ دوسری لانیوں پر اوپر نیچے رکھے ڈنوں میں جھگی جانوروں کو ڈھونڈنے کی کوشش میں، پوسٹ ماسٹر ایک لمے کے لیے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اسے جانور نظر نہ آئے۔

"یہ سرکس ہے!" وہ بولا۔ "یہ پہلا سرکس ہے جو پچھلے دس برس میں آیا ہے۔"

موسیٰ شامی نے اس کی تصدیق کی۔ وہ ملی جلی عربی اور ہسپانوی میں اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔ اس نے دکان کے عقبی حصے سے اسے جواب دیا۔ اس نے اپنے آپ سے کچھ کہا، اور پھر اپنی فکر مندی کا ترجمہ کر کے کرنل کو بتایا۔

"اپنی جلی کو چھپا لو، کرنل۔ ورنہ لڑکے اسے چرا کر سرکس میں بیچ دیں گے۔"

کرنل اٹھ کر پوسٹ ماسٹر کے پیچھے جانے کو تھا۔

"یہ جھگی جانوروں کا تماشا نہیں ہے،" اس نے کہا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا،" شامی نے جواب دیا۔ "رے پر چلنے والے بلیاں کھاتے ہیں تاکہ اپنی بڑیاں نہ توڑ بیٹھیں۔"

وہ پوسٹ ماسٹر کے پیچھے پیچھے ساحل پر دکانوں کے درمیان سے گزرتا ہوا چوک تک آپہنچا۔ وہاں مرغوں کی لڑائی جیسے شور نے اسے تعجب میں ڈال دیا۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک شخص نے اس کے مرغ کے بارے میں کچھ کہا۔ تب اسے یاد آیا کہ آج مرغوں کی جانچ پر کد کا دن ہے۔

وہ ڈاک خانے کے سامنے سے گزر گیا۔ ایک لمے بعد وہ مرغوں کی لڑائی کی پالی کے شور و غل میں گم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے مرغ کو پالی میں اکیلا اور بے مدافعت کھڑا دیکھا؛ اس کے پنہوں پر دھجیاں لپٹی ہوئی تھیں اور اس کے کانپتے پیروں سے خوف جیسی کوئی شے ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کا حریت ایک اداس خاکستری مرغ تھا۔

کرنل کو کوئی جذبہ محسوس نہ ہوا۔ مرغ ایک دوسرے پر ایک ہی طریق سے حملہ آور ہوئے۔ لوگوں کی پرجوش داد و تحسین کے درمیان، ان کے پر، ہنسنے اور گردنیں چند لمحوں کے لیے ایک دوسرے میں گتہ گتہ گئیں۔ پالی کی باڑھ سے ٹکرا کر حریت مرغ نے قلابازی کھائی، اور لوٹ کر پھر حملہ آور ہوا۔ اس کے مرغ نے حملہ نہ کیا۔ بلکہ ہر حملے کی مدافعت کر کے اپنی جگہ واپس آتا رہا۔ مگر اب اس کے پاؤں نہیں کانپ رہے تھے۔

ایرنا نے باڑھ پھلانگی، اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھایا، اور تماشاچیوں کے ہجوم کے سامنے اس کی نمائش کرنے لگا۔ لوگوں نے دیوانہ وار تحسین کے نعرے بلند کیے۔ کرنل نے لوگوں کی داد

کے ولوے اور مرغوں کی لڑائی کی شدت میں عدم تناسب کو محسوس کر لیا۔ اسے یہ سب ایک سوانگ معلوم ہوا، جس میں دونوں مرغوں نے خود کو۔۔ ارادی اور شعوری طور پر۔۔ شریک ہونا دیا تھا۔

کچھ کچھ حقارت آمیز تجسس سے مجبور ہو کر اس نے لڑائی کی دائرہ نمائی کا جائزہ لیا۔ پرجوش مجمع خستوں سے ایک دوسرے کو دھکیلتا نیچے پالی کی طرف آ رہا تھا۔ کرنل نے پرجوش، بے تاب اور مکمل طور پر زندہ چہروں کے اس بہوم کی ابتری کا مشاہدہ کیا۔ وہ سب نئے لوگ تھے۔ قصبے کے تمام نئے باشندے۔ اس نے۔۔ ایک پیش آگہی کے ساتھ۔۔ ایک ایسے لمحے کو ایک بار پھر بسر کیا جو اس کی یادداشت کے سرے پر محو ہو چکا تھا۔ تب وہ بارڈھ پلاننگ کر بہوم میں سے راستا بناتا ہوا پالی کے وسط میں جا پہنچا اور ایرنان کی برسکون آنکھوں کا سامنا کیا۔ وہ دونوں آنکھیں جھپکائے بغیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

"سہ پہر بخیر، کرنل۔"

کرنل نے مرغ کو اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ "سہ پہر بخیر،" وہ بڑبڑایا۔ وہ آور کچھ نہ بولا کیوں کہ اس جاندار کے گرم اور گہرے ارتعاش نے اس پر لچکی طاری کر دی تھی۔ اسے خیال آیا کہ اس نے اس سے پہلے کبھی اس سے زیادہ زندہ شے اپنے ہاتھوں میں نہیں لی۔

"تم گھر پر نہیں تھے، ایرنان نے گڑبڑا کر کہا۔

دادو محسین کے ایک نئے شور نے اس کی بات کاٹ دی۔ کرنل کو ڈر سامسوس ہوا۔ اس نے بہوم میں سے، کسی کی طرف دیکھے بغیر، محسین کے نعروں اور شور و غل سے سہم کر، ایک بار پھر راستا بنانا شروع کیا؛ وہ مرغ کو بغل میں دبائے لگی میں ٹھل آیا۔

سارا قصبہ۔۔ نچلے طبقے کے لوگ۔۔ اسے گزرتا دیکھنے کے لیے باہر ٹھل آیا؛ اس کے پیچھے پیچھے اسکول کے بچے تھے۔ چوک کے کونے پر ایک دیو قاست نیگرو اپنی گردن کے گرد سانپ لپیٹے، میز پر کھڑا، لائنس کے بغیر دو آئیں بیچ رہا تھا۔ بندرگاہ سے واپس آتے ہوئے لوگوں کا ایک بڑا مجمع اس کے ارد گرد کھڑا اس کے قصبے سن رہا تھا۔ لیکن جب کرنل مرغ اٹھائے ان کے پاس سے گزرا تو سب کی توجہ اس کی طرف ہو گئی۔ گھر کا راستا کبھی اتنا طویل نہیں ہوا تھا۔

اسے کوئی تاسف نہ تھا۔ ایک طویل عرصے تک یہ قصبہ، دس برس کی تاریخ کی دست برد کا شمار، بے ہوشی کے عالم میں رہا تھا۔ اس سہ پہر۔۔ بغیر خط کے ایک آور جمعے کی سہ پہر۔۔ لوگ جاگ اٹھے تھے۔ کرنل کو ایک آور زمانے کی یاد آئی۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ ایک بڑی چستری کے نیچے بیٹھا تماشا دیکھ رہا ہے، جو بارش کے باوجود جاری ہے۔ اس نے پارٹی کے

رہنماؤں کو یاد کیا، جو نہایت احتیاط کے ساتھ بنے سنورے، اس کے گھر کے دالان میں موسیقی کی تال پر اپنے آپ کو پنکھا جھل رہے تھے۔ اس نے ڈھول کی اذیت ناک دھمک کو اپنی انٹریوں میں تقریباً پھر سے بسر کیا۔

وہ گودی کے متوازی سرک پر چلتا گیا، اور وہاں بھی اس نے بہت پہلے کے الیکشن کے ایک اتوار کا پُر آشوب، ہجوم دیکھا۔ لوگ سرکس کو اترتے دیکھ رہے تھے۔ ایک خیمے کے اندر سے کسی عورت نے چیخ کر مرغ کے بارے میں کچھ کہا۔ وہ اپنے آپ میں گم، گھر کی طرف پتتا رہا، اسے سارے راستے بکھری ہوئی آوازیں یوں سنائی دیتی رہیں، جیسے پالی کے نعروں کی باقیات اس کا پیچھا کر رہی ہوں۔

دروازے پر وہ لڑکوں سے مخاطب ہوا:
"تم سب گھر جاؤ،" اس نے کہا۔ "جو کوئی اندر آیا اس کی جھڑی ادھیڑ دی جائے گی۔"
اس نے دروازہ بند کیا اور سیدھا باورچی خانے میں گیا۔ اس کی بیوی، بے ترتیب سانوں کے ساتھ خواب گاہ سے نکلی۔

"وہ اسے زبردستی لے گئے،" اس نے سکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "میں نے ان سے کہا کہ جب تک میں زندہ ہوں مرغ اس گھر سے باہر نہیں جائے گا۔" کرنل نے مرغ کو چولھے کے پائے سے باندھ دیا۔ اس کا پانی بدلتے ہوئے، اس کی بیوی کی غضبناک آواز اس کا پیچھا کرتی رہی۔
"انہوں نے کہا وہ اسے ہماری لاشوں پر سے گزر کر بھی لے جائیں گے،" وہ بولی۔ "انہوں نے کہا مرغ ہمارا نہیں، پورے قصبے کا ہے۔"

مرغ کے کاموں سے فارغ ہو کر جی کرنل نے اپنی بیوی کے اینٹھے ہوئے چہرے کی طرف توجہ دی۔ اس پر، بغیر کسی تعجب کے، انکشاف ہوا کہ اسے دیکھ کر نہ اسے افسوس ہوا اور نہ ہمدردی۔

"انہوں نے ٹھیک کیا،" اس نے آہستہ سے کہا۔ اور پھر اپنی جیبوں میں کچھ تلاش کرتے ہوئے وہ ایک قسم کی اتھاہ مٹاس کے ساتھ بولا:
"مرغ چپنے کے لیے نہیں ہے۔"

وہ اس کے پیچھے پیچھے خواب گاہ میں آئی۔ وہ اسے مکمل طور پر انسان، لیکن رسائی سے باہر محسوس ہوا، جیسے وہ اسے سنیمیا کے پردے پر دیکھ رہی ہو۔

کرنل نے الماری میں سے گول کر کے رکھے ہوئے چند نوٹ نکالے، اپنی جیبوں میں موجود رقم ان میں شامل کی، سارے نوٹوں کو گنا، اور الماری میں واپس رکھ دیا۔

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

"میرے دوست سا باس کو لوٹانے کے لیے انتیس پیسہ ہیں،" اس نے کہا۔ "باقی کی رقم اسے میری پیش آنے پر ملے گی۔"

"لیکن اگر تمہیں پیش نہ ملی تو؟" عورت نے پوچھا۔

"ملے گی۔"

"لیکن اگر نہ ملی تو؟"

"تو پھر، اسے باقی رقم کی ادائیگی نہیں ہوگی۔"

اس نے بستر کے نیچے سے جوتوں کا نیا جوڑا نکالا۔ پھر جوتوں کا خالی ڈبالیئے الماری کے پاس گیا، جوتوں کے تلے ایک جیتھڑے سے صاف کیے، اور جوتوں کو ڈبے میں اسی طرح رکھ دیا جیسے اس کی بیوی انہیں اتوار کی رات کو لائی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

"جوتے واپس کیے جائیں گے،" کرنل نے کہا۔ "اس طرح میرے دوست سا باس کے لیے تیرہ پیسہ کا اور انتظام ہو گیا۔"

"وہ انہیں واپس نہیں لیں گے،" وہ بولی۔

"انہیں لینے ہوں گے،" کرنل نے جواب دیا۔ "میں نے صرف دو بار پیسے دیے۔"

"ٹرک ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے،" عورت نے کہا۔

"انہیں سمجھنا ہو گا۔"

"اگر وہ نہ سمجھیں تو؟"

"تو پھر نہ سہی!"

وہ کھانا کھائے بغیر بستر پر گئے۔ کرنل نے اپنی بیوی کی تسبیح کے ختم ہونے کا انتظار کیا تاکہ لیمپ بجاسکے۔ لیکن وہ سو نہ سکا۔ اس نے فلم کے سنسر کی گھنٹیاں سنیں، اور تقریباً اچانک۔۔۔ تین گھنٹے بعد۔۔۔ کرفیو کا بگل سنا۔ رات کی سرد ہوا سے اس کی بیوی کے سانس کا کرب اور بڑھ گیا تھا۔ کرنل کی آنکھیں کھلی تھیں، جب وہ اس سے دھیمے، صلح جو لہجے میں مخاطب ہوئی:

"تم جاگ رہے ہو۔"

"ہاں۔"

"سمجھو جو مجھ سے کام لو،" اس نے کہا۔ "کل جا کر سا باس سے بات کر لو۔"

"وہ سوموار سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔"

"بہتر ہے،" عورت بولی۔ "اس طرح تمہیں سوچنے کے لیے تین دن مل جائیں گے۔"

"سوچنے کے لیے کچھ نہیں ہے،" کرنل نے کہا۔

اکتوبر کی چیپ ہاٹ کی بجائے اب ہوا میں خوشگوار خنکی تھی۔ پلوور پرندوں کی آمدورفت کے بندھے کئے معمول سے کرنل نے دسمبر کو ایک بار پھر پہچانا۔ رات دو بجے تک وہ نیند سے کوسوں دور تھا۔ لیکن اسے علم تھا کہ اس کی بیوی بھی جاگ رہی ہے۔ اس نے جھولنے میں کروٹ بدلنے کی کوشش کی۔

"تعمین نیند نہیں آرہی ہے،" عورت نے کہا۔
"نہیں۔"

وہ ایک لمبے سوچتی رہی۔

"ہم ایسا کرنے کی صورتِ حال میں نہیں ہیں،" وہ بولی۔ "ذرا سوچو چار سو پیسہ کی ایک مٹت رقم کتنی ہوتی ہے!"

"اب پنشن ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی،" کرنل نے کہا۔

"تم پندرہ سال سے یہی کہتے آرہے ہو۔"

"اسی لیے تو،" کرنل نے کہا۔ "اب زیادہ دیر نہیں ہے۔"

وہ خاموش رہی۔ لیکن جب اس نے دوبارہ بات کی تو کرنل کو کوئی وقفہ محسوس نہ ہوا۔

"مجھے لگتا ہے پنشن کبھی نہیں ملے گی،" عورت نے کہا۔

"ملے گی۔"

"اور اگر نہ ملی تو؟"

کرنل اس کا جواب نہ دے سکا۔ مرغ کی پہلی بانگ کے ساتھ اسے حقیقت کا احساس ہوا، مگر وہ دوبارہ دبیز، محفوظ اور بے تاسف نیند میں ڈوب گیا۔ جب وہ اٹھا تو دن چڑھ چکا تھا۔ اس کی بیوی سو رہی تھی۔ کرنل نے باقاعدگی کے ساتھ صبح کے تمام فریضے ہر روز کی طرح، مگر دو گھنٹے دیر سے، پورے کیے اور ناشتے کے لیے اپنی بیوی کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔

جب وہ اٹھی تو بہت محم گو تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو صبح بخیر کہا، اور خاموشی سے ناشتے کے لیے بیٹھ گئے۔ کرنل نے پنیر اور میٹھا بن کھایا اور بغیر دودھ کی کافی کا پیلا لایا۔ صبح کا باقی تمام وقت اس نے درزی کی دکان پر بیٹھ کر گزارا۔ ایک بجے وہ گھر واپس آیا، اور اپنی بیوی کو بیگونیہ کے گھملوں کے درمیان کپڑے رفو کرتے ہوئے پایا۔

"دوپہر کے کھانے کا وقت ہے،" اس نے کہا۔

"کھانا نہیں ہے۔"

کرنل نے کندھے اچکائے۔ وہ صحن کی دیوار کے ان سوراخوں کو بند کرنے کی کوشش

کر نل کو کوئی خط نہیں لکھتا

کرنے لگا، جن سے بچے باورچی خانے میں گھس آیا کرتے تھے۔ جب وہ دوبارہ والان میں آیا تو کھانا میز پر رکھا تھا۔

کھانا کھانے کے دوران کرنل کو احساس ہوا کہ اس کی بیوی بہت کوشش سے رونے سے گریز کر رہی ہے۔ اس یقینی بات سے وہ چونک اٹھا۔ وہ اپنی بیوی کی طبیعت سے واقف تھا، جو فطری طور پر سخت تھی، اور متقی کے چالیس برسوں نے اسے اور بھی سخت کر دیا تھا۔ اپنے بیٹے کی موت پر بھی اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہ ٹکلا تھا۔

اس نے اپنی پڑاوت لگاہ اپنی بیوی کی آنکھوں پر مرکوز کر دی۔ وہ اپنے ہونٹ کترتی، آہستہ سے اپنی پلکیں پو بھتی، کھانا کھاتی رہی۔
"تمہیں کسی کا کوئی خیال نہیں ہے،" اس نے کہا۔

کرنل کچھ نہ بولا۔

"تم خود سر، صندی اور خود غرض ہو،" اس نے دوبارہ کہا۔ اس نے اپنے چھری کانٹے رکابی میں ایک دوسرے کے اوپر رکھ دیے، مگر فوراً ہی اپنے تو سم کے زیر اثر انہیں سیدھا کر دیا۔ "ساری عمر میں نے اس لیے جہاز بھجوا کھا کہ اب آکر مجھے معلوم ہو کہ میری وقعت ایک مرغ سے بھی کم ہے۔"

"یہ اور معاملہ ہے،" کرنل نے کہا۔

"یہ ایک ہی معاملہ ہے،" عورت نے جواب دیا۔ "تمہیں اتنا تو خیال ہونا چاہیے کہ میں مرنے والی ہوں؛ میرا یہ مرض دراصل آہستہ آہستہ آتی ہوئی موت ہے۔"

جب تک کرنل نے کھانا ختم نہیں کر لیا، کچھ نہ بولا۔

"اگر ڈاکٹر مجھے یہ ضمانت دے دے کہ مرغ کے چپنے سے تمہارا دم ٹھیک ہو جائے گا، تو

میں اسے ابھی بیچ دوں گا،" اس نے کہا۔ "ورنہ نہیں۔"

اس سہ پہر وہ مرغ کو لڑائی کی پالی میں لے گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس نے اپنی بیوی کو دے کے دورے کے قریب پایا۔ وہ بازو پھیلائے، بال کھولے، بے چینی میں والان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگاتی، اپنے پیچھے ٹوں کی سیٹیوں پر قابو پانے اور اپنا سانس درست کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شام تک وہ اسی حالت میں رہی۔ پھر اپنے خاوند سے بات کیے بغیر، وہ جا کر بستر میں لیٹ گئی۔

کرفیو شروع ہونے کے کچھ دیر بعد تک وہ دعائیں پڑھتی رہی۔ کرنل نے لیمپ بجھانا چاہا۔ مگر اس نے اعتراض کیا۔

"میں اندھیرے میں نہیں مڑنا چاہتی،" اس نے کہا۔
کرنل نے جلتے ہوئے لیپ کو فرش پر رہنے دیا۔ اسے ممکن محسوس ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ سب کچھ فراموش کر کے چوالیس دن کے لیے سو جائے، اور بیس جنوری کو سہ پہر تین بجے، پالی میں جاگے تاکہ عین وقت پر مرغ کو لڑائی کے لیے اتار سکے۔ لیکن اسے اپنی بیوی کی متوقع بے خوابی سے ڈر محسوس ہوا۔

"وہی پرانی کھانی ہے،" ایک لمحے بعد وہ بولنے لگی۔ "ہم بھوکے رہتے ہیں تاکہ دوسروں کا پیٹ بھر سکے۔ پالیس برس سے یہی ہو رہا ہے۔"

کرنل خاموش رہا، یہاں تک کہ اس کی بیوی یہ پوچھنے کو رک کر کہ آیا وہ جاگ رہا ہے۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ تب عورت نے اطمینان اور روانی اور کٹھور پن سے اپنی بات جاری رکھی۔
"ہر شخص مرغ پر پیرے گا کر جیت جائے گا، ہمارے سوا۔ صرف ہم ہیں جن کے پاس مرغ پر لگانے کے لیے پھوٹی کوڑھی بھی نہیں ہے۔"

"مرغ کا مالک منافع میں سے بیس فیصد کا حق دار ہوتا ہے۔"
"ایکشن میں دن رات کام کرنے کے بعد تم کسی عہدے کے بھی حق دار تھے،" عورت نے جواب دیا۔ "خانہ جنگی میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر سپاہیوں کی پنشن کے بھی حق دار تھے۔ اب سب کی زندگیاں بن گئی ہیں، اکیلے تم ہو جو بھوکے مر رہے ہو۔"
"میں اکیلا نہیں ہوں،" کرنل نے کہا۔

اس نے وضاحت کرنے کی کوشش کی، مگر نیند نے اس پر غلبہ پالیا۔ وہ ایک آسبگی کے ساتھ دیر تک بولتی رہی یہاں تک کہ اسے احساس ہوا کہ اس کا خاوند سو چکا ہے۔ تب وہ مچھروانی سے نکلی اور بیسٹک کے اندھیرے میں ادھر ادھر پھرتی رہی۔ وہاں بھی وہ اپنے آپ سے باتیں کرتی رہی۔ سورج نکلنے کے وقت کرنل نے اسے آواز دی۔

بچتے ہوئے لیپ کی نیچے سے پڑتی ہوئی روشنی میں وہ ایک روح کی طرح دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس نے مچھروانی میں داخل ہونے سے پہلے لیپ بجا دیا۔ مگر وہ بولتی رہی۔
"ہم ایک کام کر سکتے ہیں،" کرنل نے اس کی بات کاٹی۔
"ہم صرف ایک کام کر سکتے ہیں کہ مرغے کو بیچ دیں،" عورت نے کہا۔
"ہم گھڑی بھی تو بیچ سکتے ہیں۔"
"اسے کوئی نہیں خریدے گا۔"

"کل میں الوارو سے پوچھوں گا اگر وہ مجھے پالیس پیسہ دے سکے۔"

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

"وہ نہیں دے گا۔"

"تب ہم تصویر بیچ سکتے ہیں۔"

اس بار کرنل کی بیوی بات کرنے کے لیے پھر دانی سے باہر نکل آئی۔ کرنل کو اپنی بیوی کے دواؤں اور جڑی بوٹیوں سے آلودہ سانس کی بو آئی۔
"اسے کوئی نہیں خریدے گا،" وہ بولی۔

"دیکھیں گے،" کرنل نے نرمی سے اور اپنے لمبے میں کوئی تبدیلی لائے بغیر کہا۔ "اب جا کر سو جاؤ۔ کل اگر کوئی چیز بھی نہ بک سکی تو کوئی اور طریقہ سوچیں گے۔"
کرنل نے اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کی مگر نیند نے اس کے ارادے کو خاک میں ملا دیا۔ وہ وقت اور مقام کے احساس سے دور ایک ایسی کیفیت کی تہ میں جا گرا جہاں اس کی بیوی کے الفاظ نے ایک مختلف مفہوم اختیار کر لیا۔ مگر ایک لمحے بعد اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کا کندھا ہلا رہا ہو۔

"سیری بات کا جواب دو۔"

کرنل کی علم نہ ہو سکا کہ یہ الفاظ اس نے نیند میں جانے کے بعد سنے تھے یا اس سے پہلے۔ صبح طلوع ہو رہی تھی۔ تنہری اور شفاف صبح کی سرسبزی میں کھڑکی کی شکل واضح تھی۔ اس نے سوچا شاید اسے بخار ہے۔ اس کی آنکھیں تپ رہی تھیں اور اپنے ذہن کا ابہام دور کرنے میں اسے بہت دقت کا سامنا ہوا۔

"اگر ہم کچھ بھی نہ بیچ سکے تو کیا کریں گے؟" اس کی بیوی نے اپنا سوال دہرایا۔

"تب تک بیس جنوری کا دن آچکا ہوگا،" کرنل نے کہا: وہ اب پوری طرح بیدار تھا۔ "اور مرغوں کی لڑائی کے منافعے میں سے بیس فیصد اسی شام ہمیں مل جائے گا۔"

"اگر مرغ جیت گیا تو،" عورت نے کہا۔ "اور اگر وہ ہار گیا تو کیا ہوگا؟ تم نے یہ سوچا تک نہیں کہ وہ بار بھی سکتا ہے۔"

"وہ ایسا مرغ ہے جو نہیں ہار سکتا۔"

"فرض کرو وہ ہار گیا تو؟"

"اس بارے میں سوچنے کو ابھی چوالیس دن پڑے ہیں،" کرنل نے کہا۔

اس کی بیوی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"اور اس عرصے میں ہم کھائیں گے آخر کیا؟" اس نے پوچھا، اور کرنل کو اس کی فلائین قمیص کے کالر سے پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا۔

گا۔ بریل گارسیا مارکیز

اس ایک لمے تک پہنچے میں کرنل کو پچتر برس لگے تھے، ایک ایک لمحہ کر کے بسر کیے
ہوئے اس کی زندگی کے پچتر برس۔ جواب دینے کے لمے میں اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر
پاک صاف، واضح اور ناقابلِ تخیل محسوس کیا۔
"گو،" اس نے کہا۔



انتخاب کا یہ حصہ مارکیز کے ناول *Chronicle of a Death Foretold* کے ترجمے پر مشتمل ہے۔ یہ ناول بلاشبہ قدرت بیان کا ایک بے مثل معجزہ اور کئی اعتبار سے مارکیز کی منفرد ترین تحریر ہے۔ اس کا موضوع سماجی عزت کی اقدار کے نام پر ایک بے گناہ شخص کا قتل ہے، اور اس کے مجرم صرف وہ نہیں جن کے ہاتھوں سے یہ جرم سرزد ہوا، بلکہ ان مصنوعی اقدار پر یقین رکھنے والا ایک پورا قصبہ ہے جس نے اپنی بے عملی اور خاموشی کے ذریعے اس جرم کو تکمیل تک پہنچنے دیا۔ جرم اور بے گناہی کی یہ کہانی دراصل ایک عام واقعے پر مبنی ہے جس کی خبر مارکیز کو اپنی صحافیانہ زندگی کے ابتدائی برسوں میں ملی تھی، لیکن اس واقعے نے فکشن کے ایک شاہکار کی صورت کو پہنچنے تک مارکیز کے ذہن میں تیس برس انتظار کیا۔ اسے ناول کی ہیئت میں منتقل کرتے ہوئے مارکیز نے ایک نہایت پُر تخیل اسلوب وضع کیا ہے۔ اُسی قصبے کا ایک شخص، جرم کے ستائیس برس بعد، قصبے کے لوگوں کے غمِ حسی اور ایک دوسرے کی تردید کرتے ہوئے بیانات اور دھندلی یادوں کی مدد سے واقعے کی تفصیلیں اکٹھی کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ ہیئت نہ صرف المیے کو واضح کرنے میں مددگار ہوئی ہے بلکہ اس نے جرم کی سفاکی کو بھی پوری طرح نمایاں کر دیا ہے۔

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ: افضل احمد سید

ایک پیش گفتہ موت کی روداد

جس دن اے قتل کیا جانے والا تھا، ساتیاگو نُسر سارے پانچ بجے اُس کشتی کا استعارہ کرنے کے لیے بیدار ہوا جس پر بپ آ رہا تھا۔ اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ عمارتی لکڑی والے درختوں کے چھنڈے گزر رہا ہے جہاں ہلکی بوندیں پڑ رہی ہیں، اور ایک لمحے کے لیے وہ اپنے خواب میں خوش تھا، مگر جب وہ جاگا، اس نے خود کو چڑیوں کی بیٹ سے مکمل طور پر لٹھرا ہوا پایا۔ وہ ہمیشہ درختوں کے بارے میں خواب دیکھتا تھا، "پلاسیدا لینیرو، اس کی ماں، نے ستائیس سال بعد اُس ناخوش آئند سوموار کی تفصیل یاد کرتے ہوئے مجھے بتایا۔" ایک ہفتے پہلے اس نے خواب دیکھا تھا کہ وہ ٹہن کے ورق سے بنے بوائے جہاز میں تنہا ہے اور بادام کے باغوں میں کسی درخت سے ٹکرائے بغیر اڑ رہا ہے، "اس نے مجھے بتایا۔ پلاسیدا لینیرو کو دوسروں کے خوابوں کی، اگر وہ نہار منہ ستائے جاتے، درست تعبیر بتانے میں بجا طور پر ایک نیک نامی حاصل تھی، مگر وہ اپنے بیٹے کے ان دو خوابوں میں، یا درختوں کے دوسرے خوابوں میں، جو اُس نے اپنے قتل سے پہلے والی صبحوں میں اُسے ستائے تھے، کسی بد شگون کو محسوس نہیں کر سکی تھی۔

نہ ساتیا گو نصر ہی پیش گوئی کو جان سکا۔ وہ کپڑوں سمیت، کم اور بے حال سویا، اور سردرد اور الوداعی جُڑے کی تلچٹ اپنی زبان پر لیے نیند سے جاگا، اور اس نے انھیں شادی کی رنگ رلیوں کے، جو آدھی رات کے بعد تک محنتی رہی تھیں، قدرتی اثر سے وابستہ کیا۔ اس کے علاوہ، اُن بہت سے لوگوں کو، جن سے وہ چھبج کر پلنچ منٹ پر اپنا گھر چھوڑنے سے لے کر ایک گھنٹے بعد تک، جب وہ سڑ کی طرح کاٹ کر رکھ دیا گیا، راستے میں ملا، یاد تھا کہ وہ ذرا خواب آلود مگر خوش مزاجی میں تھا، اور اس نے ان سب سے ایک بے پروا یا نہ انداز میں کہا تھا کہ یہ ایک بہت خوب صورت دن ہے۔ کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا اشارہ موسم کی کیفیت کی طرف تھا۔ دوبارہ یاد کرتے ہوئے بہت سے افراد نے اس بات پر اتفاق کیا کہ وہ ایک روشن صبح تھی، کیلوں کے باغ سے سمندری ہوا آرہی تھی، جیسا کہ اُس وقت کی ایک پُر کیف فروری میں توقع کی جا سکتی تھی۔ مگر زیادہ تر لوگ متفق تھے کہ ابراہم آلود نشیبی آسمان اور رُکے ہوئے پانی کی درشت بو کی وجہ سے موسم ماتم انگیز تھا، اور بد قسمتی کے اس لمحے میں ایک نم نم پھوار، جیسی ساتیا گو نصر نے اپنے خواب کے باغوں میں دیکھی تھی، پڑ رہی تھی۔ میں، ماریا ایسا ندریتا سرواٹس کی حواریا نہ آغوش میں، شادی کے ہنگامے سے بحال ہونے میں مشغول تھا، اور اطلاعی گھنٹیوں کی فریاد سے یہ سوچتے ہوئے بیدار ہوا کہ انھیں ہسپ کے اعزاز میں بے قرار کر دیا گیا ہے۔

ساتیا گو نصر بغیر کھٹ لگی سفید لٹن کی قمیص اور پتلون میں، جیسی کہ اس نے گزشتہ دن شادی میں پہنی تھیں، ملبوس تھا۔ اگر ہسپ نہ آ رہا ہوتا تو وہ اپنا خاص خاکی لباس اور ٹخنے سے اونچے گھڑمواری کے جوتے پہنتا، جو وہ ہر سوموار کو ڈیو آئن فیس میں مویشیوں کی اس پرورش گاہ کو جانے کے لیے پہنتا تھا جو اس نے اپنے باپ سے آرٹ کی تھی اور جس کا اس نے ہوشیاری سے، مگر زیادہ خوش طالعی کے بغیر، نظم و نسق چلایا تھا۔ قصبے سے باہر وہ اپنی بیلٹ پر میگنم ۳۵۷ باندھتا تھا، اور اس کی خود چمھی گولیاں، اس کے کہنے کے بموجب، کسی گھوڑے کو درمیان سے کاٹ کر رکھ سکتی تھیں۔ تیتروں کے موسم میں وہ اپنا بنگرے سے شکار کرنے کا ساز و سامان بھی ساتھ لے جاتا۔ صندوق خانے میں ایک ملنچر شوٹا اور ۳۰۶ رائفیل، ایک ہالینڈ میگنم ۳۰۰ رائفیل، دوہری طاقت کے دوربینی دیدیش والی ہارنیت ۲۲ اور ونچسٹر ریپر موجود تھیں۔ وہ ہمیشہ اپنے باپ کی طرح اسلحہ ٹکیے کے غلاف میں چمپا کر سوتا تھا، مگر اس دن گھر سے نکلنے سے پہلے اس نے گولیاں نکال کر ٹائٹ ٹیبل کی دراز میں ڈال دی تھیں۔ "وہ کبھی اے بھرا ہوا نہیں چھوڑتا تھا،" اس کی ماں نے مجھے بتایا۔ میں یہ جانتا تھا، اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ بدوقیں ایک جگہ رکھتا تھا اور گولیاں دوسری جگہ کافی فاصلے پر، تاکہ کوئی بے مقصد بھی انھیں گھر

کے اندر بھرنے کی ترغیب کا شکار نہ ہو سکے۔

یہ ایک بوش مندانہ روش تھی، جو اس کے باپ نے اُس صبح سے ہمیشہ کے لیے قائم کی۔ باب ایک خدمت گار لڑکی نے تکیہ لٹکانے کے لیے غلاف کو جھٹکا اور پستول فرش سے نکل کر چل گیا، اور گولی کمرے کی الماری کو تباہ کرتی ہوئی، فشت کے کمرے کی دیوار میں سے بوزکر پڑوس کے مکان کے کھانے کے کمرے سے گھن گرج کے ساتھ گزری، اور ایک قد آدم وئی کو، چوک کے بالمقابل مرکزی محراب پر، پلاسٹر کے غبار میں تبدیل کر دیا۔ ساتیاگو نصر نے، جو اس وقت خرد سال تھا، کبھی اس حادثے کو فراموش نہیں کیا۔ اس کی ماں کے پاس اس کا آخری عکس اس کا شب خوابی کے کمرے سے تیزی کے ساتھ گزرا تھا۔ اس نے غسل خانے میں دواؤں کی بھوٹی الماری میں آہستگی سے اسپرین تلاش کرتے ہوئے اپنی ماں کو جگا دیا تھا؛ اس کی ماں نے تتی جلائی اور اس کو، پانی کا ایک گلاس اپنے ہاتھ میں لیے، جائے در سے نمودار ہوتے ہوئے دیکھا، یہاں کہ وہ اسے تا ابد یاد رکھے گی۔ ساتیاگو نصر نے اسے خواب کے متعلق بتایا، مگر اس نے رختوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

"پرندوں کا خواب میں نظر آنا اچھی صحت کی علامت ہے،" وہ بولی۔

اُس کی ماں نے، اسی جھولے میں اسی کروٹ سے لیٹے اُسے دیکھا تھا، جس میں میں نے سے بڑھاپے کی آخری روشنیوں میں افتادہ پایا، جب میں نے حافظے کے شکستہ آئینے کے اتنے ستتر ٹکڑوں کو باہم پیوست کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس فراموش قصبے کو مراجعت کی۔ پوری روشنی میں وہ بہ زحمت شکلوں کا اندازہ کر پاتی تھی، اور اپنی کنپٹیوں پر چند شفا بخش پتیاں اس انہی سردرد کی وجہ سے رکھے ہوئے تھی جو اس کا بیٹا شب خوابی کے کمرے سے آخری بار گزرتے ہوئے اس کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ اٹھنے کی کوشش میں جھولے کے سرے کی رسیاں اپنی مٹھی میں بکڑے ہوئے، وہ اپنی کروٹ پر تھی، اور آدھے سایوں میں پتیسے کے حوض کی وہی بوجہ جس نے جرم کی صبح مجھے چو لٹا دیا تھا۔

ابھی میں چوکھٹ پر نمودار بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے مجھے ساتیاگو نصر کی یاد سے غلط ملط کر دیا۔ "وہ وہیں کھڑا تھا،" پلاسیڈا لینیرو نے مجھے بتایا، "وہ سفید لٹن کا لباس پہنے تھا جسے اس نے سادہ پانی میں دھویا تھا، کیوں کہ اس کی جلد اتنی حساس تھی کہ کلفت کے شور کی منتہل نہیں ہو سکتی تھی۔" وہ جھولے میں دیر تک بیٹھی کاہو کے بیچ چپا کی رہی، یہاں تک کہ اس کا یہ اشتباہ کہ اس کا بیٹا لوٹ آیا ہے، رفع ہو گیا۔ پھر اس نے آہ بھری: "وہی میری زندگی کا سہارا تھا۔"

میں نے ساتیاگو نصر کو اس کی ماں کے حافظے میں دیکھا۔ گزشتہ جنوری کے آخری ہفتے

میں وہ اکیس سال کا ہو گیا تھا، وہ چھریا اور پریدہ رنگ تھا، اور اس کے عرب پپوٹے او گھنگریا لہنے بال اپنے باپ پر تھے۔ وہ ایک غرض مندی کی شادی کی، جس میں مسرت کا کوئی موقع نہیں آیا، اکلوتی اولاد تھا۔ مگر تین سال پہلے اپنے باپ کی اچانک موت تک، وہ اس کے ساتھ خوش نظر آتا تھا اور اپنی تنہا ماں کے ساتھ ویسا ہی خوش نظر آتا جاری رکھے ہوئے تھا، یہاں تک کہ اس کی موت کا سوموار آگیا۔ اس نے اپنی جبلت اپنی ماں سے پائی تھی۔ اپنے باپ سے اس نے بہت ابتدائی عمر میں آتشیں اسلحے کا چابکدستی سے استعمال، گھوڑوں سے عشق، اور اونچے اڑنے والے شکاری پرندوں پر پوری مہارت حاصل کی تھی، مگر اس نے اپنے باپ سے دلیری اور تدبیر اُرف بزرگ بینی سیکھا تھا۔ وہ آپس میں عربی بولتے تھے، مگر پلاسیدالینیرو کے سامنے نہیں، تاکہ وہ اپنے آپ کو جدا محسوس نہ کرے۔ دونوں باپ پٹے قصبے میں کبھی ہتھیار بند نہیں نظر آئے، اور صرف ایک بار وہ اپنے تربیت کردہ پرندے ایک خصوصی بازار میں شکار کے مظاہرے کے لیے لائے تھے۔ اس کے باپ کی موت نے اسے اپنی تعلیم کو ثانوی اسکول کے خاتمے پر ترک کرنے پر مجبور کر دیا تھا، تاکہ وہ موڑوٹی پرورش گاہ کی ذمہ داری اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر سنبھال سکے۔ اپنے اوصاف میں ساتیاگو نسر خوش و خرم، صلح جو اور کشادہ دل تھا۔

جس دن اسے قتل کیا جانے والا تھا، اس کی ماں نے اسے سفید کپڑوں میں دیکھ کر سوچا کہ وہ اپنے دنوں کے اندازے میں غلطی کر گیا ہے۔ "میں نے اسے یاد دلایا کہ آج سوموار ہے، پلاسیدالینیرو نے مجھے بتایا۔ مگر اس نے اپنی ماں سے وضاحت کی کہ وہ کلیسیائی وضع میں اس لیے ملبوس ہے کہ شاید اسے شپ کی انگشتی کا بوسہ لینے کا موقع مل جائے۔ اس کی ماں نے دل چسپی کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ "وہ تو کشتی سے اترے گا بھی نہیں،" اس نے کہا۔ "وہ لوگوں کا حسب دستور فرض برکتیں دے گا، اور جس راستے سے آیا ہے اس پر لوٹ جائے گا۔ اسے اس قصبے سے نفرت ہے۔"

ساتیاگو نسر جانتا تھا کہ یہ حقیقت ہے، مگر کلیسا کا جاہ و جلال اس کے لیے ایک ناقابل مزاحمت سحر تھا۔ "یہ فلموں کی طرح ہے،" اس نے مجھ سے ایک بار کہا تھا۔ شپ کی آمد سے متعلق واحد شے جس سے اس کی ماں غرض رکھتی تھی، ساتیاگو نسر کا بارش میں بھیگنے سے بچنا تھا، کیوں کہ اس نے اُسے سوتے میں چھینکتے ہوئے سنا تھا۔ اس نے اسے اپنے ساتھ ایک چھتری لے جانے کا مشورہ دیا، مگر وہ الوداع کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔ یہ آخری موقع تھا جب اس کی ماں نے اسے دیکھا۔

وکتوریا گزمان، باورچن، غیر متذبذب تھی کہ اس دن، بلکہ فروری کے پورے مہینے میں

بارش نہیں ہوئی تھی۔ "اس کے برخلاف،" اس نے مجھے بتایا، جب میں اس کی موت سے تھوڑے عرصے پہلے اس سے ملنے گیا، "دھوپ سے برجیز انگٹ سے پہلے ہی تپنے لگی تھی۔" وہ، بانپے ہوئے کتوں کے درمیان، دوپہر کے کھانے کے لیے خرگوشوں کے ٹکڑے کر رہی تھی جب ساتیاگو نصر باورچی خانے میں داخل ہوا۔ "وہ ہمیشہ ایک فاسدرات کے چہرے کے ساتھ اٹھتا تھا،" وکٹوریا گزمان نے کسی تاثر کے بغیر یاد کیا۔ دیوینا فلور، اس کی لڑکی نے، جو بلوغت کو پہنچ رہی تھی، ساتیاگو نصر کو گتے کی شراب ملی کوہستانی کافی کا ایک مگ پیش کیا تاکہ وہ پھللی رات کا بوجہ برداشت کر سکے۔ وسیع و عریض باورچی خانہ، آگ کی سرگوشیوں اور اپنے رین بسیروں میں سوئی ہوئی مرغیوں کے ساتھ، ایک پراسرار فضا رکھتا تھا۔ ساتیاگو نصر نے ایک اور اسپرین لنگی اور خاموشی سے سوچتے ہوئے، اپنی نظریں ان دو عورتوں سے ہٹائے بغیر جو اسٹوپ پر خرگوشوں کے حکم پاک کر رہی تھیں، چھوٹے چھوٹے گھونٹوں کے ساتھ کافی پینے بیٹھ گیا۔ اپنی عمر کے باوجود، وکٹوریا گزمان ابھی تک اچھی ساخت میں تھی۔ لڑکی ابھی ذرا شویدہ سر، اپنے غدد کی سرگرمی سے مست نظر آتی تھی۔ ساتیاگو نصر نے اسے کلائی سے پکڑا جب وہ خالی مگ اس سے لینے آئی۔

"تمہارے بل ٹھکنے کا وقت آ رہا ہے،" اس نے دیوینا فلور سے کہا۔ وکٹوریا گزمان نے اسے خون آلود چھری دکھائی۔

"اے چھوڑ دو،" اس نے ساتیاگو نصر کو سختی سے حکم دیا۔ "جب تک میں زندہ ہوں تم اس چٹنے کی ایک بوند بھی نہیں چکھ سکو گے۔"

وہ ابراہیم نصر کے ہاتھوں اپنے عنفوانِ شباب میں گمراہ ہوئی تھی۔ اُس نے اس کے ساتھ پرورش گاہ کے اصطبلوں میں کئی سال تک درپردہ اختلاط جاری رکھا تھا۔ جب مہر و محبت ختم ہوئی تو وہ وکٹوریا گزمان کو ایک گھریلو خادمہ بنانے کے لیے لے آیا۔ دیوینا فلور، جو کسی بعد کے مرد سے تھی، جانتی تھی کہ وہ ساتیاگو نصر کے دُزدانہ بستر کے لیے مقدر ہے، اور یہ خیال اسے ایک پیش از وقت اذیت میں ڈال دیتا تھا۔ "اُس جیسا آدمی پھر کبھی پیدا نہیں ہوا،" فریہ اور پرمردہ، دوسری یاریوں کے نتیجے میں پیدا ہوئے بچوں میں گھری ہوئی دیوینا فلور نے مجھے بتایا۔ "وہ بالکل اپنے باپ پر پڑا تھا،" وکٹوریا گزمان نے اسے جواب دیا، "لعلتی۔" مگر وہ ساتیاگو نصر کی اس وقت کی دہشت زدگی یاد کرتے ہوئے، جب اس نے خرگوش کی استریوں کو جڑ سے نکال باہر کیا تھا اور اُبلتی ہوئی اوچھڑی کتوں کے آگے پھینک دی تھی، خوف کی لہر سے نہیں بچ سکی۔

"جنگلی مت بنو،" اُس نے کہا تھا، "سمجھ لو کہ یہ ایک انسانی وجود تھا۔" وکٹوریا گزمان کو

تقریباً بیس سال یہ سمجھنے میں لگے کہ بے مدافعت جانوروں کو شکار کرنے کا عادی شخص بھی اچانک ایسی دہشت کا اعتراف کر سکتا تھا۔ "میرے خدا،" اس نے حیرت سے کہا، "یہ سب کچھ کیسا انکشاف تھا۔" مگر اس کے باوجود، جرم کی صبح اس کے پاس اتنے ملتوی شدہ غصے جمع تھے کہ وہ ساتیاگو نصر کے ماتھے کو تلخ کرنے کے لیے کتوں کو دوسرے خرگوشوں کی اسٹریاں کھلاتی چلی گئی۔ وہ اسی عمل میں تھے جب تمام قصبہ اس دُخانی کشتی کے، جس پر بشپ آ رہا تھا، زمین کو کچکپا دینے والے شور سے جاگ اٹھا۔

ان کا گھر ایک سابقہ گودام تھا، جس میں دو مڑتلیں، تختوں کی دیواریں اور ٹین کی نوک دار چھت تھی جس پر گندہ میٹھے گودی کے آخور کی بگھبانی کیا کرتے تھے۔ یہ اُن دنوں میں تعمیر ہوا تھا جب دریا اتنا قابلِ استعمال تھا کہ بہت سے ہجرے، بلکہ چند بڑے جہاز بھی دبانے کی دلدلوں سے سمندر تک اسی راستے سے جاتے تھے۔ ابراہیم نصر جس زمانے میں، خانہ جنگیوں کے خاتمے پر، آخری عربوں کے ساتھ آیا، دریا کی گزرگاہ بدل جانے کی وجہ سے جہاز آنے بند ہو گئے تھے اور گودام متروک ہو چکا تھا۔ ابراہیم نصر نے اسے ارزاں قیمت پر درآمدی اشیاء ذخیرہ کرنے کے خیال سے خریدا تھا، مگر اس نے اس جگہ کا یہ استعمال کبھی نہیں کیا؛ جب وہ شادی کرنے جا رہا تھا، اس نے اسے رہنے کے لیے ایک مکان میں تبدیل کر دیا۔ زمینی منزل پر اس نے ایک بڑا کمرہ بنایا جو ہر طرح کے کام کے لیے تھا اور عقب میں چار جانوروں کا احطبل، نوکروں کی کوٹھریاں اور ایک دہقان باورچی خانہ بنایا جس کی گودی کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں سے پانی کی سرشاری بروقت آتی رہتی تھی۔ واحد شے جو اس نے کمرے میں صحیح و سالم چھوڑی تھی، کسی تباہ شدہ جہاز سے بازیاب ہوا پکڑدار سیرمیسوں کا زینہ تھا۔ اوپر کی منزل پر، جہاں پہلے کسٹم کے دفاتر تھے، اس نے شبِ خوابی کے دو بڑے کمرے، اور پانچ چھوٹے چھوٹے کمرے اُن بہت سے بچوں کے لیے بنائے جو وہ پیدا کرنا چاہتا تھا، اور ایک چوٹی بالکنی بنائی جو چوک میں با دام کے درختوں پر کھلتی تھی، اور جہاں پلاسیدالینیر ومارچ کی سہ پھروں میں اپنے آپ کو تنہائیوں پر دلایا دینے کے لیے میٹھے رہنے والی تھی۔ صدر دروازہ اس نے سامنے کی طرف رکھا تھا اور خراہ کی ہوئی سلاخوں والی دو تمام قد کھڑکیاں بنائی تھیں۔ اس نے گھوڑے کے نکلنے کے قابل، ذرا اونچائی کے ساتھ، ایک عقبی دروازہ بھی بنایا تھا، اور گودی کے پرانے پُل کا ایک حصہ بھی زیرِ استعمال رکھا تھا۔ عقبی دروازہ شروع ہی سے زیادہ مستعمل تھا، نہ صرف اس بنا پر کہ یہ جانوروں کی تاندوں اور باورچی خانے کے لیے قدرتی داخلہ تھا، بلکہ اس لیے بھی کہ یہ چوک کا پکڑ لگائے بغیر گودی کو جانے والی سڑک پر کھلتا تھا۔ سامنے کا دروازہ، تقریباً ت کے سوا، بند اور آگلی چڑھا رہتا تھا۔ تاہم

کسی آور دروازے کے بجائے، جو لوگ اسے قتل کرنے جا رہے تھے، اسی پر ساتیاگو نصر کا انتظار کر رہے تھے، اور وہیں سے ساتیاگو نصر بٹپ کا خیر مقدم کرنے باہر نکلا، حالانکہ اس طرح اسے گودی تک پہنچنے کے لیے گھر کے گرد پورا پکر لگا نا پڑا تھا۔

کوئی بھی اس مملکت اتفاق کو نہیں سمجھ سکا۔ تفتیشی جج نے، جو ریو پاجا سے آیا تھا، تسلیم کرنے کی جرأت کیے بغیر اسے ضرور محسوس کیا ہوگا، کیوں کہ اس کی معتدل وضاحت پیش کرنے میں اس کی دل چسپی رپورٹ سے عیاں تھی۔ چوک کی طرف کھلنے والے دروازے کا، چوٹی والے ٹاولوں کے سے "تھوئی دروازے" کے نام سے، کئی بار تذکرہ آیا۔ اصل میں صرف پلاسیدالینیرو کی تشریح قابل قبول معلوم ہوتی تھی، جس نے اس سوال کا مادرانہ حکمت سے جواب دیا تھا، "میرا بیٹا جب اچھا لباس پہنے ہوتا، کبھی عتبی دروازہ استعمال نہیں کرتا تھا۔" یہ ایک ایسی سامنے کی بات محسوس ہوتی کہ تفتیش کرنے والے نے اسے حاشیے کے طور پر درج کیا اور رپورٹ میں شامل نہیں کیا۔

وکتوریا گزمان، اپنے طور پر، جواب میں قطعی تھی کہ نہ وہ اور نہ اس کی بیٹی یہ جانتی تھی کہ وہ ساتیاگو نصر کو قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر اپنی عمر کے ایک دور میں اس نے اعتراف کیا کہ جس وقت ساتیاگو نصر باورچی خانے میں کافی پینے آیا تھا، وہ دونوں اس بات سے واقف ہو چکی تھیں۔ یہ اطلاع انھیں ایک عورت سے ملی تھی جو پانچ بچے تھوڑا سا دودھ مانگنے آئی، اُس نے اس کے ساتھ ساتھ قتل کا سبب، اور وہ جگہ بھی، جہاں وہ انتظار کر رہے تھے، بتادی تھی۔ "میں نے اسے خبردار نہیں کیا، کیوں کہ میں سمجھی کہ یہ بد مستوں کی باتیں ہیں،" اس نے مجھے بتایا۔ تاہم دیوینا فلور نے ایک بعد کی ملاقات میں، جب اس کی ماں کو گزرے ہوئے مدت ہو چکی تھی، مجھ سے اعتراف کیا کہ وکتوریا گزمان نے ساتیاگو نصر کو اس لیے کچھ نہیں بتایا تھا کہ اپنے دل کی گھرائیوں میں وہ چاہتی تھی کہ وہ قتل کر دیا جائے۔ اور خود اس نے ساتیاگو نصر کو اس لیے متنبہ نہیں کیا کہ اس وقت وہ، خود منتارنا فیصلہ کرنے کی المیت سے عاری، ایک سہمی ہوئی بچی سے زیادہ نہیں تھی، اور، سب سے بڑھ کر، اس پر خوف غالب آ گیا جب ساتیاگو نصر نے اس کی کٹائی ایک ایسے سچ اور سنگدلانہ بات سے پکڑ لی جو اسے کسی مرے ہوئے آدمی کا باتھ محسوس ہوا تھا۔

ساتیاگو نصر سایہ دار گھر سے، بٹپ کی کشتی سے اٹھتے ہوئے شادمانی کے شور میں تیز قدم نکلا۔ دیوینا فلور، اس کوشش میں کہ کہیں وہ کھانے کے کمرے میں خوابیدہ پرندوں کے پنجروں کے درمیان، یا تخت کے کمرے میں بید کے فرنیچر اور قرآن کے آویزاں گھلوں تک، اس سے

پہلے نہ پہنچ جائے، اس سے آگے بھاگی، مگر آگلی اتارتے ہوئے اس بار وہ سٹاک شکرے کے جھجے سے نہیں بچ سکی۔ "اس نے میری سموچی فرج دیوچ لی تھی،" دیورنا فلور نے مجھے بتایا۔ "جب وہ مجھے گھر کے کسی کونے میں پکڑ لیتا، ہمیشہ یہی کیا کرتا تھا، مگر اس دن میں نے غیر معمولی حیرت نہیں بلکہ رو پڑنے کی ایک شدید طلب محسوس کی۔" وہ ہٹ گئی تاکہ ساتیاگو نصر باہر نکل جائے، نیم وادروازے سے اس نے صبح کی برف سی روشنی میں چوک کے بادام کے درختوں کو دیکھا، مگر اس میں کسی اور چیز کو دیکھنے کی جرأت نہیں تھی۔ "پھر کشتی نے ٹرم ٹرم کرنا بند کر دیا اور مرغلوں نے بانگیں دہنی شروع کیں،" دیورنا فلور نے مجھے بتایا۔ "ہنگامہ اتنا تھا کہ مجھے یقین کرنا مشکل تھا کہ قصبے میں اتنے مرغے ہو سکتے ہیں، اور میں نے سمجھا کہ وہ ہشپ کی کشتی پر آ رہے ہیں۔" اس آدمی کے لیے جو کبھی اس کا نہیں تھا، وہ صرف اتنا کر سکتی تھی کہ دروازہ، پلاسیدالینیرو کے احکام کے خلاف، اس کی ہنگامی واپسی کے لیے آگلی چڑھائے بغیر رہنے دیتی۔ کسی نے، جس کی کبھی شناخت نہیں ہو سکی، ایک لٹافہ دروازے کے اندر ڈال دیا تھا، جس میں کاغذ کے ایک پرزے پر ساتیاگو نصر کو خبردار کیا گیا تھا کہ وہ اسے قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں، اور اس تحریر میں مقام، محرک، اور منصوبے کی دیگر تفصیلات کا بے کم وکاست انکشاف تھا۔ پیغام فرش پر تھا جب ساتیاگو نصر اپنے گھر سے نکلا، مگر اس پر اس کی نظر نہیں پڑی۔ دیورنا فلور، یا اور کسی نے بھی، اسے بہت بعد میں دیکھا، جب جرم پایہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

چھ بجے تھے اور سڑک پر بتیاں ابھی تک جل رہی تھیں۔ بادام کے درختوں کی شاخوں اور چند بالکنیوں میں عروسی آرائشیں بنوز آویزاں تھیں اور یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ وہ ہشپ کے اعزاز میں لگائی گئی ہیں، اور بیرونی زینوں تک، جہاں بینڈ اسٹینڈ تھا، سنگ فرش کیا ہوا چوک خالی بوتلوں اور عوامی جشن کے ہر نوع کے ملے کی وجہ سے بے ترتیبی کا انبار نظر آ رہا تھا۔ جب ساتیاگو نصر گھر سے نکلا، کسی آدمی کشتی کے شور سے سرعت پذیر ہو کر گودی کی طرف بھاگ رہے تھے۔

صرف اس مقام پر، جہاں چوک میں کلیسا کی ایک طرف دودھ کی دکان تھی، دو آدمی تھے جو ساتیاگو نصر کا اسے قتل کرنے کے لیے انتظار کر رہے تھے۔ کلو تیلدے آرمستا، دکان کی مالکہ، طلوع آفتاب کی متمہاٹ میں اسے دیکھنے والی پہلی بستی تھی، اور اس کو یہ خیال سا آیا کہ ساتیاگو نصر المونیم کے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ "وہ قتل ہونے سے پہلے ہی کسی روح کی طرح نظر آ رہا تھا،" کلو تیلدے آرمستا نے مجھے بتایا۔ وہ لوگ جو اسے قتل کرنے جا رہے تھے، اخبار

ہیں لپٹے ہوئے بچروں کو اپنے سینے سے جکڑے، بچوں پر سوتے ہوئے تھے، اور کلوتیلڈے آرمینٹا کی نیند ٹوٹ جانے کے خوف سے اپنی سانس روکے ہوئے تھی۔

وہ دونوں جڑواں تھے، پیدرو اور پابلو ویکاریو۔ وہ چوبیس سال کے تھے، اور اس حد تک اہل کہ انہیں الگ الگ شناخت کرنا دشوار تھا۔ "ان کے چہرے کے نقوش تیکھے مگر خوشگوار تھے،" رپورٹ میں لکھا تھا۔ میں نے بھی، جو انہیں گرامر اسکول سے جانتا تھا، یہی لکھا ہوتا۔ وہ اس وقت بھی رات کی عروسی تقریب کے سیاہ سوٹوں میں تھے جو کریسمس کے لیے بہت بو جھل رہے تھے، اور وہ عیش و عشرت کی اتنی ساعتوں کے بعد، فرض سمجھ کر شیوہ بتا لینے پر بھی، باہر نکلتے تھے۔ اگرچہ انہوں نے شادی کی شام سے شراب نوشی جاری رکھی تھی، مگر دوسرے دن کے اختتام پر وہ تھکے تھے، نیند میں نہیں تھے، بلکہ کسی حد تک اُجڑی ہوئی نیند کے ساتھ وابہ میں چلتے نظر آ رہے تھے۔ کلوتیلڈے آرمینٹا کی دکان پر تین گھنٹے کے انتظار کے بعد، وہ صبح کی باد آؤکیں کے ساتھ سو گئے، اور یہ پہلی نیند تھی جو جمعے کے دن سے انہیں نصیب ہوئی۔ شتی کی پہلی آواز پر وہ بہ مشکل جاگے تھے، مگر جب ساتیاگو نسر اپنے گھر سے نکلا، وجدان نے انہیں مکمل بیدار کر دیا۔ اس وقت ان دونوں نے مڑے ہوئے اخبار کو سنبھالا، اور پیدرو ویکاریو خراب ہونے لگا۔

"خدا کے لیے،" کلوتیلڈے آرمینٹا نے بہت آہستہ سے کہا، "اے کسی اور وقت پر چھوڑ دو، حضور بپ کے احترام میں سی۔"

"یہ روح القدس کا ایک نفس تھا،" وہ اکثر دہرایا کرتی۔ بے شک یہ ایک امرِ ربانی تھا، مگر اس کی تاثیر صرف لمحات تھی۔

اس کی آہٹ سنتے ہی ویکاریو بھائیوں نے ردِ عمل کیا، اور وہ جو کھڑا ہو چکا تھا، پھر سے بیٹھ گیا۔ دونوں نے ساتیاگو نسر کا، جب وہ چوک کو طے کر رہا تھا، اپنی نگاہوں سے تعاقب کیا۔ "انہوں نے اے تاسف سے زیادہ دیکھا،" کلوتیلڈے آرمینٹا نے کہا۔ رامباؤں کے اسکول کی لڑکیوں نے اپنی یتیموں کی وردی میں چوک کو اسی لمحے بے نظمی سے آہستہ دوڑ کر پار کیا۔

پلاسیدا لینیرو کی بات درست تھی؛ بپ کشتی سے نہیں اترے۔ گودی پر حکام اور اسکول کے بچوں کے علاوہ بہت سے لوگ آئے تھے، ہر طرف خوب بھولے ہوئے مرغوں کے ٹوکے نظر آ رہے تھے جو بپ کے لیے تحفے کے طور پر لائے گئے تھے، کیوں کہ مرغ کی کلنیوں کا سوپ اس کی مرغوب خوراک تھی۔ بار کرنے کے پُل پر اتنی سوختنی لکڑیاں جمع تھیں کہ کشتی میں انہیں بھرنے کے لیے کم از کم دو گھنٹے درکار ہوتے۔ مگر وہ رکی نہیں۔ وہ دریا کے موڑ پر ایک

اڑدے کی طرح تھنے پھلائی نمودار ہوئی، موسیقاروں کے بینڈ نے ہشپ کا ترانہ شروع کیا، اور مرغوں نے اپنی ٹوکریوں میں باگلیں دے دے کر قصبے کے دوسرے سارے مرغوں کو براگینتہ کر دیا۔

اُن دنوں افسانہ آمیز پیڈل وھیلر، جو لکڑیوں کے جلنے سے چلتی تھیں، معدوم ہونے کے قریب تھیں، اور جو خدمت میں باقی رہ گئی تھیں، ان میں خود نواز پیا نوا عروسی خاص کمرے نہیں تھے اور وہ یہ مشکل بہاؤ کے خلاف سفر کی اہل تھیں۔ مگر یہ کشتی نئی تھی اور اس میں ایک کے بجائے دو چنیاں تھیں جن پر آرم بینڈوں کی طرح پرچم رنگے گئے تھے، اور پشت پر تختوں سے بنے ہوئے پیسے نے اے ایک بحری جہاز کی سی کارکردگی عطا کر دی تھی۔ بالائی عرشے پر، کپتان کے کیبن سے متصل، ہشپ اپنی سفید عبا اور اپنے اسپانوی خدم و حشم کے ساتھ موجود تھا۔ "یہ کرسس کا زمانہ تھا،" میری بہن مارگوت نے کہا۔ اس کے بقول ہوا یہ کہ گودی سے گزرتے ہوئے، کشتی کی سیٹی نے دبی ہوئی بھاپ کی ایک بوچھاڑ ماری اور جو لوگ کنارے کے قریب تھے، انہیں شرابور کر دیا۔ یہ ایک بے ثبات فریب نظر تھا۔ ہشپ نے گودی کے پل پر جمع ہجوم کے مقابل، ہوامیں صلیب کا نشان بنا تا شروع کیا اور اس کے بعد کسی خیر و شر کے بغیر کٹھ پتلی کی طرح ایسا کرتا چلا گیا، یہاں تک کہ کشتی ٹکابوں سے اوجھل ہو گئی، اور جو کچھ بچ باوہ مرغوں کا شور تھا۔

ساتیاگو نصر کے لیے خود کو فریب خوردہ محسوس کرنے کی معقول وجہ تھی۔ اس نے قادر کارمین آمادور کی صلاحیت نام پر لکڑیوں کے کئی گٹھر نذر کیے تھے، اور اس کے علاوہ اس نے خود نہایت اشتہار انگیز کلفیوں والے فریب آختہ مرغوں کا انتخاب کیا تھا۔ میری بہن مارگوت کو، جو گودی کے پل پر ساتیاگو نصر کے ساتھ تھی، وہ جشن کو جاری رکھنے کی خواہش کے ساتھ خوش نظر آیا تھا، ہر چند کہ دراصل اسپرین نے اسے تسکین نہیں دی تھی۔ "وہ پڑمردہ نہیں نظر آ رہا تھا، اور صرف یہ سوچ رہا تھا کہ شادی کی تقریب پر کیا خرچ ہوا ہو گا،" اس نے مجھے بتایا۔ کرسٹو بیدویا نے، جو اُن کے ساتھ تھا، ایسی رقموں کا انکشاف کیا جن سے اس کی حیرت آور بڑھ گئی۔ وہ میرے اور ساتیاگو نصر کے ساتھ چار سبجے سے ذرا پہلے تک کھل کر شراب پیتا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ شب بھری کے لیے اپنے والدین کے پاس نہیں گیا، بلکہ اس نے اپنے دادا کے ہاں محفل جمائی۔ وہاں اسے ان اعداد کا سراغ ملا جو تقریب کے اخراجات کا اندازہ لگانے کے لیے درکار تھے۔ اس نے شمار کیا کہ مہمانوں کے لیے چالیں ترکی مرغیاں اور گیارہ خضبی سورج کیے گئے تھے، اور چار پھڑے بھی، جو نوٹے نے عوامی چوک پر لوگوں کی تواضع میں بھونے جانے کے

لیے مخصوص کیے تھے۔ اس نے شمار کیا کہ غیر قانونی طور پر درآمد کردہ الکحل کے ۲۰۵ صندوق خالی ہوئے تھے اور گتے کی شراب کی تقریباً دو ہزار بوتلیں بجوم میں بانٹی گئی تھیں۔ امیر و غریب، ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس نے کسی نہ کسی طرح اس بے نظیر پرووق ضیافت میں شرکت نہ کی ہو۔ ساتیاگو نسر بہ آواز بلند خواب دیکھنے لگا۔

"میری بھی شادی اسی طرح ہوگی،" اس نے کہا۔ "لوگوں کی زندگیاں اسے بیان کرنے میں ناکافی پڑ جائیں گی۔"

میری بہن نے فرشتے کو پاس سے گزرتے ہوئے محسوس کیا؛ اس نے ایک بار پھر فلورا میگل کی خوش نصیبی کے بارے میں سوچا، جسے زندگی میں اتنا کچھ حاصل تھا اور جو ساتیاگو نسر کو بھی اس سال کرسمس میں حاصل کرنے جا رہی تھی۔ "مجھے اچانک خیال آیا کہ اس سے بہتر شکار نہیں مل سکتا تھا،" اس نے مجھے بتایا۔ "ذرا سوچو: خوش شکل، وعدہ وفا، اور اکیس سال کی عمر میں ذاتی جائیداد کا مالک۔" جب ہمارے یہاں کساوا کے کلوچے بنے ہوتے، وہ اسے ہمارے گھر پر ناشتے کے لیے بلایا کرتی تھی، اور اُس صبح میری ماں وہی تیار کر رہی تھی۔ ساتیاگو نسر نے اشتیاق کے ساتھ اس کی دعوت قبول کی۔

"میں کپڑے بدل کر تمہارے باں آتا ہوں،" اس نے کہا، اور پھر اسے خیال آیا کہ وہ اپنی گھرٹی نائٹ ٹیبل پر چھوڑ آیا ہے۔ "کیا وقت ہوا ہوگا؟"

اُس وقت چھبج کر پچیس ہوئے تھے۔ ساتیاگو نسر نے کرسٹو بیدویا کو بازو سے پکڑا اور چوک کی طرف لے جانے لگا۔

"میں پندرہ منٹ کے اندر تمہارے گھر پر ہوں گا،" اس نے میری بہن سے کہا۔

میری بہن نے ضد کی کہ وہ اسی وقت ساتھ چلے، کیوں کہ ناشتہ تیار ہو چکا تھا۔ "یہ عجیب اصرار تھا،" کرسٹو بیدویا نے مجھے بتایا۔ "یہاں تک کہ بعد میں کئی بار مجھے گمان ہوا کہ مارگوت جانتی تھی کہ وہ اسے قتل کرنا چاہتے ہیں، اور وہ اسے تمہارے گھر میں چھپا لینا چاہتی تھی۔" ساتیاگو نسر نے بہر حال اسے رضامند کر لیا۔ وہ اتنی دیر میں ڈیوائن فیس پر پچھڑوں کو خفی کرنے کے لیے جانے کو گھر ٹھواری کا لباس پہننا چاہتا تھا۔ اس نے میری بہن سے اسی موع میں اجازت لی جس میں اس نے اپنی ماں کو الوداع کہا تھا، اور کرسٹو بیدویا کے ہم دوش چوک کی طرف بڑھ گیا۔ یہ آخری موقع تھا کہ میری بہن نے اس کو دیکھا۔

گودی میں کئی لوگ جاتے تھے کہ ساتیاگو نسر کو قتل کیا جانے والا ہے۔ دون گزارو آپوتے نے، جو اکادمی کرنل کی حیثیت سے سبک دوشی کا لطف اٹھانے کے ساتھ ساتھ گیارہ

سال سے قصبے کا میئر بھی تھا، اسے ہاتھ لہرا کر خوش آمدید کہا۔ "میں نے واقعی یقین کر لیا تھا کہ اب وہ کسی خطرے کی زد میں نہیں ہے،" اس نے مجھے بتایا۔ فادر کارمین امدادور بھی پریشان نہیں تھا۔ "جب میں نے اسے یہ حفاظت دیکھا، میں نے سمجھا کہ سب کچھ ایک بے ضرر افواہ تھی،" اس نے مجھے بتایا۔ کسی نے بھی یہ نہیں پوچھا کہ کیا سالتیاگو نصر کو متنبہ کر دیا گیا ہے، کیوں کہ یہ ناممکن معلوم ہوتا تھا کہ اسے خبر نہ پہنچائی گئی ہو۔

میری بہن مارگوت، سچ مچ اُن چند لوگوں میں سے تھی جو اس وقت تک نہیں جانتے تھے کہ وہ اسے قتل کرنے جا رہے ہیں۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا، میں اسے گھر لے جاتی، چاہے مجھے اس کو سڑک کی طرح باندھ کر لے جانا پڑتا،" اس نے تفتیشی افسر کو بیان دیا۔ یہ حیرت کی بات تھی کہ اسے معلوم نہیں تھا، مگر اس سے بھی زیادہ تعجب اس پر تھا کہ میری ماں بھی نہیں جانتی تھی جو بر بات کو گھر کے کسی اور فرد سے پہلے جان جاتی تھی، اس کے باوجود کہ اسے کلیسا کے اجتماع کے لیے بھی گھر سے باہر نکلے برسوں گزر چکے تھے۔ میں اس کی اس صلاحیت سے اس وقت آگاہ ہوا تھا جب میں نے اسکول جانے کے لیے جلد اٹھنا شروع کیا۔ صبح کی خاکستری روشنی میں، زرد اور پراسرار، جیسی کہ وہ اُن دنوں ہوا کرتی تھی، صحن کو ایک خانہ ساز جھاڑو سے صاف کرتے ہوئے، اور کافی کے گھونٹوں کے درمیان وہ ہمیں بتانا شروع کرتی کہ دنیا میں کیا ہوا جب ہم سو رہے تھے۔ وہ قصبے کے اندر لوگوں، خاص طور پر اپنے ہم عمروں سے خبر سنانی کے خفیہ سلسلے بتاتے ہوئے معلوم ہوتی تھی، اور کبھی کبھی وہ ہمیں ان واقعوں کی اطلاع سے حیرت زدہ کر دیتی جو اس وقت تک پیش نہیں آئے تھے اور جنہیں وہ صرف اپنی غیب دانی کی استطاعت ہی سے جان سکتی تھی۔ اس صبح مگر اس نے اُس سانحے کی دھڑکن نہیں سنی جو رات کو تین بجے سے پرورش پا رہا تھا۔ اس نے صحن میں جھاڑو دینا ختم کیا تھا، اور جب میری بہن مارگوت ہشپ کا استقبال کرنے باہر نکلی، اس نے اُسے کساوا پیستے ہوئے دیکھا۔ "مرغوں کی ہانگیں سنی جا سکتی تھیں،" میری ماں اُس دن کو یاد کرتے ہوئے کھنسنے کی عادی ہے۔ اس نے کبھی دور سے آتی ہوئی ان آوازوں کو ہشپ کی آمد سے منسوب نہیں کیا، وہ انہیں شادی کے جشن کی باقیات سمجھتی رہی۔

ہمارا گھر خاص چوک سے کچھ فاصلے پر دریا کے کنارے آموں کے باغ میں تھا۔ میری بہن مارگوت گودی تک دریا کے کنارے کنارے چلتی ہوئی گئی تھی، اور لوگ ہشپ کی آمد پر اتنے پرجوش تھے کہ وہ کسی اور بات پر توجہ نہیں دے سکے۔ انہوں نے بیماروں کو خدا سے شفا حاصل کرنے کے لیے عمر بانی دروازوں میں کھڑا کیا تھا، اور عورتیں اپنے آنکھوں سے ٹرکی مرغ اور شیر خوار سڑ اور ہر طرح کی خوردنی اشیاء لیے دوڑی چلی آ رہی تھیں، اور دوسرے کنارے سے پھولوں

سے سبے ڈونگے پہنچ رہے تھے۔ مگر جب بپ زمین پر قدم رکھے بغیر چلا گیا، دوسری دہائی میں خبر سنسنی خیزی کے درجہ کمال کو پہنچ گئی۔ تب میری بہن مارگوت نے اس کے بارے میں مفصل اور سفاک انداز میں جانا۔ انجلا ویکاریو، وہ خوش شکل لڑکی جو ایک دن پہلے بیابانی گئی تھی، اپنے والدین کے گھر لوٹا دی گئی تھی، کیوں کہ اس کے شوہر نے دریافت کیا تھا کہ وہ کمزاری نہیں ہے۔ "مجھے ایسا لگا کہ میں مرنے والی ہوں،" میری بہن نے کہا۔ مگر جو بھی ہو، انہوں نے اس داستان کو جتنا اٹا پلٹا، کوئی مجھے یہ نہیں بتا سکا کہ غریب ساتیاگو نسر کس طرح اس بکھیرے میں پڑ کر اپنی جان سے گیا۔ صرف ایک بات جو سب قطعی طور پر جانتے تھے، یہ تھی کہ انجلا ویکاریو کے بجائے اے قتل کرنے کے لیے اس کا استعارہ کر رہے ہیں۔

میری بہن اپنے آنورو کے کی کوشش کرتی ہوئی گھر واپس آئی۔ اس نے میری ماں کو اتوار کے نیلے پھولوں والے کرتے میں، کہ کہیں بپ ہم سے ملنے آجی جائے، ملبوس دیکھا، وہ میز لگاتے ہوئے غیر مرنی محبت کے بارے میں ایک فادو گارہی تھی۔ میری بہن نے غور کیا کہ معمول سے ایک پلیٹ زیادہ ہے۔

"یہ ساتیاگو نسر کے لیے ہے،" میری ماں نے کہا۔ "انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم نے اے ناشتے پر بلایا ہے۔"

"اے بٹالیں،" میری بہن نے کہا۔

پھر اس نے میری ماں کو بتایا۔ "مگر ایسا لگتا تھا کہ اے پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے،" اس نے مجھے بتایا۔ "یہ ہمیشہ کی طرح تھا، آپ اے کچھ بتانا شروع کریں اور اس سے پہلے کہ کہانی آدھی بھی ہو، وہ جان جائے گی کہ آخر میں کیا ہوا۔" وہ بُری خبر میری ماں کے لیے ایک مسئلہ بن گئی۔ پتسمہ دیتے وقت ساتیاگو نسر کا نام اس کے نام پر رکھا گیا تھا اور وہ اس کی دینی ماں تھی، مگر وہ پُورا ویکاریو، واپس کی گئی دلہن کی ماں، کی بھی قرابت دار تھی۔ اس کے باوجود، خبر سنتے ہی میری ماں نے اونچی ایڑی کے جوتے پہنے اور کلیسیائی شال اور ڈھی جو وہ صرف عزاداری کے لیے نکلتے وقت اور ڈھتی تھی۔ میرا باپ، جس نے بستر سے ہر بات سن لی تھی، شب خوابی کے لباس میں نمودار ہوا اور متوحش ہو کر پوچھنے لگا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ "اپنی عزیز دوست پلاسید کو اطلاع دینے،" اس نے جواب دیا۔ "یہ نامناسب ہے کہ بر آدمی جان لے کہ وہ اس کے بیٹے کو قتل کرنے جا رہے ہیں، اور ماں جو کہ اے معلوم ہی نہ ہو۔"

"ہمارے ویکاریو سے بھی برابر کے تعلقات ہیں،" میرے باپ نے کہا۔

"آدمی کو ہمیشہ مرنے والوں کا ساتھ دینا چاہیے،" اس نے کہا۔

میرے چھوٹے بھائی شب خوابی کے دوسرے کمروں سے نکل کر آنے لگے۔ سب سے چھوٹے نے ایسے کی فضا سے متاثر ہو کر روتا شروع کر دیا۔ میری ماں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی؛ زندگی میں ایک بار اس نے اپنے شوہر کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دی۔

"ایک منٹ رکھو، میں کپڑے بدل لوں،" میرے باپ نے کہا۔

وہ سرک پر نکل آئی؛ صرف میرا بھائی جیسے، جو اس وقت سات برس سے زیادہ کا نہیں ہو گا، اسکول جانے کے لیے کپڑے بدل چکا تھا۔

"تم اس کے ساتھ جاؤ،" میرے باپ نے حکم دیا۔

جیسے اس کے چچھے بھاگا، یہ جانے بغیر کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور وہ کہاں جا رہی ہے، اور ماں کا ہاتھ تھام لیا۔ "وہ اپنے آپ سے باتیں کرتی جا رہی تھی،" جیسے نے مجھے بتایا۔ "بدمعاش،" وہ زیر لب کہہ رہی تھی، "یہ گندے جانور کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس میں کچھ نہ کچھ شرارت نہ ہو۔" اسے یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ وہ بچے کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے۔ "انہوں نے ضرور سوچا ہو گا کہ میں پاگل ہو گئی ہوں،" اس نے مجھے بتایا۔ "ایک جی بات یاد ہے کہ دور سے بہت سے لوگوں کی آوازیں آرہی تھیں، جیسے شادی کی تقریب پھر سے شروع ہو گئی ہو، اور ہر کوئی چوک کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔" اُس نے اپنے قدم تیز کر دیے، ایک عزم کے ساتھ جس کی، جب کسی کی زندگی خطرے میں ہو، وہ اہل تھی، یہاں تک مخالف سمت سے آتے ہوئے کسی آدمی نے اس کی دیوانگی پر ترس نہ کھایا۔

"زحمت مت کرو، لونیزا ساتیاگا،" وہ گزرتے ہوئے چلتا یا، "انہوں نے اُسے قتل کر دیا ہے۔"

بیاردو سان رومان، وہ آدمی جس نے دلہن لوثائی، پہلی بار گزشتہ اگست میں، شادی سے چھ مہینے پہلے یہاں آیا تھا۔ وہ ہفتہ وار کشتی پر چاندی سے جڑی چند خور جینیں لیے ہوئے اترا جو اس کی بیلٹ کے بکسوں اور اس کے جوتے کے چنلوں سے سیل کھاربی تھیں۔ وہ تقریباً تیس برس کا تھا، مگر اس کی نوآموز بل فاسٹر کی سی کمر، سنہری آنکھوں، اور قلبی شور سے رفتہ رفتہ جلی ہوئی جلد نے اس کی عمر کو خوش اسلوبی سے چھپا رکھا تھا۔ وہ ایک چھوٹی جیکٹ اور بہت تنگ پتلون پہنے ہوئے آیا، دونوں پچھڑے کی کھال۔ کے نرم چمڑے سے بنے تھے، اور اُس نے اسی رنگ کی میسے کی کھال کا دستانہ پہن رکھا تھا۔ ماگدالینا اولیور، جو کشتی میں اس کے ساتھ تھی، سارے سفر میں اس پر سے ٹکائیں نہیں بٹا سکی۔ "وہ ایک پرمی زاد کی طرح نظر آ رہا تھا،" اس نے مجھے بتایا، "اور اس پر افسوس کیا جانا چاہیے، کیوں کہ میں کھن لگا اسے جٹ کر سکتی تھی۔" اکیلی وہ ایسا سوچنے والی نہیں تھی، نہ یہ محسوس کرنے میں سب سے پہلے، کہ بیاردو سان رومان پہلی نظر پر کھل جانے والا آدمی نہیں ہے۔

میری ماں نے مجھے اسکول میں اگست کے اختتام کے قریب ایک خط بھیجا اور بلا مقصد انداز

میں لکھا: "ایک بہت عجیب آدمی یہاں آیا ہوا ہے۔" اس کے بعد کے خط میں اس نے مجھے لکھا: "اس عجیب آدمی کا نام بیاردو سان رومان ہے اور ہر شخص کہتا ہے کہ وہ پُرکشش ہے، مگر میں نے اسے خود ابھی نہیں دیکھا ہے۔" کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیوں آیا ہے۔ کچھ لوگوں کو، جو پوچھنے کی ترغیب سے خود کو نہیں روک سکے تھے، جواب ملا: "میں کسی کی تلاش میں، جس سے شادی کر سکوں، شہر در شہر گھوم رہا ہوں۔" یہ درست بھی ہو سکتا تھا، مگر وہ کسی اور سوال کا جواب بھی اسی انداز میں دے سکتا تھا، کیوں کہ اس کا طرز گفتگو انکشاف کی نسبت اخفا میں زیادہ معاون تھا۔

جس رات وہ آیا، اس نے لوگوں کو یہ باور کرایا کہ وہ ریل کی پٹریوں کا انجینئر ہے، اور اندرونی علاقوں میں ریل کی پٹری بچانے کی سخت اہمیت کے بارے میں بتایا جس کے بعد ہم لوگ دریا کے آئے دن متغیر ہونے والے راستوں سے بے نیاز ہو جاتے۔ اس کے بعد والے دن اسے ایک ٹیلیگرام بھیجا تھا، اور اس نے اسے بیرم پر خود روانہ کیا، اور اس کے ساتھ ہی اس نے ٹیلیگراف کے کارندے کو اپنا نسخہ بتایا جس کی مدد سے وہ خستہ بیٹریوں کا استعمال جاری رکھ سکتا تھا۔ اُسی دن اس نے کسی سرحدی بیماری کا ملٹری ڈاکٹر سے ذکر کیا جو جبری بھرتی کے تحت اُن مہینوں میں وہاں آیا ہوا تھا۔ اسے بُر شور اور دیر تک جاری رکھنے والی خوش وقتیاں پسند تھیں، مگر وہ بہترین بلا نوش، تنازعوں کا ثالث اور پشے بازوں کا دشمن تھا۔ ایک اتوار، عبادت کے بعد اس نے سب مشاق پیرا کوں کو، جو بہت سے تھے، مقابلے کی دعوت دی، اور اول ترین کو دریا کے پار جانے اور لوٹنے میں بیس باتھ پیچھے چھوڑ دیا۔ میری ماں نے اس کے متعلق مجھے ایک خط میں بتایا، اور آخر میں اس نے ایک تبصرہ کیا جو اُسی کا حق تھا: "یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سوئے میں غیر رہا ہے۔" یہ اس قبل از وقت روایت کے جواب میں تھا کہ بیاردو سان رومان نہ صرف ہر کام با کمال طریقے سے کرنے کا اہل ہے، بلکہ اس کی رسائی کبھی نہ ختم ہونے والے خزانوں تک ہے۔

میرے ماں کی طرف سے اُس کے حق میں آخری حرف خیر اکتوبر کے ایک خط میں تھا۔ "لوگ اسے بہت زیادہ چاہتے ہیں،" اس نے مجھے لکھا، "کیوں کہ وہ دیانت دار اور دل کا اچھا ہے؛ اور گزشتہ اتوار اس نے عشائے ربانی دوراناہو کر وصول کیا اور دعا پڑھنے والوں کی لاطینی میں مدد کی۔" اس زمانے میں عشائے ربانی کو کھڑے ہو کر وصول کرنے کی اجازت نہیں تھی، اور ہر دعا لاطینی میں جوتی تھی، مگر میری ماں اس طرح کی تفصیلات کو، جب وہ معاملے کی تہ کو پہنچنا چاہتی ہو، یاد رکھنے کی عادی ہے۔ پھر بھی، اس مقدس فتوے کے بعد، اس نے مجھے دو خط بھیجے جن میں بیاردو سان رومان کا تذکرہ نہیں تھا؛ اس وقت بھی نہیں جب یہ اچھی طرح آشکار ہو گیا تھا کہ وہ انجلا ویکاریو کا خواستگار ہے۔ صرف اس سیاہ بخت شادی کے بہت عرصے بعد اس نے مجھ سے اعتراف کیا کہ وہ بیاردو

سان رومان کو سمجھ گئی تھی، مگر اس وقت تک اکتوبر کے خط کو درست کرنا بے معنی تھا، اور یہ کہ اس کی سنہری آنکھیں میری ماں کو ہر سال کر دیتی تھیں۔

"وہ مجھے ابلیس کی طرح لگتا تھا،" اس نے مجھے بتایا، "مگر تم نے خود ہی مجھ سے کہا تھا کہ اس نمونے کی باتیں تحریر میں نہیں آنی چاہئیں۔"

میں بیاردو سان رومان سے، اپنی ماں کی اس سے ملاقات کے تھوڑے دنوں بعد، کرسمس کی چھٹیوں میں گھر آنے پر ملا، اور میں نے اسے اتنا ہی عجیب پایا جتنا کہ کہا جاتا تھا۔ بے شک وہ پُرکش نظر آتا تھا، مگر ماگدالینا اولیور کے سادہ و دلکش تصور سے بہت دور۔ مجھے اُس میں اس سے زیادہ سنجیدگی نظر آتی جتنی کہ اس کی بے پروایانہ وضع نشاندہی کر سکتی تھی، اس میں ایک پوشیدہ کش مکش تھی جو اس کے حد سے زیادہ شائستہ اطوار میں بہ زحمت ہی چھپ سکتی تھی۔ مگر ان سب کے باوجود، وہ مجھے ایک بہت غم زدہ آدمی لگا۔ اُس وقت وہ انجلا ویکاریو سے اپنی محبت کے پیمان کا پابند ہو چکا تھا۔

یہ کبھی اچھی طرح ثابت نہیں ہو سکا کہ وہ دونوں کس طرح ملے تھے۔ غیر شادی شدہ افراد کی جس اقامت گاہ میں بیاردو سان رومان فروکش تھا، اس کی مالکہ نے بتایا کہ ستمبر کے آخری دنوں میں کس طرح وہ پارلر میں ایک جھولنے والی کرسی میں جھپکی لے رہا تھا کہ انجلا ویکاریو اور اس کی ماں چوک سے مصنوعی پھولوں کی دو ٹوکریاں لیے ہوئے گزریں۔ بیاردو سان رومان نے نیم بیداری کے عالم میں دونوں خواتین کو، جو دو بجے دوپہر کی اس دلدلی ساعت میں تنہا زندہ مخلوق تھیں، بے رحم سیاہ رنگ میں ملبوس دیکھا، اور سوال کیا کہ نوجوان لڑکی کون ہے۔ اقامت گاہ کی مالکہ نے جواب دیا کہ وہ اپنی ہم راہ عورت کی سب سے چھوٹی بیٹی ہے، اور اس کا نام انجلا ویکاریو ہے۔ بیاردو سان رومان نے اپنی نگاہوں سے اُن کا چوک کے دوسرے سرے تک تعاقب کیا۔

"وہ خوش نام ہے،" اس نے کہا۔

پھر اس نے اپنا سر کرسی پر رکھا اور دوبارہ آنکھیں موند لیں۔

"جب میں اٹھوں،" اس نے کہا، "مجھے یاد دلانا کہ میں اس سے شادی کرنے والا ہوں۔"

انجلا ویکاریو نے مجھے بتایا کہ اقامت گاہ کی مالکہ نے اسے اس ضمنی واقعے کے متعلق اس سے

پہلے بتا دیا تھا، جب بیاردو سان رومان نے اس سے خواستگاری شروع کی۔ اقامت گاہ میں تین افراد نے تصدیق کی کہ یہ واقعہ پیش آیا تھا، مگر دوسرے چار متذبذب تھے۔ ساتھ ہی تمام روایتیں اس امر میں موافقت کرتی تھیں کہ انجلا ویکاریو اور بیاردو سان رومان پہلی بار قومی تعطیل کے دن ایک مینا بازار میں ملے تھے، جہاں وہ گیت گا کر ایک لاٹری فروخت کرنے کی ذمہ دار تھی۔ بیاردو سان

رومان بیٹا بازار میں آیا اور سیدھا اس بُوتہ پر گیا جسے جامہ سوگواروں میں آخری حد تک ملبوس، بے حال، بخت آزمایہ چلا رہی تھی۔ اور اُس نے اس سے صدف کے ایک منقش میوزک بکس کی قیمت دریافت کی، جو میلے کی ایک اہم کشش رہا ہو گا۔ انجلا ویکاریو نے اسے جواب دیا کہ وہ فروخت کے لیے نہیں بلکہ لاٹری کے انعام میں دیے جانے کے لیے ہے۔

"خوب،" اس نے کہا۔ "اس سے تو اس کا ملنا سہل ہو گیا، اور آرزاں بھی۔"

انجلا ویکاریو نے مجھ سے اعتراف کیا کہ وہ اسے متاثر کرنے میں کارگزاری دیکھا گیا تھا، مگر اس کے نتائج محبت کے برخلاف تھے۔ "میں خود پسند مردوں سے متنفر تھی، اور میں نے کبھی اتنا مغرور آدمی نہیں دیکھا تھا،" اس نے مجھ سے اُس دن کو یاد کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے علاوہ میں نے سوچا کہ وہ ایک اُبھرتا ہوئی ہستی ہے۔" میوزک بکس کی لاٹری کے لیے گانا گاتے ہوئے اس کی برافروختگی عروج پر تھی، اور تمام لوگوں کو حیرت ہوئی جب اسے سچ بیاردو سان رومان نے جیت لیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس نے صرف اسے متاثر کرنے کے لیے لاٹری کے تمام ٹکٹ خرید لیے تھے۔

اُس رات، جب وہ گھر لوٹی، انجلا ویکاریو نے اس میوزک بکس کو تحفے کے طور پر عہدگی سے ملفوف اور ایک نازک آرگنڈی بو سے بندھا ہوا پایا۔ "میں کبھی نہیں معلوم کر سکی کہ اس نے کس طرح جانا کہ وہ میری سالگرہ کا دن ہے،" اس نے مجھے بتایا۔ اس کے لیے اپنے والدین کو یقین دلانا دشوار ہو گیا کہ اس نے بیاردو سان رومان کو اس طرح کا تحفہ، اور اس سے بدتر، اتنے اشتیاق انداز میں کہ وہ کسی کی نظر میں آئے بغیر نہ رہ سکے، بھیجنے کے لیے کوئی وجہ فراہم نہیں کی تھی۔ اس لیے اس کے بڑے بھائی، پیدرو اور پابلو، میوزک بکس کو اس کے مالک کو واپس کرنے ہوٹل لے گئے؛ اور انھوں نے یہ کام اتنی عجلت سے کیا کہ کوئی شخص ایسا نہیں تھا جس نے انھیں گھر میں آتے دیکھا ہو اور باہر نکلتے نہ دیکھ پایا ہو۔ چون کہ جس بات کا اس خاندان نے خیال نہیں رکھا تھا وہ بیاردو سان رومان کا ناقابلِ مزاحمت ظلم تھا، جڑواں بھائی دوسرے دن صبح سے پہلے نمودار نہیں ہوئے؛ وہ نشے میں دھت، میوزک بکس کو دوبارہ اٹھائے اور بیاردو سان رومان کو ساتھ لیے گھر پر ہنگامہ جارہی رکھنے کے لیے لوٹ آئے تھے۔

انجلا ویکاریو ایک محدود آمدنی والے گھر کی سب سے چھوٹی لڑکی تھی۔ اس کا باپ پونسو ویکاریو، غریبوں کا سُنا رہا تھا، اور اس نے گھر کی نیک نامی قائم رکھنے کے لیے سونے کا آئینہ باریک کام کرتے ہوئے اپنی بینائی گنوا دی تھی۔ پیورے سیما دیل کارمین، اس کی ماں، ہمیشہ ہمیش کے لیے شادی شدہ ہو جانے سے پہلے، ایک اسکول میں مغلّہ تھی۔ اس کے بُردبار، اور کسی حد تک زخم خوردہ

نظر آنے نے اس کے کردار کے استحکام کو اچھی طرح چھپا لیا تھا۔ "وہ کوئی راہبہ معلوم ہوتی تھی،" مرسیس یاد کرتی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو قربانی کے اتنے شدید جذبے کے ساتھ اپنے شوہر کی اطاعت اور بچوں کی پرورش کے لیے وقف کر دیا تھا کہ کبھی کبھی یہ بھی فراموش ہو جاتا کہ اس کا اپنا بھی کوئی وجود ہے۔ بڑی دو لڑکیاں بہت دیر سے بیاہی گئی تھیں۔ جڑواں بھائیوں کے علاوہ ایک منجلی بھی تھی جو شینہ بخار میں مر گئی تھی، اور وہ لوگ دو سال بعد بھی اُس کے سوگ کو برقرار رکھے ہوئے تھے، جو گھر میں سکون کے ساتھ اور باہر شدت سے منایا جاتا تھا۔ بھائیوں کو مرد بننے کے لیے پالا گیا تھا۔ لڑکیوں کی پرورش بیاہے جانے کے لیے کی گئی تھی۔ انہیں جالی دار کشیدہ کاری، مشین سے سینا، جالار بُننا، کپڑے دھونا اور استری کرنا، مصنوعی پھول اور رنگ برنگی مٹھائیاں بنانا آتا تھا، اور وہ تقریبات کے دعوت نامے لکھ لیتی تھیں۔ اس وقت کی لڑکیوں سے بالکل مختلف، جو موت کی رسموں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھیں، وہ چاروں، بیماروں کے سر ہانے بیٹھنے کے قدیم علم، مرتے ہوؤں کی دبوٹی، اور مرے ہوؤں کو کفن دینے میں تصور سے بڑھ کر باہر تھیں۔ صرف ایک بات جس پر میری ماں انہیں ٹوکتی تھی، ان کا سونے سے پہلے بالوں میں لنگھی کرنا تھا۔ "لڑکیو،" وہ انہیں کہتی، "رات کو بالوں میں لنگھی نہ کرو؛ تم سمندر میں جانے والوں کا سفر طویل کر دو گی۔" اس کے سوا، اس کا خیال تھا کہ اُن سے بڑھ کر اچھی پرورش پانے والی لڑکیاں اور کوئی نہیں۔ "وہ بے عیب ہیں،" اکثر اسے کہتے سنا گیا، "اور کوئی بھی شخص ان کے ساتھ خوش رہ سکے گا، کیوں کہ انہیں دکھ جھیلنے کے لیے پالا گیا ہے۔" اس کے باوجود، جنہوں نے بڑی دو سے شادیاں کی تھیں، اُن کے لیے ان سے پہچا چھڑانا مشکل ہو گیا تھا، کیوں کہ وہ ہمیشہ ہر جگہ ان کے ساتھ جاتیں، اور صرف خواتین کے لیے رقص کا اہتمام کرتیں، اور مردوں کے منصوبوں میں چھپی ہوئی غرض کو بجانب لینے میں بہت تیز تھیں۔

انجلا ویکاریو چاروں میں سب سے خوش شکل تھی، اور، میری ماں کہتی تھی، وہ تاریخ کی ایک عظیم ملکہ کی طرح، گردن کے گرد لپٹی ہوئی نال کے ساتھ پیدا ہوئی تھی۔ مگر وہ بے چارگی اور روح کی کس مہر سی کا شکار تھی، جو اس کے غیر یقینی مستقبل کا شگون معلوم ہوتی تھی۔ میں ہر سال اپنی کمرس کی تعطیل میں اسے دیکھا کرتا، اور وہ، دوپہر میں اپنے گھر کی کھڑکی میں بیٹھی کپڑوں کے پھول بناتی اور تنہا عورتوں کے والہ اپنی پڑوسنوں کے ساتھ گاتی ہوئی، ہر بار اور زیادہ بے حوصلہ نظر آیا کرتی۔ "یہ تمہاری احمق عم زاد،" سانتیاگو نصر مجھ سے کہا کرتا، "کاٹنا ٹکٹے کے لیے چل رہی ہے۔" ایک روز جب اس کی بہن کے سوگ سے ذرا پہلے، میں سرکٹ پر اس کے پاس سے گزرا، وہ پہلی بار ایک جوان عورت کی طرح ملبوس تھی اور اس کے بال تاب دیے ہوئے تھے، اور میں بہ

مشکل یقین کر سکا کہ یہ وہی ہے۔ مگر یہ ایک ناپائیدار عکس تھا: اس کی روح کی ناداری عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ جب یہ انکشاف ہوا کہ بیاردو سان روان اس سے شادی کا خواستگار ہے، بہت سے لوگوں نے سوچا کہ یہ ضرور اس بیگانے شخص کی کوئی چال ہے۔

خاندان والوں نے اس کی درخواست پر نہ صرف سنجیدگی سے، بلکہ پرجوش انداز میں رد عمل کیا، سوائے بیوروویکار یو کے، جس نے یہ شرط رکھی کہ بیاردو سان روان اپنے آپ کو بطور مناسب شناخت کرائے۔ اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ درحقیقت کون ہے۔ اس کا ماضی اُس دوپہر تک محدود تھا جب وہ ایک اداکار کے سوانگ میں کشتی سے اترتا تھا، اور اپنے، آئندہ کے بارے میں وہ اتنا کم گو تھا کہ آخری حد تک بعید از عقل اختراع بھی درست ہو سکتی تھی۔ یہ سننے میں آیا تھا کہ اس نے کامنا رے میں، ٹروپ کمانڈر کی حیثیت سے، دہشت گردی بچائی تھی اور دہشتوں کو نیست و نابود کیا تھا؛ وہ ڈیولز آئی لینڈ سے فرار ہوا تھا؛ اسے پرنامبو کو میں رہ چھوں کے ایک جوڑے کو بچا کر روزی کھاتے دیکھا گیا تھا؛ اور اس نے روڈ بار ونڈوارڈ میں سونے سے لدی ہوئی ایک اسپانوی جنگی کشتی کے باقیات کو سمندر سے نکالا تھا۔ بیاردو سان روان نے ان تمام قیاس آرائیوں کا خاتمہ ایک سیدھے سادے عمل سے کیا: وہ اپنے پورے کنبے کو لے آیا۔

وہ چار تھے: باپ، ماں، اور دو بوشیار بہنیں۔ وہ سرکاری نمبر پلیٹ کی ٹی ماڈل فورڈ میں آئے، جس کے بطح کی آوازوں والے بارن نے گیارہ بجے سرکل کو جمع ہو کر رک دیا۔ اس کی ماں، آلبرتا سموندس، کیوراساؤ کی ایک طویل قاست ملاؤ خاتون جو اسپانوی کو پاپا سینٹو کی آمیزش کے ساتھ بولتی تھی، انٹیلی کی دو سو حسین ترین عورتوں میں سب سے زیادہ خوب صورت مانی گئی تھی۔ نو شگفت بہنیں، دو بے قرار بچیریوں کی طرح تھیں۔ مگر توجہ کا اصل مرکز ان کا باپ جنرل بیٹرونیو سان روان تھا، گزشتہ صدی کی خانہ جنگیوں کا مرویدال، اور کنزرویٹو عہد کی اہم رفعتوں میں سے ایک، جس نے کرنل اور یلیانو بونڈیا کو ٹیو کوریکا کی تباہ کن جنگ میں پسپائی پر مجبور کر دیا تھا۔ صرف میری ماں اسے خوش آمدید کہنے نہیں گئی، جب اسے معلوم ہوا کہ وہ کون ہے۔ "یہ مجھے ٹھیک لگتا ہے کہ وہ شادی کر لیں،" اس نے مجھے بتایا، "مگر یہ اور بات ہے کہ اُس آدمی سے ہاتھ ملایا جائے جس نے حیرتی نیلدو مار کیز کی پشت میں گولی مارنے کا حکم دیا تھا۔" جیسے ہی وہ اپنی آٹوموبیل کی کھڑکی سے اپنا سفید بیٹ لہراتا ہوا نمودار ہوا، ہر شخص نے اس کو اس کی مشہور تصویروں کی وجہ سے پہچان لیا۔ وہ سفید لٹن کے کوٹ اور گلہتوں والے اونچے قرطباتی جوتوں میں تھا، اور سونے کی ریم کی عینک، جس کی زنجیر اس کی واسکٹ کے کاج سے بندھی تھی، اس کی ناک کے بانے پر ایک کنبے کی مدد سے بھی ہوئی تھی۔ وہ اپنے کوٹ کے کالر پر شجاعت کا تمغا سجائے اور

ایک چھڑی لیے ہوئے تھا جس کے دستے پر قومی شیلڈ محمدی تھی۔ ہمارے خستہ راستوں کی تپتی دُھول میں پوری طرح آٹا، آٹوموبیل سے اترنے والا وہ پہلا شخص تھا، اور اسے صرف یہ کرنا تھا کہ وہ رنگ بورڈ پر کھڑا ہو جائے، کہ سب جان لیں کہ بیاردو سان رومان جس کا خواستگار ہے اُس سے شادی کرنے جا رہا ہے۔

یہ انجلا ویکاریو تھی جو اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ”وہ مجھ سے بہت فزوں تھا،“ اس نے مجھے بتایا۔ اس کے علاوہ بیاردو سان رومان نے کبھی اسے شادی کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی، بلکہ اس کے گھر والوں کو اپنے جادو سے مست کر لیا تھا۔ انجلا ویکاریو اُس رات کی سراپیسکی کبھی فراموش نہیں کر سکی جب اس کے والدین اور بڑی بہنوں نے اپنے خاوندوں سمیت، بڑے کمرے میں جمع ہو کر، اس پر اس کا یہ فرض عائد کیا کہ وہ ایک ایسے آدمی سے شادی کے لیے رضامند ہو جائے جسے اس نے ٹھیک سے دیکھا تک نہیں تھا۔ جڑواں بھائی اس معاملے میں نہیں پڑے۔ ”یہ ہمیں عورتوں کا بکھیرا لگا،“ پابلو ویکاریو نے مجھے بتایا۔ والدین کی حسی دلیل یہ تھی کہ نسبتاً کم ذرائع سے اپنا بھرم قائم رکھے ہوئے ایک خاندان کو اس خوش قسمتی کی امانت لرنے کا کوئی حق نہیں۔ انجلا ویکاریو نے ہمت کر کے عدم محبت کی ناسازگاری کی طرف اشارہ کیا،

اس کی ماں نے اسے ایک فقرہ سے ڈھا دیا:

”محبت بھی سیکھی جاسکتی ہے۔“

اس وقت کی منگنیوں کے برخلاف، جو سرپرستوں کی زیر نگرانی مدتوں چلتی تھیں، یہ منگنی بیاردو سان رومان کے برزور اصرار پر صرف چار مہینے جاری رہی۔ یہ مدت اور کم نہیں ہو سکی کیوں کہ یورا ویکاریو نے مطالبہ کیا تھا کہ وہ خاندانی سوگ کے اختتام تک انتظار کریں۔ مگر یہ عرصہ، اس ناقابلِ مزاحمت وضع کی بدولت جس میں بیاردو سان رومان نے معاملات کو طے کیا، کسی دشواری کے بغیر گزر گیا۔ ”ایک شام اس نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے کون سا مکان سب سے زیادہ پسند ہے،“ انجلا ویکاریو نے مجھے بتایا، ”اور میں نے، بغیر یہ جانے کہ کیوں، جواب دیا کہ قصبے کا سب سے خوبصورت مکان رندوے بیوس کا فارم ہاؤس ہے۔“ میں نے بھی یہی جواب دیا ہوتا۔ وہ ایک ہاٹی پر، ہوا کے رخ پر واقع تھا، اور اس کی ٹیرس سے کوئی شخص قرمزی شقائقِ نعمان سے ڈھکی ہوئی دلدلوں کی لالچاہی بہشت، اور گرمیوں کے صاف دنوں میں کریبین کا شفاف آفتی اور کارتاہینا سے آندیاز سے آتے ہوئے سیاحوں کے جہاز دیکھ سکتا تھا۔ اس شام بیاردو سان رومان سوشل ملب گیا اور بیوس کی میز پر دو مینو کی ایک بازی کھیلنے بیٹھا۔

”بیوس!“ اس نے کہا، ”میں تمہارا مکان خریدنے والا ہوں۔“

"وہ پکے کے لیے نہیں ہے،" بیوس نے جواب دیا۔

"میں اسے اس میں موجود تمام چیزوں کے ساتھ خرید لوں گا۔"

بیوس نے اسے پرانے زمانے کی صحیح النسخی کے ساتھ سمجھایا کہ مکان کی چیزیں اس کی بیوی نے تمام عمر کی قربانیوں کے بعد جوڑی تھیں، اور وہ اب تک اس کے لیے اس کی بیوی کے وجود کا حصہ ہیں۔ "وہ اپنا دل اپنے ہاتھ میں لے کر بات کر رہا تھا،" مجھے ڈاکٹر دیونیسو اگواران نے بتایا، جو ان کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ "مجھے یقین تھا کہ وہ اس مکان کو، جس میں تیس سال سے زیادہ عرصے تک خوش و خرم رہا تھا، چپے سے پتلے مر جائے گا۔" مگر بیاردو سان رومان بھی اس کی دلیل کو سمجھتا تھا۔

"منظور!" اس نے کہا۔ "بس مجھے خالی مکان بیچ دو۔"

مگر بیوس کھیل ختم ہونے تک اپنی مدافعت کرتا رہا۔

تین شاموں کے بعد، بیاردو سان رومان بہتر پیش بندیوں کے ساتھ دو بیٹو کی میز پر واپس آیا۔

"بیوس!" اس نے پھر شروع کیا، "مکان کی قیمت کیا ہے؟"

"اس کی کوئی قیمت نہیں۔"

"کوئی بھی قیمت، جو تم چاہو گا لو۔"

"بیاردو! مجھے افسوس ہے،" بیوس نے کہا، "مگر تم نوجوان لوگ، دل کے عمرکات کو نہیں سمجھتے۔"

بیاردو سان رومان سوچنے کے لیے تمنا نہیں۔

"اگر ہم پانچ ہزار پیسو کہیں؟" اس نے کہا۔

"اپنا وقت ضائع مت کرو،" بیوس نے جواب دیا؛ اس کی خودداری عروج پر تھی، "وہ مکان اس سے کہیں زیادہ کا ہے۔"

"دس ہزار،" بیاردو سان رومان نے کہا، "اسی وقت، نقد۔"

بیوس نے اس کی طرف دیکھا؛ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ "وہ غصے سے رو رہا تھا،" مجھے ڈاکٹر دیونیسو اگواران نے بتایا، جو معلق ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب بھی تھا۔ "تصور تو کرو! اتنی بڑی رقم سامنے ہوا اور صرف روح کی ایک کمزوری کی بنا پر اٹکار کرنا۔" بیوس کی آواز نہیں ٹکل پائی، مگر بغیر تردد کے، اس نے سر کی جنبش سے "نہیں" کہا۔

"پھر اتنی مہربانی کرو،" بیاردو سان رومان نے کہا، "یہاں پانچ منٹ کے لیے میرا انتظار

”کرو۔“

پانچ منٹ بعد وہ سوشل کلب میں اپنی چاندی جڑی خور جینیں لیے واپس آیا، اور اس نے اسٹیٹ بینک کے چھپے ہوئے فیتوں سے بندھی ہزار ہزار پیسوں کی دس گڈیاں میز پر رکھ دیں۔ رنڈوا پیوس دو ماہ بعد مر گیا۔ ”وہ اسی وجہ سے مرا،“ ڈاکٹر دیونیسو اگواران نے کہا۔ ”وہ ہم سب سے زیادہ تندرست تھا، مگر جب تم اسٹیٹو کوپ سے سننے کی کوشش کرتے، اس کے دل کے اندر آنسوؤں کو غفل کرتے سن سکتے تھے۔“ مگر نہ صرف یہ کہ اس نے مکان اندر کی تمام اشیاء کے ساتھ فروخت کیا، بلکہ اس نے بیاردو سان رومان سے درخواست کی کہ وہ اسے قسطوں میں ادائیگی کرے، کیوں کہ اس کے پاس ایک صندوق بھی نہیں بچا تھا جس میں وہ نعم البدل کی اتنی زیادہ رقم رکھ سکتا۔

کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ انجلا ویکاریو دوشیزہ نہیں ہے۔ اس کا کوئی پچھلا منگستری بھی نہیں تھا، اور وہ اپنی بہنوں کے ساتھ اپنی ماں کی سخت گیریوں میں جوان ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ جب اس کی شادی میں صرف دو مہینے رہ گئے تھے، پیورا ویکاریو نے اسے بیاردو سان رومان کے ساتھ، اس مکان کو دیکھنے کے لیے، جہاں وہ رہنے جا رہے تھے، جانے کی اجازت دی۔ مگر وہ خود، اور نابینا باپ، اس کی عفت کی نگہبانی کے لیے ہرا گئے۔ ”میں خدا سے صرف یہ دعا کرتی تھی کہ وہ مجھے اپنے آپ کو ختم کرنے کی جرأت عطا کرے،“ انجلا ویکاریو نے مجھے بتایا۔ ”مگر اس نے مجھے یہ جرأت عطا نہیں کی۔“ وہ اتنی پریشان تھی کہ اس نے اپنی ماں کو سب کچھ بتا دینے کا فیصلہ کیا، تاکہ اپنے آپ کو اس شہادت سے بچا سکے، مگر اس کی دونوں رازداروں نے، جو کپڑوں سے پھول بنانے میں اس کی معاون تھیں، اسے اس کے نیک اداروں سے باز رکھا۔ ”میں نے آنکھ بند کر کے ان کا کھانا،“ اس نے مجھے بتایا، ”کیوں کہ انھوں نے مجھے یہ تاثر دیا تھا کہ وہ مردوں کو فریب دینے میں ماہر ہیں۔“ انھوں نے اسے یقین دلایا کہ تقریباً تمام لڑکیاں اپنی دوشیزگی بچپن کے حادثات میں کھو بیٹھتی ہیں۔ انھوں نے بصد اصرار اسے آگاہ کیا کہ سخت سے سخت شوہر بھی خود کو ہر بات برداشت کرنے پر آمادہ کر لیتا ہے، تاوقتے کہ کوئی اور اس کے بارے میں نہ جان جائے۔ انھوں نے آخر کار اسے قائل کر لیا کہ زیادہ تر مرد اپنے جملہ عروسی میں اتنے سسے ہوئے آتے ہیں کہ وہ عورت کے تعاون کے بغیر کسی عمل کے اہل نہیں رہ جاتے، اور لمحہ صدق میں اپنی حرکات انھیں یاد نہیں رہتیں۔ ”وہ صرف اُس پر یقین کرتے ہیں جو وہ بعد میں چادر پر دیکھتے ہیں،“ انھوں نے اس سے کہا، اور انھوں نے اسے دوشیزگی کا قسح کرنے میں تجربہ کار بیویوں کی چالبازیاں سکھائیں تاکہ وہ نوعروسی حیثیت میں اپنی پہلی صبح کو مکان کے صحن میں اپنی لہن کی چادر، دوشیزگی کی خون آلود علامت

سمیت، عام نمائش کے لیے رکھ سکے۔

وہ اسی بھلاوے کے ساتھ بیابانی گئی۔ بیاردو سان رومان نے، اپنے طور پر، ضرور اس التباس کے ساتھ شادی کی ہوگی کہ وہ اپنی طاقت اور دولت کے بل پر خوشیاں خرید رہا ہے، کیوں کہ تقریب کا منصوبہ جتنا پھیلتا گیا اس کو اتنے ہی بے خود کر دینے والے خیالات اُسے اور زیادہ طول دینے کے لیے آتے رہے۔ جب ہشپ کی آمد کا اعلان ہوا، اس نے تقریب کو ایک دن کے لیے روکنا چاہا تا کہ وہ ان کی شادی کی رسم ادا کر سکے، مگر انجلا ویکاریو اس کے خلاف تھی۔ ”در حقیقت،“ اس نے مجھے بتایا، ”میں ایسے شخص کی معرفت خدا کی بخشش نہیں چاہتی تھی جو سوپ کے لیے کلفی کاٹ کر باقی مرغ کو کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیتا ہے۔“ مگر ہشپ کی مقدس تمناؤں کے بغیر بھی جشن نے اتنا زور پکڑ لیا کہ اسے قابو میں رکھنا دشوار ہو گیا، اور وہ، بیاردو سان رومان کے اپنے ہاتھوں سے ٹکل کر، ایک عوامی ہنگامے پر ختم ہوا۔

جنرل پیترونیو سان رومان اور اس کا خاندان اس بار قومی کانگریس کی پُر تکلف کشتی پر آیا، جو تقریب کے اختتام تک گودی پر لنگر انداز رہی۔ اور ان کے ساتھ بہت سے نام ور لوگ آئے، جو اپنی نام وری کے باوصف، نئے چہروں کے ہنگامے میں بے ملاحظہ گزر گئے۔ اتنے تحفے لائے گئے تھے کہ یہ ضروری ہو گیا کہ ان میں سے زیادہ لائق تحسین تحفوں کی نمائش کے لیے برقی توانائی کے اوتلیں کارخانے کی فراموش شدہ عمارت کو بحال کیا جائے؛ بقیہ فوراً رندوے میوس کے سابقہ مکان پر پہنچا دیے گئے، جو نوعر عسوں کے لیے پیشتر ہی آراستہ کیا جا چکا تھا۔ نوٹے کو ایک کنورٹبل ملی جس پر اس کا نام کمپنی کے مونوگرام کے نیچے کندہ تھا۔ دلہن کو جو بیس مہمانوں کی تواضع کے لیے خالص طلائی ظروف سے بھری ایک الماری ملی۔ وہ بیٹے کا ایک طائفہ اور والز کے دو آرکسٹرا بھی لائے تھے، جو شادمانیوں کے شور سے براگمیتہ مقامی بینڈ اور دوسرے آئے ہوئے سازوں اور کارڈین کا ساتھ دیتے دیتے بے سُرے ہو گئے۔

ویکاریو خاندان ایک محل سے مکان میں رہتا تھا جس کی دیواریں اینٹوں کی اور چست تاپول کی تھی، مع دو عدد دو چشتیوں کے جہاں ابازیلیں جنوری میں افزائش نسل کرتیں۔ بیرونی رخ پر اس میں پھولوں کے گھمبوں سے تقریباً پورا بھرا ہوا ایک چبوترہ تھا، اور ایک طویل صحن جس میں آزاد دوڑتی ہوئی مرغیاں اور پھل دار درخت تھے۔ صحن کے پیچھاڑے، قربانی کی سل اور انٹریاں صاف کرنے کی میز سمیت، جڑواں بھائیوں کا سوروں کا باڑا تھا، جو پونسو ویکاریو کی بینائی کے جاتے رہنے کے بعد خاندانی آمدنی کا ایک معقول ذریعہ تھا۔ پیدرو ویکاریو نے یہ کاروبار شروع کیا تھا؛ اور جب وہ فوجی خدمت کے لیے چلا گیا، اس کے جڑواں بھائی نے بھی ذبح کرنے کا کسب اختیار کر لیا۔

مکان کے اندر رہنے کے لیے حسب ضرورت کمرے بہ مشکل ہی تھے، اس لیے بڑی ہنسوں نے جب جشن کے پھیلاؤ کا اندازہ لگایا تو کرائے پر ایک مکان لینا چاہا۔ "دیکھو تو،" انجلا ویکاریو نے مجھے بتایا "انہوں نے پلاسیدالینیرو کے مکان کے بارے میں سوچا، مگر خوش قسمتی سے ہمارے والدین اپنی پرانی ضد پر اڑے رہے کہ ہماری لڑکیاں ہمارے اسی خنزیر خانے میں بیاہی جائیں گی، یا کبھی نہیں بیاہی جائیں گی۔" اس لیے انہوں نے مکان کو اصلی زرد رنگ میں رنگا، دروازے ٹھیک کیے، فرش مٹکوا یا، اور جہاں تک بن پڑا اسے ایسی پر شور شادی کا اہل کر کے چھوڑا۔ جڑواں بھائی سوزوں کو کہیں اور لے گئے، اور باڑے کی آن بجھے چونے سے صمت افزائی کی گئی، مگر اس کے باوجود یہ واضح تھا کہ مکان میں زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ آخراکار، بیاردو سان رومان کی کوششوں سے انہوں نے صحن کی باڑھیں گرائیں، پڑوس کے گھر کو رقص کے لیے مستعار لیا، اور شرمندہ کے درختوں کی شاخوں کے نیچے، بیٹھنے اور کھانے کے لیے ترکھائی بنجیں نصب کیں۔

صرف ایک غیر متوقع سرا سیمگی نوٹے نے شادی کی صبح پھیلائی، جب اس نے انجلا ویکاریو کے ہاں آنے میں دو گھنٹے کی تاخیر کی، اور اُس نے عروسی جوڑا پہننے سے انکار کر دیا جب تک کہ اسے گھر میں آتے دیکھ نہ لیا۔ "سوچو تو،" اس نے مجھے بتایا، "میں خوش ہوتی اگر وہ بالکل نہ آتا، مگر یہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے دلہن کی طرح سہنے کے بعد ترک کر دے۔" اس کی احتیاط بجا نظر آتی تھی کیوں کہ کوئی بھی عام ایسا کسی عورت کے لیے اس سے زیادہ رُسا کن نہیں ہو سکتی تھی جتنی یہ کہ کوئی اس کے عروسی جوڑا پہننے کے بعد شادی کے اقرار سے پھر جائے۔ دوسری طرف، یہ امر کہ انجلا ویکاریو نے دوشیزہ نہ ہوتے ہوئے بھی نقاب اور اورنج بلاسم پہننے کی جسارت کی، بعد ازاں، پاک دامنی کی علامت کی بے حرمتی سے تعبیر کیا گیا۔ میری ماں وہ واحد ہستی تھی جس نے اس حقیقت کو کہ اُس نے اپنے نشان زدہ پٹے آخری بازی تک کھیلے، ایک جرات مندانہ قدم کی طرح قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ "اُن دنوں،" اس نے مجھے بتایا، "خدا اس طرح کی باتیں سمجھتا تھا۔" اُدھر، کوئی نہیں جانتا تھا کہ بیاردو سان رومان کن پشتوں سے کھیل رہا ہے۔ اُس لمحے سے لے کر جب وہ آخراکار فراک کوٹ اور اونچے ریشمی بیٹ میں ملبوس حاضر ہوا، اپنے آزار کی تخلیق کو رقص گاہ سے لے اڑنے تک، وہ ایک خوش نصیب دولے کی مکمل تصویر بنارہا۔

نہ یہ معلوم تھا کہ ساتیا گو نصر کن پشتوں سے کھیل رہا ہے۔ کلیسا اور جشن میں تمام وقت، میں، کرسٹو بیو یا اور اپنے بھائی ایسٹریک کے ہمراہ، اس کے ساتھ ہی رہا تھا، اور ہم میں سے کسی نے اس کے رویے میں کسی تبدیلی کی جھلک نہیں دیکھی۔ مجھے یہ بات کئی بار دوہرائی پڑی، کیوں کہ ہم چاروں اسکول تک ایک ساتھ پڑتے تھے اور بعد میں تعطیل کے دوران ایک ہی ٹولی میں

ہوتے تھے، اور کوئی بھی یہ باور نہیں کر سکتا تھا کہ ہم کوئی راز، اور خصوصاً اتنا بڑا راز، ایک دوسرے سے چھپا سکتے ہیں۔

سانتیاگو نصر تقریباً تھک چکا تھا، اور اس نے اپنا بہترین وقت، اپنی موت سے پیشتر کی شام، شادی کے اخراجات کا تخمینہ لگاتے ہوئے گزارا۔ کلیسا میں اس نے اندازہ لگایا کہ انھوں نے پھولوں کی اتنی آرائشیں کھڑی کی ہیں کہ ان پر چودہ اول درجے کے جنازوں کے برابر خرچ آیا ہو گا۔ یہ تشبیہ مجھے برسوں تک تنگ کرتی رہنے والی تھی، کیوں کہ سانتیاگو نصر نے مجھ سے اکثر کہا تھا کہ بند عمارتوں میں پھولوں کی خوشبو اس کے لیے موت سے ایک قریبی ربط رکھتی ہے، اور اُس دن جب وہ کلیسا کے اندر گیا، اس نے مجھ سے اس بات کو دوہرایا۔ "میں اپنے جنازے پر کوئی پھول نہیں چاہتا،" اس نے مجھ سے کہا، یہ جانے بغیر کہ اگلے دن، میں نے اس کا اہتمام کیا کہ اس کے تابوت پر پھول نہ رکھے جائیں۔ کلیسا سے ویکاریو کے گھر تک اس نے رنگین پھولوں کے دستوں کی قیمت کا تعین کیا جو مرکز کو سجا رہے تھے، اس نے موسیقی اور ہوائیوں، یہاں تک کہ کچے چاولوں کی بچاؤ کی لاگت کا بھی اندازہ لگایا جس سے انھوں نے ہمارا خیر مقدم کیا تھا۔ دوپہر کی خواب آلودگی میں نو عروس صحن میں آ جا رہے تھے۔ بیارو سان رومان ہمارا بہت اچھا دوست بن گیا، "چند جام کا دوست"، جیسا کہ اُن دنوں کا محاورہ تھا؛ اسے ہماری میز پر بہت زیادہ مزہ آیا۔ انجلا ویکاریو نے، نقاب اور عروسی گلدستے اور پسینے سے داغ دار ساٹن کے لباس میں، اچانک ایک شادی شدہ عورت کی شبیہ اختیار کر لی تھی۔ سانتیاگو نصر نے حساب لگایا، اور بیارو سان رومان سے کہا کہ اس وقت تک شادی پر لگ بھگ نو ہزار پیسو خرچ ہو چکے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ انجلا ویکاریو نے اس بات کو گستاخی سمجھا تھا۔ "میری ماں نے مجھے تربیت دی تھی کہ دوسروں کے سامنے کبھی پیسوں کا ذکر نہیں کرتے،" اس نے مجھے بتایا۔ بیارو سان رومان نے، اپنے طور پر، اس بات کو بڑی تمکنت سے، بلکہ ایک خاص خود نمائی کے ساتھ سنا۔

"تقریباً،" اس نے کہا۔ "مگر یہ تو صرف شروعات ہیں، خاتمے تک، اس سے دگنا خرچ ہو چکا ہو گا۔"

سانتیاگو نصر نے اسے آخری پائی تک ثابت کرنے کو کہا، اور اس کی زندگی نے وہیں تک وفا کی۔ آخری اعداد سے، جو کرسٹو بیدویا نے اسے دوسرے دن گودی پر، اس کے مرنے سے پینتالیس منٹ پہلے، فراہم کیے، اس نے اندازہ لگایا تھا کہ بیارو سان رومان کا اندازہ درست تھا۔ اس سے پہلے، جب میں نے دوسروں کی یادداشتوں سے اسے بحال کرنا شروع کیا، میرے پاس تقریباً ایک دُھندلا سا خیال باقی رہ گیا تھا۔ برسوں تک ہمارے گھر میں اسی کا ذکر ہوتا رہا،

مثلاً میرے باپ نے، نو عروسوں کے اعزاز میں، اپنے ایام طفلی کا واکن دوبارہ اٹھایا تھا؛ میری راجہ بہن دربان کے سوانگ میں ایک میرنگو ناچی تھی، اور یہ کہ ڈاکٹر دیونیسو اگواران نے، جو میری ماں کا عم زاد تھا، صرف ان کی خاطر باضابطہ سرکاری کشتی سے آنے کا بندوبست کیا تھا، تاکہ وہ یہاں دوسرے دن، جب شپ کو آنا تھا، نہ پہنچے۔ ان وقائع کی تفتیش کے دوران، میں کئی ضمنی تجربوں سے دوبارہ گزرا، جن میں بیاردو سان رومان کی بہنوں کا بے اختیار تصور بھی تھا جن کے فعل کے لباس نے، جس میں ایک بڑی تتلی کے پر پشت کی جانب ایک طلائی سنجاق سے اٹکے ہوئے تھے، اُن کے باپ کے پُروں والے ہیٹ اور جنگی تمغوں کی قطار سے زیادہ پذیرائی حاصل کی تھی۔ کئی لوگ جانتے تھے کہ شادی کے اس ہنگامے کے دوران، میں نے مرسیس باپا کو، جیسے ہی وہ پرائمری اسکول ختم کرتی، شادی کرنے کی تجویز پیش کر دی تھی، جیسا کہ اس نے خود چودہ سال بعد، جب ہم نے شادی کی، مجھے یاد دلایا۔ فی الواقع، اس ناخوش آئند اتوار کی سب سے تکلیف دہ تصویر، جسے میں کبھی نہیں بھول سکا، صحن کے بیچ ایک اسٹول پر تنہا بیٹھے ہوئے پونسیو ویکاریو کی تھی۔ انھوں نے اسے یہ سوچ کر وہاں بٹھا دیا تھا کہ احترام کی نکتہ دہی ہے، اور مہمان اس سے ٹھوکر کھاتے ہوئے آ جا رہے تھے، اس پر کسی اور کا گمان کر رہے تھے، اسے ہٹا رہے تھے تاکہ وہ ان کی رکاوٹ نہ بنے؛ اور وہ کلفت سے گتے کی طرح اکڑی قمیص میں، اپنی وزنی چھڑی کے سہارے جو اس کے لیے خاص اس تھریب کے واسطے لائی گئی تھی، اُن سوالوں کا جواب دیتے ہوئے جو اس سے نہیں پوچھے گئے، اور ہاتھ کے ان گریز آمیز اشاروں پر رد عمل کرتے ہوئے جو اُسے نہیں کیے جا رہے تھے، کسی ایسے شخص کے نادرست تاثر کے ساتھ جس کی بینائی ضائع ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو، اپنے برف جیسے سفید سر کو ہر سمت میں بلاتے ہوئے، اپنی خود فراموشی کے دائرے میں خوش تھا۔

چند بجے شام کو جب مہمان رخصت ہوئے، رسم کی سرگرمیاں اپنے اختتام کو پہنچیں۔ کشتی، اپنی تمام باتیاں روشن کیے، پیانو پر بجتے والز کے آہنگ کے ساتھ چلی؛ اور کچھ دیر تک ایک موبوم گرداب میں بھٹکنے کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو از سر نو دریافت کیا اور تھریب کے دائرے میں واپس آ گئے۔ نو عروس تھوڑی دیر بعد کھلی ہوئی کار میں، تھریب کے ہنگاموں کے درمیان سے اپنا راستہ بدشواری بناتے ہوئے نمودار ہوئے۔ بیاردو سان رومان نے ہوائیاں چھوڑیں، جموم کی پیش کردہ بوتلوں سے گتے کی شراب پی، اور کمبیا مبارقص کے دور میں شریک ہونے کے لیے انجلا ویکاریو کے ساتھ باہر نکلا۔ آخر میں، اس نے ہمیں اپنی طرف سے، جہاں تک ہماری زندگیاں پہنچ سکیں، رقص جاری رکھنے کو کہا، اور اپنی وحشت زدہ دلہن کو اپنے خوابوں کے گھر لے گیا، جہاں

کبھی بیوس خوش و خرم رہا کرتا تھا۔

آدھی رات کے قریب عام رنگ رلیاں چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر احتتام پذیر ہوئیں، اور باقی رہ جانے والی صرف چوک کے پاس کلوئیلڈ سے آرٹا کی دکان تھی۔ میں اور سانتیاگو نصر، میرے بھائی لوئس ایسٹریک اور کرسٹو بیدویا کے ساتھ ماریا الیہاندرینا سروانتس کے داراللان بیچے۔ دوسرے بہت سے لوگوں کے علاوہ ویکاریو برادران بھی وہاں موجود تھے، اور وہ ہماری ہم نشینی میں شراب پیتے رہے اور، اس کو قتل کرنے سے پانچ گھنٹے پہلے تک، سانتیاگو نصر کے ساتھ مل کر نغمہ سرائی کرتے رہے۔ اصل تقریب سے چند منتشر چٹاریاں ضرور باقی رہ گئی ہوں گی، کیوں کہ جب کی کشتی کے نعرہ زن ہونے سے پہلے تک ہر طرف سے موسیقی کی لہریں اور رزم آریوں کی ٹمگین ترہوتی ہوئی آوازیں ہم تک پہنچتی رہی تھیں۔

پیورا ویکاریو نے میری ماں کو بتایا کہ وہ اپنی بڑی لڑکیوں کی مدد سے تقریب کی تباہ کاریوں کو ایک ذرا سمیٹنے کے بعد، گیارہ بجے رات کو بستر پر گئی۔ دس بجے کے آس پاس، جب چوک میں چند بدست اپنی نغمہ سرائی جاری رکھے ہوئے تھے، انجلا ویکاریو نے اپنے شب خوانی کے کمرے کی الماری سے اپنی ذاتی اشیاء منگانے کے لیے ایک چھوٹا سوٹ کیس بھیجا، اور اس نے اس کے علاوہ اپنے روزمرہ کے کپڑوں کا ایک سوٹ کیس بھی بھیجنے کو کہا تھا، مگر قاصد جلدی میں تھا۔ پیورا ویکاریو پر گہری نیند کا غلبہ تھا، جب دروازے پر دستک ہوئی۔ "وہ تین بہت آہستہ دستکیں تھیں،" اس نے میری ماں سے کہا، "مگر ان میں بدفالی کا ایک نامعلوم عنصر تھا۔" پیورا ویکاریو نے میری ماں کو بتایا کہ اس نے روشنی کیے بغیر، تاکہ کوئی اور نہ جاگ اٹھے، دروازہ کھولا، اور سرنگ سے آتی ہوئی روشنی میں بیارو سان رومان کو دیکھا، اس کی ریشمی قمیص کے بٹن کھلے تھے اور اس کی زرق برق پتلون الاسٹک کی گیلیس سے رُکی ہوئی تھی۔ "اس کا رنگ خوابوں کی طرح سبز ہو رہا تھا،" پیورا ویکاریو نے میری ماں سے کہا۔ انجلا ویکاریو تاریکی میں تھی، اس لیے اس کی ماں نے اسے صرف اس وقت دیکھا جب بیارو سان رومان اسے بازو سے پکڑ کر روشنی میں کھینچ لایا۔ اس کا ساٹن کا لباس چیترے ہو چکا تھا اور وہ کمر تک ایک تولیے میں لپیٹی تھی۔ پیورا ویکاریو نے سوچا کہ وہ سرنگ پر گاڑی میں دھماکے سے ختم ہو چکے، اور اب ایک گہری گھاٹی میں مردہ پڑے ہیں۔

"مقدس مریم،" اس نے لرز کر کہا، "تم لوگ اب تک اسی دنیا میں ہو؟"

بیارو سان رومان اندر نہیں آیا، مگر اس نے، ایک لفظ کہے بغیر، اپنی بیوی کو گھر میں آہستگی سے داخل کر دیا۔ پھر اس نے پیورا ویکاریو کے رخسار پر بوسہ دیا اور بہت گہری غم زدہ آواز میں کمال ملامت کے ساتھ اس سے مخاطب ہوا۔ "آئی، آپ کی بہت نوازش،" اس نے کہا، "آپ

نہایت مقدس ہیں۔"

صرف پیورا ویکاریو ہی جانتی تھی کہ اس نے بعد کے دو گھنٹوں میں کیا کیا، اور وہ یہ راز اپنی قبر میں لے گئی۔ "مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ وہ ایک ہاتھ سے میرے بال پکڑ کر دوسرے سے اتنے غصے میں مجھے پیٹ رہی تھی کہ میں سمجھی کہ وہ مجھے جان سے مار ڈالے گی،" انجلا ویکاریو نے مجھے بتایا۔ مگر یہ عمل بھی اس نے اتنی رازداری سے کیا کہ اس کا شوہر اور بڑی لڑکیاں جو دوسرے کمروں میں موخواب تھیں، صبح تک، جب سانچہ پایہ تکمیل کو پہنچ گیا، کسی بات کو نہیں جان سکیں۔

جڑواں بھائی تین بچے سے کچھ پیٹے، اپنی ماں کے ہنگامی طور پر طلب کرنے پر واپس آئے۔ انھوں نے انجلا ویکاریو کو کھانے کے کمرے کی کوچ پر اوندھے منہ پڑے دیکھا: اس کے چہرے پر خراشیں پڑ گئی تھیں، مگر وہ رونا موقوف کر چکی تھی۔ "اس وقت میں بالکل خوف زدہ نہیں تھی،" اس نے مجھے بتایا، "اس کے برعکس، مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ موت کی غنودگی آخر کار مجھ پر سے زائل ہو گئی ہے، اور میں صرف یہ چاہ رہی تھی کہ یہ سب کچھ جلدی سے ختم ہوتا کہ میں گر پڑوں اور سو جاؤں۔"

بھائیوں میں زیادہ زور آور، پیدرو ویکاریو نے اسے کمرے سے پکڑ کر ہوا میں بلند کیا اور کھانے کی میز پر بٹھا دیا۔

"کون تھا وہ؟" اس نے غصے میں لرزتے ہوئے پوچھا۔

اس نے نام بتانے میں ضروری وقت لگایا۔ بہت سے عکس اس کے سامنے آئے، اور اس نے پہلی نظر میں، اس دنیا، اور دوسری کے بہ آسانی غلط ملاپ ہو جانے والے بہت سے ناموں میں اُسے تلاش کر لیا، اور اپنے خوش بدف تیرے، ایک بے مدافعت تنہائی کی طرح جس کی تھدیر ہمیشہ دوسروں نے لکھی، اسے دیوار پر پیوست کر دیا۔

"سانتیا گو نصر،" اس نے کہا۔

وکیل عزت کے جائز دفاع کے تحت قتل کے موقف میں قائم رہا، جو عدالت نے نیک نیتی سے تسلیم کر لیا، اور جڑواں بھائیوں نے اپنے مقدمے کے خاتمے پر اعلان کیا کہ وہ ہزار بار، اس طرح کی صورت حال میں، ایسا ہی کریں گے۔ جرم کے چند منٹوں کے بعد اپنے آپ کو کلیسا کے حوالے کرتے ہوئے انہوں نے خود اس نکتے کی طرف اشارہ کیا تھا جو بعد میں وکیل صفائی نے اٹھایا۔ مشتعل عربوں کے ایک گروہ کے خطرناک تعاقب سے بچ کر وہ ہانپتے ہوئے، کلیسا کے احاطے میں گھس آئے اور انہوں نے بے داغ بچھڑے فادر لادور کی رحل پر رکھ دیے۔ دونوں قتل کے سفاکانہ عمل کے بعد نیکے ہوئے تھے، اور ان کے کپڑے اور بازو ترتر، اور ان کے چہرے پسینے اور ہنوز زندہ خون سے آلودہ تھے، مگر کلیسا نے ان کی سپر آنداختگی کو نہایت باوقار عمل کے طور پر یاد رکھا۔

"ہم نے اسے علانیہ قتل کیا ہے،" پیدرو ویکاریو نے کہا، "مگر ہم بے گناہ ہیں۔"

"شاید خدا کی نظروں میں،" فادر لادور نے کہا۔

"خدا اور اس کے بندوں کی نظروں میں،" پابلو ویکاریو نے کہا۔ "یہ عزت کا معاملہ تھا۔"

مزید برآں، واقعات کو نئے سرے سے بیان کرتے ہوئے انھوں نے، جتنی کہ فی الواقع زیبا تھی اس سے کہیں زیادہ سخت خون آشامی کا قصع کیا، اس انتہا تک کہ یہ ضروری ہو گیا کہ پلاسیدا لینیرو کے گھر کے صدر دروازے کی مرمت میں، جو بچھروں کی ضربوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا، سرکاری وسائل استعمال کیے جائیں۔

ریوبایا کی مدور جیل میں، جہاں انھوں نے مقدمے کی سماعت کے انتظار میں تین سال گزارے، کیوں کہ وہ ضمانت کرانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، پرانے قیدیوں نے انھیں ان کے اچھے کردار اور ان کی خوش خلقی کی وجہ سے یاد رکھا، اور انھوں نے ان میں کبھی بیچختاؤ سے کا کوئی شوق نہیں دیکھا۔ اس کے باوجود، حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ویکاریو برادران نے سانتیاگو نصر کو فی الفور، اور تماشا بنائے بغیر، قتل کرنے کے لیے کچھ بھی ڈھنگ سے نہیں کیا، بلکہ انھوں نے، اس سے کہیں زیادہ جتنی تصور میں آ سکتی ہے، کاوش کی کہ کوئی انھیں اس کو قتل کرنے سے باز رکھ سکے، اور وہ اس میں ناکام رہے۔

اس کے مطابق جو انھوں نے مجھے کئی برسوں کے بعد بتایا، انھوں نے اس کی تلاش ماریا ایباندیرنا سروانتس کے ہاں سے شروع کی، جہاں وہ اس کے ساتھ دو سبے تک رہے تھے۔ یہ واقعہ، بہت سے اور واقعوں کی طرح، صل میں درج نہیں ہوا۔ اصل میں، سانتیاگو نصر اس وقت وہاں نہیں تھا جب وہ دونوں اپنے کھنسنے کے مطابق اسے تلاش کرنے آئے تھے، کیوں کہ ہم سیرینادوں کا گنت کرنے نکل پڑے تھے، مگر کسی بھی صورت میں یہ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ واقعی وہاں گئے تھے۔ "وہ وہاں آنے کے بعد جانیں سکتے تھے،" ماریا ایباندیرنا سروانتس نے مجھے بتایا، اور، اسے بخوبی جانتے ہوئے، میں نے کبھی اس کی بات پر شک نہیں کیا۔ اس کے برخلاف، وہ اس کا انتظار کرنے کو تیلدے آرمنا کی دکان پر گئے، جہاں وہ جانتے تھے کہ سانتیاگو نصر کے سوا تقریباً ہر شخص تھوڑی دیر کے لیے رکے گا۔ "صرف وہی دکان کھلی ہوئی تھی،" انھوں نے تفتیش کرنے والے سے کہا۔ "جلد یا بدیر اسے گھر سے ٹکنا تھا،" انھوں نے، بری ہو جانے کے بعد، مجھے بتایا۔ پھر بھی ہر شخص جانتا تھا کہ پلاسیدا لینیرو کا صدر دروازہ ہمیشہ، حتیٰ کہ دن کے وقت بھی، اندر سے آگلی چڑھا رہتا ہے، اور یہ بھی کہ سانتیاگو نصر ہمیشہ عقبی دروازے کی چابیاں اپنے پاس رکھتا ہے۔ درحقیقت، جب ویکاریو برادران کو دوسری طرف اس کا انتظار کرتے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ گزر چکا تھا، وہ اپنے گھر میں اسی دروازے سے داخل ہوا، اور اگر وہ بعد میں چپ کا استقبال کرنے کے لیے چوک کی طرف کے دروازے سے نکلا تو یہ کبھی ایسے ناگہانی امر کی وجہ سے تھا جسے تفتیش کرنے والا، جس نے صل کو مرتب کیا تھا، کبھی دریافت نہ کر سکا۔

کوئی موت اس سے زیادہ پیش گفتہ نہیں تھی۔ جب ان کی بہن نے ان پر نام منکشف کر دیا، ویکاریو برادران سؤروں کے بارے میں اس صندوق تک گئے جس میں وہ ذبح کرنے کے اوزار رکھتے تھے، اور انھوں نے دو عمدہ ترین بھرے منتخب کیے۔ ایک چھار قاش، دس لہج لہبا اور ڈھائی لہج چوڑا، اور دوسرا پارچے بنانے والا، سات لہج لہبا اور ڈیڑھ لہج چوڑا۔ انھوں نے ان کو بیسترٹوں میں لیٹا اور گوشت بازار لے گئے۔ اتنی صبح کو وہاں زیادہ گاہک نہیں تھے، مگر بائیس آدمیوں نے بتایا کہ انھوں نے ہر بات سنی تھی، اور ان تمام نے اس تاثر پر اتفاق کیا کہ انھوں نے وہ باتیں سنانے ہی کے لیے کی تھیں۔ تین بیس پر، جب فاوستینو سانتوس، ان کے ایک قرائی دوست نے اپنی دراز کھولی ہی تھی، انھیں آتے دیکھا، اور سمجھ نہیں پایا کہ وہ سوموار کو اتنی جلدی کیوں آرہے ہیں، اور اس وقت تک شادی کے لیے پسے گئے سیاہ سوٹوں میں کیوں ہیں۔ وہ انھیں جمعے کو آتے دیکھنے کا عادی تھا، مگر ذرا دیر سے، اور چڑھے کے ایمرن میں، جو وہ ذبح کرتے وقت باندھتے تھے۔ "میں سمجھا کہ وہ اتنے ختمے میں ہیں،" فاوستینو سانتوس نے مجھے بتایا، "کہ وہ نہ صرف یہ بھول گئے ہیں کہ کیا بچا ہے، بلکہ یہ بھی کہ کون سادہ ہے۔" اس نے انھیں یاد دلایا کہ آج سوموار ہے۔

"یہ سب کو معلوم ہے، بے وقوف،" پابلو ویکاریو نے اسے خوش طبعی سے جواب دیا۔ "ہم صرف اپنے بھرے تیز کرنے آئے ہیں۔"

انھوں نے بھروں کو سان پر چڑھایا، ہمیشہ کی طرح پیدرو بھروں کو پکڑے ہوئے تھا اور انھیں پتھر پر تیز کر رہا تھا، اور پابلو پیسے کو گنہار رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ دوسرے قسائیوں سے شادی کی شان و شوکت کے متعلق باتیں کرتے جا رہے تھے۔ چند ایک نے، ان کے کام کے ساتھی ہونے کے باوجود اپنے حصے کا کیک نہ ملنے کی شکایت کی، اور انھوں نے بھجوانے کا وعدہ کیا۔ آخر کار، انھوں نے بھروں کو پتھر پر نغمہ زن کر دیا، اور پابلو نے اپنا چھرا لیمپ کے مقابل رکھنا کہ اسٹیل جگمگائے۔

"ہم سانتیاگو کو قتل کرنے جا رہے ہیں،" اس نے کہا۔
 نیک آدمیوں کی حیثیت سے ان کی شہرت اتنی مستحکم تھی کہ کسی نے ان کی بات پر توجہ نہیں دی۔ "ہم نے سمجھا یہ شرابیوں کی بکواس ہے،" کئی قسائیوں نے بیان دیا۔ یہی وکٹوریا گنان اور کئی اور لوگوں کا بیان تھا، جنھوں نے انھیں بعد میں دیکھا۔ کچھ دنوں کے بعد میں قسائیوں سے پوچھنے والا تھا کہ آیا ذبح کرنے کا کسب ایسی روح کی نشان دہی نہیں کرتا جو کسی انسان کے قتل پر پہلے سے مائل ہو۔ انھوں نے احتجاج کیا، "کسی پچڑے کو ذبح کرنے والا اس کی آنکھوں میں جمانے کی ہمت نہیں کرتا۔" ان میں سے ایک نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے ذبح کیے ہوئے جانور کا

گوشت نہیں کھا سکتا۔ ایک آور نے بتایا کہ وہ جس گائے کو پہلے سے جانتا ہو، اسے ذبح کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا، اور اگر اس نے اس کا دودھ بھی پیا ہو تو ذبح کرنے کا امکان آور بھی کم ہو گا۔ میں نے انہیں یاد دلایا کہ ویکاریو برادران اپنے پالے ہوئے سوروں کو ذبح کرتے تھے، جن سے وہ اتنے مانوس تھے کہ انہیں ان کے ناموں سے پکارتے تھے۔ "یہ سچ ہے،" ان میں سے ایک نے کہا، "مگر یہ بھی یاد رہے کہ انھوں نے سوروں کو آدمیوں کے نہیں بلکہ پھولوں کے نام دیے تھے۔" بس ایک فاؤسٹینو سانتوس تھا جس نے پابلو ویکاریو کی دھمکی میں سچائی کی جھلک محسوس کی تھی، اور اس نے ان سے مذاق میں پوچھا تھا کہ انہیں سانتیاگو نصر کو کیوں قتل کرنا پڑ رہا ہے، جب کہ کئی آور دولت مند موجود ہیں جو پہلے مارے جانے کے مستحق ہیں۔

"سانتیاگو نصر جانتا ہے کیوں،" پیدرو نے اسے جواب دیا۔

فاؤسٹینو سانتوس نے مجھے بتایا کہ اس وقت اسے شک پڑ گیا تھا، اور اس نے ایک پولیس والے کو، جو میسر کے ناشتے کے لیے ایک پونڈ گلیبی لینے آیا تھا، یہ اطلاع دے دی تھی۔ مسل کے مطابق اس پولیس والے کا نام لیاندرو پورنوں تھا، اور وہ اس کے ایک سال بعد، قومی تعطیل کے دوران، گردن کی رگ میں بیل کا سینک لگ جانے سے ہلاک ہو گیا تھا، اس لیے میں کبھی اس سے بات کرنے کا موقع نہیں حاصل کر سکا، مگر کلوتیلدے آرمینا نے تصدیق کی کہ وہ اس کی دکان پر، جہاں ویکاریو برادران انتظار کر رہے تھے، آنے والا پہلا آدمی تھا۔

کلوتیلدے آرمینا نے اسی وقت کاؤنٹر کے پیچھے اپنے شوہر کی جگہ سنبالی تھی۔ یہ ان کا طریق کار تھا۔ دکان صبح کو دودھ اور دن کو سودا سلت بیچتی، اور شام کے چھ بجے کے بعد شراب خانہ ہو جاتی۔ کلوتیلدے آرمینا صبح ساڑھے تین بجے اسے کھولتی تھی۔ اس کا نیک شوہر، دون روجلیو دے لافلور، بند ہونے کے وقت تک شراب خانے کی ذمہ داری سنبالتا۔ مگر اس رات شادی کی وجہ سے اتنے زیادہ غیر متوقع خریدار آتے گئے کہ وہ اسے بند کیے بغیر تین بجے سونے چلا گیا، اور کلوتیلدے آرمینا معمول سے پیشتر آگئی تھی، کیوں کہ وہ چپ کے آنے سے پہلے کام ختم کرنا چاہتی تھی۔

ویکاریو برادران چار دس پر آئے۔ اس وقت کھانے کی آخری چیز بھی بیک چکی تھی، مگر کلوتیلدے آرمینا نے انہیں گئے کی شراب کی ایک بوتل پیش کی، نہ صرف یوں کہ وہ ان کے لیے زیادہ احترام رکھتی تھی، بلکہ اس لیے بھی کہ وہ شادی کے لیک کے اس حصے کے لیے جو انھوں نے اسے بھجوا دیا تھا، بہت ممنون تھی۔ وہ پوری بوتل دو طویل گھونٹوں میں پی گئے، مگر ان پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ "وہ حواس باختہ تھے،" کلوتیلدے آرمینا نے مجھے بتایا، "وہ لیمپ آئل پی کر بھی

اپنے آپ میں ولولہ پیدا نہ کر پاتے۔" انھوں نے اپنی سوچی جیکٹیں اتاریں، انھیں انتہا سے کرسی کی پشت پر لٹایا، اور اس سے ایک آور بوتل طلب کی۔ ان کی قمیص منہمک پسینے سے داغ دار تھی اور ایک دن کی بڑھی ہوئی ڈارٹھی نے ان کو جنگل نشیں کی سی شان عطا کر دی تھی۔ انھوں نے دوسری بوتل، سرک کے پار پلاسیدا لینیرو کے مکان کی طرف، جہاں کھڑکیوں میں تاریکی تھی، غور سے دیکھتے ہوئے، زیادہ سکون سے بیٹھ کر پی۔ بالکنی پر سب سے بڑی کھڑکی سانتیاگو نصر کی خواب گاہ کی تھی۔ پیدرو ویکاریو نے کلو تیلدے آرمنٹا سے پوچھا کہ کیا اُس نے اس کھڑکی میں کوئی روشنی دیکھی ہے، اور اس نے نفی میں جواب دیا، مگر یہ سوال اسے غیر مانوس معلوم ہوا۔

"کیا اسے کچھ ہو گیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں،" پیدرو ویکاریو نے جواب دیا۔ "بس ہم لوگ اسے قتل کرنے کے لیے ڈھونڈ رہے ہیں۔"

یہ اتنا بے ساختہ جواب تھا کہ اسے یقین نہیں آیا کہ اس نے صبح سنا ہے، مگر اس نے دیکھا کہ وہ دونوں باورچی خانے کی صافی میں لیٹے دو قصابی بھرے لیے ہوئے ہیں۔

"اور کیا کوئی جان سکتا ہے کہ تم لوگ کیوں اسے صبح سویرے قتل کرنا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"اسے معلوم ہے کیوں،" پیدرو ویکاریو نے جواب دیا۔

کلو تیلدے آرمنٹا نے سنجیدگی سے ان کا جائزہ لیا: وہ انھیں اتنی اچھی طرح جانتی تھی کہ الگ الگ پہچان سکتی تھی، خاص طور پر جب سے پیدرو ویکاریو فوج سے لوٹا تھا۔ "وہ دونوں کی طرح لگ رہے تھے،" اس نے مجھے بتایا۔ اور یہ بات اسے لرزائی، کیوں کہ ہمیشہ سے اس کا خیال تھا بچے ہی سب کچھ کر گزرنے کے اہل ہیں۔ اس لیے اس نے دودھ کے جگ تیار کرنے ختم کیے اور اپنے شوہر کو جگانے جلی گئی تاکہ اسے بتا سکے کہ دکان پر کیا ہو رہا ہے۔ دونوں روہیلو دے لافلور نے سیم بیداری کی حالت میں اس کی بات سنی۔

"بے وقوف مت بنو،" اس نے کلو تیلدے آرمنٹا سے کہا۔ "وہ دونوں کسی کو بھی قتل نہیں کرنے والے ہیں، اور کسی دولت مند کو تو بالکل بھی نہیں۔"

جب کلو تیلدے آرمنٹا دکان پر لوٹی، وہ دونوں سپاہی لیاندرو پورنوں سے، جو میسر کے لیے دودھ لینے آیا تھا، بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ یہ نہیں سن سکی کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، مگر جس طرح سے لیاندرو پورنوں نے جاتے ہوئے بھروں پر نظر ڈالی، اس کا خیال تھا کہ انھوں نے اسے اپنے ارادے سے کچھ نہ کچھ آگاہ کر دیا تھا۔

کرنل لزارو آپونٹے چار سے ذرا پہلے اٹھا تھا۔ وہ ڈارٹھی بنانے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ سپاہی لیاندرو پورنوں نے اس پر ویکاریو برادران کے عزائم کا انکشاف کیا۔ کرنل لزارو آپونٹے نے گزشتہ رات دوستوں کے درمیان اتنے جھگڑوں کا تصفیہ کرایا تھا کہ ایک اور کے تفصیے کے لیے عجلت میں نہیں تھا۔ اس نے آرام سے لباس تبدیل کیا، اور اپنی بوکئی بار باندھی یہاں تک کہ وہ بالکل درست بندھ گئی، اور جپ کی پذیرائی کے لیے اپنی گردن کے گرومسی کے اجتماع کی ڈھیلی ڈھالی آستینوں والی عبائٹائی۔ جب وہ تلی ہوئی پیاز کے حلقوں کے ساتھ بھنی ہوئی گلیبی کا ناشتہ کر رہا تھا، اس کی بیوی نے اس کو بست پیمان کے ساتھ بتایا کہ بیارو سان رومان انجلا ویکاریو کو اس کے گھر واپس کر آیا ہے، مگر اس نے اس بات کو ڈرامائی انداز میں نہیں دیکھا۔

"خداوند!" اس نے مسرے پن سے کہا۔ "جپ کیا سوچے گا۔"

مگر اس کے باوجود، ناشتہ ختم کرنے سے پہلے اسے یاد آگیا کہ سپاہی نے اسے کیا بتایا تھا، اس نے خبر کے دونوں اجزا کو ساتھ ساتھ رکھا، اور فوراً دیکھ لیا کہ وہ چیستان کے دو ٹکڑوں کی طرح جڑ جاتے ہیں۔ پھر وہ نئی گودی کے ساتھ کی شاہراہ پر چلتا ہوا چوک پر پہنچا جہاں مکانات جپ کی آمد کے لیے روشن ہونے شروع ہو گئے تھے۔ "میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت تقریباً پانچ بجے تھے اور بارش شروع ہو گئی تھی،" کرنل لزارو آپونٹے نے مجھے بتایا۔ راستے میں تین آدمیوں نے اسے رازدارانہ یہ بتانے کے لیے روکا کہ ویکاریو برادران سانتیاگو نصر کو قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں، مگر صرف ایک شخص نے اسے بتایا کہ وہ کس جگہ ہیں۔

اس نے انہیں کلوتیلدے آرمنٹا کی دکان پر پایا۔ "جب میں نے انہیں دیکھا تو میں نے سوچا کہ وہ شبی خوروں کے جوڑے کے سوا کچھ نہیں،" اس نے مجھ سے اپنی ذاتی منطق کے تحت کہا، "کیوں کہ وہ اتنے مدبوش نہیں تھے جتنا میرا خیال تھا۔" نہ ہی اس نے ان سے ان کے ارادوں کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ اس نے انہیں اسی خود اعتمادی سے برتا جس سے اس نے اپنی بیوی کے انتباہ کو ٹھکانے لگایا تھا۔

"ذرا سوچو،" اس نے ان سے کہا، "جپ نے اگر تمہیں اس حالت میں دیکھا تو کیا کہے گا۔" وہ چلے گئے۔ کلوتیلدے آرمنٹا نے میسر کے سرسری روپے کی وجہ سے ایک آردل شکستگی سہی، کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ حقیقت کے واضح ہونے تک اسے ضرور ان کو حراست میں لے لینا چاہیے تھا۔ کرنل آپونٹے نے آخری دلیل کے طور پر پھر سے اس کے سامنے رکھ دیے۔

"اب ان کے پاس کسی کو قتل کرنے کے لیے کوئی چیز نہیں ہے،" اس نے کہا۔ "یہ وجہ نہیں،" کلوتیلدے آرمنٹا نے کہا۔ "یہ ان غریب لڑکوں کو اس مہیب فرض سے

آزاد کرنے کے لیے ضروری ہے جو ان پر عائد ہو گیا ہے۔"

اس نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ویکاریو برادران حکم کو بجالانے میں اتنے پرجوش نہیں ہیں جتنا کہ کسی ایسے شخص کو تلاش کرنے میں جو انہیں روک دینے کی ان پر نوازش کر سکے۔ مگر کرنل آپونٹے کی روح بے سکون نہیں تھی۔

"کوئی بھی صرف ٹھپے میں گرفتار نہیں کیا جاتا،" اس نے کہا۔ "مگر اب سانتیاگو نصر کو آگاہ کرنے کا معاملہ ہے۔ اور نیا سال مبارک۔"

کلوتیلدے آرمینا ہمیشہ یاد رکھنے والی تھی کہ کرنل آپونٹے کی گول مٹول وضع دیکھ کر وہ ایک عجیب سے تاسف میں مبتلا ہو جاتی تھی، مگر اس کے برعکس مجھے یاد ہے کہ وہ ایک خوش طبع آدمی تھا؛ ہاں تنہائی میں روحانی مشتعل، جو اس نے ڈاک کے ذریعے سیکھی تھیں، جاری رکھنے کی وجہ سے ذرا کھٹکا ہوا تھا۔ اس سوموار کو اس کا طرز عمل اس کی حماقت کا آخری ثبوت تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے سانتیاگو نصر کے بارے میں، جب تک اسے گودی پر نہیں دیکھا، دوبارہ سوچا تک نہیں، اور تب اس نے اپنے آپ کو صحیح فیصلہ کرنے پر مبارکباد دی۔

ویکاریو برادران نے دودھ خریدنے کے لیے آنے والے ایک درجن سے زیادہ لوگوں کو اپنا منصوبہ بتایا، اور انہوں نے اسے سب میں چھبے سے پہلے پھیلادیا۔ کلوتیلدے آرمینا کو ناممکن لگتا تھا کہ سرکل کے پارکمان میں یہ خبر نہ پہنچی ہو۔ اس کا خیال تھا کہ سانتیاگو نصر وہاں نہیں ہے، کیوں کہ اس نے شبِ خوابی کے کمرے میں روشنی ہوتے نہیں دیکھی تھی، اور اس نے جس سے بھی ممکن ہوا، درخواست کی کہ وہ اسے دیکھتے ہی خبردار کر دیں۔ اس نے فادر آبادور تک کو سر خدمت نو آموز کے ذریعے، جو راہبوں کے لیے دودھ لینے آئی تھی، اطلاع بھجوائی۔ چار بے کے بعد جب اس نے پلاسیدا البنیرو کے باورچی خانے میں روشنی دیکھی، آخری ہنگامی پیغام وکٹوریا گنان کو گداگر عورت کے ذریعے بھیجا جو ہر روز اس سے خدا کے نام پر تھوڑا سا دودھ مانگنے آتی تھی۔ جب بپ کی کشتی نعرہ زن ہوئی، تقریباً ہر آدمی اس کا استقبال کرنے کے لیے بیدار تھا اور ہم میں سے بہت کم ایسے تھے جو نہ جانتے ہوں کہ ویکاریو برادران سانتیاگو نصر کا اس کو قتل کرنے کے لیے انتظار کر رہے ہیں، اور اس کے علاوہ ان کے ایسا کرنے کی وجہ بھی آخری جزئیات کے ساتھ مشہور ہو چکی تھی۔

کلوتیلدے آرمینا نے دودھ تقسیم کرنا ابھی ختم نہیں کیا تھا کہ ویکاریو برادران اخباروں میں لپٹے ہوئے دوسرے بچروں کے ساتھ لوٹ آئے۔ ایک رنگ آکود لیے پھل والا چہرہ قاش، بارہ انچ لمبا اور تین انچ چوڑا، جو پیدرو ویکاریو نے اس زمانے میں جب جرمن پھرے جنگ کی وجہ سے

دستیاب نہیں ہو رہے تھے، مُنبت کاری کے آرے کی دھات سے بنایا تھا۔ دوسرا چھوٹا تاگر چوڑا اور خم دار۔ تفتیش کرنے والے نے اپنی رسل میں ان کے خاکے بنائے تھے؛ شاید اسے ان کو لفظوں میں بیان کرنے میں دقت پیش آرہی تھی۔ اس نے بس اتنا لکھنے کی جسارت کی تھی کہ یہ چھوٹی سی تلوار کی طرح نظر آ رہا تھا۔ یہی وہ بھرا تھا، جس سے جرم پایہ تکمیل کو پہنچا۔ دونوں جھرے بندے اور کثرت سے استعمال شدہ تھے۔

فاؤستینو سانتوس سمجھ نہیں پایا کہ انھیں کیا ہو گیا ہے۔ ”وہ اپنے جھرے دوسری بار تیز کرنے آئے تھے،“ اس نے مجھے بتایا، ”اور ایک بار پھر لوگوں کو سنانے کے لیے چیخ رہے تھے کہ وہ سانتیاگو نصر کی انٹریاں باہر نکالنے جا رہے ہیں، اس لیے میں نے سمجھا کہ وہ چھیر مچا کر رہے ہیں، خاص طور پر یوں بھی کہ میں نے بھجروں پر توجہ نہیں دی تھی اور فرض کر لیا تھا کہ وہ پہلے والے ہی ہیں۔“ اس بار بہر حال کلو تیلدے آرمینا نے انھیں آتے دیکھ کر محسوس کر لیا کہ ان میں پہلے جیسا عزم نہیں ہے۔

دراصل ان میں پہلا اختلاف ہو چکا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ اپنی ظاہری مشابہت کے باوجود باطن میں کہیں زیادہ مختلف تھے، بلکہ ہنگامی صورت حال میں وہ متضاد رد عمل کا اظہار کرتے تھے۔ ہم، ان کے دوست، یہ بات گرامر اسکول کے زمانے سے محسوس کر چکے تھے۔ پابلو ویکاریو اپنے بھائی سے سچے منٹ بڑا تھا اور عنفوانِ شباب تک وہ زیادہ پُر تخیل اور راسخ ارادوں والا تھا۔ پیدرو ویکاریو مجھے ہمیشہ زیادہ جذباتی اور اسی حوالے سے زیادہ پُر محکم لگتا تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ بیس سال کی عمر میں خود کو فوجی خدمت کے لیے پیش کیا تھا۔ پابلو ویکاریو کو مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا تاکہ وہ گھر پر رہ کر خاندان کی پرورش کر سکے۔ پیدرو ویکاریو نے گیارہ ماہ گشتی پولیس میں خدمت انجام دی تھی۔ فوجی صائبگی نے، موت کے خوف سے اور زیادہ شدید ہو کر، اس کی حکم دینے، اور اپنے بھائی کے لیے بھی خود فیصلہ کرنے کی عادات کو پختہ کر دیا تھا۔ وہ سارجنٹس بلنور باجیا کے مرض کے ساتھ لوٹا جو فوجی معاملے کے انتہائی بہیمانہ طریقوں اور ڈاکٹر دیونیسو اگواران کے آرسینک کے انجکشنوں اور تلھیری پریگمینٹ کی خوراکوں کے باوجود باقی تھا۔ صرف جیل میں اس کا علاج کرنے میں کامیابی ہو سکی۔ ہم، ان کے دوستوں، نے اتفاق کیا کہ پابلو ویکاریو نے اچانک ایک چھوٹے بھائی کی سی تابعداری پیدا کر لی، جب پیدرو ویکاریو عسکری ٹرنگ، اور ہر اس شخص کے لیے جسے اس کے بائیں پہلو میں گولی کا زخم اور اس کے نیچے بندھے فلیٹے کو دیکھنے کی خواہش ہو، اپنی قمیص اٹھانے کی نئی شعلہ بازی کے ساتھ واپس آیا۔ پابلو ویکاریو نے اس عظیم شخص کے بلنور باجیا تک کے لیے، جسے وہ جنگی تنے کی طرح سجائے پھر رہا تھا، ایک تمہین کا جذبہ

محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔

پیدرو ویکاریو کے اعتراف کے مطابق سانتیاگو نصر کے قتل کا فیصلہ اس نے کیا تھا اور شروع میں اس کے بھائی نے صرف اس کی تقلید کی تھی، مگر یہ سوچنے والا بھی وہی تھا کہ میسر کے ان کو غیر مسلح کر دینے کے بعد ان کا فرض پورا ہو گیا ہے، اور اس کے بعد پابلو ویکاریو نے کھان سنجال لی تھی۔ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی اس اختلاف کا تفتیش کرنے والے سے، اپنے جدا جدا بیانات میں، ذکر نہیں کیا۔ مگر پابلو ویکاریو نے مجھ سے کئی بار تصدیق کی کہ اپنے بھائی کو آخری اقدام پر آمادہ کرنا اس کے لیے آسان کام نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اصل میں یہ دہشت زدگی کی ایک لہر سے زیادہ نہ رہا ہو، مگر حقیقت یہ ہے کہ پابلو ویکاریو ہاڑے میں دوسرے دو پھروں کو لانے اکیلا گیا۔ جب کہ اس کا بھائی شربند کے درختوں کے نیچے پیشاب کرنے کی کوشش کرتے ہوئے، قطرہ بہ قطرہ، بڑی اذیت میں تھا۔ "میرا بھائی کبھی نہ جان سکا کہ وہ کیسا عذاب تھا،" پیدرو ویکاریو نے مجھ سے اپنی واحد ملاقات میں کہا، "ایسا لگتا تھا جیسے پیشاب کی جگہ شیشے کی گرجیاں نکل رہی ہوں۔" پابلو ویکاریو نے، جب وہ پھروں کو لیے واپس ہوا، اسے درخت سے لپٹا ہوا پایا۔ "اسے تکلیف سے ٹھنڈے پینے آرہے تھے،" اس نے مجھے بتایا، "اور اس نے مجھے تنہا جانے کو کہنا چاہا، کیوں کہ وہ کسی کو قتل کرنے کی صورت حال میں نہیں تھا۔" وہ ان درختوں کے نیچے ان رکھائی بنچوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا جو انھوں نے شادی کی دعوت کے لیے رکھی تھیں، اور اس کی پتلون گھٹنوں تک گری ہوئی تھی۔ "اس نے تقریباً آدھا گھنٹا اس پٹی کو تبدیل کرنے میں لگایا جس میں اس نے اپنا عضو تناسل لپیٹا ہوا تھا،" پابلو ویکاریو نے مجھے بتایا۔ اصل میں اس نے دس منٹ سے زیادہ دیر نہیں لگائی تھی، مگر پابلو ویکاریو کے لیے یہ حرکت اتنی دشوار اور تعجب خیز تھی کہ اس نے اسے اپنے بھائی کی، وقت کو صبح ہونے تک صناع کرنے کے لیے، کسی نئی شعبہ بازی سے تعبیر کیا، اس لیے اس نے پھر باتھ میں پکڑا، اور تقریباً بہ زور اسے اپنی بہن کی کھوئی ہوئی عزت کی تلاش میں کھینچ لے گیا۔

"اس کے سوا کوئی راستا نہیں،" اس نے کہا۔ "یہ تو اب طے ہو چکا ہے۔"

وہ سوروں کے ہاڑے کے دروازے سے ننگے پھرے لیے، صحن میں تعاقب کرتے ہوئے کتوں کے شور کے ساتھ نکلے۔ روشنی ہونے لگی تھی۔ "بارش نہیں ہو رہی تھی،" پابلو ویکاریو کو یاد تھا۔ "ہو رہی تھی،" پیدرو نے یاد کیا۔ "سمندری ہوا چل رہی تھی اور کوئی ستاروں کو اس وقت بھی اپنی انگلیوں سے گن سکتا تھا۔" خبر اس وقت تک اتنی اچھی طرح پھیل چکی تھی کہ اور تنسیا باؤتے نے اپنا دروازہ عین اس وقت کھولا جب وہ اس کے مکان کے سامنے سے گزر رہے تھے، اور وہ

سانتیاگو نصر کے لیے رونے والوں میں پہلی تھی۔ "میں سمجھی کہ انھوں نے اسے قتل کر دیا ہے،" اس نے مجھے بتایا۔ "کیوں کہ میں نے جھروں کو اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں دیکھا اور مجھے یوں لگا کہ ان سے خون ٹپک رہا ہے۔" اس بے محل شاہراہ پر کھلنے والے چند مکاناتوں میں سے ایک پابلو ویکاریو کی منگیتر پرودنسیا کو تیس کا تھا۔ جب بھی وہ دونوں وہاں سے گزرتے، خاص طور پر جمعے کے دن بازار جاتے ہوئے، وہ اندر آ کر دن کا پہلا کافی کا پیالا پییتے تھے۔ وہ دروازے کو دھکا دے کر صحن میں داخل ہوئے اور کتوں کے محاصرے میں، جنھوں نے صبح کی مدھم روشنی میں انھیں پہچان لیا تھا، پرودنسیا کو تیس کی ماں کو باورچی خانے میں سلام کیا۔ کافی ابھی تیار نہیں ہوئی تھی۔

"بعد میں سہی،" پابلو ویکاریو نے کہا۔ "ابھی ہم جلدی میں ہیں۔"
 "میں سمجھ سکتی ہوں میرے بیو،" وہ بولی۔ "عزت انتظار نہیں کرتی۔"

بہر صورت، انھوں نے انتظار کیا، اور اس بار یہ پیدرو ویکاریو تھا جس نے سوچا کہ اس کا بھائی عمو وقت صانع کر رہا ہے۔ جب وہ کافی پی رہے تھے، پرودنسیا کو تیس، غنغوان شہاب کی پوری رعنائی میں، پرانے اخباروں کا ایک ڈھیر اسٹوو کی آگ کو تازہ کرنے کے لیے ساتھ لے کر باورچی میں آئی۔ "مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا کرنے والے ہیں،" اس نے مجھے بتایا۔ "اور میں نے نہ صرف اتفاق کیا، بلکہ میں کبھی اس سے شادی نہ کرتی اگر اس نے وہ نہ کیا ہوتا جو ایک مرد پر لازم تھا۔" باورچی خانے سے جاتے ہوئے پابلو ویکاریو نے اس سے اخباروں کے دو ورق لیے، اور ان میں سے ایک اپنے بھائی کو چھڑے لیٹنے کے لیے دیا۔ پرودنسیا کو تیس باورچی خانے کے دروازے کے پاس کھڑی، صحن کے دروازے سے باہر چلے جانے تک انھیں دیکھتی رہی، اور اس نے تین سال تک، حوصلہ شکنی کے ایک لمحے کے بغیر، انتظار کیا، یہاں تک کہ پابلو ویکاریو جیل سے باہر آیا اور زندگی بھر کے لیے اس کا شوہر بن گیا۔

"اپنا ٹھیک سے خیال رکھنا،" اس نے ان سے کہا۔

اس طرح کلوتیلدے آرمٹا کے پاس یہ محسوس کرنے کی معقول وجہ تھی کہ وہ دونوں پہلے جیسے پُر عزم نہیں رہ گئے ہیں، اور اس نے انھیں راگنٹ ریم کی ایک بوتل اس امید میں پیش کی کہ وہ ان کو مکمل مدد بوش کر دے گی۔ "اس دن،" اس نے مجھے بتایا، "مجھے اندازہ ہوا کہ ہم عورتیں دنیا میں کتنی تنہا ہیں۔" پیدرو ویکاریو نے اس سے کہا کہ وہ اپنے شوہر سے ڈارمچی بنانے کا سامان مانگ لائے، اور وہ اس کے لیے برش، صابن، آویزاں آئینہ اور نئے بلیڈ والا سینٹی ریزر لے آئی، مگر اس نے اپنے قصابی چھڑے سے ڈارمچی بنائی۔ کلوتیلدے آرمٹا نے سوچا کہ یہ جارج مردانگی کی انتہا ہے۔ "وہ کسی فلم کے قاتل کی طرح لگ رہا تھا،" اس نے مجھے بتایا۔ مگر جیسا کہ پیدرو ویکاریو نے

مجھے بعد میں بتایا، اور یہ درست بھی تھا، فوج میں اس نے سیدھے استرے سے ڈاڑھی بنانا سیکھ لیا تھا اور اس کے بعد وہ کسی اور طرح سے ڈاڑھی نہیں بنا سکتا تھا۔ اس کے بھائی نے، اس کے برعکس، زیادہ انگار کے ساتھ دونوں روجیلو دے لافلور سے مستعار لیے ہوئے سیفٹی ریزر سے ڈاڑھی بنائی۔ آخر میں انھوں نے خاموشی سے، سرخیزوں کی سی سادہ لوجی کے ساتھ سرکل کے پار مکان کی تاریک کھڑکی کو نکلتے ہوئے، بہت دھیرے دھیرے رَم کی بوتل ختم کی، جس کے دوران فرضی گاہک، اس دودھ کو خریدنے جو انھیں درکار نہیں تھا اور ان خوردنی اشیاء کو طلب کرتے ہوئے جو وہاں موجود نہیں تھیں، دکان میں یہ دیکھنے کی غرض سے آتے رہے کہ آیا یہ درست ہے کہ وہ سانتیاگو نسر کو قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

ویکاريو برادران کبھی اس کھڑکی کو روشن نہیں دیکھنے والے تھے۔ سانتیاگو نسر چار بیس پر گھر آیا، مگر اسے شبِ خوابی کے کمرے تک پہنچنے کے لیے کسی بٹی کو بلانے کی ضرورت نہیں پڑی کیوں کہ جائے درکار بلب تمام رات جلتا رہا تھا۔ اس نے خود کو تاریکی میں، کپڑوں سمیت، بستر پر گرا دیا کیوں کہ اس کے پاس سونے کے لیے صرف ایک گھنٹا بچا تھا، اور وکٹوریا گرنان نے اسے اسی حالت میں پایا جب وہ اسے بپ کے استقبال کو جانے کے لیے نیند سے جگانے آئی۔ ہم ماریا الیہاندرنا سروانتس کے بال تین بچے کے بعد تک ساتھ رہے تھے، جب اُس نے خود موسیقاروں کو رخصت کیا اور رقص کے صحن کی بٹیاں بجائیں تاکہ اس کی عیش آفریں ملاٹھ لڑکیاں تنہا بستر پر جا سکیں اور تھوڑا سا آرام کر لیں۔ وہ تین دن سے، رُکے بغیر، پہلے مہمانانِ نکرہ کی درپردہ دگلیری، اور پھر ہم میں سے ان کی جو اس وقت تک شادی کی ہنگامہ خیزیوں کے باوجود نا آسودہ تھے، واشگاف دل بستگی میں مصروف تھیں۔ ماریا الیہاندرنا سروانتس، جس کے بارے میں ہم کہا کرتے تھے کہ وہ صرف ایک بار سونے جائے گی اور یہ مرنے کے لیے ہوگا، ان تمام عورتوں میں جن سے میں اپنی زندگی میں واقف ہوا، سب سے زیادہ خوش ادا اور سب سے زیادہ نرم و نازک عورت تھی، اور بستر میں سب سے زیادہ قابلِ استفادہ، مگر وہ سب سے زیادہ سخت گیر بھی تھی۔ وہ ہمیں بلی بڑھی اور ہمیں کھلے دروازوں والے ایک مکان میں رہتی تھی جس میں کئی عمارتی کمرے، اور پاراماریبو کے جینی بازار سے لائی ہوئی تونبی لائینوں سے آراستہ، رقص کا ایک وسیع صحن بھی تھا۔ یہ وہی تھی جس نے سیرے ہم عمروں کو کنوارپن سے آزاد کیا۔ اس نے ہمیں اس سے کہیں زیادہ سکھایا جتنا ہمیں سیکھنا چاہیے تھا، مگر اس نے ہمیں سب سے بڑھ کر یہ سکھادیا کہ زندگی میں خالی بستر سے زیادہ اُداس کوئی جگہ نہیں۔ سانتیاگو نسر اسے پہلی بار دیکھتے ہی حواس کھو بیٹھا تھا۔ میں نے اسے خبردار کیا: ”وہ شاہین جو کسی مہارِ طلب کو بچ کا تعاقب کرے، اسے صرف ایک

اندوہناک زندگی کی امید رکھنی چاہیے۔ ”مگر، ماریا الیہاندرینا سروانتس کی پُرفریب پیش رفت سے مسرور ہو کر، اس نے میری نہیں سنی تھی۔ وہ اس کا جٹون تھی، پندرہ سال کی عمر میں اس کے آنسوؤں کی مشق تھی، یہاں تک کہ ابراہیم نصر نے اپنے بیٹے کو ایک چابک کی مدد سے بستر سے باہر نکالا اور ایک سال سے زیادہ کے لیے ڈیوائس فیس میں بند کر دیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک ان میں، محبت کے اختلال کے بغیر، ایک مضبوط ربط قائم تھا، اور وہ اس کا اتنا پاس رکھتی تھی کہ اس کی موجودگی میں کسی اور کے ساتھ کبھی بستر پر نہیں گئی۔ ان آخری تعطیلات میں وہ ممکن کا بہانہ کر کے ہمیں جلدی بگا دیا کرتی، مگر دالان کو روشن، اور دروازے کو آگلی چڑھائے بغیر چھوڑ دیتی تاکہ میں چھپ کر آسکوں۔

سانتیاگو نصر میں ہمیں بدلنے کا ایک سر آئینہ جوہر تھا، اور اس کا دل پسند مشغلہ ملائو لڑکیوں کی شناخت تبدیل کر دینا تھا۔ وہ ایک کی کپڑوں کی الماری کو اُچار کر دوسری کا ہمیں بدل دیتا، اور وہ تمام خود کو اپنے آپ سے مختلف، اور ان کی طرح جو وہ نہیں تھیں، موسس کرنے لگتیں۔ ایک خاص موقع پر ان میں سے ایک لڑکی نے خود کو ایک اور میں اتنے مکمل طور پر دوہرایا ہوا پایا کہ اس پر رونے کا دورہ پڑ گیا۔ ”مجھے لگا کہ میں آئینے سے ٹکل کر آگئی ہوں،“ اس نے کہا۔ مگر اس رات ماریا الیہاندرینا سروانتس نے سانتیاگو نصر کو آخری بار ہمیں تبدیل کرنے والے کی حیثیت سے شعبہ بازی میں مشغول ہونے نہیں دیا، اور یہ اس نے اتنے فاش بہانے سے کیا کہ اس کی یاد کی چھوٹی ہوئی تھی نے اس کی زندگی بدل کر رکھ دی۔ اس لیے ہم نے سیرینادوں کا گنت کرنے کے لیے موسیقاروں کو اپنے ساتھ لیا، اور تقریب کو اپنے طور پر جاری رکھا، جب کہ ویکاریو برادران سانتیاگو نصر کو قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ خیال اُسی کو آیا تھا کہ بیسوس کے مکان کی پہاڑی پر جا کر نعرہ سوں کے لیے گیت گایا جائے۔

نہ صرف ہم نے کھڑکی کے نیچے گیت گایا بلکہ باغوں میں آتش بازیوں بھی چھوڑیں۔ اس کے باوجود ہمیں فارم ہاؤس میں زندگی کی کوئی علامت موسس نہیں ہوئی۔ یہ ہمارے تصور میں بھی نہیں آیا کہ وہاں کوئی نہیں ہوگا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ کھلی ہوئی چھت والی، اور جشن کے لیے سائٹس کے رہن اور موسمی اور نرج بلاسم کے گلدستوں سے آراستہ، نئی کار اس وقت دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ میرے بھائی لوئس اینریک نے، جو اس وقت ایک پیشہ ور کی طرح گٹار بجاتا تھا، نعرہ سوں کے اعزاز میں فی البدیہہ ایک ذومعنی نغمہ بنایا۔ اس وقت تک بارش نہیں ہوئی تھی۔ اس کے برعکس، چاند آسمان پر بلند تھا، اور ہوا شفاف تھی، اور پہاڑی کے قدموں میں قبرستان سے آتی ہوئی ولی ایلمو کی آگ کی جھللاہٹ دیکھی جاسکتی تھی۔ دوسری جانب چاندنی میں کیلے کے نیلگوں

بانات، حُزن آلود دلدلوں اور کریمیں کے ضیا پاش افق کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ سانتیاگو نصر نے سمندر میں ایک جلتی بجھتی روشنی کی طرف اشارہ کیا اور ہمیں بتایا کہ وہ ایک غلام بردار جہاز کی، اذیت میں گرفتار روح ہے جو سیڈنگل سے سیاہ فاموں کے بار کے ساتھ کار تاجینا دے آندیا ز کی مرکزی بندرگاہ کے دبانے کے بالمقابل غرق ہوا تھا۔ یہ سوچنا ناممکن تھا کہ اس کا ضمیر اسے سلامت کر رہا ہوگا، ہر چند کہ اس وقت وہ نہیں جانتا تھا کہ انجلا ویکاریو کی ایک روزہ عروسانہ زندگی دو گھنٹے پہلے اپنے اختتام کو پہنچ چکی ہے۔ بیارود سان رومان اسے اس کے والدین کے ہاں پیدل لے گیا تھا تاکہ موٹر کی آواز اس کی بد قسمتی کو قبل از وقت افشا نہ کر دے، اور وہ وہاں سے بیوس کے پُرسرت فارم باؤس کی تاریکی تک تنہا واپس آیا تھا۔

جب ہم پہاڑی سے اترے تو میرے بھائی نے ہمیں بازار میں ایک دکان پر بُھنی ہوئی مچھلیوں کا ناشتہ کرنے کی دعوت دی، مگر سانتیاگو نصر نے اس کی مخالفت کی کیوں کہ وہ بپ کے آنے سے پہلے ایک گھنٹے کی نیند لینا چاہتا تھا۔ وہ کرسٹو بیدویا کے ساتھ دریا کے کنارے کنارے، پرانی بندرگاہ کے پاس ناداروں کی طعام گاہوں سے گزرتا ہوا گیا جواب روشن ہونے لگی تھیں، اور کونے پر مڑنے سے پہلے اس نے ہاتھ بلا کر ہمیں الوداع کہا۔ یہ آخری موقع تھا کہ ہم نے اسے دیکھا۔

کرسٹو بیدویا نے، جس سے اس نے بعد میں گووی پر ملنے کا وعدہ کیا تھا، اس سے اس کے گھر کے عقبی دروازے پر اجازت لی۔ کتے حسب معمول اسے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر اس پر بھونکنے مگر اس نے انہیں نیم روشنی میں اپنی چابیوں کی جھنڈا سے چپ کرادیا۔ وکتوریا گنان کافی کی کیتلی پر نظر رکھے ہوئے تھی جب وہ باورچی خانے کے پاس سے گزرا۔ "سانتیاگو نصر،" اس نے اسے پکارا۔ "کافی تیار ہونے والی ہے۔"

سانتیاگو نصر نے اس سے کہا کہ وہ تھوڑی دیر بعد کافی پیے گا، اور اسے ہدایت کی کہ وہ دیونا فلور کو اسے پانچ تیس پر اٹھانے کے لیے کہہ دے اور اس کے لیے صاف لباس بھجوا دے، بالکل ویسا ہی جیسا وہ پسینے ہوئے تھا۔ ایک لمحے بعد، جب وہ بستر پر جا چکا تھا، وکتوریا گنان نے کلوئیدے آرمینا کا بھجوا ہوا پیغام دودھ مانگنے والی عورت کے ذریعے وصول کیا۔ پانچ تیس پر اس نے اسے اٹھا دینے کے حکم پر عمل کیا، مگر اس نے دیونا فلور کو نہیں بھیجا اور شب خوابی کے کمرے میں اصلی لین کے کپڑے لے کر خود گئی کیوں کہ وہ اپنی لڑکی کو آں محترم کے چُنگل سے دور رکھنے کا کوئی موقع صانع نہیں کرتی تھی۔

ماریا الیہاندرینا سروانتس نے اپنے گھر کا دروازہ آگ ل چڑھائے بغیر چھوڑ دیا تھا۔ میں نے

اپنے بھائی سے رخصت لی، برآمدے کو لا نکھا، جس میں ملا تو لڑکیاں گل لالہ کے درمیاں سٹ سٹا کر سو رہی تھیں، اور شب خوابی کے کمرے کا دروازہ دسک دیے بغیر کھولا۔ بٹیاں بچہ بچی تھیں مگر جیسے ہی میں داخل ہوا مجھے ایک گرم عورت کی خوشبو محسوس ہوئی اور تاریکی میں ایک بے خواب جیتے کی آنکھیں نظر آئیں، اور پھر میں نے اپنے بارے میں گھنٹیوں کا شور شروع ہونے سے پہلے کچھ نہیں جانا۔

گھر جاتے ہوئے میرا بھائی کھوتیلدے آرمنٹا کی دکان پر سگریٹ لینے رکا۔ وہ اتنی پی چکا تھا کہ اس کی یادداشت اس ملاقات کے بارے میں ہمیشہ بہت پراگندہ رہی، مگر وہ اس قاتل شراب کو فراموش نہیں کر سکا جو بیدرو ویکاریو نے اسے پیش کی۔ "وہ پگھلی ہوئی آگ تھی،" اس نے مجھے بتایا۔ پابلو ویکاریو، جو سوچا تھا، اس کے آنے کی آواز سن کر جاگ اٹھا، اور اسے بچھا دیا۔ "ہم سانتیاگو نصر کو قتل کرنے جا رہے ہیں،" اس نے اسے بتایا۔

میرے بھائی کو یہ بات یاد نہیں۔ "اگر مجھے یاد بھی ہوتا، میں کبھی اس پر اعتبار نہ کرتا،" اس نے مجھ سے کئی بار کہا۔ "کون حرام زادہ کبھی سوچ سکتا تھا کہ وہ دونوں کسی کو قتل کر دیں گے، اور وہ بھی سڑوں کے بچے سے۔" پھر انھوں نے اس سے پوچھا کہ سانتیاگو نصر کہاں ہے، کیوں کہ انھوں نے ان دونوں کو ساتھ دیکھا تھا، اور میرے بھائی کو اپنا جواب بھی یاد نہیں۔ مگر کھوتیلدے آرمنٹا اور ویکاریو برادران اسے سن کر اتنے بدحواس ہوئے تھے کہ ریل میں اسے دو الگ الگ بیانون میں برقرار رکھا گیا۔ بقول ان کے میرے بھائی نے کہا تھا، "سانتیاگو نصر مرچکا ہے۔" پھر اس نے انھیں ایک کلیسیائی دعا دی، چوکھٹ سے نکلایا اور لکھڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔ چوک کے درمیان اس نے فادر لادور کو دیکھ کر صلیب کا نشان بنایا۔ وہ اپنی عبا میں لمبوس، گھنٹیاں بجاتے ہوئے ماتحت اور جپ کے میدانی وعظ کے لیے مہراب اٹھائے ہوئے کئی مددگاروں کے آگے آگے، گودی کی طرف جا رہا تھا۔ ویکاریو برادران نے بھی انھیں گزرتا دیکھ کر صلیب کے نشانات بنائے۔

کھوتیلدے آرمنٹا نے مجھے بتایا کہ انھوں نے اپنی آخری امیدیں ہار دیں جب فادر لادور اس کی دکان کے پاس سے گزرا۔ "میں نے سمجھا کہ اسے میرا پیغام نہیں ملا،" اس نے کہا۔ اس کے باوجود فادر لادور نے برسوں بعد، کالافل کے اداس آرام گھر میں دنیا سے کنارہ کشی کے زمانے میں، مجھ سے اعتراف کیا کہ درحقیقت اسے کھوتیلدے آرمنٹا کا پیغام، اور دوسروں کے زیادہ قطعی پیغامات، جب وہ گودی پر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا، مل گئے تھے۔ "سچ بات یہ ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرنا چاہیے،" اس نے مجھے بتایا۔ "میرا پہلا خیال یہ تھا کہ یہ میرا نہیں بلکہ

شہری حکام کا مسئلہ ہے، مگر پھر میں نے ارادہ کیا کہ گزرتے ہوئے پلاسیڈا لینیرو کو بتاتا جاؤں۔" اس کے باوجود جب اس نے چوک کو پار کیا، وہ بالکل بھول چکا تھا۔ "تمہیں سمجھنا پڑے گا،" اس نے مجھے بتایا، "کہ اس بد قسمت دن بپ آ رہا تھا۔" جرم کے لمحے میں اسے اتنی ناامیدی محسوس ہوئی، اور وہ اپنے آپ سے اتنا متفر ہوا، کہ واحد چیز جو وہ سوچ سکا، اگل گئے کی اطلاع دینے والی گھنٹی کا بجانا تھا۔

میرا بھائی لوئس ایمریک باورچی خانے کے دروازے سے گھر میں داخل ہوا، جو میری ماں نے کھلا چھوڑ دیا تھا تاکہ میرا باپ ہمارے اندر آنے کی آواز نہ سن سکے۔ وہ بستر پر جانے سے پہلے غسل خانے میں گیا مگر ٹوائلٹ پر بیٹھے بیٹھے سو گیا، اور جب میرا بھائی جیسے اسکول جانے کے لیے اٹھا، اس نے اسے فرش پر منہ کے بل پڑے، نیند میں گانا گاتے ہوئے پایا۔ میری راہبہ بہن، جو بپ کا انتظار نہیں کر رہی تھی، کیوں کہ وہ اپنے جذب کے لیے اس کی محتاج نہیں تھی، اسے جاگنے پر آمادہ نہیں کر سکی۔ "پانچ بج رہے تھے جب میں غسل خانے میں گئی،" اس نے مجھے بتایا۔ بعد میں جب میری بہن مارگوت، گودی پر جانے سے پہلے، نہانے کے لیے غسل خانے میں گئی، بڑی جدوجہد کے بعد اسے شب خوانی کے کمرے میں گھسیٹ لانے میں کامیاب ہو سکی۔ نیند کی دوسری جانب سے اس نے بپ کی کشتی کے اولین شور کو جاگے بغیر سنا۔ مے گساری سے چورہ پھر گہری نیند میں چلا گیا، یہاں تک کہ میری راہبہ بہن شب خوانی کے کمرے میں آئی اور بھاگتے ہوئے اپنا کلیسائی لباس پہننے کی کوششوں کے دوران اسے اپنی پاگل چیخ سے جگا دیا۔ "انہوں نے سانتیاگو کو قتل کر دیا ہے۔"

لاش کو چاقوؤں سے مجروح کرنا اس بے رحم معائنے کی محض ابتدا تھی جسے انجام دینے پر فادر
 مادور نے ڈاکٹر دیونیسو اگواران کی عدم موجودگی میں خود کو مجبور پایا۔ "یہ ایسا تھا کہ گویا ہم نے
 اس کے مر جانے کے بعد اسے از سر نو قتل کیا،" عمر سید فادر مادور نے مجھے کالافل میں اپنی کنارہ
 کشی کے زمانے میں بتایا۔ "مگر یہ حکم میسر کے پاس سے آیا تھا، اور اُس وحشی کے احکام چاہے کتنے
 ہی جا بلانہ کیوں نہ ہوں، بجالانے پڑتے تھے۔" یہ پورے طور پر درست نہیں تھا۔ اس بے سرو پا
 سوموار کو کرنل آپونٹے نے صوبے کے گورنر سے ٹیلیگراف پر ایک ہنگامی گفتگو کی تھی، اور
 موخر الذکر نے اسے تفتیشی مجسٹریٹ کی آمد تک ابتدائی اقدامات کی اجازت دے دی تھی۔ میسر
 قانونی امور سے بے بہرہ، ایک سابق فوجی کمانڈر تھا جس کے غرور نے اسے اجازت نہیں دی کہ وہ
 کسی سے پوچھ لیتا کہ اسے کہاں سے آغاز کرنا چاہیے۔

پہلا خیال جو اسے آیا وہ پس مرگ معائنے کا تھا۔ کرسٹو بیدویا نے، جو میڈیسن کا طالب علم
 تھا، سائنٹیا گو نسر سے اپنی قریبی دوستی کی وجہ سے، کسی نہ کسی طرح، اس میں ملوث نہ ہونے کا
 بندوبست کر لیا۔ میسر کا خیال تھا کہ ڈاکٹر دیونیسو اگواران کے واپس آنے تک لاش کو

ریفرز-بجیشن میں رکھا جائے، مگر اسے قد آدم فریزر نہیں مل سکا؛ اور بازار میں واحد فریزر جس سے کام چل سکتا، خراب پڑا تھا۔ لاش لوہے کی ایک تنگ چارپائی پر، عوامی دیدار کے لیے، رہنے کے کمرے کے وسط میں بے کفن رکھی گئی تھی۔ اسی دوران، اس کے لیے ایک ریسیانہ تابوت بنایا جا رہا تھا۔ وہ شب خوابی کے کمروں، اور چند پڑوسیوں کے گھروں سے پنکھے لے آئے تھے، مگر اتنے لوگ اسے دیکھنے کو بے تاب تھے کہ انہیں فرنیچر کو پیچھے کھسکانا، اور چڑیوں کے پنجروں اور قرن کے گملوں کو نیچے لے جانا پڑا، مگر اس کے بعد بھی وہاں گرمی ناقابلِ برداشت تھی۔ اس کے علاوہ، موت کی بو سے بھرمل اٹھے ہوئے کتوں نے وحشت کو اور بڑھا دیا تھا۔ انہوں نے اس وقت سے واویلا کرنا بند نہیں کیا تھا جب میں اس گھر میں داخل ہوا تھا؛ اس لمحے تک سانتیاگو نصر باورچی خانے میں جاں کنی کی حالت میں پڑا تھا، اور میں نے دیونا فلور کو اونچی چٹنوں کے ساتھ روتے اور انہیں ایک ڈنڈے سے پرے ہٹاتے دیکھا۔

"میری مدد کرو،" اس نے چلا کر مجھ سے کہا۔ "یہ اس کی انٹریاں کھانا چاہتے ہیں۔" ہم نے انہیں اصلبل میں بند کر دیا۔ پلاسیدا لینیرو نے بعد میں حکم دیا کہ تدفین ہو جائے تک انہیں کسی بہت دور جگہ پر لے جایا جائے۔ مگر دوپہر کے قریب، کوئی نہیں جانتا کہ کس طرح، وہ وہاں سے نکل آئے اور پاگل ہوتے ہوئے، گھر میں گھس آئے۔ پلاسیدا لینیرو، صرف ایک بار اپنی گرفت کھو بیٹھی۔

"یہ غلیظ کتے!" وہ چیخی۔ "انہیں جان سے مار دو۔"

حکم پر فوری عمل درآمد کیا گیا، اور گھر پھر خاموش ہو گیا۔ اس وقت تک کسی کو لاش کی حالت کے بارے میں کوئی تحویش نہیں تھی۔ چہرہ صبح سالم تھا، انہیں تاثرات کے ساتھ جو اس پر گانا گاتے وقت تھے، اور کرسٹو بیدویا نے انٹریوں کو واپس اندر ڈال دیا تھا اور لاش کو لینن کی چادر سے لپیٹ دیا تھا۔ اس کے باوجود، سہ پہر میں رنخوں سے شیرے کے رنگ کا سیال بہنا شروع ہو گیا، جس پر مکھیاں جمع ہو رہی تھیں، اور ایک اودا دجبا اوپری ہونٹ پر ابھر آیا اور بہت آہستہ سے، پانی پر بادل کے سانے کی طرح، اس کی پیشانی تک پھیل گیا۔ اس کے چہرے نے، جو ہمیشہ سے دوستانہ تھا، ایک معاندانہ تاثر اختیار کر لیا، اور اس کی ماں نے اسے ایک رومال سے ڈھانک دیا۔ کرنل آپونٹے نے سجدہ لیا کہ مزید تاخیر نہیں کی جاسکتی، اور اس نے فادر لامادور کو معائنہ کرنے کا حکم دیا۔ "ایک ہفتے بعد قبر کھود کر اسے نکالنا اور بھی بدتر ہو گا،" اس نے کہا۔ فادر لامادور نے سالانہ میں میڈیسن اور سرجری پڑھی تھی، مگر فارغ التحصیل ہونے سے پہلے وہ پادریوں کی درس گاہ میں داخل ہو گیا تھا۔ میسر کو علم تھا کہ اُس کے کیے ہوئے معائنے کی کوئی قانونی حیثیت نہیں، اس

کے باوجود اس نے اپنے حکم پر عمل کروایا۔

یہ پبلک اسکول میں، ایک دوا ساز، جس نے تفصیلات درج کیں، اور تعطیلات پر آئے ہوئے میڈیسن کے ایک طالب علم کی مدد سے انجام دی گئی ایک خوں ریزی تھی۔ جراحی کے صرف چند معمولی آلات دستیاب تھے، بقیہ اوزار بڑھئی کے ہاں سے آئے۔ مگر لاش پر برپا کی ہوئی تباہی سے قطع نظر، فادر امادور کی رپورٹ درست معلوم ہوتی تھی، اور تفتیش کرنے والے نے اسے مسل میں ایک کارآمد دستاویز کے طور پر شامل کیا۔

متعدد زخموں میں سے سات مہلک تھے۔ سامنے کے دو شکافوں کی وجہ سے جگر، تقریباً، ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ اس کا پیٹ چار جگہوں پر چاک ہوا تھا، اور ان میں سے ایک وار اتنا گہرا تھا کہ اس نے معدے کے پار نکل کر لبلبے کو تباہ کر دیا تھا۔ چھ کم تر شکاف بڑی آنت کے زیریں حصے کے چوڑے رخ پر، اور کئی چھوٹی آنت پر تھے۔ صرف ایک وار نے، جو پشت کے تیسرے مہرے کی سطح پر تھا، اس کے دائیں گردے کو چھید دیا تھا۔ شکی جوف خون کے بڑے قمتوں سے بھر گیا تھا، اور معدے کے ملغوبے کے درمیان مریم کارمیل کا ایک تمنا ٹکڑا جو سانتیاگو نصر نے چار سال کی عمر میں نگل لیا تھا۔ صدری جوف میں دو شکاف ظاہر ہوئے: ایک دائیں پہلو کے درمیانی حصے میں، جس نے پیمپیٹھوں کو زخمی کیا، اور دوسرا بائیں بغل کے بالکل ساتھ۔ اس کے بازوؤں اور باتھوں پر بھی چھ کم تر زخم تھے، اور دو افقی شکاف تھے: ایک دائیں ران پر اور دوسرا معدے کے عضلات میں۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک گہرا زخم تھا۔ رپورٹ میں درج ہے: "لاش مسیح مصلوب کے زخموں کا ایک نقش نظر آرہی تھی۔" مغز کا وزن ایک اوسط انگریز کے مغز سے ساٹھ گرام زیادہ نکلا، اور فادر امادور نے رپورٹ میں درج کیا کہ وہ اعلیٰ ذہانت اور شان دار مستقبل رکھتا تھا۔ پھر بھی، اپنے حسی نوٹ میں اس نے جگر کے معمول سے زیادہ بڑے ہونے کی طرف اشارہ کیا جس کا اس نے یرقان کے ناقص علاج کو مورد ٹھہرایا۔ "بھنا یہ چاہیے،" اس نے مجھے بتایا، "کہ اس کے پاس، ہر حال میں، زندگی کے چند ہی سال رہ گئے تھے۔" ڈاکٹر دیونیسو اگواران نے، جس نے درحقیقت سانتیاگو نصر کے یرقان کا بارہ سال کی عمر میں علاج کیا تھا، اس معائنے کو برہمی سے یاد کیا۔ "صرف کوئی راسب ہی اتنا احمق ہو سکتا ہے،" اس نے مجھے بتایا۔ "ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ اسے سمجھایا جاسکے کہ ہم منطقہ خارہ کے باشندے ان خام کالیشیائی اسپانیولیوں سے بڑے جگر رکھتے ہیں۔" رپورٹ اس نتیجے پر پہنچی کہ موت کا سبب خون کا کثیر اخراج تھا جو سات بڑے زخموں میں سے کسی ایک کی وجہ سے عمل میں آیا۔

انہوں نے ہمیں ایک بالکل مختلف لاش لوٹائی۔ کاسہ سر کا آدھا حصہ سوراخ کرنے سے

صانع ہو چکا تھا، اور عورتوں کو بہ آسانی اپنا شیفٹ بنالینے والا چہرہ، جسے موت تک نے محفوظ رکھا تھا، اپنی شناخت کھو بیٹھا تھا۔ مزید یہ کہ فادر لادور نے کئی ہوئی انٹریوں کو جڑ سے کھینچ لیا تھا، مگر آخر میں اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ ان کا کیا کرے، سو اس نے ان کے لیے مغفرت کی دعا کی اور انہیں کوڑے کی بالٹی میں ڈال دیا۔ پبلک اسکول کی کھڑکیوں سے لگے آخری تماشاویں نے اپنی دل چسپی کھودی، مددگار بے ہوش ہو گیا، اور کرنل آپونے، جس نے بہت سے ظالمانہ قتل عام دیکھے اور کیے تھے، ایک نہایت خور اور ارواح پرست ثابت ہوا۔ پیسٹرمٹوں اور آن جیجے چونے سے بھرا، اور بے دردی کے ساتھ موٹی ڈوری اور سوسے سے سیا ہوا خالی پوست بکھر جانے کی نوبت پر تعجب ہم نے اسے ریشمی لحاف کی تہوں والے نئے تابوت میں لٹایا۔ "میرا خیال تھا کہ وہ اس طرح زیادہ دیر تک محفوظ رہے گا،" فادر لادور نے مجھے بتایا۔ اس کے بالکل برخلاف ہوا، اور ہمیں صبح کو اسے عجلت میں دفن کرنا پڑا کیوں کہ لاش اتنی بُری حالت میں تھی کہ گھر میں اسے رکھنا ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔

مٹگل کا ابراؤدودن شروع ہو رہا تھا۔ میں اس افسردہ ساعت کے خاتمے پر سونے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا، اور میں نے جا کر ماریا الیہاندرنا سروانتس کے دروازے کو دھکا دیا، کہ شاید اس نے آگ ل نہ چڑھائی ہو۔ روشن تو نبی لائینیں درختوں سے آویزاں تھیں اور رقص کے صحن میں کئی الاؤ بل رہے تھے جن پر رکھے بھاپ اُگتے برتنوں کے پاس ملا تو لڑکیاں اپنے تقریبات کے لباسوں پر سوگ کے رنگ لگا رہی تھیں۔ میں نے ماریا الیہاندرنا سروانتس کو علی الصباح بیدار پایا، اور مکمل برہنہ، جیسی کہ وہ ہمیشہ، جب کوئی اجنبی موجود نہ ہوتا، رہا کرتی تھی۔ وہ ترکی خور کی طرح اپنے پُر شکوہ بستر پر ایک باہلی خوان کے سامنے اُگڑوں بیٹھی تھی، جس میں پھڑے کے گوشت کے کباب، اُبلی ہوئی مرغی، سور کے پُٹے، اور کیلوں اور سبزیوں کا ایک ڈھیر تھا جو پانچ افراد کے لیے کافی ہوتا۔ غیر متناسب خوراک ہمیشہ سے اس کے ماتم کرنے کا واحد طریقہ تھا، اور میں نے کبھی اس کو یہ فعل اتنے سخت رنج کے ساتھ کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ میں خاموشی سے، اور خود اپنے طور پر ماتم کرتے ہوئے، اس کے پہلو میں، کپڑے اتارے بغیر لیٹ گیا۔ میں سانتیاگو نصر کی تقدیر کی سفاکی پر غور کر رہا تھا، جس نے خوشیوں کے بیس سال کے عوض نہ صرف اس کی زندگی بلکہ اس کے اعضا کا جدا ہونا، بکھر جانا اور مکمل تباہ ہونا بھی طلب کیا۔ میں نے خواب میں ایک عورت کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا جو اپنے بازوؤں میں ایک بچی کو لیے ہوئے تھی اور وہ بچی، سانس لینے کور کے بغیر، منہ چلا رہی تھی، اور مکئی کے آدھ چپے دانے عورت کی بریزنہ سر میں گر رہے تھے۔ عورت بچی کے منہ چلانے کے انداز کی کسی پرندے سے مماثلت کے بارے میں مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی۔

اچانک میں نے ان بے قرار انگلیوں کو محسوس کیا جو میری قمیص کے بٹن کھول رہی تھیں، اور میں نے محبت کے درندے کی خطرناک بو اپنے پہلو میں محسوس کی اور خود کو اس کے لطف کے گرداب کی لذت میں ڈوبنا پایا۔ مگر فوراً، وہ رک گئی؛ پھر اس کے سانسوں کی آواز دور سے آئی؛ اور وہ میری زندگی سے نکل گئی۔

"مجھ سے نہیں ہوگا،" اس نے کہا۔ "تم میں سے اُس کی سی بو آتی ہے۔"

صرف میں ہی نہیں۔ اس دن ہر شے سانتیاگو نصر کی طرح مہکتی رہی۔ ویکاریو برادران نے اس کو جیل کی کوٹھری میں محسوس کیا، جہاں میسر نے انہیں، اس وقت تک کے لیے جب وہ ان کی بابت کوئی فیصلہ کر سکے، مقفل کر رکھا تھا۔ "جتنا بھی میں نے صابن اور تولیے سے رگڑ رگڑ کر صاف کیا، اس بو سے نجات نہیں پاسکا،" پیدرو ویکاریو نے مجھے بتایا۔ وہ تین راتیں سوئے بغیر گزار چکے تھے، مگر انہیں نیند نہیں آرہی تھی کیوں کہ وہ سوتے ہی اپنے خواب میں جرم کا پھر سے ارتکاب کرنا شروع کر دیتے۔ اب، جب کہ وہ اپنے بڑھاپے میں ہے، اپنی ذہنی حالت کی وضاحت کرتے ہوئے پابلو ویکاریو نے مجھے کسی کوشش کے بغیر بتایا: "یہ دوہری بیداری کی طرح تھا۔" اس فقرے نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا کہ جیل میں جو چیز ان کے لیے سب سے زیادہ ناقابلِ برداشت رہی ہوگی وہ ان کے ہوش مندی کے لمحات تھے۔

کمرہ دس فیٹ مربع تھا، اور اس میں لوہے کی سلاخوں والا ایک بہت اونچا روشن دان، پیشاب کا ایک برتن، ایک سلفیجی مع اپنے کوزے اور آب گیر کے، اور پوال کے گدوں کے دو عارضی بستر تھے۔ کرنل آپونٹے کا، جس کے احکامات کے تحت یہ کمرہ تعمیر کیا گیا تھا، کہتا تھا کہ کوئی ہوٹل اس سے زیادہ متواضع نہیں تھا۔ میرے بجائی لوئس اینریک نے اتفاق کیا، کیوں کہ ایک رات انہوں نے موسیقاروں کے درمیان جھگڑے کے بعد اسے وہاں بند کیا تھا اور میسر نے انسانی ہمدردی کے تحت اسے ملا توڑ کیوں میں سے ایک کو اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت دی تھی۔ ویکاریو برادران بھی صبح آٹھ بجے شاید یہی سوچ سکتے تھے، جب انہوں نے خود کو عربوں کی زد سے محفوظ محسوس کیا۔ اس لمحے وہ اپنے فرض کو بجالانے کے اعزاز سے آسودہ خاطر تھے، اور ایک ہی چیز جو انہیں تنگ کر رہی تھی وہ بو کا ختم نہ ہونا تھا۔ انہوں نے ڈھیر سارا پانی، کپڑے دھوئے کا صابن اور تولیے طلب کیے، اور اپنے بازوؤں اور چہرے سے خون کو دھویا، انہوں نے اپنی قمیصیں بھی دھوئیں، مگر وہ سکون نہ پاسکے۔

پیدرو ویکاریو نے اپنی قبض کشا اور پیشاب آور دوائیں مگوائیں، اور جراثیم سے پاک پٹیاں بھی طلب کیں تاکہ وہ انہیں تبدیل کر سکے، اور وہ صبح کے عرصے میں دو مرتبہ پیشاب خارج کرنے

میں کامیاب ہوا۔ اس کے باوجود دن چڑھتے چڑھتے، زندگی اس کے لیے اتنی دشوار ہو گئی کہ بُو کی اہمیت ثانوی رہ گئی۔ دوپہر کے دو بجے، جب گرمی کی شدت انہیں پگھلا چکی ہوتی، پیدرو ویکاریو سے بستر پر پڑا رہنا ناممکن ہو گیا، مگر اس کی ممکن اسے کھڑا ہونے سے روکے رہی۔ اس کے پیرو کا درد اس کے حلق تک پہنچ گیا؛ اس کا پیشاب رک گیا تھا، اور وہ اس دہشت انگیز یقین کے ساتھ عذاب کھینچ رہا تھا کہ وہ اب زندگی بھر نہیں سو سکے گا۔ "میں گیارہ مہینوں تک جاگتا رہا،" اس نے مجھے بتایا، اور میں، اس سے اچھی طرح مانوس ہونے کے سبب، جانتا تھا کہ یہ سچ ہے۔ وہ دن کا کھانا نہیں کھا سکا۔ جہاں تک پابلو ویکاریو کا تعلق ہے، اس نے ہر چیز کو جو وہ اس کے لیے لائے تھے، تصوراً بہت چمکا، اور پندرہ منٹ کے بعد ایک طاغوتی اسہال میں مبتلا ہو گیا۔ شام کو چھ بجے، جب سانتیاگو نصر کی لاش کا مساندہ کیا جا رہا تھا، میسر کو ہنگامی طور پر طلب کیا گیا، کیوں کہ پیدرو ویکاریو کو یقین تھا کہ اس کے بھائی کو زہر دیا گیا ہے۔ "وہ میرے سامنے پانی میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا،" پیدرو ویکاریو نے مجھے بتایا، "اور ہم اس خیال سے پہچان نہیں چھڑ سکے تھے کہ یہ تُرکوں کو کوئی شیطنت ہے۔" اس تک وہ برتن کو دو مرتبہ لبالب بھر چکا تھا اور نگرانی پر موجود پیرے دار اس کو ٹاؤن ہال کے پانخانے میں چھ مرتبہ لے جا چکا تھا۔ وہاں بغیر دروازے کے سنڈاس پر کرنل آپونٹے نے اسے پیرے داروں میں گھرے، اور اتنی تیزی سے سیال خارج کرتے دیکھا کہ زہر کے متعلق سوچنا بالکل بے معنی بھی نہیں رہ گیا۔ مگر اس خیال کو فوراً ہی ترک کر دیا گیا، جب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ انہوں نے صرف پانی پیا تھا اور وہی کچھ کھایا تھا جو پیورا ویکاریو نے انہیں بھجوایا۔ اس کے باوجود، میسر اتنا فکر مند ہوا کہ وہ قیدی کو خصوصی پیرے دار کی نگرانی میں اپنے گھر لے گیا، اور وہ تفتیشی جج کے آنے اور اپنے ریو باچا کی مدور جیل میں منتقل کیے جانے تک وہیں رہا۔

جڑواں بھائیوں کا خوف باہر کی صورتِ حال کے پیشِ نظر تھا۔ عربوں کے انتقام کا خطرہ دور نہیں ہوا تھا، مگر کسی نے بھی، سوائے ویکاریو برادران کے، زہر کے بارے میں نہیں سوچا۔ بلکہ خیال یہ تھا کہ وہ روشن دان سے پٹرول چھڑکنے کے لیے رات ہونے کا انتظار کریں گے، اور قیدیوں کو ان کی کوٹھری میں زندہ جلادیں گے۔ مگر یہ بھی آسان مفروضہ تھا۔ عرب ایک پُر امن جماعت تھے جو صدی کے آغاز میں کریستین کے شہروں اور قصبوں، یہاں تک کہ انتہائی غریب اور دور افتادہ مقامات تک پہنچے، اور وہیں آباد ہو گئے اور رنگین کپڑے اور سستے زیور پہنے لگے۔ وہ قبائلی، سخت کوش اور کیتھولک تھے۔ وہ آپس میں شادیاں کرتے، اپنی گندم درآمد کرتے، اپنے صمنوں میں بحیرہ میں پالتے، اور یگانو اور بیگن اگاتے؛ اور تاش کھیلنا ہی ان کا سرگرم مشغلہ تھا۔ مستخدمین نے دہقانی عربی بولنا جاری رکھا تھا جو وہ اپنے وطن سے ساتھ لائے تھے اور اسے دوسری

نسل تک تغیر سے محفوظ رکھے ہوئے تھے، مگر تیسری نسل، سانتیاگو نصر کے اسٹنٹی کے ساتھ اپنے والدین کی بات عربی میں سنتی اور اسپانوی میں جواب دیتی تھی۔ اس لیے یہ ناقابل یقین تھا کہ ایک ایسی موت کے انتقام کے لیے جس کا الزام ہم سب پر عائد کیا جا سکتا تھا، وہ اپنی راعیانہ جو تبدیل کر دیتے۔ دوسری طرف، کسی نے بھی پلاسیدا لینیرو کے خاندان کی جانب سے انتقامی کارروائی کے متعلق نہیں سوچا، جو اپنی دولت مندی کے خاتمے تک طاقتور اور جنگ جو لوگ رہے تھے، اور ان میں دو سے زیادہ، مے خانے کے قاتل پیدا ہوئے تھے، جنہیں، ان کے نام کے نمک سے، محفوظ رکھا گیا تھا۔

کرنل آپونٹے نے، افواہوں سے پریشان ہو کر، عربوں کی آبادی کا دورہ کیا اور اس وقت اس نے، آخر کار، صحیح نتیجہ اخذ کیا۔ اس نے انہیں اپنی مہربانی پر مانتی نشانات کے درمیان حیران اور سوگوار پایا، اور ان میں سے چند زمین پر بیٹھے بین کر رہے تھے، مگر کسی نے بھی انتقام کے خیال کو دل میں جگہ نہیں دی تھی۔ اس صبح ان کا رد عمل جرم کی شدت سے پیدا ہوا تھا، اور ان کے سر کردہ لوگوں نے اعتراف کیا کہ کسی بھی صورت میں وہ زود کوب سے تجاوز نہ کرتے۔ مزید برآں، یہ قبیلے کی صد سالہ سردار، سوزانہ آبادالہ ہی تھی جس نے گلی ساعت کا حیرت انگیز خیساندہ اور عرق آفستین تجویز کیا، جس سے پابلو ویکاریو کا اسہال بند، اور اس کے بھائی کا گلگول پیشاب جاری ہو گیا۔ پیدرو ویکاریو اس کے بعد ایک بے خواب غنودگی میں چلا گیا، اور اس کے شفا یافتہ بھائی کو پہلی بار کسی پشیمانی کے بغیر نیند آئی۔ اسی حالت میں پیورسیا ویکاریو نے انہیں مشکل کی صبح کو تین بجے دیکھا، جب میسر انہیں الوداع کہنے کے لیے اس کو ہال لایا۔

کرنل آپونٹے کی ایما پر، تمام خاندان، یہاں تک کہ بڑی بہنیں بھی اپنے شوہروں سمیت واپس چلی گئیں۔ وہ لوگوں کی نمکس کے زیر حفاظت، نظر میں آئے بغیر وہاں سے رخصت ہوئے، اُس وقت جب ہم میں سے اس ناقابل تلافی دن کے جو پس ماندگان بیدار تھے، سانتیاگو نصر کو دفن کر رہے تھے۔

میسر کے فیصلے کے مطابق، وہ اس وقت تک کے لیے رخصت ہو رہے تھے جب تک کہ معاملہ ٹھنڈا نہ پڑ جائے، مگر وہ پھر کبھی نہیں لوٹے۔ پیورا ویکاریو نے رد کردہ بیٹی کا چہرہ ایک کپڑے سے چھپا دیا تھا کہ کوئی خراشوں کو نہ دیکھ سکے، اور اسے شوخ سرخ رنگ میں لمبوس کیا تھا تاکہ کوئی یہ نہ سوچ سکے کہ وہ اپنے عاشق کے ماتم میں ہے۔ واپسی سے پہلے اس نے فادر مادور سے درخواست کی کہ وہ اس کے بیٹوں سے جیل میں گناہوں کا اعتراف سنے، مگر پابلو ویکاریو نے انکار کر دیا اور اپنے بھائی کو قاتل کر لیا کہ ان کے پاس منفل ہونے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ انہیں تنہا رکھا

گیا، اور اپنی ریو ہاچا منتقلی کے دن تک وہ اتنے بحال ہو چکے تھے، اور اپنے حق پر ہونے میں اتنے پُراعتماد تھے، کہ انھوں نے رات کو لے جایا جانا پسند نہیں کیا، جیسا کہ خاندان والوں کے ساتھ کیا گیا تھا، بلکہ وہ دن کی پوری روشنی میں، اور اپنے چہروں کی باقاعدہ نمائش کرتے ہوئے گئے۔ پونسویو ویکاریو، ان کا باپ، تھوڑے عرصے کے بعد مر گیا۔ "اس کا صدمہ اسے لے گیا،" انجلا ویکاریو نے مجھے بتایا۔ جب ویکاریو برادران بری ہوئے، وہ مانورے سے، جہاں خاندان رہ رہا تھا، ایک دن کی مسافت پر، ریو ہاچا میں ٹھہرے۔ پرودنیا کو تیس نے وہیں جا کر پابلو ویکاریو سے شادی کی، جس نے اپنے باپ کی دکان پر قیمتی دھاتوں کا کام سیکھ رکھا تھا اور ایک ہنرمند سُناٹا تھا۔ محبت اور روزگار سے محروم، پیدرو ویکاریو نے تین سال بعد دوبارہ فوج میں شمولیت اختیار کر لی، فرسٹ سارجنٹ کا عہدہ حاصل کیا، اور ایک خوشگوار صبح اس کا ہشتی دستہ قحبہ خانوں کے ترانے گاتا ہوا گریلا علاقے میں پہنچ کر مفقودا تجربہ ہو گیا۔

لوگوں کی بڑی اکثریت کے نزدیک ستم رسیدہ صرف ایک تھا: بیاردو سان رومان۔ یہ بات مصدقہ طور پر تسلیم کر لی گئی تھی کہ ایسے کے دوسرے اہم کردار اپنا حصہ باوقار طور پر، بلکہ ایک عظمت کے ساتھ ادا کر رہے تھے۔ سانتیاگو نصر تہمت کی حدود سے نکل چکا تھا، ویکاریو برادران مرد کی حیثیت سے اپنا مرتبہ منوا چکے تھے، اور گمراہ بہن کی عزت بحال ہو چکی تھی۔ صرف بیاردو سان رومان ایک تھا جس نے سب کچھ گنوا دیا تھا: "غریب بیاردو" جیسا کہ وہ ان برسوں میں یاد کیا جاتا تھا۔ پھر بھی، کسی کو اس کا خیال دوسرے سنیچر کو چاند گھن کے بعد تک نہیں آیا، جب رنڈوے بیوس نے میسر کو بتایا کہ اس نے ایک روشن پرندے کو اپنے سابقہ مکان کے اوپر پھر پھڑپھڑاتے ہوئے دیکھا ہے، اور اس کے خیال میں وہ اس کی بیوی کی روح ہے جو اپنی ملک کی واپسی کا مطالبہ کر رہی ہے۔ میسر نے اپنا ماتا پیٹا، مگر اس کا بیوس کے وابستہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

"لعنت ہو،" وہ زور سے بولا، "میں اس غریب کو بھول ہی گیا تھا۔"

وہ ایک ہشتی دستے کے ساتھ پہاڑی پر گیا اور گاڑی کو کھلی جھت کے ساتھ فارم باؤس کے سامنے پایا، اور اس نے شب خوابی کے کمرے میں ایک روشنی دیکھی، مگر کسی نے اس کی دسکوں کا جواب نہیں دیا، اس لیے وہ ایک بھٹی دروازے کو توڑ کر اندر داخل ہوا اور کمروں کی تلاشی لی، جو ہاند گھن میں نیم روشن تھے۔ "چیزیں پانی میں ڈوبی ہوئی لگ رہی تھیں،" میسر نے مجھے بتایا۔ بیاردو سان رومان بستر پر بے ہوش پڑا تھا، اسی طرح جیسا کہ پیورا ویکاریو نے اسے سوموار کی صبح کو دیکھا تھا، پُر تکلف پتلون اور ریشمیں قمیص میں ملبوس، مگر اس نے اپنے جوتے اتار رکھے تھے۔ فرش

خالی بوتلیں بکھری ہوئی تھیں اور بہت سی سر بہ مہر بوتلیں بستر کے قریب تھیں، مگر وہاں نے کسی چیز کا کوئی نشان نہیں تھا۔

"وہ اترتھک تھے کی آخری منزلوں میں تھا،" مجھے ڈاکٹر دیونیسو اگواران سے معلوم ہوا، اس نے اسے بنگامی امدادی تھی۔ مگر وہ چند گھنٹوں میں ٹھیک ہو گیا، اور جیسے ہی اس کا ذہن صاف ہوا، اس نے، جتنی شائستگی اس سے ممکن ہوئی استعمال کرتے ہوئے، انہیں گھر سے نکال باہر کیا۔ "کوئی میری فکر نہ کرے،" اس نے کہا۔ "میرے باپ تک کو آنے کی کوئی ضرورت میں ہے۔" اس نے اُس کی شان میں ایک فحش فقرہ کہا۔

میر نے جنرل بیٹرونیو سان رومان کو واقعے کی اطلاع، آخری فقرے سمیت، ایک راسخوب ٹیلیگرام کے ذریعے پہنچائی۔ جنرل سان رومان نے ضرور اپنے بیٹے کی خواہش پر حرف بہ زرف عمل کیا ہوگا، کیوں کہ وہ اس کے پاس نہیں آیا، بلکہ اس نے اپنی بیوی کو لڑکیوں اور دو ہر رسیدہ خواتین کے ساتھ روانہ کیا جو اس کی بہنیں معلوم ہوتی تھیں۔ وہ بیارو سان رومان کی رقصی پر گردنوں تک ماتمی لباس میں مقفل، اور غم میں اپنے ہال بکھرائے ہوئے، ایک مال بردار شتی میں آئیں۔ زمین پر قدم رکھنے سے پہلے انہوں نے اپنے جوتے اتارے اور سرک پر دوپہر کی ہمتی ہوئی دھول میں ننگے پاؤں اپنے بالوں کی ٹٹیں کھینچتی اور اتنی بلند چیخوں کے ساتھ بین کرتی مارٹی کے آخری سرے تک گئیں کہ وہ خوشی کے عالم میں سرزد ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے گدا لینا اولیور کی بالکنی سے انہیں گزرتے ہوئے دیکھا اور مجھے یاد ہے کہ میں نے سوچا تھا کہ اس رح کا ماتم صرف دوسری زیادہ اہم شرمساریوں کو چھپانے ہی کے لیے کیا جاسکتا ہے۔

کرئل لزارو آپونے ان کے ساتھ فارم ہاؤس تک گیا، اور پھر سورج ڈوبنے سے پہلے، ڈاکٹر یونیسو اگواران اپنے چہر پر، جو اس نے بنگامی حالات کے لیے رکھا ہوا تھا، وہاں پہنچا۔ حکومت کے ونوں نمائندے، گردن تک ایک کھمبل میں لپٹے ہوئے بیارو سان رومان کو، آد وزارتی کرتی نواتین کے جلو میں، ایک ڈنڈے سے لگے ہوئے جھولے پر نیچے لائے۔ ماگدا لینا اولیور سمجھی کہ وہ رچکا ہے۔

"خدا کی پناہ!" وہ بول اٹھی، "کیسی مصیبت ہے!"

اس نے انکھل سے خود کو دوبارہ جاں بہ لب کر لیا تھا، مگر یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ وہ کسی زندہ آدمی کو لے جا رہے ہیں، کیوں کہ اس کا دابنا بازو زمین پر گھسٹ رہا تھا، اور جب اس کی ماں اسے بھولے میں ڈال دیتی، وہ پھر باہر نکل آتا، اس لیے اس کے ہاتھ سے سیاہی کے دامن سے لے کر شتی کے عرشے تک زمین پر ایک لکیر بنتی چلی گئی۔ ہمارے لیے اس کی طرف سے یہی نشانی تھی:

ایک رستم رسیدہ کی یاد۔

انھوں نے فارم ہاؤس کو اسی حالت میں چھوڑ دیا۔ میرا بھائی اور میں جب تعطیلات میں گھر آتے، آوارہ گردی کی راتوں میں اسے دریافت کرنے جایا کرتے، اور ہر بار ہم نے متروک کمروں میں قیمتی اشیاء کی تعداد پچھلی بار سے کم پائی۔ ایک موقع پر ہمیں وہ چھوٹا سوٹ کیس نظر آیا جو انجلا ویکاریو نے اپنی ماں کے ہاں سے شادی کی رات کو منگوا یا تھا، مگر ہم نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ہم نے اس کے اندر جو کچھ پایا وہ ایک عورت کے حفظ حسن و صحت کی ذاتی اشیاء معلوم ہوئیں، اور مجھ پر ان کا اصل استعمال صرف اس وقت کھلا جب انجلا ویکاریو نے بست برسوں کے بعد مجھے بتایا کہ کون سی زنانہ شعبہ بازیاں اسے اپنے شوہر کو فریب دینے کے لیے سکھائی گئی تھیں۔ یہ واحد یادگار تھی جو اس نے اس جگہ چھوڑی جو پانچ گھنٹوں تک شادی شدہ عورت کی حیثیت سے اس کا گھر تھا۔

برسوں بعد، جب میں ان واقعات کے لیے شہادتوں کی آخری جزئیات تلاش کرنے آیا، یولاندا ہیوس کی مسرتوں کی خاک تک باقی نہیں بچی تھی۔ کرنل لازارو آپونٹے کے مقرر کردہ پیرے کے باوجود چیزیں تھوڑی تھوڑی کر کے غائب ہو رہی تھیں، حتیٰ کہ چھ آئینوں والی تمام قد الماری بھی، جو مومپوکن کے ماہر دستکار کو مکان کے اندر کھڑی کرنی پڑی تھی کیوں کہ وہ دروازے سے نہیں گزر سکتی تھی۔ شروع شروع میں رنڈوا ہیوس یہ سوچتے ہوئے بست خوش تھا کہ اس کی بیوی، پس آزمہگ، اپنی چیزوں کو لے جانے کے لیے واپس آیا کرتی ہے۔ کرنل آپونٹے نے اس کا مذاق اڑایا۔ مگر ایک رات اسے اس راز کو معلوم کرنے کے لیے ارواح کی مغل کا خیال آیا، اور یولاندا ہیوس کی روح نے اپنی تحریر میں تصدیق کی کہ وہی اپنی مسرتوں کی معمولی اشیاء کو اپنے خانہ مرگ سے لے جا رہی ہے۔ مکان دھینا شروع ہو گیا۔ شادی کی گاڑی دروازے پر پڑے پڑے گلے لگی، اور آخر میں صرف اس کا بوسیدہ ڈھانچا باقی رہ گیا۔ کئی برسوں تک اس کے مالک کے بارے میں کوئی خبر نہیں آئی۔ ریل میں اس کا ایک بیان ہے مگر وہ اتنا مختصر اور سرسری ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آخری لمے میں کسی ناگزیر ضرورت کے تحت درج کیا گیا تھا۔ ایک ہی بار جب میں نے اس سے تیس سال بعد، بات کرنے کی کوشش کی، وہ مجھ سے ایک خاص جارحانہ انداز میں پیش آیا، اور انتہائی غیر اہم حقائق کو بیان کرنے سے بھی انکار کیا جو ڈرامے میں اس کی شرکت کی تھوڑی سی بھی وضاحت کر سکتے۔ بہر صورت، اس کا خاندان بھی اس کے بارے میں، جو ہمیں علم تھا اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا، اور ان کو ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنے کے سوا جسے اس نے کبھی دیکھا تک نہیں تھا، وہ ایک غلط اتحادہ قصبے میں کیوں پہنچا تھا۔

ایک پیش گشتہ موت کی روداد

انجلا ویکاریو کے متعلق، اس کے برعکس، مجھے وقفے وقفے سے خبریں ملتی رہی تھیں، جن سے میرے ذہن میں اس کی ایک مثالی تصویر بن گئی تھی۔ میری راہبہ بہن بالائی گواہیرا میں آخری مت پرستوں کو مشرف بہ کلیسا کرنے کی کوشش میں مصروف تھی اور اس کی عادت تھی کہ وہ لریئین ٹمک سے ہنر قریے میں، جہاں انجلا ویکاریو کی ماں اسے زندہ دفن کرنے کو لے گئی تھی، اس کے پاس رکتی اور اس سے باتیں کرتی۔ "تمہاری عم زاد تمہیں سلام کہتی ہے،" وہ مجھے ہمیشہ بھانپ کر کہتی۔ میری بہن مارگوت نے بھی، جو ابتدائی برسوں میں اس سے ملنے جاتی رہی تھی، مجھے بتایا کہ اس نے ایک ہوادار صحن والا مضبوط مکان خرید لیا تھا، جس میں صرف ایک نقض تھا کہ مد کامل کی اتوں کو غسل خانہ اُبل پڑتا اور پھلیاں صبح کو شب خوابی کے کمروں میں شپ شپ کرتی نظر آتیں۔ جس کسی نے بھی اسے اُن دنوں دیکھا تھا، متفق تھا کہ وہ اپنی کشیدہ کاری کی مشین پر ہر وقت مشاقانہ جھکی رہتی تھی، اور اپنی مصروفیت کی وجہ سے اس نے واقعات کو فراموش کرنے میں یاسیابی حاصل کر لی تھی۔

بہت بعد کے ایک غیر یقینی زمانے میں، جب میں اپنے آپ کو تھوڑا بہت سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے گواہیرا کے قصبوں میں انسائیکلو پیڈیا اور طب کی کتابیں بیٹتا پھر رہا تھا، اتفاقاً بہت پرستوں کے اُس قریہ مرگ میں جا نکلا۔ اس مکان کی کھڑکی پر جس کا رخ سمندر کی طرف تھا، دن کی سب زیادہ چلتی ہوئی ساعت میں، اسٹیل روم کی عینک اور زردی آمیز سفید بالوں والی ایک عورت نخت ماتمی لباس میں، کشیدہ کاری کی مشین پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے سر کے اوپر ایک زرد لبل کا پنہرا تھا جو مسلسل چمکتی رہی۔ جب میں نے اسے کھڑکی کے سادہ چوکھٹے میں سے اس طرح دیکھا تو یقین کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ وہی عورت ہے جس کا تصور میرے پاس تھا، کیوں کہ میں نود کو اس اعتراف پر آمادہ نہیں کر سکا کہ زندگی خراب ادب کے اتنی مائل ہو کر رہ جائے گی۔ مگر، زراے کے تیس سال بعد، یہ وہی تھی: انجلا ویکاریو۔

اس نے مجھ سے ہمیشہ کی طرح ایک دور کی عم زاد کا سلوک کیا، اور میرے سوالوں کے بواب عقل سلیم اور ایک حس مزاج کے ساتھ دیے۔ وہ اتنی بالغ نظر اور بڑے سنج ہو گئی تھی کہ یقین کرنا مشکل تھا کہ وہ وہی ہستی ہے۔ جس بات پر مجھے سب سے زیادہ حیرت ہوئی، اس کا وہ انداز تھا جس میں وہ اپنی زندگی کے مفہوم تک پہنچی تھی۔ چند منٹوں کے بعد وہ مجھے اتنی عمر رسیدہ نہیں لگی جتنی کہ پہلی نظر میں معلوم ہوئی تھی، بلکہ وہ تقریباً اتنی ہی جوان نظر آئی جتنی وہ میری یادداشت میں تھی، اور وہ اس شخص سے جو اس سے بیس سال کی عمر میں محبت کے بغیر شادی کرنے پر مجبور ہوا تھا، کوئی قدر مشترک نہیں رکھتی تھی۔ اُس کی ماں نے، اپنے پُر شکایت بڑھاپے میں، مجھے ایک

مشکل بدروح سمجھا۔ اس نے ماضی کے متعلق بات کرنے سے انکار کر دیا اور ان وقائع کے لیے بچہ اپنی ماں کے ساتھ اس کی گفتگو اور اپنی یادداشت سے کھٹکالے ہوئے اس کے چند غیر مربوط فقرات پر اکتفا کرنا پڑا۔ وہ اس سے آگے جا چکی تھی جو انجلا ویکاریو کو جیسے جی مار ڈالنے کے لیے ممکن تھا، اس نے خود اپنی ماں کی منسوبہ بندیوں کو صفر پر پہنچا دیا تھا کیوں کہ اس نے کبھی اپنی بد قسمتی سے کوئی پراسراریت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس، اس نے اسے، تمام تفصیلات سمیت، ہر اس شخص سے بیان کیا جو اسے سننے کا طالب ہوا، سوائے ایک رمز کے، جو کبھی نہیں کھل سکا، کہ اس کی تباہی کا اصل باعث کون، کیسے اور کیوں تھا۔ اس لیے کہ کسی نے بھی یقین نہیں کیا تھا کہ وہ سچ سچ سائنٹیا گو نصر ہی رہا ہوگا۔ وہ دونوں بالکل مختلف دنیاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ کسی نے کبھی انہیں ایک ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ پُر غرور سائنٹیا گو نصر اس پر کبھی توجہ نہ دیتا "تمہاری بے وقوف عم زاد،" وہ مجھ سے کہا کرتا جب اُسے اس کا تذکرہ کرنا ہوتا۔ اس کے علاوہ جیسا کہ ہم اس وقت کہا کرتے تھے، وہ چڑیوں کو اچک لینے والا ٹکڑا تھا۔ وہ، اپنے باپ کی طرح، کم خود سر دوشیزہ کو زیر کرنے کی کوشش میں اکیلا پھرا کرتا، جو ان جنگلوں میں نظر آنا شروع کر رہا ہوتی، مگر قصبے میں اس کا اور کوئی تعلق علم میں نہیں آیا، سوائے فلورا میگل سے رسی ملاقاتوں، او ماریا الیساندرنا سروانتس سے ہنگامہ خیز عشق کے، جس نے اسے چودہ مہینوں تک پاگل کیے رکھ تھا۔ زیادہ مشہور روایت، شاید اس لیے کہ اسی میں زیادہ کجروی تھی، یہ تھی کہ انجلا ویکاریو نے کسی آوا کو جو واقعتاً اُس سے محبت کرتا تھا، بچانا چاہا تھا اور اس نے سائنٹیا گو نصر کے نام کا اس لیے انتخاب کیا کہ اس کا خیال تھا کہ اس کے بانی اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کریں گے۔ میں نے یہ حقیقت اس سے خود معلوم کرنے کی کوشش کی، جب میں اپنے تمام دلائل سے مسلح، اس کے پاس دوسری بار گیا، مگر اس نے ان کو شکست دینے کے لیے اپنی نظریں کشیدہ کاری سے یہ مشکل جی بٹائی ہوں گی۔ "اتنا تردد مت کرو،" اس نے مجھ سے کہا۔ "وہ وہی تھا۔"

اس کے علاوہ ہر بات کو، حتیٰ کہ اپنی شادی کے رات کی ابتلا کو بھی، اس نے بغیر کسی احتیاط کے بیان کر دیا۔ اس نے یاد کیا کہ کس طرح اس کی دوستوں نے اسے ہدایات دی تھیں کہ وہ اپنے شوہر کو بستر میں اتنی شراب پلانے کہ وہ اپنے حواس کھو بیٹھے، اُس سے زیادہ شرم کا مظاہرہ کرے جتنی درحقیقت اس کو آ رہی ہوتا کہ وہ کمرے کی روشنی بجھا دے، دوشیزگی کا تاثر پیدا کرنے کے لیے پھٹکری کے پانی کی ایک کارگردوش لے، اور چادر پر مرکیورو کوم سے دھبے ڈال دے تاکہ اسے دوسرے دن عروسی صحن میں نمائش کے لیے رکھ سکے۔ اس کی مشیروں نے دو باتوں پر انصاف نہیں کیا تھا: بیاردو سان رومان کی شراب کے اثر کی غیر معمولی مدافعت اور انجلا

ویکاریو کی اعلیٰ شائستگی، جو وہ اپنی ماں کی عائد کردہ غیر جذباتیت میں مستور رکھتی تھی۔ "میں نے وہ سب نہیں کیا جو انھوں نے بتایا تھا،" اس نے کہا، "کیوں کہ میں نے جس قدر سوچا، مجھے محسوس ہوا کہ یہ ایک پست حرکت ہے جو کسی کے ساتھ نہیں کی جانی چاہیے، اور وہ بھی اُس بد بخت آدمی کے ساتھ جو مجھ سے شادی کر رہا تھا۔" اس لیے اس نے خود کو شبِ خوابی کے روشن کمرے میں بطور آشکار کپڑوں سے آزاد ہونے دیا، ان تمام اکتسابی خطروں سے بالاتر ہو کر جنھوں نے اس کی زندگی تباہ کر دی۔ "یہ بہت آسان تھا،" اس نے مجھ سے کہا، "کیوں کہ میں نے مرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔"

سچ یہ ہے کہ اس نے اپنی بد قسمتی کا تذکرہ کسی شرم کے بغیر کیا، تاکہ وہ دوسری، اصل بد قسمتی کی پردہ پوشی کر سکے، جو اسے ختم کیے دے رہی تھی۔ کسی کو اس کا شبہ تک نہ ہوتا، اگر اس نے مجھے یہ بتانے کا فیصلہ نہ کیا ہوتا کہ بیاردو سانِ رومان اس کی زندگی میں اس لمحے سے ہمیشہ کے لیے داخل ہو گیا تھا جب وہ اسے گھر واپس چھوڑ گیا۔ یہ فیصلہ کن وار تھا۔ "جب ماما نے مجھے مارنا شروع کیا، وہ مجھے اچانک یاد آتا چلا گیا،" اس نے مجھے بتایا۔ اسے مارے کم تکلیف ہوئی کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ وہ اُس کے نام پر تھی۔ اس نے اس کے متعلق اس وقت ایک خاص حیرت کے ساتھ سوچنا شروع کیا جب وہ سکیاں بھرتی ہوئی کھانے کے کمرے میں کوچ پر پڑی تھی۔ "میں ماریا کی کسی آور وجہ سے نہیں رو رہی تھی۔" اس نے اس کے متعلق سوچنا جاری رکھا جب اس کی ماں آرنیکا کی ٹھنڈی پٹیاں اس کے چہرے پر رکھ رہی تھی، اور اس سے بھی زیادہ اس وقت جب اس نے سرک پر شور سنا اور اگل گلنے کی اطلاع دینے والی گھنٹیاں بجنے لگیں، اور اس کی ماں اس کو یہ بتانے آئی کہ اب وہ سو سکتی ہے کیوں کہ بدترین بات پیش آچکی ہے۔

وہ اس کے بارے میں بہت طویل عرصے تک، بغیر کسی خود فریبی کے، سوچتی رہی تھی، جب اس کو اپنی ماں کے ساتھ اس کی آنکھوں کے معائنے کے لیے ریو ہاپا کے اسپتال میں جانا پڑا۔ وہ راستے میں ہوٹل دل پور تو پر رکیں، جس کا مالک انھیں جانتا تھا، اور پیورا ویکاریو نے بار بار کمر پانی کا ایک گلاس طلب کیا۔ وہ اپنی بیٹی کی طرف پُخت کیے پانی پی رہی تھی، جب انجلا ویکاریو نے اپنے تصور کو ان آئینوں میں منعکس پایا جو کمرے میں خود کو دوہرا رہے تھے۔ انجلا ویکاریو نے اپنا سر ایک آدے کے ساتھ پھیرا اور اسے ہوٹل سے باہر جاتے دیکھا۔ پھر اس نے اپنے دل ریزہ ریزہ کے ساتھ اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ پیورا ویکاریو نے پانی پینا ختم کیا، اپنے ہونٹوں کو اپنی آستین پر صاف کیا اور بار کی جانب سے، اپنی نئی عینک سے اسے دیکھ کر مسکرائی۔ انجلا ویکاریو نے، اپنی پیدائش کے بعد سے پہلی مرتبہ، اس مسکراہٹ میں اپنی ماں کو اس طرح دیکھا جیسی وہ درحقیقت تھی:

اپنے عیوب کی پرستش میں گرفتار ایک غریب عورت۔ "لعنت ہو،" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ وہ اتنی پریشان تھی کہ اس نے گھر کو واپسی کا سارا سفر بلند آواز میں گاتے ہوئے طے کیا، اور پھر خود کو بستر پر تین دن تک روتے رہنے کے لیے گرا دیا۔

وہ پھر سے زندہ ہو گئی تھی۔ "میں اُس کے لیے دیوانی ہو رہی تھی،" اس نے مجھے بتایا، "بالکل پاگل۔" اسے اس کو دیکھنے کے لیے صرف اپنی آنکھیں بند کرنی پڑتی تھیں؛ وہ اس کو سمندر میں سانس لیتا سنتی، بستر میں اُس کے بدن کا شعلہ اسے آدھی رات کو جگا دیتا۔ بھٹے کے ختم ہونے تک، ایک لمحہ آرام پائے بغیر، اس نے اُسے پہلا خط لکھا۔ یہ ایک رسمی مراسلہ تھا، جس میں اس نے بتایا کہ اس نے اُسے جوٹل سے باہر آتے دیکھا تھا اور یہ کہ وہ خوش ہوتی اگر وہ بھی اسے دیکھ پاتا۔ اس نے جواب کا نام کام انتظار کیا۔ دو مہینوں کے بعد، انتظار سے تنک کر، اس نے پہلے کی طرح ایک اور خط اسی مبہم اسلوب میں بھیجا، جس کا واحد مقصد اسے شائستگی کے فقدان پر سرزنش کرنا تھا۔ چھ مہینوں میں وہ جواب پائے بغیر چھ خطوط لکھ چکی تھی، مگر اس نے اس امر سے اپنے آپ کو تسلی دی کہ وہ انہیں وصول کر رہا ہے۔

پہلی بار اپنی قسمت کی خود مالکہ انجلا ویکاریو نے تب جانا کہ محبت اور نفرت متبادل جذبے ہیں۔ جتنے زیادہ خطوط اس نے بھیجے اتنا ہی اس کے اضطراب میں اضافہ ہوا، مگر اس میں اپنی ماں کے خلاف مسرت آمیز کینے کی آگ بھی اتنی ہی تیز ہوتی گئی۔ "مجھے اس کو دیکھتے ہی اُبکائی آ جاتی،" اس نے مجھے بتایا، "لیکن میں اپنی ماں کو دیکھ کر اُس شخص کو یاد کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔" اس کی زندگی ایک رد کردہ بیوی کی حیثیت سے جاری تھی، جیسے ایک بوڑھی خادمہ کی سیدھی سادی زندگی ہوتی ہے؛ وہ مشین پر اپنی دوستوں کے ساتھ کشیدہ کاری میں مصروف رہتی، بالکل پہلے کی طرح جب وہ کپڑوں کے گلدستے اور کاغذی پرندے بنایا کرتی تھی، مگر جب اس کی ماں سونے جلی جاتی، وہ صبح تک کے لیے اپنے کمرے میں بند ہو جاتی، ان خطوں کو لکھنے کے لیے جن کا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ وہ دوبارہ باہوش ہو گئی، اپنے ذاتی ارادے کی مالک، اور صرف اُس کے لیے پھر سے ایک دوشیزہ بن گئی، اور اس نے اپنے سوا کسی اور کی حاکمیت، اور نہ کوئی محکومی، بجز اپنے جنون کی اطاعت کے قبول کی۔

اس نے ہفتہ وار خط لکھنا آدھی زندگی تک جاری رکھا۔ "کبھی کبھی میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا لکھا جائے،" بنی سے مرے جاتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا، "مگر میرے لیے یہی بہت تھا کہ وہ انہیں پار رہا ہے۔" شروع میں وہ ایک منگیتر کے رقبے تھے، پھر وہ ایک خفیہ مشوق کے مختصر پیغامات، شوخ محبوبہ کے خوشبودار کارڈ، کاروباری کاغذات، خفیہ دستاویزات ہوتے گئے، اور

آخر میں ایک ترک کردہ بیوی کے تلخ خطوط ہو گئے، جن میں وہ اسے واپس آنے پر آمادہ کرنے کے لیے سفاک بیماریاں ایجاد کیا کرتی۔ ایک رات ایک اچھی کیفیت میں اس نے لکھے ہوئے خط پر دوات گرا دی اور اسے پھاڑنے کے بجائے اس نے ایک پس نوشت کا اضافہ کیا: "اپنی محبت کے ثبوت میں میں تمہیں اپنے آنسو بھیج رہی ہوں۔" کسی کسی موقع پر رونے سے تنگ آ کر وہ اپنی دیوانگی کا مذاق اڑاتی۔ چھ مرتبہ ڈاک خانے کی نگراں عورتیں تبدیل ہوئیں، اور چھ مرتبہ وہ ان کی اعانت حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ صرف ایک بات جو اسے نہیں سوجھی، وہ خطوط نگاری کا ترک کرنا تھا۔ اس کے باوجود اس کے جنون کا اس شخص پر کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ان خطوں کا مخاطب کوئی تباہی نہیں۔

دسویں سال، ایک طوفان خیز صبح، وہ جلد اٹھ گئی، اس یقین کے ساتھ کہ وہ اس کے بستر میں برہنہ موجود ہے۔ پھر اس نے اسے ایک بے قرار خط لکھا، بیس صفحات پر مشتمل، جس میں اس نے وہ تلخ حقائق جو وہ اپنے دل میں اس زہول بخت رات سے لیے پھر رہی تھی، بے حجابانہ بیان کر ڈالے۔ اس نے اس کو ان ابدی نشانات، جو اس نے اس کے بدن پر چھوڑے تھے، اس کی زبان کے نمک، اس کے افریقی عضو کی آتشیں یاد کے بارے میں لکھا۔ جمعے کو اس نے یہ خط ڈاک خانے کی نگراں کو دیا جو سہ پہر کو اس کے ساتھ کشیدہ کاری کرنے اور خط لینے آئی، اور وہ پُر یقین تھی کہ یہ آخری دوا اس کے عذاب کا خاتمہ ہو گا، مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اس کے بعد سے اسے ہوش نہیں تھا کہ اس نے کیا لکھا، اور نہ یہ کہ وہ درحقیقت کے لکھ رہی تھی، مگر اس نے تعطل کے بغیر سترہ سال تک خط لکھنا جاری رکھا۔

اگست کی ایک سہ پہر، جب وہ اپنی دوستوں کے ساتھ کشیدہ کاری میں مشغول تھی، اس نے دروازے پر کسی کی آہٹ سنی۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہاں کون ہے، اسے نظر اٹھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ "وہ فرہ اندام ہو چکا تھا، اس کے بال گرے شروع ہو گئے تھے اور اسے چیزوں کو قریب سے دیکھنے کے لیے عینک کی ضرورت پڑ چکی تھی،" اس نے مجھے بتایا، "مگر یہ وہی تھا۔" وہ خوف زدہ تھی، کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ وہ بھی اسے اتنا ہی مختلف پارہا ہو گا جتنا کہ وہ اسے نظر آیا تھا، اور اس کے خیال میں اسے اس سے اتنی محبت نہیں رہی ہو گی کہ وہ اس تئیر کی تاب لاسکے۔ اس کی قمیص پینے سے بھیگی ہوئی تھی اور وہ وہی سیلٹ باندھے تھا اور وہی پانچویں جڑی، بغیر بنیوں کی چمڑے کی خورجینیں لیے ہوئے تھا۔ دوسری متحیر کشیدہ کاروں سے بے نیاز، بیارو سان روان نے قدم آگے بڑھایا اور اپنی خورجینیں سلائی کی مشین پر رکھ دیں۔

"یہ میں ہوں،" اس نے کہا۔

گا۔ بریل گارسیا مارکیز

وہ رہنے کے لیے کپڑوں کا ایک سوٹ کیس ساتھ لایا تھا، اور دوسرا، بالکل پہلے والے کی طرح، دو ہزار خطوط سے بھرا جو اسے لکھے گئے تھے۔ وہ دونوں کی ترتیب سے رنگین رہن سے بندھے ہوئے تھے، اور انہیں کبھی نہیں کھولا گیا تھا۔

برسوں تک ہم کسی اور واقعے کے بارے میں بات ہی نہ کر سکے۔ ہمارے روز و شب نے، جو بہت سی یک رخی عادتوں سے مغلوب تھے، اچانک ایک مشترکہ خلش کے محور پر گھومنا شروع کر دیا تھا۔ طلوع سر ہمیں بہت سے اتفاقیہ واقعات کی زنجیر کو، جنہوں نے ایک امر محال کو ممکن بنایا تھا، ایک ترتیب دینے کی کوشش کرتے دیکھا کرتی؛ یہ واضح تھا کہ ہم ایسا ان اصرار کو دریافت کرنے کی طلب میں نہیں کر رہے تھے، بلکہ اس لیے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس مقام اور ماموریت کے درست علم کے بغیر، جس کی جستجو تقدیر کی طرف سے ہمارے حوالے ہوئی تھی، اپنی زندگی جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔

کچھ لوگ کبھی نہیں جان سکے۔ کرسٹو بیدویا، جو ایک مشہور سرجن بنا، کبھی خود کو یہ سمجھانے میں کامیاب نہیں ہو سکا کہ کیوں وہ اس ترغیب کا شکار ہو گیا کہ بپ کے آنے تک دو گھنٹے اپنے دادا کے ہاں گزارے، بجائے اس کے کہ آرام کرنے اپنے والدین کے گھر جاتا جو صبح ہی سے اطلاع دینے کے لیے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر ان میں سے بہت سوں نے، جو جرم کو روکنے کے لیے کچھ کر سکتے تھے اور اس کے باوجود انہوں نے کچھ نہیں کیا، اپنے آپ کو اس عذر سے

تسلّی دی کہ عزّت کے معاملات اجارہ خداوندی ہیں اور اُن میں صرف اُن کا دخل ممکن ہے جو ڈرامے کا حصہ ہوں۔ "عزّت ہی محبت ہے،" میں نے اپنی ماں کو کھتے سنا۔ اور تنسیا باؤتے، جس کی شمولیت صرف دو خون آلود پُجروں کو دیکھنے کی حد تک تھی، جو اس وقت تک درحقیقت خون آلود بھی نہیں تھے، اپنے وابجے سے اس حد تک متاثر ہوئی کہ وہ ایک نہامت آمیز پہچان میں مبتلا ہو گئی، اور ایک دن، مزید برداشت کرنے کی اہل نہ رہ جانے پر، سرک پر ننھی نکل آئی۔ فلورا میگل، سانتیاگو نصر کی منگیتر، عداوت کے مارے سرحدی گشت کے ایک لفٹیننٹ کے ساتھ جگا گئی جس نے اس سے ویچادا کے رہبر مزدوروں کے درمیان جسم فروشی کروائی۔ اورا ویروس، وہ دایہ جس کی مدد سے تین نسلیں اس دنیا میں آئیں، اس خبر کو سنتے ہی مٹانے کے درمیں مبتلا ہو گئی اور اپنی موت کے دن تک اسے پیشاب کرنے کے لیے قنطیر کا استعمال کرنا پڑا۔ دون رو حیلو دے لافلور، کلوتیلدے آرمینا کا نیک شوہر، جو چھیاسی سال کی عمر میں قوتِ مردمی کا ایک شاہکار تھا، آخری بار یہ دیکھنے کو اٹھا کہ کس طرح انھوں نے سانتیاگو نصر کے اعصاب، اُس کے اپنے گھر کے بند دروازے کے سامنے، جدا کر دیے، اور اس صدمے کے بعد زندہ نہیں رہ سکا۔ پلاسیدا لینیرو نے آخری لمحے میں اُس دروازے کو مقفل کروا دیا تھا، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے خود کو الزام سے بری کر دیا۔ "میں نے اسے اس لیے بند کروا دیا تھا کہ دیونا فلور نے مجھ سے قسم کھا کر کہا تھا کہ اس نے میرے بیٹے کو اندر آتے دیکھا ہے،" اس نے مجھے بتایا، "مگر یہ سچ نہیں تھا۔" دوسری طرف اس نے خود کو درختوں کے سعد شگون اور پرندوں کے محسّ شگون میں تمیز نہ کرنے پر کبھی معاف نہیں کیا، اور کاہو کے بیج چبانے کی قبیح عادت کا شمار ہو گئی، جو اس کے زانے میں عام تھی۔

جرم کے بارہ دنوں کے بعد تفتیشی مجسٹریٹ، اس قصبے میں جو ایک کھلے ہوئے زخم کی طرح تھا، وارد ہوا۔ ٹاؤن ہال کے خستہ حال چوبی دفتر میں، شدید گرمی میں گنے کی شراب سے دو آتش گرم کافی پیتے ہوئے، جبوم کو قابو میں رکھنے کے لیے جو طلب کیے بغیر ڈرامے میں اپنے اہم کردار کی نشاندہی کرنے کے لیے اُدّ آیا تھا، اسے فوجی دستے کی محکم طلب کرنی پڑی۔ وہ نیا نیا فارغ التحصیل ہوا تھا اور ابھی تک قانون کی درس گاہ والا سیاہ لٹن کا سوٹ اور سونے کی انگوٹھی پہنتا تھا، جس پر اس کی سند کا نشان کندہ تھا۔ اس میں ایک نئے نئے باپ بننے والے مسرور شخص کی سی سرمستی اور غنائیت تھی۔ مگر میں کبھی اس کا نام نہیں جان سکا۔ جو کچھ بھی ہمیں اس کے کردار کے بارے میں معلوم ہوا، رسل سے اخذ کیا گیا تھا، جسے چند لوگوں نے بیس سال بعد ریوباچا کے ایوان انصاف میں تلاش کرنے میں میری اعانت کی۔ رسلوں کی کسی طرح کی کوئی درجہ بندی نہیں کی گئی تھی، اور ایک سو سے زیادہ مقدمات اس نوآبادیاتی عمارت کے بوسیدہ فرش پر انبار تھے، جو سر

فرانس ڈریک کا دودن کے لیے مسترد چکی تھی۔ زمینی منزل مد کامل میں پانی سے بھر جایا کرتی، اور غیر مجلد مسلیم ویران دفتر میں تیرتی پھرتیں۔ میں نے خود کئی بار اپنی تلاش ٹخنوں تک پانی میں گمشدہ قضیوں کے اس دریا میں جاری رکھی، اور صرف حسن اتفاق سے، پانچ سال کی جستجو کے بعد، میں ۵۰۰ سے زیادہ صفحات پر مشتمل رسل کے ۳۲۲ صفحات بازیاب کرنے میں کامیاب ہوا۔

جج کا نام ان میں سے کسی پر نہیں آتا، مگر یہ واضح ہے کہ وہ ادب کے جنون میں مبتلا ایک شخص تھا۔ اس نے بلاشبہ اسپانوی اور کچھ لاطینی ادبیات عالیہ پڑھ رکھی تھیں، اور وہ نیتے سے بخوبی واقف تھا جو ان دنوں کے مجسٹریٹوں میں رائج مصنف تھا۔ حاشیاتی شذرے، روشنائی کے رنگ سے قطع نظر بھی، خون سے تھرہ شدہ معلوم ہوتے تھے۔ وہ اس چھستان پر، جس کی زد میں وہ اتفاقاً آ گیا تھا، اتنا حیران تھا کہ کئی مرتبہ ایک غنائی انتشار خیال میں مبتلا ہو گیا، جو اس کے پیشے کے سنت گیر تقاضوں کے خلاف تھا۔ سب سے بڑھ کر، اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ یہ جائز ہو سکتا ہے کہ زندگی اتنے زیادہ اتفاقات کا استعمال کرے جو ادب میں بھی ممنوع ہیں، اور اتنی صاف طور پر پیش گفتہ موت کو آزادانہ پایہ تکمیل تک پہنچنے دے۔

اس کے باوجود، اپنی جاں فشان تفتیش کے اختتام پر جس بات نے اس کو سب سے زیادہ حیران کیا، وہ یہ تھی کہ کوئی سراغ، یہاں تک کہ کوئی نامکن ترین اشارہ بھی موجود نہ تھا جو سانتیاگو نصر کو خطا کا مرتکب قرار دیتا۔ انجلا ویکاریو کی دوستوں نے، جو فریب دی میں اس کی مشیر تھیں، عرصے تک یہی کہا کہ وہ شادی سے پہلے ہی اُس کے راز میں شریک ہو گئی تھیں، مگر اس نے ان پر کسی نام کا انکشاف نہیں کیا تھا۔ رسل میں ان کا بیان تھا: "اس نے معجزے کے متعلق بتایا، مگر وہی کا نام نہیں لیا۔" لیکن انجلا ویکاریو اپنے بیان پر قائم رہی۔ جب تفتیشی مجسٹریٹ نے اس سے اپنے بالواسطہ انداز میں پوچھا کہ آیا وہ جانتی ہے کہ متوفی سانتیاگو نصر کون تھا، تو اس نے جذبات سے عاری جواب دیا:

"وہ میرے ساتھ مرتکب ہوا تھا۔"

رسل میں اس کا بیان یہیں تک ہے، کیسے اور کہاں کی کسی تفصیل کے بغیر۔ سماعت کے دوران جو صرف تین دن جاری رہی، وکیل سرکار نے اپنی تمام تر کوشش الزام کی کمزوری پر صرف کی۔ تفتیشی مجسٹریٹ کی پریڈیٹا سانتیاگو نصر کے خلاف عدم ثبوت کی بنا پر اتنی زیادہ تھی کہ بعض مقامات پر یہ کارخیر مایوسیوں کی وجہ سے تباہ ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ صفحہ ۳۱۶ پر، اپنی تھریر اور دوا ساز کی سرخ روشنائی میں، اس نے ایک حاشیہ پر لکھا: "مجھے ایک مفروضہ دے دو اور میں دنیا کو بلا دوں گا۔" حوصلہ شکنی کی شرح کرتے ہوئے، اس نے ایک شوخ خاکے میں، اسی خوں رنگ

روشنائی میں، تیر سے چھدا ہوا ایک دل بنایا۔ اس کے نزدیک، سانتیاگو نصر کے قریب ترین دوستوں کی طرح، زندگی کی آخری چند ساعتوں میں ستم رسیدہ کا طرز عمل اس کی بے گناہی کا کافی سے زیادہ ثبوت تھا۔

اپنی موت کی صبح، درحقیقت، سانتیاگو نصر کے پاس شک کا ایک لمحہ بھی نہیں تھا، اس امر کے باوجود کہ وہ بخوبی آگاہ تھا کہ اس پر لگائی گئی تہمت کی اسے کیا قیمت ادا کرنی پڑ سکتی ہے۔ وہ اس دنیا کی ظاہرداری کی روش سے واقف تھا اور ضرور جانتا رہا ہو گا کہ ویکاریو برادران کی سادہ مزاجی کسی بدنامی کو برداشت کر جانے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ کوئی بھی بیارو سان رومان کو بہت اچھی طرح نہیں جانتا تھا، مگر سانتیاگو نصر اس سے اتنا ضرور آشنا تھا کہ سمجھ سکے کہ اپنے دنیا دارانہ مزاج کی گھمرائیوں میں وہ اپنے فطری تعصبات کا اتنا ہی اسیر ہے جتنا کہ کوئی اور ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس کا فکرمند نہ ہونا خود کشی کے مترادف ہوتا۔ اس کے علاوہ، آخری لمحات میں، جب اسے علم ہو گیا کہ ویکاریو برادران اسے قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں، اس کا رد عمل سرا سیمگی کا نہیں تھا، جیسا کہ متعدد موقعوں پر بیان کیا گیا، بلکہ بے گناہوں کی پریشانی کی طرح کا تھا۔

میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ وہ اپنی موت کو سمجھے بغیر مر گیا۔ میری بہن مارگوت سے وعدہ کرنے کے بعد، کہ وہ ہمارے گھر آکر ناشتہ کرے گا، کرسٹو بیڈویا اس کو بازو سے تمام کرگودی کی طرف لے گیا اور وہ دونوں اتنے بے فکر نظر آ رہے تھے کہ انھوں نے ایک غلط تاثر کو راہ دی۔ "وہ دونوں اتنے مطمئن چلے جا رہے تھے،" میسے لویز نے مجھے بتایا، "کہ میں نے خدا کا شکر ادا کیا، کیوں کہ میں سمجھی کہ معاملہ صاف ہو گیا ہے۔" بلاشبہ ہر کوئی سانتیاگو نصر سے بے پناہ محبت نہیں رکھتا تھا۔ پولو کاریو، برقی کارخانے کے مالک، کا خیال تھا کہ اس کا پُرسکون ہونا اس کی بے گناہی کا نہیں بلکہ کلیتہً کا مظہر تھا۔ "وہ سوچتا تھا کہ اپنی دولت کی وجہ سے وہ ناقابل گرفت ہے،" اس نے مجھے بتایا۔ فاؤسٹا لوپیز، اس کی بیوی، نے تبصرہ کیا: "بالکل ٹرکوں کی طرح۔" اندالیمیو پاروو، کلوتیلدے آرنٹا کی دکان کے پاس سے یوں ہی گزر رہا تھا کہ ویکاریو برادران نے اسے بتایا کہ جیسے ہی شپ چلا جائے گا وہ سانتیاگو نصر کو قتل کر دیں گے۔ دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح، اس نے سمجھا کہ یہ صبح خیزوں کی خواب آرائی ہے، مگر کلوتیلدے آرنٹا نے اس سے سانتیاگو نصر کے پاس جانے اور اسے خبردار کرنے کی درخواست کی۔

"تکلیف مت کرو،" پیدرو ویکاریو نے اس سے کہا۔ "جو بھی ہو، اب اسے مُردہ ہی سمجھو۔" یہ بہت زیادہ واضح چیلنج تھا: وہ اندالیمیو پاروو اور سانتیاگو نصر کے درمیان تعلق کو جاننے تھے، اور انھوں نے ضرور سوچا ہو گا کہ وہ جرم کو روکنے اور انھیں شرمندگی سے بچانے کے لیے

نہایت موزوں شخص ہے۔ مگر اندالسیو نے سانتیاگو نصر کو کرسٹو بیدویا کے ساتھ ان گروہوں میں پایا جو گودی سے لوٹ رہے تھے، اور اسے اس کو متنبہ کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ "میرے اعصاب جواب دے گئے،" اس نے مجھے بتایا۔ اس نے دونوں کی پیٹھ تھپتھپائی اور انہیں ان کی راہ پر جانے دیا۔ انھوں نے شاید ہی اسے محسوس کیا ہو، کیوں کہ وہ ابھی تک شادی کے اخراجات کا تخمینہ لگانے میں منہمک تھے۔

اب لوگ منتشر ہو کر، ان دونوں کی طرح، چوک کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ ایک کثیف بہوم تھا مگر ایسکو کیڈیٹا سنیروس کا خیال تھا کہ اس نے دونوں کو بہوم کے وسط کے ایک خالی دائرے میں بہ آسانی چلتے ہوئے دیکھا تھا، کیوں کہ لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ سانتیاگو نصر مرنے جا رہا ہے، اور ان میں اس سے مَس ہونے کی جرأت نہیں تھی۔ کرسٹو بیدویا نے بھی اس غیر معمولی طرز عمل کی وجہ سے اس بہوم کو یاد رکھا۔ "وہ ہماری طرف اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے ہم نے اپنے چہرے پر رنگ کل رکھا ہو،" اس نے مجھے بتایا۔ سارا نورسگا بھی اس وقت اپنی جوتوں کی دکان کھول رہی تھی، اور جب وہ وہاں سے گزرے وہ سانتیاگو نصر کی لڑھی ہوئی رنگت دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی۔ مگر اس نے اسے مطمئن کر دیا۔

"تم سمجھ سکتی ہو، مارا،" اس نے اس سے رُکے بغیر کہا۔ "رات بھراتے غل غپاڑے کے بعد تو ایسا ہی لگوں گا۔"

سیلیسٹے وانگوند اپنے گھر کے دروازے پر شب خوانی کے لباس میں بیٹھا ان لوگوں کا مضحکہ اڑا رہا تھا جو شب کے استقبال کو گئے تھے۔ اس نے سانتیاگو نصر کو کافی پینے کی دعوت دی۔ "مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے تھا،" اس نے مجھے بتایا۔ مگر سانتیاگو نصر نے اسے جواب دیا کہ وہ میری بہن کے ساتھ ناشتہ کرنے کے لیے لباس تبدیل کرنے کی جگت میں ہے۔ "میں بالکل گڑبڑا گیا،" سیلیسٹے وانگوند نے مجھے بتایا، "کیوں کہ اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر وہ اتنا پُر یقین ہے کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے تو پھر یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اسے قتل کرنے والے ہوں۔" جمیل شعیوم واحد شخص تھا جس نے وہی کیا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ جیسے ہی اس نے افواہ سنی، وہ اپنی بڑائی کی دکان کے دروازے پر گیا، اور سانتیاگو نصر کا انتظار کرنے لگا تا کہ اسے خبردار کر سکے۔ وہ ان آخری عربوں میں سے ایک تھا جو ابراہیم نصر کے ساتھ آئے تھے، اور اس کے دم واپس تک تاش کی بازی میں اس کا ساتھی رہا تھا، اور ابھی تک خاندان کا موروثی مشیر تھا۔ اس سے زیادہ کسی کو بھی سانتیاگو نصر سے بات کرنے کا اختیار نہیں تھا، مگر اس کے باوجود اس نے سوچا کہ اگر افواہ بے بنیاد ہے تو وہ اس کو خواہ افواہ پریشان کر دے گی، اور اس نے پہلے کرسٹو بیدویا سے مشورہ کرنے کو ترجیح دی،

کہ شاید اسے کچھ خبر ہو۔ جب وہ پاس سے گزرا، اس نے اسے آواز دی۔ کرسٹو بیدویا نے سانتیاگو نصر کو تھپکی دی، جو چوک کے مورٹیک پہنچ چکا تھا، اور جمیل شعیوم کے بلانے کا جواب دیا۔ "بہتے کو ملیں گے،" اس نے کہا۔

سانتیاگو نصر نے اسے جواب نہیں دیا، مگر عربی میں جمیل شعیوم سے کچھ کہا، جس نے عربی ہی میں، ہنسی سے بل کھاتے ہوئے جواب دیا۔ "ہم میں ذو معنی گفتگو چلتی تھی،" جمیل شعیوم نے مجھے بتایا۔ ر کے بنیر، سانتیاگو نصر نے دونوں کو ہاتھ اشارے سے الوداع کہا، اور چوک کے مورٹیک طرف چلا گیا۔ یہ آخری موقع تھا کہ انھوں نے اسے دیکھا۔

کرسٹو بیدویا نے سانتیاگو نصر کو پکڑنے کے لیے دوڑنے سے پہلے صرف جمیل شعیوم کی اطلاع سننے کا وقت لیا۔ اس نے اس کو مورٹ سے جاتے ہوئے دیکھا تھا، مگر وہ اسے اُن گروہوں میں نظر نہیں آیا جو چوک تک پہنچ کر منتشر ہونے لگے تھے۔ اس نے جس سے بھی پوچھا، اس کو ایک ہی جواب ملا:

"میں نے اسے ابھی تمہارے ساتھ دیکھا تھا۔"

یہ ناممکن معلوم ہوتا تھا کہ وہ اتنے کم وقت میں گھر پہنچ گیا ہو، مگر بہر صورت وہ اس کے بارے میں معلوم کرنے اندر چلا گیا، کیوں کہ اس نے بیرونی دروازہ آگلی چڑھے بنیر اور آدھ کھلا پایا۔ وہ فرش پر پڑے کاغذ کو دیکھے بنیر اندر گیا۔ وہ رہنے کے تاریک کمرے سے شور پیدا نہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے گزرا، کیوں کہ ممانوں کے آنے کے لیے یہ وقت نامناسب تھا۔ مگر گھر کے عقبی حصے میں کتے ہوشیار ہو گئے اور اس سے ملنے کو آگئے۔ اس نے انہیں چابیوں کی جھنکار سے چپ کرایا، جیسا کہ اس نے ان کے مالک سے سیکھا تھا، اور ان کے آگے آگے باورچی خانے کی طرف بڑھا۔ برآمدے میں وہ دیوڈنا فلور سے ٹکرایا، جو پانی کی ایک بالٹی لیے رہنے کے کمرے کا فرش صاف کرنے آرہی تھی۔ اس نے اسے یقین دلایا کہ سانتیاگو نصر واپس نہیں آیا۔ وکتوریا گزنان نے خرگوشوں کا اسٹو چولھے پر رکھا ہی تھا، جب وہ باورچی خانے میں داخل ہوا۔ وہ فوراً جان گئی۔ "اس کا دل اس کی زبان پر تھا،" اس نے مجھے بتایا۔ کرسٹو بیدویا نے اس سے پوچھا کہ کیا سانتیاگو نصر گھر آگیا ہے، اور اس نے بناوٹی معصومیت سے جواب دیا کہ وہ ابھی تک سونے کے لیے نہیں لوٹا۔

"دیکھو، بہت سنگین بات ہے،" کرسٹو بیدویا نے اس سے کہا۔ "وہ قتل کرنے کے لیے اس کو تلاش کر رہے ہیں۔"

وکتوریا گزنان اپنی معصومیت بھول گئی۔

"وہ غریب لڑکے کسی کو قتل نہیں کریں گے،" اس نے کہا۔

"وہ ہفتے کے دن سے پیسے چلے جا رہے ہیں،" کرسٹو بیدویا نے کہا۔

"اسی لیے تو،" اس نے جواب دیا۔ "دنیا میں کوئی شرابی اپنی بکواس پر عمل نہیں کرتا۔"

کرسٹو بیدویا دوبارہ رہنے کے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں دیوینا فلور نے کھڑکیوں کو کھولا ہی تھا۔ "بلاشبہ بارش نہیں ہو رہی تھی،" کرسٹو بیدویا نے مجھے بتایا۔ "اس وقت سات بجنے ہی والے تھے اور سنہری دھوپ کھڑکیوں سے آرہی تھی۔" اس نے دیوینا فلور سے پوچھا کہ کیا وہ یقین سے کہہ رہی ہے کہ سانتیاگو نصر رہنے کے کمرے کے دروازے سے اندر نہیں آیا۔ اب کی بار وہ پہلے کی طرح پُر یقین نہیں تھی۔ اس نے پلاسیدا لینیرو کے بارے میں پوچھا، اور اس نے جواب دیا کہ صرف ایک لمحے پہلے وہ اس کی کافی ٹائٹ ٹیبل پر رکھ کر آئی ہے، مگر اسے جگایا نہیں۔ ہمیشہ اسی طرح ہوتا تھا۔ وہ سات بجے اٹھتی، کافی پیتی اور دن کے کھانے کے لیے ہدایات دینے نیچے اترتی۔ کرسٹو بیدویا نے گھڑمی کی طرف دیکھا۔ چھ بیچین ہوئے تھے۔ وہ دوسری منزل پر اس بات کی تصدیق کرنے گیا کہ سانتیاگو نصر گھر نہیں آیا۔

شب خوابی کا کمرہ اندر سے بند تھا، کیوں کہ سانتیاگو نصر اپنی ماں کے شب خوابی کے کمرے کی طرف سے باہر گیا تھا۔ کرسٹو بیدویا نہ صرف اس گھر کو اپنے گھر کی طرح بخوبی جانتا تھا، بلکہ وہ اس خاندان سے اتنا مانوس تھا کہ اس نے پلاسیدا لینیرو کے شب خوابی کے کمرے کا دروازہ کھولا اور وہاں سے متصل کمرے میں چلا گیا۔ روشندان سے ایک گرد آلود روشنی کی لکیر آرہی تھی، اور خوبصورت عورت اپنی کمرٹ پر جھولے میں سوئی ہوئی اپنا عروسی ہاتھ اپنے رخسار پر رکھے غیر حقیقی لگ رہی تھی۔ "وہ ایک خوبصورت روح کی طرح تھی۔" اس نے ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا، اس کے حسن سے مسحور ہوا، اور پھر خاموشی کے ساتھ غسل خانے سے ہوتا ہوا سانتیاگو نصر کے کمرے میں چلا گیا۔ بستر ابھی تک بچا ہوا تھا، اچھی طرح استری کیے ہوئے گھر سواری کے کپڑے کرسی پر رکھے تھے، اور کپڑوں کے اوپر اس کا بیٹ اور فرش پر ممیز والے جوتے تھے۔ ٹائٹ ٹیبل پر سانتیاگو نصر کی کلائی کی گھڑمی چھ اٹھاون بتا رہی تھی۔ "ایکانک مین نے سوچا کہ وہ واپس آچکا ہے تاکہ مسلح ہو کر باہر جاسکے،" کرسٹو بیدویا نے مجھے بتایا۔ مگر اس نے میکسم ٹائٹ ٹیبل کی دراز میں پائی۔ "میں نے کبھی گولی نہیں چلائی،" کرسٹو بیدویا نے مجھے بتایا۔ "مگر میں نے فیصلہ کیا کہ ریوالور رکھ لوں اور سانتیاگو نصر تک پہنچا دوں۔" اس نے اسے اپنی قمیص کے نیچے اپنی بیلٹ میں پنہا لیا، اور جرم کے بعد ہی اس کو احساس ہوا کہ وہ بھرا ہوا نہیں ہے۔ پلاسیدا لینیرو کافی کاگ اپنے ہاتھ میں لیے جانے درمیان نمودار ہوئی، عین اس وقت جب وہ دروازہ بند کر رہا

تھا۔

"خداوند،" وہ چیخی۔ "تم نے تو مجھے ڈرا دیا۔"

کرستو بیدو یا بھی گھبرا گیا تھا۔ اس نے اس کو پوری روشنی میں سنہری پرندوں والا ڈریسنگ گاون پہنے اور بال بکھرائے دیکھا۔ اس کا سر ٹوٹ چکا تھا۔ اس نے بڑی حد تک بدحواسی میں اسے بتایا کہ وہ سانتیاگو نصر کی تلاش میں ہے۔

"وہ شپ کا استقبال کرنے گیا ہے،" پلاسیڈا لنیرو نے کہا۔

"وہ ابھی ابھی گیا ہے؟" اس نے کہا۔

"ہاں، میرا خیال ہے،" اس نے کہا۔ "وہ سب سے خراب قسم کی ماں کا بیٹا ہے۔"

وہ وہاں سے گئی نہیں، کیوں کہ اس وقت تک اس نے اندازہ لگایا تھا کہ کرستو بیدو یا اپنی حرکات و سکنات پر اختیار نہیں رہا ہے۔ "میرا خیال ہے خدا نے مجھے معاف کر دیا ہوگا، پلاسیڈا لنیرو نے مجھے بتایا، مگر مجھے وہ اتنا الجھا ہوا نظر آ رہا تھا کہ اچانک مجھے لگا کہ وہ لوٹنے آ رہے۔" اس نے پوچھا کہ وہ اتنا بدحواس کیوں ہے۔ کرستو بیدو یا کو معلوم تھا کہ وہ مشتبہ حالت میں ہے، مگر اس میں سچ بتانے کی ہمت نہیں تھی۔

"بس میں ایک منٹ بھی سو نہیں سکا ہوں،" اس نے کہا۔

وہ مزید توضیحات کے بغیر چلا گیا۔ "ویسے بھی،" اس نے مجھے بتایا، "وہ ہمیشہ اس وہم میں مبتلا رہا کرتی تھی کہ اسے لوٹنا جا رہا ہے۔" چوک پر وہ فادر امادور سے ملا، جو نہ ہونے والے اجتماع کا عبا میں کلیسا کو واپس جا رہا تھا، مگر اس کا خیال تھا کہ وہ سانتیاگو نصر کے لیے سوائے اس کی روح بچانے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ دوبارہ گودمی کی طرف بڑھ رہا تھا، جب اس نے انخیر کلو تیلدے آرمنٹا کی دکان سے پکارتے سنا۔ پیدرو ویکاریو دروازے پر تھا، زرد اور وحشت زدہ، اس گریبان کھلا ہوا تھا اور آستینیں کہنٹیوں تک چڑھی ہوئی تھیں، اور اس کے ہاتھ میں نٹا بھرا تھا۔ ۱۲ کا انداز اتنا نامناسب تھا کہ فطری نہیں لگ سکتا تھا، مگر یہ صرف ان حربوں میں سے ایک تھا جو ۱۲ نے اختیار کیا تھا تاکہ وہ اسے جرم کے ارتکاب سے روک سکے۔

"کرستو بال،" وہ چیخا۔ "سانتیاگو نصر سے کہہ دو، ہم اسے قتل کرنے کے لیے یہاں اس انتظار کر رہے ہیں۔"

کرستو بیدو یا اسے باز رکھنے کی نوازش کر سکتا تھا۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ریوالور کس طر چلایا جاتا ہے، تو سانتیاگو نصر آج زندہ ہوتا،" اس نے مجھے بتایا۔ مگر اس خیال نے اسے متاثر کر دیا کیوں کہ وہ خود چڑھی گولی کی تباہ کارانہ صلاحیت کے بارے میں سن چکا تھا۔

"میں تمہیں خبردار کرتا ہوں۔ وہ میکلنم سے مسلح ہے جس کی گولی انہی ہلاک سے گزر سکتی ہے،" اس نے چیخ کر کہا۔

بدرو ویکاریو جانتا تھا کہ یہ درست نہیں ہے۔ "وہ کبھی مسلح ہو کر نہیں ٹھکتا تھا، سوائے اُس وقت کے جب اس نے گھڑسواری کا لباس پہن رکھا ہو،" اس نے مجھے بتایا۔ مگر بہر حال اس نے اپنی بہن کی عزت کا داغ مٹانے کا فیصلہ کرتے وقت اس امکان کو مد نظر رکھا تھا کہ وہ مسلح بھی ہو سکتا ہے۔

"مرا ہوا آدمی گولیاں نہیں چلاتا،" اس نے چیخ کر کہا۔

پھر پابلو ویکاریو جانے دے در میں نمودار ہوا۔ وہ بھی اپنے بھائی کی طرح زرد ہو رہا تھا، اور شادی کی جیکٹ پہنے اور اخبار میں لپٹا بھرا لیے ہوئے تھا۔ "اگر ایسا نہ ہوتا،" کرسٹو بیدویا نے مجھے بتایا، "میں کبھی نہ جان سکتا کہ دونوں میں کون سا بھائی کون ہے۔" پھر کلو تیلدے آرمنٹا پابلو ویکاریو کے پیچھے نمودار ہوئی اور اس نے چیخ کر کرسٹو بیدویا سے جلدی کرنے کو کہا، کیوں کہ اس نامرد قصبے میں صرف اُس جیسا شخص ہی ایسے کو روک سکتا تھا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب کے علم میں ہے۔ جو لوگ گودی سے واپس آ رہے تھے، چیخوں سے ہوشیار ہو کر جرم کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے چوک پر اپنی اپنی جگہ سنبھالنے لگے۔ کرسٹو بیدویا نے کئی لوگوں سے، جنہیں وہ جانتا تھا، پوچھا کہ کیا انہوں نے سانتیاگو نصر کو دیکھا ہے، مگر کسی نے بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ سوشل کلب کے دروازے پر وہ کرنل لازارو آپونٹے سے ملا، اور اس نے اسے بتایا کہ کلو تیلدے آرمنٹا کی دکان کے سامنے کیا ہو رہا ہے۔

"یہ ناممکن ہے،" کرنل آپونٹے نے کہا، "کیوں کہ میں نے انہیں گھر جا کر سو رہنے کا حکم دیا ہے۔"

"میں نے انہیں ابھی ابھی سڑوں کو ذبح کرنے کے بھجروں کے ساتھ دیکھا ہے،" کرسٹو بیدویا نے کہا۔

"یہ ناممکن ہے، کیوں کہ وہ میں نے گھر جا کر سونے کا حکم دینے سے پہلے ان سے لے لیے تھے،" میسر نے کہا۔ "ضرور تم نے انہیں اس سے پہلے دیکھا ہو گا۔"

"میں نے انہیں دو منٹ پہلے دیکھا ہے، اور دونوں کے پاس سڑوں کو ذبح کرنے کے بھجے تھے،" کرسٹو بیدویا نے کہا۔

"لعنت ہو،" میسر نے کہا۔ "وہ ضرور نئے بھجروں کے ساتھ لوٹ آئے ہیں۔"

اس نے اس مسئلے پر فوری توجہ دینے کا وعدہ کیا، مگر وہ رات کے دہیون کی تاریخ کی تصدیق

کرنے سوشل کلب کے اندر چلا گیا، اور جب باہر نکلا تو جرم کا ارتکاب ہو چکا تھا۔ کرسٹو بیدویا نے اُس وقت اپنی واحد مہلک غلطی کی۔ اس نے سوچا کہ سانتیاگو نصر نے آخری لمحے میں فیصلہ کر لیا ہو گا کہ وہ لباس تبدیل کرنے سے پہلے ہی ہمارے گھر ناشتہ کرے گا، اور وہ اسے تلاش کرنے کے لیے وہاں پہنچا۔ وہ دریا کے کنارے تیزی سے پٹا، ہر ایک سے یہ پوچھتے ہوئے کہ کیا کسی نے اسے گزرتے ہوئے دیکھا ہے، مگر کسی نے نہیں کہا کہ اس نے دیکھا ہے۔ اسے تھویش نہیں ہوئی، کیوں کہ ہمارے گھر پہنچنے کے کسی اور راستے بھی تھے۔ پرو سپیرا آرائگو، پہاڑی لڑکی، نے اس سے اپنے باپ کی طبی امداد کرنے کو کہا، جو شپ کی گریزا دعاؤں کے اثر سے باہر اپنے گھر کے چبوترے پر جاں کنی کے عالم میں پڑا تھا۔ "میں نے اسے گزرتے ہوئے دیکھا تھا"، میری بہن مارگوت نے مجھے بتایا، "اور اس کا چہرہ اس وقت ہی مُردوں جیسا ہو چکا تھا۔" کرسٹو بیدویا نے بیمار شخص کی حالت کا اندازہ کرنے میں چار منٹ لگائے، اور وعدہ کیا کہ وہ بعد میں آکر ہنگامی امداد دے گا، مگر اس نے مزید تین منٹ شبِ خوابی کے کمرے تک جانے میں پرو سپیرا آرائگو کی مدد کرتے ہوئے ضائع کیے۔ جب وہ باہر آیا، اس نے دور سے شور کی آواز سنی، اور اسے معلوم ہوا کہ چوک کی جانب ہوائیاں چھوڑی جا رہی ہیں۔ اس نے دوڑنا چاہا، مگر ریوالور، جو اس کی بیلٹ میں بے ڈھنگے پن سے اڑسا ہوا تھا، اس کی رفتار میں مزاحم ہوا۔ جیسے ہی وہ آخری موڑ سے آگے بڑھا، اس نے میری ماں کو عقب سے پہچان لیا، جب وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو اپنے ساتھ عملاً گھسیٹتی ہوئی جا رہی تھی۔ "لوتیزا سانتیاگا"، اس نے اسے زور سے پکارا۔ "سانتیاگو نصر کہاں ہے؟" میری ماں مشکل سے مڑ سکی، اس کا چہرہ آنسوؤں میں نہایا ہوا تھا۔

"میرے بچے"، اس نے جواب دیا۔ "وہ کبہ رہے ہیں کہ اسے قتل کر دیا گیا ہے۔" ایسا ہی ہوا تھا۔ جب کرسٹو بیدویا اسے تلاش کر رہا تھا، سانتیاگو نصر اپنی منگیتر فلورا میگل کے گھر گیا تھا، جو اس موڑ کے بالکل قریب تھا جہاں اس نے اسے آخری بار دیکھا تھا۔ "میرے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ وہ وہاں ہو گا"، اس نے مجھے بتایا، "کیوں کہ وہ لوگ کبھی دوپہر سے پہلے سو کر نہیں اٹھتے تھے۔" مروجہ روایت یہ تھی کہ پورا خاندان قبیلے کے بزرگ ٹیچر میگل کی ہدایت پر بارہ بجے تک سوتا رہتا تھا۔ "اسی لیے فلورا میگل، جو اتنی نوخیز نہیں رہ گئی تھی، اس وقت تک گلاب کی طرح شاداب تھی،" مرسیڈس کہتی ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ لوگ، دوسرے بہت سے گھروں کی طرح، اپنے گھر کو بہت دیر تک بند رکھتے تھے، گموہ صبح خیز اور جفاکش تھے۔ یہ رشتہ سانتیاگو نصر اور فلورا میگل کے والدین نے طے کیا تھا۔ سانتیاگو نصر نے اسے اپنے عشقوان شہاب میں قبول کیا تھا اور وہ اسے قائم کرنے کا مصمم ارادہ نہ رکھتا تھا؛ شاید وہ بھی اپنے باپ کی طرح شادی کے

افادی پہلو کا زیادہ قائل تھا۔ فلورا میگل ایک خاص گل اندامی کی حامل تھی، مگر اس میں ذہانت اور قوت فیصلہ کی کمی تھی، اور وہ اپنی تمام ہم عصروں کے لیے دلہن کی خاص سہیلی کی حیثیت سے خدمت انجام دے چکی تھی، اس لیے یہ رشتہ اس کے لیے ایک عطیہ خداوندی تھا۔ ان کی منگنی، پُر تحفہ ملاقاتوں اور دلوں کی بے قرار یوں کے بغیر، آسانی سے عمل میں آئی تھی۔ شادی کی تاریخ کئی بار ملتوی ہونے کے بعد آخر کار کرسمس کے بعد مقرر ہوئی تھی۔

فلورا میگل اس سوموار کو بچپ کی کشتی کے پہلے شور پر بیدار ہوئی تھی، اور اٹھنے کے طور پر ہی دیر کے بعد اسے علم ہو گیا تھا کہ ویکاریو برادران سانتیاگو نصر کو قتل کرنے کے لیے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس نے میری راہبہ بہن کو، جو واحد ہستی تھی جس سے اس نے بدبختی کے بعد گفتگو کی، بتایا کہ اسے یہ بھی یاد نہیں کہ اسے کس نے یہ اطلاع دی تھی۔ "مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ چھ بجے صبح ہر کوئی جانتا تھا،" اس نے میری بہن سے کہا۔ اس کے باوجود اسے یہ ناقابل یقین نظر آتا تھا کہ وہ سانتیاگو نصر کو قتل کرنے جا رہے ہیں، اس کے برعکس، اس کو یہ خیال آیا کہ وہ اسے انجلا ویکاریو سے شادی کرنے پر مجبور کر س گے تاکہ اس کی عزت اسے واپس مل سکے۔ وہ تذلیل کے ایک شدید بحران سے گزری۔ جب آدھا قصبہ بچپ کی آمد کی انتظار کر رہا تھا، وہ غصے میں روتی ہوئی اپنے شب خوانی کے کمرے میں تھی، اور ان صندوقچے بھر خطوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی جو سانتیاگو نصر نے اسے اسکوٹ سے لکھے تھے۔

جب بھی وہ فلورا میگل کے گھر کے پاس سے گزرتا، حتیٰ کہ جب وہاں کوئی نہ بھی ہوتا، سانتیاگو نصر اپنی چابیاں کھڑکی کی جالی سے رگڑتا تھا۔ اس سوموار کو وہ خطوں کا صندوقچہ اپنی گود میں لیے انتظار کر رہی تھی۔ سانتیاگو نصر سرک پر سے اُسے نہیں دیکھ سکا، مگر اس نے بہر حال اسے چابی رگڑنے سے پہلے جالی کے اندر سے دیکھ لیا۔

"اندر آ جاؤ،" اس نے کہا۔

اس گھر میں کوئی بھی، حتیٰ کہ کوئی معالج بھی، صبح کے چہرے کرینتالیں منٹ پر داخل نہیں ہوا تھا۔ سانتیاگو نصر نے اسی وقت کرسٹو بیدویا کو جمیل شعیر کی دکان پر چھوڑا تھا، اور اس وقت چوک پر اتنے افراد اس کی حرکات پر نظر رکھے ہوئے تھے کہ یہ یقین کرنا دشوار تھا کہ کسی نے اس کو اپنی منگیتر کے گھر جاتے ہوئے نہیں دیکھا ہو گا۔ گفتیشی مجسٹریٹ نے کسی ایک آدمی کو تلاش کرنے کی کوشش کی جس نے اسے فلورا میگل کے گھر میں جاتے ہوئے دیکھا ہو، اور اس نے بھی میری طرح اتنی ہی سخت کوشش کی تھی، مگر ایک گواہ کو بھی تلاش کرنا ناممکن ثابت ہوا۔ مسل کے صفحہ ۳۸۲ پر، ایک آور حاشیاتی فیصلے میں، اس نے سرخ روشنائی سے لکھا: "بدبختی ہمیں نظروں

سے او جمل کر دیتی ہے۔ "حقیقت یہ تھی کہ سانتیاگو نصر سب کی نظروں کے سامنے، اور خود کو چھپانے کی کوئی کوشش کیے بغیر، صدر دروازے سے اندر گیا تھا۔ فلورا میگل ان لباسوں میں سے ایک بد نصیب چنٹ دار جالروں والا لباس پہنے، جو وہ یادگار مواقع پر پہننے کی عادی تھی، غصے سے پاگل ہوئی ہوئی، پارلر میں اس کا انتظار کر رہی تھی، اور اس نے صندوقچہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"تو یہ تم ہو،" اس نے اسے بتایا۔ "مجھے امید ہے کہ وہ تمہیں قتل کر دیں گے۔" سانتیاگو نصر اتنا بدحواس ہوا کہ اس نے صندوقچہ گرا دیا، اور اس کے نامحبوب خط فرش پر بکھر گئے۔ اس نے فلورا میگل کو شب خوابی کے کمرے میں جالینا چابا گھر اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس نے کئی بار دستک دی اور اس کو صبح کے وقت کا لحاظ نہ کرتے ہوئے، بست اسرار آمیز آواز میں پکارا، لہذا تمام خاندان جمع ہو گیا، اور وہ سب متوحش تھے۔ نسبی اور ازدواجی رشتے داروں کو شمار کرتے ہوئے، بڑے اور چھوٹے ملا کر وہ چودہ افراد تھے۔ خیر میگل، فلورا میگل کا باپ، اپنی سرخ ڈاڑھی کے ساتھ اور بدوی کفنان میں ملبوس، جو وہ اپنے وطن سے لایا تھا اور گھر میں تمام وقت زیب تن کیے رہتا تھا، سب سے آخر میں نمودار ہوا۔ میں نے اسے کئی بار دیکھا تھا اور وہ بست بوڑھا اور نحیف تھا، مگر جو چیز مجھے متاثر کرتی تھی وہ اس کی مقتدرانہ تاب و تاب تھی۔

"فلورا،" اس نے اپنی زبان میں پکارا۔ "دروازہ کھولو۔"

وہ اپنی بیٹی کے شب خوابی کے کمرے میں گیا، جب کہ سارا خاندان کھڑا سانتیاگو نصر کو گھورتا رہا۔ وہ پارلر میں جھکا، خط اٹھا اٹھا کر صندوقچے میں رکھ رہا تھا۔ "یہ عمل توبہ کی ایک ریاضت معلوم ہوتا تھا،" انھوں نے مجھے بتایا۔ خیر میگل چند منٹوں میں شب خوابی کے کمرے سے باہر آیا، اپنے ہاتھ سے ایک اشارہ کیا، اور تمام خاندان منتشر ہو گیا۔

اس نے سانتیاگو نصر سے عربی میں گفتگو جاری رکھی۔ "پہلے ہی لمحے میں سمجھ گیا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اُسے اس کا خفیہ سا گمان بھی نہیں ہے،" اس نے مجھے بتایا۔ اس نے اس سے بے درنگ پوچھا کہ کیا وہ جانتا ہے کہ ویکاریو برادران قتل کرنے کے لیے اس کو تہش کر رہے ہیں۔ "وہ زرد پڑ گیا اور اپنا توازن اس طرح کھو بیٹھا کہ یہ سوچنا ناممکن تھا کہ وہ دیکھاوے کے لیے ایسا کر رہا ہے۔" اس نے اتفاق کیا کہ اس کا رویہ خوف سے زیادہ ایک پریشانی کا غماز تھا۔

"صرف تم جان سکتے ہو کہ ان کا الزام درست ہے یا نہیں،" اس نے اس سے کہا۔ "مگر بہر صورت، اب تمہارے پاس دو راستے ہیں: یا تو تم یہیں چھپ جاؤ، اس گھر میں جو تمہارا ہے، یا تم میری رائفل لے کر باہر نکلو۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے،" سانتیاگو نصر نے کہا۔ وہ صرف اتنا ہی کہنے کے قابل

ہوسکا، اور اس نے یہ اسپانوی میں کہا۔ "وہ ایک بھیگے ہوئے پرندے کی طرح لگ رہا تھا،" نخر میگل نے مجھے بتایا۔ اس کو صندوقچہ اس کے ہاتھ سے لینا پڑا، کیوں کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دروازہ کھولنے کے لیے اسے کہاں رکھے۔

"یہ دو کا ایک سے مقابلہ ہوگا،" اس نے اسے بتایا۔

سانتیاگو نصر چلا گیا۔ لوگوں نے خود کو چوک پر اسی انداز میں مقرر کر لیا تھا جیسا کہ وہ پریڈ کے دنوں میں کیا کرتے تھے۔ ان سب نے اسے باہر آتے دیکھا، اور وہ سب سمجھ گئے کہ اب وہ جانتا ہے کہ وہ اسے قتل کرنے جا رہے ہیں، اور وہ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ اسے اپنے گھر جانے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک بالکنی سے کسی نے چیخ کر کہا، "بے ٹرک، اس راستے سے نہیں، پرانی گودی کی طرف سے۔" سانتیاگو نصر نے آواز دینے والے کو ڈھونڈنا چاہا۔ جمیل شعیوم نے اسے آواز دی کہ وہ اس کی دکان کے اندر آجائے، اور اپنی شکاری ہندوق لانے چلا گیا۔ مگر اسے یاد نہیں آیا کہ اس نے کارتوس کہاں رکھے تھے۔ انھوں نے اسے ہر طرف سے آوازیں دینی شروع کر دیں، اور سانتیاگو نصر اتنی آوازوں سے بوکھلا کر کئی بار آگے بڑھا، اور پھر پیچھے لوٹا۔ یہ واضح تھا کہ اس کا رخ اپنے گھر کے باورچی خانے کے دروازے کی طرف تھا، مگر یک دم اسے احساس ہوا ہوگا کہ صدر دروازہ کھلا ہے۔

"وہ آ رہا ہے،" پابلو ویکاریو نے کہا۔

دونوں نے اسے بیک وقت دیکھا۔ پابلو ویکاریو نے اپنی جیکٹ اتاری، اسے منچ پر رکھا، اور اپنا جُحرا اخبار سے نکال کر اسے ایک تلوار کی طرح تمام لیا۔ دکان سے ٹٹکنے سے پہلے، بغیر کسی مطابقت کے، دونوں نے اپنے سینوں پر صلیب کا نشان بنایا۔ پھر کلوئیلدے آرمینا نے پابلو ویکاریو کی قمیص تمام لی اور سانتیاگو نصر سے چیخ کر کہا کہ وہ بھاگ جائے کیوں کہ وہ اسے قتل کرنے جا رہے ہیں۔ یہ اتنی بگڑی چیخ تھی کہ اس نے دوسروں کو چپ کرادیا۔ "پہلے تو وہ حیرت زدہ رہ گیا،" کلوئیلدے آرمینا نے مجھے بتایا، "کیوں کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے کون آواز دے رہا ہے اور کہاں سے۔" مگر جب اس نے اسے دیکھا، اس نے بیدرو ویکاریو کو بھی دیکھ لیا، جس نے کلوئیلدے آرمینا کو دھکا دے کر زمین پر گرادیا اور اپنے بھائی سے جا ملا۔ سانتیاگو نصر اپنے گھر سے پچاس گز سے کم فاصلے پر تھا، اور وہ صدر دروازے کی طرف دوڑا۔

پانچ منٹ پہلے وکٹوریا گزنان نے پلاسیدا لینیرو کو وہ سب کچھ بتا دیا تھا جو لوگ پہلے سے جانتے تھے۔ پلاسیدا لینیرو مضبوط اعصاب کی عورت تھی، اور اس نے فکر مندی کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہونے دی۔ اس نے وکٹوریا گزنان سے پوچھا کہ کیا اس نے اس کے بیٹے کو کچھ بتایا ہے، اور

اس نے ایمانداری سے جھوٹ بولا، کیوں کہ اس نے اسے جواب دیا کہ جب وہ کافی کے لیے نیچے آیا تھا، اس وقت تک وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ رہنے کے کمرے میں جہاں وہ ابھی تک فرش صاف کر رہی تھی، دیوینا فلور نے اسی وقت سانتیاگو نصر کو چوک کی طرف والے دروازے سے اندر آتے، اور کھلی سیرٹھیوں سے شب خوابی کے کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔ "یہ ایک بہت واضح فریبِ نظر تھا،" دیوینا فلور نے مجھے بتایا۔ "وہ سفید لباس پہنے ہوئے تھا، اور اپنے ہاتھ میں کچھ لیے تھا جس کا میں ٹھیک سے اندازہ نہیں کر سکی، مگر وہ گلابوں کے ایک دستے کی طرح لگ رہا تھا۔" اس لیے جب پلاسیڈالینیرو نے اس کے بارے میں پوچھا، دیوینا فلور نے اسے مطمئن کر دیا۔

"وہ ایک منٹ پہلے اپنے کمرے میں گیا ہے،" اس نے اسے بتایا۔

تب پلاسیڈالینیرو نے کاغذ کو فرش پر دیکھا، مگر اس کو اسے اٹھانے کا خیال نہیں آیا، اور اسے صرف اس وقت معلوم ہوا کہ اس میں کیا لکھا تھا جب کسی نے بعد میں المیے کی افراقی کے دوران اسے وہ خط دکھایا۔ دروازے سے اس نے دیکھا کہ ویکاریو برادران اپنے بچے بند کیے اس کے گھر کی طرف دوڑتے آرہے ہیں۔ اس جگہ سے جہاں وہ تھی، وہ انھیں دیکھ سکتی تھی، مگر اپنے بیٹے کو جو ایک دوسری سمت سے دروازے کی طرف دوڑ رہا تھا، نہیں دیکھ سکتی تھی۔ "میں سمجھی کہ وہ اسے قتل کرنے کے لیے مکان کے اندر داخل ہونا چاہتے ہیں،" اس نے مجھے بتایا۔ پھر وہ بھاگی اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ آگ ل چڑھا رہی تھی جب اس نے سانتیاگو نصر کی چیخیں سنیں، اور دروازے پر کسی کے سخت خوفزدگی کے عالم میں زور زور سے ہاتھ مارنے کی آواز آئی، مگر اس نے سوچا کہ وہ اوپر اپنے کمرے کی بالکنی سے ویکاریو برادران پر چلا رہا ہے۔ وہ اس کی مدد کرنے اوپر گئی۔

سانتیاگو نصر کو اندر آنے میں چند ثانیے رہ گئے تھے جب دروازہ بند ہوا۔ اس نے اپنی مٹھیوں سے کئی مرتبہ دروازہ پٹا، اور پھر فوراً اپنے دشمنوں کا اپنے خالی ہاتھوں سے مقابلہ کرنے کو مڑا۔ "میں اسے رو بہ رو دیکھ کر ڈر گیا،" پابلو ویکاریو نے مجھے بتایا، "کیوں کہ وہ اپنے قد سے دُگنا لگ رہا تھا۔" سانتیاگو نصر نے پیدرو ویکاریو کا پہلا وار روکنے کے لیے، جس نے اس پر سید سے تھامے ہوئے چترے سے دائیں جانب سے حملہ کیا تھا، اپنا ہاتھ بند کیا۔

"سور کے پتو،" وہ چیخا۔

پھر اس کی دائیں ہتھیلی سے گزر کر اس کے پہلو میں دستے تک اتر گیا۔ ہر شخص نے اس کی دردناک چیخ سنی۔

"اوہ، میری ماں۔"

پیدرو ویکاریو نے جھڑ اپنی قساویں والی فولادی کلائی سے باہر کھینچا، اور دوسرا وار تقریباً اسی مقام پر کیا۔ "تعب یہ ہے کہ جھڑا ہر بار بے داغ باہر آتا رہا،" پیدرو ویکاریو نے تفتیش کرنے والے کو بیان دیا۔ "میں نے اسے کم از کم تین بار اس کے جسم میں اتارا، مگر اس پر خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔" سانتیاگو نصر تیسرے وار کے بعد خم کھا گیا، اس کے بازو اس کے پیٹ پر تھے؛ اس نے ایک ذبح ہوتے ہوئے بچھڑے کی کراہ نکالی، اور اپنی پشت ان کی طرف کرنے کی کوشش کی۔ پابلو ویکاریو نے، جو اس کے پائیں طرف تھا، پھر اسے پشت کا واحد زخم لگایا، اور خون کی ایک دھار بہت زیادہ فشار سے اس کی قمیص تر کر گئی۔ "اس میں اُس کی مہک تھی،" اس نے مجھے بتایا۔ تین بار مملک طور پر زخمی ہو کر، سانتیاگو نصر پھر سامنے کی طرف مڑا، اور مزاحمت کیے بغیر اپنی پشت اپنی ماں کے دروازے سے ٹپکی، جیسے انھیں قتل کرنے میں برابر کی شرکت کا موقع دے رہا ہو۔ "وہ پھر نہیں چھا،" پیدرو ویکاریو نے تفتیش کرنے والے کو بتایا۔ "اس کے برعکس، مجھے ایسا لگا کہ وہ قہقہہ لگا رہا ہے۔" پھر ان دونوں نے، دہشت کے اُس پار کی خیرگی میں، دروازے سے لگے ہوئے سانتیاگو نصر پر باری باری، بے آسانی وار کرتے ہوئے، اپنی خنجر زنی جاری رکھی۔ انھوں نے پورے قصبے کی آوازیں سنیں، جو اپنے جرم سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔ "مجھے ایسا محسوس ہوا جیسا گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر اسے سر پیٹ دوڑاتے ہوئے محسوس ہوتا ہے،" پابلو ویکاریو نے بیان کیا۔ مگر وہ دونوں فوراً ہی حقیقت کی دنیا میں آگئے، کیوں کہ وہ تنک چلے تھے؛ اس کے باوجود انھوں نے سوچا کہ سانتیاگو نصر کبھی نہیں گرے گا۔ "لغبت ہو،" پابلو ویکاریو نے مجھے بتایا، "تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ کسی انسان کو قتل کرنا کتنا دشوار ہے۔" اسے ایک وار میں ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے، پیدرو ویکاریو نے اس کے دل کا نشانہ لینا چاہا، مگر اس نے اسے بغل کے قریب تلاش کیا، جہاں سوروں کا دل ہوتا ہے۔ درحقیقت سانتیاگو نصر کے نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ان کے وار اسے دروازے کے ساتھ کھڑائے ہوئے تھے۔ ایوس ہو کر پیدرو ویکاریو نے اس کے پیٹ پر ایک اچھی چاک لگایا، اور اس کی تمام انتڑیاں باہر نکل آئیں۔ پیدرو ویکاریو پھر یہی عمل دہرانے جا رہا تھا، مگر خوف سے اس کی کلائی مڑ گئی اور اس کا تیز وار ران پر پڑا۔ سانتیاگو نصر دروازے کی ٹیک لگائے ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گیا، پھر اس نے اپنی صاف اور نیگلوں انتڑیوں کو سورج کی روشنی میں دیکھا اور اپنے گھٹنوں پر گر گیا۔

پلاسیدا لینیرو، شب خوابی کے کمرے میں تلاش کرنے اور آواز دینے کے بعد، دوسری چیخوں کو سن کر جو اس کی اپنی نہیں تھیں، اور یہ نہ جانتے ہوئے کہ وہ کہاں سے آ رہی ہیں، چوک کی طرف کھٹنے والی کھڑکی پر گئی اور ویکاریو برادران کو کلیسا کی طرف بھاگتے دیکھا۔ جمیل شعیوم اپنی

بگوار بندوق لیے ہوئے، اور چند دوسرے غیر مسلح عرب، ان کے تعاقب میں تھے، اور پلاسیدا لینیرو نے سوچا کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ پھر وہ شب خوابی کے کمرے کی بالکنی پر آئی اور اس نے سانتیاگو نصر کو دروازے کے سامنے، خاک پر منہ کے بل پڑے اور اپنے ہی خون میں تر، اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ ایک طرف کو جھک کر کھڑا ہوا، اور اس نے، اپنی لنگتی ہوئی انٹریوں کو باتھوں میں تھامے، کا بوس زدگی کے عالم میں چلنا شروع کیا۔

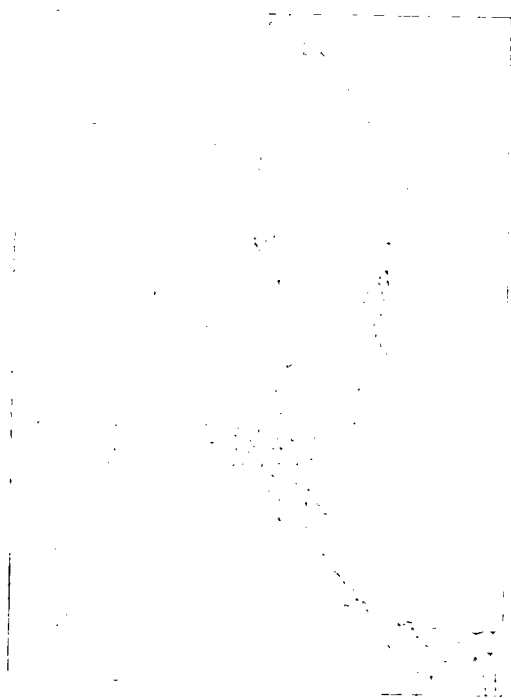
وہ گھر کے گرد دائرہ مکمل کرتے ہوئے سو گز سے زیادہ دور تک چلا، اور باورچی خانے کے دروازے سے اندر پہنچا۔ اس کو اس وقت بھی سرنگ سے ہو کر لمبے راستے سے نہ جانے کا ہوش تھا، اور وہ پڑوس کے مکان کے راستے اندر گیا۔ پونچو لاناؤ، اس کی بیوی، اور ان کے پانچ بچے نہیں جانتے تھے کہ ان کے دروازے سے بیس قدم کے فاصلے پر کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ ”ہم نے چیخیں سنی تھیں،“ اس کی بیوی نے مجھے بتایا، ”مگر ہم سمجھے یہ بپ کے جن کا ایک حصہ ہیں۔“ وہ ناشتہ کرنے بیٹھے ہی تھے جب انہوں نے سانتیاگو نصر کو، خون میں تر اور اپنی انٹریاں باتھوں میں لیے، اندر آتے دیکھا۔ پونچو لاناؤ نے مجھے بتایا: ”میں فُصلے کی اُس بولناک بدبو کو کبھی نہیں بھولوں گا۔“ مگر آرنے نیدا لاناؤ، سب سے بڑی لڑکی، نے کہا کہ سانتیاگو نصر حسب عادت اپنے قدموں کو بونوئی ناپتے ہوئے، اپنی اعلیٰ بردباری کے ساتھ چل رہا تھا، اور یہ کہ اپنے سرکش کانٹوں کے ساتھ اس کا عرب چہرہ ہمیشہ سے زیادہ حسین لگ رہا تھا۔ میز کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا، اور شب خوابی کے کمروں سے ہوتا ہوا گھر کے عقبی دروازے کی طرف بڑھا۔ ”ہم خوف سے مفلوج ہو گئے تھے،“ آرنے نیدا لاناؤ نے مجھے بتایا۔ میری خالہ وینے فریدا مارکیز، دریا کی دوسری طرف اپنے صحن میں ایک چشم سیاہ مچھلی کے فلس اتار رہی تھی کہ اس نے اسے پرانی گودی کی سیرمٹیوں سے اترتے، اور اُستوار قدموں کے ساتھ اپنے گھر کا راستہ تلاش کرتے دیکھا۔

”سانتیاگو نصر، میرے بچے،“ اس نے اس سے چیخ کر کہا، ”تمہیں کیا ہوا؟“

”انہوں نے مجھے قتل کر دیا ہے،“ اس نے کہا۔

آخری سیرمٹی پر وہ لڑکھڑا کر گرا، مگر فوراً ہی اٹھ گیا۔ ”اس نے اس خاک کو بھی صاف کرنے کا خیال رکھا جو اس کی انٹریوں پر لگ گئی تھی،“ میری خالہ نے مجھے بتایا۔ پھر وہ اپنے گھر میں عقبی دروازے سے داخل ہوا، جو چھ بچے سے کھلا ہوا تھا، اور باورچی خانے میں منہ کے بل گر گیا۔

100



انتخاب کا یہ حصہ مارکیز کے دو اہم ترین ناولوں *One Hundred Years of Solitude* اور *Love in the Time of Cholera* کے منتخب ابواب پر مشتمل ہے۔

"تہنائی کے سو سال" مارکیز کا سب سے معروف ناول ہے اور درحقیقت یہی وہ کتاب ہے جس نے مارکیز کو دنیا بھر میں متعارف کرایا۔ یہ ناول پہلی بار ہسپانوی زبان میں ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا اور اُس وقت سے لے کر ستائیس زبانوں میں مجموعی طور پر اس کے سینکڑوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اس نے دنیا بھر کے لاکھوں پڑھنے والوں کو تحیر اور مسرت سے ہم کنار کیا ہے۔ اس ناول میں مارکیز نے ایسی منفرد بیانیہ میتیں تخلیق کیں جو دنیا بھر کے فکشن پر گہرا اثر ڈال رہی ہیں۔ مشہور چیک ناول نگار میلان کنڈیرا (Milan Kundera) کا کہنا ہے کہ "تہنائی کے سو سال" کے ہوتے ہوئے ناول کے زوال یا خاتمے کی بات کرنا لغویت کے سوا کچھ نہیں۔ اس ناول کے پہلے تین باب اس حصے میں شامل ہیں۔

"دبا کے دنوں میں محبت" ہسپانوی زبان میں ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا، اور اس حقیقت کی شہادت دیتا ہے کہ اس عظیم قصہ گو میں پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈالنے اور ان کی توقعات سے بلند ہونے کی کس قدر بے پناہ صلاحیت ہے۔ یہ ناول جو اپنے اسلوب اور ہیئت کے اعتبار سے "تہنائی کے سو سال" سے بہت مختلف ہے، مارکیز کی اس خواہش کا ثمر ہے کہ وہ محبت کی ایسی کہانی لکھنا چاہتا تھا جس کا انجام خوش گوار ہو، "کیوں کہ دنیا میں خوشی کی بہت کمی ہے۔" اس ناول کا دوسرے باب کا ترجمہ اس حصے میں شامل ہے۔

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ: زینت حسام

تنہائی کے سوسال

بہت برسوں بعد، فائرنگ اسکو اڈ کا سامنا کرتے ہوئے، کرنل اوریلیانو بوئندیا ماضی کی اُس دور دراز سہ پہر کو یاد کرنے والا تھا جب اس کا باپ زندگی میں پہلی بار اسے برف دیکھانے لے گیا تھا۔ اس وقت ماکوئندو مٹی کے بیس گھروں پر مشتمل گاؤں تھا، جو ایک ایسے دریا کے کنارے بنائے گئے تھے جس کا شفاف پانی پکنے پتھروں کے پاٹ پر بہتا تھا۔ یہ پتھر ماقبل تاریخ کے اندھوں کی مانند سفید اور عظیم الجثہ تھے۔ دنیا اتنی تازہ تھی کہ بہت سی چیزوں کے کوئی نام نہ تھے، اور ان کا ذکر کرتے وقت اُن کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہوتا۔ ہر سال مارچ کے مہینے میں مفلوک الحال خانہ بدوشوں کا ایک قبیلہ گاؤں کے قریب اپنے خیمے لگاتا، اور تئاروں اور بانسریوں کے شور و غل کے ساتھ نئی ایجادات کا مظاہرہ کرتا۔ پہلے وہ مقناطیس لائے۔ غیر مانوس ڈاڑھی اور چڑیا کے سے ہاتھوں والے ایک بھاری بھر کم خانہ بدوش نے، جس نے اپنا تعارف ملکبادیس کے نام سے کرایا، لوگوں کے سامنے، بقول اس کے، مقدونیہ کے عالم کیمیا گروں کے آنکھوں عبوبے کا ایک جید مظاہرہ پیش کیا، اور لوگ شہر ہو کر، اپنی اپنی جگہوں سے گر کر دھات کے پیچھے لڑکتی دیگچوں، کڑھائیوں، چمٹوں اور انگلیٹھیوں کو، کیلوں اور پیسوں کی بے قراری سے

”ٹڑختے شتیروں کو، اور ان اشیاء کو جنہیں گم ہوئے مدتیں ہو چکی تھیں، انہیں کوفل مخدروں سے، جہاں انہیں سب سے زیادہ تلاش کیا گیا تھا، نمودار ہوتے دیکھتے رہ گئے، جو ایک ہنگامہ خیز افراتفری میں ملکبادیس کے طلسمی ڈلوں کے چچے گھسٹتی چلی آ رہی تھیں۔“ اشیاء کی اپنی زندگی ہوتی ہے، ”خانہ بدوش نے کرخت لہجے میں اعلان کیا، ”صرف ان کی روحوں کو بیدار کرنے کی بات ہے۔“ حوزے آرکادیو بونڈیا نے، جس کا تخیل ہمیشہ فطرت کی قوتوں سے، بلکہ معجزوں اور ظلمات سے بھی پرے جاتا تھا، سوچا کہ اس بے مقصد ایجاد کے ذریعے زمین کے پیٹ سے سونا نکالا جاسکتا ہے۔ ملکبادیس نے، جو ایک دیانت دار انسان تھا، اس کو خبردار کیا: ”اس سے یہ کام نہیں لیا جاسکتا۔“ لیکن حوزے آرکادیو بونڈیا اُن دنوں خانہ بدوشوں کی دیانت پر ایمان نہ رکھتا تھا، لہذا اس نے اپنے چچر اور دو بکریوں کے عوض مقناطیسی ڈلے خرید لیے۔ اس کی بیوی اُرسلا اگواران، جو اپنے مختصر گھریلو مال واسباب میں اعنائے کے لیے ان جانوروں پر انحصار کرتی تھی، حوزے آرکادیو کو اس حرکت سے باز نہ رکھ سکی۔ ”بہت جلد ہمارے پاس کافی سونا ہوگا اور ہم گھر کا فرش پکا کر داسکیں گے،“ اس کے شوہر نے کہا۔ وہ کئی مہینوں تک اس خیال کو سچ ثابت کرنے میں لگا رہا۔ مقناطیسی ڈلوں کو گھسیٹتے ہوئے اور ملکبادیس کے متر بہ آواز بلند پڑھتے ہوئے، حوزے آرکادیو بونڈیا نے اُس خطے کا ایک ایک بچ کھون لیا، یہاں تک کہ دریا کی تہ بھی کھنڈال ڈالی۔ جو کچھ وہ کھود نکالنے میں کامیاب ہوا وہ پندرہویں صدی کا ایک زرہ بکتر تھا، جو زنگ خوردگی سے جڑا ہوا تھا، اور جس کے اندر پتھروں سے بھرے ہوئے ایک بہت بڑے ٹوہنے کی گونج سنائی دیتی تھی۔ جب حوزے آرکادیو بونڈیا اور اس کی مہم کے چار آدمی زرہ بکتر کو کھولنے میں کامیاب ہوئے تو اس کے اندر سے ایک بھر بھرا ہوا انسانی دُعا نچا برآمد ہوا، جس کے گلے میں تانبے کا ایک لاکٹ محمول رہا تھا۔ لاکٹ کے اندر کسی عورت کے بالوں کی ایک لٹ تھی۔

مارچ میں خانہ بدوش واپس آئے۔ اس دفعہ وہ اپنے ساتھ دو رہین، اور طبل برابر مدبِ عندسہ لائے، جسے انھوں نے ایسٹریڈیم کے یودیوں کی ایجاد کبھی نہ متعارف کرایا۔ انھوں نے ایک خانہ بدوش عورت کو گاؤں کے ایک سرے پر بٹھا دیا اور خیمے کے سامنے دو رہین لگا کر بیٹھ گئے۔ پانچ سگھوں کے عوض لوگ دو رہین میں جہانک کر عورت کو ہاتھ بھر فاصلے پر بیٹھا دیکھ سکتے تھے۔ ”سائنس نے فاصلے مٹا دیے ہیں،“ ملکبادیس نے اعلان کیا۔ ”بہت جلد کوئی بھی شخص گھر بیٹھے دیکھ سکے گا کہ دنیا کے کسی بھی خطے میں کیا ہو رہا ہے۔“ دوپہر کے چلتے سورج نے مدبِ عندسے کے ساتھ ایک حیرت انگیز تماشا کیا: انھوں نے گلی کے بیچ خشک بجوے کی ایک ڈسیری لگائی، اور شمعوں کو مرکز کر کے اس میں آگ بھڑکا دی۔ حوزے آرکادیو بونڈیا کو، جس

کی اپنے مقتناطیسوں کی ناکامی کے بعد سے اب تک دل جوتی نہ ہو سکی تھی، عدے کو جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا خیال آیا۔ ملکبادیس نے ایک بار پھر اس کو باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن آخر کار دو مقتناطیسی ڈلوں اور نوآبادیاتی زمانے کے تین سکوں کے عوض حوزے آرکادیو بونڈیا کو محدب عدسہ دے دیا۔ اُرسلا پریشانی سے رو دی۔ وہ پیسے سونے کے سکوں سے بھرے صندوق سے نکالے گئے تھے جو اس کے باپ نے عمر بھر روکھی سوکھی کھا کر جوڑے تھے، اور جو اُرسلا نے کسی مناسب وقت پر استعمال میں لانے کے لیے پلنگ کے نیچے زمین میں دبا رکھے تھے۔ حوزے آرکادیو بونڈیا نے ارسلا کو تسلی دینے کی کوئی کوشش نہ کی، اور کسی سائنس دان کی سی نفس کشی کے ساتھ، خود اپنی سلامتی کی بھی پروا کیے بغیر، حربی تجربات میں محو ہو گیا۔ دشمنوں کی فوج پر عدسے کے اثرات کے مظاہرے کی ایک کوشش میں، وہ سورج کی شعاعوں کے ارتکاز کا خود شکار ہو کر اپنا جسم کئی جگہ سے جلا بیٹھا، اور ان زخموں کے بھرنے میں طویل عرصہ لگا۔ بیوی کے احتجاج پر، جس کو اس خطرناک ایجاد پر بے حد تشویش تھی، ایک موقع پر حوزے آرکادیو بونڈیا جھنجھلا کر گھر کو آگ دھکانے لگا تھا۔ وہ مسلسل کئی کئی گھنٹے اپنے کمرے میں بند، اس انوکھے ہتھیار کے حربی امکانات کا جائزہ لیتا رہتا، یہاں تک کہ وہ ایک ایسا ہدایت نامہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا جو حیرت انگیز طور پر اطلاقی صراحت، اور ایک ناقابل تعرض یقین کا مل کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ یہ کتابچہ اس نے اپنے لاتعداد تجربوں کی تفصیلات اور خاکوں کے ساتھ تسمی کر کے، ایک قاصد کے ہاتھ حکومت کو روانہ کیا، جو سپارڈوں کو عبور کرتا، لامتناہی دلدلوں میں گم ہوتا، سرکش دریاؤں کو پار کرتا، وباؤں، خونخوار جانوروں اور نامیلا یوں سے قریب المرگ تھا کہ اس نے ایک ایسا راستا پایا جسے ڈاک لے جانے والے پتھر استعمال کیا کرتے تھے۔

اس حقیقت کے باوجود کہ دارالخلا نے تک پہنچنا ناممکن حد تک مشکل تھا، حوزے آرکادیو بونڈیا نے ٹھان لی کہ جیسے ہی حکومت اسے فوج کے سامنے اس ایجاد کا عملی ثبوت دینے اور فوجیوں کو ہتھیار شاعی جنگ کے رموز سکھانے کا حکم دے گی، وہ اس مہم پر نکل کھڑا ہو گا۔ کئی سال تک اس نے جواب کا استعار کیا۔ آخر کار استعار سے تنک کر اس نے ملکبادیس کے سامنے اپنے تجربوں کی ناکامی کا رونا رویا۔ خانہ بدوش نے دیانت داری کا تسلی بخش ثبوت دیتے ہوئے محدب عدسہ واپس لے کر حوزے آرکادیو بونڈیا کو مقتناطیسی ڈلے لوٹا دیے، اور اس کے ساتھ کچھ پر نکالی نقشے اور جہاز رانی کے چند آلات بھی اس کے پاس چھوڑ دیے۔ اس نے رامب بیرمن کی تحقیقات کا مختصر خلاصہ خود تحریر کر کے حوزے آرکادیو کو دیا تاکہ وہ اسٹریٹ، قطب نما اور زاویہ پیماس کو کام میں لاسکے۔ حوزے آرکادیو بونڈیا نے برسات کے طویل ماہ اس چھوٹے سے کمرے

میں بند ہو کر تجربات کرنے میں گزارے جسے اس نے مکان کے عقب میں تعمیر کیا تھا تاکہ کوئی اس کے تجربات میں خلل انداز نہ ہو سکے۔ اپنی فانی زندگی کے داروں سے یکسر بے نیاز ہو کر، وہ تمام رات صحن میں بیٹھا ستاروں کی چالیں دیکھا کرتا، اور دوپہر کے درست وقت کا تعین کرنے کے چکر میں اسے گولگتے لگتے بچے۔ جب وہ اپنے آلات کے استعمال میں طاق ہو گیا تو اس کے ذہن میں خلا کا ایسا نظریہ آیا جس کی مدد سے وہ اپنے کتب خانے سے نکلے بغیر انجانے سمندروں کا سفر، غیر آباد خطوں کی سیر اور شاندار ہستیوں سے تعلق قائم کر سکتا تھا۔ یہ وہ دن تھے جب اس نے خود سے باتیں کرنے اور گھر میں کسی کی طرف متوجہ ہوئے بغیر چلنے کی عادتیں اپنائی تھیں۔ اس دوران اُرسلا اور بچوں کی، باغ میں کیلے، کلاؤس، شکر قند، آبیو اما اور بیگن اکا اکا کر، کمر ٹوٹنے لگی تھی۔ پھر اچانک، کسی اطلاع کے بغیر، حوزے آرکادیو بونسڈیا کی ہڈیاں سرگرمی کی جگہ ایک فٹوں کی سی کیفیت نے لے لی۔ اس نے کئی دن یوں گزارے جیسے کس سحر میں ہو، اپنی سمجھ پر اعتبار کیے بغیر وہ سرگوشیوں میں خوفناک قیاسات بڑھاتا رہتا۔ آخر دسمبر کے مہینے میں، مشکل کے روز، دوپہر کے کھانے کے وقت، اس نے اپنی اذیت کا تمام بوجھ اچانک اتار پھینکا۔ بچے اپنے باپ کی، جو طویل بے خوابی اور اپنے تختیل کے قہر سے تباہ ہو چکا تھا، اس جلیل القدر متانت کو عمر بھر یاد رکھنے والے تھے جس کے ساتھ اس نے اپنی دریافت ان پر منکشف کی:

"دنیا گول ہے، تاریکی کی طرح۔"

اُرسلا سے ضبط نہ ہو سکا۔ "اگر تم کو پاگل ہونا ہی ہے تو براہ کرم صرف خود پاگل ہو،" وہ چلائی، "اپنے خاں بدوشوں کے سے خیالات بچوں کے سروں میں نہ گھساؤ۔" بے حس حوزے آرکادیو بونسڈیا اپنی بیوی کی مایوسی سے خوفزدہ نہ ہوا، جس نے طیش میں آکر اسطراب فرش پر دے مارا۔ اس نے اسطراب دوبارہ بتا لیا، گاؤں کے مردوں کو تنگ کمرے میں جمع کیا اور اپنے نظریات کی مدد سے، جنہیں کوئی نہ سمجھ سکا، اس امکان کو ثابت کرنے میں لگ گیا کہ مسلسل مشرق کی سمت سفر کرنے پر کوئی بھی شخص اُسی جگہ واپس پہنچ سکتا ہے جہاں سے اس نے سفر کا آغاز کیا ہو۔ گاؤں بھر کو یقین ہو چلا تھا کہ حوزے آرکادیو بونسڈیا کا دماغ چل گیا ہے۔ تب ملکبادیس نے آکر معاملہ سلجایا۔ اس نے لوگوں کے سامنے اس شخص کی ذہانت کو سراہا جس نے خالصتاً علم ہیئت کے قیاس پر مبنی ایک ایسا نظریہ پیش کیا جو پہلے ہی عملی طور پر ثابت کیا جا چکا تھا، گو کہ ماکوئو میں اب تک کسی کو اس کا علم نہ تھا۔ محسین کے ثبوت طور پر اس نے حوزے آرکادیو بونسڈیا کو ایک ایسا تحفہ دیا جو گاؤں کے مستقبل پر گہرا اثر ڈالنے والا تھا: ایک کیمیاگر کی تجربہ گاہ۔

تب تک ملکیداہیں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ بوڑھا ہو گیا تھا۔ ابتدائی پھیروں میں وہ حوزے آرکادیو بوندیا کا ہم عمر نظر آتا تھا۔ لیکن جب کہ موخر الذکر نے اپنی غیر معمولی قوت کو برقرار رکھا تھا، جس کے ذریعے وہ گھوڑے کو کانوں سے پکڑ کر روک سکتا تھا، خانہ بدوش لگتا تھا کسی بیماری سے اندر ہی اندر گھلتا جا رہا ہے۔ درحقیقت اس کا یہ حال ان متعدد اور غیر معمولی بیماریوں کی وجہ سے ہوا جن کا وہ دنیا کے گرد بے شمار چکر لگاتے ہوئے شکار ہوا تھا۔ جیسا کہ تجربہ گاہ میں آلات ترتیب سے رکھنے میں حوزے آرکادیو بوندیا کی مدد کرتے وقت بات چیت کے دوران خود اس نے کہا، موت اس کے تعاقب میں تھی، اس کے پانچوں کو سونگھتی پھرتی، لیکن اپنے منہ اس پر گاڑنے کا فیصلہ نہ کر پاتی۔ ملکیداہیں ان تمام طاعونوں اور ناگہانی آفتوں سے بچ کر آیا تھا جو نوع انسان پر حملہ آور ہوئی تھیں۔ وہ فارس میں پھیلا گرا، ملایا کے جزائر میں اسقربوط، اسکندریہ میں کوڑھ، جاپان میں بیری بیری، مدغاسکر میں کالے طاعون، سیلی میں زلزلے اور آبتائے ماگیلان میں سمندری طوفان سے بچ نکلا تھا۔ ملکیداہیں ایک دل گیر شخص تھا، اداسی کے بالے میں گھرا ہوا ایک ایسا انونھا بشر جس کے پاس کہا جاتا تھا ناسترادیس کی پیش گوئیوں کی شرحیں تھیں: ایک ایسی نگاہ کا حامل جو ایشیا کے پار دیکھ سکتی تھی۔ وہ ایک بڑا سا کالا بیٹھ پسے رہتا، جو بڑے بڑے پر پھیلائے پہاڑی کوئے کی مانند لگتا، اور ایک خمیلی واسکٹ جس پر صدیوں کی چکنی تہ جمی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے علم و فراست، اور اس کی ہراساں وسعت نگاہ کے باوجود، اس کا ایک انسانی وجود تھا، ایک بوجھ، ایک دنیاوی کیفیت، جو اس کو روزمرہ کے مسائل میں الجھائے رکھتی۔ وہ ضعیفی میں لاگو ہونے والی بیماریوں کا رونا روتا، اور معمولی پریشانیوں سے دوچار رہتا۔ ہنستا وہ ایک عرصہ ہوا ترک کر چکا تھا، کیوں کہ اس کے دانت اسقربوط کی بیماری میں گر گئے تھے۔ اس جس زندہ دوپہر کو، جب خانہ بدوش اپنے راز اس پر آشکار کر رہا تھا، حوزے آرکادیو بوندیا کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ ان دونوں کے درمیان ایک عظیم دوستی کا آغاز ہو رہا ہے۔ بچے اس کی عجیب و غریب داستانیں حیرت زدہ ہو کر سن رہے تھے۔ اور یلیانو، جو اس وقت پانچ سال سے زیادہ کا نہ ہو گا، زندگی بھر ملکیداہیں کو اسی طرح یاد رکھنے والا تھا جیسا اس نے اس دوپہر کو دیکھا تھا: دھات کی سی چمکیلی اور مرتعش روشنی میں بیٹھا، تھیل کی تاریک ترین گہاؤں کو اپنی بیماری گونج دار آواز سے روشن کرتا ہوا، جبکہ گرمی کی حدت سے اس کی کنپٹیوں پر چکنائی پگھل کر بہہ رہی تھی۔ حوزے آرکادیو، اس کا بڑا بھائی، اس زبردست لمحے کا نقش موروثی یاد کا حصہ بنا کر اپنی آل اولاد کے لیے چھوڑ جانے والا تھا۔ البتہ اُرسلا کے لیے ملکیداہیں کی اس ملاقات کی ناخوشگوار یاد باقی رہی، کیوں کہ جس لمحے وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی، ملکیداہیں نے بے احتیاطی

سے پارے کا فلاسک توڑا تھا۔

"اس میں سے شیطانی بو آرہی ہے،" ارسلانے کہا۔

"ہرگز نہیں،" ملکیدیاس نے اس کی اصلاح کی۔ "یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ شیطان میں

گندھک کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ پارہ تو محرق ہو رہا ہے۔"

ہمیشہ کی طرح پند آمیز ملکیدیاس ارسلان کو شکرگف کی شیطانی خصوصیات پر لیکچر دینے لگا۔

ارسلان نے اس کی باتوں پر توجہ نہ دی، اور بچوں کو لے کر عبادت کے لیے چلی گئی۔ اس کاٹنے والی

تیز بو کو اس کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے ملکیدیاس کی یاد سے وابستہ ہو جانا تھا۔

وہ ابتدائی تجربہ گاہ، طرح طرح کے برتنوں، گپٹیوں، مقاطیر اور چھلنیوں کے علاوہ، پانی کی

ایک بھرتی سی ننکی، پتلی لمبی گردن والے کالج کے پیالے، پارس پتھر کی ایک قتل، اور مریم

یسود کے تین بازوؤں والے انبیق پر مشتمل تھی جسے خانہ بدوشوں نے جدید تفصیلات کی روشنی

میں بنایا تھا۔ ان اشیاء کے ساتھ، ملکیدیاس سات سیاروں سے مطابقت رکھنے والی سات دھاتوں

کے نمونے، سونے کی مقدار دگنی کرنے والے موسیٰ اور روزنمس کے نسخہ جات، تخریجات اور

خاکوں سے مرتع ان عظیم تعلیمات پر مبنی ایک جامع کلیات، ان لوگوں کے لیے چھوڑ گیا تھا جو ان

کی تفسیر کی صلاحیت رکھتے ہوں اور پارس پتھر تیار کرنے کا بیڑا اٹھا سکیں۔ سونے کی مقدار دگنی

کرنے کے آسان نسخے کے جمانے میں آکر حوزے آرکادیو بونڈیا ہشتوں ارسلان کی طرف ملتفت

رہا، تاکہ وہ زمین میں دبائے ہوئے سونے کے سکے نکالنے دے، اور وہ ان کو اتنی دفعہ دگنا کر سکے

جتنا کہ پارے کو تقسیم در تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ارسلان ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی اپنے شوہر کی اٹل

خند کے آگے نہ ٹھہر سکی۔ اور پھر حوزے آرکادیو بونڈیا نے تین سکوں کو ایک کرٹھائی میں ڈالا،

ان کو تانبے کے ذرات، زرنخ، گندھک اور جست کے ساتھ پگھلایا، اور پھر اس آمیزے کو ارندھی

کے تیل میں ابلنے کو رکھ دیا، یہاں تک کہ وہ ایک گاڑھے، طاعونی سیال میں بدل گیا، جو سونے

سے زیادہ عام سا شکر کا شیرہ معلوم ہوتا تھا۔ ارسلان کو ورٹے میں ملا ہوا قیمتی اثاثہ ان پر خطر اور

سخت مراطل سے گزرنے، سات سیاروں کی دھاتوں کے ساتھ پگھلنے، ہوا بند پارے اور جوہر نمک

کے ساتھ ملائے جانے اور ختریر کے تیل میں پکنے کے بعد (کہ مٹی کا تیل اُس وقت دستیاب نہ

تھا) سور کی بھنی ہوئی خستہ محال کے ایک بڑے سے ٹکڑے میں تبدیل ہو گیا جو کرٹھائی کے

پہندے سے مضبوطی کے ساتھ چپک گیا تھا۔

جب خانہ بدوش واپس آئے تو ارسلان پورے گاؤں کو ان کے خلاف کرچی تھی۔ لیکن تجسس

خوف پر غالب آیا، کیوں کہ اس دفعہ خانہ بدوش طرح طرح کے سازبجائے گاؤں میں گھوم رہے

تھے، کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، اور ایک نقارچی ناسیان سینیز کی سب سے حیران کن ایجاد کے مقابلے کا اعلان کر رہا تھا۔ لہذا ہر شخص خیمے کی طرف چل پڑا، اور ایک ایک سٹک دے کر جو ان سال ملکیداہیں کا دیدار کرنے لگا، جس کی جھڑیاں غائب ہو چکی تھیں اور نئے سفید دانت چھما رہے تھے۔ جن لوگوں کو ملکیداہیں کے استقر بوط سے گلے ہوئے موڑھے، اندر کو چپکے ہوئے گال اور پٹھے ہوئے ہونٹ یاد تھے، خانہ بدوش کی مافوق الفطرت قوت کا مقابلہ دیکھ کر خوف سے کانپنے لگے، اور وہ خوف اس وقت شدید ہراس میں بدل گیا جب ملکیداہیں نے اپنی بتیسی ایک لمحے کے لیے نکال کر دکھائی۔۔۔ وہ لمحہ جس میں ملکیداہیں دوبارہ وہی پیر فرقت بن گیا۔۔۔ اور منہ کھول کر اسے پھر سے جمایا، اور اعادہ شباب کے پورے اعتماد کے ساتھ مسکرایا۔ حوزے آرکادیو بوسندیا تک نے یہ سوچا کہ ملکیداہیں کا علم اپنے عروج کو پہنچ چکا ہے، لیکن جب ملکیداہیں نے اسے نقلی دانتوں کے بارے میں سمجھایا تو حوزے آرکادیو بوسندیا پر ایک مثبت جوش کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ بات اس کو اتنی معمولی ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی انوکھی لگی کہ راتوں رات وہ کیمیاگری سے اپنی تمام تر دلچسپی کھو بیٹھا۔ وہ بدرمراجی کے ایک نئے بحران سے گزرا۔ اس نے وقت پر کھانا پینا چھوڑ دیا۔ تمام دن وہ گھر میں ٹھہلا کرتا۔ "دنیا میں ناقابل یقین چیزیں ہو رہی ہیں،" اس نے ارسلہ سے کہا، "دیا کے اُس پار ہر طرح کے طلسمی آلات موجود ہیں، اور ہم یہاں گدھوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔" جو لوگ حوزے آرکادیو بوسندیا کو ماکوندو کی بنیاد پڑنے کے وقت سے دیکھتے چلے آئے تھے، وہ حیران رہ گئے کہ وہ ملکیداہیں کے اثر میں آکر کتنا بدل گیا ہے۔

ابتدا میں حوزے آرکادیو بوسندیا گھر کا پُر شباب سربراہ تھا، جو کاشت کاری کی بدانتیں جاری کرتا، بچوں کی پرورش اور جانوروں کی افزائش نسل کے بارے میں مٹھورے دیتا، اور سب کے ساتھ مل کر ہر طرح کے کام کرتا، یہاں تک کہ گاؤں کی بھید کے لیے جسمانی مشقت میں بھی لوگوں کا ہاتھ بٹاتا۔ اس کا گھر شروع ہی سے گاؤں کا بہترین گھر تھا، لہذا دوسرے گھر اسی طرز پر بنائے گئے تھے۔ اس گھر میں ایک چھوٹی سی روشن بیٹھک تھی، چبوترے پر کھانے کا کمرہ بنایا گیا تھا جس میں خوش رنگ پھول تھے، دو خواب گاہیں تھیں، ایک آنگن جس میں شاد بلوط کا ایک دیو قامت درخت تھا، ایک صاف ستھرا باغیچہ، اور ایک باڑا جہاں بکریاں، سؤر اور مرغیاں پُر سکون سنگت میں رہتی تھیں۔ صرف لڑکا مرغی ایک ایسا حیوان تھا جس کا نہ صرف اس گھر میں، بلکہ پوری آبادی میں داخلہ ممنوع تھا۔

ارسلہ کام کرنے کی اتنی ہی استعداد رکھتی تھی جتنی اس کا شوہر۔ وہ پُھر تیلی، چھوٹی سی، سخت گیر، مضبوط اعصاب والی عورت، جس کو آج تک کسی نے گنگنا تے نہ سنا تھا، پوچھنے سے

رات گئے تک اپنے سنت، کلف دار پیٹی کوٹ کی نرم سرگوشیوں کے ساتھ ہر جگہ دکھائی دیتی۔ اسی کی بدولت گٹھا ہوا پتھا فرش، مٹی کی دیواریں، لکڑی کا پرانا فرنیچر، جو انھوں نے خود بنایا تھا، ہمیشہ صاف ستھرا رہتا، اور پرانی الماریوں کے خانوں سے، جہاں وہ اپنے کپڑے رکھتے تھے، کالی نلکی کی گرم مہک اٹھا کرتی۔

حوزے آرکادیو بونڈیا نے، جو گاؤں کا سب سے زیادہ پُر عزم مرد تھا، بستی کے تمام گھر ایسے وقوع پر بنائے تھے کہ ہر گھر سے یکساں محنت کے ساتھ دریا پر جا کر پانی لایا جاسکتا تھا، اور گلیوں کی ترتیب ایسی سوجھ بوجھ سے رکھی تھی کہ کسی گھر کو دوسرے گھر سے زیادہ دھوپ کی حدت نہ پہنچتی۔ چند ہی برسوں میں ماکوئو جیسا با ترتیب اور محنتی گاؤں اس کی تین سو کی آبادی میں سے کسی نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ حقیقتاً ایک ایسا خوش و خرم گاؤں تھا جہاں کوئی تیس سال سے زیادہ کا نہ تھا، اور جہاں کوئی موت واقع نہیں ہوئی تھی۔

گاؤں کی بنیاد پڑنے کے زمانے ہی سے حوزے آرکادیو بونڈیا نے پنجرے اور دام بنائے تھے۔ کچھ ہی عرصے میں نہ صرف اس نے اپنے گھر کو، بلکہ گاؤں کے ہر گھر کو توتوں، میناؤں، بلبلوں اور خوش رنگ کٹنی دار پرندوں سے بھر دیا۔ انواع و اقسام کے پرندوں کی چھما بٹیس اور نغے ارسلان کوتا پریشان کرتے کہ وہ اپنے کانوں میں موم ڈال لیتی کہ کہیں شور سے پاگل نہ ہو جائے۔ جب ملکبادیس کا قبیلہ پہلی دفعہ سرورد کے علاج کے لیے شیشے کی گولیاں پہنتا گاؤں پہنچا تھا، تو سب کو حیرت ہوئی تھی کہ انھیں خوابیدہ دلدلوں میں گم یہ گاؤں کیوں کر ملا، اور خانہ بدوشوں نے اقرار کیا تھا کہ وہ پرندوں کے نغموں کا پتھا کرتے ہوئے وہاں تک پہنچے ہیں۔

اجتماعی پیش قدمی کا یہ جذبہ جلد ہی غائب ہو گیا؛ مقتناطیس کی دھن، علم نجوم کے حساب کتاب، کیمیاگری کے خوابوں، اور دنیا کے نوادرات دریافت کرنے کی تمنا نے اس ولولے کو پس پشت ڈال دیا۔ ایک صاف ستھرے، چاق و چوبند انسان سے، حوزے آرکادیو بونڈیا ایک قابل الوجود، لباس کے معاملے میں بے پروا شخص میں تبدیل ہو گیا، جس کی وحشیانہ ڈاڑھی ارسلان بڑی کوششوں اور باورچی خانے کی بھری کی مدد سے تراشتی۔ کئی لوگ اسے آسیب کا شکار سمجھتے۔ لیکن وہ لوگ بھی، جنہیں اس کے پاگل پن کا یقین ہو چکا تھا، اپنے اپنے کام کاج اور گھر بار چھوڑ کر اس کے چھتے چھتے چلے آئے، جب وہ اوزار سنبھالتا ہوا نکلا، اور لوگوں سے ایک ایسی راہ کھولنے کے لیے کہا جس کے ذریعے ماکوئو کی رسائی دنیا کی عظیم ایجادات تک ہو سکے۔

حوزے آرکادیو بونڈیا خطے کے جغرافیے سے قطعی نا بلند تھا۔ اسے صرف یہ معلوم تھا کہ مشرق میں سنگھن پہاڑی سلسلہ ہے، اور پہاڑوں کے دوسری طرف ریو باجا کا قدیم شہر، جہاں، اس

کے دادا اور یلیانو بوندیا اول کے بقول، سر فرانس ڈریک نے توپوں سے مگر مچھوں کا شکار کیا تھا، اور پھر ان کے ٹکڑے اکٹھا کر کے، اور ان میں بھس بھروا کے، ملکہ الزبتھ کی خدمت میں پیش کیے تھے۔ جوانی میں حوزے آرکادیو بوندیا اور اس کے آدمیوں نے سیوی بچوں، مویشیوں اور سازو سامان کے ساتھ ان پہاڑوں کو عبور کیا تھا تا کہ سمندر تک نکلنے والی راہ کا پتہ لگا سکیں، اور چھبیس ماہ کے بعد اس مہم کو خیر باد کہہ کر ماکوندو کی بنیاد ڈالی تھی تا کہ انھیں واپس نہ جانا پڑے۔ لہذا وہ ایک ایسا راستہ تھا جس سے اسے کوئی دل چسپی نہ تھی، جو صرف ماضی کو جانتا تھا۔ جنوب میں دلدل تھی، جو دائمی خود رو نباتاتی کیچڑ سے ڈھکی ہوئی تھی، اور دلدلی سلسلے کی وسیع کائنات تھی، جس کی، خانہ بدوشوں کے بقول، کوئی حدیں نہ تھیں۔ مغرب کی سمت وہ وسیع دلدل ایک لالٹناہی آبی سلسلے سے جا ملتی تھی جہاں نرم جلد والی، دودھ پلانے والی مچھلیاں تھیں، جن کے سر اور دھڑکرتیوں کے سے تھے، اور جن کے غیر معمولی پستانوں کی کشش ملاحوں کو برباد کر دیتی تھی۔ خانہ بدوش زمین کے اس ٹکڑے تک پہنچنے سے پہلے، جہاں سے ڈاک لے جانے والے خنجر گزرا کرتے تھے، اس دلدلی راستے پر چھ ماہ تک گشتیوں میں رواں رہے تھے۔ حوزے آرکادیو بوندیا کے حساب کے مطابق، تہذیب سے اتصال کا راستہ شمال کی سمت سے ٹکل سکتا تھا۔ لہذا اس نے زمین صاف کرنے کے اوزار اور شکار کرنے کے ہتھیار ان لوگوں کو تمھانے جو ماکوندو بساتے وقت اس کے ساتھ تھے، قلمب نما اور نقتے اپنے تھیلے میں ڈالے، اور اس پر خطر مہم پر ٹکل پڑا۔

پہلے چند روز انھیں کوئی مشکل نہ پیش آئی۔ وہ دریا کے پتھر یلے کنارے کے ساتھ ساتھ اس جگہ تک اترتے چلے گئے جہاں انھیں برسوں پہلے سپاہی کا زرد بکتر ملا تھا، اور وہاں سے جھٹکی نارنگی کے درختوں کے درمیان ایک پگڈنڈی سے گزر کر بن میں داخل ہو گئے۔ پہلے ہفتے کے اختتام پر انھوں نے ایک ہرن شکار کر کے بھونا۔ لیکن وہ اس بات پر متفق ہوئے کہ آدھا ہرن سکھایا جائے، اور باقی نمک لگا کر آئندہ کے لیے رکھ لیا جائے۔ اس تیاری کے ذریعے انھوں نے کوشش کی کہ توپوں کو پکڑ کر نہ کھانا پڑے، جن کا نیلا گوشت سخت اور بدمزہ ہوتا تھا۔ پھر دس دن سے زیادہ عرصے تک انھوں نے سورج نہ دیکھا۔ زمین آتش فشاں کے لاوے کی طرح نرم اور گیلی ہوتی گئی، نباتات دبیر تر، اور پرندوں کی چیخیں اور بندروں کا شور دور تر ہوتا گیا، اور کائنات پر دائمی اداسی چھا گئی۔ اپنے جوتے کھولتے ہوئے تیل کے جوہرٹوں میں دھنساتے، کھڑکیوں سے خون رنگ سوسن کے پھولوں کو کاٹتے اور سنہرے سلامندار مارتے ہوئے، مہم کے لوگ اس پر نم اور ساکت جنت کے اندر قدیم یادوں میں ڈوبتے چلے گئے، وہ یادیں جو گناہ آدم کے وقت سے بھی پرے کی تھیں۔ ایک ہفتے تک، منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر، خواب ناک کیفیت میں سرشار، نیند میں چلنے والوں

کی مانند، وہ اس عملگین کائنات میں اترتے چلے گئے، وہ کائنات جو صرف جگمگاتے ہوئے کیڑوں کی لطیف پرچائیوں سے روشن تھی، اور ان کے پھپھڑے خون کی دم گھونٹنے والی بو سے پھنسنے لگے۔ وہ واپس نہ جاسکتے تھے، کیوں کہ وہ جو بھی راستا کھولتے، جلد ہی نباتات دوبارہ اگنے سے بند ہونے لگتا، وہ نباتات جو ان کے دیکھتے ہی دیکھتے آگ آتی تھیں۔ "ٹھیک ہے،" حوزے آرکادیو بونندیا کہتا۔ "اصل بات یہ ہے کہ ہم سمت نہ بھول جائیں۔" قلب نما کی مدد سے وہ اپنے آدمیوں کو آن دیکھے شمال کی جانب راستا دکھاتا رہا تا کہ وہ اس پر ظلم خطے سے نکل سکیں۔ وہ ایک گہری رات تھی، بے ستارہ، لیکن اندھیرا تازہ اور صاف ہوا سے بارور ہوتا جا رہا تھا۔ طویل مسافت کی تنگن سے چور، انھوں نے اپنی اپنی جھولنیاں درختوں کے تنوں سے تانیں اور دو ہفتوں کے مسلسل سفر کے بعد گہری نیند سوئے۔ صبح جب ان کی آنکھ کھلی تو سورج آسمان پر چمک رہا تھا۔ منظر کے فُوں نے انھیں گنگ کر دیا۔ ان کے سامنے قرن اور کھجور کے درختوں میں گہرا، صبح کی روشنی میں سفید، اور سفوف کی طرح بھر بھرا ہوا ایک بڑا سا قدیم ہسپانوی جہاز، داہنے رخ پر ہلکا سا جھکا ہوا کھڑا تھا۔ اس کے مستول پر بادبان کے چیدھڑے جھول رہے تھے۔ جہاز کے رستے گیارہ سے مزین تھے، اور اس کا پیٹا، نرم کافی اور پسترائی ہوئی سیپ مچلیوں سے پٹا ہوا، مضبوطی سے پتھر ملی زمین پر جھاکھڑا تھا۔ تمام ڈھانچائیوں لگتا تھا جیسے اپنی مخصوص جگہ گھیرے ہوئے ہو، جو تنہائی اور گمنامی کی دنیا تھی، وقت کی تباہ کاری اور پرندوں کی دست برد سے محفوظ۔ جہاز کے اندرونی حصے میں، جس کا مہم کے ارکان نے احتیاط کے ساتھ جائزہ لیا، پھولوں کے ایک گھنے جنگل کے سوا کچھ نہ نکلا۔

جہاز کی دریافت سے، جو سمندر کے نزدیک ہونے کی نشان دہی کرتی تھی، حوزے آرکادیو بونندیا کی ہمت ٹوٹ گئی۔ وہ اسے اپنی متون مزاج قسمت کی ایک چال سمجھا، کہ وہ سمندر جس کو وہ ہزار بار قربانیوں اور دشواریوں کے باوجود تلاش نہ کر پایا تھا، اب اچانک، کسی تلاش کے بغیر، ایک ناقابلِ تغیر شے کی طرح اس کے راستے میں حائل تھا۔ بہت برسوں بعد، جب وہ خطہ ڈاک کی باقاعدہ ترسیل کے راستے کے طور پر استعمال ہونے لگا تھا، اسے ایک بار پھر کرنل اوریلیانو بونندیا نے عبور کیا، اور اسے جہاز کا صرف جلا ہوا ڈھانچا فیوں کے کھیت میں نظر آیا۔ اس وقت، جب اسے یقین ہو گیا کہ باپ کی سنائی ہوئی گمنامی اُس کے ذہن کی اختراع نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی تھی، اس کو تعجب ہوا کہ جہاز خشکی کے اس حصے میں کس طرح آکر پھنسا ہو گا۔ لیکن حوزے آرکادیو بونندیا کو اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ جہاز کو پیچھے چھوڑ کر، مزید چار دن کے سفر کے بعد، جب اس نے راکھ کے رنگ کا گندا، جھاگ اڑاتا سمندر دیکھا تو اس کے سارے خواب ڈھسے گئے۔ وہ سمندر اتنی قربانیوں اور مہم جوئیوں کے قابل نہ تھا۔

"خدا غارت کرے،" وہ چلایا، "ماکونڈو چاروں طرف سے پانی سے گھرا ہوا ہے۔"

جزیرہ نما ماکونڈو کا خیال، جو حوزے آرکادیو بونڈیا کے بنائے ہوئے بے طور، بے ڈھنگے نقشے کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا، طویل عرصے تک قائم رہا۔ وہ نقشہ اس نے مہم سے واپسی پر طیش میں آ کر بنایا تھا، بدینیتی سے، راستے کی مشکلات کو بڑھا چڑھا کر، گویا خود کو اس بات کی سزا دے رہا ہو کہ اس نے عقل سے کس قدر بالاتر ہو کر وہ جگہ چنی تھی۔ "ہم کہیں نہیں پہنچ سکتے،" اس نے ارسلہ سے واویلا کیا، "ہم یہیں سر کر رہے ہیں گے، سائنس کے فائدے اٹھائے بغیر۔" یہ یقین، جس پر تجربہ گاہ کے طور پر استعمال کیے جانے والے تنگ کمرے میں بند حوزے آرکادیو بونڈیا بہت دنوں تک سوچ بچار کرتا رہا، ماکونڈو کو کسی بہتر مقام پر منتقل کرنے کے منصوبے کا سبب بنا۔ اس وقت تک ارسلہ کو اس ہڈیانی منصوبے کی ہوا لگ چکی تھی۔ ایک جیونٹی کی سی رازداری اور مشقت کے ساتھ اس نے گاؤں کی عورتوں کو اپنے شوہروں کی متلون مزاجی کی مخالفت پر مائل کر لیا تھا، جو منتقلی کی تیاریوں میں مصروف ہو چکے تھے۔ حوزے آرکادیو بونڈیا کو معلوم نہ ہوا کہ کس لمحے، یا کن مخالفت قوتوں کے سبب، اس کا منصوبہ غدر، ٹال مٹول، ناسید یوں اور حیلہ ساز یوں کے جالوں میں پھنس کر ایک فریب میں بدل گیا۔ ارسلہ نے ایک معصوم توجہ کے ساتھ اس پر نظر رکھی، بلکہ اس صبح جب وہ نقل مکانی کے بارے میں بڑبڑاتا ہوا عقبی کمرے میں تجربہ گاہ کا سامان ڈٹوں میں رکھ رہا تھا، ارسلہ کو اس پر ترس بھی آیا۔ لیکن اس نے حوزے آرکادیو بونڈیا کو یہ کام مٹانے دیا۔ اور کچھ کئے بغیر اسے ڈبے بند کر کے ان میں کیلیں ٹھونکتے، اور سیاہی میں برش ڈبو کر اپنا نام لکھتے ہوئے دیکھتی رہی، لیکن اسے معلوم تھا کہ حوزے آرکادیو بونڈیا کو معلوم ہے (کیوں کہ ارسلہ نے اسے خود سے جیسے جیسے سرگوشیاں کرتے سن لیا تھا) کہ گاؤں کے لوگ اس مہم میں اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ البتہ جب حوزے آرکادیو بونڈیا کمرے کا دروازہ اکھاڑنے لگا، تو ارسلہ نے بہت کر کے اس سے پوچھا کہ وہ کیا کر رہا ہے، اور اس نے کسی قدر تلخی کے ساتھ جواب دیا: "چوں کہ کوئی ہمارا ساتھ دینے کو تیار نہیں، لہذا ہم لوگ اکیلے ہی جائیں گے۔" ارسلہ پریشان نہ ہوئی۔

"ہم نہیں جائیں گے،" اس نے کہا، "کیوں کہ ہمارا بیٹا یہاں پیدا ہوا تھا۔"

"یہاں ابھی تک ہم میں سے کوئی نہیں مرا ہے۔ جب تک کسی جگہ کوئی اپنا دفن نہ ہو، وہ جگہ اپنی نہیں ہوتی۔"

ارسلہ نے ایک نرم استقامت سے جواب دیا: "اگر تم سب لوگوں کے یہاں ٹھہرنے کے لیے مجھے مرنا پڑا تو میں مر جاؤں گی۔"

حوزے آرکادیو بونڈیا نے کبھی نہ سوچا تھا کہ اس کی بیوی عزم کی اتنی بچی ہے۔ اس نے ارسلہ کو اپنے پُرکشش تمیلات سے لہانے کی کوشش کی؛ ایک انوکھی دنیا کا وعدہ کیا جہاں انسان کی جب خواہش ہوتی، اُسے صرف زمین پر آبِ طلسم چھڑکنا ہوتا اور درخت پھل دینے لگتے، جہاں درد رفع کرنے کے لیے انواع و اقسام کے آلاتِ سستی قیمت پر ملتے۔ لیکن ارسلہ اس کی بصیرت سے قطعی متاثر نہ ہوئی۔

”بجائے اس کے کہ تم اپنی احمقانہ ایجادات کے بارے میں سوچتے رہو، تمہیں اپنے لڑکوں کی فکر کرنی چاہیے،“ ارسلہ نے کہا، ”دیکھو، وہ کس حالت میں ہیں۔ گدھوں کی طرح وحشی ہوتے جا رہے ہیں۔“

حوزے آرکادیو بونڈیا نے اپنی بیوی کی بات کو لفظاً لیا اور کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا۔ بچے دھوپ میں ننگے پاؤں باغ میں دوڑتے پھر رہے تھے، اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے بچے اسی لمحے، اچانک، ارسلہ کے جادو پھونکنے سے وجود میں آئے ہوں۔ حوزے آرکادیو بونڈیا کو اندر ہی اندر کچھ ہوا، کوئی قطعی اور پُراسرار کیفیت، جو اسے اس کے اپنے زمانے سے اکھاڑ کر یادوں کے نامعلوم گوشوں میں لے گئی۔ ارسلہ نے جھاڑو دنا جاری رکھا، اس گھر میں جو آبِ خالی چھوڑ دیے جانے کے خطرے کی زد سے باہر آچکا تھا۔ حوزے آرکادیو بونڈیا خیالوں میں گم کھڑا بچوں کو دیکھتا رہا، یہاں تک کہ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھوں کی نمی صاف کی، اور تسلیم و رضا کا ایک گہرا سانس کھینچا۔

”ٹھیک ہے،“ حوزے آرکادیو بونڈیا نے کہا، ”لڑکوں سے کھوڑیوں سے سامان ٹکوانے میں میری مدد کریں۔“

سب سے بڑا لڑکا، حوزے آرکادیو، چودہ سال کا تھا۔ اس کا سر چوکور، بال گھنے اور فطرتِ باپ کی سی تھی۔ گو کہ اس کی قوت اور جسمانی نشوونما کی رفتار باپ پر لگی تھی، یہ بات ابتدا ہی سے واضح تھی کہ اس میں تخیل کی کمی ہے۔ وہ ماکوندو بسانے سے پہلے، دشوار گزار پہاڑوں کو عبور کرنے کے دوران پیٹھ میں آیا اور پیدا ہوا تھا، اور اس کے والدین نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ اس کے خدوخال جانوروں جیسے نہ تھے۔ اور یلیانو، جو ماکوندو میں پیدا ہونے والا پہلا انسان تھا، مارچ میں چھ سال کا ہونے والا تھا۔ وہ ایک خاموش طبع اور اپنے آپ میں گم بچہ تھا۔ وہ ماں کے پیٹ میں رویا تھا، اور پیدائش کے وقت اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ جب نال کاٹی جا رہی تھی تو اس نے اپنا سر اوجھڑا دھر گھما کر گرد و پیش کا جائزہ لیا تھا، اور کمرے میں موجود چیزوں اور چہروں کا بے خوف تجسس کے ساتھ معائنہ کیا تھا۔ اور پھر ان لوگوں سے لاتعلقی، جو اسے قریب سے دیکھنے آئے، کھجور کی

چال کی بنی چمت کو نکٹا رہا تھا، جو لگتا تھا مسلسل بارش کے دباو سے کسی وقت بھی ڈسے سکتی ہے۔ ارسلہ کو بچے کی نگاہ کی شدت اس لمحے تک یاد نہ آئی جب تین سالہ اوریلینا نو باورچی خانے میں داخل ہوا، جس وقت وہ ابلتے ہوئے سوپ کو چولہے سے اتار کر میز پر رکھ رہی تھی۔ باورچی خانے کی دہلیز پر کھڑے بچے نے متحیر ہو کر کہا تھا، "سوپ بننے والا ہے!" سوپ کا برتن، حفاظت سے میز کے پیچوں پہ رکھا تھا، لیکن بچے کے منہ سے یہ الفاظ نکلنے ہی میز کے کنارے کی جانب حرکت کرنے لگا، گویا کسی اندرونی قوت سے کھینچا چلا جا رہا ہو، اور زمین پر گر کر ٹوٹ گیا۔ گھبرائی ہوئی ارسلانے اپنے شوہر سے اس واقعے کا تذکرہ کیا۔ لیکن حوزے آرکا دیو بوندیانے اسے فطری عمل سے تعبیر کیا۔ حوزے آرکا دیو بوندیا کا ہمیشہ سے یہی حال تھا۔ وہ اپنے لڑکوں کے وجود سے یکسر بیگانہ تھا، کچھ اس وجہ سے کہ وہ بچپن کو ذہنی کم مائیگی کا دور سمجھتا تھا، اور کچھ اس لیے بھی کہ وہ ہمیشہ اپنے تخیلاتی مفروضوں میں کھویا رہتا۔

لیکن اس دوپہر کے بعد سے، جب اس نے لڑکوں کو بلا کر ڈبوں سے تجربہ گاہ کی چیزیں نکلوانے میں مدد لی تھی، اس نے انہیں اپنا بہترین وقت دیا۔ اُس چھوٹے سے الگ تھلگ کمرے میں، جس کی دیواریں رفتہ رفتہ عجیب وغریب نقشوں اور حیران کن خاکوں سے بھر گئی تھیں، اس نے ان کو پڑھنا سکھانا اور حساب کرنا سکھایا، اور دنیا کے عجوبوں کے بارے میں بتایا۔ اس عمل میں وہ نہ صرف اپنا حاصل کردہ علم استعمال میں لاتا، بلکہ اپنے تخیل کو اس کی انتہائی حدود تک کھینچ لے جاتا۔ اس طرح لڑکوں کو معلوم ہوا کہ جنوبی افریقہ کی آخری حدوں پر بسنے والے لوگ اتنے ذہین اور شانت ہوتے ہیں کہ فرصت کے لمحات میں ان کی ایک ہی سرگرمی ہوتی ہے: بیٹھ کر سوچنا، اور یہ کہ بحرہیمین کو پیدل ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے پر چھلانگ لگاتے ہوئے عبور کر کے سالونیکا کی بندرگاہ تک پہنچا جاسکتا ہے۔ وہ سرائیکیز نقشوں کے ذہنوں پر اس طرح نقش ہوئیں کہ، بست برسوں بعد، فوجی افسر کے فائرنگ اسکوڈ کو گولی چلانے کا حکم دینے سے ایک سیکنڈ پہلے، کرنل اوریلینا نو بوندیا کو مارچ کی وہ گرم سہ پہر دوبارہ دکھائی دی جب اس کا باپ، دور سے آتی ہوئی نقاروں، نفیر یوں اور خانہ بدوشوں کے گیتوں کی آوازیں سن کر، جو میسٹس کے سیانوں کی تازہ ترین اور سب سے حیران کن ایجاد کی منادی کرتے ہوئے گاؤں میں ایک بار پھر داخل ہو رہے تھے، طبیعیات کا سبق اودھورا چھوڑ کر، ساکت آنکھوں اور ہوا میں بلند باتھوں کے ساتھ، سرزد کھڑا رہ گیا تھا۔

وہ نئے خانہ بدوش تھے، جوان مرد اور عورتیں، جو صرف اپنی زبان جانتے تھے، پکنی جلدوں اور ذہین باتھوں والے خوب صورت لوگ، جن کے رقص اور موسیقی نے ماکوندو کی گلیوں میں

مسرت آمیز ہنگامہ برپا کر دیا؛ رنگارنگ توتے لیے، جو اطالوی گیت گاتے، اور ایک مرغی جو طنبورے کی آواز پر سونے کے سوانڈے دیتی؛ اور ایک سدھا ہوا بندر جو لوگوں کے خیالات پڑھ لیتا، اور ایک ایسی مشین جس کے کئی استعمال تھے، جو بٹن ٹانگنے اور بخار کم کرنے کا کام ساتھ ساتھ انجام دیتی، اور ایک ایسا آدم جس سے انسان اپنی ناخوشگوار یادیں فراموش کر سکتا تھا، اور ایک پیلٹس جس سے وقت زائل ہو جاتا، اور مزید ایک ہزار ایجادات، جو اتنی عجیب و غریب اور انوکھی تھیں کہ حوزے آرکادیو بونندیا کا یقیناً دل چاہا ہو گا کہ وہ ایک ایسی مشین ایجاد کرے جس کے ذریعے ان تمام چیزوں کو یاد رکھا جاسکے۔ ایک لمحے میں خانہ بدوشوں نے گاؤں کی کایا پلٹ دی۔ ماکوندو کے باشندوں نے خود کو اپنی ہی گلیوں میں گم، میلے کی بھیر میں حیران و سرگرداں پایا۔

دونوں بچوں کے ہاتھ تھامے، تاکہ وہ اس ہنگامے میں گم نہ ہو جائیں، سونے کے دانٹوں والے مسروں سے نکراتا، چہ بازوؤں والے جادو گروں سے الجھتا، جبوم سے اٹھتی ہوئی صندل اور کھاد کی ملی جلی بو سے گھٹتے ہوئے دم کے ساتھ حوزے آرکادیو بونندیا کسی جنونی کی طرح میلے میں ملکبادیس کو ڈھونڈتا پھرا، تاکہ وہ اس کے عجیب و غریب، داستان انگیز، ڈراؤنے خواب کے بے پایاں رموز اس پر کھول سکے۔ اس نے کئی خانہ بدوشوں سے دریافت کیا جو اس کی زبان نہ جانتے تھے۔ آخر کار وہ اس بگد جا پہنچا جہاں ملکبادیس اپنا خیمہ لگایا کرتا تھا، اور وہاں اس کو ایک کم گوار آرمینی نظر آیا، جو ہسپانوی زبان میں ایک ایسا شربت بیچ رہا تھا جس کو پنی کر انسان نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ جب حوزے آرکادیو بونندیا کہنیاں مارتا، مجھے کو چیرتا اس سے سوال کرنے پہنچا، آرمینی گلاس بھر غنبریں مانع ایک گھونٹ میں چڑھا چکا تھا۔ خوفناک طاعونی دھویں کے بادل میں خائب ہونے سے پیشتر، خانہ بدوش نے حوزے آرکادیو بونندیا کو اپنی نگاہ کی مسیب فضا میں لپیٹ لیا۔ دھویں کے اوپر اس کے جواب کی گونج سنائی دی، "ملکبادیس مرچکا ہے۔" یہ خبر سن کر حوزے آرکادیو بونندیا سکتے کے عالم میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا، اور اس پپتا سے سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا، یہاں تک کہ مجمع دوسرے کرشموں کی طرف متوجہ ہو کر چھٹنے لگا، اور کم گوار آرمینی کا گدلا کیپڑٹھارات بن کر اڑ گیا۔ دوسرے خانہ بدوشوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ ملکبادیس سٹکا پور کے ساحل پر بخار کا شکار ہو کر مر چکا ہے، اور یہ کہ اس کی لاش کو جاوا کے سمندر کے سب سے گہرے حصے میں پھینکا جا چکا ہے۔ لڑکوں کو اس خبر سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ وہ اپنے باپ سے ضد کرنے لگے کہ میسٹرس کے سیانوں کی انوکھی شے دکھانے لے چلے، جس کی خیمے کے باہر منادی کی جارہی تھی، اور جو بتول مشہر کے، سلیمان بادشاہ کی ملکیت تھی۔ بچوں نے اتنی ضد کی کہ حوزے آرکادیو بونندیا تیس کھدے دے کر بچوں کو خیمے کے وسط میں لے گیا، جہاں بالوں سے ڈھکے جسم اور گنے سر

والا ایک عظیم الجثہ آدمی ناک میں تانبے کی بالی لٹائے اور ٹخنے پر لوہے کی زنجیر پہنے، ایک صندوق کی گڈائی کر رہا تھا۔ جب اس دیو نے صندوق کھولا تو اس میں سے ایک سرد بھکا اٹھا۔ صندوق کے اندر ایک بے حد بڑی شفاف سل دھری تھی جس کے اندر لاتعداد سوئیاں بنی ہوئی تھیں، جن سے نکلا کر سورج کی شاعیں دھنک کے رنگ پیدا کر رہی تھیں۔ مضطرب حوزے آرکادیو بوندیا، جو جانتا تھا کہ بچے اس شے کی وضاحت سننے کے لیے بیٹاب ہیں، آہستہ سے بڑھایا:

"یہ دنیا کا سب سے بڑا میرا ہے۔"

"نہیں،" خانہ بدوش نے اس کی تصحیح کی۔ "یہ برف ہے۔"

حوزے آرکادیو بوندیا نے کچھ سمجھے بغیر سل کی جانب ہاتھ بڑھایا، لیکن دیو ہیکل شخص نے اسے روک دیا۔ "پانچ سکے آور، اسے چھونے کے۔" حوزے آرکادیو بوندیا نے سکے دیے اور اپنا ہاتھ برف پر رکھ دیا، اور کئی منٹ تک رکھے رہا، یہاں تک کہ اس کا دل اسرار سے اتصال پر خوف اور مسرت سے پھٹنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کھے۔ اس نے دس سکے آور دیے، تاکہ اس کے پیٹے بھی اس عظیم تجربے سے گزر سکیں۔ ننھے حوزے آرکادیو نے برف کو چھونے سے انکار کر دیا، جب کہ اور یلیانو نے قدم آگے بڑھا کر اپنا ہاتھ اس پر رکھا اور فوراً کھینچ لیا۔ "یہ تو ابل رہا ہے،" اس نے حیرت سے چیخ کر کہا۔ لیکن اس کے باپ نے کوئی توجہ نہ دی۔ معجزے کی شہادت سے سرشار، وہ اس لمحے اپنی مایوسیوں کو بھول گیا جو اس کی بذیافی منہات، اور ملکبادیس کی لاش کے سمندری ہشت پایوں کی بھوک کے حوالے کر دیے جانے سے پیدا ہوئی تھیں۔ اس نے پانچ سکے آور بڑھائے، اور اپنا ہاتھ سل پر رکھ کر، گویا کسی مقدس صحیفے پر شہادت دے رہا ہو، بولا:

"یہ ہمارے وقتوں کی عظیم ایجاد ہے۔"

جب خُناق سر فرانس ڈریک نے سولھویں صدی میں ریو باچا پر حملہ کیا، تو اُسرلا کی سکڑنا فی خطرے کی گھنٹیوں اور توپوں کی گھن گرج سے اتنی خوفزدہ ہوئی کہ اس کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ سرا سیمکی کے نالم میں جلتے ہوئے چولہے پر جا بیٹھی۔ جلتے کے سبب وہ تمام عمر کے لیے ایک ناکارہ بیوی بن کے رہ گئی۔ وہ بچکے کے سہارے صرف ایک پہلو پر بیٹھ سکتی تھی۔ اس کی چال میں کوئی عجیب و غریب چیز واقع ہوئی تھی، کیوں کہ اس حادثے کے بعد وہ کبھی لوگوں کے سامنے نہ جلی۔ اس نے تمام معاشرتی سرگرمیاں ترک کر دیں، کیوں کہ اس کے ذہن میں یہ وسوسہ سما گیا تھا کہ اس کے جسم سے جلتے ہوئے گوشت کی بو آتی ہے۔ پوپٹے وہ آنگن میں بیٹھی پانی پاتی جاتی، اس خوف سے سو نہ پاتی کہ کھمیں خواب میں اسے انگریز اور ان کے خوں خوار حملہ آور کتے نظر نہ آ جائیں، جو اس کے کمرے کی کھڑکی سے کود کر اندر آئے تھے اور اسے جلتے ہوئے لوہے کی شرم ناک اذیت سے دوچار کیا تھا۔ اس کا شوہر، ایک آراگونیز تاجر، جس سے اس کے دو بچے تھے، اپنی دکان کی نصف مالیت اس کی دوا سیوں اور دلبوئیوں میں لگا بیٹھا تھا، اس کوشش میں کہ اس کی دہشت کسی صورت جاتی رہے۔ آخر کار اس نے اپنا کاروبار بیچ کر سمندر سے دور پہاڑیوں کے دامن میں

مقامی انڈین لوگوں کی ایک بڑسکون بستی میں اپنی بیوی کے لیے ایک ایسا گھر بنایا جس کی خواب گاہ میں کوئی کھڑکی نہ تھی، تاکہ اس کے خوابوں کے قزاقوں کو اندر داخل ہونے کا کوئی راستہ نہ ملے۔

اس پوشیدہ گاؤں میں تمباکو کا ایک مقامی کاشت کار حوزے آرکادیو بوئندیا کچھ عرصے سے مقیم تھا۔ ارسلہ کے سگڑنانا نے اس کے ساتھ مل کر ایک مشترکہ کاروبار شروع کیا، جو اتنا منافع بخش ثابت ہوا کہ ان کی قسمت بدل گئی۔ چند صدیوں بعد تمباکو کے مقامی کاشت کار کے پڑپوتے نے آراگو نیز تاجر کی پر نواسی سے شادی کر لی۔ لہذا ہر دفعہ جب ارسلہ کو اپنے شوہر کے پاگل پن کے خیالات پر طیش آتا، تو وہ ایک ہی جہت میں قسمت کے تین سوسال طے کرتی، اور اُس دن کو کوستی جب سرخرانس ڈریک نے ریو باپا پر حملہ کیا تھا۔ یہ صرف اپنے آپ کو تسلی دینے کا ایک بہانہ تھا، کیوں کہ وہ دونوں درحقیقت ایک ایسے بندھن میں بندھے ہوئے تھے جو محبت سے زیادہ مستحکم تھا، اور وہ بندھن تھا: ضمیر کی مشترکہ جھنجھ۔ وہ عم زاد تھے۔ دونوں اُس پرانے گاؤں میں اکٹھے پہلے بڑھے تھے جس کو ان کے آباؤ اجداد کی منست اور اچھی عادتوں نے تمام صوبے کا ایک عمدہ ترین قصبہ بنادیا تھا۔ گو کہ اُن دونوں کی شادی کی پیش گوئی ان کے دنیا میں آتے ہی کر دی گئی تھی، جب انھوں نے آپس میں شادی کرنے کی خواہش کا خود اظہار کیا تو ان کے رشتہ داروں نے ان کو روکنے کی کوشش کی۔ انھیں خوف تھا کہ دو صحت مند جوانوں کو، جو دونوں کے صدیوں تک اختلاط سے پیدا ہوئے تھے، اگوانا جھنے کی ذلت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ ان کے سامنے اس سے پہلے کی ایک ہولناک مثال موجود تھی۔ اُرسلہ کی ایک خالہ کا، جس کی حوزے آرکادیو بوئندیا کے چچا سے شادی ہوئی تھی، ایک ایسا بیٹا تھا جو زندگی بھر ڈھیلی ڈھالی پستونیں پہنتا رہا، اور جو بیالیس برس کنوارا رہنے کے بعد، زیادہ مقدار میں خون بہہ جانے کے سبب جان بحق ہوا، کیوں کہ اس کی، بوتل کا کارک ٹکانے والے اوزار کی مانند، ایک کڑکڑی بدھی دار دُم تھی، جس کے سرے پر بالوں کا گچھا تھا۔ سور کی دم، جسے دیکھنے کی کسی عورت کو اجازت نہ تھی، اور جس کی وجہ سے اس کو اپنی جان سے ہاتھ دھو نے پڑے جب اس کے ایک قصاب دوست نے بھدے سے وہ دُم اڑادی۔ انیس سالہ حوزے آرکادیو بوئندیا نے اس مسئلے کو جوانی کے جوش میں صرف ایک جملے سے حل کر ڈالا تھا: ”مجھے پروا نہیں اگر میرے ہاں سور پیدا ہوں، بشرطے کہ وہ بول سکتے ہوں۔“ لہذا ان کی، دھوم دھام سے، آتش بازی اور بینڈ باجے کے ساتھ شادی ہو گئی۔ وہ اس کے بعد ہنسی خوشی زندگی گزار سکتے تھے، اگر اُرسلہ کی ماں نے ان کی اولاد کے بارے میں منوس پیش گوئیاں کر کے انھیں ڈرا نہ دیا ہوتا، یہاں تک کہ اس نے اُرسلہ کو مشورہ دیا کہ شادی کے باوجود مباشرت سے

احتراز کرے۔ اس خوف سے کہ اس کا تنومند اور پُر عزم شوہر کہیں سوتے میں اس کے ساتھ زبردستی اختلاط نہ کر بیٹھے، وہ بستر میں لیٹنے سے پہلے ایک بجا سازیرجامہ پہن لیتی جو اس کی ماں نے مضبوط بادبانی کپڑے کا سیاہ تھا، جس پر چمڑے کی پٹیاں چڑھی ہوئی تھیں اور جو سامنے سے لوہے کے بکسے سے کھلتا تھا۔ اس طرح انہوں نے چند ماہ گزارے۔ دن کے وقت حوزے آرکادیو بونڈیا اپنے لڑاکا مرغوں کی دیکھ بھال کرتا، اور اُرسلا ماں کے ساتھ بیٹھی کٹیدہ کاری کیا کرتی۔ رات وہ گھنٹوں ایک دکنہ بھری دھندلاشتی میں گزارتے جو اختلاط کا بدل معلوم ہوتی، یہاں تک کہ لوگوں کو کوئی غیر معمولی بات محسوس ہونے لگتی، اور افواہ اُڑ گئی کہ اُرسلا شادی کا ایک سال پورا ہو جانے پر بھی کنواری کی کنواری ہے، کیوں کہ اس کا شوہر نامرد ہے۔ حوزے آرکادیو بونڈیا کو سب سے آخر میں اس بات کا علم ہوا۔

"دیکھو، لوگ کس قسم کی باتیں کرتے پھر رہے ہیں اُرسلا،" اس نے اپنی بیوی سے پرسکون لہجے میں کہا۔

"انہیں بکنے دو،" اُرسلا نے جواب دیا۔ "ہمیں معلوم ہے کہ یہ سچ نہیں ہے۔"

سو یہ صورت حال چھ ماہ مزید، اس دردناک اتوار تک برقرار رہی جب حوزے آرکادیو بونڈیا نے پرووانسیو اگویار سے مرغوں کی لڑائی جیتی۔ پرووانسیو اگویار خون میں لیتھڑے اپنے مرغ کو دیکھ کر طیش میں آگیا، اور حوزے آرکادیو بونڈیا سے دور ہٹ کر، تاکہ پالی کے گرد موجود لوگ سن لیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، چیخ کر بولا، "مبارک ہو! شاید تمہارا مرغ تمہاری بیوی کا بھی کچھ بھلا کر سکے۔" حوزے آرکادیو بونڈیا نے نعل کے ساتھ اپنے مرغ کو اٹھایا۔ "میں ابھی واپس آتا ہوں،" اس نے مجمعے سے کہا۔ اور پھر پرووانسیو اگویار سے مخاطب ہوا:

"تم گھر جاؤ اور ایک ہتھیار لے آؤ، کیوں کہ میں تمہیں قتل کرنے جا رہا ہوں۔"

دس منٹ بعد وہ ہاتھ میں اپنے دادا کا دندا نے دار بھالالیے لوٹا۔ میدان میں، جہاں آدھے سے زیادہ گاؤں جمع ہو چکا تھا، پرووانسیو اگویار اس کا منتظر تھا۔ اسے اپنا دفاع کرنے کا موقع نہ ملا۔ حوزے آرکادیو بونڈیا نے بیل کی سی طاقت سے، اُس صبح نشانے کے ساتھ جس سے اوریلیانو بونڈیا اول نے علاقے کے چیتوں کا خاتمہ کیا تھا، بجالے سے اس کا گلہ چیر ڈالا۔ اس رات، جو گاؤں کے لوگوں نے میدان میں پڑی لاش کے ساتھ جاگ کر گزاری، حوزے آرکادیو بونڈیا اپنی خواب گاہ میں گیا، جہاں اس کی بیوی اپنی عصمت کی حفاظت کے لیے زیرجامہ چڑھا رہی تھی۔ بجالے کی نوک اس کی جانب کر کے حوزے آرکادیو بونڈیا نے حکم دیا: "اتارو اسے!" اُرسلا کو اپنے شوہر کے فیصلے کے بارے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ "جو کچھ ہو گا اس کے تم ہی ذمے دار ہو گے،"

وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔ حوزے آرکادیو بوندیا نے بھالائی زمین میں گاڑ دیا۔
"اگر تم نے اگوانوں کو جنم دیا تو ہم اگوانے پالیں گے،" وہ بولا۔ "لیکن اس گاؤں میں
تمہاری وجہ سے مزید کوئی قتل نہیں ہوگا۔"

وہ جون کی ایک خوش گوار رات تھی، خنک اور چاندنی میں ڈوبی ہوئی، اور وہ صبح تک بستر
میں پڑے خرمستیاں کرتے رہے، پرووانسیو اگویار کے اقربا کے بین سے بوجھل ہوا کے ان
جھونکوں سے لائق، جو ان کی خواب گاہ میں آتے جاتے رہے۔

اس معاملے کو عزت کی خاطر ڈول کہہ کر دیا گیا، لیکن حوزے آرکادیو بوندیا اور ارسل
دونوں کے ضمیر میں پچاس لگ چکی تھی۔ ایک رات نیند نہ آنے پر ارسل بستر سے اٹھ کر آنگن
میں رکھے مٹکے سے پانی لینے گئی تو اس نے پرووانسیو اگویار کو مٹکے کے قریب کھڑا دیکھا۔ وہ نیلا ہو
رہا تھا، اس کے چہرے پر ادا سی تھی اور وہ اپنی گردن کے سوراخ کو ایسا پر تو گھاس سے بھرنے کی
کوشش کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ارسل کو بجائے خوف کے اس پر رحم آیا۔ وہ اُٹے پاؤں کمرے میں
واپس گئی اور اپنے شوہر کو بتایا کہ اس نے کیا دیکھا ہے، لیکن حوزے آرکادیو بوندیا نے کوئی
خاص توجہ نہ دی۔ "اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہمارے ضمیر کا بوجھ ہمیں پریشان کر رہا ہے۔"

دو راتوں بعد ارسل نے پرووانسیو اگویار کو پھر دیکھا۔ اس دفعہ وہ غسل خانے میں، ایسا تو
گھاس کی مدد سے، گردن پر جما خون صاف کر رہا تھا۔ ایک اور رات وہ بارش میں ٹھٹھا ہوا نظر آیا۔
حوزے آرکادیو بوندیا، جو اپنی بیوی کے فریب نظر سے تنگ آچکا تھا، بجائے سے لیس ہو کر
آنگن میں گیا۔ مقتول اپنے چہرے پر ادا سی کے تاثرات لیے کھڑا تھا۔

"جسم میں جاؤ،" حوزے آرکادیو بوندیا چلایا۔ "بہتر مرتبہ تم آؤ گے، میں اتنی دفعہ تمہاری
جان لوں گا۔" پرووانسیو اگویار وہیں کھڑا رہا۔ حوزے آرکادیو بوندیا کی ہمت نہ ہوئی کہ اس پر بھالا
پھینکے۔ اس رات کے بعد وہ کبھی چین سے نہ سو سکا۔ جس ویرانی کے ساتھ بارش میں کھڑے
پرووانسیو اگویار نے اس کی طرف دیکھا تھا، اس کی زندگیوں میں کوٹنے کی وہ آتماہ آرزو، اور وہ تفکر
جس کے ساتھ وہ پانی کی تلاش میں پورے گھر میں بھگتا پھرتا تھا کہ گھاس کو گلیا کر کے زخم پر پھاہار کہ
سکے، اس نے حوزے آرکادیو بوندیا کو عذاب میں ڈال دیا۔ "وہ سنگین اذیت سے دوچار ہے،"
اس نے ارسل سے کہا۔ "تم دیکھ سکتی ہو وہ خود کو کتنا تنہا محسوس کر رہا ہے۔" ارسل نے جب اگلی
دفعہ اس کو چولے پر رکھی پتیلیوں کے ڈھکن کھولتے دیکھا تو سمجھ گئی کہ وہ پانی تلاش کر رہا ہے؛
اُسے پرووانسیو اگویار پر اتنا ترس آیا کہ اس نے گھر میں جگہ جگہ پانی سے بھرے جگہ رکھ دیے۔
ایک رات جب حوزے آرکادیو بوندیا نے اسے اپنے کمرے میں زخم دھونے دیکھا تو اس سے

مزید برداشت نہ ہو سکا۔

”ٹھیک ہے، پرودا انیسو،“ حوزے آرکادیو بونندیا اس سے مخاطب ہوا، ”ہم یہ گاؤں چھوڑ کر بارہے ہیں، اتنی دور جتنا کہ ہم جا سکتے ہیں۔ اور اب ہم کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے۔ اب تم سکون سے واپس جا سکتے ہو۔“

تو اس طرح انھوں نے پہاڑ عبور کرنے کی ٹٹانی۔ حوزے آرکادیو بونندیا کے چند دوستوں نے، جن کو اس مہم نے اکسایا، اپنے اپنے گھروں کا سازو سامان لپیٹا، بیوی بچوں کو ساتھ لیا، اور انجانی سرزمین کی طرف چل پڑے۔

روانگی سے پیشتر حوزے آرکادیو بونندیا نے بحالا آنگن میں دفن کیا اور اپنے شاندار مرغوں کی ایک ایک کر کے گردن کاٹی، اس یقین کے ساتھ کہ اس عمل سے پرودا انیسو اگویلا کو سکون پہنچے گا۔ جو کچھ ارسلانے ساتھ لیا وہ اس کی شادی کے چند جوڑے، کچھ برتن اور ایک چھوٹا سا صندوق تھا، جس میں سونے کے سکے تھے جو اس کے باپ نے اس کے لیے چھوڑے تھے۔ انھوں نے سفر کا کوئی قطعی منصوبہ نہیں بنایا۔ صرف اتنا کیا کہ ریو ہاچا کی مخالفت سمت راہ پکڑنے کی کوشش کی، تاکہ انھیں راستے میں کوئی شناسا نہ نظر آئے، اور وہ اپنا کوئی نام و نشان نہ چھوڑیں۔ وہ ایک مضحکہ خیز سفر تھا۔ چودہ ماہ بعد ارسلانے، جس کا پیٹ بندر اور سانپ کا گوشت کھا کھا کر بکڑ چکا تھا، ایک لڑکے کو جنم دیا جس کے تمام خدو خال انسانوں جیسے تھے۔ ارسلانے نصف سفر جمولے میں لیٹے لیٹے طے کیا جسے دومر اپنے کاندھوں پر اٹھائے چلتے تھے، کیوں کہ ورم سے اس کی ٹانگیں بدبست ہو گئی تھیں اور ان میں بلبوں کی مانند نیلی رنگیں ابھر آتی تھیں۔ گو کہ ان کے دھنسنے ہوئے پیٹ اور ویران آسمان دیکھ کر ترس آتا تھا، بچوں نے والدین کی یہ نسبت سفر کو بہتر طور پر سہا تھا۔ زیادہ تر وقت انھوں نے سفر سے مزہ ہی اٹھایا تھا۔ ایک صبح، تقریباً دو سال کے طویل سفر کے بعد، پہاڑی سلسلے کے مغربی دامن کو دیکھنے والے وہ پہلے انسان تھے۔ بادلوں میں ڈھکی چوٹی سے انھیں، دنیا کے دوسری طرف، عظیم دلدل کی آبی وسعت پھیلی نظر آئی۔ لیکن انھیں سمندر کبھی نہ ملا۔ اس دلدلی علاقے میں کئی ماہ بھٹکنے کے بعد، ان آخری مقامی انڈین لوگوں کو بہت پیچھے چھوڑ کر جو انھیں راستے میں نظر آئے تھے، ایک رات انھوں نے ایک پتھر لے دریا کے کنارے پڑاؤ ڈالا جس کا پانی شیشے کے جے ہوئے دھارے کی طرح تھا۔ برسوں بعد، دوسری خانہ جنگی کے دوران، کرنل اوریلیانو بونندیا نے اسی راستے سے گزرنے کی کوشش کی تھی، تاکہ ریو ہاچا پر اپنا حملہ کر کے قبضہ جما سکے، اور چھ دن بعد وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ پاگل پن ہے۔ بہر حال، اس رات جب انھوں نے دریا کے کنارے نیسے گاڑے، اس کے باپ کے ساتھیوں کے چہروں پر ایسے تاثرات تھے گویا ان کا جہاز

تباہ ہو چکا ہو اور اب واپسی کی کوئی راہ نہ ہو، لیکن ان کی تعداد میں سفر کے آغاز سے اب تک اضافہ ہو چکا تھا اور وہ طویل عمر پا کر مرنے کے لیے تیار تھے۔ اس رات حوزے آرکادیو بوندیا نے خواب میں دیکھا کہ اس جگہ ایک آباد اور پُر صدا شہر کھڑا ہے جس کے گھروں کی دیواریں آئینے کی ہیں۔ اس نے لوگوں سے پوچھا یہ کون سا شہر ہے، اور انھوں نے جواب میں ایک ایسا نام لیا جو اس نے پہلے کبھی نہ سنا تھا، جس کے کوئی معنی نہ تھے، لیکن اس نام نے حوزے آرکادیو بوندیا کے خواب میں ایک ماورائے طبیعی بازگشت پیدا کر دی: ماکوندو۔ دوسرے دن اس نے اپنے ساتھیوں کو قائل کر لیا کہ وہ سمندر کبھی نہ تلاش کر پائیں گے، اور ان سے دریا کے کنارے سب سے ٹھنڈے مقام پر زمین کو درختوں سے صاف کرنے کو کہا، اور وہاں انھوں نے گاؤں کی بنیاد ڈالی۔

حوزے آرکادیو بوندیا کو خواب میں آئینے کی دیواروں والے گھروں کا مطلب اس وقت تک سمجھ میں نہ آیا جب تک اس نے زندگی میں برف نہ دیکھی۔ برف دیکھ کر اس نے سوچا کہ وہ خواب کے عمیق معنی کو یا گیا ہے۔ اس نے سوچا کہ مستقبل قریب میں وہ پانی جیسی معمولی چیز سے برف کی سلیں بنا سکیں گے، اور پھر گاؤں میں ان سلوں سے نئے گھر تعمیر کریں گے۔ پھر ماکوندو جھلستی ہوئی جگہ نہ رہے گا، جہاں دروازوں کے قبضے اور گنڈیاں تیش سے بل کھا جاتی تھیں، بلکہ ایک سرد، پُر فضا مقام میں بدل جائے گا۔ اگر وہ برف کا کارخانہ بنانے میں ثابت قدم نہ رہ سکا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان دنوں اپنے بیٹوں کی تعلیم کے سلسلے میں بے حد پُر جوش تھا، خاص طور پر اوریلیانو کی تعلیم کے سلسلے میں، جس نے شروع ہی سے کیمیا گری کی طرف وجدان ظاہر کیا تھا۔ تجربہ گاہ پر جہی گرد صاف کی گئی۔ ملکیا دیس کی دستاویزات کو سنجیدگی کے ساتھ اس کے انوکھے پن کی تعریف و توصیف کیے بغیر، آزمہ نو پڑھا گیا، اور کئی پُر تحمل اور طویل فستوں میں انھوں نے ارسلان کے سونے کو اس مغلوبے سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی جو کڑھائی کے پیندے سے چپک گیا تھا۔ چھوٹے حوزے آرکادیو نے اس عمل میں برائے نام ہی حصہ لیا۔ جس عرصے میں اس کا باپ دل و جان یکے ساتھ پانی کی نلکیوں میں الجھا رہا، وہ سرکش پہلوٹا، جو ہمیشہ اپنی عمر سے بڑا نظر آتا، ایک نیم نیم شمیم ٹوبانگ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کی آواز بدل گئی تھی۔ اس کے بالائی لب کے اوپر ابتدائی روئیدگی نمودار ہو چلی تھی۔ ایک رات جب ارسلان اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ بستر میں لیٹنے سے پہلے کپڑے اتار رہا تھا۔ ارسلان کو شرم اور رحم کا ملا جلا احساس ہوا۔ شوہر کے بعد وہ پہلا مرد تھا جس کو اس نے عریاں دیکھا۔ وہ زندگی کے لیے اتنے بھرپور طریقے سے لیس تھا کہ غیر معمولی نظر آتا تھا۔ ارسلان کو، جو تیسری دفعہ حمل سے تھی، شادی کے ابتدائی دنوں کی دہشت یاد آگئی۔

ان دنوں ایک چنچل، منہ پھٹ اور اشتعال انگیز عورت گھر کے کام کاج میں باتھ بٹانے

کے لیے آئی۔ وہ تاش کے پتے دیکھ کر مستقبل بتانا جانتی تھی۔ ارسلانے اپنے بیٹے کے بارے میں اس سے بات کی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے بیٹے کا عضو غیر معمولی طور پر بڑا ہے، اور اتنا ہی غیر فطری جتنا کہ اس کے عم زاد کی دُم تھی۔ عورت نے ایک انبساط پذیر قہقہہ لگایا جو پورے گھر میں میں ٹوٹتے ہوئے شیشے کے چھناکے کی طرح گونجتا رہا۔ "تمہارے اندیشے کے برعکس، وہ بے حد خوش قسمت ثابت ہوگا۔" اپنی پیش گوئی کو ثابت کرنے کے لیے وہ تاش کے بٹے ان کے گھر لے کر آئی، اور حوزے آرکادیو کے ساتھ باورچی خانے سے پرے گودام میں بند ہو گئی۔ اس نے خاموش سے تاش کے پتے ایک پرانے بڑھئی کے تختے پر رکھے، اور جو کچھ اس کے دماغ میں آیا، منہ ہی منہ میں بڑبڑانا شروع کر دیا۔ لڑکا اس کے قریب منتظر کھڑا رہا۔ وہ تجسس کے بجائے اکتاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ اچانک عورت نے ہاتھ بڑھا کر اس کو پھونک لیا۔ "اوہ خدایا!" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی، وہ حقیقتاً تعجب میں آگئی تھی۔ حوزے آرکادیو کو اپنی بڑیوں میں جگہ سا بھرنا محسوس ہوا۔ ایک مضحل خوف اور رونے کی شدید خواہش نے اسے آیا۔ عورت نے کوئی اشارہ نہ کیا تھا، لیکن حوزے آرکادیو تمام رات اس کے لیے بے چین رہا؛ اُس کی بغلوں سے اٹھنے والی دھوئیں کی بو حوزے آرکادیو کی کھال میں سرایت کر گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا تمام وقت اس عورت کے ساتھ رہے، وہ چاہتا تھا کہ وہ اس کی ماں ہوتی، اور وہ دونوں گودام سے کبھی نہ نکلتے، اور وہ کہتی، "اوہ خدایا!" ایک دن حوزے آرکادیو سے برداشت نہ ہو سکا، اور وہ اس کو تلاش کرتا ہوا اس کے گھر تک جا پہنچا۔ وہ جھجکتا ہوا اندر داخل ہوا اور پیٹھک میں بے خود سا، منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر بیٹھا رہا۔ اس لمحے حوزے آرکادیو کو اس عورت کی کوئی طلب نہ تھی۔ اس کو وہ مختلف لگی، اس تصور سے یکسر مختلف جو اس کی خوشبو نے جگایا تھا، گویا وہ کوئی اور ہو۔ اس نے کافی بی، اور پرشردگی کے عالم میں باہر نکل آیا۔ اس رات نیند نہ آنے کے مہیب لمحے میں، حوزے آرکادیو نے ایک وحشیانہ اضطراب کے ساتھ اس کی آرزو کی۔ لیکن اس دفعہ اسے اُس عورت کی طلب نہ ہوئی جیسی وہ اس دن گودام میں تھی، بلکہ اس عورت کی جیسا اسے حوزے آرکادیو نے اس سہ پہر پایا تھا۔

کئی دنوں بعد اُس نے اچانک حوزے آرکادیو کو اپنے گھر بلوایا جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ تنہا تھی، اور اسے تاش کے پتے دکھانے کے بہانے اپنے کمرے میں لے گئی، اور پھر اس نے حوزے آرکادیو کو اتنی آزادی سے بچھو کہ اسے ابتدائی جھرجھری کے بعد مغالطہ ہونے لگا، اور اس نے لذت سے زیادہ خوف محسوس کیا۔ عورت نے اسے رات کے وقت آنے کی دعوت دی۔ حوزے آرکادیو نے باہی بھری تاکہ وہاں سے نکل سکے، گو کہ وہ جانتا تھا کہ وہ جانے کے قابل نہیں

ہے۔ لیکن اس رات حوزے آرکادیو نے جان لیا کہ اسے اس عورت کے پاس بھر صورت جانا ہے، اگر وہ اس قابل نہ ہو تب بھی۔ اس نے اندھیرے میں ٹٹول کر کپڑے پہنے، اور اپنے بھائی کی پڑسکون سانسوں کی آواز، دوسرے کمرے میں اپنے باپ کی اٹھنے والی خشک کھانسی، آئٹکن میں مرغیوں کا دم، پچھروں کی بھنٹھناہٹ، تیزی سے دھڑکنے ہوئے دل کی دھڑکن، اور دنیا کی بے ترتیب بلبل، جو اس نے پہلے کبھی موس نہیں کی تھی، سنتے ہوئے وہ خوابیدہ گلی میں ٹٹل گیا۔ دل ہی دل میں اس نے تمنا کی کہ دروازے کے نہ صرف پٹ بند ہوں، بلکہ اس میں اندر سے چٹختی بھی چڑھی ہو۔ لیکن دروازہ کھلا تھا۔ اس نے انگلیوں کے سروں سے جیسے ہی دھکیلا، پٹ کھل گیا، ایک درد بھری لیکن واضح سسکی کے ساتھ، جس کی گونج اس کی روح میں منجمد ہو کے رہ گئی۔ جس لمحے وہ دیوار کے ساتھ ساتھ سرکنا ہوا اندر داخل ہوا، اسے وہی خوشبو آئی۔ وہ ابھی تک دالان میں تھا، جہاں عورت کے تینوں بھائیوں نے اپنی جھولنیاں تان رکھی تھیں، جو نہ اس کو دکھائی دے رہی تھیں اور نہ جن کے وقوع کا وہ اندھیرے میں اندازہ لگا سکتا تھا۔ وہ ٹٹولتا ہوا دالان سے گزر کر عورت کے کمرے کا دروازہ کھولنے کے لیے بڑھا، تاکہ اسے اندازہ ہو سکے کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ وہ جھولینوں کی رسیوں سے، جو اس کے اندازے سے نیچی تھیں، اور ایک خزانے لیسے ہوئے مرد سے ٹکرایا، جس نے سوتے میں کروٹ بدلی اور خواب میں بڑبڑایا: "وہ بدچہ کا دن تھا۔" کمرے کے دروازے کا پٹ کھولتے وقت وہ ناہموار فرش پر گرتے گرتے پچا۔ اس سمبیر اندھیرے میں، گزرے ہوئے لمحے کی نراس آرزو میں، اس کو اپنا تک احساس ہوا کہ وہ قطعی طور پر ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے۔ اس تنگ سے کمرے میں اس کی ماں، اس کی دوسری بیٹی اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ، اور وہ عورت، جو شاید وہاں تھی ہی نہیں، سو رہی تھی۔ وہ اُس کی خوشبو کے ذریعے اس تک جا پہنچتا اگر وہ خوشبو پورے گھر میں پھیلی ہوئی نہ ہوتی۔ وہ خوشبو اتنی بھرپور اور اتنی گمراہ کن تھی گویا اس کی اپنی جلد سے ہمیشہ سے لپٹی ہوئی ہو۔ وہ کافی دیر تک ساکت کھڑا رہا، اس تعجب میں کہ وہ بے خودی گئے اس ہاتال میں کیوں کر جا گرا۔ اس دوران ایک باتہ پوری انگلیوں کے ساتھ آگے بڑھا، اور اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے اس کے چہرے کو جھوا۔ اسے تعجب نہ ہوا۔ انجانے میں وہ اس کی توقع کر رہا تھا۔ پھر اس نے خود کو اس باتہ کے سپرد کر دیا، اور ایک مہیب تھکان کی کیفیت میں، خود کو ایک بے بہت جگہ پر لے جانے دیا، جہاں اس کے کپڑے اتارے گئے اور اسے آکوؤں کی بوری کی طرح اٹاپٹا گیا اور ایک طرف سے دوسری طرف لٹکایا گیا، ایک اتھاہ اندھیرے میں جہاں بازو کسی کام کے نہ تھے، اور جہاں عورت کی خوشبو کے بجائے آموئیا کی مہک تھی، اور جہاں اس نے عورت کے چہرے کو یاد کرنے کی کوشش کی اور نظروں کے سامنے اُرسلا کا

چہرہ پایا، سرا سیمہ آگئی میں، کہ وہ وہی کر رہا ہے جس کے کرنے کی اسے طویل مدت سے آرزو تھی اور جو اس کا خیال تھا وہ کبھی نہ کر سکے گا، یہ سمجھے بغیر کہ وہ کیا کر رہا ہے کیوں کہ اسے ہوش نہ تھا کہ اس کے پیر کمال ہیں اور سر کس طرف ہے، یا کس کا سر اور کس کے پیر، اور اس احساس کے ساتھ کہ اب وہ مزید اپنے گردوں کی سرد، طوفانی گڑگڑاہٹ کو برداشت نہ کر سکے گا، اور نہ اپنی انٹریوں کی ہوا کو، اور اس سرا سیمگی کو کہ فرار ہو جائے، اور ساتھ ساتھ اس آرزو کو کہ اس براؤنگینٹ ناموشی اور مہیب تنہائی میں ہمیشہ کے لیے ٹھہرا رہے۔

اس کا نام پیلا ترنیر تھا۔ وہ اس خروج کا حصہ تھی جو ما کوندو کی بنیاد پڑنے پر اختتام کو پہنچا تھا۔ گھر والے گھسیٹ کر اسے اپنے ساتھ لائے تھے، تاکہ اسے ہمیشہ کے لیے اس شخص سے جدا کر سکیں جس نے اس کے ساتھ اس وقت دست درازی کی تھی جب وہ چودہ سال کی تھی، اور اس سے محبت کرتا رہا یہاں تک کہ وہ بائیس برس کی ہو گئی۔ لیکن وہ اس صورت حال کو گاؤں پر ظاہر کرنے کا فیصلہ نہ کر پایا تھا، کیوں کہ وہ ان لوگوں سے الگ تھا۔ اس نے دنیا کے آخری کونے تک پیلا ترنیر کا پیچھا کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اپنے مغلطات کو سلجھانے کے بعد، اور وہ اس کے انتظار سے تنگ چکی تھی۔ وہ ان تمام لمبے یا پستہ قد، گورے یا کالے مردوں پر اس کا گمان کرتی رہی جو اس کے تاش کے پتوں کے خوش آئند وعدوں کے مطابق سمندر یا خشکی کے راستے، تین دن، تین ماہ یا تین سال کے اندر اندر آنے والے تھے۔ انتظار میں وہ اپنی رانوں کی مضبوطی، اپنے سینوں کی اٹھان اور اپنی نرم خونی کھوپڑی تھی۔ اس نے صرف اپنے دل کا پاگل پن برقرار رکھا تھا۔ اس انوکھے کھلونے نے حوزے آرکادیو کو پاگل کر دیا۔ وہ ہر رات اس کے کمرے کی بھول بھلیوں سے گزر کر اس تک پہنچتا۔ ایک رات اس نے دروازہ بند پایا، اور کئی دفعہ دستک دی، یہ سوچ کر کہ جب وہ پہلی دفعہ دروازہ کھٹکھٹانے کی ہمت کر چکا ہے تو اسے آخری لمحے تک دستک دینی ہوگی، یہاں تک کہ ایک ختم نہ ہونے والے انتظار کے بعد پیلا نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ دن بھر لیٹا جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتے ہوئے، چپکے چپکے گزشتہ رات کی یادوں کا مزہ لیتا۔ لیکن جب وہ گھر آتی، شادمان، لائق، باتونی، تو حوزے آرکادیو کو اپنی گھبراہٹ چھپانے کی چنداں ضرورت نہ پڑتی، کیوں کہ اس عورت کا، جس کے گونج دار قفسے فاخاؤں کو خوف زدہ کر دیا کرتے، اس انجانی قوت سے کوئی واسطہ نہ تھا جس نے حوزے آرکادیو کو اپنی روح میں سانس لینا اور اپنے دل کی دھڑکن پر قابو پانا سکھایا تھا، اور اسے یہ بات سمجھنے کا موقع دیا تھا کہ مردوں کو موت سے خوف کیوں آتا ہے۔ حوزے آرکادیو اپنے آپ میں اتنا لگن تھا کہ جب اس کے باپ اور بھائی نے یہ مرثہ سنایا کہ وہ دھاتوں کے اس ملفوبے کو توڑنے اور اسلا کا سونا الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے

ہیں، تو وہ سمجھ نہ پایا کہ گھر والے آخر کیوں اتنا خوش ہو رہے ہیں۔

وہ درحقیقت کئی دنوں کی پیچیدہ اور انتک محنت کی وجہ سے کامیاب ہوئے تھے۔ ارسلان خوش تھی، یہاں تک کہ اس نے علمِ کیمیا گری کی ایجاد کے لیے خدا کا شکر ادا کیا، جبکہ گاؤں کے لوگوں نے تجربہ گاہ پر یلغار کر دی اور گھر والوں نے بسکٹوں پر امرود کی جیلی لگا کر ان کی خاطر تواضع کر کے اس شاندار کامیابی کا جشن منایا، اور حوزے آرکادیو بوندیا نے الگ کیا ہوا سونا لوگوں کو اس طرح دکھایا گویا وہ اس نے ایجاد کیا ہو۔ سب کو دکھانے کے بعد وہ اپنے بڑے بیٹے کے پاس گیا جو گزشتہ چند دنوں سے تجربہ گاہ میں شاذ و نادر ہی نمودار ہوا تھا۔ حوزے آرکادیو بوندیا نے پہلی خشک دھیری بیٹے کی آنکھوں کے سامنے لا کر پوچھا: "تمہیں یہ کیا نظر آتا ہے؟" حوزے آرکادیو سچائی سے بولا:

"کتنے کا پانا۔"

حوزے آرکادیو بوندیا نے اس کو ایسا طمانچا رسید کیا کہ اس کے منہ سے خون اور آنکھوں سے آنسو ٹپک آئے۔ اس رات پیلا ر نے اندھیرے میں روٹی اور بوتل ٹٹول کر حوزے آرکادیو کے سو بے ہوش منہ کی آرنیکا سے کافی کی، اور ساتھ ساتھ وہ سب کچھ کیا جو وہ کرنا چاہتی تھی، اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ وہ دونوں آپس میں قربت کی اس کیفیت کو پہنچ گئے کہ انھیں پتا ہی نہ چلا کہ کب انھوں نے آپس میں سرگوشیاں کرنا شروع کیں۔ "میں تمہارے ساتھ تنہا ہونا چاہتا ہوں،" اس نے کہا۔ "میں آج کل میں سب کو بتانے جا رہا ہوں، اور پھر ہم چوری چھپے رات کے اندھیرے میں ملنا بند کر دیں گے۔" پیلا ر نے اس کو تسلی دینے کی کوشش نہ کی۔

"یہ بہت اچھا ہوگا،" وہ بولی۔ "اگر ہم تنہا رہیں تو میں لیمپ روشن رکھا کروں گی تاکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ سکیں، اور میں دل کھول کر شور مچا سکوں گی اور کوئی ٹوکنے والا نہ ہوگا، اور تم میرے کانوں میں جو بھی بکواس کرنا چاہو، کر سکو گے۔"

اس گفتگو نے، اس چھپتی ہوئی عداوت نے جو اس کو اپنے باپ سے پیدا ہو گئی تھی، اور ایک غیر تاجِ محبت کے امکان نے، حوزے آرکادیو کے اندر ایک بردبار جرات پیدا کر دی تھی۔ بے ساختگی میں، بغیر کسی تیاری کے، حوزے آرکادیو نے اپنے بھائی کو سب کچھ بتا دیا۔

شروع میں چوٹا اور بلیا نو صرف خطرے کو سمجھ سکا، خطرے کے بے پناہ امکان کو جو اس کے بھائی کے کارنامے سے نشتی تھا، اور وہ اس شے کے طلسم کو نہ سمجھ پایا۔ رفتہ رفتہ فکر نے اسے آجکلہ۔ خطروں کی تفصیلات کے بارے میں سوچ کر، اپنے بھائی کی افیتوں اور لذتوں کا گمان کر

کے، اس کو بیک وقت خوف اور مسرت محسوس ہوئی۔ وہ اس کے انتظار میں صبح تک آنکھیں کھولے بستر میں پڑا رہتا، اس تنہا بستر میں جس کے بچے لگتا تھا کوئلے دہک رہے ہیں، اور پھر وہ لیٹے باتیں کیا کرتے، یہاں تک کہ بستر سے اٹھنے کا وقت آ جاتا، لہذا جلد ہی دونوں لڑکے دن میں غنودگی کا شکار رہنے لگے، ان کو کیسا گرمی اور باپ کے علم و دانش سے کوئی دلچسپی نہ رہی، اور دونوں تنہائی میں پناہ ڈھونڈی۔ "یہ بچے پاگل ہو گئے ہیں،" ارسلانے کہا۔ "یقیناً ان کے پیٹ میں کیڑے ہیں۔" اس نے ایک بد ذائقہ، کڑوا کیلا مشروب پیٹ کے کیڑے نکالنے والی جڑی بوٹی کو کچل کر بنایا، جسے ان دونوں نے غیر متوقع آمدگی کے ساتھ پی لیا، اور وہ دونوں ایک ساتھ دن میں گیارہ دفعہ پاخانے لگے، اور سرخ رنگ کے کچھ کیڑے خارج کیے جو انھوں نے مسرت کے ساتھ سب کو دکھائے، تاکہ اس طرح وہ ارسلان کو اپنی لائق اور غنودگی کی اصل وجہ کی جانب سے فریب میں مبتلا کر سکیں۔ چھوٹے اور یلیانو کو نہ صرف اب سب کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا، بلکہ وہ اپنے بھائی کے تجربات کو اپنا سمجھ کر تصور ہی تصور میں ان تمام کیفیات سے گزرنے لگا، کیوں کہ ایک موقع پر جب حوزے آرکادیو تفصیل کے ساتھ محبت کی ترکیبیں اسے سمجھا رہا تھا، اور یلیانو نے بات روک کر پوچھا: "کیسا محسوس ہوتا ہے؟" حوزے آرکادیو نے فوراً جواب دیا:

"یہ زلزلے کی طرح ہوتا ہے۔"

جنوری کی ایک جمعرات کو دو بجے رات امارانتا پیدا ہوئی۔ پیشتر اس کے کہ لوگ کمرے میں داخل ہوتے، ارسلانے اچھی طرح اس کا معائنہ کیا۔ وہ بکھی بکھی ریگ باہی کی طرح تھی، لیکن اس کے تمام اعضا انسانی تھے۔ اور یلیانو اس نئی چیز کی طرف اس وقت تک متوجہ نہ ہوا جب تک گھر لوگوں سے بھر نہ گیا۔ افراتفری کے پردے میں وہ اپنے بھائی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا جو گیارہ بجے رات سے غائب تھا۔ یہ ایک اتنا اضطرابی فیصلہ تھا کہ اسے خود سے یہ بھی پوچھنے کا موقع نہ ملا کہ وہ اپنے بھائی کو پیلاڑنیرا کے کمرے سے کیسے نکالے گا۔ اس نے اس کے گھر کے کئی چکر لگائے، سیٹیاں بجائیں، یہاں تک کہ پو پھٹنے لگی، اور اسے مجبوراً واپس ہونا پڑا۔ ماں کے کمرے میں اس نے دیکھا کہ حوزے آرکادیو معصوم سا چہرہ لیے فومولودہن سے کھیل رہا ہے۔

ارسلانے ابھی چٹا بھی ختم نہ کیا تھا کہ خانہ بدوش پھر وارد ہو گئے۔ اور یہ وہی شعبہ باز اور جادوگر تھے جو برف لے کر آئے تھے۔ ملکیا دیس کے قبیلے کے برعکس، انھوں نے یہ بات جلد ہی واضح کر دی کہ وہ ترقی کے پیامبر نہیں، بلکہ تفریح کے میرساں ہیں۔ یہاں تک کہ جب انھوں نے برف ان کے سامنے پیش کی تھی تب بھی انسانی زندگی کے لیے اس کے فوائد کی تسخیر نہیں کی تھی، بلکہ اسے صرف سرکس کے ایک عجوبے کے طور پر دکھایا تھا۔ اس دفعہ، دوسری بہت سی

نت نئی اشیاء کے ساتھ، وہ اڑنے والا قالین بھی لائے۔ لیکن انہوں نے اسے حمل و رسد کی ترقی کے ایک منظر کے بجائے ایک تفریحی شے کے طور پر پیش کیا۔ لوگوں نے فوراً اپنے آخری سکوں کو کھود کر نکالا، تاکہ گاؤں کے گھروں کے اوپر اڑنے کا مزد ٹوٹ سکیں۔ ایک اجتماعی افراتفری کے مسرت آمیز پردے میں، حوزے آرکادیو اور پیلار نے کئی خوش گوار گھنٹے ایک دوسرے کی قربت میں گزارے۔ وہ بجوم میں ایک خوش و خرم، محبت میں گرفتار جوڑے کی مانند گھومتے رہے، یہاں تک کہ خود انہیں بھی شبہ ہونے لگا کہ محبت ایک ایسا احساس بھی ہو سکتی ہے جو ان کی خفیہ ملاقاتوں کی بے لگام، لیکن لمحاتی مسرت سے زیادہ گمبیر اور فرحت بخش ہو۔ پیلار نے البتہ اس ظلم کو ٹوڑ دیا۔ حوزے آرکادیو کے جوش و خروش سے، جو اس میں اس کی قربت سے پیدا ہوا تھا، متاثر ہو کر، پیلار نے موقعے اور دستور کو خط ملط کر کے اچانک حوزے آرکادیو کے سر پر آسمان ڈھا دیا۔ "تم اب واقعی ایک مرد بن چکے ہو،" اس نے کہا۔ اور چوں کہ اس کی سمجھ میں نہ آ سکا کہ پیلار کی بات کا کیا مطلب ہے، اس نے وضاحت کی:

"تم باپ بننے والے ہو۔"

چند روز تک حوزے آرکادیو کو گھر سے نکلنے کی ہمت نہ ہوئی۔ باورچی خانے میں پیلار کے گونجتے ہوئے قہقہے سن کر وہ بھاگ کر تجربہ گاہ میں پناہ لیتا، جہاں ارسلہ کی رضامندی سے کیمیا گری کے آلات میں پھر سے جان پڑ گئی تھی۔ حوزے آرکادیو بوندیا نے اپنے گمراہ بیٹے کو مسرت کے ساتھ تجربہ گاہ میں خوش آمدید کہا، اور اسے پارس پستھر کی تلاش سے روشناس کرایا، جو اس نے آخر کار شروع کر دی تھی۔ ایک سہ پہر لڑکے تجربہ گاہ کی کھڑکی کے قریب سے تیزی سے اڑتے ہوئے قالین کو دیکھ کر، جس پر خانہ بدوش اور گاؤں کے بچے بیٹھے بات چیت کر رہے تھے، جوش میں آ گئے، لیکن حوزے آرکادیو بوندیا نے نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ "انہیں خواب دیکھنے دو،" اس نے کہا۔ "ہم ان سے بہتر طریقے پر پرواز کریں گے، ایک گھٹیا سی بستر کی چادر سے کہیں بہتر سانس کی وسائل کے ساتھ۔" گو کہ اس نے دلچسپی کا ڈھونگ رچایا، حوزے آرکادیو پارس پستھر کی قوتوں کو سمجھ نہ پایا، جو اسے ایک بے شکم بوتل کی مانند نظر آتا تھا۔ وہ اپنی فکروں سے آزاد ہونے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اس کی بھوک اڑ چکی تھی اور آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ وہ بد مزاجی کا شکار ہو گیا، بالکل اسی طرح جس طرح اس کا باپ اپنے تجربات کی ناکامی پر ہو جایا کرتا تھا، اور اس کی بے چینی اتنی بڑھ گئی کہ حوزے آرکادیو بوندیا نے اس کو تجربہ گاہ کی ذمہ داریوں سے سبک دوش کر دیا، یہ سوچ کر کہ غالباً وہ کیمیا گری کو دل پر لے گیا ہے۔ اور یلیا نوالبتہ سمجھ چکا تھا کہ اس کے بھائی کی پریشانی کا سبب پارس پستھر کی تلاش نہیں، لیکن وہ اُس کا اعتماد حاصل نہ کر سکا۔ حوزے آرکادیو اپنی پرانی

بے ساختگی کھو بیٹھا تھا۔ وہ ایک رازدار اور بے تکلف شخص سے اپنی ذات میں سٹے ہوئے بداندیش انسان میں بدل گیا تھا۔ دنیا سے تلخ کینہ لیے، تنہائی کی تلاش میں ایک رات وہ حسب معمول گھر سے نکلا، لیکن پیلاڑ ترنیرا کے گھر نہ گیا بلکہ میلے کی گھاگھی میں جا کر گم ہو گیا۔ سب تماشوں کو بغیر کسی دلچسپی کے دیکھنے کے بعد، اس کو ایک ایسی شے نظر آئی جو اس میلے کا حصہ نہ لگتی تھی: وہ ایک بے حد نوخیز، خانہ بدوش لڑکی تھی، تقریباً ایک انچی، جو منکوں موتیوں کے بوجھ تلے جھکی جاتی تھی، اور اس سے زیادہ حسین لڑکی حوزے آرکادیو نے آج تک نہ دیکھی تھی۔ وہ اس مجمعے میں کھڑی تھی جو والدین کی نافرمانی کرنے کے سبب ایک شخص کے سانپ کے قاب میں دھل جانے کا منہوم تماشا دیکھ رہا تھا۔

حوزے آرکادیو نے تماشے پر کوئی توجہ نہ دی۔ جب سانپ نما آدمی سے تکلیف دہ پوچھ گچھ ہو رہی تھی، وہ مجمعے کو چیرتا پہلی قطار تک جا پہنچا، جہاں وہ لڑکی کھڑی تھی، اور اس کے پیچھے جا کر رک گیا۔ اس نے لڑکی کی پشت پر دباؤ ڈالا۔ لڑکی نے بیٹنے کی کوشش کی، لیکن وہ زیادہ قوت کے ساتھ اس کی پشت سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ تب لڑکی نے اسے محسوس کیا۔ وہ ساکت کھڑی رہی، تعجب اور خوف سے لرزاں؛ اس کو اس لمس کا یقین نہیں آ رہا تھا، اور آخر اس نے ایک لرزتی مسکراہٹ کے ساتھ پیچھے مڑ کر حوزے آرکادیو کو دیکھا۔ اس لمحے دو خانہ بدوشوں نے سانپ نما آدمی کو پتھرے میں ڈالا اور خیمے کے اندر لے گئے۔ ایک خانہ بدوش نے، جو تماشا پیش کر رہا تھا، اعلان کیا:

"اور اب، خواتین و حضرات، ہم آپ کے سامنے اُس عورت کی خوفناک آزمائش کا تماشا پیش کرتے ہیں، جس کا سر ڈیڑھ سو سال سے قلم کیا جا رہا ہے؛ یہ سزا اسے اس بات کی مل رہی ہے کہ اس نے وہ دیکھ لیا جو اسے نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔"

حوزے آرکادیو اور خانہ بدوش لڑکی نے عورت کا سر قلم ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ مجمعے سے نکل کر لڑکی کے خیمے میں چلے گئے، جہاں انھوں نے کپڑے اتارتے ہوئے ایک بے خوف اشتیاق کی کیفیت میں ایک دوسرے کو بو سے دیے۔ خانہ بدوش لڑکی نے کٹت دار لیس کی قمیص اور انگلیا اتاری۔ اب اس کے جسم پر کچھ نہ تھا۔ اپنے ابتدائی پستانوں اور پتلی پتلی ٹانگوں کے ساتھ، جو حوزے آرکادیو کے بازوؤں سے بھی پتلی تھیں، وہ ایک چھوٹے سے کمزور بینڈک کی مانند لگ رہی تھی، لیکن اس کی قوت فیصلہ اور حرارت نے اس کی کمزوری چھپا لی تھی۔ لیکن پھر بھی حوزے آرکادیو پر اس کی گرمی کا اثر نہ ہوا، کیوں کہ وہ ایک خیمہ نام تھا جہاں خانہ بدوش کھیل تماشوں کی اشیاء لیے آ جا رہے تھے اور اپنے کاموں میں مصروف تھے، یہاں تک کہ وہ بستر کے قریب پانہ کھینے کے لیے توقف بھی کرتے۔ لیمپ نے، جو وسط میں ایک کھیمے سے لٹک رہا تھا، تمام خیمے کو

روشن کر رکھا تھا۔ خرمیستوں کے ایک وقفے میں حوزے آرکادیو، یہ جانے بغیر کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے، بستر میں دراز ہو گیا، جبکہ لڑکی اس کے جذبات جگانے کی کوشش کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد ایک بھرپور جسم والی خانہ بدوش عورت ایک آدمی کے ساتھ خیمے میں داخل ہوئی، جو نہ خانہ بدوشوں میں سے تھا اور نہ گاؤں کا باسی تھا، اور وہ دونوں بستر کے قریب آکر کپڑے اتارنے لگے۔ عورت نے لیٹے ہوئے آرکادیو پر یوں ہی ایک نظر ڈالی، اور ایک جاں گداز شوق کے ساتھ اس کے شاندار، آسودہ عضو کا معائنہ کیا۔

"میرے بیٹے،" اس نے کہا، "خدا تم کو سلامت رکھے، اسی طرح جیسے کہ تم ہو۔"

حوزے آرکادیو کی ساتھی نے ان سے کہا کہ وہ ان کو تنہا چھوڑ دیں، اور وہ جوڑا بستر کے قریب فرش پر لیٹ گیا۔ ان کے شہوانی اختلاط سے حوزے آرکادیو کے جذبات جاگ اٹھے۔ پہلے لمس کے ساتھ ہی لڑکی کے جسم کی بدٹیوں کا ایک ایک جوڑ بیچ کر گوٹیوں کے ڈٹنے کی طرح کھل گیا، اس کی جلد پر پسینے کے قطرے ابھر آئے، اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں، اور اس کے جسم سے مٹی کی موہوم سی خوشبو اور ایک عکسین فغاں اٹھنے لگی۔ لیکن اس نے اس اتصال کو اپنی مضبوط خاصیت اور ایک قابل تحسین بہادری کے ساتھ برداشت کیا۔ حوزے آرکادیو نے خود کو فضا میں، ایک ملکوتی تاثر کی کیفیت کی جانب بلند ہوتے ہوئے محسوس کیا، اور اس کا دل محبت آمیز فحش فکروں سے بھر آیا، جو اس نے لڑکی کے کانوں میں اندھیل دیے، اور جو لڑکی کے منہ سے اس کی اپنی زبان میں ترجمہ ہو کر نکلے۔ وہ جمعات کا دن تھا۔ سنپیر کے روز حوزے آرکادیو نے ایک سرخ کپڑا سر پر لپیٹا اور خانہ بدوشوں کے ساتھ نکل گیا۔

جب ارسلہ کو اس کی غیر موجودگی کا علم ہوا تو اس نے حوزے آرکادیو کو پورے گاؤں میں تلاش کیا۔ جس مقام سے خانہ بدوشوں نے اپنے خیمے لیٹے تھے، وہاں کوڑے کے ڈھیر اور بجھے ہوئے الو سے دھواں دیتی راکھ کے سوا کچھ نہ تھا۔ کسی نے، جو کوڑے پر سے منکے چن رہا تھا، ارسلہ کو بتایا کہ ایک رات پہلے اس نے ارسلہ کے بیٹے کو کارواں کے ہنگامے میں سانپ نما آدمی کا پتھر دھکیلتے دیکھا تھا۔ "وہ خانہ بدوش ہو گیا ہے،" ارسلہ نے چیخ کر اپنے شوہر کو اطلاع دی، جس نے بیٹے کی گمشدگی پر ذرا بھی تھویش کا اظہار نہ کیا تھا۔

"کاش یہ بات سچ ہو،" حوزے آرکادیو بوندیا نے بولن دستے میں اس شے کو کوٹتے ہوئے کہا جسے وہ ہزاروں دفعہ پیس کر گرم کرنے کے بعد دوبارہ کوٹ رہا تھا۔ "اس طرح وہ مرد بھنا سیکھ لے گا۔"

ارسلہ نے لوگوں سے پوچھا کہ خانہ بدوش کس سمت گئے ہیں۔ وہ اس راستے پر پوچھتے پوچھتے

آگے ٹھٹکی چلی گئی، اس خیال میں کہ خانہ بدوشوں کو جا پکڑے گی۔ وہ گاؤں سے دور ہوتی گئی، یہاں تک کہ اس نے اتنی مسافت طے کر لی کہ واپس پلٹنے کا خیال ہی نہ رہا۔ حوزے آرکادیو بونڈیا کو رات کے آٹھ بجے اس وقت اپنی بیوی کے لپٹا ہوا جانے کا علم ہوا جب وہ اس ملغوبے کو گوہر کی کیاری میں گرم ہونے کے لیے رکھ کر، ننھی امارانتا کے رونے کی آواز سن کر یہ دیکھنے کے لیے اندر گیا کہ بچی کو کیا ہوا ہے۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر اس نے ساز و سامان سے لیس لوگوں کا ایک گروہ اکٹھا کر لیا، اور امارانتا کو ایک عورت کے حوالے کر کے، جس نے اس کو دودھ پلانے کی ذمہ داری لی، ارسال کی تلاش میں آن دیکھی راہوں پر ٹکل کھڑا ہوا۔ اور یلیا نو ان کے ساتھ تھا۔ چند مقامی مجسمروں نے، جن کی زبان وہ نہ سمجھ سکے، اشاروں کی مدد سے بتایا کہ انھوں نے اس راستے سے کسی کو گزرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ تین دن کی ناکام تلاش کے بعد وہ گاؤں لوٹ آئے۔

حوزے آرکادیو بونڈیا کتنی ہفتے پریشانی کے عالم میں رہا۔ اس نے ننھی امارانتا کا ماں کی طرح خیال رکھا۔ وہ اس کو نہلاتا، کپڑے بدلاتا، دن میں چار دفعہ عورت کے گھر دودھ پلوانے لے جاتا، یہاں تک کہ رات کو اسے لوریاں بھی دیتا جو اسلا کو کبھی سنانی نہ آئی تھیں۔ ایک دن پیلاز نے گھر کا کام کاج اپنے ذمے لینے کی پیشکش کی۔ اور یلیا نو کو، جس کی پراسرار حس اس افتاد کے بعد آور تیز ہو گئی تھی، پیلاز کو آتے دیکھ کر ایک الہام سا ہوا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ پیلاز کسی ناقابل بیان طریقے سے اس کے بانی کے فرار اور اس کی ماں کی گمشدگی کی ذمہ دار ہے، اور اس نے پیلاز کو ایک خاموش اور کٹھور عداوت کے ساتھ اس طرح دیکھا کہ وہ اس گھر میں پھر کبھی داخل نہ ہوئی۔

وقت نے سب کچھ معمول کے مطابق کر دیا۔ حوزے آرکادیو بونڈیا اور اس کے بیٹے کو اس بات کا احساس بھی نہ ہوا کہ کب وہ تجربہ گاہ میں واپس لوٹے، گردوغبار صاف کیا، پانی کی نلکیاں سلاگئیں اور دوبارہ دھات کے اس ملغوبے کو گوہر سے نکالا جہاں وہ مہینوں سے پڑا سو رہا تھا۔ ننھی امارانتا بید کی ٹوکری میں لیٹی تجس سے اپنے باپ اور بانی کو تجربوں میں ڈوبا ہوا دیکھا کرتی، اس چھوٹے سے کمرے میں جس کی فضا پارے کے بخارات کی موجودگی سے لطیف ہو گئی تھی۔ ارسال کے جانے کے چند ماہ بعد، ایک خاص موقع پر عجیب و غریب واقعات رونما ہونے لگے۔ ایک خالی فلاسک جو الماری میں مدتوں سے رکھا ہوا تھا، اتنا بھاری ہو گیا کہ اسے بلانا مشکل ہو گیا، برتن میں رکھا پانی بغیر آگ پر چڑھے ابٹنے لگتا یہاں تک کہ بخارات بن کر اڑ جاتا۔ حوزے آرکادیو بونڈیا اور اس کے بیٹے نے یہ عجیب و غریب کرشمے حیرانی اور اضطراب کے ساتھ دیکھے۔ ایک دن امارانتا کی ٹوکری نے خود بخود بلنا شروع کر دیا اور کمرے میں گردش کرنے لگی، اور اور یلیا نو نے پریشانی کے عالم میں اسے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا باپ اس واقعے سے خائف نہ ہوا۔ اس نے ٹوکری

کو اس کی جگہ پر رکھ کر میز کے پائے سے باندھ دیا، اس یقین کے ساتھ کہ جس واقعے کا اسے مدتوں سے انتظار تھا، وہ رونما ہونے والا ہے۔ یہی وہ موقع تھا جب اوریلیا نے اپنے باپ کو کہتے سنا:

"اگر تمہیں خدا کا خوف نہیں، تو دھاتوں کے ذریعے اس سے ڈرو۔"

ارسلا تقریباً پانچ ماہ بعد اپانک واپس آگئی۔ وہ ہشاش بشاش، تجدیدِ شباب کے ساتھ خوشی میں مست، اور نئے کپڑوں میں ملبوس لوٹی جن کی وضع قطع گاؤں میں پہلے کسی نے نہ دیکھی تھی۔ ارسلا کی واپسی کا حوزے آرکادیو بوندیا پر اتنا اثر ہوا کہ اس سے کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ "تو یہ بات تھی!" وہ چلایا۔ "مجھے معلوم تھا یہ ہونے والا ہے۔" اور اسے واقعی اس کا یقین تھا، کیوں کہ اس طویل قید کے دوران، جب وہ دھاتوں کے تجربات میں مصروف تھا، اس نے دل کی گھرائیوں سے تمنا کی تھی کہ وہ معجزہ جو ظہور میں آنے والا ہے، پارس پتھر کی دریافت، اس سانس کی آزادی جس سے خوابیدہ دھاتیں جی اٹھیں، یا وہ قوت جس سے گھر کے تالے اور چوکھٹیں سونے میں بدل جائیں، نہ ہو، بلکہ وہی ہو جو ہوا: ارسلا کی واپسی۔ لیکن ارسلا اس گرم جوشی میں شریک نہ ہوئی۔ اس نے حوزے آرکادیو بوندیا کو ایک روایتی بوسہ دیا، گویا وہ محض ایک گھنٹے بعد گھر لوٹی ہو، اور کہا:

"دروازے کے باہر تو دیکھنا۔"

حوزے آرکادیو بوندیا نے جب باہر جا کر گلی میں مجھے کو دیکھا تو شش و پنج سے ٹکنے میں اسے کافی وقت لگا۔ وہ خانہ بدوش نہ تھے۔ وہ انہیں جیسے مرد اور عورتیں تھیں، سیدھے بالوں اور سانولی رنگت والے لوگ، جو انہیں کی زبان بولتے اور انہیں ٹکلیفوں کا رونا روتے۔ ان کے ساتھ کھانے پینے کی اشیاء سے لدے خچر تھے، اور بیل گاڑیاں جن پر گھوٹیلو استعمال کے برتن لدے ہوئے تھے، سیدھی سادھی دنیاوی اشیاء جنہیں روزمرہ کی دنیا کے خوناچہ فروش بغیر کسی شور شرابے کے بیچ رہے تھے۔ وہ دلدلی علاقے کے اُس پار سے آئے تھے جو صرف دو دن کے فاصلے پر تھا، جہاں ایسے قصبے تھے جن میں سال کے ہر ماہ ڈاک پہنچا کرتی تھی، اور جن کے باشندے عمدہ رہن سہن کے طور طریقوں سے واقف تھے۔ ارسلا کو خانہ بدوش تو نہ ملے تھے، لیکن اس نے وہ راستا پایا تھا جو اس کا شوہر اپنی شاندار ایجادات کی بے نتیجہ جستجو کے دوران دریافت کرنے میں ناکام رہا تھا۔

پیلار ترنیرا کے بیٹے کو اس کے پیدائش کے دو ہفتے بعد دادا دادی کے گھر لے آیا گیا۔ ار سلا نے اسے ناخوشی سے گھر میں داخل کیا، اپنے شوہر کی ضد کے آگے ایک بار پھر بے بس ہو کر، جو یہ خیال برداشت نہ کر سکتا تھا کہ اس کا خون اس سے دور رہے، لیکن اس نے یہ شرط عائد کی کہ بچے کو اس کے اصل حسب نسب کا کبھی پتا نہ چلے۔ گو کہ بچے کو حوزے آرکادیو کا نام دیا گیا، اسے سب لوگ صرف آرکادیو کہہ کر پکارتے تاکہ الجھن نہ ہو۔ اُن دنوں گاؤں میں اتنی گھما گھمی، اور گھر میں اتنی چہل پھل تھی کہ بچوں کی دیکھ بھال کا کام ضمنی سطح پر چلا گیا تھا۔ بچوں کو ویزنٹا سیوں، ایک مقامی گواہیرو عورت، کے حوالے کر دیا گیا تھا، جو اپنے بھائی کے ساتھ قصبے پہنچی تھی، بے خوابی کی وبا سے فرار ہو کر جو اُن کے قبیلے میں کئی سال سے پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اتنے اطاعت گزار اور مدد کے لیے تیار تھے کہ ار سلا نے انھیں گھر کے کام کاج میں باتھ بٹانے کے لیے رکھ لیا۔ اس طرح آرکادیو اور امارا اتنا ہسپانوی زبان سیکھنے سے پہلے گواہیرو بولنے لگے تھے، اور انھوں نے چھپکلی کا شور بہ اور کڑیوں کے انڈے کھانا سیکھ لیے، جس کا علم ار سلا کو نہ ہوا، جو اپنے شکر کے جانوروں کے بڑھے ہوئے کاروبار میں بے حد مصروف رہنے لگی تھی۔ ماکوندو میں تبدیلی آگئی تھی۔ جو لوگ ار سلا

کے ساتھ آئے تھے، انھوں نے یہ خبر پھیلا دی کہ یہاں کی زمین بہت عمدہ ہے اور دلدلی علاقے کے مقابلے میں امتیازی حیثیت کی حامل ہے، لہذا ماکوندو پرانے وقتوں کے چھوٹے سے گاؤں سے ایک فعال قصبے میں بدل گیا، دکانوں، کارگاہوں اور ایک باقاعدہ تجارتی راستے والا قصبہ، جس سے عرب ڈھیلی ڈھالی پتلونیں پہنے اور کانوں میں بالے لٹکائے آتے، اور کانچ کے منکوں کے عوض توڑے لیا کرتے۔ حوزے آرکادیو بونڈیا کو ایک لمحے کا آرام نہ ملتا۔ سامنے کی حقیقت کے سر میں آکر، جو اس کے تخیل کی وسیع کائنات سے زیادہ انوکھی تھی، وہ کیمیا گری میں تمام دلچسپی کھو بیٹھا، اس نے وہ مادہ اٹھا کر رکھ دیا جو مبینوں کے جوڑ توڑ سے رقیق ہو چلا تھا، اور دوبارہ پرانے دنوں والا ایک پُر عزم آدمی بن گیا، جب اس نے گاؤں کا نقشہ اس طرح ترتیب دیا تھا کہ کوئی شخص ایسی مراعات نہ پاسکے جو سب کو حاصل نہ ہوں۔ نئے آنے والوں میں اس کو اتنا استناد حاصل ہو گیا کہ اس سے مشورہ کیے بغیر نہ گھر کی بنیاد ڈالی جاتی اور نہ دیواریں کھڑی کی جاتیں، اور فیصلہ کیا گیا کہ زمین کی تقسیم کا نگران اسے بنایا جائے۔ جب کرتب دکھانے والے خانہ بدوش واپس آئے، جن کا آوارہ کار نیوال تقدیر اور اتفاقات کے کھیلوں کے ایک عظیم الشان ادارے میں بدل گیا تھا، تو ان کا بے حد مسرت کے ساتھ استقبال کیا گیا، کیوں کہ خیال یہ تھا کہ حوزے آرکادیو ان کے ساتھ واپس آیا ہو گا۔ لیکن حوزے آرکادیو واپس نہ آیا تھا، اور نہ ہی وہ سانپ نما آدمی ان کے ساتھ تھا جو اس کے خیال میں واحد شخص تھا جو حوزے آرکادیو کے بارے میں ان کو کچھ بتا سکتا تھا، لہذا خانہ بدوشوں کو قصبے میں پڑاؤ ڈالنے کی اجازت نہ ملی اور انھیں آئندہ وہاں قدم نہ رکھنے کی تنبیہ کی گئی، کیوں کہ انھیں شہوت پرستی اور جنسی کجروی کا پیامبر سمجھا جاتا تھا۔ حوزے آرکادیو بونڈیا نے البتہ صاف لفظوں میں واضح کر دیا کہ ملکبادیس کے پرانے قبیلے کے لیے گاؤں کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے، جس نے گاؤں کی ترقی اور خوشحالی میں اپنے علم و دانش اور شاندار ایجادات کے ذریعے معاونت کی تھی۔ لیکن ملکبادیس کا قبیلہ، بقول ان خانہ بدوشوں کے، روئے زمین سے فنا ہو چکا تھا، کیوں کہ وہ انسانی علم کی حدوں سے پرے نکل گیا تھا۔

تخیل کے عذاب سے کم از کم کچھ عرصے کے لیے آزاد ہو کر، حوزے آرکادیو بونڈیا نے مختصر سی مدت میں نظم و ضبط اور کام کا ایک نظام ترتیب دیا جس میں صرف ایک آزادی کی گنجائش رکھی گئی: ان پرندوں کی آزادی جنھوں نے ماکوندو کی بنیاد پڑنے سے اب تک وقت کے گزراں کو خوش الحان نغموں سے پُر مسرت کیا تھا، اور ان کی جگہ ہر گھر میں موسیقی والی گھڑیاں نصب کی گئیں۔ وہ شاندار گھڑیاں منقش لکڑی کی بنی ہوئی تھیں جو عربوں نے تو تلوں کے عوض انھیں دی تھیں، اور جنھیں حوزے آرکادیو بونڈیا نے اس صراحت سے ہم وقت کیا تھا کہ پورا

گاؤں ہر آدھ گھنٹے بعد ایک ہی نفعے کے اٹھتے ہوئے سُروں سے مجھوم اٹھتا، وہ نفعہ جو عین دوپہر کے وقت اپنے عروج پر پہنچتا، ایک مکمل والز کی طرح درست اور ہم آواز۔ یہ حوزے آرکادیو بونڈیا ہی تھا جس نے ان برسوں میں یہ فیصلہ کیا کہ انہیں لیکر کی جگہ گلیوں میں بادام کے درخت لگانے چاہییں، اور اسی نے ایسا طریقہ دریافت کیا، جو اس نے کسی کو نہ بتایا، جس سے وہ درخت ہمیشہ ہرے بھرے رہتے۔ بہت برسوں بعد، جب باکوندو جُست کی چھتوں والے لکڑی کے گھروں کے ایک میدان میں تبدیل ہو گیا تھا، بادام کے شکستہ اور گرد آلود درخت قدیم ترین گلیوں میں اب بھی کھڑے تھے، جو کسی کو معلوم نہ تھا کہ کس نے لگائے تھے۔ جن دنوں اس کا باپ گاؤں کا نظام درست کر رہا تھا، اور اس کی ماں شکر کی مچھلیوں اور مرغیوں کے شاندار کاروبار سے گھر کی دولت میں اضافہ کر رہی تھی جس کی وجہ سے گھر میں دن میں دو دفعہ سالا لکڑی کی ڈنڈیاں لٹائی جاتیں، اور یلیانو گھنٹوں اس ترک کردہ تجربہ گاہ میں گزارتا اور خود تجربے کر کے چاندی کا کام سیکھتا۔ مختصر سی مدت میں اس نے اتنی تیزی سے قد نکالا کہ بڑے بھائی کے چھوٹے ہوئے کپڑے اس پر تنگ ہونے لگے اور وہ اپنے باپ کے کپڑے پہننے لگا۔ لیکن ویزتاسیوں کو فیصلوں اور پتلونوں میں چٹھیں ڈالنی پڑتی تھیں، کیوں کہ اور یلیانو پر دوسرے لوگوں جیسا مٹا پانہ چڑھا تھا۔ بلوغت نے اس کی آواز کی نرمی ختم کر دی تھی اور اس کو خاموش طبع اور قطعی طور پر تنہا کر دیا تھا، لیکن دوسری طرف اس کی آنکھوں میں تاثرات کی وہ شدت دوبارہ عود کر آئی تھی جو پیدائش کے وقت تھی۔ وہ چاندی کے کام پر اتنی توجہ مرکوز رکھتا کہ بمشکل کھانا کھانے کے لیے تجربہ گاہ سے نکلتا۔ حوزے آرکادیو بونڈیا اس کے اندر ہی اندر سمٹنے سے اتنا متکثر ہوا کہ اس نے، یہ سوچ کر کہ شاید اسے عورت کے پاس جانے کی ضرورت ہے، اسے گھر کی چابیاں اور کچھ پیسے دیے، لیکن اور یلیانو نے وہ پیسے آب شاہی تیار کرنے کے لیے جو ہر نمک خریدنے میں لگا دیے، اور چابیوں پر سونے کا پانی چڑھا کر انہیں خوب صورت بنا دیا۔ اس کی بے اعتدالی کا آرکادیو اور امارانتا کی حرکتوں سے مقابلہ نہ ہو سکتا تھا، جن کے دودھ کے دانت ٹوٹ چکے تھے اور نئے دانت نمودار ہو رہے تھے، اور جو مقامی انڈین لوگوں کی سی عباہیں گھسیٹتے پھرتے اور اس بات پر اڑے رہتے کہ ہسپانوی نہیں بلکہ گواہیرو بی بولیں گے۔ "تمہیں شکایت نہیں کرنی چاہیے،" اسلانی اپنے شوہر سے کہا۔ "بچوں کو والدین کا پاگل پن وراثت میں ملتا ہے۔" اور جب وہ اپنی قسمت کو کوس رہی تھی، اس یقین کے ساتھ کہ اس کے بچوں کی وحشیانہ حرکتیں اتنی ہی خوفناک ہیں جتنی کہ سور کی دم، اور یلیانو نے اس کی طرف اس طرح دیکھا کہ وہ تذبذب میں مبتلا ہو گئی۔

"کوئی آ رہا ہے،" اس نے اُرسلا کو بتایا۔

ارسلانے اس پیش گوئی کو گھریلو عورت کی منطق سے سمجھنا چاہا، جیسا کہ وہ ہمیشہ کیا کرتی تھی جب بھی اور یلیا نو اس قسم کی بات کرتا۔ کسی کا آنا عام بات تھی۔ روازنہ درجنوں انہبی، بغیر شکوک و شبہات اہمارے اور بغیر کسی اسرار کے، ماکوندو آیا کرتے۔ بہر حال، ہر منطق سے بالاتر، اور یلیا نو کو اپنی پیش گوئی پر پورا یقین تھا۔

"میں نہیں جانتا وہ کون ہوگا،" اس نے اصرار کیا، "لیکن وہ جو کوئی بھی ہے، روازنہ جو چکا ہے۔"

اس اتوار درحقیقت ریکا پہنچی۔ وہ صرف گیارہ سال کی تھی۔ اس نے مانورے سے ماکوندو تک کا کٹھن سفر چمڑے کے چند تاجروں کے ہمراہ طے کیا تھا، جنہوں نے ریکا کو ایک خط سمیت حوزے آرکادیو بونڈیا تک پہنچانے کی ذمہ داری لی تھی، لیکن وہ ٹھیک سے سمجھا نہ پائے کہ آخر وہ کون شخص تھا جس نے یہ کام ان کے سپرد کیا تھا۔ ریکا کا سازو سامان صرف ایک چھوٹے سے صندوق، رنگ دار پھولوں سے مزین ایک جھولنے والی کرسی اور ایک ٹاٹ کی بوری پر مشتمل تھا، جس سے کلاک، کلاک، کلاک کی آواز نکلتی، اور جس میں وہ اپنے والدین کی بڈیاں لیے پھرتی تھی۔ وہ گرم جوش خط جو حوزے آرکادیو بونڈیا کے نام تھا، کسی ایسے شخص کی طرف سے لکھا گیا تھا، جو اب تک، زمان و مکاں کے فاصلوں کے باوجود، اس سے محبت کرتا تھا، اور جس نے ایک بنیادی انسانی ہمدردی کے تحت اس بے سہارا یتیم بچی کو اس کے پاس بھیجا تھا، وہ ارسلان کی رشتہ کی بہن تھی، اور اس طرح اس کا حوزے آرکادیو بونڈیا سے بھی دور کا رشتہ ٹکٹا تھا، اس لیے کہ وہ اس کے کبھی نہ بھلانے جائے والے دوست ٹانور اُیو با اور اس کی نیک بیوی ریکا مونٹیسل کی بیٹی تھی، خدا اُن دونوں روحوں کو اپنی امان میں رکھے، اور ان کی بڈیاں ساتھ لے کر آئی تھی تاکہ عیسائی طریقے سے ان کو دفنایا جاسکے۔ خط میں دیے گئے نام اور دستخط صاف صاف پڑھ جاتے تھے، لیکن نہ حوزے آرکادیو بونڈیا کو اور نہ ارسلان کو اس نام کے کسی رشتہ دار کا علم تھا، اور نہ ہی انہوں نے آج تک مانورے گاؤں کا نام سنا تھا۔ لڑکی سے کوئی مزید معلومات حاصل کرنا ناممکن تھا۔ جس وقت سے وہ آئی تھی، جھولنے والی کرسی میں انگوٹھا چوستی ہوئی، ہر ایک کو اپنی بڑی بڑی وحشت زدہ آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، اور اس کے چہرے اور حرکات سے اس سے کیے جانے والے سوالات کے سمجھنے کے کوئی آثار نہ پائے جاتے تھے۔ وہ آڑھی دھاریوں والا، کالے رنگ میں رنگا ہوا لباس پہنے تھی جو پرانا نظر آتا تھا۔ اس نے بٹی دار چمڑے کے جوتے پہن رکھے تھے۔ اس کے بال کانوں کے پیچھے کالے ربن سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ ایک دو شاہ اورھے ہوئے تھی جس پر بنی شیشیں پہینے سے مٹ جلی تھیں، اور دائیں کلائی میں نظربد کے حفاظتی تعویذ کے طور پر گوشت خور جانور کے دانتوں

سے منڈھا ہوا ایک تانبے کا کڑا تھا۔ اس کی سبز مائل جلد اور دھول کی طرح تنہا ہوا گول پیٹ اس کی خرابی صحت اور بھوک کی نشان دہی کرتا تھا، جس کی عمر اس کی عمر سے زیادہ تھی، لیکن جب انھوں نے اسے کچھ کھانے کو دیا تو وہ پلیٹ کو ٹٹنوں پر رکھے بیٹھے رہی اور کچھ نہ چکھا۔ ان لوگوں کو شبہ ہونے لگا کہ وہ گونگی بہری ہے، یہاں تک کہ مقامی لوگوں نے اپنی زبان میں اس سے پوچھا کہ آیا اسے پانی چاہیے، اور اس نے اپنی آنکھیں گھمائیں، جیسے انھیں پہچان رہی ہو، اور سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔

انھوں نے بھی کور کھ لیا، کیوں کہ اس کے سوا وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ انھوں نے اسے ربیکا پکارنے کا فیصلہ کیا جو خط کے مطابق اس کی ماں کا نام تھا، کیوں کہ اوریلیانو نے انتہائی تحمل کے ساتھ تمام ولیوں کے نام لیے اور کسی بھی نام پر اس نے رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ چوں کہ اس وقت تک ماکوندو میں قبرستان نہ تھا، انھوں نے ہڈیوں کی بوری کو تدفین کے مناسب مقام کی تلاش کے انتظار میں رکھا رہنے دیا، اور ایک طویل عرصے تک وہ بوری ہر جگہ نظر آتی اور مرغی کی کڑکڑاہٹ کی سی آواز کے ساتھ ایسی جگہ پائی جاتی جہاں اس کے ہونے کی کوئی توقع نہ کی جاسکتی تھی۔ ربیکا کو اس خاندان کی زندگی کا حصہ بننے میں طویل عرصہ لگا۔ وہ گھر کے کسی دور دراز کونے میں اپنی چھوٹی سی جمونے والی کرسی پر بیٹھی اگلوٹھا چوسا کرتی۔ اسے کوئی چیز متوجہ نہ کرتی سوائے گھڑیوں کی موسیقی کے، جس کے لیے وہ ہر آدھ گھنٹے بعد اپنی خوف زدہ آنکھیں اٹھا کر یوں دیکھتی گویا وہ اسے ہوا میں دکھائی دینے والی ہو۔ وہ اسے کسی دنوں تک کھانے پر مائل نہ کر سکے۔ کسی کی سجدہ میں نہ آتا تھا کہ وہ اب تک بھوک سے مر کیوں نہیں گئی، یہاں تک کہ مقامی انڈین لوگوں نے، جو کئی باتوں سے باخبر تھے، اور جو گھر میں دبے پاؤں بغیر کسی آہٹ کے آیا جایا کرتے، دریافت کیا کہ ربیکا صرف آنگن کی گیلی مٹی اور دیواروں کا چونا کھانا پسند کرتی ہے، جو وہ اپنے ناخونوں سے کھرچ کر نکالا کرتی۔ یہ بات واضح تھی کہ اس کے والدین نے، یا جس کسی نے اس کی پرورش کی، اس کی اس عادت پر خاصی سرزنش کی تھی، کیوں کہ وہ یہ کام چھپ کر اور ایک احساسِ جرم کے ساتھ کرتی، اور اس کوشش میں رہتی کہ کچھ مٹی چونا چپا رکھے اور جب کوئی نہ دیکھ رہا ہو، چپکے چپکے کھائے۔ تب سے انھوں نے اس کی کڑی نگرانی شروع کر دی۔ انھوں نے آنگن میں گائے کا گوبر پھیلادیا اور دیواروں پر تیز مرچیں لٹ دیں، اس امید پر کہ اس طرح وہ اس کی مہلک عادت کو شکست دے سکتے ہیں۔ لیکن اس نے مٹی حاصل کرنے میں اتنی ہوشیاری اور چٹرائی دکھائی کہ اسے اسلاف کو مجبوراً سنت اقتدات کرنے پڑے۔ اس نے ایک برتن میں موسمی کا عرق اور ریوند جینی ملا کر رات بھر کے لیے آنگن میں چھوڑ دیا تاکہ اس میں شبشم پڑ سکے، اور یہ دوا اس نے دوسرے دن

ریکا کو خالی پیٹ پلائی۔ گو کہ ارسلہ کو کسی نے نہ بتایا تھا کہ یہ مٹی کھانے کی عادت کا علاج ہے، اس کا خیال تھا کہ کوئی بھی تلخ مانع خالی پیٹ میں جائے گا تو جگر میں رد عمل پیدا کرے گا۔ ریکا اپنے نازک جسم کے باوجود اتنی مضبوط اور سرکش تھی کہ انھیں اس کو ایک پھڑپھڑے کی طرح باندھ کر دوا پلائی پڑی، اور انھوں نے بہ مشکل خود کو اس کی لاتوں سے بچایا اور ان عجیب و غریب آوازوں کو برداشت کیا جو وہ دانتوں سے کاٹنے اور ٹھوکنے کے دوران نکالتی رہی۔ صدے سے حیرت زدہ مقامی لوگوں کے مطابق، یہ غلیظ ترین گالیاں تھیں، جو کوئی ان کی زبان میں سوچ سکتا تھا۔ جب ارسلہ کو اس بات کا پتا چلا تو اس نے دوا پلانے کے ساتھ ساتھ اس کی خوب پٹائی بھی کی۔ یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ ریوند جینی کا اثر تھا یا پٹائی کا، یا دونوں کا، لیکن سچ یہ ہے کہ چند ہی ہفتوں میں ریکا کے سُدھرنے کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ آرکادیو اور اماراتا کے ساتھ کھیلا کرتی جو اس سے بڑی بہن کا سا برتاؤ کرتے، اور بڑتنوں کا صحیح استعمال کرتے ہوئے جی بھر کے کھانا کھاتی۔ جلد ہی یہ حقیقت کھل گئی کہ وہ سپانوی زبان بھی اتنی ہی روانی سے بولتی ہے جتنی کہ مقامی، اور جسمانی مشقوں کی اس میں حیرت انگیز استعداد ہے، اور گھڑیوں کے والز کو وہ خود سے بنائے ہوئے مزاحیہ بولوں کے ساتھ گا سکتی ہے۔ ان لوگوں کو اسے گھر کا فرد سمجھنے میں زیادہ عرصہ نہ لگا۔ وہ ارسلہ سے اتنی محبت کرنے لگی تھی کہ اس کی حقیقی اولاد بھی نہ کرتی ہوگی۔ وہ آرکادیو اور اماراتا کو بھائی بہن، اور یلیانو کو چاچا، اور حوزے آرکادیو بونڈیا کو نانا کہہ کر پکارتی۔ اور اس طرح آخر کار دوسروں کی طرح، وہ ریکا بونڈیا کے نام کی مستحق ہوئی، وہ نام جس کو اس نے اپنی موت تک وقار کے ساتھ برقرار رکھا۔

ان دنوں جب ریکا کو مٹی کھانے کی عادت سے چھٹکارا دلا کر اسے دوسرے بچوں کے کمرے میں لایا جانے لگا تھا، ایک رات مقامی انڈین عورت کی، جو بچوں کے ساتھ سوتی تھی، اتفاق سے آنکھ کھل گئی، اور اسے کونے سے ایک عجیب و غریب آواز وقفے وقفے سے اٹھتی سنائی دی۔ وہ تنویش سے اٹھ بیٹھی، یہ سوچتے ہوئے کہ شاید کمرے میں کوئی جانور گھس آیا ہے، اور تب اس نے ریکا کو آرام کرسی میں بیٹھے ہوئے پایا۔ وہ انگوٹھا چوس رہی تھی اور اندھیرے میں اس کی آنکھیں بلی کی آنکھوں طرح چمک رہی تھیں۔ دہشت زدہ، اپنی تقدیر سے بار کر، ویزنٹاسیون نے ان آنکھوں میں اُس سیرامی کی علامات پہچان لیں جس کے اندیشے نے اسے اور اس کے بھائی کو ہمیشہ کے لیے اس قدیم سلطنت سے، جس کے وہ شہزادہ شہزادی تھے، جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ بے خوابی کی وبا تھی۔

مقامی انڈین، کا تورے، صبح تک گھر چھوڑ کر جا چکا تھا۔ اس کی بہن وہیں رہی، کیوں کہ اس

کے تقدیر پرست دل نے اس کو بتا دیا تھا کہ وہ جان لیوا بیماری دنیا کے آخری کوٹنے تک اس کا پیچھا نہ چھوڑے گی۔ کوئی ویزنٹاسیوں کے خوف کو نہ سمجھ پایا۔ "اگر ہم کبھی نہ سو سکیں تو بہت اچھا ہو،" حوزے آرکادیو بونڈیا نے ازراہ مذاق کہا، "اس طرح ہم زندگی سے زیادہ حاصل کر سکتے ہیں۔" لیکن مقامی عورت نے سمجھایا کہ اس بیماری کا سب سے خوفناک پہلو یہ نہیں کہ نیند کا آنا ناممکن ہو جاتا ہے، کیوں کہ جسم کو ٹھنک کا احساس ہی نہیں ہوتا، بلکہ اس کا رفتہ رفتہ، بے رحمی سے، ایک خطرناک مظہر کی جانب بڑھنا ہے، اور وہ ہے: یادداشت کی گم شدگی۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب اس بیماری میں مبتلا آدمی اپنی بے خوابی کا عادی ہو جاتا، تو بچپن کے واقعات کی یادیں اس کے ذہن سے مٹنے لگتیں، اور پھر اشیا کے نام اور تصورات موم ہو جاتے، اور بالآخر لوگوں کی شناخت، یہاں تک کہ خود اپنی ذات کی آگہی بھی باقی رہتی، یہاں تک کہ وہ حماقت کی ایک ایسی کیفیت میں ڈوب جاتا جس کا کوئی ماضی نہ ہوتا۔ حوزے آرکادیو بونڈیا نے، جس کا ہنستہ ہنستہ دم ٹھنکے لگا، سوچا کہ یہ مقامی لوگوں کے توہمات کی ایجاد کردہ بیماریوں میں سے ایک ہے، لیکن ارسلانے احتیاط کے طور پر ریکا کو بچوں سے علیحدہ کر دیا۔

چند ہفتوں بعد جب ویزنٹاسیوں کی دہشت کم ہو چلی تھی، حوزے آرکادیو بونڈیا نے خود کو بستر پر کروٹیں بدلتے پایا، اس کو کسی طرح نیند نہیں آ رہی تھی۔ ارسلانے، جو خود بھی جاگ اٹھی تھی، اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے، اور اس نے جواب دیا: "میں پھر پروڈانسیو اگولیلار کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوتے، لیکن دوسرے دن خود کو اتنا ہشاش بشاش محسوس کر رہے تھے کہ انہیں یاد ہی نہ رہا کہ ان کی رات کتنی بُری طرح گزری ہے۔ اور یلیانو نے دوپہر کے کھانے کے وقت اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ وہ خود کو بستر محسوس کر رہا ہے، اس کے باوجود کہ اس نے پوری رات تجربہ گاہ میں ایک بروچ پر سونے کا پانی چڑھانے میں گزارا تھا جو وہ ارسلانے کی سالگرہ پر دینا چاہتا تھا۔ انہیں کوئی تھویش نہ ہوئی، حتیٰ کہ تیسرے دن جب کسی کو رات میں نیند نہ آئی تو انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ وہ پچاس گھنٹوں سے زیادہ وقت سوتے بغیر گزار چکے ہیں۔

"بچے بھی جاگ رہے ہیں،" مقامی عورت نے تقدیر پرستانہ وثوق سے کہا۔ "ایک دفعہ یہ گھر میں داخل ہو جائے تو اس وبا سے کوئی نہیں بچ سکتا۔"

وہ واقعی بے خوابی کی وبا کا شکار ہو گئے تھے۔ ارسلانے، جس نے اپنی ماں سے جڑی بوٹیوں کی طبی خاصیتوں کے بارے میں سیکھا تھا، گل تاج ملک کشید کر کے سب کو پلایا، لیکن انہیں پھر بھی نیند نہ آئی اور وہ تمام رات کھڑے خواب دیکھتے رہے۔ فریبِ نظر کی اس تابندگی میں انہیں نہ

صرف اپنے خوابوں کی شبیہیں نظر آئیں، بلکہ ان میں سے کچھ کو وہ شبیہیں بھی دکھائی دیں جو دوسروں نے خواب میں دیکھی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے گھر ممانوں سے بھر گیا ہو۔ باورچی خانے کے ایک کونے میں، اپنی جھولنے والی کرسی میں بیٹھے بیٹھے رہیٹا نے دیکھا کہ ایک آدمی جو بالکل اس کا ہم شکل نظر آتا ہے، سفید کپڑوں میں ملبوس ہے اور جس کی قمیص کا کار سونے کے بیٹن سے بند ہے، اس کے لیے گلابوں کا ایک دستہ لیے آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ نازک ہاتھوں والی ایک عورت تھی جس نے گلدستے سے ایک گلاب نکال کر بیٹی کے بالوں میں لگایا۔ ارسلان سمجھ گئی کہ وہ مرد اور عورت رہیٹا کے والدین ہیں، گو کہ رہیٹا نے انہیں پہچاننے کی بڑی کوشش کی، وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اس نے ان لوگوں کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اس دوران، ایک لغزش کے تحت جس کے لیے حوزے آرکادیو بوندیا نے خود کو کبھی معاف نہ کیا، گھر میں بننے والے شکر کے جانور قصبے بھر میں اسی طرح چلتے رہے۔ بچے اور بڑے مزے لے لے کر بے خوابی کے ننھے ننھے ہرے مرغ۔ بے خوابی کی لطیف گلابی مچھلیاں، اور بے خوابی کے نازک پیلے گھوڑے چوستے رہے، لہذا سوموار کی صبح پورے قصبے کو جاگتے پایا گیا۔ شروع شروع میں کسی کو تردد نہ ہوا۔ بلکہ وہ نیند نہ آنے پر خوش تھے، کیوں کہ ان دنوں ماکوندو میں اتنا کچھ کرنے کو تھا کہ وقت بمشکل ہی پرتا۔ وہ اتنی محنت کرتے تھے کہ جلد ہی کرنے کو کچھ نہ رہ گیا، اور وہ صبح تین بجے ہاتھ پر ہاتھ دھرے گھڑیوں کا والز سننے پائے جاتے۔ وہ لوگ جو سونا چاہتے تھے، ممکن کی وجہ سے نہیں بلکہ خوابوں کی آرزو میں، انہوں نے خود کو تھکانے کے تمام حربے استعمال کر ڈالے۔ وہ اکٹھے بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کیا کرتے، ایک ہی لطیفہ بار بار دوہراتے، خسی مرغ کی کہانی کو ابتری کی آخری حدوں تک گنجلک کرتے، جو ایک کبھی نہ ختم ہونے والا کھیل تھا، اور جس میں کہانی سنانے والا پوچھتا کہ آیا انہیں خسی مرغ کی کہانی سننی ہے، اگر وہ کہتے "ہاں"، تو داستان گو کہتا کہ اس نے ان سے ہاں کہنے کے لیے نہیں کہا تھا بلکہ یہ پوچھا تھا کہ وہ خسی مرغ کی کہانی سننا چاہتے ہیں یا نہیں، اگر وہ کہتے "نہیں"، تو داستان گو کہتا کہ اس نے ان سے نہیں کہنے کو نہیں کہا تھا بلکہ یہ سوال کیا تھا کہ آیا وہ چاہتے ہیں کہ انہیں خسی مرغ کی کہانی سنائی جائے، اور اگر وہ خاموش ہو جاتے تو داستان گو کہتا کہ اس نے ان سے خاموش رہنے کو نہیں کہا تھا بلکہ پوچھا تھا کہ کیا وہ چاہتے ہیں کہ انہیں خسی مرغ کی کہانی سنائی جائے، اور کوئی اٹھ کے نہ جاسکتا تھا کیوں کہ داستان گو کہتا کہ اس نے ان سے جانے کو نہیں کہا تھا بلکہ یہ پوچھا تھا کہ آیا وہ خسی مرغ کی کہانی سننا چاہتے ہیں، وغیرہ وغیرہ اس طرح وہ ایک لاناصل دائرے میں تمام رات گھومتے رہتے۔

جب حوزے آرکادیو بوندیا کو احساس ہوا کہ قصبے پر وبا کا حملہ ہو چکا ہے تو اس نے

خاندانوں کے سربراہوں کو اکٹھا کیا، اور جو کچھ وہ بے خوابی کے مرض کے بارے میں جانتا تھا انہیں بتایا، اور انہوں نے ویا کو دلہلی علاقے کے دوسرے قصبوں میں پھیلنے سے روکنے کے لیے اقدامات طے کیے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے بکریوں کے گلے سے گھنٹیاں اتار لیں جو عربوں نے انہیں تو توتوں کے مول دی تھیں، اور ان گھنٹیوں کو قصبے میں داخل ہونے والی راہگزر پر ان لوگوں کے لیے رکھ دیا جو سنتریوں کی منت سماجت سے باز نہ آتے، اور قصبے میں داخل ہونے کے لیے بضد رہتے۔ تمام اجنبیوں کو، جو ان دنوں ماکوندو کی گلیوں سے گزرتے، یہ گھنٹیاں بجانی پڑتیں، تاکہ بیماروں کو علم ہو سکے کہ وہ صحت مند لوگ ہیں۔ اپنے قیام کے دوران انہیں کھانے پینے کی اجازت نہ تھی، کیوں کہ اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ بیماری کے جراثیم منہ کے ذریعے پھیلتے ہیں، اور تمام کھانے پینے کی اشیاء بے خوابی کے اثرات کی زد میں آچکی ہیں۔ اس طرح انہوں نے وبا کو قصبے تک محدود رکھا۔ یہ قریضہ اتنا موثر ثابت ہوا کہ ان ناگہانی حالات کو ایک فطری چیز سمجھ کر قبول کر لیا گیا، اور زندگی کو اس طرح منظم کیا گیا کہ کام کاج کی رفتار معمول پر آگئی، اور لوگوں نے نیند کی بے کار عادت کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔

یہ اور یلیانو تھا جس نے وہ نسخہ دریافت کیا جو ان کی یادداشت کو گم ہونے سے کئی مہینے تک محفوظ رکھنے والا تھا۔ اس کو یہ نسخہ اتفاق سے معلوم ہوا۔ ایک ماہر بے خواب ہونے کی وجہ سے، کیوں کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں سب سے پہلے یہ بیماری لاحق ہوئی تھی، اس نے چاندی کے کام میں تکمیل کی حد تک مہارت حاصل کر لی تھی۔ ایک دن وہ چھوٹا سندان تلاش کر رہا تھا جسے وہ دعات پر ملمع چڑھانے کے لیے استعمال کیا کرتا تھا، اور اسے اس اوزار کا نام یاد نہ آ سکا۔ اس کے باپ نے اسے بتایا: ”دست“۔ اور یلیانو نے کانڈ کے چھوٹے سے پرزے پر یہ نام لکھا، اور اسے سندان کے پیندے سے چپکا دیا: ”دست“۔ اسے یقین تھا کہ اس طرح وہ آئندہ یہ لفظ نہ بھولے گا۔ اس کو اس بات کا خیال نہ آیا، کیوں کہ اس شے کا نام کافی مشکل تھا، کہ یہ یادداشت گم ہونے کی پہلی علامت ہے۔ لیکن کچھ دنوں بعد اسے احساس ہوا کہ تجربہ گاہ میں رکھی ہوئی تقریباً تمام چیزوں کے نام یاد رکھنے میں اسے دشواری ہو رہی ہے۔ تب اس نے تمام اشیاء پر ان کے نام لکھ کر لگا دیے، تاکہ وہ لکھے ہوئے نام پڑھ کر انہیں شناخت کر سکے۔ جب اس کے باپ نے اپنے بچپن کے قابل ذکر ترین واقعات بھی ذہن سے جاتے رہنے پر تنویش کا اظہار کیا، تو اور یلیانو نے اسے اپنا طریقہ بتایا، اور حوزے آرکادیو بوئندیا نے پہلے اسے گھر بھر میں رائج کیا، اور پھر تمام گاؤں میں نافذ کر دیا۔ برش کو سیاہی میں ڈبو کر اس نے تمام اشیاء پر ان کے نام لکھ دیے: میز، کرسی، گھر ٹی، دروازہ، دیوار، بستر، برتن۔ وہ جانوروں کے بارے میں گیا، اور جانوروں اور پودوں پر نام لکھے:

گائے، بکری، سور، مرغی، کساوا، کلود، سم، کیلا۔ رفتہ رفتہ مٹی ہوئی یادداشت کے لامتناہی امکانات پر غور کرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ دن آسکتا ہے جب لوگ جیمنوں کو ان پر لکھے ناموں کی مدد سے پہچان لیں، لیکن ان کا استعمال انہیں یاد نہ رہے۔ تب وہ زیادہ وضاحت سے کام لینے لگا۔ وہ تمنی جو اس نے گائے کی گردن میں لٹائی، اس تدبیر کی عمدہ مثال تھی جس سے ماکوندو کے باشندوں نے حافظے کے زوال کے خلاف جنگ کے لیے خود کو لیس کیا: "یہ گائے ہے۔ اس کو ہر صبح دوہنا ہے تاکہ یہ دودھ پیدا کرتی رہے، اور دودھ کو پالنا ہے تاکہ کافی میں ملا کر دودھ کافی بنائی جا سکے۔" اس طرح وہ ایسی حقیقت میں راکھے جو ان کے ہاتھوں سے پمپسٹی جارہی تھی، وقتی طور پر الفاظ کے ذریعے گرفت میں لائی ہوئی حقیقت، لیکن جسے لکھے الفاظ کی قدر فراموش ہونے پر ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جانا تھا۔

اس راہگزر کے آغاز پر، جو دلدلی علاقے کو ٹھکتی تھی، انہوں نے "ماکوندو" کی تمنی لگا دی، اور ایک بڑی سی تمنی شاہراہ عام پر نصب کر دی، جس پر لکھا تھا: "خدا ہے۔" تمام گھروں میں اشیاء اور احساسات کو یاد رکھنے کے لیے شرحیں تیار کر لی گئی تھیں۔ لیکن وہ نظام اتنی ہوشیاری اور اخلاقی قوت کا متقاضی تھا کہ بہت سے لوگ خیالی حقیقت کے طلسم سے زیر ہو گئے، اپنی گھڑی ہوئی حقیقت جو ان کے لیے عملی کم، لیکن آرام دہ زیادہ تھی۔ پیلاز ترینرا وہ ہستی تھی جس کا اس پنہاں سازی کو مقبول کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ تھا۔ اس کو تاش کے پتوں سے ماضی پڑھنے کی ترکیب سوچی، جس طرح وہ پہلے مستقبل دیکھا کرتی تھی۔ اس ترکیب کی بدولت بے خوابی کے شکار لوگ ایک ایسی دنیا میں رہنے لگے جس کی بنیاد تاش کے پتوں کے غیر یقینی متبادل پر تھی، جہاں ایک باپ کو مبسم طور پر ایک ایسے سانولے آدمی کی صورت یاد کیا جاتا جو اپریل کے اوائل میں آیا تھا، اور ماں کو صرف ایک ایسی سانولی عورت کے روپ میں جس نے اپنے بائیں ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی پہن رکھی تھی، اور جہاں جنم دن اس پچھلے مسئلے تک محدود ہو گیا جب برگ غار کے درخت پر چاکوک چھپایا تھا۔ دل ہلانے کے ان طریقوں سے شکست کھا کر حوزے آرکادیو بونڈیا نے یادداشت کی مشین بنانے کی ٹٹائی، جس کی اس نے کبھی تنہا کی تھی تاکہ خانہ بدوشوں کی شاندار ایجادات کو یاد رکھ سکے۔ یہ کل، انسان کی تمام زندگی میں حاصل کیے گئے علم پر، ہر صبح، شروع سے آخر تک نظر ڈالنے کے امکان پر مبنی تھی۔ حوزے آرکادیو بونڈیا نے اس کا تصور ایک چرخہ نما لغت کے طور پر کیا تھا، جس کو محور پر رکھ کر دستے کے ذریعے چلایا جاسکے، اور اس طرح، زندگی کے سب سے ضروری تصورات، ہر چند گھنٹوں بعد، اس کی آنکھوں کے سامنے آسکیں۔ وہ تقریباً چودہ ہزار اندراجات کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا، جب دلدلی علاقے والی راہگزر سے ایک عجیب

وغریب طبع کا آدمی بے خوانی سے محفوظ لوگوں کی غناک گھنٹی کے ساتھ نمودار ہوا، جس نے رسی سے بندھا ایک بھولا ہوا سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا، اور کالے کپڑے سے ڈھکے ایک ٹھیلے کو کھینچتا ہوا لا رہا تھا۔ وہ سیدھا حوزے آرکا دیو بوندیا کے گھر پہنچا۔

ویرنٹاسیوں نے اسے نہ پہچانا جب اس نے دروازہ کھولا، اور اس نے سوچا شاید وہ کچھ دینے کے ارادے سے آیا ہے، اس بات سے بے خبر کہ اس قصبے میں، جو فراموشی کی دلدل میں ہمیشہ کے لیے دھنسا جا رہا ہے، کوئی چیز نہیں بچی جاسکتی۔ وہ ایک پیر فرتوت تھا۔ اس کی آواز بے انتہائی سے شکستہ تھی، اور اس کے ہاتھ لگتا تھا جیسے اشیا کے وجود پر شبہ کرنے لگے ہوں، مگر یہ بات واضح تھی کہ وہ ایک ایسی دنیا سے آ رہا ہے جہاں لوگ اب تک سو سکتے ہیں، اور یاد رکھ سکتے ہیں۔ حوزے آرکا دیو بوندیا نے اسے بیٹھک میں پایا، جہاں وہ بیٹھا اپنے پیوند لگے کالے بیٹ سے ہوا جمل رہا تھا، اور ایک دردمند توجہ کے ساتھ دیوار پر چسپاں ناموں اور علامتوں کو پڑھ رہا تھا۔ حوزے آرکا دیو بوندیا نے گرم جوشی کے کھلے مظاہرے کے ساتھ اس کا استقبال کیا، اس بات پر فخر مند کہ وہ کسی زمانے میں اسے جانتا تھا اور اب پہچان نہیں پا رہا۔ لیکن ملاقاتی کو اس بناوٹی شیفنگی کا احساس ہو چکا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اسے بھلایا جا چکا ہے، دل کے ناقابل علاج نسیان سے نہیں بلکہ ایک مختلف فراموشی سے، جو زیادہ ظالمانہ اور کبھی نہ ختم ہونے والی تھی، اور جس سے وہ اچھی طرح واقف تھا کیوں کہ وہ موت کی فراموشی تھی۔ تب وہ جان گیا۔ اس نے سوٹ کیس کھولا، جو سمجھ میں نہ آنے والی اشیا سے بھرا ہوا تھا، اور اس میں سے ایک چھوٹی سی بیٹی نکالی جس میں بہت ساری بوتلیں تھیں۔ اس نے حوزے آرکا دیو بوندیا کو ایک بلکی رنگت والا مائع پینے کو دیا، اور اس کی یادداشت کے مقصدی جل اٹھے۔ اس سے پہلے کہ وہ خود کو ایک احمقانہ بیٹھک میں پاتا جہاں اشیا پر نشان لگے ہوئے تھے، اس سے پہلے کہ وہ دیواروں پر لکھی سنجیدہ بکواس پر شرمندہ ہوتا، اور اس سے پہلے کہ وہ آنے والے کو ایک تابناک مسرت کے ساتھ پہچانتا، اس کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ آنے والا ملک یاد دہس تھا۔

جب تمام ماکوندو یادداشت کے واپس آنے کا جشن منا رہا تھا، حوزے آرکا دیو بوندیا اور ملک یاد دہس نے اپنی پرانی دوستی پر پڑی گرد جھاڑی۔ خانہ بدوش قصبے میں ٹھہرنے پر مائل تھا۔ وہ حقیقتاً موت کے منہ میں جا چکا تھا، لیکن اس لیے واپس آ گیا کہ اس سے تنہائی برداشت نہ ہوئی۔ قبیلے سے باہر نکال دیے جانے کے بعد، اپنی تمام مافوق الفطرت صلاحیتوں کو زندگی سے وفاداری کے سبب کھود دینے کے بعد، اس نے دنیا کے اس کونے میں پناہ لینے کا فیصلہ کیا جسے موت اب تک نہ ڈھونڈ پاتی تھی، اور خود کو ڈگریوٹا پ سے تصور اتارنے کی ایک تجربہ گاہ کے کام پر مامور

کر دیا۔ حوزے آرکادیو بوندیا نے اس ایجاد کے بارے میں اب تک نہ سنا تھا، لیکن جب اس نے خود کو اور پورے خاندان کو قزح رنگی دھات کے پترے پر ابد تک کے لیے نقش کیا ہوا پایا، وہ بدحواسی سے لنگ رہ گیا۔ وہ تاریخ تھی اُس رنگ آلود ڈیگروٹا سب تصویر کی، جس میں حوزے آرکادیو بوندیا اپنے سرمئی کھڑے بالوں کے ساتھ نظر آتا تھا، اس کے گلف وار کالر کانسی کے بٹن سے قمیص سے جڑے موٹے تھے اور چہرے پر ایک حیران کن سنجیدگی تھی، جس پر ارسلانے ہنسی سے دوہرا ہوتے ہوئے اسے "خوفزدہ جرنیل" کا نام دیا تھا۔ دسمبر کی اُس ٹھہری ہوئی صبح، جب تصویر اتاری گئی، حوزے آرکادیو بوندیا واقعی خوفزدہ تھا، کیوں کہ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ لوگ رفتہ رفتہ بڑھے ہوتے جائیں گے جبکہ اس کی شبیہ دھات کے اس پترے پر ہمیشہ کے لیے محفوظ رہ جائے گی۔ رواج کی ایک انوکھی کایا کھپ میں، یہ ارسلان تھی جس نے حوزے آرکادیو بوندیا کے ذہن سے یہ خیال نکالا، اور وہی تھی جس نے پرانی تلقی کو بجلا کر یہ فیصلہ کیا کہ ملکیدا یس اس گھر میں ٹھہرے، گو کہ اس نے کبھی اپنی تصویر اتارنے کی اجازت نہ دی، کیوں کہ (بقول خود اس کے) وہ اپنے پڑپوتوں کی ہنسی کا سامان بننا نہ چاہتی تھی۔ اس صبح اس نے بچوں کو بہترین لباس پہنائے، چہروں پر پوڈر لگایا، اور ہر سچے کو ایک ایک چمچا شربت مغز پلایا تاکہ وہ تصویر اتروانے کے لیے ملکیدا یس کے انوکھے کمرے کے سامنے دو منٹ بالکل ساکت رہیں۔ اس خاندانی ڈیگروٹا سب میں، جو اپنی نوعیت کی واحد تصویر تھی، اور یلیا نو سیاد فمیل میں ملیوس، امارانا اور ریکا کے درمیان نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی افسردگی اور روشن بینی کی کیفیت تھی، جس کے ساتھ وہ بہت برسوں بعد فارنگ اسکواڈ کا سامنا کرنے والا تھا۔ لیکن اُس وقت تک اسے اپنی تقدیر کے بارے میں پیش آنکھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ ایک ماہر نقرہ کار تھا، جس کے کام کی نزاکت کی تعریف تمام دلدلی خطے میں ہوتی تھی۔ اُس کارگاہ میں، جس میں ملکیدا یس کی جنونی تجربہ گاہ بھی واقع تھی، اس کے سانس لینے کی آواز بھی بمشکل سنائی دیتی۔ یوں لگتا جیسے اور یلیا نو نے کسی دوسرے زمانے میں پناہ لے رکھی ہو، جب کہ اس کا باپ اور ملکیدا یس، بوتلوں اور طشتوں کے شور، تیزاب بھجکنے اور پارے کے ہر لمحے لٹکی کے ہر ٹھم اور ہر بل پر گم ہونے کے حادثات کے درمیان، چلا چلا کر ناسترا دیس کی پیش گوئیوں کی تشریح کیا کرتے۔ اس سپردگی اور فیصلے کی عمدگی نے، جس سے وہ اپنی توجہ کام پر مرکوز رکھتا، اور یلیا نو کو اس قابل کر دیا کہ کم وقت میں وہ اس سے کہیں زیادہ پیسہ کما لے جتنا کہ ارسلان اپنے لذیذ شکر کے جانور بنا کر کھایا کرتی تھی، لیکن ہر ایک کو یہ بات عجیب لگتی تھی کہ بالغ ہونے کے باوجود اس نے آج تک کسی عورت کو نہ جانا تھا۔ یہ سچ تھا کہ وہ کبھی کسی عورت کے پاس نہ گیا تھا۔

چند ماہ بعد مرد بچے: سِکو کی واپسی دیکھی گئی، ایک آوارہ گرد جو تقریباً دو سو سال کا بوڑھا تھا، اور جو اکثر اپنے بنائے ہوئے نفعے گاتا ہوا ماکوندو سے گزرتا۔ ان نفعوں میں مرد بچہ فرانسکو بڑی تفصیل کے ساتھ ان تمام گاؤں میں ہونے والے واقعات سناتا جو ماکوندو سے لے کر دلدل کے آخری سرے تک واقع تھے، تاکہ اگر کسی کو کہیں کوئی پیغام بھیجنا ہو، یا کسی واقعے کی تشریح کرنی ہو، تو وہ اس کو دو سٹکے دے کر اس کے نفعوں کی پٹاری میں شامل کروادے۔ اسی طریقے سے ارسلو کو اپنی ماں کی موت کا علم ہوا، کیوں کہ وہ یہ نفعے اس امید میں سنا کرتی تھی کہ شاید ان میں اس کے بیٹے حوزے آرکادیو کی کوئی خبر ملے۔ مرد بچہ فرانسکو، جسے یہ نام اس لیے دیا گیا تھا کہ ایک دفعہ اس نے شیطان کو بدیسہ گوئی کے مقابلے میں شکست دی تھی، اور جس کا اصل نام کسی کو معلوم نہ تھا، بے خوابی کی وبا کے دنوں میں ماکوندو سے غائب ہو گیا تھا، اور ایک رات اپنا تک کاتارینو کی دکان میں پھر نمودار ہوا۔ پورے گاؤں کے لوگ اس کے نفعے سننے کے لیے گئے، یہ جاننے کے لیے کہ دنیا میں کیا واقعات پیش آئے ہیں۔ اس دفعہ اس کے ساتھ ایک عورت بھی آئی تھی، جو اتنی فریادیں کرتی تھی کہ چار مقامی انڈین اس کو ایک جھولنے والی کرسی میں اٹھا کر چلتے تھے، اور اس کے ساتھ کھوئی کھوئی آنکھوں والی ایک نو خیز ملا تو لڑکی تھی، جو ایک چستری اٹھائے عورت کو دھوپ سے بچائے رکھتی تھی۔ اور یلیانو اس رات کاتارینو کی دکان پر گیا۔ اس نے مرد بچے فرانسکو کو تماشاٹیوں کے دائرے کے بیچ ایک لمبے لمبے گریٹ کی مانند بیٹھا پایا۔ وہ اپنی بوسیدہ، بے سُری آواز میں خبروں بھرے نفعے گاربا تھا، اس کے پاس وہی قدیم کارڈین تھا جو سرواٹر ریلے نے اسے گیانا میں دیا تھا، اور وہ اپنے آنکھ چلنے والے پیروں سے، جو شور سے چٹخ گئے تھے، تال دے رہا تھا۔ دکان کے عقب میں ایک دروازہ تھا جس میں سے لوگ آ جا رہے تھے، اور جس کے سامنے جھولنے والی کرسی میں رئیس خاموشی سے بیٹھی خود کو پنکھا چل رہی تھی۔ کاتارینو، کان کے پیچھے ایک مصنوعی گلاب اٹھائے، مجمع میں گنے کی شراب مگ میں بیچ رہا تھا، اور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ مردوں کے قریب جاتا اور ان پر وہاں ہاتھ رکھتا جہاں نہیں رکھنا چاہیے۔ آدھی رات تک گرمی ناقابل برداشت ہو گئی۔ اور یلیانو نے بغیر دھیان دیے آخر تک خبریں سنیں، اور اسے کوئی ایسی خبر نہ ملی جو اس کے خاندان کے لیے دل چسپی کا باعث ہو۔ وہ گھر جانے کے لیے اٹھ ہی رہا تھا کہ فریادیں نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"تم بھی اندر جاؤ،" اس نے اور یلیانو سے کہا۔ "صرف بیس پیدو لگیں گے۔"

اور یلیانو نے رئیس کی گود میں دھری ٹوکری میں ایک سکہ پیدھا، اور بغیر سوچے سمجھے کمرے میں چلا گیا۔ نوبالغ ملا تو لڑکی، جس کے چھوٹے چھوٹے سر پرستان کتیا کے سے تھے، بستر پر عریاں

لیٹی تھی۔ اور یلیانو سے پہلے تریسٹ آدمی اس رات اس کمرے سے گزرے تھے۔ کمرے کی کثیف فضا، پسینے اور آہوں میں گندھی ہوئی، کپڑوں میں بدلنے لگی تھی۔ لڑکی نے ٹرچادر اٹھائی، اور اور یلیانو سے اسے ایک طرف سے پکڑنے کو کہا۔ چادر کینوس کے ٹکڑے کی طرح بیماری ہو رہی تھی۔ انھوں نے اس کے سرے مروڑ کر اسے نیوڑا، یہاں تک کہ وہ اپنی اصل حالت پر واپس آگئی۔ انھوں نے درمی کو اٹھایا اور دوسری طرف سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ اور یلیانو فکر مند تھا، اس کی خواہش تھی کہ یہ کام کبھی ختم نہ ہو۔ وہ نظریاتی طور پر محبت کے عمل سے واقف تھا، لیکن اس کے گھٹنے جواب دے رہے تھے، اور گو کہ اس کی جلتی ہوئی کھال کا ایک ایک رُواں کھڑا ہو چکا تھا، وہ اپنی آستوں کے بوجھ کو خارج کرنے کی فوری طلب کی مزاحمت نہ کر پا رہا تھا۔ جب لڑکی بستر درست کر چکی اور اس نے اور یلیانو سے کپڑے اتارنے کو کہا، اس نے ایک بوکھلائی ہوئی توجیہ پیش کی: "انھوں نے مجھے اندر بھیجا تھا۔ انھوں نے مجھ سے بیس پیسو بچھیننے کو، اور جلدی کرنے کو کہا تھا۔" لڑکی اس کی سراسیمگی کو سمجھ گئی۔ "اگر تم جاتے وقت بیس پیسو اور ڈالٹے جاؤ، تو تم کچھ دیر اور یہاں ٹھہر سکتے ہو،" اس نے نرمی سے کہا۔ اور یلیانو نے کپڑے اتار دیے، شرم کی اذیت میں گرفتار، وہ اس خیال سے چھٹکارا حاصل کرنے میں ناکام رہا کہ اس کی برہمنگی اس کے بھائی کے مقابلے کی نہیں ہو سکتی۔ لڑکی کی کوششوں کے باوجود اس نے خود کو بے حد تنہا اور لاتعلقی محسوس کیا۔ "میں بیس پیسو اور ڈال دوں گا،" اس نے سُنی آواز میں کہا۔ لڑکی نے خاموشی سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی پیٹھ تلخ تھی۔ اس کی کھال بڑیوں سے منڈھی ہوئی تھی، اور وہ کوشش کر کے سانس کھینچتی تھی، کیوں کہ وہ ناقابلِ بیان حد تک منڈھال تھی۔ دو سال پہلے، وہاں سے بہت دور، وہ شمع بجائے بغیر سو گئی تھی، اور جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو شعلوں میں گھرا پایا تھا۔ وہ گھر، جہاں وہ اپنی دادی کے ساتھ رہتی تھی، جس نے اسے پالا تھا، جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد سے اس کی دادی اسے قصبے قصبے لیے پھر رہی تھی، بیس بیس پیسو کے عوض اسے بستر پر لٹاتی، تاکہ جلد ہوئے گھر کی مالیت کے نقصان کی تلافی ہو سکے۔ لڑکی کے حساب کے مطابق اس کو دس سال مزید، ہر رات شرمروں کے ساتھ لیٹنا تھا، کیوں کہ اسے اپنے اور دادی کے سفر اور کھانے کا خرچ بھی اٹھانا تھا اور ان چار مقامیوں کی تنخواہ بھی دینی تھی جو کرسی اٹھا کر چلنے کے کام پر مامور تھے۔ جب رئیس نے دوسری دفعہ دروازہ کھٹکھٹایا تو اور یلیانو، بغیر کچھ کیے، رونے کی شدید خواہش سے پریشان، کمرے سے نکل آیا۔ اس رات وہ سو نہ سکا، آرزو اور رحم کے طے جلد جذبات کے ساتھ لڑکی کے متعلق سوچتا رہا۔ اسے لڑکی سے محبت کرنے، اور اس کی حفاظت کرنے کی ایک ناقابلِ رد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ صبح کے وقت، بے خوابی اور بخار کی ٹنگن میں چُور، اس نے خاموشی

سے فیصلہ کیا کہ وہ اس لڑکی سے شادی کر لے گا، تاکہ اس کو دادی کے چنگل سے آزاد کرا سکے، اور اُن تمام راتوں کی لذتوں سے محظوظ ہو سکے جو وہ شرمزدوں کو بخشی تھی۔ لیکن جب دس بجے صبح وہ کاتارنو کی دکان پر پہنچا تو لڑکی قصبہ چھوڑ کر جا چکی تھی۔

وقت نے رفتہ رفتہ اس دیوانگی کے خیال کو مندل کر دیا، لیکن اس کا احساس محرومی بڑھتا گیا۔ اس نے کام میں پناہ لی۔ اس نے زندگی بھر بغیر عورت کے زندگی گزارنے کی قسمت پر رضا اختیار کر لی، تاکہ اپنے بے کار وجود کی شرم چھپا سکے۔ اس دوران ملکیا دس دھات کے پتروں پر ماکوندو کی ان تمام چیزوں کے عکس اتار چکا تھا جو عکس اتارنے کے قابل تھیں، اور اس نے ڈگریوٹا سَپ کی تجربہ گاہ حوزے آرکادیو بوندیا کے تخیلات کے لیے چھوڑ دی تھی، جس نے اسے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے استعمال میں لانے کی ٹھان لی تھی۔ گھر کے مختلف حصوں میں اتاری گئی تصویروں کو ایک دوسرے پر اتارنے کے پیچیدہ عمل سے، اسے یقین تھا کہ جلد یا بدیر وہ خدا کی تصویر کھینچنے میں کامیاب ہو جائے گا، اگر اس کا وجود ہے، یا پھر ہمیشہ کے لیے خدا کے وجود کے مفروضے کا خاتمہ کر دے گا۔ ملکیا دس ناسترا دس کی پیش گوئیوں کی شرحوں کی گہرائی میں اترا تیرا چلا گیا۔ وہ رات دیر تک جاگتا، اپنی بوسیدہ، نمٹلی واسکٹ میں لمبوس، اپنے چھوٹے چھوٹے چڑیا جیسے ہاتھوں سے لکھتا رہتا، جن کی انگوٹھیوں سے پرانے دنوں کی چمک گم ہو چکی تھی۔ ایک رات اس نے سوچا کہ اس نے ماکوندو کے مستقبل کی پیش گوئی پالی ہے۔ یہ ایک روشن شہر ہو گا، شیشے کے بڑے بڑے گھروں پر مشتمل، جہاں بوندیا نسل کا نام و نشان تک باقی نہ ہو گا۔ "یہ غلط ہے،" حوزے آرکادیو بوندیا گرجا۔ "وہ شیشے کے نہیں بلکہ برف کے گھر ہوں گے، جیسا کہ میں نے خواب میں دیکھا تھا، اور یہاں ایک بوندیا ہمیشہ رہے گا۔" اس سلا اس بے اعتدال گھر میں ہوش و حواس اور شعور کی فضا قائم رکھنے کی کوشش کرتی رہی، شکر کی ٹافیوں کے کاروبار کو ایک تنور کے ذریعے وسیع کر کے، جو تمام رات گرم رہتا، اور جس میں سے ٹوکریاں بھر ڈبل روٹیاں اور انوکھی انواع و اقسام کی پڈینگ اور بسکٹ نکلتے رہتے، جو چند گھنٹوں کے اندر اندر دلدلی خٹے میں پیچ و خم کھاتی گلیوں میں بک جاتے۔ اب وہ عمر کے اس حصے میں پہنچ گئی تھی جب اسے آرام کرنے کا حق پہنچتا تھا، لیکن وہ مزید فعال ہو گئی تھی۔ وہ اپنے پھلتے پھولتے کاروبار میں اتنی مسرور ہو چکی تھی کہ ایک دوپہر جب اس نے بے خیالی میں آگن کی طرف نگاہ اٹھائی، جب مقامی انڈین عورت گندھے ہوئے آٹے میں شکر ملا رہی تھی، تو اس نے دو انجانی، خوبصورت، نو عمر لڑکیوں کو ڈوبتے سورج کی روشنی میں کشیدہ کاری کرتے پایا۔ وہ ربیکا اور امارا تھیں۔ جب سے انھوں نے ماتمی لباس اتارے تھے، جو وہ نانی کی موت کے بعد تین سال تک تن دہی سے پہنتی رہی تھیں، ان کے شوخ رنگارنگ

کپڑوں نے لگتا تھا انہیں دنیا میں ایک خاص مقام دے دیا ہے۔ ربیکا، توقعات کے برخلاف، زیادہ خوب صورت ٹکلی تھی۔ اس کی رنگت گوری تھی، آنکھیں بڑی اور پرسکون، اور جادوئی ہاتھ جو کشیدہ کاری کے نمونے لگتا تھا نظر نہ آنے والے دھاگوں سے کاٹھڑ رہے ہیں۔ امارانا، جو اس سے چھوٹی تھی، نسبتاً کم پُروقتار تھی، لیکن اسے اپنی مرحوم نانی کا فطری امتیاز اور اندرونی استحکام حاصل تھا۔ آرکادیو، جو اگرچہ ابھی سے اپنے باپ کی سی جسمانی قشور نما کا مظہر تھا، ان کے سامنے بچہ سا نظر آتا تھا۔ وہ اور یلیا نو سے چاندی کا کام سیکھنے میں جُٹ گیا تھا، جس نے اسے پڑھنا لکھنا بھی سکھایا تھا۔

ارسلانے اپنا کم ماموس کیا کہ گھر لوگوں سے بھر گیا ہے، اور اس کے بچے شادی کرنے اور اپنے بچے پیدا کرنے کے قابل ہو گئے ہیں، اور ان کو جگہ کی کمی کے باعث تتر بتر ہونا پڑے گا۔ پھر اس نے وہ پیسے نکالے جو اس نے طویل برسوں میں کڑی محنت سے جمع کیے تھے، اور اپنے کچھ گاہکوں کے ساتھ انتظامات کر کے گھر کو بڑا کرنے کے کام کا بیڑا اٹھایا۔ اس نے ملاقاتیوں کے بیٹھنے کے لیے ایک بڑا دیوان خانہ بنوایا، اور روزمرہ کے استعمال کے لیے ایک آؤر بیٹھک، جو زیادہ آرام دہ اور ٹھنڈی تھی؛ ایک کھانے کا کمرہ، جس میں بارہ کرسیوں والی میز لگوائی تاکہ گھر کے تمام افراد اپنے مہمانوں سمیت آگئے بیٹھ سکیں؛ نو کمرے، جن کی کچھ کھیاں آنگن میں کھلتی تھیں؛ اور ایک لمبی سی ڈیوڑھی جسے گلاب کے ایک باغ کے ذریعے دوپہر کی گرمی سے محفوظ کیا گیا تھا؛ باغ میں فون اور بیگونیہ کے گھلے رکھنے کے لیے احاطہ لگایا گیا۔ ارسلانے باورچی خانہ بڑا کروایا تاکہ اس میں دو تنور آسکیں۔ وہ گودام جہاں پیار ترنیرا نے حوزے آرکادیو کا مستقبل بڑھا تھا، توڑا گیا اور اس سے دگنا بڑا گودام تعمیر کرایا گیا، تاکہ گھر میں کھانے پینے کی اشیا کی کبھی قلت نہ ہو۔ اس نے آنگن میں شاہ بلوط کے درخت کی چھاؤں میں غسل خانہ بنوائے، ایک عورتوں کے لیے، دوسرا مردوں کے لیے؛ اور گھر کے عقب میں ایک بڑا سا اصطبل، باڑھ لگا ہوا مرغی خانہ، بھینسوں کا باڑا، اور ایک جڑیا خانہ، جو چاروں سمت کی ہوا کے لیے کھلا تھا، تاکہ گزرتے ہوئے پرندے وہاں اپنی خوشی سے اندھے بچے دے سکیں۔ درجنوں مستریوں اور بڑھئیوں کو ساتھ لیے لیے، گویا اسے اپنے شوہر کا سا میڈیانی بخار چڑھ گیا ہو، ارسلانہ روشنی اور دھوپ کے مقام طے کرتی، اور حدود کی بغیر جگہ کی تقسیم کرتی پھرتی۔ پرانی عمارت، جو بانیوں نے بنائی تھی، اوزاروں اور سامان تعمیر، اور پسینے میں شرابور، نیکے ہوئے مزدوروں سے بھر گئی، جو ہر ایک سے درخواست کرتے کہ براہ مہربانی ان کے کام میں مداخلت نہ کریں، اور بڈیوں کی اس بوری سے پریشان رہتے جو ایک عملمکن کچھ کھڑا بیٹھ کے ساتھ ان کا پیچھا کرتی۔ اس بے آرامی میں، چو نے اور کوتلار کے دھویں میں سانس لیتے ہوئے، کوئی درست طور پر نہ دیکھ سکتا تھا کہ زمین کے بیٹھ سے یہ گھر کیوں کرا بھر رہا ہے، جو نہ صرف

قصبے کا سب سے بڑا گھر تھا، بلکہ سب سے زیادہ مہمان نواز اور ٹھنڈا گھر جو اس دلدلی خطے میں کبھی پایا گیا ہو۔

حوزے آرکادیو بونڈیا جو اس تمام ہنگامے کے دوران خدا کی قدرت کو حیرت میں ڈالنے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا، واحد شخص تھا جو اس بات کو بالکل نہ سمجھ پایا۔ نیا گھر تقریباً مکمل ہو چکا تھا جب ارسلہ اسے اس کی خیالی دنیا سے کھینچ کر باہر لائی، یہ بتانے کے لیے کہ اسے گھر کے باہر نیلا رنگ کرانے کا حکم دیا گیا ہے، جبکہ وہ سفید رنگ کرانا چاہتی ہے۔ اس نے ایک سرکاری کاغذ نکال کر دکھایا۔ حوزے آرکادیو بونڈیا نے، بغیر سمجھے کہ اس کی بیوی کیا کہہ رہی ہے، کاغذ میں کیے گئے دستخط کو پڑھا۔

"یہ کون شخص ہے؟" اس نے پوچھا۔

"مبٹرٹ،" ارسلہ نے پریشانی کے عالم میں جواب دیا۔ "لوگ کہتے ہیں کہ وہ حکومت کی طرف سے بھیجا گیا یا اختیار الکار ہے۔"

دون اپولینار موسکوٹے، مبٹرٹ، بے حد خاموشی کے ساتھ اکوندو آیا تھا۔ وہ ہوٹل باکوب میں ٹھہرا، جو توتوں کے عوض اشیا دینے والے پہلے عربوں میں سے ایک نے بنایا تھا، اور دوسرے دن اس نے حوزے آرکادیو بونڈیا کے گھر سے دو بلاک دور ایک چھوٹا سا کمرہ کرائے پر لے لیا، جس کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا، اور اس نے ایک میز اور کرسی، جو اس نے ہوٹل باکوب سے خریدی تھی، اس کمرے میں لگائی، کیل سے دیوار پر جموڑیہ کی مہر ٹھونک دی جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا، اور دروازے کے باہر ایک تختی لگا دی: "مبٹرٹ"۔ اس کا پہلا حکم یہ تھا کہ ملک کے یوم آزادی کا جشن منانے کے لیے تمام گھروں کو نیلا رنگ دیا جائے۔ حکم نامے کی نقل ہاتھ میں لیے، حوزے آرکادیو بونڈیا نے مبٹرٹ کو ایک جھولنی میں قیلوہ کرتے پایا جو اس نے اپنے تنگ سے دفتر میں تان رکھی تھی۔ "کیا تم یہ لکھا ہے؟" اس نے مبٹرٹ سے پوچھا۔ دون اپولینار موسکوٹے نے، جو ایک پختہ، شرمیلا، سرخی مائل رنگت والا شخص تھا، اثبات میں جواب دیا۔ "کس حق کے تحت؟" حوزے آرکادیو بونڈیا نے پھر پوچھا۔ دون اپولینار موسکوٹے نے میز کی دراز سے ایک کاغذ نکال کر اسے دکھایا۔ "مجھے اس قصبے کا مبٹرٹ نامزد کیا گیا ہے۔" حوزے آرکادیو بونڈیا نے اس کی تھڑی کے کاغذ کی طرف دیکھا تک نہیں۔

"اس قصبے میں ہم کاغذ کے پُرزوں پر لکھ کر حکم نہیں دیتے ہیں،" وہ تمحل سے بولا۔ "اور تم یہ جان لو، اس وقت، اور ہمیشہ کے لیے، کہ ہمیں کسی جج کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ یہاں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر فیصلہ کرنا پڑے۔"

دون اپولینار موسکوئے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، آواز اونچی کیے بغیر، حوزے آرکادیو بوندیا نے تفصیل کے ساتھ ماکوندو بسانے کی روداد سنائی، کس طرح انھوں نے زمین تقسیم کی تھی، سرٹکیں بنائی تھیں، اور ضرورت کے تحت، بغیر حکومت کو تکلیف دیے اور بغیر کسی دخل اندازی کے، اس کی بہتری کے کام کیے تھے۔ "ہم اتنے امن پسند ہیں کہ اب تک ہم میں سے کوئی طبعی موت بھی نہیں مرا ہے۔" کوئی اس بات سے پریشان نہ تھا کہ حکومت نے اب تک ان کی مدد نہیں کی۔ اس کے برعکس، وہ خوش تھے کہ اب تک حکومت نے ماکوندو کو سکون کے ساتھ پھلنے پھولنے دیا ہے، اور انھیں امید تھی کہ حکومت ان کو اسی طرح رہنے دے گی، کیوں کہ انھوں نے یہ قصبہ اس لیے نہیں بنایا تھا کہ پہلایا نواب جو یہاں آئے وہ انھیں بتائے کہ کیا کرنا ہے۔ دون اپولینار موسکوئے، ایک لمحے کے لیے بھی اپنی جنبشوں کا وقار کھوئے بغیر، اپنی ڈسٹنم کی جیکٹ پہن چکا تھا، جو اس کی پتلون کی طرح سفید تھی۔

"اس لیے اگر تم کسی بھی عام شہری کی طرح یہاں ٹھہرنا چاہو، تو تمہیں خوش آمدید کہا جائے گا،" حوزے آرکادیو بوندیا نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر تم یہاں لوگوں کو اپنے گھر نیلے رنگنے پر مجبور کر کے بدامنی پھیلانے آئے ہو، تو تم اپنا کباڑ اٹھا کر اس جگہ واپس جاسکتے ہو جہاں سے تم آئے ہو۔ کیوں کہ میرا گھر فاختہ کی طرح سفید ہونے جا رہا ہے۔"

دون اپولینار موسکوئے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور جبرٹے سکیر کر ایک خاص غضب کے ساتھ کہا:

"میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ میں مسلح ہوں۔"

حوزے آرکادیو بوندیا کو پتا نہ چلا کہ کس لمحے اس کے ہاتھوں میں وہ کار آمد قوت پھر لوٹ آئی جس سے وہ گھوڑوں کو کانوں سے پکڑ کر روک لیا کرتا تھا۔ اس نے دون اپولینار موسکوئے کو کوٹ کے کال سے پکڑ کر اپنی آنکھوں کی سطح تک اٹھالیا۔

"میں یہ اس لیے کر رہا ہوں،" اس نے کہا، "کیوں کہ میں تمہیں زندہ اٹھائے پھرنا چاہتا ہوں، بجائے اس کے کہ تمہیں زندگی بھر کے لیے مردہ اٹھائے پھروں۔"

اور وہ اسی طرح دون اپولینار موسکوئے کو کال سے اٹھائے سرک کے وسط میں چلتا گیا، یہاں تک کہ دلدلی سرک پر اسے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ ایک ہفتے بعد وہ چھ عدد ننگے پاؤں، پچھٹی وردیوں میں ملبوس، اور بندوقوں سے مسلح سپاہیوں، اور ایک بیل گاڑی کے ساتھ، جس میں اس کی بیوی اور سات بیٹیاں اس کے ساتھ سفر کر رہی تھیں، واپس آیا۔ دو اور بیل گاڑیاں بعد میں فرنیچر، گھر کا سامان اور برتن لیے پہنچیں۔ اس نے اپنے خاندان کو گھر تلاش کرنے کے دوران بوٹل باکوب میں

ٹھہرایا، اور خود سپاہیوں کے پہرے میں اپنا دفتر کھولنے چل دیا۔ ماکوندو کے بانی، جنہوں نے حملہ آوروں کو قصبے سے ٹکانے کا تہیہ کر لیا تھا، اپنے اپنے بڑے بیٹوں کے ساتھ حوزے آرکادیو بونندیا کے پاس پہنچ گئے۔ لیکن وہ اس کے خلاف تھا، جیسا کہ اس نے وضاحت کی، کیوں کہ کسی کو اس کے بیوی بچوں کے سامنے پریشان کرنا مردانگی نہیں ہے، اور دون اپولینار موسکوٹے بیوی بچوں کے ساتھ واپس آیا تھا۔ لہذا اس نے فیصلہ کیا کہ اس مسئلے کو خوشگوار طریقے سے حل کیا جائے۔

اور یلیانواس کے ساتھ گیا۔ اُن دنوں اس نے سیاہ مونچھیں رکھنا شروع کر دی تھیں، جن کی نوکوں پر تیل چھڑا ہوتا، اور اس کی آواز کچھ کچھ بلند ہو چلی تھی، وہی خصوصیات جو آئندہ جنگ میں اس کو میسر کرنے والی تھیں۔ مسلح محافظوں کی پروا کیے بغیر، نشتہ، وہ بمسٹریٹ کے دفتر میں بیٹھے۔ دون اپولینار موسکوٹے نے اپنا تحمل برقرار رکھا۔ اس نے اپنی دو بیٹیوں کا، جو اس وقت وہاں موجود تھیں، تعارف کرایا: آپارو، سولہ سالہ، اپنی ماں کی طرح سانولی، اور ریمیدیوس، صرف نو سال کی، ایک خوبصورت چھوٹی سی بچی، جس کی جلد گلی سوسن کی طرح سفید اور آنکھیں سبز تھیں۔ وہ دونوں پروقار اور شائستہ تھیں۔ جیسے ہی مرد داخل ہوئے، ان سے متعارف کرائے جانے سے پیشتر ہی، لڑکیوں نے ان کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں پیش کیں۔ لیکن وہ دونوں کھڑے رہے۔

"بہت خوب، میرے دوست،" حوزے آرکادیو بونندیا نے کہا، "تم اگر چاہو تو یہاں ٹھہر سکتے ہو، اس لیے نہیں کہ تم نے دروازے پر مسلح ڈاکوؤں کو بٹھا رکھا ہے، بلکہ تمہاری بیوی اور بچوں کے احترام میں۔"

دون اپولینار موسکوٹے پریشان ہو گیا، لیکن حوزے آرکادیو بونندیا نے اسے جواب دینے کی مہلت نہ دی۔ "تمہاری صرف دو شرائط ہیں،" اس نے بات جاری رکھی، "اول: جو جس رنگ میں اپنا گھر رنگنا چاہے، رنگ سکتا ہے۔ دوم: سپاہی فوراً یہاں سے واپس چلے جائیں۔ ہم امن و امان اور نظم و ضبط کی ضمانت دیتے ہیں۔" بمسٹریٹ نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔

"تم اپنی زبان دیتے ہو؟"

"تمہارے دشمن کی زبان،" حوزے آرکادیو بونندیا نے کہا۔ اور تلخ لہجے میں وضاحت کی: "کیوں کہ میں ایک بات تم پر واضح کر دوں: تم اور میں اب تک دشمن ہیں۔"

سپاہی اسی سہ پہر واپس چلے گئے۔ چند دنوں بعد حوزے آرکادیو بونندیا نے بمسٹریٹ کے خاندان کے لیے ایک گھر تلاش کر دیا۔ سوائے اور یلیانواس کے سب سکون سے ہو گئے۔ ریمیدیوس، بمسٹریٹ کی چھوٹی بیٹی، جو اپنی عمر کے لحاظ سے خود اس کی بیٹی ہو سکتی تھی، اس کے جسم کے

تسائی کے سوال

کسی حصے میں درد جگاتی رہی۔ وہ ایک جسمانی پہچان تھا جو اس کو چلتے میں اس طرح تنگ کیا کرتا جیسا کہ جوئے کا لکڑ۔

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ: اجل محال

وبا کے دنوں میں محبت

دوسری طرف فلورنسیو آریزا نے، اکیاون سال، نومادہ اور چاردن قبل، ایک طویل اور دشوار عشق کے اختتام پر فرمیتا دازا کی جانب سے رد کردیے جانے کے بعد سے ایک لمحے کے لیے بھی اُس کے بارے میں سوچتا ترک نہیں کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے اسے، کسی کوٹھری کی دیوار پر ہر دن کے لیے ایک نشان ڈالتے ہوئے، گزرتے وقت کا حساب رکھنے کی ضرورت نہیں تھی، کیوں کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب فرمیتا دازا کی یاد دلانے والی کوئی نہ کوئی بات نہ ہوئی ہو۔ جس وقت ان میں جدائی ہوئی، وہ اپنی ماں ترانہ تو آریزا کے ساتھ درپچوں والی گلی میں کرائے کے ایک نصف مکان میں رہا کرتا تھا، جہاں اس کی ماں نے اپنی جوانی کے دنوں سے چھوٹی موٹی کم قیمت چیزوں کی ایک دکان کھول رکھی تھی، جس میں اس نے اُدھرٹی ہوئی قمیصیں اور پرانے پیسٹریٹس بھی رکھ چھوڑے تھے تاکہ فائدہ جتنی میں زخمی ہونے والوں کے ہاتھ، پیسوں کے طور پر فروخت کر سکے۔ وہ اس کا اکلوتا بیٹا، اور معروف جہازراں دون پیس ویلویزا سے اس کے اتفاقی معاشرے کی یادگار تھا۔ ویلویزا اُن تین بھائیوں میں سے ایک تھا جنہوں نے کریبینین ریور کمپنی قائم کر کے دریائے ماگدالینا میں نقل و حمل کے لیے دُفانی کشتیوں کے استعمال میں ایک نئی

تحریک پیدا کی تھی۔

جب دون پینس ویلوز اُفوت ہوا تو اس کا بیٹا دس سال کا تھا۔ اگرچہ وہ اس کے اخراجات کا بار چوری چھپے اٹھاتا رہا تھا، لیکن اس نے کبھی اسے قانونی طور پر اپنے بیٹے کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا تھا، اور نہ اس کے مستقبل کے تحفظ کے لیے اس کے نام کوئی ورثہ چھوڑا تھا؛ اس لیے فلورنٹینو آریزا اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ ماں کا نام استعمال کرتا تھا، اگرچہ اس کی ولادت کی بابت سب کو علم تھا۔ اپنے باپ کے مرنے کے بعد فلورنٹینو آریزا کو اسکول میں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی، اور اس نے محکمہ ڈاک میں کام سیکھنے کی غرض سے ملازمت کر لی، جہاں اس کا کام ڈاک کے تحویلے کھولنا، خط چھانٹنا اور لوگوں کو جہاز کی آمد کی اطلاع دینے کے لیے دفتر کے دروازے پر اُس ملک کا جھنڈا لہراتا تھا جہاں کا جہاز آیا ہو۔

اس کی ہوشیاری نے جرمن تارک وطن لوٹاریو گٹٹ کی توجہ حاصل کر لی، جو ٹیلیگراف آپریٹر تھا اور ساتھ ہی کلیسا میں اہم تقریبات کے موقوفوں پر آرگن بجانے اور گھر پر موسیقی کی تعلیم دینے کا کام بھی کرتا تھا۔ لوٹاریو گٹٹ نے اسے موریس کوڈسکایا، اور بتایا کہ ٹیلیگراف کا نظام کس طرح کام کرتا ہے؛ اور اس سے والکن بجانے کے چند سبق لینے کے بعد فلورنٹینو آریزا نے اس میں اتنی پیشہ ورانہ مہارت حاصل کر لی کہ وہ محض سن کر کوئی بھی دُھن بجا سکتا تھا۔ جب اس کی فرمیتا دازا سے ملاقات ہوئی، وہ اپنے سماجی طبقے میں سب سے مقبول نوجوان تھا جو رقص کی تازہ ترین طرزوں سے واقف تھا اور جذباتی شاعری زبانی سنا سکتا تھا، اور جو اپنے دوستوں کی محبوباؤں کے لیے والکن پر عشقیہ سیرناتا بجانے کے لیے ہمیشہ مستعد رہتا تھا۔ وہ بہت دہلا تھا، انڈین باشندوں جیسے اس کے بال خوشبودار تیل سے ہمیشہ چُپڑے رہتے اور آنکھوں پر دور کی نگاہ کی نینک لگی ہوتی، جس سے اس کی ہیئت کڈائی کی ویرانی اور بڑھ جاتی۔ نگاہ کی کمزوری کے علاوہ اسے قبض کی بھی مستقل شکایت تھی، اور وہ ساری زندگی انیما لینے پر مجبور رہا۔ اس کے پاس ایک اکلوتا سیاہ سُٹ تھا، جسے ترانزیو آریزا اتنی احتیاط سے رکھتی تھی کہ وہ ہر اتوار کو نیا معلوم ہوتا۔ اس کے ناتوانی کے تاثر، لیے دیے رہنے کے انداز اور ماتمی لباس کے باوجود، اس کے طبقے کی لڑکیاں اس بات پر قُرعہ ڈالا کرتی تھیں کہ کون لڑکی اس کے ساتھ وقت گزارے گی، اور وہ بھی ان لڑکیوں کے ساتھ وقت گزاری کا جُوا کھیلا کیا، یہاں تک کہ ایک دن وہ فرمیتا دازا سے ملا اور اس کی معصومیت اختتام کو پہنچی۔

اس نے پہلی بار اسے اُس موقع پر دیکھا تھا جب لوٹاریو گٹٹ نے اسے کسی اور ترو دازا کے نام آیا جو ٹیلیگرام پہنچانے کے لیے کما، جس کے گھر کا پتا معلوم نہیں تھا۔ اس نے اسے

بارغِ اناجیل کے پاس بنے ہوئے قدیم ترین مکانات میں سے ایک میں پایا یہ آدھا ٹھنڈا جو چکا تھا، اور اس کا اندرونی صحن، گلدانوں کے خس و خاشاک اور خشک سبکی فوارے کے ساتھ، کسی کلیسیائی خانقاہ کی شبابہت رکھتا تھا۔ فلورنٹینو آریزا کو کوئی انسانی آواز سنائی نہ دی جب وہ برہنہ پا خادمہ کے چپکے چپکے محراب دار برآمدے کو عبور کر رہا تھا، جہاں بچے ہوئے چوڑے کے دھیروں اور سیمنٹ کے خالی تھیلوں کے درمیان سامان کے آن کھلے صندوق اور راج مزدوروں کے آؤزار بکھرے پڑے تھے، کیوں کہ مکان تقریباً از سر نو تعمیر کے عمل سے گزر رہا تھا۔ برآمدے کے آخری سرے پر ایک خارجی دفتر تھا جس میں ایک بہت فربہ شخص، جس کے گل مچھوں کے گھٹنگھریالے بال اس کی مونچھوں کے بالوں میں مل گئے تھے، ایک میز کے عقب میں بیٹھا قیلو لہ کر رہا تھا۔ اسی کا نام لورنزو دازا تھا؛ وہ شہر میں زیادہ معروف نہیں تھا کیوں کہ اسے یہاں آنے ہوئے دو سال سے کم عرصہ گزرا تھا اور وہ کثیر الاحباب نہیں تھا۔

اس نے ٹیلیگرام یوں وصول کیا گویا یہ کسی منحوس خواب کا تسلسل ہو۔ فلورنٹینو آریزا نے اس کی آنکھوں کے متغیر رنگ، اور لٹافے کی مہر توڑتی ہوئی اس کی کپکپاتی انگلیوں کو ایک سرکاری قسم کی ہم دردی سے دیکھا، کیوں کہ اپنے کام کے دوران وہ بے شمار بار ٹیلیگرام وصول کرنے والے ان بے شمار لوگوں کو اس دلی خوف کا شکار دیکھ چکا تھا جو اب تک ٹیلیگرام کی آمد کا رشتہ موت کی اطلاع سے جوڑے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ ٹیلیگرام پڑھنے کے بعد البتہ اس کا اطمینان بحال ہو گیا۔ اس نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا: "اچھی خبر ہے"، اور فلورنٹینو آریزا کو وہ پانچ سیکے تھما دیے جو ٹیلیگرام پانے پر ادا کرنے کے لئے لازم آتے تھے، لیکن پُر سکون مسکراہٹ کے ساتھ یہ بھی جتنا دیا کہ وہ یہ رقم ہرگز ادا نہ کرتا اگر ٹیلیگرام بری خبر کا ہوتا۔ پھر اس نے فلورنٹینو آریزا سے ہاتھ ملا کر اسے الوداع کہا، جو ٹیلیگرام لانے والے قاصد کو رخصت کرنے کا مروجہ طریقہ نہیں تھا؛ اور خادمہ گلی میں کھٹکنے والے دروازے تک اس کے ساتھ ساتھ گئی، جس کا مقصد راستا بتانے سے زیادہ اس پر نگاہ رکھنا تھا۔ وہ واپس اسی راستے پر محراب دار برآمدے میں پلٹنے لگے، لیکن اس بار فلورنٹینو آریزا کو ظلم تھا کہ مکان میں کوئی اور بھی موجود ہے، کیوں کہ صحن کا اُبالا سبق دوہراتی ہوئی ایک نوانی آواز سے معمور تھا۔ جب وہ سلائی کے کمرے کے پاس سے گزر رہا تھا، اس نے کھڑکی سے اندر نگاہ ڈالی اور ایک عمر رسیدہ عورت اور ایک نو عمر لڑکی کو دو کرسیوں پر ایک دوسرے کے قریب بیٹھے دیکھا، جو ایک کتاب میں سے ساتھ ساتھ پڑھ رہی تھیں جو عمر رسیدہ عورت کی گود میں کھلی ہوئی رکھی تھی۔ یہ عجیب سا منظر لگتا تھا: بیٹی ماں کو پڑھنا سیکھا رہی تھی۔ اس کا یہ خیال صرف جُزوی طور پر غلط تھا، کیوں کہ عورت لڑکی کی ماں نہیں بلکہ چھوٹی تھی، اگرچہ

اس نے اے اپنی بیٹی جی کی طرح پالاتا۔ پڑھائی میں کوئی خلل نہ آیا، بس لڑکی نے یہ دیکھنے کو نگاہ اٹھائی کہ کھڑکی کے پاس سے کون گزر رہا ہے، اور یہ سرسری نگاہ محبت کے اس طوفان کی ابتدا ہوئی جو اب تک، نصف صدی کا عرصہ گزر جانے پر بھی، ختم نہ ہوا تھا۔

فلور تینیو آریزا، لوہے ترو داوا کے بارے میں صرف اتنا جان سکا کہ وہ بیسنے کی دبا کے کچھ ہی عرصے بعد، سان حوان دلاسیہ ناگا سے، اپنی اکلوتی بیٹی اور ناکتھا بسن کو ہمراہ لیے آیا تھا، اور جن لوگوں نے اُسے جہاز سے اترتے دیکھا تھا، انہیں اس بات میں ذرا بھی شبہ نہ تھا کہ وہ مستقل رہنے کی غرض سے آیا ہے، کیوں کہ اس کے اسباب میں وہ تمام چیزیں شامل تھیں جو ایک مکمل طور پر آراستہ مکان کے لیے درکار ہوتی ہیں۔ اس کی بیوی اس وقت فوت ہو گئی تھی جب بچی بہت چھوٹا تھا۔ اس کی بسن، جس کا نام ایسکولتیکا تھا، چالیس برس کی تھی، اور، ایک مدت کی پاسداری میں، گھر سے باہر نکلتے وقت سینٹ فرانس کی عباہنتی تھی اور گھر کے اندر کمر میں انفعال کی ڈوری باندھے رکھتی تھی۔ لڑکی کی عمر تیرہ برس کی تھی اور نام وہی تھا جو اس کی مرحومہ ماں کا تھا: فرمینا۔

لوہے ترو داوا کو خاصا متمول باور کیا جاتا تھا، کیوں کہ وہ کسی معلوم پیشے سے بے نیاز، ٹھاٹ سے رہتا تھا، اور اس نے باغ اناجیل کا مکان نقد رقم دے کر خریدا تھا، جس کی تجدید اور آرائش میں اسے اس کی قیمت یعنی دو سو پلائی پیسو سے دگنی رقم خرچ کرنی پڑی ہوگی۔ اس کی بیٹی مریم عذرا کی تقدیم کی اکادمی میں پڑھ رہی تھی، جہاں پچھلی دو صدیوں سے اعلیٰ طبقے کی نو عمر خواتین مستعد اور اطاعت گزار بیویاں بننے کا فن اور قواعد سیکھتی رہی تھیں۔ نوآبادیاتی دور میں، اور جمہوریہ کے ابتدائی برسوں میں، یہ اسکول صرف ان طالبات کو داخلہ دیا کرتا تھا جو معزز ناموں والے ارفع خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن آزادی کی اٹھارہ پچھار کی زد میں آئے ہوئے قدیم گھرانوں کو ایک نئے زمانے کی حقیقتوں کے سامنے سر جھکا نا پڑا، اور اکادمی نے خاندانی وجاہت سے قطع نظر، صرف اس بنیادی شرط پر کہ وہ کیتھولک شادیوں کی باقاعدہ جائز اولاد ہوں، ان تمام درخواست گزاروں کے لیے اپنے دروازے کھول دیے جو تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے کے اہل تھے۔ ہر کیف، یہ ایک گراں اسکول تھا، اور یہ حقیقت کہ فرمینا داوا اس میں پڑھتی تھی، اس کے خاندان کے سماجی رتبے کا نہ سہی مالی خوشحالی کا بہر حال کافی ثبوت تھی۔ اس اطلاع نے فلور تینیو آریزا کو خاصی امید بخشی، کیوں کہ اس سے اسے اندازہ ہوا کہ بادام سی آنکھوں والی یہ حسین اور نوخیز لڑکی اس کے خوابوں کی رسائی میں ہے۔ لیکن اس کے باپ کی کڑی نگرانی نے بہت جلد ایک بے مداوا دشواری پیدا کر دی۔ دوسری طالبات کے برعکس، جو ٹولپوں میں یا کسی

متر ملازمہ کی ہمراہی میں اسکول جاتی تھیں، فرمیتا دازا ہمیشہ اپنی ناکھدا پھوپھی کے ساتھ ہوتی تھی، اور اس کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کسی اور طرف دھیان بٹانے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔

اسی سادگی کے ساتھ فلور نٹیو آریزا نے اکیلے شکاری کے طور پر اپنی پوشیدہ زندگی کا آغاز کیا۔ صبح سات بجے سے وہ باغ اناجیل کی سب سے اونچل بیج پر بادام کے درختوں کے سائے میں بیٹھ کر بظاہر شاعری کی کوئی کتاب کھول کر پڑھنے لگتا، یہاں تک کہ دھاری دار نیلی یونیفارم، گھٹنوں تک پہنچتی ہوئی اسٹاکنگز اور مردانہ وضع کے کتاری دار جوتوں میں، اس محال دوشیزہ کو گزرتے ہوئے دیکھ لیتا۔ اس کی موٹی سی چوٹی، سرے پر بندھی ہو کے ساتھ، اس کی کمر تک پہنچ رہی ہوتی۔ وہ ایک فطری تمکنت کے ساتھ، سر اٹھائے، ایک نقطے پر نگاہ جمائے، کتابوں کا بستا سینے پر دونوں ہاتھوں سے تھامے، تیز قدموں سے ناک کی سیدھ میں چلتی جاتی۔ اس کی برنی کی سی سبک رفتار سے یوں لگتا جیسے وہ زمین کی کشش سے آزاد ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ، قدم سے قدم ملانے کی کوشش کرتی، کتھی عبا میں ملبوس اس کی پھوپھی فلور نٹیو آریزا کو خفیف سا موقع بھی نہ دیتی کہ وہ نزدیک آنے کی کوشش کرے۔ فلور نٹیو آریزا ہر روز چار مرتبہ ان دونوں کو آتے اور جاتے دیکھتا، اور اتوار کے دن ایک بار، جس وقت وہ ہفتہ وار عبادت کے بعد گرجا سے باہر آ رہی ہوتی، اور اس لڑکی کو صرف دیکھ لینا اس کے لیے کافی تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اس میں غیر آغلب خوبیوں اور خیالی جذبات کا اضافہ کر کے اسے مثالی صورت دیتا گیا، اور دو ہفتے بعد اس کے ذہن میں اس لڑکی کے خیال کے سوا کچھ نہ رہ گیا۔ تب اس نے فرمیتا دازا کو، اپنے خوش نویوں کے سے نفیس خط میں کاغذ کے دونوں طرف لکھا ہوا ایک سادہ رقعہ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن وہ اسے کئی روز تک اپنی جیب میں ڈالے، اُس کو تھمانے کا طریقہ سوچتا رہا، اور یہ سوچتے سوچتے بررات سونے سے پہلے اس میں اضافہ کرتا گیا، یہاں تک کہ اصل خط اب مدحیہ الفاظ کی ایک ضخیم لغت کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا، جو تمام ان کتابوں سے مستعار تھے جنہیں وہ باغ میں اپنی نگہداریوں کے دوران پڑھا کرتا تھا اور جن کے اشعار اب اسے زبانی یاد ہو گئے تھے۔

خط اُس تک پہنچانے کے کسی ذریعے کی تلاش میں اس نے اکادمی کی چند اور طالبات سے راہ و رسم پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ اس کی دنیا سے بہت دور تھیں۔ اس کے علاوہ بہت سوچنے کے بعد، اسے یہ مناسب معلوم نہ ہوا کہ کسی اور کو اپنے ارادوں کا رازدار کرے۔ پھر بھی وہ اتنا جاننے میں کامیاب ہوا کہ شہر میں آنے کے چند روز بعد فرمیتا دازا کو سنیچر کے رقص میں شرکت کی دعوت ملی تھی، لیکن اس کے باپ نے اسے جانے کی اجازت نہ دیتے ہوئے فیصلہ کن

انداز سے کہہ دیا تھا: ”بر چیز اپنے وقت پر“۔ جب خط کی ضخامت دونوں طرف لکھے ہوئے ساتھ صفحوں سے تجاوز کر گئی تو فلور ٹینمو آریزا اپنے اس راز کا بوجھ مزید نہ سہار سکا اور اس نے اپنی ماں کو اس میں شریک کر لیا، جو واحد ہستی تھی جس پر اعتماد کرنے کی وہ خود کو اہانت دیتا تھا۔ محبت کے معاملات میں اپنے بیٹے کی سادگی نے ترازیو آریزا کو اتنا متاثر کیا کہ اس کی آنکھیں بھر آئیں، اور اس نے اپنی دانائی سے اس کی رہنمائی کرنے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے تو اس نے اُسے کاغذوں کے اس نعمتی پلندے کو خط کے طور پر بھیجنے سے باز رہنے پر آمادہ کیا، کہ یہ اس کے خوابوں پر چھائی ہوئی لڑکی کو صرف خوف میں مبتلا کر سکتا تھا، جو اس کے خیال میں دل کے معاملات میں اتنی ہی تازہ کار تھی جتنا اس کا بیٹا۔ پہلا قدم یہ ہے، اس نے سمجھایا، کہ وہ اسے اپنی دل چسپی سے آگاہ کرے تاکہ اس کے اعلان پر وہ حیرت کا شکار نہ ہو جائے اور اسے غور کرنے کا وقت مل سکے۔

”اور سب سے اہم بات یہ ہے“، وہ بولی، ”کہ تم لڑکی سے پہلے اس کی پھوپھی کا دل جیتنے کی کوشش کرو۔“

یہ دونوں نصیحتیں، بلاشبہ، دامائی سے بھرپور تھیں، لیکن دونوں بعد از وقت تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ اُس روز، جب اپنی پھوپھی کو سبق دینے سے ایک لمحے کو دھیان ہٹا کر اس نے یہ دیکھنے کے لیے نگاہ اٹھائی تھی کہ برآمدے سے کون گزر رہا ہے، فلور ٹینمو آریزا نے اپنے بے مدافعت انداز کے باعث اسے متاثر کر لیا تھا۔ اس رات، کھانے کے دوران، اس کے باپ نے ٹیلیگرام کا ذکر کیا جس سے اس نے جانا کہ فلور ٹینمو آریزا کے اس کے گھر آنے کا مقصد کیا تھا، اور یہ کہ وہ معاش کے لیے کیا کرتا ہے۔ اس اطلاع نے اس کی دل چسپی اور بڑھادی، کیوں کہ اس زمانے کے اور لوگوں کی طرح اس کے لیے بھی ٹیلیگراف کی ایجاد اپنے اندر جادو کا سا عنصر رکھتی تھی۔ سو اس نے باغ اناجیل میں بادام کے درختوں کے نیچے بیٹھا دیکھ کر پسلی ہی مرتبہ میں اسے پہچان لیا تھا، لیکن اسے کوئی اضطراب محسوس نہیں ہوا جب تک اس کی پھوپھی نے اسے یہ بتایا کہ وہ کئی ہفتوں سے وہاں نظر آ رہا ہے۔ جب انھوں نے اتوار کو، عبادت کے بعد باہر نکلتے ہوئے، اسے ایک بار پھر دیکھا تو اس کی پھوپھی کو یقین ہو گیا کہ یہ تمام ملاقاتیں اتفاقی نہیں ہو سکتیں۔ اس نے کہا: ”ظاہر ہے وہ یہ تمام مشقت میرے لیے تو نہیں اٹھا رہا ہے۔“ اپنے راہبانہ انداز اور استغفار کی عادت کے باوجود پھوپھی ایک کولتیکا میں زندگی سے شغف اور ساز باز کی طلب موجود تھی، جو اس کی سب سے بڑی خوبی تھی؛ اور صرف اس خیال نے، کہ کوئی شخص اس کی ہمتی میں دل چسپی لے رہا ہے، اس میں ایک ناقابلِ مزاحمت جذبہ بیدار کر دیا۔

البتہ فریمنہ دازا محبت کے سادہ ترین تجسس ہے بھی محفوظ تھی، اور فلور تینسو آریزا کو دیکھ کر اس میں جو واحد جذبہ پیدا ہوتا وہ ایک طرح کے ترحم کا تھا، کیوں کہ وہ اسے بیمار دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اس کی پھوپھی نے اسے بتایا کہ کسی مرد کی اصل فطرت کا پتا چلانے کے لیے ایک طویل عمر درکار ہے، اور اسے یقین ہے کہ اس نوجوان کو، جو باغ میں بیٹھا انھیں آتے جاتے دیکھا کرتا ہے، معرفت عشق کا مرض لاحق ہے۔

بے محبت کی شادی کی اکلوتی یادگار اس نوحیز لڑکی کے لیے پھوپھی اسکولسٹیکامہردی اور اُنس کی ایک پناہ گاہ تھی۔ ماں کی موت کے بعد سے اسی نے اسے پالا تھا، اور اس کے لورہ ترو دازا کے ساتھ معاملات میں اس کا طرز عمل پھوپھی سے زیادہ محرم راز کا سا ہوتا تھا۔ اس طرح فلور تینسو آریزا کی آمدان دونوں کے لیے ان کے بہت سے رازدارانہ مشغلوں میں سے ایک تھی جو جو وہ وقت گزارنے کے لیے ایجاد کیا کرتی تھیں۔ دن میں چار مرتبہ جب وہ باغ اناجیل کے پاس سے گزرتیں تو اس دبلے، سسے ہوئے، غیر متاثر کن پاسدار پر جلدی سے ایک تیز نگاہ ڈالتیں جو شدید گرمی میں بھی سیاہ لباس پہنے بیٹھا درختوں کے نیچے پڑھنے کی اداکاری کر رہا ہوتا تھا۔ "وہ رہا!" ان میں سے جس کی نگاہ اس پر پہلے پڑتی وہ اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے دوسری کو بتاتی، اور جب وہ نظر اٹھاتا تو اسے اپنی زندگی کی دو سنجیدہ اور الگ تھلگ خواتین اس کی طرف توجہ کیے بغیر باغ کا راستہ طے کرتی ہوئی دکھائی دیتیں۔

"بے چارہ،" اس کی پھوپھی نے کہا تھا، "میں ساتھ ہوں اس لیے اسے تم سے مخاطب ہونے کی ہمت نہیں ہوتی، لیکن اگر وہ واقعی سنجیدہ ہے تو ایک دن تم سے بات کرے گا، اور پھر تمہیں ایک خط دے گا۔"

آنے والی تمام دشواریوں کا اندازہ کر کے اس کی پھوپھی نے اسے اشاروں کی زبان سکھائی جو ممنوعہ محبت میں ایک ناگزیر حربہ ہے۔ ان غیر متوقع اور تقریباً بچکانہ حرکتوں نے فریمنہ دازا میں ایک نامانوس تجسس جگا دیا، لیکن کئی ماہ تک اسے یہ خیال نہ ہوا کہ معاملہ اس سے آگے بھی جاسکتا ہے۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ کب یہ مشغلہ رفتہ رفتہ ایک محویت میں بدل گیا، اور اسے دیکھنے کی طلب میں اس کے خون کی گردش تیز ہونے لگی، اور ایک رات وہ دہشت میں جاگ اٹھی جب وہ اندھیرے میں اسے مسہری کی پائنتی کی طرف سے اس پر نظریں جمائے ہوئے دکھائی دیا۔ تب اس نے اپنی پوری جان سے اپنی پھوپھی کی پیش گوئیوں کے سچ ہونے کی آرزو کی، اور اپنی دعاؤں میں اس نے خدا سے اُس کو حوصلہ عطا کرنے کی التجا کی کہ وہ خط اسے تمہادے اور وہ دیکھ سکے کہ اس میں کیا لکھا ہے۔

لیکن اس کی دعاؤں کا کوئی جواب نہ آیا۔ بلکہ جو کچھ ہوا وہ اس کے برعکس تھا۔ یہ وہی موقع تھا جب فلورنٹینو آریزا نے اپنی ماں کے سامنے اعتراف کیا تھا اور اس نے اسے شرمندہ صفت تو صیفی پلندا فرینا دازا کو تھمانے سے باز رہنے پر آمادہ کر لیا تھا، سو وہ اس سال کے اختتام تک انتظار کرتی رہی۔ اس کی محویت ناامیدی میں بدلتی جا رہی تھی کیوں کہ دسمبر کی چٹیاں آ رہی تھیں اور وہ بار بار خود سے سوال کر رہی تھی کہ ان تین مہینوں میں جب وہ اسکول نہیں جایا کرے گی تو اسے کس طرح دیکھے گی اور کس طرح اسے خود کو دیکھنے کا موقع دے گی۔ اس کے یہ سوال ابھی تک بے جواب تھے کہ کرسمس سے پہلے کی رات وہ اس احساس سے لرز اٹھی کہ وہ نصف شب کی عبادت کے مجوم میں موجود ہے اور اسے دیکھ رہا ہے، اور اس کا دل بے تابی کے طوفان کی زد میں آ گیا۔ وہ گردن گھمانے کی ہمت نہ کر سکی، کیوں کہ وہ اپنے باپ اور اپنی پھوپھی کے بیچ میں بیٹھی تھی اور خود پر قابو پانے کی شدید کوشش کر رہی تھی تاکہ وہ دونوں اس کے پہچان سے باخبر نہ ہو جائیں۔ لیکن گرجا گھر سے باہر نکلتے ہوئے مجوم کے درمیان اسے وہ اتنے واضح طور پر، اتنا قریب محسوس ہوا کہ گرجا گھر کے وسطی حصے سے گزرتے ہوئے وہ ایک ناقابل مزاحمت قوت کے زیر اثر اپنے شانے کے اوپر سے دیکھے بغیر نہ رہ سکی، اور تب اس نے اپنی آنکھوں سے ہاشت بھر کے فاصلے پر ان سرد آنکھوں، اس بے رنگ چہرے اور محبت کی دہشت سے پشیم بنے ہوئے ان بوٹوں کو دیکھا۔ اپنی بے باکی سے خوفزدہ ہو کر اس نے پھوپھی ایسکولیتیکا کا بازو تمام لیا کہ گر نہ پڑے، اور اس کی پھوپھی نے جالی دار دستانوں میں سے اس کی ہتھیلیوں کے برف جیسے ٹھنڈے پسینے کو محسوس کر لیا اور اپنی غیر مشروط رازداری کے پیچہ مجوم اشارے سے اسے تسلی دی۔ آتش بازی اور مقامیوں کے طنزوں کے شور، دروازوں کی رنگین روشنیوں اور سکون کے طالب مجوم کی باوہ کے درمیان فلورنٹینو آریزا نیند میں چلنے والوں کی طرح صبح تک پھرتا رہا، اپنے آنسوؤں کے درمیان سے اس جشن کو دیکھتے ہوئے وہ اس احساس کے اثر میں تھا کہ یہ خداوند کی نہیں بلکہ خود اس کی پیدائش کا دن ہے۔

اگلے مہینے اس کا جنون آور بڑھ گیا جب وہ سہ پہر کو قبیلے کے وقت مایوسی کے عالم میں فرینا دازا کے مکان کے پاس سے گزرا اور اس نے دیکھا کہ وہ اور اس کی پھوپھی دروازے کے باہر باغچے میں بادام کے درختوں کے نیچے بیٹھی ہیں۔ وہی منظر جو اس نے پہلی سہ پہر کو مکان کے اندر سلائی والے کمرے میں دیکھا تھا اب بیرون در دوہرایا جا رہا تھا: لڑکی اپنی پھوپھی کو پڑھنا سکھا رہی تھی۔ لیکن فرینا دازا اسکول کی یونیفارم کے بغیر مختلف نظر آ رہی تھی، کیوں کہ اس نے ایک تنگ سی قبا پہن رکھی تھی جس کی بہت ساری تھیں اس کے کندھوں سے یونانی انداز میں نیچے گرتی

تھیں، اور سر پر اس نے گارڈنیا کے تازہ پھولوں سے بنا ایک بار لپیٹ رکھا تھا جس سے وہ کوئی تاج دار دیوی دکھائی دے رہی تھی۔ فلورنٹینو آریزا باغ میں ایسی جگہ جا بیٹھا جہاں اسے یقین تھا کہ اسے دیکھ لیا جائے گا۔ وہ خود کو پڑھنے کا ٹانگہ کرنے پر آمادہ نہ کر سکا، بلکہ کتاب گود میں کھلی چھوڑ کر نظریں جمائے اس خیالی دوشیزہ کو دیکھتا رہا، جس نے جواب میں اس پر ایک ترس بھری نگاہ تک نہ ڈالی۔

پہلے پہل اسے خیال ہوا کہ ان دونوں کا باہر باغچے میں آ بیٹھنا شاید مکان کی نہ ختم ہونے والی مرمت کے باعث ایک اتفاقی انتظام تھا، لیکن آنے والے چند دنوں میں وہ سمجھ گیا کہ فرینا دازا چٹھیوں کے تین مہینوں کی برسہ برسہاں، اس کی نظروں کے سامنے ہو گی۔ بلاشبہ اس بات سے اس کا دل ایک نئی امید سے بھر گیا۔ اسے یہ تاثر نہیں ملا تھا کہ اسے دیکھ لیا گیا ہے، اور نہ وہ کسی دلچسپی یا تنفر کا سراغ لگا پایا تھا، مگر فرینا دازا کی بے نیازی سے ایسی روشنی پھوٹی معلوم ہوتی تھی جو ثابت قدم رہنے میں اس کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ تب، جنوری کے اواخر کی ایک سہ پہر پھوپھی نے اپنی چیزیں کرسی پر رکھیں اور اپنی بھتیجی کو بادام کے درختوں سے گرتے زرد پتوں کے نیچے تنہا چھوڑ کر اندر چلی گئی۔ اس فوری خیال سے حوصلہ پا کر کہ یہ موقع التزاماً پیدا کیا گیا ہے، فلورنٹینو آریزا نے سرکل پار کی اور فرینا دازا کے مقابلہ کا کھڑا ہوا، اس کے اتنے قریب کہ اس کے سانوں کے خفیف زیر و بم اور پھولوں کے عطر کی اس خوشبو کو محسوس کر سکتا تھا جو اس کے ذہن میں عمر بھر کے لیے فرینا دازا کی ذات سے وابستہ ہو جانے والی تھی۔ اس سے مخاطب ہوتے وقت فلورنٹینو آریزا کا سر اٹھا ہوا تھا اور اس میں ایک ایسا عزم تھا جو اس موقع کے پچاس برس بعد اس میں، اسی سبب سے، دوبارہ بیدار ہونے والا تھا۔

"میں تمہیں ایک خط دینا چاہتا ہوں،" وہ بولا۔

یہ وہ آواز نہیں تھی جس کی فرینا دازا کو اس سے توقع تھی: یہ ایک تیز اور صاف آواز تھی اور اس میں ایسا ضبط تھا جو اس کے ناقابل انداز سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اپنے کڑھائی کے کام سے نظریں ہٹائے بغیر وہ جواب میں بولی: "میں اپنے ابا کی اجازت کے بغیر نہیں لے سکتی۔" فلورنٹینو آریزا اس آواز کی گرمی سے لرز اٹھا، جس کا وہ بالآخر وہ ساری زندگی فراموش نہیں کرنے والا تھا۔ لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا اور کسی جھجک کے بغیر بولا: "تو اجازت لے لو۔" پھر اس حکم میں التجا کی شیرینی گھولنے کے لیے اس نے کہا: "یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔" فرینا دازا نے اس پر نظر نہیں ڈالی، نہ اپنا کڑھائی کا کام ایک لمحے کے لیے بند کیا، پھر بھی اس کے فیصلے نے دروازے کو اتنا کھول دیا کہ اس میں سے تمام دنیا گزر سکتی تھی۔

و با کے دفن میں محبت

"روزانہ سہ پہر کو آتے رہو،" اس نے کہا، "اور اس وقت تک انتظار کرو جب تک میں اپنی جگہ تبدیل نہ کروں۔"

فلورنٹینو آریزا کو اس کی بات اگلے سوموار تک مسجد میں نہ آئی جب اس نے باغ میں منچ پر سے بیٹھے بیٹھے وہی پرانا منظر ایک تبدیلی کے ساتھ دیکھا۔ جب پچو بھی ایسکولتیکا اندر گھر میں چلی گئی تو فرینا دا ازا اپنی جگہ سے کھڑی ہو کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ فلورنٹینو آریزا، جس نے اپنے کارل میں کمیلیا کا ایک پھول لگا رکھا تھا، سرکل پار کر کے اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے کہا: "یہ میری زندگی کا سب سے عظیم لمحہ ہے۔" فرینا دا ازا نے اس کی جانب نگاہیں نہ اٹھائیں، لیکن اپنے دائیں بائیں نظر ڈال کر خشک موسم کی حدت میں ویران سرکل اور ہوا میں اڑتے سوکھے پتوں کو دیکھا۔

"لاؤ، دے دو،" وہ بولی۔

پہلے تو فلورنٹینو آریزا نے ارادہ کیا تھا کہ وہ شہر صفحات اسے دے دے جو بار بار پڑھنے سے اسے زبانی یاد ہو چکے تھے، لیکن پھر اس نے صرف آدھے صفحے کا ایک سنجیدہ اور سیدھا سادہ خط اس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا جس میں اس نے صرف اسی شے کا عہد کیا تھا جو ضروری تھی: یعنی اپنی مکمل وفاداری اور دوامی محبت کا۔ اس نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے خط نکالا اور اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیا جو کڑھائی پر مستقل نظریں جمائے ہوئے تھی اور اب بھی اس کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کر رہی تھی۔ اس نے خوف سے زرد ہاتھ میں لپکپاتے ہوئے خط کو دیکھا اور کڑھائی کا فریم خط وصول کرنے کے لیے اوپر اٹھا دیا، کیوں کہ وہ یہ اقرار کرنے کو تیار نہ تھی کہ اس نے اس کی انگلیوں کی لپکپاٹ کو محسوس کر لیا ہے۔ تب ایسا ہوا کہ بادام کے درختوں کے پتوں میں کسی پرندے نے ہر پھر پھڑپھڑائے اور اس کی بیٹ سیدھی کڑھائی کے فریم پر آگری۔ فرینا دا ازا نے فریم جلدی سے ہٹا کر اپنے پیچھے کر لیا تاکہ اسے معلوم نہ ہونے پائے، اور پہلی بار اپنا جلتا ہوا چہرہ اوپر اٹھا کر اسے دیکھا۔ فلورنٹینو آریزا اس کا اثر لیے بغیر خط ہاتھ میں لیے کھڑا رہا اور بولا: "یہ اچھا لگتا ہے۔" وہ شکر کے لیے طور پر پہلی بار مسکرائی اور خط اس کے ہاتھ سے تقریباً جھپٹ لیا، اور تہہ کر کے اپنے گریبان میں رکھ لیا۔ پھر فلورنٹینو آریزا نے کمیلیا کا پھول اپنے کارل سے نکال کر اسے پیش کیا، لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا: "یہ وعدوں کا پھول ہے۔" تب، یہ احساس ہونے پر کہ ان کی ملاقات کا وقت ختم ہو رہا ہے، اس نے دوبارہ اپنے سنجیدہ انداز میں پناہ لی۔

"اب تم جاؤ،" اس نے کہا، "اور اس وقت تک دوبارہ نہ آنا جب تک میں نہ کہوں۔"

اس سے پہلے کہ وہ اس پہلی ملاقات کا حال اپنی ماں کو بتاتا وہ اس کے بارے میں جان گئی،

کیوں کہ فلورنٹینو آریزا کی آواز مدھم پڑنے لگی، بھوک کم ہونے لگی اور وہ پوری پوری رات بستر پر کروٹیں بدل کر گزارنے لگا۔ لیکن جب اس نے اپنے پہلے خط کے جواب کا انتظار شروع کیا تو اس کی اذیت اسہال اور سبز اُلٹیوں کی وجہ سے اور زیادہ پییدہ ہونے لگی، وہ کھویا کھویا رہنے لگا اور اسے غشی کے دورے پڑنے لگے۔ اس کی ماں اس کی حالت دیکھ کر دشت زدہ ہو گئی کیوں کہ اس کی علامات محبت کے اضطراب سے زیادہ ہینے کی غارت گری سے مشابہت رکھتی تھیں۔ فلورنٹینو آریزا کا دہنی باپ بھی، جو ہومیوپیٹھی کا پرانا معلق اور ترانزیتو آریزا کا اس وقت سے رازداں تھا جب وہ درپردہ ایک داشتہ کی حیثیت سے رہتی تھی، پہلے اپنے مریض کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا، کیوں کہ اس کی نبض سُست تھی، سانس بھاری تھا اور زرد پسینا کسی ایسے شخص کی طرح تھا جو مرنے کے قریب ہو۔ لیکن اس کے تفصیلی معائنے سے معلوم ہوا کہ اسے بخار یا درد کی کوئی شکایت نہیں، اور اس کا واحد شعوری احساس مر جانے کی ایک شدید خواہش کا ہے۔ اس نتیجے تک پہنچنے کے لیے اسے پہلے مریض سے اور پھر اس کی ماں سے ہوشیاری کے ساتھ پوچھ گچھ کرنی پڑی، کہ محبت اور ہینے کی علامات ایک جیسی ہوتی ہیں۔ اس نے اعصاب کو سکون پہنچانے کے لیے زیرفون کے گلو فون کا خیساندہ تجویز کیا اور آب و ہوا کی تبدیلی کا مشورہ دیا تاکہ دور جا کر اسے کچھ قرار مل سکے، لیکن فلورنٹینو آریزا کی خواہش اس کے برعکس تھی: وہ اپنی اذیت سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔

ترانزیتو آریزا ایک آزاد کردہ مخلوط النسل تھی جس کی شاد کامی کی جہلت کا افلاس نے دم گھونٹ دیا تھا، اور وہ اپنے بیٹے کی بے کلمی میں اسی طرح لذت محسوس کر رہی تھی گویا یہ خود اسی کی ہو۔ جب اُس کا جنون بڑھا تو اس نے فلورنٹینو آریزا کو خیساندہ سے پلائے اور سردی سے بچاؤ کے لیے اسے کھمبلوں میں لپیٹ دیا، لیکن ساتھ ہی وہ اسے اپنی اس حالت سے لذت اٹھانے پر بھی اکساتی رہی۔

"اس کی قدر کرو، کیوں کہ ابھی تم جوان ہو اور اسے سہار سکتے ہو،" وہ اس سے بولی، "یہ چیزیں ساری زندگی ساتھ نہیں رہتیں۔"

لیکن محکمہ ڈاک اس خیال سے متفق نہ تھا۔ فلورنٹینو آریزا اپنے کام سے غفلت برتنے لگا تھا اور اتنا گم شدہ رہنے لگا تھا کہ ڈاک کے جہاز کی آمد پر لہرائے جانے والے جھنڈوں میں تمیز نہ کر پاتا تھا۔ ایک بدھ کے روز اس نے جرمنی کا جھنڈا لہرا دیا جب کہ جہاز لے لینڈ کمپنی کا تھا اور لیورپول سے ڈاک لایا تھا، اور ایک اور دن سالن زیر سے آنے والے کمپنی ڈرنال ٹرانس اٹلانٹیک کے جہاز کی آمد پر ریاست ہائے متحدہ کا جھنڈا لہرا دیا۔ محبت کی اس تائب دماغی نے ڈاک کی تقسیم میں اس قدر بے ترتیبی پیدا کی اور لوگوں کو اتنا چراغ پا کیا کہ اگر لوٹاریو گمٹ نے اسے ٹیلیگراف کے کام پر

نہ لگا دیا ہوتا اور کلیسا کی سرود خوانی میں وہ اس کے ساتھ واکمن بنانے نہ جایا کرتا تو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ ان میں ایسی دوستی تھی جو ان کی عمروں کے فرق کے باعث ناقابل فہم تھی؛ یہ فرق اتنا تھا کہ ان دونوں میں داد اور پوتے کا رشتہ بھی ہو سکتا تھا لیکن ان کے تعلقات نہ صرف کام کے اوقات میں بے حد خوشگوار تھے بلکہ وہ شام کو بندرگاہ کے آس پاس کے ان سے خانوں میں بھی ساتھ جایا کرتے تھے جو سماجی طبقے سے قطع نظر، گھر سے باہر شام گزارنے والے تمام لوگوں کی محبوب آماج گاہ تھے، چاہے وہ تھے میں دُخت گداگر ہوں یا تلی ہوئی مچھلی اور ناریل کے ساتھ چاول کھانے کی طلب میں سوشل کلب کی بارونق ضیافتوں سے بھاگ نکلنے والے خوش پوش دولت مند نوجوان۔ لوٹاریو گنٹ ٹیلیگراف کی آخری شفٹ کے بعد وہاں جانے کا عادی تھا، اور صبح اکثر اسے جھیکن پیچ پیٹنے، اور انتیلی جہازوں کے دیوانے ملاحوں کے ساتھ اکارڈین بجانے میں مشغول پاتی۔ وہ بیل کی سی گردن، اور سنہری ڈاڑھی والا ایک فریہ اندام شخص تھا۔ رات کو باہر نکلتے وقت وہ ایک لبرٹی کیپ آور لگا لیتا اور اس کے بعد اس کی سینٹ نکولس سے مشابہت مکمل ہونے میں صرف گھلے میں گھنٹیوں کی کسر رہ جاتی۔ ہفتے میں کم از کم ایک بار وہ ایسی عورتوں میں سے کسی ایک کے ساتھ رات گزارتا جنہیں وہ رات کے پرندے کہا کرتا تھا، اور جو ملاحوں کے لیے بنے ہوئے شب ب سری کے ایک ہوٹل میں فوری ضرورت کے لیے محبت فروخت کیا کرتی تھیں۔ فلورنٹینو آریزا سے ملتے ہی اس نے ایک ٹھکانہ مسرت کے ساتھ اسے اپنی اس بہشت کے اسرار سے متعارف کرایا۔ اس نے فلورنٹینو آریزا کے لیے اپنے خیال میں بہترین ٹوپرواز پرندوں کا انتخاب کیا، ان سے ان کی قیمت اور طور طریق کے بارے میں بات طے کی اور انہیں ان کی خدمات سے قبل اپنی جیب سے ادائیگی کی پیش کش کی۔ لیکن فلورنٹینو آریزا راضی نہ ہوا: وہ کنوارا تھا اور اس نے اپنے کنوارپن سے محبت کے سوا کسی اور شے کے عوض دست بردار نہ ہونے کا عہد کر رکھا تھا۔

ہوٹل کی عمارت ایک نوآبادیاتی حویلی تھی جو اپنے اچھے دن گزار چکی تھی اور اس کے وسیع و عریض دیوان خانوں اور کمروں کو لکڑی کے تختوں کی مدد سے چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا، جن کے دروازوں میں اندر جھانکنے کے لیے سوراخ بنے ہوئے تھے۔ ان کو نہ صرف ہم بستری کے لیے بلکہ جھانکنے کے لیے بھی کرائے پر دیا جاتا تھا۔ وہاں بہت سے قفسے مشہور تھے: بعض دخل اندازوں نے بُنائی کی سلاخیوں سے اپنی آنکھیں پھوٹلی تھیں؛ ایک شخص نے سوراخ میں سے جھانک کر اپنی بیوی کو پہچان لیا تھا؛ بعض خاندانی شرفا اپنی اصل کو فراموش کرنے کے لیے چٹھیوں پر آئے ہوئے سر ہنگوں کے ساتھ فحاشوں کے ہمیں میں وہاں آیا کرتے تھے۔ ان قصوں، اور جھانکنے والوں اور دیکھنے والوں کی بدھشتی کی بہت سی اور داستانوں کی وجہ سے

فلورنٹینو آریزا کو ان میں سے کسی کو ٹھہری میں جانے کا خیال ہی دہشت زدہ کر دیتا تھا۔ اور اس طرح لوٹاریو گلٹ اسے اس بات پر کبھی قائل نہ کر سکا کہ ان سوراخوں سے جھانکنا اور اس جھانکنے کا بدفہم بننا یورپی شہزادوں کے نفیس ذوق کا آئینہ دار ہے۔

اپنے ہماری بھر کم جتنے کے برعکس لوٹاریو گلٹ کے اعضائے تناسل کسی کمسن بچے کی طرح نوخیز تھے، لیکن یہ ضرور ایک با برکت نقص رہا ہو گا کیوں کہ انتہائی تجربہ کار طوائفوں میں بھی اس کے ساتھ سونے کا موقع حاصل کرنے کے لیے تکرار ہوتی تھی، اور پھر کو ٹھہری میں سے ان کی چٹخیں بلند ہوا کرتیں، جیسے انھیں فوج کیا جا رہا ہو، جن سے عمارت کی بنیادیں لرزنے لگتیں اور اس میں بے ہوش غزیت تک خوف سے کانپنے لگتے۔ کہا جاتا تھا کہ لوٹاریو گلٹ کے پاس سانپ کے زہر سے بنایا ہوا ایک مرہم ہے جس کے کٹنے سے عورتوں کے بدن جل اٹھتے ہیں، لیکن وہ قسم کھا کر کہتا تھا کہ وہ خدا کے دیے ہوئے وسائل کے سوا کچھ نہیں رکھتا۔ وہ ہنسی کے مارے بے حال ہوتے ہوئے کہتا: "یہ خالص محبت کا کرشمہ ہے۔" فلورنٹینو آریزا کو اس کی بات کا یقین کرنے کے لیے ابھی کئی سال درکار تھے۔ آخر کار اپنی جذباتی تعلیم کے اعلا درجے پر پہنچ کر جب وہ ایک ایسے شخص سے ملا جو بیک وقت تین عورتوں کو تصرف میں لاتے ہوئے ایک شاہانہ زندگی بسر کر رہا تھا، تو اسے قائل ہونا پڑا۔ وہ تینوں عورتیں صبح اس کے قدموں میں گر کر اپنی یافت اس کی نذر کرتیں، اپنی کم مائیگی پر شرمندہ ہوتیں اور التجا کرتیں کہ ان تینوں میں سے جس نے اسے سب سے زیادہ رقم پیش کی ہو وہ اس کے ساتھ بستر پر جائے۔ فلورنٹینو آریزا کا خیال تھا کہ ایسی تذلیل کا سبب صرف خوف ہی ہو سکتا ہے، لیکن ان میں سے ایک نے اس کے برعکس حقیقت کا اظہار کر کے اسے حیران کر دیا۔

"کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں،" وہ بولی، "جو صرف محبت کی خاطر کی جاتی ہیں۔"

لیکن لوٹاریو گلٹ کے اس ہوٹل کا سب سے معزز گاہک بننے میں اس کی جنسی صلاحیتوں کو اتنا دخل نہ تھا جتنی اس کی شخصیت کی کشش کو۔ فلورنٹینو آریزا نے بھی، اپنی کم گوئی اور گریزاں انداز کے سبب سے ہوٹل کے مالک کے دل میں جگہ بنائی، اور اپنی شدید تنہائی اور یاس کے وقتوں میں وہ ہوٹل کے کسی تنگ کمرے میں بند ہو کر شاعری اور آنسو بھری قسط وار کہانیاں پڑھا کرتا، اور اس کے خیالوں کی پرواز اسے سہ پہر کے سکوت میں، بالکنی میں لگے ہوئے سیاہ اباہیلوں کے گھونسلوں، اور بوس و کنار اور پَر پھر پھڑپھڑانے کی آوازوں سے دور لے جاتی۔ غروب آفتاب کے قریب جب موسم کی حدت کم ہو جاتی تو دوسرے کمروں میں دن بھر کے کام کے بعد خود کو عاجلانہ محبت سے تسکین دینے کے لیے آئے ہوئے مردوں کی گفتگو سے توجہ بٹھانا ناممکن ہو جاتا۔ اس گفتگو

کے کانوں میں پڑتے رہنے سے فلورنٹینو آریزا کو نہ صرف بہت سی بے وفائیوں کا بلکہ چند سرکاری رازوں کا بھی علم ہوا، جو بعض بااثر گاہک، اور یہاں تک کہ مقامی البکار، اس بات سے بے پروا ہو کر کہ ان کی آواز دوسرے کمروں میں سنی جاسکتی ہے، اپنی لہجائی محبوباؤں کو بتا رہے ہوتے تھے۔ اسی طرح اسے اس بات کا بھی پتا چلا کہ جزائر سوتاوینتو سے چار سمندری کوس کے فاصلے پر سمندر کی تہ میں ایک ہسپانوی جہاز موجود ہے جو اٹھارویں صدی میں چار کھرب پیسو کی مالیت کے طلائی سکوں اور جواہرات سمیت غرقاب ہو گیا تھا۔ اس قفسے نے اسے حیرت زدہ کر دیا، لیکن اس کا خیال اسے دوبارہ چند ماہ بعد آیا جب اس کے عشق نے اس کے دل میں اس غرقاب خزانے کے حصول کی ایک بے پناہ آرزو جگادی تاکہ فرینا دازا کو سر سے پاؤں تک سونے میں نہلایا جاسکے۔

برسوں بعد، جب وہ یاد کرنے کی کوشش کرتا کہ شاعری کی کیا گری سے مثالی صورت اختیار کر لینے والی دوشیزہ اصل میں کیسی تھی، تو وہ اپنے ذہن میں اُسے ان شاموں کی یاد سے جدا نہ کر سکتا تھا۔ اپنے پہلے خط کے جواب کے انتظار میں گزارے ہوئے اُن دنوں میں بھی، جب وہ اپنے تصور میں اسے دیکھا کرتا تو وہ اسے ایک سدا بہار اپریل کی سہ پہر میں دوسرے کی جھلجھلاہٹ کے درمیان بادام کے درختوں سے گرتے گٹھنوں کے نیچے دکھائی دیتی۔ کلیسا کی سرد خوانیوں میں وانکن بجانے کے لیے اس کے لوٹاریو گٹھ کے ساتھ جانے کی واحد وجہ یہ تھی کہ وہ اس مقام سے دیکھ سکتا تھا کہ مزامیر سے اٹھنے والے ہوا کے جموں میں فرینا دازا کا لباس کس طرح لہراتا ہے۔ لیکن اس کی بے خودی آخر اس لذت کی راہ میں رکاوٹ بن گئی کیوں کہ اسے کلیسا کی صوفیانہ موسیقی اپنی کیفیت سے اتنی مختلف اور اتنی بے روح محسوس ہوتی تھی کہ اس میں جان ڈالنے کے لیے اس نے غیر ارادی طور پر عشقیہ والز بجانے کی کوشش کی، اور لوٹاریو گٹھ کو اسے وہاں سے بٹانا پڑا۔ یہ وہ وقت تھا جب گارڈینیا کے پھول کھانے کی خواہش نے اس پر غلبہ پایا جو ترانزیتو آریزا دالان میں رکھے گھمیلوں میں اگایا کرتی تھی، وہ فرینا دازا کا ذائقہ محسوس کرنا چاہتا تھا۔ اور اسی زمانے میں ایک روز اسے اپنی ماں کے صندوق میں کولون کی ایک بوتل پڑی ملی جو ہیمبرگ آسیریکن لائن کے جہازی ممنوعہ سامان کے طور پر فروخت کیا کرتے تھے، اور وہ اپنی محبوبہ کے دیگر ذائقے دریافت کرنے کی خواہش میں اس خوشبو کو چکھنے کی ترغیب سے باز نہ رہ سکا۔ وہ صبح تک اس بوتل میں سے پیتا رہا اور تیز جُرعوں میں فرینا دازا کے نئے میں مست ہوتا رہا؛ پہلے وہ بندرگاہ کے مے خانوں میں گھومتا پھرا، اور پھر بندرگاہ کے ان پلوں پر سے جنہیں محبت کے مارے بے گھر جوڑے تسکین حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے، سمندر کو ٹکتا رہا یہاں تک کہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ترانزیتو

آریزا، جو صبح چھ بجے تک بے تابی سے اس کی راہ دیکھتی رہی تھی، انتہائی غیر اغلب ٹھکانوں میں اسے ڈھونڈتی پھری اور اس نے آخر کار دوپہر کے قریب، ساحل کے اس مقام پر جہاں ڈوبنے والوں کی لاشیں سمندر سے باہر آیا کرتی تھیں، اسے خوشبودار اُلٹیوں کے تالاب میں پڑا پایا۔

فلورنٹینو آریزا کی صحت یابی میں پڑنے والے اس رخنے سے اس کی ماں کو موقع مل گیا کہ خط کے انتشار میں اس کی بے بسی پر اسے ملامت کر سکے۔ اس نے اُسے آگاہ کیا کہ محبت کی سلطنت میں، جو ایک سفاک اور دشوار گزار سرزمین ہے، ناتوانوں کے داغوں کی کوئی گنجائش نہیں، اور عورتیں خود کو صرف مضبوط عزم کے مالک مردوں کے سپرد کرتی ہیں جو انہیں زندگی گزارنے کے لیے تحفظ فراہم کر سکیں۔ فلورنٹینو آریزا اپنی ماں کی اس نصیحت سے شاید کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گیا۔ ترانزیتو آریزا اپنے فخر کے احساس کو چھپا نہ سکی، جو مادرانہ سے زیادہ شوقانی تھا، جب اس نے فلورنٹینو آریزا کو سیاہ سُوث، نمہرے کے کلفت دار بیٹ، رنگین بو اور سیلولائیڈ کے کالر میں ملبوس دکان سے باہر نکلے دیکھا، اور مذاق کے طور پر پوچھا کہ کیا وہ کسی تدفین میں جا رہا ہے۔ اس کے کان کی لوہیں جل اٹھیں، اور اس نے جواب دیا: "تقریباً ایسی ہی بات ہے۔" ترانزیتو آریزا نے محسوس کیا کہ خوف سے فلورنٹینو آریزا کا سانس پھول رہا ہے، لیکن اس کا عزم ناقابل شکست ہے۔ اس نے ہنسی سے بے حال ہوتے ہوئے اسے آخری ہدایات اور دعائیں دیں، اور اس سے وعدہ کیا کہ اس کی فتح کے جشن کے لیے وہ کولون کی ایک بوتل میا کرے گی جسے وہ دونوں مل کر پیئیں گے۔

اسے فرینا داوا کو خط دیے ہوئے ایک مہینا گزر چکا تھا اور اس عرصے میں وہ باغ میں نہ جانے کا وعدہ کئی بار توڑ چکا تھا، لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ فرینا داوا اسے نہ دیکھ پائے۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ درختوں کے زیر سایہ سبق دو بجے تک جاری رہتا جب شہر قیلو لے سے بیدار ہو رہا ہوتا، اور پھر فرینا داوا اپنی پھوپھی کے ساتھ شام تک کڑھائی میں مشغول رہتی۔ فلورنٹینو آریزا نے پھوپھی کے اندر جانے کا انتشار نہ کیا اور اپنے گھٹنوں کی کمزوری پر قابو پانے کے لیے ایک عسکری انداز اختیار کر کے سرک پار کر لی، لیکن اس بار وہ فرینا داوا سے نہیں بلکہ اس کی پھوپھی سے مخاطب ہوا:

"مہربانی کر کے مجھے نوجوان خاتون کے ساتھ تنہا چھوڑ دیجیے،" وہ بولا۔ "مجھے اس سے ایک اہم بات کرنی ہے۔"

"تم کتنے گستاخ ہو!" اس کی پھوپھی نے کہا۔ "اس سے کی جانے والی کوئی بات ایسی نہیں جو میں نہ سن سکوں۔"

"تب میں کوئی بات نہیں کروں گا،" وہ بولا۔ "لیکن میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ نتائج کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔"

یہ انداز پھوپھی ایسکولسٹیکا کے خیال میں ایک مثالی محبوب کے شایان شان نہ تھا، لیکن وہ چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی کیوں کہ اسے پہلی بار شدید احساس ہوا کہ فلورنٹینو آریزاروچ اقدس کے زیر اثر بول رہا ہے۔ سو وہ سلاٹیاں تبدیل کرنے کے لیے مکان میں چلی گئی اور دونوں نوعمروں کو دروازے کے قریب بادام کے درختوں کے نیچے تنہا چھوڑ دیا۔

درحقیقت فرینا دارا اپنے کم گو خواستگار کے بارے میں بہت ہی کم جانتی تھی، جو موسم گما کی ابابیل کی طرح اچانک اس کی زندگی میں در آیا تھا، اور جس کا نام بھی اسے معلوم نہ ہوتا اگر اس نے خط کے آخر میں اپنے دستخط نہ کیے ہوتے۔ اسے صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ وہ ایک غیر شادی شدہ ماں کا یتیم بیٹا ہے جو ایک محنتی اور سنجیدہ عورت ہے، لیکن اپنی جوانی کی واحد غلطی کی بدنامی کا آتشیں داغ اب تک لیے ہوئے ہے۔ اسے پتا چلا تھا کہ وہ کوئی قاصد نہیں بلکہ ایک لائٹ اسٹنٹ ہے جس کا مستقبل تابناک ہے، اور اس کا خیال تھا کہ اس کا اس کے باپ کو ٹیلیگرام پہنچانے کے لیے آنا دراصل اس کو دیکھنے کا بہانہ تھا۔ اس خیال سے وہ خاصی متاثر ہوئی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کلیسا کے موسیقاروں میں سے ایک ہے، اور اگرچہ وہ کبھی عبادت کے دوران نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے کی ہمت نہ کر پائی، ایک اتوار کو اس پر انکشاف ہوا کہ دوسرے ساز سب لوگوں کے لیے بجتے ہیں لیکن وانکن کی آواز کی مخاطب صرف وہ ہوتی ہے۔ یہ شخص اس قسم کا نہ تھا جس کا اس نے انتخاب کیا ہوتا۔ اس کی یتیموں کی سی عینک، پادریوں کے سے لباس اور اس کی پراسرار صلاحیتوں نے اس کے دل میں تجسس تو بیدار کر دیا تھا، جس پر قابو پانا مشکل تھا، لیکن اس نے یہ کبھی تصور نہیں کیا تھا کہ یہ تجسس محبت کی بہت سی نقابوں میں سے ایک ہے۔

وہ خود بھی یہ نہ بتا سکتی تھی کہ اس نے وہ خط کیوں وصول کیا۔ اس نے اس بات پر خود کو ملامت نہیں کی، لیکن جواب دینے کا بڑھتا ہوا دباو اس کی زندگی میں پیچیدگی پیدا کرنے لگا۔ اپنے باپ کی گفتگو کے ہر لفظ، اس کی اتفاقی نظروں، اس کی نہایت معمولی حرکات و سکنات، ہر چیز میں اسے راز افشا کر دینے والے جاں نظر آنے لگے تھے۔ اس کو مستقل کھٹکا لگا رہتا تھا اور وہ کھانے کی میز پر خاموش رہتی کہ کوئی غلطی اس کا راز فاش نہ کر دے۔ وہ پھوپھی ایسکولسٹیکا سے بھی گریز کرنے لگی تھی لیکن وہ اس کے اضطراب میں اس طرح شریک تھی جیسے وہ خود اس سے گزر رہی ہو۔ فرینا دارا معمول کے برخلاف کسی بھی وقت خود کو غسل خانے میں بند کر لیتی، صرف اس خط کو ایک بار پھر پڑھنے کے لیے تاکہ اس کے تین سو چودہ حروف اور اٹھاون الفاظ اپنے اندر چھپا ہوا کوئی خفیہ رمز، کوئی طلسمی پیغام، اپنے ظاہری مضمون سے زیادہ کوئی معنی اس پر آشکار کر دیں۔ لیکن اسے ہر بار وہی کچھ معلوم ہوا جو اس نے خط کو پہلی بار پڑھنے پر جانا تھا، جب وہ دوڑ کر غسل خانے میں چھپ گئی

تھی اور بے قابو دھڑکنوں کے ساتھ ایک طویل پہچان خیز خط کی امید میں لفافے کو کھولا تھا، لیکن اسے خوشبو میں بسا ہوا ایک مختصر سا پیغام ملا جس کی قطعیت نے اسے خوف زدہ کر دیا۔

شروع میں اس نے سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا کہ اسے خط کا جواب بھی دینا ہوگا، لیکن خط اتنا واضح تھا کہ اس سے گریز کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس دوران اپنے شکوک کی اذیت میں اپنے آپ کو اس سے زیادہ کثرت سے فلورنٹینو آریزا کے بارے میں سوچتے پا کر جتنا وہ شعوری طور پر خود کو اجازت دے سکتی تھی، اسے حیرت ہوئی، اور بعض اوقات اس نے شدید یاس کے عالم میں خود سے سوال بھی کیا کہ آخر وہ اب اپنے مقررہ وقت پر باغ میں کیوں نظر نہیں آتا، یہ فراموش کرتے ہوئے کہ خود اسی نے اسے وہاں نہ آنے کی تاکید کی تھی جب تک وہ خط کا جواب تیار نہ کر لے۔

اور یوں وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی، جس طرح کسی کے بارے میں سوچنے کا اس نے کبھی تصور نہیں کیا تھا؛ وہ اسے وہاں دیکھتی جہاں وہ موجود نہیں تھا، اس کے ایسی جگہ پر ہونے کی خواہش کرتی جہاں اس کا ہونا ناممکن تھا، رات میں اس جسمانی احساس کے ساتھ جاگ اٹھتی کہ وہ اندھیرے میں سے اسے موائسراحت دیکھ رہا ہے، یہاں تک کہ جب ایک سہ پہر اس نے باغ میں گرے ہوئے خشک پتوں پر اس کے برعزم قدموں کی چاپ سنی تو اسے یہی لگا کہ یہ حقیقت نہیں بلکہ اس کے تخیل کی کارفرمائی ہے۔ لیکن جب اس نے ایک محکمانہ انداز سے، جو اس کی ناتوانی سے مطابقت نہ رکھتا تھا، اس سے خط کے جواب کا تقاضا کیا تو وہ اپنے خوف پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئی، اور اس نے اس موضوع سے کترانے کی کوشش میں سچ کا سہارا لیا؛ وہ نہیں جانتی کہ خط کا کیا جواب دے۔ لیکن فلورنٹینو آریزا نے وہ گہری خلیج اس لیے پار نہیں کی تھی کہ اس قسم کے بہانوں سے ٹل جاتا۔

"تم نے خط وصول کر لیا ہے،" وہ بولا، "تو اس کا جواب نہ دینا بد اخلاقی ہے۔"

یہ بھول جلیوں کا احتتام تھا۔ فرینا دارا نے اپنی خود اعتمادی بحال کر لی، جواب دینے میں تاخیر پر معذرت کی، اور اس سے وعدہ کیا کہ چھٹیوں کے ختم ہونے سے پہلے اسے خط کا جواب مل جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ فروری کے آخری حصے کو، اسکول کھلنے سے تین دن قبل، پھوپھی ایسکولتیکا یہ معلوم کرنے کے لیے تارگھر میں آئی کہ پینڈراس دمولیر نامی گاؤں کو تار بھینسنے پر کتنا خرچ آئے گا، جو ایک ایسا گاؤں تھا جس کا نام ٹیلیگراف کی فہرست تک میں نہ آتا تھا۔ اس نے فلورنٹینو آریزا کی زبانی اپنے استفسار کا جواب اس طرح سنا گویا اسے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو، لیکن جاتے ہوئے مگر مچھ کی کھال کا ایک چھوٹا سا بٹوا جان بوجہ کر کاؤنٹر پر بھول گئی جس میں دبیز کاغذ کا، سنہری بیل بوٹوں سے مزین ایک لفافہ تھا۔ مسرت سے بے خود ہو کر فلورنٹینو آریزا نے شام

کا بقیہ حصہ گلاب کی پتیاں کھاتے اور خط کو حرف بہ حرف بار بار پڑھتے ہوئے گزارا جتنا زیادہ وہ اس خط کو پڑھتا جاتا اتنے ہی زیادہ گلاب کھاتا جاتا، اور نصف شب تک وہ خط کو اتنی بار پڑھ چکا تھا اور اتنے گلاب کھا چکا تھا کہ اس کی مال کو اس کا سر مضبوطی سے پکڑ کر، پچھڑے کی طرح اس کے حلق میں انجیر کا تیل زبردستی اندر ملانا پڑا۔

یہ وہ سال تھا جب وہ دونوں ایک غارت گر محبت میں مبتلا ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں سوچتے رہنے، خواب دیکھنے، بے صبری سے خطوں کا انتظار کرنے اور اتنی ہی بے صبری سے ان کا جواب دینے کے سوا کچھ نہ کر سکتے تھے۔ نہ دیوانگی کی اس بہار میں، اور نہ اگلے سال انہیں ایک دوسرے سے مخاطب ہونے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ ایک دوسرے کو پہلی بار دیکھنے کے لمحے سے لے کر نصف صدی بعد کے اس لمحے تک جب فلورنٹینو آریزا نے اپنی محبت کی استواری کا دوبارہ اظہار کیا، انہیں تسنانی میں ملنے یا اپنی محبت کے بارے میں گفتگو کرنے کا کوئی موقع نہ ملا۔ لیکن پہلے تین ماہ میں کوئی دن ایسا نہ گیا جب انہوں نے ایک دوسرے کو خط نہ لکھا ہو، اور بعض دنوں میں وہ دو دو بار خط لکھا کرتے، یہاں تک کہ پچوپچی اسکولیتیکا اس آگ کے شعلوں سے خوف زدہ ہو گئی جس کو بھرکانے میں خود اس کی مدد شامل تھی۔

اس پہلے خط کے بعد سے، جسے وہ خود اس طرح تارگھر لے گئی تھی جیسے اپنی تقدیر سے انتقام لے رہی ہو، اس نے سرمک پر بظاہر اتفاقی مدبھیڑ کے بہانے خطوں کے اس روزانہ سلسلے کو جاری رکھنے کی اجازت دے رکھی تھی، لیکن وہ کسی قسم کی گفتگو کو روا رکھنے کی جرات نہیں کر سکتی تھی، چاہے وہ کتنی ہی معمولی اور سرسری کیوں نہ ہو۔ تاہم تین ماہ گزرنے پر اسے احساس ہوا کہ اس کی بختیجی کسی نوعمری کے مشغلے میں مبتلا نہیں ہے جیسا کہ اس نے پہلے پہل خیال کیا تھا، اور محبت کے ان شعلوں سے اس کی اپنی زندگی کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اسکولیتیکا داوا کے پاس اپنے بھائی کے رحم و کرم کے سوا زندگی گزارنے کا کوئی وسیلہ نہیں تھا، اور وہ جانتی تھی کہ اس کے بھائی کی سخت گیر فطرت اپنے اعتماد کو اس طرح ٹھیس پہنچائے جانے کو کبھی معاف نہ کرے گی۔ لیکن جب آخری فیصلے کا وقت آیا تو وہ اپنی بختیجی کو وہ صدمہ پہنچانے کا حوصلہ نہ کر سکی جو وہ خود اپنی جوانی کے دنوں سے اب تک برداشت کرتی چلی آئی تھی، اور اس نے فرینا داوا کو ایسی حکمت عملی اختیار کرنے کی اجازت دے دی جس سے اس کی معصومیت کا بھرم قائم رہے۔ یہ طریقہ بہت سادہ تھا: فرینا داوا اپنے گھر سے اسکول جاتے ہوئے راستے میں کسی پوشیدہ جگہ اپنا خط چھوڑ دیتی اور خط میں فلورنٹینو آریزا کو اشارہ دے دیتی کہ جواب کس جگہ چھپائے۔ وہ بھی ایسا ہی کیا کرتا۔ اس طرح سال کے بقیہ دنوں میں پچوپچی اسکولیتیکا کے ضمیر میں ہونے والی شکمش گرجا گھروں کی

ہیسمہ گاہوں، درختوں کی دراڑوں اور پرانی اُجاڑ نو آبادیاتی حویلیوں کے کونوں کچھروں میں منتقل ہو گئی۔ بعض موقعوں پر یہ خط بارش میں بھیگ جاتے، کیڑوں میں لٹھڑ جاتے، بد قسمتی کے ہاتھوں پھٹ جاتے، یا کسی اور وجہ سے گم ہو جاتے، لیکن وہ دونوں ایک دوسرے سے دوبارہ رابطہ پیدا کرنے کا کوئی نہ کوئی ذریعہ نکال لیتے۔

فلورنٹینو آریزا ہر روز رات میں خط لکھا کرتا۔ وہ دکان کے پچھلے کمرے میں متواتر خط لکھنے کے دوران چراغ کے دھوس سے خود کو رفتہ رفتہ بے رحمی کے ساتھ ہلاک کرتا رہا، اور جوں جوں وہ پاپولر لائبریری کے شائع کیے ہوئے اپنے پسندیدہ شاعروں کے مجموعوں کی، جن کی تعداد اب اسی تک پہنچ چکی تھی، نقالی کرتا گیا، اس کے خط زیادہ طویل اور زیادہ دیوانگی کے شکار ہوتے گئے۔ اس کی ماں، جس نے خود ہی اتنے شوق سے اسے عشق کا کرب سننے کی نصیحت کی تھی، اب اس کی حالت کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہو گئی۔ "تم اپنا داغ بھلا کر لو گے،" صبح مرغ کی پہلی بانگ پر وہ اپنی خواب گاہ سے چلا کر بولی۔ "کوئی عورت اس دیوانگی کی مستحق نہیں ہے۔" اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے اپنی ساری زندگی میں کسی شخص کو اس بے پناہ جذبے کی حالت میں دیکھا ہو۔ لیکن فلورنٹینو آریزا نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ کبھی کبھی تو وہ رات کو پلک جھپکائے بغیر صبح، راستے میں اپنے پیٹے سے ملے کیے ہوئے مقام پر خط چھپانے کے بعد، کہ وہ فرینا دازا کو اسکول جاتے ہوئے مل جائے، دفتر چلا جاتا؛ اس کے بال محبت کے طوفان کی زد میں آ کر بکھرے ہوئے ہوتے۔ دوسری طرف وہ گھر پر اپنے باپ کی، اور اسکول میں راہباؤں کی نگراں آنکھوں سے بچ کر غل خانے میں چھپ کر یا کلاس میں نوٹس لینے کے بہانے پر مشکل آدھا صفحہ لکھ پاتی۔ لیکن یہ محض فرصت کی کمی یا پکڑے جانے کے خطرے کے باعث نہیں تھا، یہ اس کی اپنی طبیعت بھی تھی جو اسے خطوں میں جذباتیت کا شکار ہونے سے بچاتی اور کسی جہاز کی لاگ بک کے سے سیدھے سادے انداز میں اپنی روزمرہ زندگی کے واقعات تک محدود رہنے پر مجبور کرتی تھی۔ درحقیقت یہ بڑے آشفٹہ خطوط تھے جن سے اس کا مقصد آگ میں ہاتھ ڈالنے بغیر انگاروں کو جلانے رکھنا تھا، جب کہ فلورنٹینو آریزا ایک ایک سطر میں خود کو زندہ جلا رہا ہوتا تھا۔

اسے بھی اپنی دیوانگی کے حصار میں کھینچ لانے کے لیے اس نے کمیلیا کی پتیوں پر اپنے ناخن سے بہت باریک خط میں شعر لکھ کر بھیجے۔ یہ وہی تھا، نہ کہ فرینا دازا، جس نے بے باکی سے اپنے بالوں کی ایک لٹ کاٹ کر ایک خط میں رکھ بھیجی، لیکن اسے وہ جواب کبھی نہ ملا جس کی اسے تمنا تھی، یعنی فرینا دازا کی دراز زلفوں کا ایک تار۔ وہ اسے صرف ایک قدم آگے آنے پر آمادہ کر سکا، اور اس کے بعد سے فرینا دازا ڈکٹریوں کے صفحات میں رکھی سوکھی پتیاں، اور تیلیوں اور

طلسمی پرندوں کے پر خطوں میں رکھ کر بھیجنے لگی، اور فلور نینینو آریزا کی سالگرہ پر اس نے سینٹ پیٹر کلیور کی عبا سے ایک مربع سنٹی میٹر کا ٹکڑا بھیجا، جسے اُن دنوں خفیہ طور پر فروخت کیا جا رہا تھا اور جس کی قیمت اس عمر کی لڑکی کی پہنچ سے کہیں باہر تھی۔ ایک بار، بغیر کسی پیشگی اطلاع کے، فرینا دازا کی آنکھ کھلی اور وہ ایک تنہا والکن پر ایک ہی والز کی دُھن بار بار بجتے سن کر چونک اٹھی۔ وہ اس احساس سے کانپ گئی کہ اس دُھن کا ایک ایک سُراس کی بھیجی ہوئی پتیوں، کلاس میں خط لکھنے کے لیے چرائے ہوئے لمبوں اور امتحان سر پر ہونے کے باوجود نیچرل سائنس کے بجائے اُس کے خیالات میں مورہ بنے پر اس کا ٹکڑیہ ادا کرنے کے لیے ہے، لیکن وہ یہ تسلیم کرنے کا حوصلہ نہ کر سکی کہ فلور نینینو آریزا اتنا بے باک بھی ہو سکتا ہے۔

صبح ناشتے کی میز پر لوریئرو دازا اپنے تجسس پر قابو نہ رکھ سکا: ایک تو اس وجہ سے کہ وہ اس بات سے ناواقف تھا کہ سیریناد کی زبان میں ایک ہی دُھن کو بار بار بجانے کے کیا معنی ہیں، اور دوسرے اس باعث کہ باوجود غور سے سننے کے وہ یہ اندازہ لگانے میں ناکام رہا تھا کہ اس دُھن کا مخاطب کون سا مکان ہے۔ پھوپھی ایسکولتیکا نے، اتنے اطمینان سے جس سے اس کی بھتیجی کا سانس رک گیا، بتایا کہ والکن بجانے والے کو اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باغ کی دوسری طرف کھڑے ہوئے دیکھا تھا، اور اس نے یہ بھی بتایا کہ، بہر حال، ایک ہی دُھن کو بار بار بجانا ٹوٹے ہوئے تعلق کی علامت ہے۔ اس دن کے خط میں فلور نینینو آریزا نے تصدیق کی کہ سیریناد بجانے والا وہی تھا، اور یہ کہ والز کی وہ دُھن بھی اسی نے ترتیب دی تھی اور اس کا نام بھی وہی رکھا تھا جس سے وہ دل ہی دل میں فرینا دازا کو پکارتا تھا: "تاج دار دیوی"۔ اس نے اس کے بعد باغ میں یہ دُھن کبھی نہیں بجائی لیکن چاندنی راتوں میں وہ اس کے لیے ایسی جگہوں کا انتخاب کرتا جہاں سے فرینا دازا اپنی خواب گاہ میں بغیر کسی خوف کے یہ دُھن سن سکے۔ اس کی پسندیدہ جگہوں میں سے ایک، گداگروں کا قبرستان تھا، جو کھلے آسمان تلے ایک مٹلس پہاڑی کی ڈھلان پر تھا اور جس میں دھوپ اور بارش سے بچاؤ کا کوئی بندوبست نہ تھا؛ وہاں گدے میٹھے اونگھا کرتے تھے اور موسیقی میں ایک آسمانی گونج پیدا ہو جاتی تھی۔ بعد میں وہ ہوائے رَح کا اندازہ لگانا سیکھ گیا اور اس طرح اسے یقین ہو گیا کہ اس کی دُھن وہاں تک پہنچ رہی ہے جہاں وہ پہنچانا چاہتا ہے۔

اس سال اگست میں ایک نئی خانہ جنگی شروع ہو گئی، جو ان بہت سی خانہ جنگیوں میں سے ایک تھی جنہوں نے نصف صدی سے زیادہ عرصے سے ملک میں تباہی مچا رکھی تھی۔ اس کے پھیلنے کے اندیشے سے حکومت نے کریبینین کے ساحلی علاقوں میں مارشل لا اور چھبے کا کرفیو نافذ کر دیا۔ اگرچہ کچھ ناخوشگوار واقعات ہو چکے تھے اور فوجیوں نے جواب میں ہر طرح کی زیادتی روار کھی تھی،

لیکن فلورنتینو آریزا اتنا مدہوش تھا کہ اسے حالات کی کچھ خبر نہ تھی؛ اور ایک صبح، جب وہ اپنی عاشقانہ نعمتی سے مُردوں کی نیند میں خلل ڈال رہا تھا، ایک گشتی دستے نے اسے گرفتار کر لیا۔ کسی معجزے کے تحت وہ فوری سزائے موت سے بچ گیا جب سرسری مقدمے میں اس پر جاسوس ہونے کا الزام لگایا گیا جو ساحل کے قریب کارروائیوں میں مصروف لبرل پارٹی کی کشتیوں کو 'G' کے سُرمے میں گنجل بھیج رہا تھا۔

"جاسوس؟ کیا مطلب؟" فلورنتینو آریزا نے کہا۔ "میں تو صرف ایک عاشق ہوں۔" تین راتوں تک اسے مقامی گیریزن کی ایک کوٹھڑی میں پنڈلیوں کو جکڑی ہوئی آہستی سلاخوں کے ساتھ سونا پڑا۔ جب اسے رہا کیا گیا تو اس نے اپنی قید کے اتنا مختصر ہونے پر خود کو فریب خوردہ محسوس کیا، اور بعد میں اپنے بڑھاپے میں بھی، وہ یہ سوچا کرتا تھا کہ پورے شہر میں، بلکہ شاید پورے ملک میں، وہ واحد آدمی ہے جسے محبت کی خاطر پانچ پونڈ وزنی لوہے کی بیڑیاں گھسیٹنی پڑی ہیں۔

ان کی مجنونانہ خط و کتابت کو شروع ہوئے دو برس ہوئے تھے کہ فلورنتینو آریزا نے صرف ایک پیرا گراف پر مشتمل خط میں فرینا دازا سے شادی کی باقاعدہ درخواست کی۔ اس سے پہلے کے چھ مہینوں میں کسی بار اس نے فرینا دازا کو کھیلیا کا سفید پھول خط میں رکھ کر بھیجا تھا، اور اس نے ہر بار اگلے خط میں اسے واپس کر دیا تھا، تاکہ فلورنتینو آریزا کو اس بات میں کوئی شبہ نہ رہے کہ وہ اس خط و کتابت کو جاری رکھنا چاہتی ہے لیکن کسی وابستگی کی شدت کے بغیر۔ سچ یہ ہے کہ کھیلیا کے پھولوں کی آمدورفت کو اس نے کبھی محبت کرنے والوں کے دلچسپ کھیل کے سوا کچھ نہ سمجھا تھا، اور اسے کبھی خیال نہ آیا تھا کہ یہ اس کی تقدیر کا ایک دورِ بابا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن جب شادی کی باقاعدہ درخواست آئی تو اس نے پہلی بار خود کو موت کے ناخنوں سے زخمی ہوتا محسوس کیا۔ اس نے شدید اضطراب کے عالم میں یہ بات پھوپھی ایکولتیکا کو بتائی، جس نے اسے اُس جرأت اور وضاحت کے ساتھ مشورہ دیا جو اسے بیس سال کی عمر میں، اپنی تقدیر کا فیصلہ کرتے وقت، میسر نہ تھی۔

"ہاں کہہ دو،" وہ بولی، "چاہے خوف کے مارے تمہارا دم ہی کیوں نہ نکل رہا ہو، اور چاہے تمہیں بعد میں اس پر پھجھتاوا ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ اگر تم نے انکار کر دیا تو پھر شتم کچھ بھی کرو، تمہاری تمام بقیہ زندگی افسوس میں گزرے گی۔"

فرینا دازا البتہ اتنی الجھن میں تھی کہ اس نے غور کرنے کا وقت طلب کیا۔ پہلے اس نے ایک مہینے کی مہلت مانگی، پھر دو، پھر تین، اور جب چوتھا مہینا بھی جواب کے بغیر گزر گیا تو اسے

ایک بار پھر کمیلیا کا سفیر بھول ملا، لیکن پچھلے موقعوں کے برعکس ایک تاکید می تحریر بھی ساتھ تھی، کہ یہ آخری بار ہے: آب یا کبھی نہیں۔ اس سہ پہر، موت کی جھلک دیکھنے کی باری فلور نٹینو آریزا کی تھی جب اسے لفافے میں اسکول کی نوٹ بک کے اوپر والے سادے حصے سے پھاڑا ہوا ایک لمبا سا پُرزد ملا جس پر پینسل سے اس کے سوال کا ایک سطری جواب تحریر تھا: "ٹھیک ہے، میں تم سے شادی کر لوں گی، بشرطے کہ تم مجھے بیگنن نہ کھلانے کا وعدہ کرو۔"

فلور نٹینو آریزا اس قسم کے جواب کے لیے تیار نہ تھا، لیکن اس کی ماں تیار تھی۔ چھ مہینے پہلے جب فلور نٹینو آریزا نے اسے اپنے شادی کے ارادے سے آگاہ کیا تھا، اس نے پورا مکان کرائے پر لینے کے لیے بات چیت شروع کر دی تھی، جس میں اس وقت دو اور خاندان بھی آباد تھے۔ سترھویں صدی کا بنا ہوا یہ دو منزلہ مکان ہسپانوی حکومت کے دور میں تمباکو کا کارخانہ رہ چکا تھا، اور اس کے تباہ حال مالکان اسے مختلف حصوں میں کرائے پر چڑھانے کے لیے مجبور تھے، کیوں کہ وہ اس کی دیکھ بھال کی استطاعت نہ رکھتے تھے۔ اس کا ایک حصہ سرک کے مقابل تھا جہاں کبھی تمباکو کی دکان رہ چکی تھی، دوسرا حصہ پتھریلے صحن کے پیچھے واقع تھا جہاں کارخانہ ہوا کرتا تھا، اور اس میں ایک بہت بڑا اصطبل تھا جسے مکان کے موجودہ کرایہ دار کپڑے دھونے اور سکھانے کے لیے مشترک طور پر استعمال کرتے تھے۔ ترانزیستو آریزا کے پاس سامنے والا حصہ تھا، جو سب سے بہتر حالت میں تھا، لیکن سب سے چھوٹا تھا۔ اس کی دکان تمباکو والی پرانی دکان میں واقع تھی، جس کا بڑا سا دروازہ سرک کی طرف کھلتا تھا، اور اس کے پہلو میں سابقہ گودام تھا جس میں ہوا کی آمد و رفت کے لیے صرف چھت کا روشندان تھا۔ اس میں ترانزیستو آریزا سویا کرتی تھی۔ آدھا رقبہ گودام نے گھیر رکھا تھا جسے لکڑی کی دیوار نے دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اس میں ایک میز اور چار کرسیاں تھیں جو کھانے اور لکھنے پڑھنے دونوں کے کام آتی تھیں، اور یہیں، اگر اسے رات کو خط لکھنے سے فرصت ملتی، فلور نٹینو آریزا اپنا جھولنا لٹکا لیتا تھا۔ یہ جگہ ان دونوں کے لیے کافی تھی لیکن اس میں کسی بھی تیسرے شخص کی گنجائش نہ تھی، مریم عذرا کی اکادمی کی پڑوسی ہوتی ایک معزز نوجوان خاتون کا تو ذکر بھی کیا جس کے باپ نے اس زمانے میں ایک پرانی حویلی خرید کر اسے نیا کروایا تھا، جب کہ سات خطابات کے مالک خاندان ہررات اس خوف کے عالم میں سویا کرتے تھے کہ ان کے محلوں کی چھت ان پر آرہے گی۔ اس لیے ترانزیستو آریزا نے مکان کے مالکوں سے مل کر صحن کے سامنے کا حصہ بھی، پانچ سال تک مکان کی دیکھ بھال اور مرمت کا خرچ اٹھانے کے عوض، اپنے تصرف میں لانے کا معاملہ طے کر لیا۔

اس کے پاس اس کے لیے وسائل تھے۔ دکان کی نقد آمدنی کے علاوہ، جو اس کی منکسر

زندگی کے لیے کافی تھی، اس نے اپنی بچت کو نئے نئے مفلس ہونے والے ہر مندہ معزز خاندانوں کو قرض دے دے کر بہت بڑھالیا تھا؛ وہ لوگ اس کی اونچی شرح سود کو اس کی رازداری کے عوض قبول کر لیا کرتے تھے۔ ہلاکوں جیسی نمکنت والی خواتین ملازموں یا خاندانوں کے واسطے کے بغیر دکان کے سامنے اپنی گاڑیوں سے اترتیں، اور بظاہر ولندیزی بیبلوں یا سنہری کناریوں کی خریداری کرتے ہوئے، سکویوں کے درمیان اپنی گم گشتہ جنت کی یادگار، آخری دکتے ہوئے زیور گروی رکھ دیا کرتیں۔ ترانزیتو آریزا انہیں ان کی دشواریوں سے نجات دلانے میں ان کے خاندانی مقام کا اتنا پاس کرتی کہ وہ واپس جاتے ہوئے اپنی مشکل کے حل سے زیادہ اس کے احترام کے لیے ممنون ہوتیں۔ دس سال سے کم عرصے میں وہ ان تمام زیورات کو، جو بار بار بچھڑائے اور پھر گروی رکھے جاتے تھے، یوں پہچاننے لگی تھی جیسے وہ اس کے اپنے ہوں، اور جب اس کے بیٹے نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کا منافع سونے سے بھرے مرتبان کی صورت میں اس کی مسہری کے نیچے پوشیدہ تھا۔ تب اس کو حساب کتاب سے یہ معلوم ہوا کہ وہ اس مکان کو نہ صرف پانچ سال تک اچھی حالت میں رکھ سکتی ہے بلکہ، اپنی کاروباری سوجھ بوجھ اور تھوڑی سی خوش قسمتی کی مدد سے، مرنے سے پیشتر اسے خرید بھی سکتی ہے تاکہ اس میں اس کے بارہ پوتے پوتیاں رہ سکیں جن کی اسے آرزو تھی۔ دوسری طرف فلورنٹینو آریزا کو تارگھر میں فرسٹ اسٹنٹ کا عارضی عہدہ بھی مل چکا تھا اور لوٹاریو گنٹ ایک سال بعد اسے دفتر کا سربراہ دیکھنا چاہتا تھا جب وہ رٹائر ہو کر میکسیکو آئی اور مقناطیسیات کی ایک درس گاہ کھولنے والا تھا۔

اس طرح شادی کے عملی پہلوؤں کی تیاری مکمل تھی۔ پھر بھی ترانزیتو آریزا دو فیصلہ کن شرائط خاند کرنا ضروری سمجھتی تھی۔ ایک تو وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ لوریئزو داوا در حقیقت کون ہے؛ اگرچہ اس کے لیے کی وجہ سے اس کے آبائی وطن کے بارے میں کسی شبہ کی گنجائش نہ تھی، لیکن کسی شخص کو اس کے پس منظر اور ذریعہ آمدنی کے بارے میں یقینی طور پر کوئی علم نہ تھا۔ دوسری شرط یہ تھی کہ منگنی کا عرصہ کافی طویل رکھا جائے، تاکہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جان لیں اور منگنی کا اس وقت تک اعلان نہ کیا جائے جب تک دونوں اپنی محبت کے حقیقی ہونے کا یقین نہ کر لیں۔ اس نے تجویز پیش کی کہ شادی کی تاریخ کے لیے خانہ جنگی کے خاتمے کا انتظار کیا جائے۔ فلورنٹینو آریزا رازداری کی تجویز سے متفق تھا، نہ صرف اپنی ماں کے پیش کردہ اسباب کی بنا پر، بلکہ اپنی گوشہ نشین طبیعت کے باعث بھی۔ اسے شادی میں تاخیر پر بھی اعتراض نہ تھا لیکن اس تاخیر کی میعاد اسے حقیقت پسندانہ معلوم نہ ہوتی تھی، اس لیے کہ آزادی کے بعد کے پچاس برسوں میں ملک کو خانہ جنگیوں سے ایک دن کے لیے بھی نجات نہیں ملی تھی۔

"اس انتظار میں تو ہم دونوں بوڑھے ہو جائیں گے،" اس نے کہا۔

اس کے دینی باپ، ہوسپیڈنگ معلق نے، جو اس گفتگو میں شریک تھا، یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ خانہ جنگی شادی کی راہ میں کوئی رکاوٹ بن سکتی ہے۔ اس کے خیال میں خانہ جنگیاں کسانوں اور برہنہ پاسبانیوں کے درمیان کش مکش کے سوا کچھ نہیں تھیں؛ کسانوں کو ان کے جاگیردار بیلوں کی طرح بانک رہے تھے اور پاسبانیوں کی پشت پناہی حکومت کر رہی تھی۔

"خانہ جنگی پہاڑوں میں ہو رہی ہے"، اس نے کہا۔ "جب سے مجھے یاد ہے اس وقت سے شہروں میں ہمیں گولیوں سے نہیں بلکہ فراہین سے قتل کیا جاتا ہے۔"

بہر کیف، اگلے چند ہفتوں کی خط و کتابت میں ان دونوں نے منگنی کی تمام تفصیلات طے کر لیں۔ فرینا دازا نے پوچھی ایسکولتیکا کے مشورے پر دو سال کی تاخیر اور نسبت کی رازداری کی شرائط مان لیں، اور تجویز پیش کی کہ ثانوی اسکول کی تعلیم ختم ہونے کے بعد والی کرسس کی تعطیلات میں فلورنٹینو آریزا اس کے رشتے کی باقاعدہ درخواست کرے؛ جب وقت آنے کا تو وہ یہ تفصیلات بھی طے کر لیں گے کہ منگنی کی رسم کس طرح ادا کی جائے، کیوں کہ اس کا انصرار اس بات پر ہے کہ فرینا دازا کا باپ کس حد تک رضامند ہوتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی خط و کتابت پہلے کی طرح جوش و خروش اور پابندی سے جاری رکھی لیکن اب وہ اس کرب سے آزاد تھے جو انھیں اس سے پہلے محسوس ہوتا تھا، اور اب ان کے خطوں میں وہ انداز پیدا ہو گیا تھا جو شوہر اور بیوی کے لیے مناسب معلوم ہوتا۔

فلورنٹینو آریزا کی زندگی میں تبدیلی آگئی تھی۔ محبت کا جواب ملنے سے اس میں وہ اعتماد اور قوت پیدا ہو گئی تھی جس سے وہ پہلے واقف نہ تھا، اور وہ دفتر کا کام بھی اتنی مستعدی سے کرنے لگا تھا کہ لوٹاریو گنٹ کو اس کی ملازمت کو مستقل کرانے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ اس وقت تک لوٹاریو گنٹ کا ٹیلیگرافی اور مقناطیسیات کی درس گاہ کھولنے کا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا، اور وہ اپنا فارغ وقت انہی مشاغل میں گزارنے لگا تھا جن میں اسے سب سے زیادہ لطف آتا تھا: بندرگاہ پر جا کر اکارڈین بجانا اور مذاحوں کے ساتھ بیٹھ کر بیس پینا اور شام ڈھلے ہوٹل میں پہنچ جانا۔ فلورنٹینو آریزا کو یہ بات ایک طویل عرصے بعد معلوم ہوئی کہ عشرت کی اس آماج گاہ میں لوٹاریو گنٹ کے رسوخ کا اصل باعث یہ تھا کہ وہ نہ صرف اس کاروبار کی ملکیت میں حصہ دار ہو گیا تھا بلکہ رات کے پرندوں کے لیے بندرگاہ میں گماشتے کا کام بھی کرنے لگا تھا۔ اس کاروبار کو اس نے اپنی برسوں کی بچت سے خرید لیا تھا، اور اس نے اس کے انتظام کے لیے ایک دہلے پتے، یک چشم، پستہ قد آدمی کو مقرر کیا تھا جس کا سر بالکل صاف تھا اور مزاج اتنا نرم اور مہربان کہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ

وہ کس طرح اچھا منتظم ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ واقعی بڑا اچھا منتظم تھا؛ کم از کم فلورنٹینو آریزا کو ایسا ہی لگا جب اسے معلوم ہوا کہ درخواست کیے بغیر، اس کے لیے ہوٹل میں ایک کمرہ مستقل طور پر مخصوص کر دیا گیا ہے، نہ صرف اس غرض سے کہ وہ جب چاہے اپنے زیرنات مسائل کو حل کر لیا کرے بلکہ اس لیے بھی کہ اسے کتابیں پڑھنے اور حقیقی خطوط لکھنے کے لیے ایک خاموش اور پرسکون جگہ ہمیشہ میسر رہے۔ اور جوں جوں انتشار کے طویل مہینے ایک ایک کر کے گزرتے گئے، وہ اپنے دفتر اور گھر سے کہیں زیادہ وقت ہوٹل میں بسر کرنے لگا، اور بعض موقعے تو ایسے آتے تھے کہ ترانزیٹو آریزا کو اس کی شکل صرف اس وقت نظر آتی جب وہ کپڑے بدلنے گھر آیا کرتا۔

کتابیں پڑھنے کے شغل نے اس کے لیے نہ بچھنے والی بوس کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جب اس کی ماں نے اسے پڑھنا سکھایا تھا تو اسے ٹارڈن مصنفوں کی باتویر کتابیں خرید کر دی تھیں، جنہیں بچوں کی کہانیوں کے طور پر فروخت کیا جاتا تھا لیکن جو دراصل کسی بھی عمر میں پڑھنے کے لیے نہایت ظالمانہ، پُر تشدد اور کج رو کتابیں تھیں۔ پانچ سال کی عمر کو پہنچنے تک فلورنٹینو آریزا کو یہ کتابیں کوس میں اور اسکول کی ادبی شاموں میں پڑھتے پڑھتے زبانی یاد ہو چکی تھیں، لیکن اس آشنائی سے بھی اس دہشت میں کوئی فرق نہیں آیا جو انہیں پڑھ کر اس پر طاری ہو جایا کرتی تھی، بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوا۔ لہذا جب اس نے شاعری کو دریافت کیا تو ان کتابوں کے مقابلے میں وہ اسے سکون کا ایک نخلستان لگی۔ اسنے لڑکپن میں بھی پاپولر لائبریری کے چھاپے ہوئے شعری مجموعے جس ترتیب سے اس کے ہاتھ لگتے وہ بے تابی سے پڑھتا جاتا۔ یہ مجموعے اس کے لیے ترانزیٹو آریزا منشیوں کے چوک کے کتب فروشوں سے ہوا تاو کر کے خریدا کرتی تھی جن کے پاس ہومر سے لے کر غیر اہم ترین مقامی شاعروں تک کا کلام دستیاب تھا۔ لیکن وہ ان میں کوئی امتیاز نہ کرتا تھا؛ وہ ہاتھ لگنے والی ہر چیز کو، گویا اپنی تھدیر کا نوشتہ جان کر، پڑھا کرتا تھا، اور اپنے برسوں کے مطالعے کے بعد بھی وہ تمیز نہ کر سکتا تھا کہ اس کی پڑھی ہوئی کتابوں میں کون سی اچھی تھیں اور کون سی نہیں۔ صرف ایک بات اس پر واضح تھی کہ اسے نشر کے مقابلے میں شاعری زیادہ پسند تھی؛ اور شاعری میں بھی وہ محبت کی نظموں کو ترجیح دیتا تھا جو صرف دو بار پڑھ کر اسے بلا کوشش زبانی یاد ہو جایا کرتیں۔ ان کی بحر میں اور قافیے جتنے زیادہ رواں، اور مضامین جتنے زیادہ المناک ہوتے، اتنی ہی آسانی سے وہ انہیں حفظ کر لیا کرتا تھا۔

یہ فرینا دازا کے نام اس کے اولیں خطوط کے، آخذ تھے، ہسپانوی رومان پرستوں سے حرف بہ حرف اٹھائے ہوئے نیم پختہ اظہار عشق؛ اور اس کے خطوط اسی رومیں جاری رہے، یہاں تک کہ حقیقت کی دنیا نے اسے دردِ دل کی بہ نسبت پیش پا افتادہ معاملات پر زیادہ توجہ دینے پر مجبور کر دیا۔

اس وقت تک وہ رقت انگیز قسط وار ناولوں، اور اس زمانے کی اس سے بھی زیادہ مبتذل نشر پر آگیا تھا۔ اس نے مشترکہ مطالعے کے دور ان اپنی ماں کے ساتھ مقامی شاعروں کے ان گلدستوں پر آنسو بہانا سیکھ لیا تھا، جو شہر کے ہر چوک پر دو دو سنتاؤں میں فروخت ہوا کرتے تھے۔ لیکن اسی زمانے میں وہ عہد زریں کی کاسٹیلیئن شاعری کو حفظ کرنے پر بھی قادر ہو چکا تھا۔ مختصر یہ کہ وہ اپنی راہ میں آنے والی ہر شے، اسی ترتیب سے، پڑھنے کا عادی تھا، یہاں تک کہ اپنے پہلے عشق کے ان دشوار برسوں کے بہت بعد، جب اس کا شباب رخصت ہو چکا تھا، وہ گارنیر برادران کی مکمل مطبوعات پر مشتمل بیس جلدیں، پہلے صفحے سے آخری صفحے تک پڑھنے والا تھا۔ ترجمہ شدہ ادبِ عالیہ سے لے کر سہل ترین تحریروں کے مقامی سسٹے ایڈیشنوں تک، ہر چیز۔

تاہم اس بوٹل میں اس کی نوعمری کی سرگرمیاں کتابیں پڑھنے اور دیوانگی کے خطوط لکھنے تک محدود نہ تھیں، بلکہ ان میں بے محبت عاشقی کے اسرار سے اس کا تعارف بھی شامل تھا۔ اس عمارت میں زندگی دوبہر کے بعد شروع ہوتی تھی جب رات کے پرنندوں کی، جن سے اب اس کی دوستی ہو چکی تھی، اسی حالت میں آنکھ کھلتی جس حالت میں وہ پیدا ہوئی تھیں۔ لہذا جب فلورنٹینو آریزا کام کے بعد یہاں پہنچتا تو عمارت برہنہ حوروں سے بھری ہوتی، جو بلند آوازیں شہر کے ان رازوں پر تبصرہ کر رہی ہوتی تھیں جو خریداروں نے اپنی وفاداری کے ثبوت کے طور پر ان تک پہنچائے تھے۔ ان کی برہنگی ان میں سے بہت سوں کے ماضی کے نشانات آشکار کر رہی ہوتی تھی؛ پیٹ میں چاقو کے وار کے نشان، بندوق کی گولی کے چھروں کے زخم، محبت میں لگے ہوئے بلیڈ کے زخموں کی لکیریں، قسائیوں کے کیے ہوئے اسقاط کی یادگاریں۔ ان میں سے بعض کے ساتھ ان کے کمرس پچے بھی تھے جو ان کی پرشہاب بغاوت یا بے احتیاطی کی پیدوار تھے؛ وہ ان بچوں کے داخل ہوتے ہی ان کے بھی کپڑے اتار دیتیں تاکہ وہ برہنگی کی اس جنت میں خود کو الگ محسوس نہ کریں۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنا کھانا خود تیار کیا ہوتا تھا، اور ان میں سب سے بہتر غذا فلورنٹینو آریزا کو ملتی تھی، کیوں کہ وہ ان کی دعوت پر ان میں سے ہر ایک کی پکائی ہوئی بہترین چیز منتخب کرتا تھا۔ یہ روزانہ ضیافت دن ڈھلنے تک جاری رہتی، اور پھر تمام برہنہ عورتیں گاتی ہوئی غسل خانوں کی طرف روانہ ہو جاتیں؛ وہ ایک دوسرے سے صابن، ٹوتھ برش اور قینچیاں ادھار مانگتیں، ایک دوسرے کے بال سنوارتیں، مانگے کے کپڑے پہنتیں، خود کو غم انگیز مسخروں کی طرح رنگوں سے پوت لیتیں، اور رات کے پہلے شکار کی تلاش میں نکل جاتیں۔ تب سے لے کر اس مکان میں زندگی غیر انسانی اور غیر شخصی شکل اختیار کر لیتی اور اس میں حصہ لینا رقم ادا کیے بغیر ممکن نہ

رہتا۔

فرینا دازا سے آشنا ہونے کے بعد سے فلورنٹینو آریزا کا دل اس جگہ سے زیادہ کمپیں نہ لگتا تھا، کیوں کہ یہاں اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ فرینا دازا کے ساتھ ہے۔ شاید ایسے ہی کسی سبب سے ایک خوش شکل عمر رسیدہ عورت نے بھی مستقل قیام کے لیے اس ہوٹل کو منتخب کر لیا تھا، وہ وہاں رہنے کے باوجود بربنہ عورتوں کی بے حجاب زندگی میں شریک نہ تھی، لیکن وہ تمام عورتیں اُس کا کسی مذہبی پابندی کے ساتھ احترام کرتی تھیں۔ جوانی کی ناتجربہ کاری میں اس کا عاشق اسے یہاں لے آیا تھا، اور کچھ عرصے تک اس سے عشق کرنے کے بعد اسے اس کی تقدیر پر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس صدمے اور بدنامی کے داغ کے باوجود، وہ ایک اچھی بیوی ثابت ہوئی۔ جب وہ عمر رسیدہ اور تنہا ہو گئی تو اس کے دو بیٹوں اور تین بیٹیوں کی خواہش تھی کہ وہ ان کے ساتھ رہے، لیکن اس نے رہنے کے لیے اپنی جوانی کی بے راہ روی کی یادگار اس ہوٹل ہی کو ہسٹربانا۔ یہاں اس کا مستقل کمرہ ہی اس کا واحد گھر تھا۔ اور اس مشترکہ اقامت گاہ میں اس کی رسم و راہ فلورنٹینو آریزا سے ہوئی، جو اس کا خیال تھا کہ آگے چل کر ایک نہایت دانا آدمی ثابت ہوگا اور اس کی شہرت دنیا بھر میں ہوگی کیوں کہ وہ شہوت پرستی کی اس بہشت میں بھی اپنی روح کی کتاب خوانی سے آبیاری کرتا رہتا ہے۔ فلورنٹینو آریزا بھی اس سے خاصا مانوس ہو گیا تھا اور سودا سلفٹ لانے میں اس کی مدد کر سنے کے علاوہ شاموں میں اس سے گفتگو بھی کیا کرتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ عورت محبت کے معاملات میں خاصی دانائی رکھتی تھی، کیوں کہ اس نے، فلورنٹینو آریزا کے اسے اپنا شریکِ راز بنائے بغیر، اپنی سوجھ بوجھ سے کئی بار اس کی رہنمائی کی۔

رہیں اس ہوٹل کی ترغیبات، تو ان کے سامنے فلورنٹینو آریزا نے اس وقت بھی ہمتیار نہیں ڈالے تھے جب اسے فرینا دازا کی محبت کا تجربہ حاصل نہ تھا، اب وہ ایسا کس طرح کر سکتا تھا جب فرینا دازا اس سے باقاعدہ منسوب ہو چکی تھی۔ لہذا وہ ان لڑکیوں کے ساتھ رہتا رہا اور ان کے غموں اور خوشیوں میں شریک ہوتا رہا، لیکن اس سے آگے بڑھنے کا اسے خیال تک نہ آیا۔ ایک غیر متوقع واقعے نے اس کے عزم کی پختگی کو اور واضح کر دیا۔ ایک شام چھ بجے کے قریب، جب لڑکیاں شام کے گاہکوں کے خیر مقدم کے لیے تیار ہو رہی تھیں، اس کی منزل پر صفائی کرنے والی عورت اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی عمر زیادہ نہ تھی لیکن وہ اپنے وقت سے پہلے ہی لاغر اور عمر رسیدہ ہو گئی تھی، اور پُر شکوہ برہنگی کے درمیان ایک لمبوس شرمسار نظر آتی تھی۔ وہ اسے روز آتے جاتے دیکھتا تھا اور اسے یہ محسوس نہ ہوا تھا کہ وہ بھی اسے دیکھا کرتی ہے۔ وہ اپنی جھاڑوؤں، کورٹا اٹھانے کی بالٹی، اور فرش سے استعمال شدہ کندھوں پھینے کے لیے مخصوص صافی

اٹھائے کمروں میں آیا جایا کرتی تھی۔ وہ اس کمرے میں داخل ہوئی، جہاں فلور نٹینو آریرا بستر پر دراز، مطالعے میں مگن تھا، اور ہمیشہ کی طرح احتیاط سے صفائی کرنے لگی تاکہ اس کی مصروفیت میں خلل نہ پڑے۔ پھر وہ بستر کے قریب آئی، اور فلور نٹینو آریرا نے اپنے پیٹ کے قریب ایک گرم اور نرم باتہ کالس محسوس کیا، پھر اس نے اس باتہ کو آس پاس ٹٹولتے، اسے مُراد تک پہنچتے، پتلون کے بیٹن کھولتے محسوس کیا۔ وہ زور زور سے سانس لے رہی تھی۔ کچھ دیر تک تو وہ اسے نظر انداز کر کے پڑھنے میں مصروف رہا، لیکن جب یہ عمل ناقابلِ برداشت ہو گیا تو اس نے دوسری طرف کروٹ لے لی۔

وہ بہت مایوس ہوئی، کیوں کہ اسے صفائی کرنے کی ملازمت دیتے ہوئے یہ بات صاف صاف بتا دی گئی تھی کہ وہ بوٹل کے گاہکوں کے ساتھ بستر پر جانے کی کوشش نہیں کرے گی۔ ویسے اس سے یہ بات کہنے کی انہیں کوئی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ وہ ان عورتوں میں سے تھی جن کے لیے طوائف ہونے کا مطلب پیسے کی عوض ہم بستری کرنا نہیں بلکہ کسی بھی اجنبی کے ساتھ ہم بستری کرنا ہوتا ہے۔ اس کے دو بچے تھے، دونوں کے باپ مختلف تھے، اس لیے نہیں کہ وہ کوئی اتفاقی معاشرے تھے، بلکہ اس لیے کہ تیسری ملاقات کے بعد وہ کسی مرد سے محبت جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس وقت تک وہ ایک ایسی عورت رہی تھی جسے جلدی نہیں تھی اور جو مایوس ہوئے بغیر انتظار کرتے رہنے پر آمادہ تھی، لیکن یہاں کے کمپنوں کا طرزِ زندگی اس کے ضبط سے زیادہ طاقتور ثابت ہوا۔ وہ شام چوبیس بجے کام پر آئی اور تمام رات کمروں میں آتی جاتی، فرش صاف کرتی، کندھوں چُمتی اور چادریں بدلتی رہتی۔ یہ تصور سے باہر تھا کہ مرد محبت کے بعد وہاں کتنی بے شمار چیزیں چھوڑ جایا کرتے تھے: اُلٹیاں اور آنسو، جو اس کے لیے قابلِ فہم تھے؛ لیکن وہ اپنی قربت کی بہت سی اور نشانیاں بھی چھوڑ جاتے تھے: خون کے دھبے، گندگی کے پتے، کانچ کی آنکھیں، سونے کی گھڑیاں، نقلی دانت، سنہری چٹنوں والے لاکٹ، عشقیہ خطوط، کاروباری خطوط، تعزیتی خطوط، ہر طرح کے خطوط۔ ان میں سے بعض اپنی چھوٹی ہوئی چیزیں واپس لینے کے لیے آیا کرتے، لیکن زیادہ تر چیزیں وہیں بے طلب رہ جاتی تھیں، اور لوٹاریو گٹ انہیں حفاظت سے تالے میں بند کر کے رکھتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ جلد یا بدیر یہ عمارت، جو اپنے اچھے دن گزار چکی ہے، ان بے شمار یادگاروں کی وجہ سے، محبت کا ایک عجائب خانہ بن جائے گی۔

اُس کا کام سخت اور تنخواہ نہایت قلیل تھی، پھر بھی وہ اسے دل لگا کر کرتی تھی۔ جو چیز اس کی برداشت سے باہر تھی وہ سکیاں، آہیں اور مسہریوں کی چرچراہٹ تھی، جو اس کے لبو کو جذبے اور دکھ سے اس قدر بھر دیتی کہ اسے اپنی اس خواہش پر قابو رکھنا دشوار ہو جاتا کہ باہر نکل کر

خود کو کسی بھی گداگر یا حقیر شرابی کے سپرد کر دے جو کسی تکلف یا سوال جواب کے بغیر اس کی مشکل آسان کر سکے۔ فلور نینو آریزا کا نمودار ہونا، جو نو جوان، صاف ستھرا اور کسی عورت کے بغیر تھا، اس کے لیے بہشت کے ایک تھنے سے کم نہ تھا، کیوں کہ اسے پہلی بار دیکھتے ہی اس نے اپنے اور اس کے درمیان ایک قدر مشترک تلاش کر لی تھی: دونوں محبت کے ضرورت مند تھے۔ لیکن وہ اس کی بے بس کر دینے والی خواہش سے بے خبر تھا۔ اس نے اپنا کنوارا پرن فرینا دازا کے لیے منبھال رکھا تھا اور دنیا میں کوئی دلیل یا قوت ایسی نہ تھی جو اسے اس عہد سے بٹا سکتی۔

سواس کی زندگی اسی طرح گزر رہی تھی جب فرینا دازا اور اس کے درمیان طے شدہ نسبت کی تاریخ سے چار ماہ پہلے، ایک صبح سات بجے لورینزو دازا تار گھر میں داخل ہوا اور اس کے بارے میں دریافت کیا۔ چوں کہ فلور نینو آریزا ابھی دفتر نہیں پہنچا تھا، وہ بچہ پریمٹا آٹھ بج کر دس منٹ تک انتظار کرتا رہا، اور اس دوران اپنی سونے کی انگوٹھی ایک انگلی سے دوسری انگلی میں منتقل کرتا رہا۔ جیسے ہی فلور نینو آریزا دفتر میں داخل ہوا، اس نے ٹیلیگرام پہنچانے والے قاصد کے طور پر اسے پہچان لیا، اور بازو سے پکڑ لیا۔

"میرے ساتھ چلو، بیٹے،" وہ بولا، "مجھے تم سے پانچ منٹ صاف صاف بات کرنی ہے۔"

فلور نینو آریزا نے، جس کا رنگ لاش کی طرح سبز ہو گیا تھا، خود کو اس کے ساتھ جانے دیا۔ وہ اس ملاقات کے لیے تیار نہیں تھا، کیوں کہ فرینا دازا کو اسے پہلے سے آگاہ کرنے کا کوئی موقع یا ذریعہ نہ ملا تھا۔ قصہ یہ تھا کہ گزشتہ سینچر کے روز اسکول کی سپیریر سٹر فرائڈ دالیونز، "نظریات کائنات" کی کلاس کے دوران سانپ کی طرح چوری چھپے کمرے میں داخل ہوئی، اور اس نے طالبات کے کندھوں کے پیچھے سے ان کا خفیہ طور پر معائنہ کرنے کے دوران دریافت کیا کہ فرینا دازا نوٹس لینے کے بہانے محبت نامہ لکھنے میں مصروف ہے۔ اسکول کے ضوابط کے مطابق یہ غلطی اسکول سے نکال دیے جانے کے لیے کافی تھی۔ لورینزو دازا کو فوری طور پر ریکٹر کے دفتر میں طلب کیا گیا، جہاں اس پر انکشاف ہوا کہ اس کا آہنی اقتدار کس شگاف کے راستے سے پگھل کر بہہ رہا ہے۔ فرینا دازا نے، اپنی جبلی استقامت کے ساتھ، خط لکھنے کے جرم کا اعتراف کر لیا، لیکن اپنے خفیہ محبوب کا نام بتانے سے وہاں بھی انکار کیا اور ٹریبونل آف آرڈر کے روبرو بھی، جس نے اس کے اسکول سے نکالے جانے کے فیصلے پر مہر ثبت کر دی۔ اس کے باپ نے البتہ اس کے کمرے کی تلاش لی، جو اب تک ایک محفوظ پناہ گاہ رہا تھا، اور اس کے صندوق کی دوہری تہ میں سے تین سال کی خط و کتابت کے بندل برآمد کر لیے۔ خطوں کے دستخط بالکل غیر مبہم تھے، لیکن لورینزو دازا کو نہ اس وقت یقین آیا اور نہ کبھی اس کے بعد، کہ اس کی بیٹی اپنے عاشق کے بارے میں اس

سے زیادہ کچھ نہیں جانتی کہ وہ تارگھر میں کام کرتا ہے اور وائلن بجانے کا شوقین ہے۔
اسے یقین تھا کہ اتنی پیسیدہ رادو رسم صرف اس کی بہن کے تعاون ہی سے ممکن ہے، اس لیے اس نے اسے عذر پیش کرنے یا رحم کی التجا کرنے کا موقع دیے بغیر، سان حوان دلاسیے ناگا جانے والے جہاز پر سوار کرا دیا۔ فرینا دازا اپنی پھوپھی کی اس آخری اذیت ناک یاد سے کبھی سکون نہ پاسکی، جب اُس سہ پہر وہ اپنی عیا کے نیچے بخار میں جلتے ہوئے سوکھے اور خاکستری جسم کے ساتھ، الوادع کمرہ کر دروازے سے باہر نکل گئی تھی اور اپنی زندگی بھر کی متاع، سونے کی چٹائی اور مینے بھر کے خرچ کی رقم، ایک رومال میں باندھے بلکی بارش میں سامنے والے باغ میں اوجھل ہو گئی تھی۔ بعد میں اپنے باپ کے اقتدار سے رہا ہوتے ہی فرینا دازا نے کریبینس کے ساحلی علاقوں میں اس کی تلاش شروع کی، ہر اس شخص سے اس کے بارے میں پوچھا جس پر اُس سے جان پہچان کا گمان ہو سکتا تھا، لیکن وہ اس کا کوئی سراغ نہ پاسکی، یہاں تک کہ تیس برس بعد اسے ایک خط ملا جو طویل عرصے تک بھگتنے کے بعد، مختلف لوگوں کے ہاتھوں سے ہوتا ہوا اس تک پہنچا تھا۔ اس خط سے اسے پتا چلا کہ اس کی پھوپھی آب خداوند کے جذامی اسپتال میں مر چکی ہے۔ لورینزو دازا کو اس شدید رد عمل کا اندازہ نہ تھا جو اس کی پھوپھی کو ملنے والی ناحق سزا سے اس میں پیدا ہوا، کیوں کہ اس نے ہمیشہ اسے اپنی ماں کی جگہ جانا تھا جو اسے یاد بھی نہ تھی۔ اس نے خود کو اپنے کمرے میں مقفل کر لیا، کھانے پینے سے قطعی انکار کر دیا، اور جب لورینزو دازا کی دھمکیوں اور بے ڈھنگی ریاکارانہ التجاؤں سے قائل ہو کر اس نے دروازہ کھولا تو اس کے باپ کو ایک زخمی شیرنی نظر آئی جو دوبارہ کبھی پندرہ سال کی معصوم بچی نہیں بنے گی۔

اُس نے ہر طرح کی خوشامد سے اسے رام کرنے کی کوشش کی۔ اسے سمجایا کہ اس کی عمر میں محبت ایک التباس کے سوا کچھ نہیں ہوتی، اس نے اُسے قائل کرنے کی کوشش کی کہ یہ تمام خط واپس کر دے اور اسکول جا کر اپنی غلطی کی معافی مانگ لے، اس نے وعدہ کیا کہ وہ اُس کے لیے جلد از جلد کوئی مناسب رشتہ تلاش کرے گا۔ لیکن یہ سب یوں تھا جیسے وہ کسی لاش سے مخاطب ہو۔ ناکام ہو کر وہ سوموار کو دوبہر کے کھانے پر طیش میں آگیا، اور جب وہ اپنے غم و غصے کو دبانے کی کوشش میں تھا، فرینا دازا نے گوشت کاٹنے والا پا قواٹھا کر کسی ڈرامائی انداز کے بغیر اپنے گلے پر رکھ لیا، اس کے ہاتھ میں کوئی لکچیاٹ نہیں تھی اور آنکھیں ایسی پھٹی پھٹی تھیں کہ وہ کچھ نہ بول سکا۔ یہ وہ موقع تھا جب اس نے اس منسوس چھو کرے سے پانچ منٹ کے لیے رو برو بات کرنے کا فیصلہ کیا، جس کی صورت اس کے ذہن میں نہیں تھی اور جس کی وجہ سے اس کی زندگی پر یہ مصیبت نازل ہوئی تھی۔

فلورنٹینو آریزا ابھی اپنے ہوش و حواس بحال نہ کر پایا تھا کہ لورینزو دازا اسے بازو سے پکڑے پکڑے کلیسا کا چوک پار کر کے قریب کے کیفے کی مراب دار گیلری میں لے گیا۔ اتنی صبح وہاں کوئی اور گاہک نہیں تھا، ایک سیاد فام عورت گرد آلود دھندلے شیشوں کی کھڑکیوں والے بال کا فرش دھو رہی تھی۔ فلورنٹینو آریزا نے اسے اکثر بڑے بازار کے آسٹروی دکانداروں کے ساتھ وہاں بیٹھے جوا کھیلنے اور بیس پیٹے دیکھا تھا۔ وہ لوگ بلند آواز میں ایسی طویل جنگوں کا تذکرہ کر رہے ہوتے جن کا ہمارے ملک سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ فلورنٹینو آریزا محبت کے فانی ہونے کے احساس کے زیر اثر اکثر سوچا کرتا تھا کہ لورینزو دازا سے اس کی وہ ملاقات کیسی ہو گی جس کا جلد یا بدیر ہونا ناگزیر تھا، جسے ملنا کسی انسانی قوت کے بس میں نہ تھا، کیوں کہ یہ ملاقات ان دونوں کی تقدیر میں لکھ دی گئی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ ایک غیر مساوی مقابلہ ہو گا، نہ صرف اس لیے کہ فرینا دازا نے اپنے خطوں میں اسے اپنے باپ کی طوفانی فطرت سے آگاہ کر دیا تھا، بلکہ اس نے خود بھی لورینزو دازا کو جوئے کی میز پر دیکھا تھا جب ہنسٹے ہوئے بھی اس کی آنکھیں غصے سے جل رہی ہوتی تھیں۔ اس کی ہر چیز وحشی پن کی گواہی دیتی تھی: اس کی فحش توند، اونچی آواز، جانوروں کے سے گل چمچے، ہڈے ہاتھ، دودھیا پستہ سے جلی ہوئی انگوٹھی والی انگلی۔ اس کی واحد پسندیدہ خصوصیت، جسے فلورنٹینو آریزا نے اسے پہلی ہی بار دیکھ کر پہچان لیا تھا، اس کی چال تھی، جو اس کی بیٹی کی چال سے مشابہ تھی۔ اس سب کے باوجود، جب لورینزو دازا نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے اسے بیٹھنے کو کہا تو وہ فلورنٹینو آریزا کو اتنا سخت گیر معلوم نہ ہوا جتنا اس کا خیال تھا، اور جب اس نے فلورنٹینو آریزا کو سوفت کی شراب کا ایک جام پینے کی دعوت دی تو اس کی ہمت بحال ہو گئی۔ فلورنٹینو آریزا نے اس سے پہلے کبھی صبح آٹھ بجے شراب نہیں چکھی تھی، لیکن اس نے اس دعوت کو شکریے کے ساتھ قبول کر لیا کیوں کہ اس وقت اسے اس کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

لورینزو دازا نے اپنی بات کہنے میں واقعی پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہ لگایا۔ اور اس نے اپنی بات اتنے بے بس کر دیئے والے خلوص کے ساتھ کہ فلورنٹینو آریزا حیرت زدہ رہ گیا۔ اپنی بیوی کے مرنے کے بعد اس نے اپنی زندگی کا واحد مقصد یہ بنا لیا تھا کہ اپنی بیٹی کی اس طرح پرورش کرے کہ وہ بڑی ہو کر ایک نہایت معزز خاتون بنے۔ تجربوں کے ایک آن پڑھ تاجر کے لیے یہ راستا بے حد طویل اور دشوار تھا، جس کی گھوڑے چرانے کی شہرت اتنی ثابت شدہ نہیں تھی جتنی سان حوان دلا سیعہ ناگا کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے چرسواروں کا مخصوص سگار سلاگایا اور تانسٹ سے کہنے لگا: "خراب شہرت خراب صحت سے بھی زیادہ بُری چیز ہے۔" لیکن،

اس نے کہا کہ، اس کی کامیابی کا اصل راز یہ ہے کہ اس نے ہمیشہ اپنے چہروں سے بھی زیادہ محنت سے کام کیا، اور اس معمول میں خانہ جنگیوں کے اُس تلخ ترین زمانے میں بھی فرق نہیں آنے دیا جب صبح ہونے پر گاؤں خود کو خاکستر اور کھیت اپنے کو تباہ حال پاتے تھے۔ اگرچہ فرینا دازا کو اپنے باپ کے منصوبوں کا علم نہ تھا، لیکن اب تک اس نے ایسی اچھی کارکردگی دکھائی تھی جیسے وہ ان میں شریک ہو۔ وہ اتنی ذہین اور منظم تھی کہ اس نے خود پڑھنا سیکھتے ہی اپنے باپ کو بھی پڑھنا سکھادیا، اور بارہ سال کی عمر میں اس میں معاملات کی ایسی سمجھ بوجھ آگئی تھی کہ وہ اپنی پھوپھی کی مدد کے بغیر گھر کا سارا انتظام چلا سکتی تھی۔ وہ ایک آہ بھر کر بولا: "وہ ایک ایسی گھوڑی ہے جو سونے میں تولے جانے کے لائق ہے۔" جب اس کی بیٹی نے پرائمری اسکول کی تعلیم ہر مضمون میں سب سے زیادہ نمبر اور تعریفی سند حاصل کر کے پوری کر لی تو وہ سمجھ گیا کہ سان حوان دلاسیے ناگا کا قصبہ اس کے خوابوں کے لیے بہت تنگ ہے۔ تب اس نے اپنی زمین اور مویشی بیچ ڈالے اور شہر ہزار پیسو کی رقم اور ایک نئے ولولے کے ساتھ بوسیدہ شان و شوکت والے اس تباہ شدہ شہر میں اٹھ آیا، جہاں روایتی انداز میں تربیت یافتہ ایک خوش شکل لڑکی کے لیے اچھے خاندان میں شادی کے توسط سے نئی زندگی شروع کرنے کا امکان موجود تھا۔ فلورنٹینو آریزا کی اچانک آمد اس بے حد دشوار منصوبے میں ایک غیر متوقع رکاوٹ تھی۔ "میں تم سے ایک درخواست کرنے آیا ہوں،" لورینزو دازا نے کہا۔ اس نے اپنے سگار کے سرے کو شراب میں ڈبو کر ترکیا، اس کا ایک طویل کش لیا اور دحوال باہر نکالے بغیر افسردہ آواز میں بولا:

"ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ۔"

فلورنٹینو آریزا شراب کے گھونٹ لیتے ہوئے اس کی بات غور سے سن رہا تھا، اور فرینا دازا کے ماضی کے متعلق سننے میں اتنا محو تھا کہ اسے یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملی کہ اپنی باری پر اسے خود کیا کہنا ہے۔ لیکن جب یہ لمحہ آیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ کہنے لگا، اس کی تقدیر پر اثر انداز ہو گا۔

"کیا آپ نے اُس سے بات کر لی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اس سے تمہیں کوئی مطلب نہیں،" لورینزو دازا نے کہا۔

"میں یہ سوال اس لیے کر رہا ہوں،" فلورنٹینو آریزا نے کہا، "کہ میرے خیال میں یہ فیصلہ اسی کو کرنا ہے۔"

"برگز نہیں،" لورینزو دازا نے کہا، "یہ مردوں کا معاملہ ہے اور مردوں کے درمیان طے ہو

گا۔"

اس کا لہجہ خوفناک ہونے لگا تھا، اور ایک گاہک جو ابھی ابھی آ کر ایک قریبی میز پر بیٹھا تھا، چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔ فلورنٹینو آریزا نہایت وحشی آواز میں، لیکن مقدور بھر شابانہ عزم کے ساتھ بولا:

"کچھ بھی ہو، میں اس کی رائے معلوم کیے بغیر کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ یہ اس کے ساتھ قریب ہو گا۔"

تب لورینزو دازا اپنی پشت کر سی سے لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے پیوٹے سرخ اور بھیگے ہوئے تھے اور اس کی بائیں آنکھ اپنے ہلکے میں گھوم کر باہر کی جانب جم گئی تھی۔ اس نے بھی اپنی آواز مدھم کر لی۔

"مجھے مجبور مت کرو کہ تمہیں گولی مار دوں،" وہ بولا۔

فلورنٹینو آریزا کو اپنی آنتوں میں سرد جھگ سا بھرتا محسوس ہوا۔ لیکن اس کی آواز میں کوئی لرزش نہ آئی، کیوں کہ اسے یقین تھا کہ اس پر روح القدس کا سایہ ہے۔

"میں تیار ہوں،" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا، "مفت کے لیے مارے جانے سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔"

لورینزو دازا کو اپنی توتے کی طرح گھومی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف تڑچھا دیکھتا پڑا۔ اس نے تین الفاظ ایک ایک کر کے یوں ادا کیے جیسے انہیں تھوک رہا ہو:

"کتیا کی اولاد۔"

اسی ہنستے وہ اپنی بیٹی کو لے کر اس سفر پر روانہ ہو گیا جو اسے بھول جانے پر آمادہ کر سکے۔ اس نے سفر کے مقصد کی کوئی وضاحت نہ کی، صرف اس کی خواب گاہ میں طوفان کی طرح داخل ہوا، اور اس حالت میں کہ اس کی مونچھیں طیش اور چبائے ہوئے سگار سے سنی ہوئی تھیں، فرینا دازا کو سامان باندھنے کا حکم دیا۔ اس نے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں، تو وہ جواب میں بولا: "اپنی موت کی طرف۔" اس جواب سے گھبرا کر، جو اسے حقیقت کے قریب تر محسوس ہوا، اس نے پہلے کی طرح جرأت سے اس کا سامنا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے اپنی کپڑے کی بیٹی اتاری جس کے سرے پر کوٹے ہوئے تانبے کا بکمو آگیا ہوا تھا، اسے اپنی مٹھی کے گرد لپیٹا، اور اسے اتنی زور سے میز پر مارا کہ اس کی گونج رافٹل کی گولی کی آواز کی طرح پورے مکان میں دوڑ گئی۔ فرینا دازا اپنی جرأت کی حد اور موقع محل سے واقف تھی، لہذا اس نے دو چٹائیاں اور ایک جھولنا بستر بند میں باندھا، اپنے سارے کپڑے دو بکموں میں ڈالے اور اس یقین کے ساتھ تیار ہو گئی کہ اس سفر سے واپس کبھی نہیں ہو گی۔ کپڑے بدلنے سے پہلے وہ غسل خانے میں بند ہو گئی اور ٹوائلٹ پیپر کا

ایک کھڑا چارکر فلور نینینو آریزا کو ایک مختصر الوداعی خط لکھا۔ تب اس نے اپنی پوری چوٹی قینچی سے کاٹی اور اسے سنہری بیل بوٹوں والے ٹھکلی ڈبے میں رکھ کر خط کے ساتھ فلور نینینو آریزا کو بھجوا دیا۔

یہ ایک پاگل پن کا سفر تھا۔ اس کا پہلا حصہ، جو سیرا نوادا کے پہاڑی راستوں پر مشتمل تھا، انھوں نے آندینا کے چرسواروں کے کارواں میں شامل ہو کر حجر کی بیٹھ پر گیارہ دن میں طے کیا، اور اس دوران تیز دھوپ، اکتوبر کی اقی بارشوں، اور گھاٹیوں سے اٹھتے سن کر دینے والے بخارات کی زد میں رہے۔ سفر کے تیسرے دن نکھیل کے حملے سے بوکھلایا ہوا ایک چتر اپنے سوار سمیت نیچے کھائی میں جا گرا، اور اپنے ساتھ چٹروں کی پوری قطار کو گھسیٹ لے گیا۔ اس آدمی، اور ایک دوسرے سے رستوں سے بندھے ہوئے سات جانوروں کی چیخیں حادثے کے کئی گھنٹے بعد تک چٹانوں اور کھائیوں سے ٹکرا کر گونجتی رہیں، اور اس کے بعد ساہسال تک یہ گونج فرینا دازا کے حلقے میں سنائی دیتی رہی۔ اُس کا سارا سامان گرنے والے چٹروں کی بیٹھ پر تھا، لیکن اس حادثے کے صدیوں طویل لمحے سے لے کر دہشت کی اُن چٹنوں کے گہری کھائی میں جا کر ختم جانے تک اس کے ذہن میں بد قسمت چتر سوار اور اس کے بندھے ہوئے جانوروں کا خیال نہ آیا، بلکہ وہ اپنی اس بد قسمتی کے بارے میں سوچتی رہی کہ اُس کا چتر ان گرنے والے جانوروں کے ساتھ بندھا ہوا نہیں تھا۔

وہ پہلی بار حجر کی بیٹھ پر سفر کر رہی تھی، لیکن اس سفر کی دہشت اور ناقابلِ بیان صعوبتیں اسے اتنی تلخ محسوس نہ ہوتیں، اگر اسے اس کا یقین نہ ہوتا کہ اب زندگی بھر نہ وہ فلور نینینو آریزا کو دیکھ سکے گی اور نہ اس کے خطوں سے تسکین پاسکے گی۔ اس نے سفر کے آغاز سے اپنے باپ سے مخاطب ہو کر ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا تھا، اور وہ بھی اتنا حیرت زدہ تھا کہ انتہائی ضرورت کے وقت بھی وہ اس سے بات نہ کرتا بلکہ چرسواروں کے ہاتھ پیغام بھجوا دیا کرتا۔ کبھی کبھار خوش قسمتی سے انھیں سرک کے کنارے کوئی سرائے مل جاتی جہاں دہشتانی کھانا دستیاب ہوتا، جسے وہ کھانے سے انکار کر دیتی، اور بدبودار پیسے اور پیشاب سے آلودہ تریال کی چارپائیاں کرائے پر ملتی۔ مگر زیادہ تر راتیں انھیں انڈین بستریوں میں سرک کے کنارے بنی ہوئی کھلی سڑائیوں میں گزارنی پڑیں جہاں لکڑی کے کھمبوں پر کھجور کے پتوں کی چست پڑی ہوتی اور جہاں ہر مسافرات گزارنے کا حق رکھتا تھا۔ فرینا دازا ان میں سے ایک رات بھی سو کر نہ گزار سکی، وہ خوف کے عالم میں پڑی اندھیرے میں مسافروں کے آنے جانے کی آہٹیں سنتی رہتی جو اپنے جانوروں کو کھمبوں سے باندھ کر اپنے جھولنے لٹکار رہے ہوتے تھے۔

غروب کے وقت جب پہلے مسافروں پہنچتے تو یہ جگہ بحیرہ بھاڑ کے بغیر خاصی پُر سکون معلوم ہوتی، لیکن صبح ہونے تک یہ ایک میلے میں بدل جاتی، جہاں جھولنے مختلف بلندیوں پر اوپر سے ٹک رہے ہوتے، پہاڑوں پر رہنے والے ارواک انڈین میٹھے میٹھے سو رہے ہوتے، اور بندھی ہوئی بکریوں اور لکڑی کے صندوقوں میں بند لڑاکا مرغوں کی بانگیں ایک بگڑا ہوا بپاکیے ہوئے ہوتی تھیں، اور پہاڑی کتوں کے خاموشی سے ہانپنے کی آوازیں اس بگڑا ہونے میں اضافہ کر دیتیں جنہیں خانہ جنگی کے خطرے کے باعث جھونکنے سے باز رہنے کی تربیت دی گئی تھی۔ لورینزو دازا ان صوبوں کا حامی تھا، کیوں کہ اس کی آدمی زندگی انہی راستوں پر سفر کرتے ہوئے گزرتی تھی، اور وہ ہر جگہ صبح بیدار ہونے پر جھوم میں پڑنے دوستوں کو پہچان لیتا تھا۔ مگر اس کی بیٹی کے لیے یہ ایک مسلسل عذاب تھا۔ نمک لگی پھلیوں کے دھیروں کے ٹھن سے اس کی بھوک، جو کہ کے ہاتھوں پہلے ہی بہت کم ہو گئی تھی، آخر بالکل جاتی رہی۔ اگر وہ ان تمام منسبتوں کے باوجود پاگل ہونے سے بچ نکلی تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ فلورنٹینو آریزا کی یاد سے تسکین حاصل کر لیتی تھی۔ اسے اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ یہ فراموشی کی سرزمین ہے۔

ایک اور مستقل خوف خانہ جنگی کا تھا۔ سفر کے آغاز ہی سے گشت کرتے ہوئے مسلح دستوں سے سامنا ہونے کے خطرات کی باتیں ہونے لگی تھیں، اور خیر سواروں نے انہیں دونوں فریقوں میں تمیز کرنے کی نشانیاں اچھی طرح یاد کرا دی تھیں تاکہ وہ انہیں پہچان کر مناسب طرز عمل اختیار کر سکیں۔ انہیں اکثر راستوں میں گھڑ سوار دستے ملتے جو کسی افسر کی کمان میں نئے رنگوٹوں کی تلاش میں گھوم رہے ہوتے، وہ منتہب ہونے والوں کو مویشیوں کی طرح باندھ کر ساتھ لے جاتے تھے۔ بے شمار منسبتوں میں گرفتار فرینا دازا کو اس خطرے کا اندازہ ہی نہ تھا جو اسے حقیقی سے زیادہ قصہ کہانی معلوم ہوتا تھا۔ مگر ایک رات ایک گشتی دستے نے، جس کی وابستگی نامعلوم تھی، کارواں کے دو مسافروں کو قیدی بنالیا، اور بستی سے آدھ فرسنگ باہر کمپانوں کے درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی۔ لورینزو دازا ان کو جانتا تھا کہ پھر بھی اس نے ان کی لاشیں اتروائیں اور، اس بد قسمتی سے اپنے بچ نکلنے پر شکرانے کے طور پر، ان کی مسمی تدفین کروائی۔ اس کی نہایت معقول وجہ بھی تھی: حملہ آور سپاہیوں نے اسے بھی پیٹ پر رائفل کی نال رکھ کر جگایا تھا، اور کمانڈر نے، جس کے کپڑے بوسیدہ تھے اور چہرے پر کالک لگی ہوئی تھی، اس کے چہرے پر روشنی ڈال کر اس سے پوچھا تھا کہ وہ لبرل ہے یا کنزرویٹو۔

"دونوں میں سے کوئی نہیں،" لورینزو نے کہا تھا، "میں سپانوی رنایا میں سے ہوں۔"

"تم خوش قسمت ہو،" کمانڈر نے کہا تھا، اور پھر باتہ اٹھا کر بولا تھا: "زندہ باد شاہ سپانیا!"

اور آگے بڑھ گیا تھا۔

دو دن بعد وہ دھلواں راستے سے اتر کر اس روشن میدانی علاقے میں پہنچے جہاں والید و پار کا قصبہ واقع تھا۔ صمنوں میں مرغ لڑائے جا رہے تھے، گلیوں کے موڑ پر اکارڈین بجائے جا رہے تھے، عمدہ نسل کے گھوڑوں پر سوار لوگ تھے اور آتش بازیاں اور گھنٹیوں کی آوازیں تھیں۔ آتش بازی سے ہوا میں ایک قلعہ تعمیر کیا جا رہا تھا۔ فرینا داوا کو جشن کے اس بنگامے کا ذرا بھی پتا نہ چلا۔ وہ لیبیا کو سانچیز کے گھر میں ٹھہرے جو اس کی مرحوم ماں کا بھائی تھا جو ان کے استقبال کے لیے علاقے کے عمدہ ترین نسل کے گھوڑوں پر سوار خاندان کے نوجوانوں کے ایک جلوس کے ساتھ سلطانی شاہراہ تک آیا تھا۔ انہیں قصبے کی گلیوں میں سے آتش بازی کی روشنیوں کے درمیان سے لے جایا گیا۔ مکان مرکزی چوک میں کئی بار تعمیر شدہ نوآبادیاتی گرجا گھر سے متصل تھا اور اس جاگیر کی اہم ترین عمارت معلوم ہوتا تھا۔ اس کے کمرے وسیع و عریض اور نیم تارک تھے، اور اس کی گیلری کا رخ پتلوں کے ایک باغ کی جانب تھا، اور وہاں گئے کے رس کی گرم خوشبو تیرتی رہتی تھی۔

وہ ابھی اصطبل میں آکر اترے ہی تھے کہ استقبالیہ کمروں میں سے بے شمار ناشناس رشتے دار نکل آئے، جن کا ناقابل برداشت ریل فرینا داوا کے لیے تازیانوں سے کم نہ تھا، کیوں کہ وہ کسی اور سے محبت کرنے کے قابل نہیں تھی۔ وہ کاٹھی کے زخموں سے چور، ٹھکن اور بدبھنی سے جاں بہ لب تھی، اور صرف کسی تنہا اور خاموش جگہ جا کر رونا چاہتی تھی۔ صرف اس کی عم زادہ بلد براندہ سانچیز، جو اس سے دو سال بڑی، اور شابانہ نمکت میں اس سے مشابہ تھی، اس پر نظر ڈالتے ہی اس کا حال سمجھ گئی، کیوں کہ وہ خود بھی بے احتیاط محبت کے انگاروں میں جل رہی تھی۔ شام پڑتے ہی وہ اسے اپنی خواب گاہ میں لے گئی جہاں ان دونوں کو ساتھ رہنا تھا، اور اس کے کولہوں کے زخم دیکھ کر اسے یقین نہ آیا کہ وہ اب تک زندہ کس طرح ہے۔ اپنی ماں کی مدد سے، جو ایک بے حد شفیق عورت تھی اور اپنے شوہر سے اس قدر مشابہت رکھتی تھی جیسے وہ جڑواں بھائی بہن ہوں، اس نے فرینا داوا کے غسل کا بندوبست کیا اور اس کے جلتے ہوئے زخموں کو آرنیکا کے مرہم سے ٹھنڈک پہنچائی، جب کہ باہر بارود کا قلعہ مکمل ہو چکا تھا اور اس سے اٹھتے ہوئے دھماکے مکان کی بنیادیں ہلا رہے تھے۔

نصف شب کے قریب مہمان رخصت ہوئے، جشن کے شعلے مدھم پڑ گئے، اور عم زادہ بلد براندہ نے اسے شب خوابی کا لباس پہننے کو دیا اور ہموار چادر اور پروں کے ٹکے والے بستر پر لٹا دیا، اور اپنا نک خوشی کے سہجان سے بے قابو ہو گئی۔ جوں ہی وہ دونوں تنہا ہوئیں، بلد براندہ نے

سلاح اٹھا کر دروازہ بند کر دیا اور اپنے بستر کے نیچے بھی ہوئی چٹائی کے اندر سے دبیز کاغذ کا ایک لفافہ نکالا جس پر لگی موم کی سرخ مہر پر ٹیلیگراف کا نشان بنا ہوا تھا۔ اپنی عم زاد کے چہرے پر چمکتی ہوئی شرارت دیکھتے ہی فرینا دازا کے دل میں گارڈونیا کے سفید پھولوں کی اداس مہک پھر سے بھر گئی۔ اس نے سرخ مہر اپنے دانتوں سے توڑی اور ان گیارہ ممنوعہ ٹیلیگراموں کو رات بھر اپنے آنسوؤں سے تر کرتی رہی۔

تو وہ جانتا تھا! لورینزو دازا سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ روانہ ہونے سے پہلے اس نے اپنے برادر نسبتی لیسیمو کو سانچیز کو ٹیلیگرام کے ذریعے خبر کی تھی اور اس نے یہ خبر اس علاقے کے تمام قصبوں اور گاؤں میں بے ہوسے اپنے بے شمار رشتہ داروں میں پھیلادی تھی۔ لہذا فلورنٹینو آریزا کو نہ صرف ان کے سفر کے راستے کا علم ہو گیا تھا، بلکہ وہ علاقے کے تمام ٹیلیگراف آپریٹروں کو ایک برادری کی صورت میں اس بات پر آمادہ کر چکا تھا کہ وہ فرینا دازا کے سفر کی، کا بودلاویلا کی آخری بستی تک، خبر رکھیں۔ اس طرح وہ فرینا دازا کے والدین پر پہنچتے ہی اس سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا، اور یہ رابطہ اس کے پورے سفر کے دوران قائم رہا جو ڈیڑھ سال بعد ریو باچا میں اختتام پذیر ہوا، جب لورینزو دازا نے، یہ اطمینان ہونے پر کہ اس کی بیٹی اس قصبے کو مکمل طور پر بھلا چکی ہے، واپسی کا قصد کیا۔ وہ شاید اس امر سے بے خبر تھا کہ یہاں پہنچ کر اس نے اپنی نگرانی کو کس قدر نرم کر دیا ہے۔ وہ ہر وقت اپنے سرسالی رشتہ داروں کی خوشامد ان باتوں میں گھرا رہتا، جنہوں نے ان تمام برسوں میں اپنی قبائلی بدگمانیوں کو خیر باد کہہ کر کھلے بازوؤں سے اُسے اپنے خاندان کا ایک فرد تسلیم کر لیا تھا۔ درحقیقت فرینا سانچیز کا خاندان اس کے ایک تارک وطن سے شادی کرنے کے سنت خلاف تھا جو کوئی پس منظر نہ رکھتا تھا، اور ان کی نظر میں مضیٰ ایک شینی خورا اور اُجداد شخص تھا جو ہمیشہ سفر میں رہتا اور اپنے سالم خجروں کی تجارت کیا کرتا جو اتنا سادہ پیشہ تھا کہ اس کی دیانتداری کا کسی کو یقین نہیں آتا تھا۔ لورینزو دازا ایک بڑا جوان کھیل رہا تھا، کیوں کہ اس کی محبوبہ علاقے کے ایک روایتی خاندان کی چشم و چراغ تھی، جو سرکش عورتوں اور مہربان مردوں پر مشتمل ایک پیچیدہ قبیلہ تھا جسے اپنی عزت کا احساس جنون کی حد تک تھا۔ البتہ فرینا سانچیز اُس محبت کے عزم کے ساتھ جسے مخالفت کا سامنا ہو، اپنی خواہش پر مصر ہو گئی اور خاندان کی مخالفت کے باوجود اس قدر جلد بازی اور رازداری کے ساتھ اس سے شادی کر لی کہ شبہ ہوتا تھا کہ اس کا محرک عشق نہیں بلکہ کسی بے وقت غلطی پر تقدس کا پردہ ڈالنا ہے۔

پچیس سال بعد لورینزو دازا کو احساس نہ تھا کہ اپنی بیٹی کے عشق پر اس کا رد عمل اُسی ماضی کی تکرار ہے، اور وہ اپنی اس بد قسمتی کی انہیں سرسالی والوں کے رو برو شکایت کر رہا تھا جنہوں نے

کبھی اس کی مخالفت کی تھی اور اپنے رشتے داروں سے اسی قسم کی شکایتیں کی تھیں۔ تاہم جتنے وقت وہ اس ماتم میں مصروف رہا، اس کی بیٹی اپنے عشق کی مصروفیت کے لیے آزاد رہی۔ اور جب وہ اپنے سسرالی رشتے داروں کی جاگیر پر پھڑوں کو خفی کرنے اور چڑوں کو سدھانے میں مشغول ہوتا، فرینا داوا اپنی عم زاد بہنوں کے ہجوم میں گھری رہتی۔ ان سب کی سردار بلد براندہ سانچیز تھی، جو ان سب سے حسین اور دل نواز تھی، اور جو اپنے سے بیس سال بڑے، شادی شدہ، صاحبِ اولاد مرد سے نامراد عشق میں دُزدانہ نگاہوں تک محدود رہنے پر مجبور تھی۔

والیدو پار میں طویل قیام کے بعد انھوں نے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ پھولوں کے تختوں اور خواب جیسے سرسبز میدانوں کو عبور کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھا۔ ہر گاؤں میں ان کا اسی طرح استقبال ہوا جس طرح پہلے گاؤں میں ہوا تھا: موسیقی، آتش بازی، رشتے داروں کا ہجوم، اور ان کی آمد کی اطلاع دینے کے لیے پابندی سے آنے والے ٹیلیگرام۔ فرینا داوا کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ ان کی والیدو پار آمد کی شام غیر معمولی نہیں تھی بلکہ اس زرخیز علاقے میں ہفتے کے ہر روز کو اس طرح منایا جاتا تھا گویا وہ کوئی تہوار ہو۔ مسافر جہاں بھی رات پڑے سو سکتے تھے، جہاں بھوک لگے کھانا کھا سکتے تھے، کیوں کہ ان گھروں کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے اور ایک زائد بستر ہمیشہ لٹکا رہتا تھا اور چولہے پر تین قسم کے گوشت کا سائین ہمیشہ چڑھا رہتا تھا، اس خیال سے کہ آنے والے مہمان شاید اپنی آمد کی اطلاع دینے والے ٹیلیگرام سے پہلے ہی آ پہنچیں، جو تقریباً ہمیشہ کا معمول تھا۔ بلد براندہ سانچیز باقی سفر میں اپنی عم زاد کے ساتھ رہی اور ایک پر مسرت جذبے کے ساتھ رشتے داریوں کے نہایت پیچیدہ گور کہ دھندے سلجھانے میں اس کی رہنمائی کرتی رہی۔ فرینا داوا کو پہلی بار اپنے وجود کا احساس ہوا، اس نے خود کو بے فکر، محفوظ اور مہربانیوں کے درمیان محسوس کیا، پہلی بار آزادی کی فضا میں سانس لیا، جس سے اس کی طبیعت کا سکون اور زندہ رہنے کی آرزو لوٹ آئی۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ اس سفر کو ایک بار پھر یاد کرنے والی تھی جب نوستالجیا کے عجیب و غریب عمل سے یہ سفر اس کی یادداشت میں قریب سے قریب تر معلوم ہونے لگا تھا۔

ایک روز وہ اپنی روزانہ سیر سے اس انکشاف پر حیرت زدہ واپس آئی کہ انسان نہ صرف محبت کے بغیر بلکہ اس کے ہوتے ہوئے بھی خوش رہ سکتا ہے۔ اس انکشاف نے اسے چونکا دیا، کیوں کہ اس کی ایک عم زاد نے بتایا تھا کہ اس کا باپ اپنے سسرالی رشتے داروں میں، کلیوفاس موسکوئے کی بے اندازہ جائیداد کے اکھوتے وارث سے اس کی شادی کے امکان کا ذکر کر رہا تھا۔ فرینا داوا اس شخص کو جانتی تھی۔ اس نے اُسے چوک میں کئی بار دیکھا تھا جہاں وہ اپنے بے مثال گھوڑوں کو ان کے زیبائشی ساز پسنارہا ہوتا تھا جو اپنی چمک و دک سے تقریبات میں پسے جانے والے

زیوروں کی طرح لگتے تھے۔ وہ خوش وضع اور ہوشیار تھا، اور اس کی پلمکیں خواب دیکھنے والوں جیسی تھیں جنہیں دیکھ کر پتھر بھی آہیں بھرنے لگیں، لیکن جب وہ اس کا موازنہ باغ میں بادام کے درخت کے نیچے اپنے زانو پر شاعری کی کتاب رکھے، مسکین اور لاغر فلورنٹینو آریزا سے کرتی تو اسے اپنے دل میں کسی شک کی دھندلی سی پرچائیں بھی محسوس نہ ہوتی۔

اُن دنوں بلد برانداسا پیچیز امید سے بے حال تھی، کیوں کہ وہ ایک نبوی سے مل کر آئی تھی جس نے اپنی غیب دانی سے اسے حیران کر دیا تھا۔ اپنے باپ کے ارادوں سے مضطرب ہو کر فرینا دازا بھی اس کے ساتھ اس نبوی سے ملنے گئی۔ قسمت کا حال بتانے والے پشتوں نے بتایا کہ اس کی طویل اور پُرمسرت شادی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس پیش گوئی نے اس کا حوصلہ بحال کر دیا، کیوں کہ وہ اس خوش قسمتی کا اپنے محبوب کے سوا کسی اور کے ساتھ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس یقین سے سرشار ہو کر اس نے گویا اپنی تقدیر کی حکمرانی سنبھال لی۔ اس طرح اب اس کے اور فلورنٹینو آریزا کے درمیان ٹیلیگراموں کا سلسلہ تनावوں اور گریز پانچوئوں پر مشتمل نہ رہا بلکہ پہلے سے زیادہ فعال، شدید اور پُرشوق ہوتا گیا۔ وہ تاریخیں طے کرتے، طریق کار وضع کرتے، اپنی زندگی کو اس مشترکہ عزم کے لیے وقف کرنے کا عہد کرتے کہ جب اور جس طرح بھی ممکن ہو وہ دوبارہ ملتے ہی، کسی سے مشورہ کیے بغیر شادی کر لیں گے۔ فرینا دازا کو اپنے اس عہد کا ابھی سے اتنا پاس تھا کہ جب اس کے باپ نے فونیکا کے قصبے میں، زندگی میں پہلی بار، اسے رقص میں جانے کی اجازت دی تو اسے یہ مناسب معلوم نہ ہوا کہ اپنے منکبتر کی رضامندی حاصل کیے بغیر رقص کی دعوت قبول کر لے۔ فلورنٹینو آریزا اُس رات ہوٹل میں لوہاریو گٹ کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا جب اسے بتایا گیا کہ اس کے لیے ٹیلیگراف پر ایک بے حد اہم پیغام ہے۔

فونیکا کا ٹیلیگراف آپریٹر لائن پر تھا جو سات واسطوں سے گزر کر اس سے رابطہ قائم کر پایا تھا، تاکہ فرینا دازا رقص میں شرکت کی اجازت لے سکے۔ مگر جب اسے اجازت مل گئی تو وہ اس مثبت جواب سے مطمئن نہ ہوئی اور اس بات کا ثبوت طلب کیا کہ دوسرے سرے پر فلورنٹینو آریزا خود موجود ہے۔ فلورنٹینو آریزا کو اس مطالبے پر خوشی سے زیادہ حیرت ہوئی اور اس نے اپنی شناخت کے لیے ایک فقرہ بنایا: "اسے کہو کہ میں تاج دار دیوی کی قسم کھاتا ہوں۔" فرینا دازا اس اسم کو پہچان گئی اور مطمئن ہو کر صبح سات بجے تک رقص کی محفل میں رکی اور اس وقت بھی وہاں سے اس لیے واپس آئی کہ شتابی سے لباس تبدیل کر کے گرجا گھر جا سکے۔ اس وقت تک اس کے صندوق کی تہ میں اُن خطوں سے، جنہیں اس کے باپ نے اس سے چھین لیا تھا، کہیں زیادہ ٹیلیگرام جمع ہو چکے تھے۔ اب وہ ایک شادی شدہ عورت کا سا انداز سیکھ گئی تھی۔ لورینزو دازا نے

اس کے طرزِ عمل میں اس تغیر کو اس بات کا ثبوت جانا کہ فاصلے اور وقت نے اسے اس کی نوعمری کے خوابوں سے رہا کر دیا ہے، لیکن اس نے کبھی فرینا دازا سے اس کی شادی کے منصوبے کا کوئی ذکر نہ کیا۔ اس پر ٹکلف احتیاط کی حدود میں جو فرینا دازا نے پھوپھی ایسکولیتیکا کے نکال دیے جانے کے بعد سے عائد کر لی تھی، ان دونوں کے تعلقات خاصے ہموار ہو گئے تھے اور اس نے انہیں ساتھ رہنے کی ایک ایسا پُر سکون وضع فراہم کر دی تھی کہ کسی کو اس کے اُنس پر مبنی ہونے میں کوئی شبہ نہ ہوتا تھا۔

یہ وہ وقت تھا جب فلور نٹینو آریزا نے اپنے خطوں میں فرینا دازا کو اس کی خاطر غرقاب خزانے کی بازیابی کے ارادے سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ سچ تھا، اور یہ خیال ایک روز اس کے ذہن پر اچانک چھا گیا تھا جب ایک دھوپ بھری سہ پہر میں سمندر نشہ آور گھاس کی مدد سے سطح پر لائی گئی بے شمار مچھلیوں کے باعث المومس سے ڈھکا ہوا لگ رہا تھا۔ فضا کے تمام پرندے ان کے آس پاس جمع ہو کر شور مچا رہے تھے۔ مچھیروں کو اپنے چپو ہوا میں لہرا کر انہیں منتشر کرنا پڑتا کہ انہیں ان پرندوں سے اس ممنوعہ مجزے کے اٹھار کی تقسیم پر لڑنا نہ پڑے۔ مچھلیوں کو بے ہوش کرنے کے لیے اس بوٹی کا استعمال نوآبادیاتی دور سے قانوناً ممنوع تھا، لیکن یہ کرییمین کے مچھیروں کا اس وقت تک معمول رہا جب تک اس کی جگہ بارود نے نہ لے لی۔ فرینا دازا کے اس طویل سفر پر رہنے کے عرصے میں فلور نٹینو آریزا وقت گزاری کے لیے، ساحل پر کھڑا مچھیروں کو بے ہوش مچھلیوں سے بھرے جال اپنی کشتیوں میں لاوتے دیکھا کرتا۔ اسی دوران کم عمر لڑکوں کی ایک ٹولی وہاں کھڑے ہوئے لوگوں سے پانی میں سکے پھینکنے کی درخواست کیا کرتی تاکہ وہ غوطہ کھا کر اسے تہ میں سے نکال لانے کا مظاہرہ کر سکیں۔ یہی لڑکے اس مظاہرے کے لیے تیر کر ساحل سے کچھ دور کھڑے سمندری جہازوں تک جایا کرتے تھے، اور غوطہ زنی میں ان کی مہارت کے قصے یورپ اور ریاست ہائے متحدہ کے کتنے ہی سفر ناموں کا مشترک موضوع رہے ہیں۔ فلور نٹینو آریزا کو ان کے بارے میں ہمیشہ سے علم تھا، اس زمانے سے جب وہ محبت سے آشنا نہیں ہوا تھا، لیکن اسے یہ خیال کبھی نہیں آیا تھا کہ غرقاب خزانے کو بازیاب کرنے میں بھی ان کی مدد لی جاسکتی ہے۔ یہ خیال اسے اسی سہ پہر کو آیا، اور اس سے اگلے اتوار سے لے کر تقریباً ایک سال بعد فرینا دازا کی واپسی تک، اسے جنون کا ایک آور محرک دستیاب ہو گیا۔

یوکلیدس، جو ان غوطہ خور لڑکوں میں سے ایک تھا، اس سے دس منٹ تک بات چیت کرنے کے بعد زیر آب مہم کے بارے میں اتنا ہی پرجوش ہو گیا۔ فلور نٹینو آریزا نے اسے مہم کے بارے میں پورے منصوبے سے آگاہ نہ کیا، مگر غوطہ خور اور کشتی ران کے طور پر اس کی

صلاحیتوں کے بارے میں پوری معلومات حاصل کیں۔ اس نے پوچھا کہ کیا وہ بیس میٹر کی گھرائی میں سانس لیے بغیر اتر سکتا ہے، تو یوکلیدیس نے کہا، "ہاں"۔ اس نے پوچھا کہ کیا وہ طوفانی موسم میں کسی آلے کے بغیر صرف اپنی جہت پر بھروسہ کرتے ہوئے کشتی کو کھلے سمندر میں لے جاسکتا ہے، تو یوکلیدیس نے کہا، "ہاں"۔ اس نے پوچھا کہ کیا وہ جزائر سوتاؤینٹو کے سب سے بڑے جزیرے کے شمال مغرب میں سولہ بحری میل کے فاصلے پر ایک مخصوص مقام کا پتہ لگا سکتا ہے، تو یوکلیدیس نے کہا، "ہاں"۔ اس نے پوچھا کہ کیا وہ اسی اجرت پر کام کرنے کو تیار ہو گا جتنی مچھیرے اسے مچھلیاں پکڑنے میں مدد دینے کے عوض دیتے ہیں، تو یوکلیدیس نے کہا، "ہاں"، لیکن اتوار کے دن کام کرنے کے وہ پانچ ریال مزید لے گا۔ اس نے پوچھا کہ کیا وہ شارکوں سے مقابلہ کر سکتا ہے، تو یوکلیدیس نے کہا، "ہاں"، کیوں کہ اسے شارکوں کو ڈرا کر بھگانے کی طلسمی ترکیبیں معلوم ہیں۔ اس نے پوچھا کہ کیا وہ کسی راز کی حفاظت کر سکتا ہے چاہے اسے سپاہیوں کی عاقبت خافوں میں ڈال دیا جائے، تو یوکلیدیس نے کہا، "ہاں"۔ درحقیقت وہ کسی بھی بات کے جواب میں "نہ" نہیں کہتا تھا، اور "ہاں" وہ اتنے اعتماد سے کہتا تھا کہ اس پر شبہ کرنا ناممکن تھا۔ پھر یوکلیدیس نے خرچ کا حساب لگایا: کشتی کا کرایہ، کشتی کے جہیزوں کا کرایہ، مچھلیاں پکڑنے کے سامان کا کرایہ، تاکہ کوئی ان کی مہم کے اصل مقصد پر شک نہ کر سکے۔ کچھ چیزیں اور بھی ساتھ لے جانا ضروری تھا: کھانا، تازہ پانی کی جھاگل، تیل کا چراغ، چربی کی بتیوں کا ایک دستہ، اور خطرے کی صورت میں مدد مانگنے کے لیے شکاریوں کا زسنگھا۔

یوکلیدیس کی عمر تقریباً بارہ سال کی تھی، وہ بھر تیل، چالاک اور بے پناہ باتونی تھا، اور اس کا جسم اس قدر کچک دار تھا کہ وہ پیسے کے سوراخ میں سے بھی نکل سکتا تھا۔ موسموں نے اس کی جلد کو اتنا سنو لادیا تھا کہ اس کی اصل رنگت کا اندازہ کرنا ناممکن تھا، اور اس کی وجہ سے اس کی بڑی بڑی زرد آنکھیں اور بھی چمک دار لگتی تھیں۔ فلورنٹینو آریزا نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ اس پیمانے کی مہم کے لیے یوکلیدیس ایک مثالی ساتھی ثابت ہو گا، اور وہ مزید تاخیر کے بغیر اگلے اتوار کو روانہ ہو گئے۔

ان کا سفر سورج نکلنے کے وقت مچھیروں کے ساحل سے شروع ہوا: ان کا سامان مکمل اور حوصلہ بلند تھا۔ یوکلیدیس تقریباً بربنہ تھا: اس نے صرف ایک لنگوٹی باندھ رکھی تھی۔ فلورنٹینو آریزا اپنے فراک کوٹ، سیاہ بیٹ، پیسٹنٹ لیدر کے بوٹ اور ایک شاعرانہ بو میں ملبوس تھا، اور اس کے ہاتھ میں جہیزوں تک کے راستے میں وقت گزارنے کے لیے ایک کتاب تھی۔ پہلے ہی اتوار کو اسے اندازہ ہو گیا کہ یوکلیدیس کشتی رانی میں بھی اتنا ہی طاق ہے جتنا غوطہ خوری میں، اور سمندر کی

کیفیات اور اس میں تیرتی ہوئی ہر شے کے بارے میں اس کا علم حیرت انگیز ہے۔ وہ کسی بھی زنگ آلود کشتی کی تاریخ حیران کن تفصیل سے بیان کر سکتا تھا، ہر لنگر کی عمر کا علم رکھتا تھا، تیرتے ہوئے بلے کے ہر گٹھے کے، آخذ سے واقف تھا، اس زنجیر کی کڑیوں کی تعداد تک جانتا تھا جس سے ہسپانوی بندرگاہ میں داخلے کا راستا بند کرتے تھے۔ اس خوف سے کہ وہ اس مہم کے اصل مقصد سے بھی باخبر نکلے گا، فلورنٹینو آریزا نے اس سے حیل سازی سے ادھر ادھر کے سوالات کیے؛ اسے پتا چلا کہ یوکلیدس کو غرقاب جہاز کے بارے میں ذرہ بھر بھی علم نہیں۔

جب سے فلورنٹینو آریزا نے شب بصری کے ہوٹل میں پہلی بار خزانے کا قصہ سنا تھا، اس وقت سے وہ جہازوں کے بارے میں ہر ممکن معلومات جمع کرتا رہا تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ سان حوزے سمندر کی تہ میں مونگے کی چٹانوں کے درمیان واحد جہاز نہیں تھا۔ درحقیقت وہ تیرا کربا نامی بیرٹے کا ہراول جہاز تھا، جو پناما کے روایتی پور تو بیلو کے میلے سے اس کے خزانے کا ایک حصہ۔۔ یعنی پیرو اور ویرا کروز کی چاندی کے تین سو صندوق، اور کونادورا کے جزیرے پر جمع کیے اور گئے ہوئے موتیوں سے بھرے سو صندوق۔۔ لے کر مئی ۱۷۰۸ کے بعد یہاں پہنچا تھا۔ اس طویل مہینے میں جب وہ یہاں ٹھہرا، جتنی رات دن جاری رہا اور سلطنت ہسپانیہ کو نداداری سے بچانے کے لیے درکار خزانے کا بقیہ جمع کر کے جہازوں پر لادا جاتا رہا، جو موزو اور سومندو کو کے زمردوں سے بھرے ایک سو سولہ صندوقوں اور سونے کے تین کروڑ ٹکٹوں پر مشتمل تھا۔

تیرا فرما کے بیرٹے میں بار برداری کے چھوٹے بڑے کم از کم بارہ جہاز شامل تھے اور وہ اس بندرگاہ سے، ایک قافلے کی شکل میں، ایک فرانسیسی بحری دستے کی زیر نگرانی روانہ ہوا، جو اگرچہ اچھی طرح مسلح تھا لیکن چارلس و بجر کے زیر کمان انگریزی بحری دستے کی توپ کے گولوں کو درست نشانے پر لگنے سے نہ روک سکا جو بندرگاہ میں داخلے کے راستے پر جزائر سوتا وینٹو کے قریب منظر تھا۔ اس لیے سان حوزے ڈوبنے والا واحد جہاز نہیں تھا، لیکن اس بات کی کوئی معتبر دستاویزی شہادت نہ تھی کہ انگریزی حملے میں کتنے جہاز غرق ہوئے تھے اور کتنے بچ نکلے تھے۔ لیکن جو بات یقینی طور پر کہی جاسکتی تھی وہ یہ تھی کہ ہراول جہاز ڈوبنے والے پہلے جہازوں میں شامل تھا، اور اس کے ساتھ عرشے پر کھڑا ہوا اس کا پورا عملہ اور اس کا کمانڈر بھی ڈوب گیا تھا اور اسی جہاز پر زیادہ تر خزانہ لدا ہوا تھا۔

فلورنٹینو آریزا نے اس زمانے کے بحری نقشوں کی مدد سے اس بیرٹے کے راستے کا پتا چلا لیا تھا، اور اپنی دانست میں اُس مقام کا بھی سراغ لگا لیا تھا جہاں وہ غرق ہوا تھا۔ انھوں نے ساحل پر بوکا چیکا کے دو قلعوں کے درمیانی مقام سے آغاز کیا اور چار گھنٹوں کے سفر کے بعد جزائر کے

درمیان کے پُر سکون پانیوں میں داخل ہو گئے جہاں وہ مونگے کی چٹانوں کے پہلو میں سوتے ہوئے بڑے جمینگلوں کو ہاتھ بڑھا کر اٹھا سکتے تھے۔ ہوا اتنی سبک اور سمندر اتنا پُر سکون اور صاف تھا کہ فلورنٹینو آریزا کو لگا کہ وہ خود پانی میں نظر آنے والا اپنا ہی عکس ہے۔ جزائر کے عقبی سمندر کے دوسرے سرے پر وہ مقام تھا جہاں جہاز غرق ہوئے تھے۔

دھوپ کی شدید تمازت میں پُر ٹکٹ لباس پہنے ہوئے فلورنٹینو آریزا کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے یوکلیدیس سے کہا کہ وہ اس مقام پر بیس میٹر کی گہرائی تک غوطہ لگائے اور تہہ میں اسے جو چیز ہاتھ لگے اسے باہر نکال لائے۔ پانی اتنا شفاف تھا کہ وہ اسے نیلی شارکوں کے درمیان ایک سیاہ فام شارک کی طرح نظر آ رہا تھا جو اس کے ارد گرد سے اسے چھوئے بغیر گزر رہی تھیں۔ پھر اس نے اسے مونگے کے انہار میں غائب ہوتے ہوئے دیکھا اور عین اُس وقت جب اسے خیال ہوا کہ اب اس کے پیچھے ہٹوں کی ہوا ختم ہو چکی ہو گی، اسے اپنی عقب میں اس کی آواز سنائی دی۔ یوکلیدیس کمر کمر پانی میں بازو اٹھائے کھڑا تھا۔ سوانحوں نے سمندر کی سطح پر چمکتی بے نیاز روشنی کی تہہ، خوفزدہ کینچھوں اور سمندری گلاب کی جھاڑیوں کے اوپر اوپر شمال کی جانب اپنا سفر، اور زیادہ گہرے مقامات میں اپنی تلاش جاری رکھی، یہاں تک کہ یوکلیدیس اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ ماضی وقت صنّاع کر رہے ہیں۔

"اگر تم مجھے یہی نہیں بتاؤ گے کہ مجھے کیا چیز تلاش کرنی ہے، تو میں اسے کس طرح تلاش کروں گا،" اس نے کہا۔

لیکن فلورنٹینو آریزا نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ پھر یوکلیدیس نے تجویز پیش کی کہ وہ بھی کپڑے اتار کر اس کے ساتھ غوطہ لگائے، چاہے اس کا مقصد مونگے کی چٹانوں کی گہرائی میں، زمین کے نیچے ایک اور آسمان دریافت کرنا ہی کیوں نہ ہو۔ فلورنٹینو آریزا کا ہمیشہ سے خیال تھا کہ خدا نے سمندر اس لیے بنایا ہے کہ آدمی کھڑکی سے اس کا نظارہ کرے، اس لیے اس نے کبھی تیرنا سیکھا ہی نہ تھا۔ کچھ دیر بعد بادل چھا گئے اور ہوا سرد اور نرم ہو گئی، اور اتنی تیزی سے اندھیرا ہو گیا کہ انھیں واپس بندرگاہ تک پہنچنے میں لائٹ ہاؤس کی روشنیوں کی مدد لینا پڑی۔ بندرگاہ میں داخل ہونے سے پہلے بہت بڑا سفید فرانسیسی بحری جہاز ان کے بالکل نزدیک سے گزرا، اس کی تمام روشنیاں جل رہی تھیں اور وہ اپنے پیچھے نرم گوشت کے اسٹو اور ابلی ہوئی گو بھی کی مہک چھوڑتا جا رہا تھا۔

انھوں نے تین اتوار اسی طرح صنّاع کیے، اور وہ تمام اتوار اسی طرح صنّاع کرتے رہتے اگر فلورنٹینو آریزا نے یوکلیدیس کو اپنے راز میں شریک کرنے کا فیصلہ نہ کر لیا ہوتا، جس نے تلاش

کے پورے منصوبے کو نئے سرے سے ترتیب دیا، اور وہ جہازوں کے قدیم راستے پر اُس مقام کی طرف روانہ ہوئے جو فلورنٹینو آریزا کے طے کردہ مقام سے بیس بحری میل دور مشرق میں واقع تھا۔ دو ماہ سے کم عرصہ گزرا ہو گا کہ برسات کی ایک سہ پہر، یوکلیدیس تہ میں بہت دیر تک ٹھہرا رہا اور کشتی اس اثنا میں بہتے بہتے اتنی دور ٹکل گئی کہ اسے سطح پر آنے کے بعد آدھ گھنٹے تک تیر کر اس تک پہنچنا پڑا کیوں کہ فلورنٹینو آریزا اسے اس کے قریب نہیں لاسکتا تھا۔ جب آخر کار وہ کود کر کشتی میں سوار ہوا تو اس نے اپنے منہ سے عورتوں کے پسینے کے دوزیور برآمد کیے اور ان کی یوں نمائش کی جیسے وہ اس کی باجوہ صلیبی کا انعام ہوں۔

اس نے جو تفصیل بیان کی وہ اس قدر مسور کن تھی کہ فلورنٹینو آریزا نے عہد کیا کہ تیرنا اور ہر ممکن گہرائی تک غوطہ لگانا سیکھے گا تا کہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔ یوکلیدیس نے بتایا کہ اس مقام پر صرف اٹھارہ میٹر کی گہرائی میں موٹے کی چٹانوں کے درمیان اتنے سارے قدیم بادبانی جہاز پڑے ہیں کہ ان کی گنتی دشوار ہے، اور وہ اتنے بڑے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں کہ ان کا دوسرا سرا نظر نہیں آتا۔ اس نے بتایا کہ سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ وہ ڈوبے ہوئے جہاز سطح پر تیرنے والے لمبے کی نسبت بہت اچھی حالت میں ہیں۔ اس نے بتایا کہ ان میں سے بعض کے بادبان بھی صحیح سلامت ہیں، اور ڈوبے ہوئے جہاز تہ میں بھی صاف نظر آتے ہیں، جیسے وہ اپنے وقت اور مقام کے ساتھ غرقاب ہوئے ہوں، کیوں کہ ان پر گیارہ بجے دن کی وہی روشنی پڑ رہی ہے جو سنچر ۹ جون کے اُس دن پڑ رہی تھی جب وہ غرق ہوئے تھے۔ اپنے تخیل کی قوت سے بے دم ہو کر اس نے کہا کہ ان جہازوں میں سب سے آسانی سے پہچان میں آنے والا جہاز سان حوزے ہے، کیوں کہ اس کا نام اس کے پچھلے حصے پر سنہری حروف میں لکھا ہوا ہے، مگر یہی جہاز انگریز توپوں کے حملے کے نتیجے میں سب سے زیادہ تباہ شدہ بھی ہے۔ اس نے بتایا کہ اس نے جہاز کے اندر ایک آکٹوپس دیکھا ہے جس کی عمر تین سو سال سے زیادہ ہے اور ٹانگیں توپ کے گولوں سے بنے سوراخوں سے باہر نکلی ہوئی ہیں، وہ کھانے کے کمرے میں قید کی حالت میں اتنا بڑا ہو چکا ہے کہ اس کو ربا کرنے کے لیے جہاز کو توڑنا ضروری ہو گا۔ اس نے بتایا کہ اس نے جہاز کے اگلے حصے کے باہی خانے کے اندر جنگی وردی میں ملبوس کمانڈر کی لاش کو کروٹ کے بل تیرتے دیکھا ہے، اور یہ کہ اگر وہ آور گہرائی میں جا کر جہاز کے تہ خانے تک نہیں پہنچ سکا، جہاں اس کا تمام خزانہ بند ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پیپیرٹوں میں ہوا ختم ہو گئی تھی۔

تب، فرینا دازا کے فونیکا سے واپسی سے کچھ عرصہ قبل، اُس کے نام ایک خط میں فلورنٹینو آریزا نے پہلی بار خزانے کا تذکرہ کیا۔ وہ اس غرقاب خزانے کے قفسے سے واقف تھی،

اس لیے کہ اس نے لورینزو وازا سے بہت مرتبہ اس کا ذکر سنا تھا، جس نے جرمن غوطہ خوروں کی ایک کمپنی کو اس خزانے کی بازیابی کے منصوبے میں شریک ہونے پر قائل کرنے میں بہت وقت اور سرمایہ برباد کیا تھا۔ وہ اس منصوبے پر حمار ہٹا اگر اکیڈمی آف ہسٹری کے کئی اراکین نے اسے قائل نہ کر لیا ہوتا کہ غرقاب جہاز کا قصہ کسی بد معاش وائسرائے نے سلطنت کے اس خزانے کی خوردبرد کو چھپانے کی غرض سے ایجاد کیا تھا۔ ہر کیفیت، فریٹنا وازا جانتی تھی کہ غرقاب جہاز کسی انسان کی رسانی سے باہر ہے اور وہ دو سو میٹر، نہ کہ فلورنٹینو آریزا کے دعوے کے مطابق بیس میٹر، کی گہرائی میں دفن ہے۔ لیکن وہ فلورنٹینو آریزا کے شاعرانہ غلو کی عادی تھی، اس لیے اس نے خزانے کی مہم کو انتہائی کامیاب قرار دے کر اس پر خوشی کا اظہار کیا۔ اس کے باوجود، جب اُس نے بعد کے خطوں میں آور بھی زیادہ ناقابل یقین تفصیلات اتنی ہی سنجیدگی سے لکھی ہوئی پڑھیں جس سنجیدگی سے وہ اپنی محبت کا اعلان کرتا تھا، تو اس نے ہلدا برندا سا پیچر سے اپنے اس اندیشے کا مجبوراً اظہار کیا کہ اس کا محبوب شاید اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔

اس دوران یوکلیدیس اپنے سنائے ہوئے قصے کے اتنے سارے ثبوت سمندر سے برآمد کر چکا تھا کہ اب معاملہ منگنے کے درمیان بکھرے ہوئے اکادکا زیورات سے کھیلنے کا نہیں، بلکہ باہلی خزانے سے لدے ہوئے پچاس جہازوں کو سمندر کی تہ سے نکالنے کے ایک عظیم الشان منصوبے کا تھا۔ تب وہی ہوا جو ہلدا یا بدیر ہونا تھا: فلورنٹینو آریزا نے اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اپنی ماں کی مدد طلب کی۔ اس کی ماں نے صرف دھات کے زیوروں میں دانت گڑو کر دیکھا، اور کانچ کے بنے ہوئے بیروں پر ایک نظر ڈالی اور جان گئی کہ کوئی شخص فلورنٹینو آریزا کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ یوکلیدیس نے گھٹنوں کے بل جھک کر قسم کھائی اور فلورنٹینو آریزا کو یقین دلایا کہ اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے، لیکن اگلے اتوار کو وہ پھیروں کے ساحل پر نمودار نہیں ہوا، اور اس کے بعد بھی کہیں نظر نہیں آیا۔

اس مہم سے فلورنٹینو آریزا کو جو واحد چیز حاصل ہوئی وہ لائٹ ہاؤس کی مہربان پناہ گاہ تھی۔ وہ ایک رات یوکلیدیس کی کشتی میں سوار ہو کر وہاں گیا تھا کہ انہیں سمندری طوفان نے آیا۔ اس کے بعد سے وہ اکثر سر پہروں کو وہاں جایا کرتا اور لائٹ ہاؤس کے محافظ سے خشکی اور پانی کے ان عجائبات کے بارے میں باتیں کیا کرتا جو محافظ کے علم میں تھے۔ یہ ایک ایسی دوستی کی ابتدا تھی جو دنیا میں بہت سی تبدیلیاں آنے کے باوجود قائم رہی۔ برقی توانائی کے ہم تک پہنچنے سے قبل فلورنٹینو آریزا نے لکڑی کے کندوں پر تیل انڈیل کر لائٹ ہاؤس کی آگ روشن کرنے کا ہنر سیکھا۔ اس نے روشنی کا رخ تبدیل کرنا اور آئینوں کی مدد سے اس میں اضافہ کرنا سیکھا، اور کئی موقعوں پر،

جب محافظ کو کسی وجہ سے کہیں جانا پڑتا، وہ لائٹ ہاؤس کے ینار میں بیٹھ کر رات بھر سمندر پر پہرا دیا کرتا۔ وہ آوازوں اور افق پر چمکتی روشنیوں کی مدد سے جہازوں کو پہچاننا سیکھ گیا اور اسے احساس ہونے لگا کہ اس طرح ان جہازوں سے کوئی شے لائٹ ہاؤس کے روشن ینار میں اس تک پہنچ رہی ہے۔

دن میں، خصوصاً اتوار کے روز، اسے ایک اور مشغلہ میسر تھا۔ وائسرائے کے محلے میں، جہاں پرانے شہر کے متمول لوگ رہا کرتے تھے، ساحل پر مردوں اور عورتوں کی تفریح گاہوں کے درمیان پلاسٹر کی ایک دیوار حائل تھی، اس طرح کہ لائٹ ہاؤس ان دونوں حصوں کے عین درمیان میں واقع تھا۔ لہذا لائٹ ہاؤس کے محافظ نے ایک چھوٹی سی دور بین مخصوص کر دی تھی کہ ایک سستا واداکر کے کوئی شخص اس کی مدد سے اس ساحل پر نظر ڈال سکتا تھا جو عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ یہ جانے بغیر کہ انہیں دیکھا جا رہا ہے، اعلیٰ طبقے کی خواتین ٹکٹوں بھرے تیراکی کے لباسوں اور چپلوں اور بیٹوں میں مقدور بھر اپنی نمائش کیا کرتیں، اگرچہ یہ لباس ان کے جسم کا تقریباً اسی قدر حصہ ڈھانپ لیتا تھا جتنا ان کا عام لباس، اور اس کے علاوہ وہ اس کے مقابلے میں کم پرکشش تھا۔ ان کی مائیں اپنے مخصوص لباس اور پروں والے بیٹھ پینے جھولنے والی کرسیوں میں بیٹھی دھوپ سینکا کرتیں؛ ان کے ہاتھوں میں نفیس سوئی کپڑے کی وہی چستریاں ہوتیں جنہیں لے کر وہ عبادت کے لیے گرجا گھر جایا کرتی تھیں۔ وہ وہاں بیٹھی اپنی بیٹیوں کی نگرانی کرتی رہتیں، کیوں کہ انہیں خوف ہوتا کہ کہیں دیوار کی دوسری طرف کے مرد انہیں پانی کے اندر ورغلا نہ لیں۔ حقیقت یہ تھی کہ اس دور بین میں سے کوئی شخص اس سے زیادہ یا اس سے بہتر نظارہ نہ کر سکتا تھا جتنا عام سرمکوں پر ممکن تھا، لیکن ہر اتوار کو بہت سے گاہک اس دور بین سے چپک کر دیوار کے اُس طرف کے ممنوعہ پھل کی لذت چکھنے آتے جس سے انہیں محروم رکھا تھا۔

فلورنٹینو آریزا بھی وہاں آیا کرتا، مگر لذت اٹھانے سے زیادہ اکٹا ہٹ دور کرنے کی غرض سے۔ لائٹ ہاؤس کے محافظ سے اس کی دوستی کی وجہ یہ نہیں تھی۔ اصل وجہ یہ تھی کہ فریدنا دازا کی جانب سے رد کر دیے جانے کے بعد، جب اس نے اس کا خلا پُر کرنے کی کوشش میں بہت سی مختلف محبتوں کے بیجان میں خود کو مبتلا رکھا، اس زمانے میں صرف لائٹ ہاؤس میں گزارا ہوا وقت اس کا مسرور ترین وقت ہوتا تھا، اور وہیں اسے اپنی بد نصیبیوں سے پناہ ملتی تھی۔ اسے یہ مقام سب سے زیادہ عزیز تھا، اس قدر کہ اس نے کئی سال تک اپنی ماں، اور اس کے بعد اپنے ماموں لیو بگنٹم کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ اسے خریدنے میں اس کی مدد کریں۔ ان دنوں کریبینن کے لائٹ ہاؤس نجی ملکیت میں ہوا کرتے تھے اور ان کے مالک جہازوں سے بندرگاہ میں

داخلے کے لیے ان کے حجم کے مطابق محصول وصول کرتے تھے۔ فلورنٹینو آریزا کے خیال میں یہ شاعری سے نفع کمانے کا واحد معزز طریقہ تھا، لیکن اس سے نہ اس کی ماں کو اتفاق تھا اور نہ باموں کو۔ جب تک وہ اپنے وسائل سے اس قابل ہوا کہ لائٹ ہاؤس خرید سکے، اس وقت تک سارے لائٹ ہاؤس ریاست کی ملکیت بن چکے تھے۔

لیکن اس کے یہ سارے خواب رائیگاں نہیں تھے۔ غرقاب جہاز کے قفسے اور لائٹ ہاؤس کے انوکھے پن نے فرینا دازا کی وقت کا احساس کم کرنے میں بہت مدد دی، اور اس وقت جب وہ اس کی سب سے کم توقع کر رہا تھا، اسے فرینا دازا کی واپسی کی خبر ملی۔ درحقیقت ریوباچا میں طویل قیام کے بعد لورینزو دازا نے واپسی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ سمندر کے سفر کے لیے مناسب ترین موسم نہیں تھا، اس لیے کہ دسمبر کی تجارتی ہوائیں چل رہی تھیں، اور وہ تاریخی جہاز جو اس موسم میں سمندر عبور کرنے کا خطرہ مول لینے والا واحد جہاز تھا، مستقل اس امکان کی زد میں تھا کہ تیز مخالفت ہوائیں اسے دھکیل کر پھر اُسی بندرگاہ میں پہنچا دیں جہاں سے وہ روانہ ہوا تھا۔ اور یہی ہوا۔ فرینا دازا نے پوری رات ایک کیبن میں، جو نہ صرف اپنی تنگی کی وجہ سے بلکہ اپنے طاغوتی تعضن اور شدید گرمی کے باعث کسی مے خانے کے بیت الخلا سے مشابہ تھا، تختے پر پیٹیوں سے بندھے بندھے سبز الٹیاں کرتے ہوئے گزاری۔ جہاز اتنی بری طرح بل رہا تھا کہ اسے کئی بار یہ خیال آیا کہ پیٹیاں زور سے کھل جائیں گی۔ عرشے پر لوگوں کے چہنچہنے چلانے اور گالیاں دینے کی آوازیں کبھی کبھار اس تک پہنچتی تھیں تو ایسا لگتا کہ جہاز طوفان کا شکار ہو گیا ہے۔ برابر والے تختے پر اس کے باپ کے پیستے کی غرابٹ جیسے خزانے اس کی دہشت کو آور بڑھا رہے تھے۔ تین سال میں پہلی بار ایسا ہوا کہ اس نے پوری رات جاگتے ہوئے گزاری اور ایک لمبے کے لیے بھی فلورنٹینو آریزا کا خیال نہ آیا، جب کہ وہ دکان کے پچھلے کمرے میں اپنے جھونے میں لیٹا اس کی واپسی کے ابدی لمحات گن رہا تھا۔ صبح کے وقت ہوائیں اچانک ختم کئیں اور فرینا دازا کو احساس ہوا کہ شاید نہایت خراب حالت کے باوجود اس کی آنکھ لگ گئی تھی، کیوں کہ وہ لنگر کی زنجیروں کے شور سے جاگی۔ تب اس نے اپنی پیٹیاں کھولیں، اور بندرگاہ کے مبوم میں فلورنٹینو آریزا کو دیکھنے کی امید میں عرشے پر گئی، لیکن وہاں پہنچ کر اسے پام کے درختوں کے درمیان کسٹم کے شید پر پڑتی ہوئی سورج کی پہلی کرنیں اور کھارٹی کے گلے ہوئے تختے نظر آئے۔ جہاز ریوباچا کی بندرگاہ پر کھڑا تھا جہاں سے گزشتہ رات روانہ ہوا تھا۔

دن کا باقی حصہ ایک وابستہ کی سی کیفیت میں گزرا: وہ اُسی مکان میں تھی جہاں کل تک مقیم تھی، اُنہیں رشتہ داروں سے مل رہی تھی جنہوں نے کل اسے الداع کہا تھا: وہ زندگی کے ایک دن کو دوبارہ بسر کرنے پر حیرت زدہ تھی جسے وہ پہلے گزار چکی تھی۔ یہ تکرار اتنی مکمل تھی کہ فرینا دازا

پچھلی رات کی اذیت کے دوہرائے جانے کے خیال سے لرز اٹھی، کیوں کہ صرف اس کی یاد ہی اسے دہشت زدہ کرنے کو کافی تھی۔ لیکن اس سے گریز کا واحد طریقہ پہاڑی راستوں پر دو ہفتوں تک حجر کی پیٹھ پر سفر کرنا تھا، جس کے لیے حالات اب اور زیادہ خطرناک ہو گئے تھے، کیوں کہ کوسا کے آندھن صوبے میں ایک نئی خانہ جنگی شروع ہو گئی تھی جو تمام کریمین علاقوں میں پھیلتی جا رہی تھی۔ اور اس طرح رات آٹھ بجے شور مچاتے ہوئے رشتہ داروں کا وہی قافلہ اُسے ایک بار پھر اسی بندرگاہ تک رخصت کرنے آیا، وہی الوداعی آنسو بہائے اور جدا ہوتے وقت کے تحفوں کے اُسی انبار سے اسے لادیا جو کہیں میں کسی طرح نہ سماتا تھا۔ جب جہاز کی روانگی کا وقت آیا تو خاندان کے مردوں نے ہوا میں بے شمار فائر کر کے الوداع کہا اور دواب میں عرشے پر کھڑے ہوئے اور ہنزو دازا نے اپنے ریوالور سے پانچ ہوائی فائر کیے۔ فریدنا دازا کا خوف رفتہ رفتہ زائل ہو گیا، کیوں کہ ساری رات موافق ہوا چلتی رہی اور ہوا میں پھولوں کی ایسی خوشبو بسی رہی کہ وہ رات بھر حفاظتی پیٹیوں کے بغیر گھرمی نیند سوئی۔ اس نے خواب دیکھا کہ وہ فلورنٹینو آریزا سے دوبارہ مل رہی ہے جس نے اپنا مایوس چہرہ اتار پھینکا ہے، کیوں کہ وہ صرف ایک نقاب تھا، لیکن نقاب کے نیچے اس کا اصل چہرہ بھی موبہ ہو ویسا ہی ہے۔ صبح کو وہ بہت سویرے جاگ اٹھی، اور اس خواب کے معنے کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس نے اپنے باپ کو کپتان کے بار میں برانڈی ملی پہاڑی کافی پیتے ہوئے پایا، اس کی آنکھ اکھل کے اثر سے پچی ہوئی تھی، لیکن اس نے ان کی واپسی کے سفر کے بارے میں ذرا بھی بے یقینی کا اظہار نہ کیا۔

وہ بندرگاہ میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کا جہاز بڑے بازار کے قریب گودی میں لنگر انداز بادبانی جہازوں کی بھول بھلیوں کے درمیان خاموشی سے راستا بناتا آگے بڑھ رہا تھا، اور بازار سے اٹھنے والی بوسمندر میں میلوں دور تک پہنچ رہی تھی۔ صبح کی ہوا مستوا تر ہوند ابلانہمی سے بھری ہوئی تھی جس نے جلد ہی باقاعدہ بارش کی شکل اختیار کر لی۔ تارگھر کی بالکنی پر انتظار میں کھڑے فلورنٹینو آریزا نے جہاز کو، جس کے بادبان بارش کی وجہ سے دل شکستہ لگ رہے تھے، لاس آنیاس کی خلیج سے گزرتے اور بڑے بازار کی گودی میں لنگر انداز ہوتے دیکھ کر پہچان لیا۔ پچھلی صبح وہ گیارہ بجے تک انتظار میں کھڑا رہا تھا، اور تب اسے تار کے ذریعے مخالفت ہواؤں کی خبر ملی تھی جنہوں نے جہاز کی آمد میں تاخیر کر دی تھی، مگر اس صبح چار بجے وہ دوبارہ بالکنی میں جا کھڑا ہوا۔ وہ اس لانچ پر نظر جمائے انتظار کرتا رہا جو ان مسافروں کو جہاز سے ساحل تک پہنچا رہی تھی جنہوں نے طوفان کے باوجود جہاز سے اترنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لانچ بیچ راستے میں خشکی میں پھنس گئی اور ان میں سے اکثر کو کپڑوں میں گرتے پڑتے پیدل ساحل تک آنا پڑا۔ جب جہاز کے باقی ماندہ مسافروں کا بارش رکنے کا

انتظار بے سود رہا تو آٹھ بجے کمر کمر پانی میں کھڑے ایک سیاہ فام حمال نے عرشے کے جھگے سے فرینا دازا کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور تیرا کر ساحل تک پہنچا دیا، لیکن اس وقت تک وہ اتنی شراہور ہو چکی تھی کہ فلورنٹینو آریزا اسے پہچان نہ سکا۔

وہ خود بھی اس سے باخبر نہ تھی کہ اس سفر کے دوران اس میں کس قدر پہنچنی آچکی ہے، تاوقتے کہ وہ اپنے مقفل مکان میں داخل ہوئی، اور سیاہ فام خادمہ گالا پلاسیڈیا کے ساتھ مل کر، جو ان کی واپسی کی خبر سن کر غلاموں کے محلے سے وہاں پہنچ گئی تھی، مکان کو دوبارہ رہنے کے قابل بنانے کے رستہ نامہ کام کا بیڑا اٹھایا۔ فرینا دازا اب باپ کے لڑپیار سے بگڑی ہوئی اور اس کی سنت گیری سے خوف زدہ، اکلوتی بچی نہیں رہی تھی، بلکہ گردوغبار اور مکڑی کے جالوں سے بھری اس سلطنت کی حکمران تھی جسے اصل صورت پر بحال کرنا صرف ناقابلِ تخیل محبت ہی کی قوت سے ممکن تھا۔ وہ اس سے خوف زدہ نہ ہوئی کیوں کہ اسے اپنے اندر ایک سر بلند جرات مموس ہو رہی تھی جس نے اسے دنیا کو بلا دینے کے قابل کر دیا تھا۔ واپسی کے بعد پہلی ہی رات کو، جب وہ باورچی خانے کی بڑی میز پر بیٹھ گرم چاکلیٹ اور لیکس کھا رہے تھے، اس کے باپ نے اسے گھر چلانے کا اختیار سونپ دیا، اور اس نے یہ عمل ایک مذہبی رسم کے سے مطراق کے ساتھ انجام دیا۔

”میں تمہاری زندگی کی کنیاں تمہیں سونپ رہا ہوں،“ اس نے کہا۔

فرینا دازا نے، جس کی عمر کے سترہ سال پورے ہو چکے تھے، مضبوط باتوں اور اس شعور کے ساتھ ان کنبیوں کو قبول کیا کہ اس کی حاصل کی ہوئی آزادی کا ایک ایک انچ محبت کے لیے وقف ہے۔ پریشان خوابوں پر مشتمل رات گزارنے کے بعد، اگلے روز اسے اپنے گھر پر موجود ہونے کی ناخوشگوار کا پہلا احساس ہوا جب اس نے بالکنی کی کھڑکی کھولی اور اسے بوند باندی میں باغِ اناجیل، سربریدہ سورما کے مجسے، اور پتھر کی اس بیچ پر نظر ڈالی جہاں فلورنٹینو آریزا شاعری کی کتاب لیے بیٹھا رہا کرتا تھا۔ وہ اب اس کے ذہن میں دسترس سے باہر محبوب کے طور پر نہیں بلکہ ایک یقینی شوہر کی حیثیت سے آتا تھا جس سے وہ دل و جان سے وابستہ تھی۔ اسے اس وقت کا ہماری بوجھ اپنے دل پر مموس ہوا جو اس کی غیر موجودگی میں صانع ہو گیا تھا، اسے مموس ہوا کہ زندہ رہنا کس قدر دشوار ہے اور اسے خدا کے حکم کے مطابق اپنے مرد سے محبت کرنے کے لیے محبت کی کتنی زیادہ مقدار کی ضرورت ہوگی۔ باغ میں فلورنٹینو آریزا کو نہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کیوں کہ اس سے پہلے وہ بارش کی پروا کیے بغیر وہاں آیا کرتا تھا، اسے اس پر بھی حیرت تھی کہ اسے فلورنٹینو آریزا کی طرف سے کوئی اشارہ، کوئی پیغام تک نہیں ملا، اور وہ اچانک اس خیال سے لرز گئی کہ کہیں وہ مر نہ گیا ہو۔ لیکن اس نے اس ناساک خیال کو فوراً ہی جھٹک دیا کیوں کہ واپسی کی

اطلاع دینے والے ٹیلیگراموں کے جوش و خروش میں ان دونوں کو یہ طے کرنا یاد ہی نہیں رہا تھا کہ واپسی کے بعد وہ اپنا رابطہ کس طرح بحال کریں گے۔

درحقیقت فلور نٹینو آریزا کو اس وقت تک یقین تھا کہ وہ واپس نہیں آئی ہے، جب تک کہ ریوباچا کے ٹیلیگراف آپریٹر نے اس بات کی تصدیق نہ کر دی کہ وہ لوگ جمعے کے دن اُسی جہاز پر سوار ہو گئے تھے جو پچھلے روز مخالف ہواؤں کے باعث نہیں پہنچ سکا تھا۔ دو دن تک وہ فریٹنا دازا کے مکان میں زندگی کے آثار دیکھنے کے انتظار میں رہا اور آخر سوموار کو اس نے مکان کی کھڑکیوں میں ایک روشنی کو متحرک دیکھا جو مکان کے مختلف حصوں سے ہوتی ہوئی بالکنی والے کمرے میں جا کر ختم ہو گئی۔ وہ اُسی خوفناک مثلی کا شمار ہو کر نیند سے دور تھا جس نے اس کی محبت کی پہلی راتوں میں لجلجائی تھی۔ مرغ کی پہلی بانگ کے ساتھ ترانہ آریزا کی آنکھ کھلی تو وہ اس بات پر پریشان ہو گئی کہ اس کا بیٹا آدھی رات کو باہر صحن میں چلا گیا تھا اور اب تک واپس اندر نہیں آیا۔ اس نے فلور نٹینو آریزا کو گھر میں نہ پایا۔ وہ صبح ہونے تک گھومتا، ساطلوں کی ہوا میں عقیقہ شعر بلند آواز سے پڑھتا، اور مسرت سے روتا رہا۔ آٹھ بجے، ممکن سے بے حال، وہ کیفے کی مہرابوں کے نیچے بیٹھا تھا، اور یہ سوچ رہا تھا کہ فریٹنا دازا کو خوش آمدید کا پیغام کس طرح پہنچائے، کہ اچانک دل بلا دینے والے زلزلے کے جھٹکے سے تہ و بالا ہو کر رہ گیا۔

یہ وہی تھی، کلیسا کے چوک سے گزرتی ہوئی، گالا پلاسیدیا کو ساتھ لیے ہوئے، جس نے خریداری کی غرض سے خالی ٹوکریاں اٹھا رکھی تھیں؛ اور یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اسکول کی یونیفارم میں نہیں تھی۔ وہ سفر سے پہلے کے دنوں کی بہ نسبت زیادہ دراز قد، زیادہ بکھری ہوئی اور زیادہ سرگرم دکھائی دی؛ اس کا حسن بلوغت کے مناظر انداز کی وجہ سے زیادہ پاکیزہ ہو گیا تھا۔ اس کی چوٹی اور لمبی ہو گئی تھی لیکن اب اس نے اسے پشت پر لٹائے رکھنے کے بجائے بل دے کر اپنے بائیں کاندھے پر ڈال رکھا تھا، اور اس معمولی سی تبدیلی نے اس میں سے کم سنی کے تمام نشانات مٹا دیے تھے۔ فلور نٹینو آریزا اپنی جگہ بیٹھا اپنے تصور کی اس دوشیزہ کو دم بخود بھٹکتا رہا، یہاں تک کہ وہ دائیں بائیں دیکھنے بغیر چوک سے گزر گئی۔ مگر اسی ناقابل مزاحمت قوت نے جس کے اثر سے وہ مفلوج ہو کر رہ گیا تھا، اسے اُس کے پیچھے پیچھے چل دینے پر مجبور کر دیا، جب وہ کلیسا کا موڑ مڑ کر بازار کے فرش کی ناہموار پتھر پٹی سلوں کے بھرا کر دینے والے شور میں گم ہو رہی تھی۔

وہ اُس کو نظر آئے بغیر اس کا پہچان کرنے لگا اور اُس دوشیزہ کی روزمرہ کی حرکات، ممکنات اور قبل از وقت پہنچنے کی دیکھتا رہا، جس سے وہ دنیا میں سب سے زیادہ محبت کرتا تھا اور جسے پہلی بار اس کی فطری صورت حال میں دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی خوش خرامی سے مسحور ہو گیا جس کی مدد سے وہ

ہجوم میں راستا بنا رہی تھی، جب کہ کالا پلاسید یا قدم قدم پر لوگوں سے ٹکراتی اور اپنی ٹوکریوں میں الجھتی آرہی تھی اور اُس کے ساتھ ساتھ چلنے کے لیے اسے دوڑنا پڑتا تھا۔ فرینا داوا، اپنے ہی زمان و مکاں میں، سرک کی بے ترتیبی میں کسی سے ٹکرائے بغیر آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ پھوپھی ایسکولتیکا کے ساتھ بارہا بازار آچکی تھی، لیکن وہ دونوں ہمیشہ چھوٹی موٹی خریداری کیا کرتیں، کیوں کہ گھربار کا سارا سامان، نہ صرف فرنیچر اور کھانے پینے کی چیزیں بلکہ زنانہ کپڑے تک خریدنے کا کام لورنیزو داوا نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ سو بازار کا پہلا دورہ اس کے لیے ایک مسور کن مہم کی طرح تھا جسے اس کے لڑکپن کے خوابوں نے بے حد پرکشش بنا دیا تھا۔

اس نے ابدی محبت کا ضربت پیش کرنے والے سپروں، رستے ہوئے زخموں کو لیے دلمیزوں میں پڑے گداگروں کی التجاؤں، یا سدا ہوا گھڑیاں اس کے ہاتھ فروخت کرنے کی کوشش کرنے والے نقلی انڈین پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس نے کسی طے شدہ منصوبے کے بغیر بازار کا ایک لمبا اور تفصیلی چکر لگایا اور راستے میں کسی وجہ کے بغیر، صرف اپنی مشغولیت سے لطف اٹھانے کے لیے جگہ جگہ رکتی گئی۔ وہ ہر اس دروازے میں داخل ہوئی جس کے اندر کوئی چیز فروخت ہو رہی تھی، اور ہر جگہ اسے کوئی نہ کوئی ایسی چیز نظر آتی رہی جس نے اس کی زندہ رہنے کی امنگ میں اضافہ کیا۔ اس نے بڑے بڑے صندوقوں میں رکھے کپڑوں کے تانوں میں سے اٹھتی مہک کو شوق سے سونچا، اس نے کڑے ہوئے ریشمی کپڑے اپنے جسم پر لپیٹے، اس نے طلائی تار نائی دکان میں، بالوں میں لنگھا اڑے، پھولوں کی تصویروں سے مزین پنکھا ہاتھ میں لیے میڈرڈ کی عورت کا ہمیس بدل کر، قد آدم آئینے میں خود کو دیکھا، اور اپنی ہنسی پر خود ہی ہنسنے لگی۔ کھانے پینے کی درآمد شدہ چیزوں کی دکان میں اس نے بیرنگ مچلی کے اپار کی برنی کا ڈھکنا اٹھایا تو اسے شمال مشرق کی راتیں یاد آ گئیں جب وہ سان حوان دلاسیے ناگا میں رہنے والی سسھی سی لڑکی تھی۔ اس نے ایلی کانتے کا ایک ساج پسند کیا جس میں لمبی کا ڈانڈ تھا، اور سنپیر کے ناشتے کے لیے دو ساج اور اس کے علاوہ مچلی کے قتلے اور سرخ منشا کا مرتبان بھی خرید لیا۔ سالوں کی دکان میں اس نے ساج اور نازبو کے پتوں کو صرف انہیں سو گھنٹے کے سادہ لطف کی خاطر اپنی ہتھیلیوں کے درمیان ملا، اور مٹھی بھر لوٹیں، اتنی ہی سونف اور تھوڑی سی خشک اورک اور جو سپر خریدی، اور آنکھوں میں بے تماشا ہنسی کے آنسو لیے دکان سے رخصت ہوئی کیوں کہ پسی ہوئی تیتا مرچ کی دھانس سے اسے بار بار جھینگیں آرہی تھیں۔ فرانسیسی سامان آرائش کی دکان میں روٹر صابن اور روغن بلسان خریدتے ہوئے اس کے کان کے پیچھے پیرس کا تازہ ترین عطر ذرا سا لگا دیا گیا اور تمباکو نوشی کے بعد سانس کو معطر کرنے والی کلیا دی گئی۔

یہ درست ہے کہ وہ خریدنے کا کھیل کر رہی تھی، لیکن جو چیزیں اسے واقعی درکار تھیں، انہیں وہ بلا جھجکے خریدتی گئی اور اس کا انداز اس قدر پُر اعتماد تھا کہ کسی کو یہ خیال تک نہ آ سکتا تھا کہ وہ پہلی بار خریداری کے لیے نکلی ہے، کیوں کہ اسے احساس تھا کہ اس کی خریداری صرف اپنے لیے نہیں بلکہ فلورنٹینو آریزا کے لیے بھی ہے: ان دونوں کی میز کے لیے بارہ گز لنن؛ شادی کے بستر کی چادروں کے لیے سوتی کپڑا جو صبح ہونے تک ان دونوں کے جسموں کی نمی سے گھیلا ہو چکا ہوگا؛ محبت کے گھر میں ان دونوں کے نشاط کے لیے ہر عمدہ ترین چیز۔ اس نے بجا دتا و کیا اور دام کم کرائے، اس نے وقار اور تمکنت کے ساتھ جرح کی اور بہترین چیزیں چنیں، اور ان کی قیمت سونے کے سکوں میں ادا کی جنہیں دکان داروں نے صرف ان کی کھنک کا لطف لینے کے لیے سبکی کاؤنٹر پر بجا کر سنا۔

فلورنٹینو آریزا ایک استعجاب کے عالم میں چوری چھپے اسے نکتا رہا، سانس روکے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا؛ کئی بار وہ خاموش کی ٹوکریوں میں الجھ کر لٹکھڑایا، جس نے اس کی معذرتوں کا مسکراہٹ سے جواب دیا؛ اور اگر فرینا دازا نے اسے نہ دیکھا تو اس لیے نہیں کہ اسے موقع نہیں ملا، بلکہ اپنے چلنے کے پُر غرور انداز کے باعث اسے نہیں دیکھ پائی۔ اسے وہ اتنی حسین، اتنی ترغیب انگیز، عام لوگوں سے اتنی مختلف لگ رہی تھی کہ اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ پتھر ٹیلی سلوں پر اس کی ایڑیوں کی آواز کسی اور کو کیوں نہیں چوٹاتی، اس کے دامن کی لرزش سے اٹھنے والی ہوا ہر کسی کو دیوانہ کیوں نہیں کر دیتی، اس کی چوٹی کے لہرانے سے، اس کی بانہوں کی حرکت سے اور اس کی ہنسی کے خالص سونے سے ہر کوئی ہوش و حواس کیوں نہیں کھو بیٹھتا۔ فرینا دازا کے جسم کی ایک حرکت، اس کے مزاج کی ایک جھلک بھی اس کی نظر سے نہیں بچی تھی، لیکن اس نے اس خوف سے اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہ کی کہ کہیں یہ سر ٹوٹ نہ جائے۔ لیکن جب وہ منشیوں کے چوک کے بے پناہ شور میں داخل ہوئی تو فلورنٹینو آریزا کو خیال آیا کہ وہ موقع جس کے لیے وہ برسوں سے بے تاب رہا ہے، کہیں ضائع نہ ہو جائے۔

فرینا دازا کا اپنے اسکول کی دیگر طالبات کی طرح یہ خیال تھا کہ منشیوں کا چوک ایک ایسی منوس جگہ ہے جہاں باعزت نوجوان خواتین کے جانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ دراصل ایک چھوٹے سے چوک کے کنارے ایک محراب دار گیلری تھی جہاں سواری اور بار برداری کے لیے گدھا گاڑیاں کرائے پر ملتی تھیں اور جہاں عام خرید و فروخت زیادہ پر شور اور پر ہجوم ہو جاتی تھی۔ یہ نام نوآبادیاتی دور کی یادگار تھا جب واسکٹوں اور نقلی کفوں میں ملبوس کم گو منشیوں نے یہاں بیٹھنا شروع کیا، اور بہت قلیل معاوضے پر ہر قسم کی دستاویزات تحریر کرنے کا کام کرنے لگے: ان

دستاویزات میں استثنائے کی عرضیاں، قانونی شہادتیں، مبارک باد یا تعزیت کے خطوط، معاشرے کے مختلف مرحلوں کے مطابق محبت نامے، سبھی کچھ شامل تھا۔ اس بازار کی خراب شہرت کی وجہ، بلاشبہ، یہ لوگ نہیں تھے، بلکہ بعد میں آنے والے وہ دست فروش تھے جو یورپی جہازوں سے اسمگل کیا ہوا ہر قسم کا قابل اعتراض سامان غیر قانونی طور پر فروخت کیا کرتے تھے، جس میں فحش پوسٹ کارڈوں اور طلا کے مہموں سے لے کر کٹالونیا کے مشہور کنڈوم تک شامل تھے جو یا تو اگوانا کی کھنی سے مزین ہوتے تھے جو موقع کی ضرورت کے مطابق لہرانے لگتی تھی، یا پھر ان کے سروں پر پھول نگے ہوتے تھے جو استعمال کرنے والے کی خواہش پر اپنی پنکھڑیاں کھول دیتے تھے۔ فرینا دازا جو بازار کے آداب سے قدرے نا آشنا تھی، گیارہ بجے کی دھوپ سے پناہ حاصل کرنے کے لیے، یہ جانے بغیر کہ کہاں جا رہی ہے، اس گلی میں داخل ہو گئی۔

وہ شور و غل کے اس سمندر میں ڈوبتی چلی گئی جو جوتے چمکانے والے چھو کروں، پرندے فروخت کرنے والوں، سستی کتابیں بیچنے والوں، جن بھوت کا علاج کرنے والے دیسی معالجوں، اور مٹائی بیچنے والوں کی صداؤں سے پُر تھا۔ لیکن اس ہنگامے سے بے نیاز، وہ ایک کاغذ فروش کو دیکھ کر اپنی جگہ پر جم کر رہ گئی جو جادوئی روشنیوں کی کرامات کا مظاہرہ کر رہا تھا: خون کا تاثر دیتی ہوئی سرخ روشنائی، موت کی خبر دینے والی ماتمی روشنائی، اندھیرے میں نظر آنے والی چمک دار روشنائی، نظر نہ آنے والی روشنائی جو روشنی کے سامنے لائے جانے پر اُجاگر ہو جاتی تھی۔ وہ یہ ساری روشنیاں خریدنا چاہتی تھی تاکہ فلورنٹینو آریزا کو اپنی زندہ دلی سے مظلوم اور حیران کر دے، لیکن کئی روشنیاں آزمانے کے بعد اس نے سنہری روشنائی کی شیشی کا انتخاب کیا۔ پھر وہ پا کلیٹ فروخت کرنے والے کے پاس پہنچی جو اپنے بڑے بڑے مرتبانوں کے پیچھے بیٹھا تھا، اور مختلف مرتبانوں کی طرف انگلی سے اشارہ کر کر کے، کیوں کہ وہ اپنی آواز اس بے پناہ شور سے بلند نہ کر سکتی تھی، ہر قسم کی چھ مٹائیاں خریدیں، اور انہیں نہایت وقار کے ساتھ خادمہ کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ وہ شیرے پر بھنبھناتی بکھیوں، متواتر شور و غل اور بے پناہ گرمی میں تیرتے سرٹھی ہوئی مٹائیوں کے بخارات سے بالکل بے پروا تھی۔ اس سمر سے وہ اس وقت چوٹھی جب رنگ دار کپڑا سر پر باندھے ایک خوش طبع، فریہ اندام اور پُرکشش سیاہ فام عورت نے قسائی کے چاقو کی نوک پر اٹھی ہوئی انٹاس کی ایک مثلث قاش اسے پیش کی۔ اس نے اسے قبول کر کے منہ میں ڈال لیا، اس کا ذائقہ چمکا اور اسے کھاتے ہوئے، مجبوم نہیں اور حُر اور نظر ڈالنے لگی، اور ایک اچانک صدمے سے بے حس و حرکت ہو گئی۔ اس کی پشت پر، اس کے کان کے اس قدر قریب کہ صرف اسے سنائی دے، فلورنٹینو آریزا کی آواز آئی:

"تاج دار دیوی کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔"

وہ پیچھے مڑی اور اپنی آنکھوں سے پشت بھر کے فاصلے پر اُن سرد آنکھوں، اُس بے رنگ چہرے اور خوف سے پتھر بنے ہوئے اُن ہونٹوں کو اُسی طرح دیکھا جیسے اس سے پہلے اتنے ہی قریب سے گرجا گھر میں نصف شب کی عبادت کے ہجوم میں دیکھا تھا، لیکن اس بار اسے محبت کے مہجان کے بجائے مایوسی کی گھری کھائی کی دہشت محسوس ہوئی۔ ایک ہی لمحے میں اس کی غلطی کا بھیاں تک پہنچا اور اس پر آشکار ہو گیا، اور اس نے بیہوش زدہ ہو کر خود سے سوال کیا کہ آخر کس طرح ایک لایعنی خیال اتنے طویل عرصے تک اور اتنی شدت سے اس کے دل میں بسا رہا۔ وہ صرف اس قدر سوچ سکی: اوہ میرے خدا! یہ بے چارہ! فلورنٹینو آریزا نے مسکرا کر کچھ کہنا چاہا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کی، لیکن فرینا دازا نے اپنے ہاتھ کی ایک تیز حرکت سے اسے اپنی زندگی سے محو کر دیا۔

"نہیں،" وہ اس سے بولی، "بس! بھول جاؤ۔"

اسی سہ پہر کو جب اس کا باپ قیلولہ کر رہا تھا، اس نے گالا بلاسیدیا کے ہاتھ دو سطروں کا خط فلورنٹینو آریزا کو بھیجا: "آج جب میں نے تمہیں دیکھا تو احساس ہوا کہ ہمارے درمیان جو کچھ ہے وہ کسی سراب سے زیادہ نہیں۔" خادمہ نے اسے تمام ٹیلیگرام، تمام شعر اور کمیلیا کے خشک پھول لوٹا دیے، اور اس سے فرینا دازا کے تمام خط اور تحفے، پھوپھی ایکوولیتا کی دینی کتاب، اس کے باغیچے کی سوکھی ہوئی پتیاں، سینٹ پیٹر کلیور کی عبا کا ٹکڑا، ولیوں کے تحفے اور اسکول یونیفارم کے ربن میں بندھی اس کے پندرہویں سال کی چوٹی واپس کرنے کو کہا۔ اس کے بعد کے دنوں میں، فلورنٹینو آریزا نے، جو دیوانگی کی حدود کو چھو رہا تھا، اسے بے شمار بے تابانہ خطوط لکھے اور خادمہ سے انہیں فرینا دازا تک لے جانے کی استدعا کی، جس نے فرینا دازا کی ہدایات کی سختی سے پابندی کرتے ہوئے اس کے دیے ہوئے پرانے تحفوں کے علاوہ کوئی چیز لے جانے سے انکار کر دیا۔ اس نے اتنے شرمندہ سے تقاضا کیا کہ فلورنٹینو آریزا کو ساری چیزیں واپس دیتے ہی ہنسی، لیکن اس نے وہ سیاہ چوٹی نہیں لوٹائی اور کہا کہ یہ وہ خود فرینا دازا کو واپس کرے گا، اگر وہ چند لمحوں کے لیے مل سکیں۔ فرینا دازا نے انکار کر دیا۔ ترانزیٹو آریزا نے کسی ایسے فیصلے سے خوفزدہ ہو کر، جو اس کے بیٹے کے لیے مہلک ثابت ہو، اپنی انا کو بالائے طاق رکھا اور فرینا دازا سے پانچ منٹ کی ایک ملاقات کی درخواست کی، اور فرینا دازا اپنے گھر کے دروازے میں کھڑے کھڑے اس سے ملی، اسے اندر آنے یا بیٹھنے کو نہیں کہا، اور پیچھے کا شاہد تک ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اپنی ماں سے دو دن بحث کرنے کے بعد، فلورنٹینو آریزا نے اپنے کمرے کی دیوار سے رنگین شیشے کا وہ بکس اتار لیا جس میں اس نے فرینا دازا کی چوٹی کو کسی مقدس یادگار کی طرح سجایا تھا، اور ترانزیٹو آریزا اسے

سنہری بیل بوٹوں والے اُسی خمیلی ڈبے میں رکھ کر فرینا داڑا کو واپس دے آئی۔ فلورنٹینو آریزا کو فرینا داڑا سے ملنے یا بات کرنے کا، دونوں کی طویل زندگیوں کے دوران بارہا ایک دوسرے کے سامنے آنے کے باوجود، کوئی موقع نہ ملا، تاوقتیکہ اس نے اکیاون برس، نوماد اور چار دن بعد، اس کی بیوگی کی پہلی رات کو، اپنی ابدی وفاداری اور دوامی محبت کا عہد ایک بار پھر دوبہرایا۔

2000



انتخاب کا یہ حصہ مارکیز کی ایک تقریر اور ایک مضمون پر مشتمل ہے۔

مارکیز کو ۱۹۸۲ میں ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ "لاٹینی امریکا کی تنہائی" اس تقریر کا متن ہے جو مارکیز نے ۱۰ دسمبر ۱۹۸۲ کو اسٹوٹ گولم میں نوبل انعام کی تقریب میں کی تھی۔ انگریزی زبان میں یہ متن برطانیہ کے سرمایہ جریڈے Granta کے شمارہ ۹ میں شائع ہوا تھا۔

"کولومبیا کا مستقبل" مارکیز کا ایک صحافیانہ مضمون ہے جو نہ صرف اس لیے اس انتخاب میں شامل کیا گیا ہے کہ یہ اپنے ارد گرد کے حالات کے بارے میں ایک بڑے ادیب کا نقطہ نظر پیش کرتا ہے بلکہ اس لیے بھی کہ پاکستان کے پڑھنے والے اس مضمون سے جھلکنے والے کولومبیا کے معاشرے کے بہت سے اجزا کو بہت مانوس پائیں گے۔ یہ مضمون Granta کے شمارہ ۳۱ سے لیا گیا ہے۔

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ: اجمل کمال

لاطینی امریکا کی تنہائی

فلورنس کے جہاز راں انتونیو پیگافیتا نے، جو دنیا کے گرد پہلے بحری سفر میں ماگیلان کا ساتھی تھا، ہمارے جنوبی امریکا کے اپنے سفر کی روداد تحریر کی جو انتہائی حقیقی تفصیلات پر مبنی ہونے کے باوجود فینٹسی کی کارگزاری معلوم ہوتی ہے۔ اس میں وہ بتاتا ہے کہ اس نے ایسے سو دیکھے جن کی ناف پٹھوں پر تھی، ایسے پرندے دیکھے جن کی ٹانگیں غائب تھیں اور جن کی مادائیں نروں کی پیٹھ پر انڈے دیتی تھیں، بعض پرندے چیلیکن سے مشابہ تھے مگر ان کی زبان نہیں تھی اور چوچ کی شکل چمچ کی طرح کی تھی۔ وہ ایک ایسی مخلوق کو دیکھنے کا تذکرہ کرتا ہے جو تچر کے سر اور کان، اونٹ کا دھڑ، برن کا ٹانگیں اور گھوڑے کی ہینٹا ہٹ لے کر پیدا ہوئی تھی۔ وہ بتاتا ہے کہ کس طرح، پاتا گونیا میں پہلی بار کسی مقامی سے سامنا ہونے پر انھوں نے آئینہ اس کے مقابل کر دیا تھا، جس پر وہ مشتعل دیوڑا، اپنے عکس کی دہشت کے رو برو، ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

پیگافیتا کی مختصر اور مسرور کن کتاب، جس میں اُس زمانے میں بھی ہمارے آج کل کے ناولوں کا بیج موجود ہے، ہماری اُس دور کی حقیقت کا سب سے حیرت خیز بیانیہ برگز نہیں ہے۔

انڈیز کے ستیاج واقع نگاروں نے ہمارے لیے بے شمار آوریے بیانیں چھوڑے ہیں۔ ایلدورادو، ہماری گریز پاسرز زمین، جو بے اندازہ جستجو کا ہدف رہی ہے، بے شمار برسوں تک متعدد نقشوں میں، نقشہ سازوں کے تخیل کے زیر اثر مختلف مقامات پر، مختلف شکلوں میں نمودار ہوتی رہی ہے۔ ابدی شباب کے چشمے کی تلاش میں دیومالائی الوار نیونیز کا بیرزا دوا کا آٹھ برس تک شمالی میکسیکو کی خاک چھانتا پھرا، اور خام خیالی کی اس مہم کے دوران اس میں شامل افراد ایک دوسرے کو مار مار کر کھاتے رہے، اور روانہ ہونے والے چھ سو میں سے صرف پانچ زندہ لوٹ سکے۔ حل نہ ہو پانے والے لاتعداد معتموں میں سے ایک، گیارہ ہزار پتھروں کا وہ قافلہ بھی ہے جو آتا ہوا پالپا کا تاوان لے کر ایک روز کرکوسے یوں روانہ ہوا تھا کہ ہر پتھر پر ایک ہزار پونڈ سونا لدا ہوا تھا، اور جو کبھی اپنی مٹرل پر نہ پہنچ سکا۔ اس کے بعد کے زمانے میں کارتاہیتا دے آندرہاز میں فروخت ہونے والی دریا کے خشک ہونے سے ٹکلی ہوئی زمین پر پالی گئی مرغیوں کے سنگدانوں میں سے سونے کے ریزے برآمد ہوا کرتے تھے۔ اپنے موس آباؤ اجداد کے اس سنہری بڈیان کا عذاب ہم ماضی قریب تک اٹھاتے رہے ہیں۔ پچھلی بی صدی میں ایک جرمن مٹن، جسے دو سمندروں کے درمیان واقع خاکنائے پناہ کی پوری چوڑائی پر ریل کی پٹری بچھانے کے امکانات کا جائزہ لینے کا کام سونپا گیا تھا، اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ منصوبہ قابل عمل ہے بشرطہ کہ پٹریاں لوہے کی بجائے، جو اس علاقے میں کمیاب تھا، سونے کی بتائی جائیں۔

ہسپانوی تسلط سے ہماری آزادی بھی ہمیں دیوانچی کی رسائی سے باہر نہ لے جاسکی۔ جنرل انتونیو لوپیز دسائتانانے، جو تین بار میکسیکو کا حکمران رہا، اس جنگ میں جسے "پیٹریوں کی جنگ" کہا جاتا ہے، اپنی داہنی ٹانگ گنوا بیٹھنے پر اُس کی تدفین کی عالیشان رسوم ادا کیں۔ جنرل گابریئل گارسیمار مورے سونے ایکوادور پر مطلق العنان بادشاہ کے طور پر سولہ سال تک حکمرانی کی تھی؛ فوجی وردی میں ملبوس اور تمغوں سے آراستہ اس کی لاش نے، صدر اتی کریسی پر مستکن ہو کر باقاعدہ اپنی آخری رسوم میں شرکت کی۔ جنرل ماکی میلیانو برناندیز مارتینیز نے، جو ایل سلوادور کا تھیووفیکل ڈکٹیٹر تھا اور جس نے ایک ہیسا نہ قتل عام میں تیس ہزار کسانوں کو تہ تیغ کروا دیا تھا، اپنی غذا میں زہر کا پتا چلانے کے واسطے ایک پنڈولم ایجاد کیا تھا، اور قرمزی بخار کی ایک وبا کی مدافعت کرنے کی غرض سے گلے کے لیمپوں کو سرخ کاغذ سے ڈھکوا دیا تھا۔ گلوگی گالپا کے مرکزی چوک میں ایستادہ جنرل فرانسکو مورازان کا مجسمہ درحقیقت مارشل نے کا مجسمہ ہے جسے پیرس میں استعمال شدہ مجسموں کے ایک گودام سے خریدا گیا تھا۔

گیارہ سال پہلے ہمارے زمانے کے ایک ممتاز ترین شاعر، چیلے کے پابلو نیرودا نے اسٹوٹ گبولم کا سفر اختیار کیا تھا۔ اس وقت سے لے کر یورپ کے خوش خیال، اور بعض بداندیش، لوگ لاٹینی امریکا سے روز افزوں قوت سے اٹھنے والی عجیب غیر زمینی خوش خبریوں کی زد میں رہے ہیں: لاٹینی امریکا، آسیب زدہ مردوں اور تاریخ ساز عورتوں کی بے حد وسعت سرزمین جن کی بے پایاں استقامت افسانوی دُھند میں گم ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہمیں ایک لمحے کا آرام بھی نصیب نہیں ہوا۔ ایک محصور، تنہا، پرومیتھین صدر اپنے جلتے ہوئے محل میں ایک پوری فوج کی یلغار کا مقابلہ کرتے ہوئے ہلاک ہوا، اور دو مشتہ جوائی حادثوں نے، جو اب تک وضاحت طلب ہیں، ایک آور وسیع القلب صدر اور اپنے عوام کا وقار بحال کرنے والے ایک جمہوری سپاہی کی جانیں لیں۔ پابلو نیرودا کے اُس دورے سے لے کر اب تک پانچ جنگیں اور سترہ فوجی بغاوتیں ہو چکی ہیں: ایک ملعون ڈکٹیٹر نمودار ہو چکا ہے جو، خدا کے نام پر، ہمارے زمانے کے پہلے نسلی قتل عام میں مصروف ہے۔ اسی عرصے میں دو کروڑ لاٹینی امریکی بچے ایک برس کی عمر کو پہنچنے سے پہلے موت کا شکار ہو چکے ہیں۔ یہ تعداد اس عرصے میں یورپ بھر میں پیدا ہونے والے بچوں کی کل تعداد سے زیادہ ہے۔ "غائب ہوجانے والے"، یعنی وہ جو جبر کا شکار بن کر معدوم ہو گئے، تعداد میں تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے (سویڈن کے شہر) اُپسلا کے تمام باشندے اپنا نام و نشان چھوڑے بغیر مفقود الغیر ہو جائیں اور کوئی ان کے بارے میں کچھ نہ بتا سکے۔ گرفتار کی جانے والی بہت سی حاملہ عورتوں نے ارجنٹینا کی جیلوں میں بچوں کو جنم دیا ہے، لیکن ان بچوں کا پتا نشان کوئی نہیں جانتا، جنہیں چوری چھپے گود لینے والوں کے پاس یا یتیم خانوں میں بھیج دیا گیا۔ کم و بیش دو لاکھ عورتیں اور مرد اس لیے لڑتے ہوئے مارے گئے کہ وہ اپنی دنیا کو کسی تبدیلی کے بغیر جاری رہتا نہیں دیکھتا چاہتے تھے، اور ایک لاکھ سے زیادہ لوگ وسطی امریکا کے تین چھوٹے اور بد قسمت ملکوں، نکاراگوا، ایل سلواڈور اور گواتمالا میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اگر یہ واقعات ریاست ہائے متحدہ میں پیش آئے ہوتے تو ان سے تناسب رکھنے والی تعداد سولہ لاکھ پُر تشدد اموات پر مشتمل ہوتی۔

مہمان نوازی کی روایات رکھنے والے ملک چیلے سے دس لاکھ افراد، جو اس کی کل آبادی کے دسویں حصے کے برابر ہیں، جان بچا کر فرار ہو چکے ہیں۔ یوروگوئے میں، جو پچیس لاکھ باشندوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا ملک ہے جو خود کو پورے براعظم پر سب سے زیادہ مہذب خیال کرتے ہیں، برپانچ میں سے ایک شخص جلا وطنی میں ہے۔ ۱۹۷۹ء سے اب تک ایل سلواڈور میں ہونے

والی خانہ جنگی تقریباً ہر بیس منٹ پر ایک شخص کو پناہ گزین بنا رہی ہے۔ لاطینی امریکا کے جلاوطن، اور ترک وطن پر مجبور کر دیے جانے والے، لوگوں پر مشتمل ایک ملک بنایا جاسکے تو اس کی آبادی تاروسے سے زیادہ ہوگی۔

میں یہ سوچنے کی جسارت کرتا ہوں کہ یہ بیبت ناک حقیقت، نہ کہ ادب میں اس کا اظہار، وہ شے ہے جو سویڈش اکیڈمی آف لیٹرز کی توجہ کی مستحق ہوئی ہے۔ ایک ایسی حقیقت جو کاغذی نہیں ہے بلکہ ہمارے اندر رہتی بستی ہے، اور جو ہر لمحے ہماری بے شمار روزانہ اموات پر متبج ہو رہی ہے اور جو ایک سیر نہ ہونے والی فلاقت کے منبع کو شاداب رکھتی ہے، جو درد اور حسن سے معمور ہے، اور یہ آوارہ گرد اور یادوں کا اسیر کولو میسین جس کا محض ایک ذرہ ہے جسے تقدیر نے چُن لیا ہے۔ شاعر اور گداگر، موسیقار اور پیغامبر، جنگ باز اور بد معاش۔۔۔ اس بے لگام حقیقت کی تمام مخلوقات۔۔۔ ہم سب کو تخیل کے در پر کم ہی صدا لگانی پڑی ہے، کہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ تو ایسے پابند اظہار یا ذریعے کی تلاش کا رہا ہے جو ہماری زندگیوں کی حقیقت کو قابلِ یقین بنانے میں ہماری مدد کر سکے۔۔۔ سی، میرے دوستو، ہماری تنہائی کا عقدہ ہے۔

اور جب اس مسئلے سے نبرد آزما ہو کر خود ہم خام دست ہو جاتے ہیں، تو یہ بات قابلِ فہم ہے کہ دنیا کے اس حصے کی عقلی صلاحیتیں، جو اپنی تہذیبوں کے انہماک میں سرفراز ہیں، ہماری شرح کرنے کا کوئی موزوں طریقہ نہ پاسکیں۔ یہ محض فطری بات ہوگی کہ وہ ہمیں جانچنے کے لیے بھی وہی پیمانہ اختیار کریں جو وہ خود اپنے لیے استعمال کرتی ہیں، اس بات کو فراموش کر کے کہ زندگی کی غارت گری سب کے لیے یکساں نہیں ہوتی، اور اس بات کو بھی کہ شناخت کی جستجو ہمارے لیے بھی اتنی ہی دشوار اور خون آلود ہے، جتنی خود اُن کے لیے رہ چکی ہے۔ اجنبی اصطلاحات میں ہماری شرح کرنا ہمیں اور زیادہ نامعلوم، ہماری آزادی کو اور زیادہ محدود، اور ہمیں اور زیادہ تنہا کرتا ہے۔ قابلِ احترام یورپ زیادہ باادراک ہوتا اگر وہ ہمیں خود اپنے ماضی میں دیکھنے کی کوشش کرتا: یہ یاد کرتا کہ لندن شہر کو اپنی پہلی فسیل بنانے میں تین سو برس لگے تھے، اور تین سو برس اور اسے اپنا پہلا ہسپ میٹر آنے میں؛ اور یہ کہ روم کو بیس صدیوں تک بے یقینی کی تاریکی میں بھگتنا پڑا تھا اس سے پیشتر کہ ایک ایتر سکُن اسے تاریخ کے ساحل پر لنگر انداز کر دے؛ اور یہ کہ آج کے امن پسند سوئس، جو اپنے ملائم پنیروں اور مضبوط گھڑیوں سے ہماری تواضع کرتے ہیں، سولہویں صدی تک تقدیر کے سپاہیوں کی حیثیت میں یورپ کو

لاطینی امریکا کی تنہائی

لہولہان کرتے رہے ہیں، یہاں تک کہ نشاۃ الثانیہ کے اوج پر شاہی افواج کے تنخواہ دار پارہ ہزار کرائے کے سپاہیوں نے روم کو تاخت و تاراج کیا اور اس کے آٹھ ہزار باشندوں کو تہ تیغ کیا۔
میں تو نیو کورگو کے تصورات کی تجسیم کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا، جس کے پاکیزہ شمال اور جذباتی جنوب کو یکجان کرنے کے خواب کو تریپن سال قبل اسی اسٹوک بولم میں تومس مان کی توصیف حاصل ہوئی تھی۔ لیکن مجھے یہ یقین ہے کہ یورپ کے وہ صاحب نظر افراد جو زیادہ منصفانہ اور زیادہ انسانی دنیا کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، ہم پر نظر ڈالنے کے انداز پر نظر ثانی کر کے ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ محض ہمارے خوابوں سے ایک جہتی ہمارے تنہائی کے احساس کو کم نہیں کر سکتی، تاوقتہ کہ اس ایک جہتی کا اظہار اُن لوگوں کی جائز عملی امداد کے ذریعے نہ ہو جنہیں اس کی سب سے زیادہ طلب ہے: وہ جو اس تصور پر اب بھی یقین رکھتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن وہ بھی اس دنیا سے منصفانہ حصہ پا کر اپنی زندگی سے لطف اندوز ہونے کے اہل ہوں گے۔

نہ لاطینی امریکا کی یہ خواہش ہے، اور نہ اس کا کوئی جواز ہے کہ وہ اپنی مرضی سے محروم ایک مُردہ بنا رہے۔ اور یہ محض امید پرستی نہیں کہ لاطینی امریکا کی آزادی اور خلاقیت کی جستجو مغرب کی اسنگ بن جائے۔ لیکن وہ تمام بحری مہمات، جنہوں نے ایک طرف ہمارے امریکا کا یورپ سے فاصلہ کم کر دیا ہے، دوسری طرف ہماری تہذیبی دور افتادگی میں اضافے کی باعث بھی بنی ہیں۔ ایسا کیوں ہے کہ وہ خلاقیت جو ادب کے میدان میں ہمیں اتنی سہولت سے عطا کر دی جاتی ہے، اُسی خلاقیت سے سماجی تبدیلی کے لیے ہماری دشوار جدوجہد کے معاملے میں ہمیں نہایت بے اعتباری کے ساتھ محروم رکھا جاتا ہے؟ یہ کیوں سوچا جاتا ہے کہ یورپ کے ترقی پسند باشندوں کی اپنے ملک میں سماجی انصاف کی جستجو، اور لاطینی امریکیوں کی، مختلف حالات میں، مختلف ذرائع سے کی جانے والی کوششوں کی منزل ایک نہیں ہو سکتی؟ نہیں: ہماری تاریخ کا بے پناہ تشدد اور درد، قدیم نابرابریوں اور بے اظہار تلفیوں کا نتیجہ ہے، ہمارے گھر سے تین ہزار فرسنگ دور کی جانے والی کسی سازش کا نہیں۔ لیکن بہت سے یورپی رہنماؤں اور مفکروں نے یہی مانا ہے، کسی بوڑھے کے سے بچپن کے ساتھ جو اپنی جوانی کی کارگزاریوں کو فراموش کر چکا ہو: گویا دنیا کے دو بڑے مالکوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے والی تقدیر کے سوا کسی اور تقدیر کے ساتھ زندہ رہنا ہمارے لیے ممکن ہی نہیں۔ یہ، میرے دوستو، ہماری تنہائی کا پیمانہ ہے۔

اس کے باوجود، جبر، لوٹ مار اور ترک شدگی کے مقابل، ہم زندگی سے کلام کرتے ہیں۔ سیلاب اور وبائیں، قحط اور آفتیں، یہاں تک کہ صدیوں تک چلنے والی ابدی جنگ بھی زندگی کو اس فوقیت سے محروم نہیں کر سکی ہے جو اے موت پر حاصل ہے۔ ایک فوقیت جو روز بروز فروز تر اور تیز تر ہوتی جاتی ہے: ہر برس اموات سے سات کروڑ زیادہ پیدا نشیں ہوتی ہیں، یعنی ہر سال نیویارک کی کل آبادی کے سات گنا کے برابر۔ ان میں زیادہ تر پیدا نشیں اُن ملکوں میں ہوتی ہیں جن کے پاس سب سے کم وسائل ہیں، ان میں لاطینی امریکا کے ملک بھی شامل ہیں۔ اس کے برخلاف، خوشحال ترین ملکوں نے تباہی کی اتنی طاقت جمع کر لی ہے جو نہ صرف ان انسانوں کو جو آج تک پیدا ہوئے، بلکہ ان تمام جانداروں کو جنہوں نے اس بد قسمت سیارے پر کبھی سانس لیا، نیست و نابود کرنے کو کافی ہے۔

آج ہی کی طرح کے ایک دن، میرے استاد ولیم فاکنر نے کہا تھا: "میں انسان کے خاتمے کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں۔" میں خود کو اس مقام پر کھڑے ہونے کا مستحق نہ گردانتا، جو اُس کا مقام ہے، اگر میں اس بات سے مکمل طور پر آگاہ نہ ہوتا کہ وہ بے پناہ المیہ جسے تسلیم کرنے سے اُس نے بتیس برس قبل انکار کیا تھا، وہ آج، انسانیت کے آغاز سے اب تک پہلی بار، محض ایک سادہ سائنسی امکان بن کر رہ گیا ہے۔ اس پُرہیت حقیقت کے مقابل، جسے تمام انسانی زمانوں میں ایک یوٹوپیا کی حشیت حاصل رہی ہوگی، ہم، کہانیوں کے موجد، جن کے نزدیک ہر بات قابل یقین ہے، اس بات پر یقین کرنے کے بھی پوری طرح حق دار ہیں کہ ایک بالکل دوسری قسم کے یوٹوپیا کی تخلیق میں خود کو منہمک کر دینے کا وقت ابھی ہاتھ سے نہیں گیا۔ زندگی کا ایک نیا اور ہمہ گیر یوٹوپیا، جہاں کسی کو دوسروں کی موت کے حالات کا تعین کرنے کا اختیار نہیں ہوگا، جہاں محبت سچی، اور خوشی ممکن ہوگی اور جہاں سوسال کی تنہائی کی سزا بھگتنے والی قوموں کو، آخر کار اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے، اس زمین پر ایک اور موقع دیا جائے گا۔

گابریئل گارسیا مارکیز

ترجمہ: اجمل کمال

کولومبیا کا مستقبل

اکتوبر ۱۹۸۹ میں اخبارات نے کولومبیا کا ایک انتہائی احتیاط سے چھپایا گیا راز فاش کر دیا: یہ کہ ایک سال سے زیادہ عرصے سے حکومت کولومبیا کے معتمد نمائندے ملک کے منشیات کے تاجروں کے معتمد نمائندوں کے ساتھ باضابطہ مذاکرات میں مشغول رہے ہیں۔ جب حکومت نے اس اطلاع کی تردید کی تو منشیات کے تاجروں نے اس کی تصدیق کر دی اور نتیجتاً حکومت کو ہچکچاتے ہوئے اس کی صداقت کا اعتراف کرنا پڑا۔ اس بارے میں مزید کوئی وضاحت نہیں کی گئی۔ اس کے بعد بھی کوئی وضاحت سامنے نہیں آئی ہے، اور انجام کار اخبارات کی اس اطلاع سے صرف ایک انکشاف ہوا ہے: منشیات کی اُس جنگ کے خدوخال کا انکشاف جو خود کو بے رحم انداز میں دوہراتی رہی ہے اور جس کے تصفیے کا کوئی امکان نہیں۔

مذاکرات کی پہلی معلوم کوشش مئی ۱۹۸۳ میں پتاما میں کی گئی، جب منشیات کے نمایاں ترین تاجروں میں ایک، پابلو اسکوبار گاویریا نے، جو میدیلیں گروہ کا سرغنہ ہے، صدر بیلساریو بیتا نکور تک ایک تجویز پہنچانے کے لیے ایک واسطے کو استعمال کیا۔ تجویز یہ تھی کہ اسکوبار اور دوسرے تاجر منشیات کے کاروبار سے دست کش ہو جائیں گے، اپنے پروسیسنگ

پلانٹ تلف کر دیں گے، اپنے بے پناہ سرمائے کو قانونی طور پر مقامی صنعت اور تجارت میں لگائیں گے اور بیرونی قرضوں کا بوجھ برداشت کرنے میں ریاست کی مدد کریں گے، اگر اس کے عوض ان پر کولومبیا ہی میں مقدمہ چلایا جائے اور انہیں مدتوں سے خوابیدہ اُس معاہدے کے تحت ریاست ہائے متحدہ کے سپرد نہ کیا جائے جسے اُن دنوں میں از سر نو بحال کیا جانے والا تھا۔

دلچسپ بات یہ کہ ایسکو بار اور منشیات کے دیگر تاجروں نے معافی کا مطالبہ نہیں کیا، اگرچہ عام معافی کی تجویز پیش کی جا چکی تھی: اقتدار سنبالنے کے دن ہی، صدر بیلیاریو بتیانکور نے مسلح گریلا تحریکوں کے ارکان کو، جن میں سے بعض کولومبیا کے پہاڑوں میں تیس برس سے زائد عرصے سے روپوش تھے، عام معافی کی پیش کش کی تھی۔ صدر بیتانکور ہمیشہ مذاکرات کی پالیسی پر کاربند رہے تھے، اس لیے انہوں نے منشیات کے تاجروں کی پیش کش کا مثبت جذبے کے ساتھ استقبال کیا۔ اٹارنی جنرل کارلوس خیمینیز گومیز، جو پچھلے ایک سال کے دوران ایک باعزت سمجھوتے کی جستجو میں منشیات کے بڑے بیوپاریوں کے ساتھ خفیہ مذاکرات کرتے رہے تھے، ایک بار پھر ان سے ملاقات کے لیے پناماروانہ ہو گئے۔ یہ ثابت نہیں کیا جا سکا ہے کہ اس ملاقات کا اختیار صدر کی جانب سے دیا گیا تھا، لیکن مجھے اس پر یقین ہے۔ بہر حال، بات اس سے آگے نہ بڑھی۔ ۳ جولائی کے دن اخبار "ایل تیمپو" کو ان ملاقاتوں کے بارے میں پتا چلا اور اس نے ان کی مذمت شائع کر دی، جس سے بیدار ہونے والی رائے عامہ نے کسی سمجھوتے کے امکان کا راستا بند کر دیا۔ صدر بیتانکور کو پسپا ہو کر اس سارے معاملے سے اپنی لا تعلقی کا اعلان کرنا پڑا۔ چھ برس بعد مرڈر کیس تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس طرح کولومبیا نے ان بہت سے بولناک واقعات سے بچنے کا موقع کھودیا، جن کا آج اسے سامنا ہے۔

اب یہ بات قرنِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ان مذاکرات کو ریاست ہائے متحدہ کی طرف سے سبوتاژ کیا گیا تھا، اور اس کے اسباب کا تعلق منشیات کے کاروبار سے زیادہ رولڈرینگن کی کمیونٹ مخالف تخیلات سے تھا۔ اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے جس شخص کا تقرر کیا گیا وہ کولومبیا میں ریاستہائے متحدہ کا سفیر لوئس سیمبس تھا جو سائٹا فے گروپ کا رہنما رہا تھا اور رینگن ازم کے متعدد دائیں بازو سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ سیمبس مذاکرات کے ذریعے قائم ہونے والے امن کے خلاف تھا جس پر بیتانکور حکومت نے اپنی ساری امیدیں لگا رکھی تھیں۔ سیمبس کے سر پر اُس معاہدے کو بحال کرنے کا خیال بری طرح سوار تھا جس پر کولومبیا کی سابقہ حکومت نے دستخط کیے تھے اور جس میں کولومبیا کے شہریوں کو ریاست ہائے متحدہ کی تحویل میں دینے کی شرط شامل تھی۔ سفیر سیمبس کی خوفناک ریشہ دوانیوں

سے اندازہ ہوتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ کے لیے منشیات کے تاجروں اور چھاپاماروں میں کوئی فرق نہیں تھا، اور اس نے ایک نئی اصطلاح وضع کی تھی: نارکو گریلا۔ تحویل مجرمین کے معاہدے کی بدولت امریکی فوجیوں کو کولومبیا بھیجتا ایک آسان اقدام ہوتا، جو درحقیقت چھاپاماروں سے جنگ کر رہے ہوتے۔ ہر کیف، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس معاہدے کی رو سے عملاً کسی بھی کولومبیئن شہری کو ریاست ہائے متحدہ کی تحویل میں دینا ممکن ہو جاتا۔

سفیر ٹیمبس کے بوگوٹا پہنچنے کے کچھ ہی عرصے بعد اس سے دوپہر کے کھانے کی دعوت میں ملاقات کرنے پر مجھے۔ یہی تاثر ملا تھا، اور وقت نے اسے درست ثابت کر دیا ہے۔ بعد میں ٹیمبس کا تبادلہ کوسٹاریکا میں امریکی سفارت خانے میں کر دیا گیا اور اس نے ٹکارا گوا کے کوئٹرا چھاپاماروں سے نمٹنے کے لیے ایک خفیہ ایئرپورٹ کی تعمیر میں آلیور نارنہ کی مدد کر کے ایران گیٹ کے واقعات میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ہم کولومبیئن اب تک سوچتے ہیں کہ منشیات کے تاجروں نے صلح کی پیش کش کیوں کی تھی، اور آیا یہ پیش کش حقیقی تھی۔ میرا خیال ہے یہ حقیقی تھی۔ ان تاجروں نے جو کچھ کہا تھا، اس میں سے اگر خطابت کو الگ کر دیا جائے، تو وہ اپنے اندر ایک بڑا انکشاف رکھتا ہے: ”ہم ریاست ہائے متحدہ میں قید ہونے پر کولومبیا میں دفن ہونے کو ترجیح دیں گے۔“ وہ تحویل مجرمین کے معاہدے سے دہشت زدہ تھے، لیکن اس سے اس بات کی پوری وضاحت نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں اس کی بنیادی وجہ ثقافتی تھی: پیدائش اور پس منظر کے لحاظ سے منشیات کے تاجر کولومبیا سے باہر کی زندگی کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کی غلی بابا کے خزانوں جیسی دولت ہمیں اور ان کے کسی کام کی نہ تھی، اور وہ خود کو کولومبیا ہی میں محفوظ اور اپنی دولت کی نمود و نمائش کے قابل محسوس کرتے تھے: اپنی دولت کو اپنے زندگی بھر کے دوستوں کے درمیان اڑانا، اپنے مصافقاتی لب و لہجے میں مذاق کرنا، اور کولومبیا کے عمدہ کھانوں کو اپنی ملک کے برتنوں میں کھانا۔ انہیں سب سے بڑھ کر جس چیز کی آرزو تھی وہ وہی تھی جس سے وہ محروم تھے: کولومبیئن معاشرے میں ایک مقام۔ ہر حال، جب مذاکرات کی کوشش ناکام ہو گئی تو منشیات کے تاجروں نے بہت سے نفرت انگیز طریقے استعمال کر کے اپنے لیے یہ مقام حاصل کرنے کی کوشش کی، جو آخر کار الٹ کر انہیں پر پڑیں گے۔

جب مذاکرات ناکام ہو گئے تو تاجروں کو وہ وقفہ مل گیا جس میں وہ اپنی سلامتی کو یقینی بنا سکتے تھے۔ اگر کوئی انہیں گرفتار کرنا چاہتا تو کوئی بھی متعلقہ پولیس والا یہ کام کر سکتا تھا۔ لیکن

مجموعی طور پر کولومبیا کا معاشرہ انہیں جس دلچسپی اور تجسس سے دیکھتا تھا وہ ساز باز کی حدود کو چھوٹی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اُن دنوں ہر طرف انہیں کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ صحافی، سیاست دان، صنعت کار، تاجر یا محض تجسس کے مارے عام لوگ جوق در جوق اُس ضیافت پر ٹوٹے پڑتے تھے جو میدیلین کے نواح میں واقع، پابلو اسکوبار کے ذاتی رینچ ٹاپولیز میں ہمہ وقت جاری رہتی تھی۔ اسکوبار کا اپنا چڑیا گھر بھی تھا جس میں اس کے مہمانوں کی تفریح طبع کے لیے رزافے اور میو پوٹامس افریقا سے منگوا کر رکھے گئے تھے۔ باہر کے بڑے پناہنگ کے سامنے نمائش کے لیے رکھا ہوا وہ موائی جہاز جس پر کوکین کی پہلی کھپپ ریاست ہائے متحدہ بھیجی گئی تھی، قومی یادگار کا درجہ حاصل کر چکا تھا۔

منشیات کے تاجروں کے پاس دولت تو تھی، لیکن انہیں اس سے زیادہ کی خواہش تھی: انہیں طاقت بھی چاہیے تھی۔ اسکوبار ایوان نمائندگان کی مخصوص نشستوں میں ایک پر منتخب ہوا اور انسانی حقوق کے سیمیناروں کا سرپرست بن گیا۔ کارلوس لیدر نے پُر تعیش ڈسکو قائم کیے، آرمینیا کے لذت پسند شہر میں جَوَن لیئسن کا مجسمہ لگوا یا، ایک سیاسی تحریک چلائی اور انتہائی دائیں بازو کا ایک قوم پرست رسالہ جاری کیا جسے ماری ہوائنا (افیون) کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے سبز روشنائی میں چھاپا جاتا تھا۔ وہ کانگریس کے اجلاسوں میں اپنے مسلح محافظوں کے ساتھ شرکت کرتا، اور پاؤں اوپر رکھے قہقہے لگاتا رہتا۔ میدیلین گروہ کے رکن خورخے لوئس اوجوآ، اور کالی (Cali) سے تعلق رکھنے والے گلبر تو روڈریگز اور سویلا، جو آج کل ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں، دنیا بھر میں ساتھ ساتھ گھومتے، اعلیٰ نسل کے گھوڑے خریدا کرتے تھے اور اپنے قانونی کاروبار کے لیے یورپی پارٹنروں کی تلاش میں رہتے تھے۔ ایک بار اسپین میں گرفتار کر کے انہیں کولومبیا کے حوالے کر دیا گیا تھا جہاں وہ رہا کر دیے گئے۔ ان کے حق میں اتنی فضا ہونے کے باوجود ان کے کسی سیاست دان دوست نے انہیں یہ مشورہ دینے کی زحمت نہ کی کہ وہ جن جرائم کے فروغ میں مصروف ہیں وہ ہولناک شکل اختیار کر چکے ہیں اور درحقیقت خطرناک سیاسی غلطیاں بن چکے ہیں۔

ان کی بڑی غلطی ۱۹۸۴ میں وزیر انصاف رودریگو لارا پونیا کا قتل تھا۔ بد قسمتی سے صدر بیتا نگور کا اس پر رد عمل ایک آور غلطی تھا۔ کچھ نہ کرنے کے الزامات سے ہراساں ہو کر، اور شاید اس جرم پر طیش میں آ کر، انہوں نے پہلی بار تحویل مجرمین کے معاہدے کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی، اگرچہ اس پر انہیں اُس وقت بھی پشیمانی تھی، اور شاید ان کے دل میں یہ پچھتاوا آج بھی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس معاہدے پر عمل درآمد پر انہیں اس بات نے مجبور

کیا تھا کہ ان کے پاس کوئی اور مناسب حد تک موثر قانونی ذریعہ نہیں تھا؛ لیکن معاہدے کے اس طور پر استعمال کا مطلب یہ نکلا کہ وہ اب قانونی اقدام نہ رہا بلکہ استقامی کارروائی کا ایک ہتھیار بن گیا۔

کارلوس لیڈر اب ریاست ہائے متحدہ میں ۱۳۵ سال سے زیادہ کی ایک بے حد طویل "عمر قید" کاٹ رہا ہے۔ اکتوبر ۱۹۸۹ کے آخر تک کوئی بیس کولومبیئن، اور کولومبیا میں مقیم تین غیر ملکی، امریکا کے حوالے کیے جا چکے تھے۔ منشیات کے تاجروں نے کبھی اس بات کی تردید نہیں کی کہ آخر کار وہی کولومبیا کے اب تک ناقابلِ شمار شہریوں کی ہلاکت کے ذمے دار ہیں، اگرچہ انھوں نے وزیرِ انصاف لارا پونیللا کے قتل سے ہمیشہ انکار کیا ہے، جس سے ان کے خلاف رائے عامہ کی جنگ شروع ہوئی۔ بائیں بازو کی پارٹی پٹریا نک یونین کے کم از کم آٹھ سو ارکان، جن میں پارٹی کے صدارتی امیدوار حاتم پارڈو لیل بھی شامل ہیں، ان کی ہیمانہ قتل عام کی مہم کا شکار ہو چکے ہیں۔ اخبار "ایل ایسپیکٹادور" کے مسفرڈ ایڈیٹر گیلیرمو کا نو کا قتل میرے لیے ایک ذاتی المیے کی حیثیت رکھتا ہے اور مجھے اب بھی اسے قبول کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ اُستہی دشوار بعد میں اس اخبار پر کیے جانے والے حملوں کو قبول کرتا ہے جہاں میں نے صحافی کے طور پر اپنی زندگی کی بہترین سال گزارے تھے۔ جھول اور میجسٹریٹوں کو، جن کی قابلِ رحم تنخواہیں ان کے بچوں کی تعلیم کے اخراجات کے لیے بھی بمشکل کافی ہوتی تھیں، ایک ناممکن انتخاب کا مرحلہ درپیش ہوا؛ کہ وہ یا تو منشیات کے بیوپاریوں کے ہاتھ بک جائیں یا ان کے ہاتھوں مارے جائیں۔ انتہائی قابلِ تعریف لیکن المٹاک بات یہ ہے کہ ان میں چالیس سے زیادہ نے، اور ان کے علاوہ بہت سے صحافیوں اور سرکاری ملازمین نے، مرنے کو ترجیح دی۔

جو بات ناقابلِ فہم ہے وہ یہ ہے: اس تمام قتل و غارت کے دوران میں منشیات کے تاجروں نے حکومت سے مذاکرات کی تجویز کبھی ترک نہیں کی۔ ہمیں شاید کبھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ اس سلسلے میں کتنی بار کوشش کی گئی۔ ۱۹۸۵ کے اختتام پر میں نے میکیکو میں پابلو ایسکو بار کے ایک ایجلی سے بات کی، جو پتاما میں کولومبیئن حکومت کو کی گئی پیش کش کا اعادہ کرنے کے لیے بے تاب تھا، لیکن ایک نمایاں ترمیم کے ساتھ: تحویلِ مجرمین کے معاہدے کی بات چیت کو، جو اب تک کے تمام مذاکرات کا اہم حصہ رہی تھی، اس وقت تک ملتوی کر دیا جائے جب تک مذاکرات کے نتیجے میں کوئی سمجھوتا نہیں ہو جاتا۔ اس کوشش کا بھی، اور کوششوں کی طرح، کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

چند ماہ بعد کولومبیا کے سپریم کورٹ نے تحویلِ مجرمین کے معاہدے کو غیر آئینی قرار

دے دیا، لیکن قتل و غارت کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ فرض کرنا غیر معقول بات نہیں ہے کہ اس بربریت کے اسباب رہے ہوں گے، جن کو کبھی عوام کے علم میں نہیں لایا گیا، لیکن کسی نے بھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ کس حد تک ہمارے عظیم اور بد قسمت کولومبیا کی سماجی اور سیاسی صورت حال نے -- جس کے پس منظر میں صدیوں سے قائم دیسی جاگیرداری، تیس برس کی بے نتیجہ گریلا جھڑپیں اور عوام کی خواہشات کی نمائندگی نہ کرنے والی حکومتوں کی طویل تاریخ موجود ہے -- منشیات کے بیوپاریوں، اور ان تمام چیزوں کی پرورش کی ہے جن کی یہ کاروبار محض ایک علامت ہے۔ ۱۹۷۹ میں جب پناما کے جنرل عمر تودہ سوس نے کولومبیا کے کریمین کے ساحلی خطے میں واقع سینوادی میں مویشی پالنے کے فارموں کا دورہ کیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کتنے ہی فارموں کے مالکوں نے اپنی حفاظت کے لیے مسلح شہریوں کو مقرر کر رکھا ہے۔ اسے یاد آیا کہ ایل سلوادور کی ابتلاؤں کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے وہاں بھی سماجی نظم و ضبط میں تباہی کے یہی آثار نمودار ہوئے تھے۔ تودہ سوس کا خیال درست تھا۔ خوشحال فارموں سے چند ہی میل پرے، میرے افسانوی دریائے ماگدالینا کے درمیانی ساحلی خطے میں سماجی ڈھانچا اس بری طرح شکست و ریخت کا شکار تھا کہ وہاں چند برسوں کے مختصر عرصے میں ایک متوازی بندوبست قائم ہو گیا، لیکن اس کی باگ ڈور منشیات کے تاجروں کے ہاتھ میں تھی۔

انیس سو ساٹھ کی دہائی میں کمیونسٹ پارٹی کے گریلا بازو "کولومبیا کی انقلابی مسلح افواج" نے نئے کسانوں کو ان کے جاگیرداروں کے ہاتھوں سے بچانے کا کام اپنے ذمے لیا۔ یہ بنیادی خیال جلد ہی پستی کا شکار ہو گیا، اور گریلوں نے اپنی جنگ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مویشی پالنے والوں سے اغوا، بلیک میل اور دھمکیوں کے ذریعے رقم امنٹھا شروع کر دیا۔ جاگیرداروں نے اس کے جواب کے طور پر پرائیویٹ فوج قائم کر لی، جن میں سے بعض کو حکومت نے اس بنیاد پر تسلیم شدہ حیثیت بھی دے دی کہ یہ خودمدافعتی گروپ ہیں۔ شروع میں تمام اقدامات کا مقصد کمیونزم کا جسمانی خاتمہ تھا۔ -- چھ سال پہلے اس علاقے کا دورہ کرنے والے ایک صحافی نے لکھا تھا۔ -- مگر اس کے بعد انھوں نے رسائیوں کے، اور پھر شہری جرائم پیشہ افراد کے خلاف بھی کارروائی شروع کر دی، اور یہاں تک کہ گداگروں اور آمر دستوں کو بھی ہلاک کرنے لگے۔ مویشی پالنے والے جو لوگ قتل ہونے سے بچ بھی گئے وہ نہ صرف اپنی زیادہ تر جمع پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھے بلکہ وہ انھیں قانون دشمن افراد کے خطرے کا شکار ہو گئے جنہیں سب سے پہلے انھوں نے خود مسلح کیا تھا۔

یہی وہ تباہ حال فارموں کے مالک تھے جنہوں نے منشیات کے بیوپاریوں سے رابطہ قائم

کیا۔ ان دونوں کے اشتراک سے وہ شے وجود میں آئی جسے آج "ماگڈالینا میدیو" کہا جاتا ہے، جو پچاس ہزار مربع کلومیٹر پر پھیلی ہوئی ایک وسیع سلطنت ہے جو رقبہ میں ایل سلوادور سے دگنی ہے، اور جس کا اسلحہ کا ذخیرہ اس ملک سے زیادہ ہے جسے جنرل تورےسوس نے اپنی جوانی میں دیکھا تھا۔ یہ سب واقعات پچھلے چند برسوں میں، کولومبیا کے صدارتی محل سے تین سو کلومیٹر سے کم فاصلے پر، اور مقامی فوجی بیرک سے چند قدم دور پیش آئے ہیں، اور اس کے باوجود اس کا علم پچھلے سال اس وقت ہوا جب وہاں سے فرار ہونے والے ایک شخص نے پوری کہانی بیان کی۔

منشیات کے تاجروں نے رقم، تکنیکی مہارت اور اپنی غیر متنازعہ کاروباری سوجھ بوجھ فراہم کی۔ ان کی جوانی کا رروائی تشدد آمیز تھی اور اس کی سائنسی بنیادوں پر منصوبہ بندی کی گئی تھی؛ ان کے نیم فوجی دستوں نے لندن اور تل ابیب میں کرائے کے ان سپاہیوں کی زیر نگرانی تربیت حاصل کی تھی جنہیں سونے کے عوض خریدا گیا تھا۔ یہ تربیتی اسکول ہمارے شہروں کے انتہائی افلاس زدہ محلوں سے نوعمر مجرموں کو داخل کرتے تھے اور انہیں کولومبیا بھر میں دہشت اور موت پھیلانے کے قابل بنادیتے تھے۔ کسی احمقانہ جدلیاتی مذاق کی بدولت، "انقلابی افواج" نے جس انقلاب کی منصوبہ بندی کی تھی وہ آیا تو ضرور، لیکن برعکس صورت میں۔ "ماگڈالینا میدیو" باقاعدہ ایک الگ دنیا بن گیا، جس میں صرف خودمدافعتی گروپ ہی نہیں بلکہ میسرؤں کے زیر انتظام باضابطہ پولیس کے دستے اور باشندوں کے منتخب کردہ کونسلر بھی ہیں۔ رہائش، علاج اور تعلیم کے میدانوں میں ان کے منصوبے مرکزی حکومت کے لیے ایک براہ راست چیلنج معلوم ہوتے ہیں۔ اس جماعت کا نشان رائل پر لگی ہوئی نشانہ لگانے کی دور بین ہے۔

جب تک باقی کولومبیا کو اس مایوس کن صورت حال کا علم ہوتا، بہت دیر ہو چکی تھی۔ ریاست کی حدوں کے اندر ایک اور ریاست، جو زخیز میدانوں اور دریائے ماگڈالینا کے غروب آفتاب پر قناعت کو مزید تیار نہیں تھی، پھیل کر ملک کے ہر قابل تصور گوشے میں اپنے اثرات داخل کر رہی تھی۔

ہماری حقیقت کا مشاہدہ کرنے والے ایک شخص نے کہا ہے کہ کولومبیا کا پورا معاشرہ نئے کی لت کا شکار ہے۔ یہ نشہ کوکین کا نہیں۔۔۔ جو کولومبیا کا بہت بڑا مسئلہ نہیں ہے۔۔۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ مملکت چیز کا ہے: آسانی سے ہاتھ آنے والی دولت۔ ہماری تجارت اور صنعت، بینکاری کا نظام، ہماری سیاست، صحافت، کھیل، ہمارے تمام علوم و فنون، ریاست اور ہماری تمام سرکاری اور غیر سرکاری تنظیمیں، چند مستثنیات کو چھوڑ کر، غیر قانونی سازشوں کے ایک ایسے

ہال میں گرفتار ہیں، جس سے رہا ہونا ناممکن ہو گیا ہے۔ پچھلے تین برسوں میں فوج اور پولیس کے سترہ سوارکان۔۔ ایک ناقابل یقین تعداد۔۔ منشیات کے بیوپار سے تعلق رکھنے کی بنا پر مقدمے یا برطرفی کا شکار ہوئے ہیں؛ پچیس ہفتہ وقتی سیاست دانوں کے نام منشیات کے کاروبار سے آمدنی حاصل کرنے والوں کی اس فہرست میں شامل ہیں جو ریاست ہائے متحدہ میں شائع ہوئی؛ ہماری قومی سلامتی کو نسل کے ابلاؤں کے انتہائی خفیہ نکات منشیات کے ایک تاجر کے بریف کیس میں پائے گئے؛ چوٹی کے سرکاری افسروں کی فون پر سازشی گفتگو کو غیر قانونی طور پر ٹیپ کیا گیا؛ گھروں پر چچا پوں کے پیچھے میں بہت سے ایسے ممتاز شہریوں کے ناموں کا انکشاف ہوا ہے جو بے شمار مشتبہ دھندوں میں ملوث ہیں۔ یہ پوشیدہ اور گرفت میں نہ آنے والا آبی سانپ ہمیں دکھائی نہیں دیتا، لیکن ہر جگہ موجود ہے؛ ہمارے ملک کی سرحدوں سے دور یہ جس شے کو مس کرتا ہے اس میں دراز ڈال کر داخل ہو جاتا ہے اور اسے فاسد کر دیتا ہے۔ غالباً حکومت بھی اس بات سے بے خبر ہے کہ ان غیر قانونی رقوم نے سماجی بندھنوں کو ڈھیلا کر کے ان لوگوں کی کتنی مدد کی ہے۔

انتہائی محتاط اندازوں کے مطابق منشیات کی آمدنی کی سرمایہ کاری ایک بلین ڈالر سالانہ ہے۔ یہ رقم درحقیقت اس سے پانچ گنا بھی ہو سکتی ہے۔ اخباروں میں شائع ہونے والے اعداد و شمار کے مطابق کولومبیا کے منشیات کے گروہوں کے تین ممتاز ترین سرغنوں کی ذاتی دولت تین بلین ڈالر فی کس سے زیادہ ہے۔ یہ بات ناقابل تصور ہے کہ اس پیمانے کی قوت خرید رکھتے ہوئے وہ صرف مادی اشیاء کے حصول سے تسکین پا کر قناعت کر لیں گے؛ یہ بات واضح ہے کہ انھوں نے اپنے ہم وطنوں کے ذہنوں اور ارادوں کے اندھیرے کو نے کھدروں میں داخل ہونا چاہا ہے، اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی ہے۔

لیکن منشیات کے تاجروں کی اصل ہوس، ان کی فرامدین ہوس، زمین، زمین، اور زیادہ زمین خریدنے کی رہی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے انھوں نے ڈیڑھ لاکھ ہیکٹیئر زمین کی خریداری کا جشن منانے کے لیے ایک عظیم الشان پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ پورے کا پورا نقشہ، اس کے پہاڑوں اور دریاؤں سمیت، اس کے سونے کی زردی اور اس کے سمندروں کی نیلاہٹ سمیت، خرید لینا چاہتے ہیں تاکہ وہ جہاں رہنا چاہتے ہیں وہاں سے انھیں کوئی نہ بلا سکے۔ اس دیوانگی کی حقیقت کے مقابل، صدارتی امیدوار لوئس کارلوس گالان کی آواز نے ایک مدہم سی امید دلائی جب انھوں نے علانیہ طور پر ایک بار پھر منشیات کے تاجروں سے ہتھیار ڈالنے کو کہا۔ ہجوم کے بچوں، بیچ، مسلح محافظوں کے حلقے کے اندر، ان کے قتل کے مذہبی رسم کے سے انداز نے

خر کولومبیا کی حکومت کو اپنی بھاری تاریخی ذمے داری کا سامنا کرنے پر مجبور کر دیا۔ صدر ور میلیو ار کو کار د عمل اگرچہ سست اور غیر متوقع ہے لیکن اس کا اس سے زیادہ سخت ہونا ممکن نہیں تھا۔

اپنے پیش رو، صدر بیتا کور کی طرح، بار کو کا پہلا اقدام بھی تحویل مجرمین کے غیر آئینی عابد سے کوبال کرنے کے لیے ہنگامی حالات کے خصوصی اختیارات کا استعمال تھا۔ لگتا ہے کہ منشیات کے تاجر ایک ایسے شخص کی جانب سے، جو اب تک کوئی اقدام کرنے سے گریز کرتا رہا تھا، ایک ایسے عزم کے مقابلے پر حیرت زدہ رہ گئے۔ اس کے بعد صدر بار کو نے ان تاجروں کے محلات اور جاگیروں پر چھاپے مارنے کا حکم دیا اور ان کی منشیات لے جانے والی کشتیاں اور راز فاش کرنے والی دستاویزات ضبط کر لیں۔ صدر بار کو کے اقدامات اتنے موثر تھے کہ کوکین کی پیداوار اور فروخت کے اعداد و شمار پر ان کے اثرات ضرور ظاہر ہوں گے۔ لیکن منشیات کے تاجروں کے اصل، بدترین دشمن خود ان کے اختیار کردہ حربے ہیں، جو ایک بار پھر پورے ملک کو ان کی مخالفت پر آمادہ کر دیں گے۔

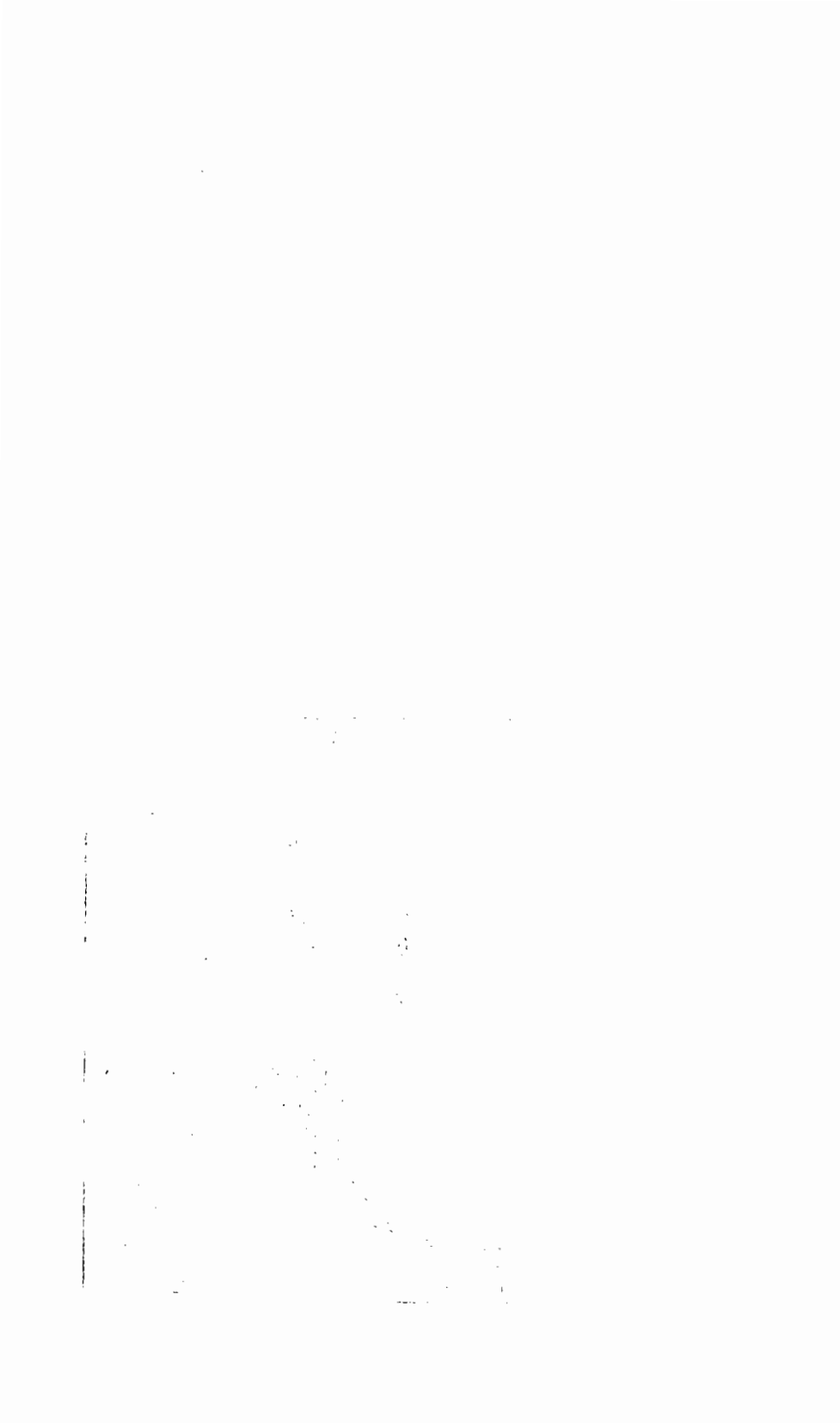
کولومبیا کے رہنے والوں کی غالباً سب سے حیران کن خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر اچھی یا بری بات کے عادی ہو جاتے ہیں۔ خود کو کوبال کر لینے کی ان کی صلاحیت مافوق الفطرت کی حدوں کو چھوتی ہے۔ کچھ لوگ، جو شاید سب سے زیادہ مبوش مند ہیں، معلوم ہوتا ہے اس حقیقت کو فراموش کر چکے ہیں کہ وہ دنیا کے خطرناک ترین ملکوں میں سے ایک میں رہ رہے ہیں۔ لوئس گالان، جن کے قتل نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا، انہیں کی تدفین والے اتوار کے دن خوشی سے بے قابو ہو جم سرموں پر نکل کر فٹ بال میں ایکوادر پر کولومبیا کی فتح کا جشن منا رہا تھا۔ کولومبیا میں تشدد کی صدیوں پرانی روایت میں شہری دہشت گردی ایک نئی چیز ہے۔ ہم پھٹنے کی وارداتیں جن میں بے گناہ لوگ ہلاک ہو جاتے ہیں، اور فون پر موت کی گھنٹاں دھمکیاں جو روزمرہ زندگی کو متواتر میجان کا شکار رکھتی ہیں، دیکھائی نہ دینے والی دہشت کے خلاف دوستوں اور دشمنوں کے اتحاد ہی کے ذریعے ختم ہو سکتی ہیں۔ جو کچھ پیش آ چکا ہے اس کے خوف کے ساتھ زندہ رہنا شاید پھر بھی ممکن ہے، لیکن جو کچھ پیش آ سکتا ہے اس کی دہشت کے ساتھ کوئی شخص زندہ نہیں رہ سکتا: بازار میں دھماکے سے پھٹ جانے والی ترکاریاں؛ پرواز کے دوران ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے والا جہاز؛ پینے کے پانی میں زہر کی ملاوٹ سے پورے پورے خاندان کی ہلاکت۔ نہیں: دہشت گردی سے کبھی کوئی جنگ نہیں جیتی گئی۔

دوسری جانب صدر ور میلیو بار کو کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جس چیز کو وہ صرف ایک مختصر

اور سخت ایکشن خیال کر رہے ہیں، درحقیقت ان کی زندگی کی سب سے دشوار اور خطرناک مہم ثابت ہوگی: ان کا کئی سروں والا دشمن، اقتدار کی راہداریوں میں تعینات اپنے مشتبہ مخبروں کی مدد سے، خود کو ہمیشہ پہلے سے باخبر اور صورت حال سے نمٹنے کے لیے مسلح اور تیار رکھتا ہے؛ اس کے کان سب کچھ سنتے ہیں اور آنکھیں ہر شے کو دیکھ لیتی ہیں۔ صدر بار کو کی حکومت کے وسائل دشمن کے مقابلے میں مضحکہ خیز حد تک قلیل ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ کی جانب سے کولومبیا پر یہ الزام لگانا بہت خوب ہے کہ وہ منشیات کے تاجروں کے خلاف جنگ میں بہت سست روی سے کام لے رہا ہے، اس سے قطع نظر کہ وہاں کی گلیوں میں یکے والی منشیات کی مقدار ہمارے مقابلے میں کمزور ہے اور وہ اس دھندے میں ملوث اپنے ناقابل گرفت شہریوں کی فہرستیں ہمیشہ خفیہ رکھتے ہیں۔ ایک ایسی قوم میں جس نے صرف پچھلے سال دو سو ستر ٹن کوکین استعمال کی، ایسے لوگوں کی خاصی تعداد ہوگی۔ لیکن آخری بات یہ ہے کہ موجودہ جنگی صورت حال کے مقابلے کے لیے ریاست ہائے متحدہ سے کولومبیا کو جو امداد مل رہی ہے وہ دو بلین ڈالر کی اس رقم کا عشرِ عشر بھی نہیں ہے جو سرکاری اور خفیہ فنڈ سے نکاراگوا کے باغیوں کو آٹھ سال سے ملتی رہی ہے۔ کولومبیا کو ملنے والی اس امداد میں اضافے کی بھی اس وقت تک کوئی توقع نہیں جب تک صدر بار کو ریاست ہائے متحدہ کی فوج کو کولومبیا میں داخلے کی اجازت دینے سے انکار پر قائم ہیں، چاہے اس فوج کا واحد مقصد منشیات کے تاجروں کا قلع قمع ہی کیوں نہ ہو۔

ان تمام حقائق سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کولومبیا میں منشیات کے خلاف جنگ بے حد طویل اور مہنگی ہوگی اور اس میں کامیابی کے امکانات بھی بہت کم ہیں۔ اور بدترین بات یہ ہے کہ اس میں واپسی کا کوئی راستا نہیں، بجز اس کے کہ کوئی غیر متوقع اور درخشاں واقعہ پیش آ جائے: ان مبارک ناممکنات کی طرح جنھوں نے ماضی میں کتنے ہی موقعوں پر لاطینی امریکا کو بچایا ہے۔ اگر اس کا حل مذاکرات نہیں ہیں، تو کوئی بھی اور ذریعہ آزمائے جانے کے قابل ہے، بشرطے کہ اس میں مزید جانوں کا زیاں نہ ہو۔ یہ بات ناقابل تصور ہے کہ اس ختم نہ کی جاسکنے والی جنگ کے ختم ہونے سے پہلے ہمارا ملک آخر خود ختم ہو جائے: یہ وہ واحد حوصلہ افزا پیش گوئی ہے جو میں کر سکتا ہوں تاکہ میرے اس مضمون کا اختتام تباہی کے اشارے پر نہ ہو۔



انتخاب کے اس حصے میں مارکیز کے فن پر دو مضامین پیش کیے جا رہے ہیں۔

پہلا مضمون جسے "گابریئل گارسیا مارکیز" کا عنوان دیا گیا ہے، ولیم رو (William Rowe) کی تحریر ہے جو یونیورسٹی آف لندن کے کنگز کالج میں لاطینی امریکی ادب کے ریڈر ہیں۔ ان کا یہ مضمون جون کنگ (John King) کی مرتب کردہ کتاب *Modern Latin American Fiction: A Survey* سے لیا گیا ہے۔

جو متن "تسنائی کے سوال" کے عنوان سے انتخاب کے اس حصے میں شامل ہے، دراصل *100 Years Landmarks of World Literature* سیریز میں شائع ہونے والی کتاب *100 Years of Solitude* کا پہلا باب ہے۔ یہ مائیکل وڈ کی تصنیف ہے جو انگلستان کی یونیورسٹی آف ایکسیٹر میں انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ کتاب کا پہلا باب مارکیز کے معروف ترین ناول کو معاصر لاطینی امریکی ادب اور مارکیز کی ابتدائی تحریروں کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اور لاطینی امریکی تاریخ اور سیاست سے وہاں کے ادب کے مخصوص تعلق کو واضح کرتا ہے۔ اس باب میں، جس کی موجودہ انتخاب کے لحاظ سے کہیں کہیں تلخیص کی گئی ہے، مارکیز کے اس شاہکار ناول پر سیر حاصل، بحث نہیں ملتی، لیکن ایسی معلومات یقیناً میسر آتی ہیں جن کی مدد سے دنیا کے ادب کی اس اہم کتاب کو، اور مارکیز کی دیگر تحریروں کو، درست تناظر میں دیکھنا ممکن ہو جاتا ہے۔

گا برینٹل گارسیا مارکیز

برطانیہ میں مارکیز کو عموماً فینٹسی کا ادیب سمجھا جاتا ہے۔ نقادوں اور تبصرہ نگاروں نے بار بار اس کی تحریروں میں پائی جانے والی "فینٹسی پر مبنی" اور "ظلماتی" خصوصیات کی جانب توجہ دلائی ہے، اور اپنے اس عمل سے بڑی حد تک اُن موضوعات کو دُھندلا دیا ہے جن سے اس کی تحریروں کو بنیادی طور پر سروکار ہے۔ تحیر انگیز اور اجنبی (exotic) عناصر پر اس تاکید کی وجوہ متناقص ہیں۔ بے دلیل فینٹسی، جیسی کہ سُرینسکی (surrealist) روایت میں پائی جاتی ہے، برطانیہ میں ادبی تدریس کے فائق انداز سے بالخصوص کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔ ایک شخص جہاں جاتا ہے زرد تھلیوں کا ایک بادل ہر جگہ اس کا تعاقب کرتا رہتا ہے: پڑھنے والا آخر اس کے ساتھ کیا سلوک کرے؟ کیا اس کے کوئی معنی ہیں، یا یہ محض جذباتی فرار پسندی کا مظاہرہ ہے، کسی ناممکن دنیا (Never-Never Land) کی علامت؟ لیکن اسی کتاب میں، جس کا نام "تسنائی کے سوال" ہے، سوکھے ہوئے بازو والا ایک شراب فروش بھی ہے۔ اس کا بازو اس لیے جل گیا (ہمیں بتایا جاتا ہے) کہ اس نے ایک بار اپنے والدین پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ لاطینی امریکا کے کتیسو لک گھرانوں میں بچوں کو یہی بتایا جاتا ہے کہ اگر کوئی اپنے والدین پر ہاتھ اٹھائے تو اس کا

بازو۔۔ حقیقی معنوں میں۔۔ جل جاتا ہے۔ مارکیز کا ناول ان اعتقادات کو، پرمزاح انداز میں، ان کے لغوی معنوں میں قبول کرتا ہے، اور اس طرح ان کے اصل مقصد کو بے نقاب کر دیتا ہے، جو یہ ہے کہ بچوں کو دھوکے میں رکھا جائے تاکہ وہ اپنی حدود میں رہیں۔

اگر فینٹسی کا کردار فرار پسندی کا نہیں، تو کیا اس کا مقصد اخلاقی سبق دینا ہے، جس طرح ٹولکین کی کتاب *The Lord of the Rings* میں، یا اگر اس سے قبل کی مثال لیں تو چارلس کنگزلی کی *The Water Babies* میں ہے جو کوئورین عہد کے فینٹسی کے ادب کا کلاسیک ہے؟ لیکن مارکیز کے ہاں فینٹسی تمثیل سے آلودہ نہیں۔ تو پھر شاید ایسا ہو کہ لاطینی امریکا کی زندگی جی میں کوئی باطنی طلسمی خصوصیت موجود ہو؟ لاطینی امریکا کا تصور، ایک غیر معمولی، بے لگام فینٹسی کی آماج گاہ کے طور پر، خاصا مانوس ہے۔ لیکن خود ہماری اپنی فرار پسندی اس میں جو کردار ادا کرتی ہے، ہمیں اس کو تسلیم کرنے کی ضرورت ہے: اجنبی عناصر کی طلب، ثقافتی ستیاجی کا ذوق۔۔۔ یا، زیادہ سنجیدہ طور پر: معاشرت کی قید سے رہائی کی ہماری اپنی جستجو۔ اسے تسلیم کیے بغیر ہم یہ محسوس نہیں کر سکیں گے کہ دوسری معاشرتوں میں بھی جبر کے پہلو ہوتے ہیں؛ ہم صرف فینٹسی کی فراوانی ہی دیکھ پائیں گے، وہ حرے نہیں جن کے ذریعے روزمرہ زندگی پر نظم و ضبط نافذ کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مارکیز نے اکثر کہا ہے کہ جو چیزیں یورپی قاری کو حیرت خیز معلوم ہوتی ہیں، کولومبیا کے باشندوں کے لیے معمولی اور روزمرہ کی باتیں ہیں۔

لاطینی امریکا کی بابت اس اجنبی اور طلسمی تصور کی بنیاد ایک یورپی موقف پر ہے۔ امریکا کی فتح (the Conquest) کے بعد، اس براعظم سے تعلق رکھنے والے انسانوں کو، اور ماحول کے ان تمام عناصر کو جو ہر اُس شے سے مختلف تھے جو یورپ کے باشندوں کے لیے جانی پہچانی تھی، افسانوی، عجیب یا ہیبت ناک قرار دے دیا گیا ہے؛ یہ مختلف اور نا آشنا چیزوں کو اپنے ذاتی تناظر میں سمیٹ لانے کا ایک طریقہ ہے۔ فینٹسی اور اجنبیت کی سرزمین کے طور پر لاطینی امریکا کا تصور، مستحکم کی ہوئی اجنبیت کا تصور ہے، جو بڑی حد تک انیسویں صدی میں Celticism کے طریق کار سے مشابہ ہے، جس کے ذریعے برطانیہ نے آئرش آبادی کو خواب دیکھنے والے بے ضرر لوگوں کی قوم میں تبدیل کرنے کی کوشش کی، تاکہ اس طرح اُن کے ثقافتی اختلافات کو ہموار کر کے اُنہیں انگریزی معاشرت میں ضم کیا جاسکے۔ ان لوگوں کے لیے جو درحقیقت وہاں رہتے ہیں، یہ جنگیں اجنبیت اور تیر خبری سے یکسر غاری ہیں۔ تو اب سوال یہ ہوا کہ وہ خط کون کھینچتا ہے جو یہ فیصلہ کرے کہ یہاں حقیقت کی عمل داری ختم، اور فینٹسی اور طلسم کی قلمرو شروع ہوتی ہے۔ ماکوندو کے باشندوں کے لیے، جو مارکیز کی بہت سی ابتدائی افسانوی

تحریروں کا محل وقوع ہے، برف، نقلی دانت اور محدب عدسے بے پناہ حیرت خیز چیزیں ہیں۔ دوسری طرف سائنسی عقلیت کے نقطہ نظر سے ماکونڈو ایک افسانوی اور طلسمی مقام ہے۔ مارکیز کا ناول ایسی کسی بھی سرحد کی لغوت پر بنتا ہے جو حقیقت اور فینٹسی کے درمیان ایک طے شدہ تقسیم قائم کرنے کا سوانگ رچاتی ہے۔ اس عمل کو الٹ کر کے جس کے ذریعے فینٹسی کی حدود تعمیر کر کے چیزوں کو بے ضرر بنایا جاتا ہے، مارکیز فینٹسی کی مدد سے اُن اصولوں اور ضابطوں کو لکارتا ہے جو حقیقت کو قائم کرتے اور اسے منظم رکھتے ہیں۔ اس لیے فینٹسی کو بذاتہ ایک خصوصی رُمرے کے طور پر اجاگر کرنا گمراہ کن ہے، کیوں کہ یہ اپنے سے بہت زیادہ وسیع ایک شے کا محض ایک جُز ہے: مارکیز کا سروکار بیک وقت اُن ضابطوں سے بھی ہے جن کی حدود میں سماجی حقیقت قائم ہوتی اور برقرار رہتی ہے، اور اُن ضابطوں کو مکمل طور پر تبدیل کر دینے کے امکانات سے بھی۔ اگر ہم طلسمی کی تعریف اس شے کے طور پر کریں جو ایک نہایت تنگ سائنسی انداز فکر میں نہ سما سکتی ہو، تب مارکیز کی تحریروں کا طلسمی پہلو عقلیت کی قائم کردہ قیود سے، اور اس کی حدود میں رہنے والی تحریروں سے، اس کے انکار کا ایک حصہ ہے۔ جیسا کہ اس نے پلیینیو اپولیئو میندوزا سے کہا تھا، اسے اپنے ادب بننے کے ارادے کا احساس اس وقت ہوا جب اس نے دریافت کیا کہ کافکا کا قصہ سناتے کا انداز بالکل اس کی نانی کی طرح کا ہے۔

اس کی نانی، جن کے ساتھ وہ آٹھ برس کا ہونے تک رہا، اس کی تحریروں کا ایک بے حد اہم مآخذ ہیں۔ ان طویل اور ختم نہ ہونے والی کہانیوں نے جو اس نے بچپن میں اپنی نانی سے سنی تھیں، کو کولومبیا کے شمالی ساحل کی مالا مال زبانی روایتوں کے خزانے اس پر کھول دیے۔ تحریر کی آشرافی اور پدیری روایت سے اس زبانی ذخیرے کا تصادم، اس کی تحریروں کا ایک بے حد مسور کن پہلو ہے۔ نانی اس حقیقت کی مثال ہیں جو اُس جگہ وقوع پذیر ہوتی ہے جہاں سماجی تانے بانے کی تشکیل قصہ گوئی اور زبانی اظہار سے ہوتی ہے، نہ کہ تحریر کردہ یادداشت سے۔ "سنائی کے سو سال"، اسی اعتبار سے -- یورپی ناول کے آمد نامے کے برعکس، جو خیال اور کرداروں کا مجموعہ ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ ارتقا پذیر ہوتا ہے -- سنی ہوئی کہانیوں کا ایک ذخیرہ ہے۔ تاہم اس کے بیانے کی بے پناہ توانائی کے باوجود اس کے اختتام تک پہنچنے پر ایک تسکین کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ناول، مثال کے طور پر، کہانیوں کے ایک آور ذخیرے، "الف لیلہ و لیلہ"، کے برعکس، ایسا متن نہیں جس کی لذت کو پڑھنے والا ختم نہ ہونے دیتا چاہے۔ ایک مسلسل فراوانی کے اندر ایک غمتا کی، اور ایک مجموعی طور پر دم گھونٹنے والی محدودیت کا احساس قائم رہتا ہے، جو بیانے کے بے رکاوٹ بہاؤ اور کرداروں کے ناموں اور زندگیوں کی

بے تسکین تکرار سے جنم لیتا ہے۔

مارکیز کے بیشتر ناول ایک ایسے مقام سے لکھے گئے ہیں جہاں تمام واقعات پہلے ہی پیش آچکے ہیں۔ اس کا پہلا ناول "پتھوں کا طوفان" ایک تدفین کے لمحے سے شروع ہو کر وقت میں چھپنے کی طرف سفر کرتا ہے۔ "تسنائی کے سوسال" اپنے اندر خود اپنے لکھے جانے کا ایک آئینہ رکھتا ہے: ملکیتا دیس کا کمرہ: وقت کی پائمالی اور موسموں کے اتار چڑھاوے محفوظ ایک مکمل طور پر جامد مقام، جہاں ناول میں پیش آنے والے تمام واقعات کی پیش گوئی کرنے والے مسودات محفوظ ہیں۔ "سردار کا زوال" اپنے مرکزی کردار، ڈیڑھ سوسالہ آمر کی موت سے شروع ہوتا ہے، جو اس صدارتی محل میں واقع ہوتی ہے جو اب مکمل طور پر فطرت کے رحم و کرم پر ہے۔ "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" میں ساتیاگو نسر کی یقینی موت کا اشارہ عنوان ہی سے مل جاتا ہے، جسے درحقیقت ناول کے آخری چند جملوں میں بیان کیا گیا ہے لیکن پہلے ہی جملے سے اس کے یقینی ہونے کا تجربہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ یہ نقشہ مارکیز کے تازہ ترین ناول "وبا کے دنوں میں محبت" (جو مہا نوبی میں ۱۹۸۵ میں شائع ہوا) سے پہلے تک قائم رہتا ہے۔

بیانیے کی اس مخصوص قسم کی ساخت کا تعلق ذاتی اور سماجی، تحریری اور زبانی یادداشت کے مرکزی قصبے سے ہے۔ اپنی زندگی میں مارکیز متعدد بار اپنے والدین، اپنے بچپن کے گھر، اور اپنے آبائی خطے سے جدا ہونے کے تجربے سے گزرا۔ آٹھ برس کی عمر کو پہنچنے تک وہ اپنے نانا اور نانی کے ساتھ اراکاتا کا میں رہا۔ جب اس کے نانا کا انتقال ہو گیا تو اسے ماں کے پاس بھیج دیا گیا۔ نو عمری ہی میں اسے کریبینین کے گرم ساحلی علاقے سے دور، کولومبیا کے سرد آندینین خطے کے ایک اسکول میں بھیج دیا گیا جہاں اسے کریبینین تہذیب کی بے تکلفی اور فراوانی میسر نہ تھی۔ بعد میں اسے آور بھی دور دراز مقامات پر جانا پڑا: "کرئل کو کوئی خط نہیں لکھتا" پیرس میں لکھا گیا، اور "تسنائی کے سوسال" میکسیکو میں۔ اکیس برس کی عمر میں اس نے اپنی ماں کے ساتھ واپس اراکاتا کا سفر اختیار کیا۔ اس سفر کا مقصد نانا نانی کے مکان کو فروخت کرنا تھا۔ یہ ایک ایسا تجربہ تھا جس نے اس کی تحریروں کی شکل متعین کرنے میں ایک نہایت اہم کردار ادا کیا۔ وہاں پہنچنے پر اس نے ہر شے کو پہلے سے مختلف پایا:

مکان بالکل وہی تھے، لیکن وقت اور افلاس انہیں کھا گئے تھے۔ اور گھر میوں میں سے وہی فرنچر نظر آتا تھا لیکن اس کی عمر میں پندرہ سال کا اضافہ

ہو چکا تھا۔ یہ ایک گرد آلود، گرم قصبہ تھا اور دوپہر کی گرمی بے حد شدید تھی۔
سانس لینے سے گرد اٹھتی تھی۔

وقت کے حملے کے شکار ماضی کو بھال کرنے کی کوشش سے مارکیز کو توانائی کا ایک بنیادی منبع حاصل ہوا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسے وقت اور مقام سے یگانگت بھی حاصل ہوئی جن کی تقدیر نیستی ہے، اور خود نیستی اور زوال کے اس عمل سے بھی۔

اراکانا کا واپسی کو اس کی ایک عمدہ ترین کہانی "مٹگل کے دن کا قیلو" کے، آخذ کے طور پر پہچانا جاسکتا ہے۔ ایک عورت اپنی بیٹی کے ہمراہ اپنے بیٹے کی قبر تک کا سفر اختیار کرتی ہے، جو ایک مینڈ ڈاکے کے دوران گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا تھا۔ دوپہر کی شدید اور گرد آلود گرمی کے علاوہ اسے پادری کے عدم تعاون اور گلیوں میں بھرے ہوئے تماش بینوں کی بداندیش نگاہوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ قصبے کے بارے میں اس کا باغیانہ رویہ ایک ذاتی یادداشت کے اثبات کا، اور قصبے کے باشندوں کی سماجی فراموشی سے انکار کا عمل ہے۔ کہانی کا اختتام عورت کے شدید گرمی میں باہر نکل جانے پر ہوتا ہے: قبر پر حاضری۔۔۔ جو کہانی کا مرکزی واقعہ ہے۔۔۔ پڑھنے والے کے تخیل میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ ناول میں، بطور ایک حرکی قوت کے یادداشت کا عمل زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے۔ واقعات کا وسیع ذخیرہ کس فرد یا ادارے (agency) کے پاس محفوظ ہے؟ اور کس میڈیم میں نقش کیا گیا ہے؟ عام لوگوں کی زبانی یادداشت یاد آوری کے حالات کی نسبت سے تبدیل ہوتی رہتی ہے؛ یہ، جامد اور ہمیشہ کے لیے متعین ہونے کے بجائے، متواتر نئے سرے سے تشکیل پاتی رہتی ہے۔ اور اس کی شکل، تحریر شدہ الفاظ کے بجائے، سنائی دینے والی آواز سے متعین ہوتی ہے۔ ایک بار تحریری ضابطے میں آجانے کے بعد یادداشت ایک مختلف شے ہو جاتی ہے: سب سے بڑھ کر یہ کہ اب اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں رہتی۔ اور اب وہ اجتماعیت کی ملکیت نہیں رہتی، بلکہ پروہتوں اور نقل نویسوں کے مخصوص عمل سے گزر کر آتی ہے (جن کا نمائندہ "تسہائی کے سو سال" میں ملکیدا-س ہے)۔ یادداشت کی نقاشی کے زبانی اور تحریری طریقوں کا فرق ناول کے پہلے حصے میں نمایاں طور پر ظاہر ہے:

بست برسوں بعد، فائرنگ اسکوٹ کا سامنا کرتے ہوئے، کرنل اوریلیانو بونندیا
ماضی کی اُس دور دراز سہ پہر کو یاد کرنے والا تھا جب اس کا باپ زندگی میں پہلی
بار اسے برف دکھانے لے گیا تھا۔

ماضی کے ایک سادہ بیان کو ("اس کا باپ اسے زندگی میں پہلی بار برف دکھانے لے گیا") ایک ایسے مستقبل کے درمیان رکھ دیا گیا ہے، جو پیش آچکا ہے۔ یہ ایک ایسے عمل کے ذریعے کیا گیا

ہے جو تحریر کے تعین اور اس کی پیچیدہ ساخت ہی کی مدد سے ممکن ہے۔ یہ تناظر تحریر شدہ تاریخ کے احساس پر بھی انحصار کرتا ہے، جو وقت کے دوران میں واقعات کی ایک باضابطہ ترتیب ہے جس کے آخری لمحات کو اس سے پہلے کے لمحات میں تحریر شدہ دیکھا جاسکتا ہے۔ یاد کیے ہوئے ایک ماضی کا ایک ایسے مستقبل کے درمیان واقع ہونا جو ایک لحاظ سے پہلے ہی پیش آچکا ہے، مجموعی طور پر اس کتاب کی زبانی ساخت کی تشکیل کرتا ہے۔

کتاب کا ایک حصہ ایسا ہے جہاں وہ تمام نکات جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، ایک جگہ جمع ہو کر ایک ڈرامائی ارتکاز حاصل کر لیتے ہیں: بے خوابی کی وبا۔ یہ وبا کووند کے باشندوں پر حملہ آور ہو کر نتیجے کے طور پر فراموشی پیدا کرتی ہے: لوگ چیزوں کے نام بھول جاتے ہیں۔ اس وبا کا کچھ موت مقامی انڈین آبادی سے لگتا تھا، جو زبانی اظہار پر انحصار کرنے والے لوگ تھے۔ جبکہ اس کا علاج دریافت کرنے والا شخص، ملکیادیس، تحریر کا آدمی ہے۔ لیکن وبا کا علاج ہونے سے پہلے حوزے آرکادیو بوئندیا، جو خاندان کا سردار ہے، اس کے سنگین اثرات کو محدود کرنے کے لیے یادداشت کی مشین ایجاد کرتا ہے:

یہ کل، انسان کی تمام زندگی میں حاصل کیے گئے علم پر، ہر صبح، شروع سے آخر تک نظر ڈالنے کے امکان پر مبنی تھی۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے اس کا تصور ایک چرخہ نفلت کے طور پر کیا تھا، جس کو موہر پر رکھ کر دستے کے ذریعے چلایا جاسکے، اور اس طرح، زندگی کے سب سے ضروری تصورات، ہر چند گھنٹوں بعد، اس کی آنکھوں کے سامنے آسکیں۔ وہ تقریباً چودہ ہزار اندراجات کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

یہ دراصل تحریر کی مشین ہے۔ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے کہ لوگ چیزوں کے منصب اور استعمال بھول جائیں گے (جس کی پُر مزاج مثال کے طور پر گائے کا ذکر کیا گیا ہے)، یہ مشین نام اور تعریفیں پیدا کرتی ہے۔ لیکن فراموشی کا خاتمہ کر کے یہ تبدیلی کا بھی خاتمہ کر دیتی ہے: دنیا نفلت کی محکوم ہو جاتی ہے۔ اور چوں کہ اس کا مقصد پوری حقیقی دنیا کو لفظوں سے اس طرح بھر دینا ہے کہ کہیں کوئی جگہ خالی نہ رہ جائے، اس کی مدوریت (circularity) تحریری ادب کا استعارہ بن جاتی ہے، جو گویا ایک بند ساخت ہے جو کسی تفسیر کو راہ نہیں دیتی، اور اپنی خود کفالت میں قید ہے: جو اس ناول کی مثال بھی ہے، اس کے جمود کے احساس اور ناقابل فراتقدیر کے کل پرزوں سمیت۔ اس ناول کے لوازمات زیادہ تر زبانی ہیں، لیکن وہ تحریری ہیئت میں سے گزر کر ٹھوس شکل اختیار کرتے ہیں۔ یہ عمل دوبار طریقہ اختیار کرتا ہے: ایک طرف زبانی سنائی جانے والی کہانیاں

ہیں، اور دوسری طرف متعین تھدیر، جو ملک یا دیس کی پیش گوئیوں کی شکل میں محفوظ ہے۔ اس ناقابل فرار تھدیر کا عمل ایڈیپس کے انجام (Oedipal trap) کی طرح ہے: مرموں کے درمیان ممنوعہ جنسی تعلق کی خواہش (incestuous desire) بوسند یا خاندان کی جبلت میں موجود ہے، اور اس خواہش کی تکمیل انتہائی درجے کا جرم ہے، جس کی سزا مکمل بربادی ہے، نہ صرف اس کا ارتکاب کرنے والوں کی، بلکہ ان کی پوری کائنات کی بربادی۔ رشتوں کو نام دینا اور ان کی تعریف متعین کرنا اس جرم کے امتناع کے لیے لازمی ہے: ناموں کے بغیر یہ امتناع کارگر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ ماں، باپ، بیٹا، بیٹی، وغیرہ، رشتوں کو نام دینے ہی کا عمل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بے خوابی کی وبا کا فوری انسداد ضروری ہے: یہ ایڈیپس کے انجام کے تمام کل پرزوں کو نیست و نابود کر سکتی ہے۔ یہاں سوفوکلیز اور فراند کا، مقبول عوامی معاشرت سے خطرناک ٹکراؤ ہوتا ہے۔

اب ہم زبانیت بمقابلہ تحریر کے قضیے سے بڑھ کر، معاشرتی نظم و ضبط کی عائد کردہ قیود، اور سماجی وجود کے بنیادی اصولوں میں تغیر کے امکان، سے مارکیز کے شغف تک آگئے ہیں۔ نوہیل انعام قبول کرتے وقت کی گئی تحریر میں "تنہائی کے سوسال" کے آخری جملے کو الٹ کر اس نے کہا کہ سوسال کی تنہائی کی سزا پانے والوں کو زمین پر ایک آور موقع دیا جانا چاہیے۔ سیاسی ضرورت کا یہ خیال، جو سوشلزم سے اس کی وابستگی سے پیدا ہوا ہے، اس کے فٹن کے بنیادی سروکار سے مطابقت نہیں رکھتا: ادبی انہماک اور سیاسی عقیدے کی دوستی اس کی تحریروں کا سب سے بڑا تضاد ہے۔ اس کا سب سے پسندیدہ ادیب سوفوکلیز ہے۔ خصوصاً اس کا Oedipus Rex۔ "تنہائی کے سوسال" میں لبرل پارٹی کی صفوں میں ایک سپاہی کہتا ہے: "ہم پادریوں کے خلاف جنگ کر رہے ہیں، تاکہ اگر کوئی شخص اپنی ماں سے شادی کرنا چاہے تو کر سکے۔" کسی بنیادی تبدیلی کو جنم دینے میں کولومبیا کی خانہ جنگیوں کی ناکامی، اور ایڈیپس کے انجام کا یقینی ہونا، دونوں ایک ہی سطح پر آجاتے ہیں: تاریخ سے ماورا، متعین تھدیر کے عائد کردہ المناک مناظروں کی فتح ہوتی ہے، اور تاریخ کا کام صرف اس تھدیر پر عمل کرنا ہے۔

لاٹینی امریکا کے کسی اور ملک سے زیادہ، کولومبیا کی تاریخ خانہ جنگیوں سے رنگین ہے۔ ان میں سے بدترین اور تاریخی طور پر قریب ترین، جسے 1a violencia کہا جاتا ہے، ۱۹۳۸ء سے ۱۹۶۲ء تک جاری رہی، اور اس میں تین لاکھ جانیں تلف ہوئیں۔ "ممنوس وقت" اور "کرئل کو کوئی خط

نہیں لکھتا "اسی خانہ جنگی کے زمانے سے متعلق ہیں۔ مارکیز کے دیگر تمام ناول روزمرہ زندگی پر سیاسی تشدد کی متواتر یلغار کی تصویر کشی کرتے ہیں، اور تمام ناول کوئی معنی خیز سیاسی تبدیلی لانے میں ناکامی کے شاہد ہیں۔ لیکن مارکیز کی تحریروں میں تاریخ کا پدیری اور اٹل تقدیر والا تصور ہی تاریخ کا واحد تصور نہیں۔ یہ تصور "پتوں کا طوفان" اور "ستھائی کے سوسال" پر چایا ہوا ہے، جہاں نقطہ نظر مقامی دیسی اشرافیہ (مثلاً بونڈیا خاندان) کا ہے: بیسویں صدی کے اوائل میں یونائیٹڈ فروٹ کمپنی کی آمد کی تعبیر ایک مکمل تباہی کے طور پر کی گئی ہے، کیوں کہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سماجی تبدیلیاں اس اشرافیہ کے خاتمے کا اشارہ ہیں۔ دوسری جانب اس کے بعد کے ناولوں میں عوام کی اجتماعی یادداشت کی آواز سنائی دیتی ہے، جس میں سرکاری تاریخ کے مصنوعی پن اور تحریف کے واسطے ایک حقارت موجود ہے، جیسے کہ "بڑی اما کا جنازہ" کا راوی کہتا ہے کہ یہی وقت ہے کہ صدر دروازے کے قریب کرسی گھسیٹ کر پورا قصہ بیان کر دیا جائے، اس سے پیشتر کہ مورخین آنکلیں۔ عوامی معاشرت کی اس پُر تعصیب اور مائل بہ تحریب لہر سے خود ایڈمی پس کا اسطور بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ بچوں کے نام رکھنے کا قاعدہ، جو اس قانون کا آئینہ دار ہے جس کی غلاف ورزی نہیں کی جاسکتی، پدیری استحقاق کو سر بلند رکھتا ہے: خاندان کی شناخت اس کے لڑکوں سے ہوتی ہے جن کے نام ہمیشہ باپ دادا کے ناموں پر رکھے جاتے ہیں۔ لیکن ممنوعہ جنسی عمل کا واحد حقیقی اشارہ سور کی دُم والے بچے کی پیدائش سے ملتا ہے۔ اس قسم کے ثبوت کی ضرورت ایک ایسے معاشرے میں پڑتی ہے جہاں غیر یقینی ولدیت کا اصول موجود ہو، یعنی جہاں پدیری استحقاق کی پابندی ترک ہو جانے کی وجہ سے ماں کی اہمیت مسلم ہو، اور مرد آتے جاتے رہتے ہوں۔ یہ رویے کسان معاشروں سے تعلق رکھتے ہیں، جہاں حسب نسب اور ورثے میں ملنے والے ناموں کی اہمیت نہیں ہوتی، جو بونڈیا خاندان کے لیے نہایت اہم ہیں۔ اس کے باوجود، اور بونڈیا خاندان کی ممنوعہ جنسی تعلق کی خواہش کے نشانہ تعصیب بننے کے باوجود، یہ خواہش ہی وہ اصل قوت ہے جس کے ذریعے بیانیہ وقت کا سلسلہ آگے بھی بڑھتا ہے اور، آخر کار تمام خالی جگہوں کے پُر ہو جانے کے بعد، تباہی کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ عوامی اور اشرافی قوانین کی تہیں یوں ایک دوسرے کے اوپر جمانے سے دھرم کڑی تناظر پیدا ہوتا ہے، اور، کبھی ایک اور کبھی دوسرا مرکز زیادہ نمایاں محسوس ہوتا ہے۔ سطح پر اپنی ظاہری سادگی کے باوصف، مارکیز کی تحریر مختلف تہوں کی ایک پیچیدہ بُنت ہے۔

اقتدار کی درجہ بندی کی پابند زبان، اور عوامی معاشرت کی آواز کے درمیان ممکنہ فاصلہ "سردار کا زوال" میں سب سے زیادہ شدت سے نمایاں ہوتا ہے۔ اس متن کو کئی آوازوں کے

ذریعے بیان کیا گیا ہے، جن میں نمایاں آوازیں عام لوگوں کی ہیں جو آخر محل کے اندر داخل ہو کر آمر کے عرصہ حکمرانی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ مگر یہ عوامی آوازیں، جو کسی ایک شخص کی نہیں بلکہ اجتماعی ہیں، صرف بے نام آمر کے خاتمے کی خواہش کا اظہار ہی نہیں ہیں؛ یہ اُسے ایک ٹھوس جسمانی وجود بھی عطا کرتی ہیں جس سے وہ دراصل محروم ہے۔ دوسرے لفظوں میں، اس کا وجود، ایک حد تک، ان کا مہونہ منت ہے۔ پیرو سے تعلق رکھنے والے نقاد حولیو اور تیگا (Julio Ortega) نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اس متن میں عوام کی آواز آمریت کی دیوالا پر تنقید اور اس کی تخریب کرتی ہے۔ لیکن اس بات پر بھی زور دیا جانا چاہیے کہ آمر، ایک مربوط شناخت رکھنے والے وجود کے طور پر، آوازوں کی اسی اجتماعیت کی پیداوار ہے جو اس کو بیان کرتی ہیں۔ ایک جانب آمریت کی ثبات کی، اور اقتدار کے تسلسل کی خواہش ہے، اور دوسری جانب عوامی آوازوں کا ایک سیل ہے، جو مسلسل تغیر میں ہے، اور جس کی کوئی جامد شناخت نہیں ہے۔ لیکن بیانیے میں کوئی جوڑ و کھائی نہیں دیتا؛ عوامی آوازوں کی اجتماعیت اور آمریت کی جابرانہ وحدانیت کے درمیان تمام رخنے پریشان کن طور پر نظروں سے اوجھل کر دیے گئے ہیں؛ ریاست اور عوامی معاشرت کے درمیان فاصلہ و حند لا گیا ہے۔ استبداد کی ذمہ داری، انجام کار، کسی پر عائد نہیں کی جا سکتی؛ یہ بس موجود ہے، موسم کی طرح۔ وہ کون سا عمل ہے جس کے ذریعے لوگ کسی کشش کے زیر اثر آمریت کی حدوں میں داخل ہو کر اپنے ہی استبداد کی سازش میں شریک ہو جاتے ہیں؟ اپنی ماں کے واسطے آمر کا شدید نوستالیا اس کی وقت میں ثبات کی آرزو کو صورت پذیر کرتا ہے۔ اسی سے اُس کی آوازیں وہ جذباتی کشش پیدا ہوتی ہے جو عوامی آوازوں کو اپنے اندر گھسیٹ کر و حند لا دیتی ہے۔ خود کو سماجی جبر کے سپرد کر دینے کی پشت پر بھی ایڈمی پس کی وہی خواہش موجود ہے۔

آئیے اب مارکیز کی تحریروں میں تنقید کی ناگزیریت پر عمومی غور کی طرف لوٹتے ہیں۔ ہر طرف سے بند اور ناقابل فراز ماحول کئی صورتوں میں پیدا کیا گیا ہے؛ موسم، خوشبوئیں، ناموں اور واقعات کی تکرار، اور جسمانی اور سماجی فنا کے مرحلے۔ یہاں ان میں سے صرف ایک، شاید سب سے زیادہ اہم، سطح پر اس ناگزیریت کے اظہار کے بارے میں گفتگو کی گنجائش ہے؛ پلاٹ کی ساخت میں پنہاں، وقت کے گزران کا بیان۔ ان تمام پلاٹوں میں ایک بلاکت خیز واقعے پر گزر جانے والے طویل عرصے کا افسوں طاری ہے۔ اکثر موقعوں پر وقت ایک التوا (یا التواؤں کے ایک سلسلے) کی صورت میں گزرتا ہے۔ ”تسہائی کے سو سال“ میں بونڈیا خاندان کی تاریخ سو برسوں پر

پھیلی ہوئی ہے، جن کے دوران ممنوعہ جنسی تعلق کی خواہش کی سزا ملتوی ہوتی چلی جاتی ہے۔ "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" کے مرکزی کردار، کرنل، نے چھپن سال تک جنگ کی پنشن کا انتظار کیا ہے، جب کہ اس کی روزمرہ زندگی فاقوں سے نہرو آنا ہونے میں گزرتی ہے۔ "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" میں سانتیاگو نصر کی موت کا علم آنا ہی میں ہو جاتا ہے: اس موت کے اعلان اور اس کے حقیقت بننے کے درمیانی وقفے کو ایک ادبی تدبیر کے ذریعے طویل کیا گیا ہے جس میں سانتیاگو نصر کی موت کی وجہ کی ایک عقلی تفتیش کا عمل، قصبے کے باشندوں کی، ایسے کی غیر عقلی خواہش کے پس منظر میں دکھایا جاتا ہے۔ "معصوم ارندرا" میں ارندرا نامی کم سن لڑکی، اپنی دادی کے مکان میں غلطی سے آگ لگ جانے کی یادداشت میں، ایک لالچا عرصے تک عصمت فروشی کا نشانہ بنتی رہتی ہے۔ اس کہانی میں دادی کا کردار مارکیز کے ہاں معاشرے کا استعارہ بھی ہو سکتا ہے، جو اپنے ارکان سے احساس جرم کے قرض کی متواتر وصولی کرتا رہتا ہے۔ "سردار کا زوال" میں جس شے کا التوا ہے وہ آمرگی موت ہے، جس کا شدت سے انتظار کیا جاتا ہے، لیکن جب وہ درحقیقت واقع ہوتی ہے تو ممکن کا احساس غلبہ پالیتا ہے: گویا ایک مختلف سیاسی نظام کی تعمیر کے لیے جو توانائیاں درکار ہیں وہ ماند پڑ گئی ہیں۔

مارکیز کے اکثر بیانیوں میں وقت، قربانی اور بتدریج فنا کی قیمت پر خریداجاتا ہے، جب کہ تبدیلی کے تمام امکانات معدوم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" زیادہ تفصیلی غور کا مستحق ہے، کیوں کہ وہ بدلے ہوئے حالات کے امکان کو پیش کرتا ہے، جس کی بنیاد مسلسل بغاوت پر ہے۔ اگرچہ سیاسی جبر نے روزمرہ زندگی کے ہر رخنے میں راہ پالی ہے، لیکن کرنل اس حکمانہ دلیل کے آگے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیتا ہے جس کے ذریعے آمریت، اس دعوے کے ساتھ کہ وہ بے بدل اور فطری ہے، اپنی طاقت کو مستحکم کرتی ہے۔ ہر موڑ پر، بذلہ سنجی، مزاح اور سادہ لوحی کے امتزاج کے ساتھ، کرنل اقتدار سے سیاسی اور وجودی مفاہمت کی نگار نہ زبان کو ناکام کر دیتا ہے۔ ہمیں، کامیو کے "طاعون" کی طرح، یہ پہچاننے کی دعوت دی جاتی ہے کہ اخلاقی بغاوت کا عمل ایسا بھی ہو سکتا ہے جو کسی نظام عقائد پر استوار نہ ہو، لیکن پھر بھی، روزمرہ اور عمومی زندگی کے اندر رہتے ہوئے سر بلندی حاصل کرے اور مایوسی کے خلاف نہرو آنا ہو۔ اس کے باوجود، مارکیز کے ناول میں، متن کی دیگر سطحیں منظم طور پر رفتہ رفتہ بغاوت کی بیخ کنی کر دیتی ہیں۔ لڑکا مرغ کو، جو سیاسی تبدیلی اور مستقبل کی امید کی علامت ہے، کرنل اپنی اور اپنی بیوی کی جسمانی ضروریات کی قربانی کی قیمت پر زندہ رکھتا ہے: جیسے کہ اس کی بیوی کہتی ہے: "یہ ایک منہنگی خام خیالی ہے: کمپی ختم ہونے کے بعد ہم اسے اپنا کھجوا بھی کھلا کر پال سکیں گے۔" یہ تبصرہ کرنل کی

مثالیت پسندی کو تواجر کرتا ہی ہے، لیکن اس مثالیت پسندی کی قیمت کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے، اور اس یونانی اسطور کو متحرک کرتا ہے جس میں پرومیتھیوس کو دیوتاؤں کی آگ چرانے کی یہ سزا ملتی ہے کہ ایک گدھ پیسم اس کا جگر نوچ نوچ کر کھاتا رہے۔ جب ایک بار ہم آگ کو ایک انسانی ایجاد کے طور پر مطلع کر لیتے ہیں، اور جان جاتے ہیں کہ گدھ خود پرومیتھیوس ہے، تو یہ اسطور انسانی توانائی کو قربانی کے ایک نظام کے سپرد کر دینے کی مثال بن جاتی ہے۔ مرغ اجتماعیت یا سیاسی نظام کا اشارہ بھی ہے، جسے افراد کی قربانی دے کر پروان چڑھایا اور باقی رکھا جاتا ہے۔ کرنل، جو ایک رواقی (stoic) ہے، کسی شخص کو چھوٹا پسند نہیں کرتا، اس لیے جس لمحے وہ لڑاکا مرغ کو چھوٹا ہے، وہ لمحہ ایک خاص شدت کا حامل ہے:

وہ آور کچھ نہ بولا کیوں کہ اس جاندار کے گرم اور گہرے ارتعاش نے اس پر لپکی طاری کر دی تھی۔ اسے خیال آیا کہ اس نے اس سے پہلے کبھی اس سے زیادہ زندہ شے اپنے ہاتھوں میں نہیں لی۔

اس طرح ہم یہاں ایک اور تصور کو کارفرما دیکھتے ہیں، جو درحقیقت مسیحیت سے تعلق رکھتا ہے: قربانی کے عمل کے ذریعے دوسروں سے جڑ جانے کا تصور۔ متن کی وہ سطح جو انقلابی بغاوت کی شہادت دیتی ہے، ناگزیر تقدیر، اور قربانی کے متعین ضابطوں کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔

متن کی مختلف سطحوں کو ایک ساتھ بننے میں مارکیز کو غیر معمولی مہارت حاصل ہے۔ اس کی سرشاری کا ایک بڑا حصہ ایک زبردست بیانیہ توانائی کا احساس ہے، جو قید عائد کرنے اور آزادی عطا کرنے والی قوتوں کے درمیان ایک کش مکش میں مشغول ہے۔ "وبا کے دنوں میں محبت" کا ایک دلچسپ ترین پہلو یہ ہے کہ اس میں اس نمونے سے انحراف کیا گیا ہے جو اس سے پہلے مارکیز کی تحریروں پر حاوی رہا ہے۔ پہلی نظر میں اس ناول کے پلاٹ میں بھی اس سے پہلے کے ناولوں کی جانی پہچانی شہادت محسوس ہوتی ہے، کیوں کہ اس کا مرکزی تار بھی ایک عشق کا التوا ہے جو اکیاون سال، نومینے اور چارون کے عرصے پر محیط ہے۔ اس کے باوجود اس میں ایک بہت نازک فرق موجود ہے۔ فرینا داوا، اس عشق کی ایک فریق، دانائی سے کام لے کر ماضی سے، اور خصوصاً نوستلیا کی ترغیبات سے جو مارکیز کی اس سے پہلے کی افسانوی تحریروں کا غالب جنسی جذبہ رہا ہے، داسن چھڑا لیتی ہے:

ماضی کی یاد نے مستقبل کی تلافی نہیں کی تھی، جس پر یقین کرنے پر وہ مصر تھا۔ اس کے برعکس، وہ یاد اس عقیدے کو تقویت پہنچاتی تھی جس پر فرینا داوا

ہمیشہ قائم رہی تھی، کہ بیس سال کی عمر کی جذباتیت گو نہایت قابلِ قدر اور خوب صورت شے تھی، لیکن وہ محبت نہیں تھی۔

جس شے کو وہ بطور خاص رد کر رہی ہے وہ فلورنٹینو آریزا کا چایا ہوا محبت کا تصور ہے: محبت کی خوشبوؤں اور ذائقوں کی قربان گاہ پر خود کو فنا کر لینا (وہ یودی کلون پیتا اور گارڈینیا کے پھول کھاتا ہے)، اس تصور میں خود کو تباہ کر لینے کا، ایک مرض کا مقام ہے، جس کا اشارہ استعاراتی طور پر ناول کے عنوان سے بھی ملتا ہے۔ جب آخر کار فلورنٹینو آریزا اور فرینا دازا کا ملاپ ہوتا ہے، تو محبت اور میسنے کی یکسانیت ایک مختلف معنی اختیار کر لیتی ہے: اب جبکہ دونوں کی عمر ستر سال سے تجاوز کر چکی ہے، ان کی محبت روایات اور رسمیات کے خلاف، اور اس قرطینہ کے خلاف ایک بغاوت ہے جو معاشرہ اپنے مخالفوں پر عائد کر دیتا ہے۔

محبت، مارکیز کے ناولوں میں، عقل کی دسترس سے باہر ایک انتشار کا مقام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام سماجی پابندیوں کا سب سے بڑا بدلتا بنی ہے۔ بار بار، جب نظم و ضبط کی تعمیر محبت کے باتھوں منتشر ہو جاتی ہے، تو اس کے نتیجے میں ممنوعہ جنسی تعلق، یا اکارت خواہشوں۔۔۔ یا کم از کم نوستلیا کی رسمیات۔۔۔ کی، تھدیر اور تباہی کی تصویریں غلبہ حاصل کر لیتی ہیں۔ مگر فرینا دازا اور فلورنٹینو آریزا اس عمل سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، اور اس کی وجہ صرف ان دونوں کا ضبط نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ مارکیز اپنی بیانیہ توانائی کے خبے کو المناکی، قربانی، اور نوستلیا پر مبنی یادداشت کی بند کتاب سے بٹانے کی کوشش میں ہے۔ فلورنٹینو آریزا کا پچاس سالہ انتشار، کرنل کے زہد، ارنسدر کی ادائیگی قرض، یا آمر کے اپنی ماں کو یاد کرنے سے مختلف نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ جس جگہ ان کے عشق کی تکمیل ہوتی ہے وہ ایک بحرِ جہاز ہے جو ان دونوں کو دریائے ماگدالینا میں اوپر کی جانب لے جا رہا ہے۔ وقت کی گزران کے ایک اور طرح کے عمل کے بہاؤ پر۔۔۔ جو قربانی والے عمل سے بہت مختلف ہے۔۔۔ جہاز مارکیز کی تحریر کی مشین ہے، جو ایک نئے قالب میں آگئی ہے۔ کارتاچینا کی طرف واپسی کے سفر میں وہ جہاز پر قرطینہ کا پرچم لہرانے کا فیصلہ کرتے ہیں، تاکہ مسافر اور اسباب جہاز سے دور رہیں، اور وہ دونوں، کپتان اور اس کی داشتہ کے ساتھ، تنہا رہ جاتے ہیں۔ اس کھامٹی میں انتشار کے دوران فلورنٹینو آریزا آخر طے کرتا ہے کہ دوبارہ اوپر کی جانب سفر پر روانگی جی واحد حل ہے۔ "اور تمہارا کیا خیال ہے ہم کب تک یہ آمدورفت جاری رکھ سکتے ہیں؟" کپتان دریافت کرتا ہے۔

اس سوال کا جواب فلورنٹینو آریزا کے پاس تریپن سال، سات ماہ اور گیارہ دن رات سے تیار تھا: "زندگی کے خاتمے تک"۔

فلورنٹینو آریزا کے جواب میں شامل عرصے کی طوالت کم و بیش مارکیز کی اُس وقت کی عمر کے برابر ہے جب وہ یہ کتاب لکھ رہا تھا، لہذا اس سوال میں یہ سوال بھی موجود ہے کہ وہ اور کتنے عرصے تک ایک ادیب کے طور پر رزخیز رہ سکتا ہے۔ سفر کے جاری رکھنے میں ایک رکاوٹ جہاز کے بوائے کے لیے لکڑی کی کمی ہے (دریا کنارے کے جنگل کٹ چکے ہیں)، اور یہ خوف کہ دریا خشک ہو کر موٹروں کے راستے میں تبدیل ہو جائے گا۔ اپنے پہلے ناول سے لے کر، مارکیز اس دنیا کے خاتمے کے بارے میں فکر مند رہتا ہے جس کے بارے میں وہ لکھ رہا ہو۔ یہاں البتہ اسے اعتماد ہے کہ تحریر کی مشین اپنا سفر جاری رکھ سکتی ہے۔ اسے بلاشبہ ایندھن اور وسعت کی ضرورت ہے، لیکن اب وہ اپنے استعمال میں آنے والی اشیاء کو تباہ نہیں کرتی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اشیاء۔۔۔ بیسویں صدی کی سرمایہ داری سے قبل کی روایتی دیہی دنیا۔۔۔ خود مٹتی جا رہی ہیں۔ یہ امر اس سوال کو اور بھی دلچسپ بنا دیتا ہے کہ مارکیز کی اگلی تحریر کیا ہوگی۔

100

تہنائی کے سوسال

لاطینی امریکی ادب اس براعظم کی فتح (the Conquest) سے پیشتر بھی موجود تھا، اگرچہ وہ لاطینی نہیں تھا اور نہ خود کو امریکی کا نام دیتا تھا۔ لیکن اس کے انداز میں کوئی ایسی بات ہے کہ وہ بار بار بے حد قریبی زمانے کا معلوم ہوتا ہے، گویا اُسے ابھی دریافت کیا گیا ہو؛ اور یہ احساس صرف بابر والوں تک محدود نہیں۔ اس ادب کی تاریخ میں ہر طرح کے خلا موجود ہیں، اور اندھیرے کے اور بہاؤ رک جانے کے وقفے؛ اور چیلے کے ادب حوزے دو نوسو (Jose Donoso) کا کمنا ہے کہ معاصر لاطینی امریکی فکشن کا موجودہ عروج، جسے Boom کا نام دیا جاتا ہے اور جو واضح اور قابلِ لحاظ نئی تحریروں کی صورت میں کوئی بیس سال قبل نمودار ہوا، ایسے ادیبوں کی پیدوار ہے جن کے دادا تو تھے لیکن باپ نہیں تھے۔ ان کی ادبی روایت میں ان سے فوراً پہلے کوئی مثال، یا کسی متعین راہ کا سراغ نہیں ملتا، لیکن اس کمی نے، ایک بار اس کا مکمل ادراک ہو جانے کے بعد، ایک نہایت قابلِ دید موقعے کی صورت اختیار کر لی۔

اس عروج کے واسطے ہسپانوی زبان میں بھی انگریزی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، جس سے اس پورے معاملے پر ایک ہلکی سی بدیسی خوشبو چھا جاتی ہے، اور ایک ثقارے کی سی گونج:

'El Boom' - لاطینی امریکی فکشن کی یہ فراوانی نہایت گرما گرم بحثوں کا موضوع رہی ہے: اسے ذرائع ابلاغ کی ایجاد، اور فرانسیسی اور امریکی ناشروں کے ذہن کی پیداوار کے طور پر دیکھا گیا ہے؛ ایک طرح کے ادبی مافیا کے ارکان کی ایک دوسرے کی تحریروں کو بڑھاوا دینے کی سازش کے طور پر دیکھا گیا ہے؛ اور اسے ایک تابناک نئے جنم، بلکہ پہلے جنم، اس ادب کی آزاد زندگی میں پہلی بار آمد کے طور پر بھی دیکھا گیا ہے۔ "بوم" کی اصطلاح کو بازاری، نامناسب اور فن کے لیے توہین آمیز خیال کیا گیا ہے؛ اس کے باوجود، اگر ہم اسے زیادہ سنجیدگی سے نہ لیں، تو یہ اس منظر کو بیان کرنے کے لیے مجھے نہایت موزوں معلوم ہوتی ہے۔ اس سے نئے ادبوں کی دریافت کے نوآموز جوش و خروش کا پتا چلتا ہے؛ اور بڑے کارآمد طور پر یہ اشارہ ملتا ہے کہ گویا ان ادبوں نے تھیل کی سرزمین میں تیل کے ذخیرے دریافت کر لیے، اور المال مال ہو گئے۔ "بوم" کی اس سرزمین کا سب سے دیرپا نشان راہ "سنائی کے سوسال" ہے۔

لاطینی امریکی ادب کے اس عروج کے ساتھ بار بار وابستہ ہونے والے ناموں میں حولیو کورتازار (Julio Cortazar)، کارلوس فونتنیس (Carlos Fuentes)، گیرمو کا بریرا (Guillermo Cabrera Infante)، گابریل گارسیا مارکیز اور ماریو برگس یوسا (Mario Vargas Llosa) کے نام شامل ہیں، اگرچہ بہت سے دوسرے ادبوں کے نام بھی اس تذکرے میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان ناموں کی قیادتیں بھی ایک دلچسپ کہانی سناتی ہیں: ایک ارجنٹینیئن؛ ایک میکسیکن، ایک کیوین، ایک کولومبیئن اور ایک پیروویئن۔ پورے براعظموں پر محیط ادبی تحریکیں پہلے بھی ہو چکی ہیں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے، اور لاطینی امریکی ادب کی تحریک میں نئی وفاداریوں کا واضح احساس موجود ہے: یہ اپنے اپنے ملک سے نہیں، بلکہ لاطینی امریکا سے، ہسپانوی زبان سے، جدید ادب سے، اور فکشن اور دنیا کے درمیان تعلق کے مخصوص نظریات سے وفاداری ہے۔ اگر ہم (حورے دونو کی بات میں) اتنا اضافہ کر سکیں کہ بن باپ کے ان ادبوں کے ممتاز اور مقبول بدیسی چچا موجود تھے۔۔۔ جوئس، کافکا، میسنگ وے، فاکز۔۔۔ اور انھوں نے لگتا ہے اپنی پوری زندگی سنیا دیکھنے میں گزاری ہے، تو ایک تصویر سی بننے لگتی ہے۔ ہمیں ان کے مقامی چچاؤں، مثلاً بورجیس (Borges)، کارپنتیر (Carpentier) اور اونیتی (Onetti)، کے بارے میں بھی سوچنا پڑتا ہے، حالانکہ یہ موقف اختیار کرنے کے لیے، کہ یہ باپ نہیں بلکہ چچا تھے، ادبی تاریخ کے ایک مکمل نظریے کی ضرورت پڑے گی، کہ یہ نئے ادبوں کے لیے مواقع کی نشان دہی تو کرتے ہیں لیکن حسب نسب کا سلسلہ ان سے قائم نہیں ہوتا۔

تشیائی کے سوال

یہ "بوم" اتنا بڑا نہیں تھا کہ اسے نشاۃ الثانیہ کا نام دیا جاسکے، اور یہ ایک تحریک بھی نہیں تھا، اگر تحریک سے مراد ایک سوچے سمجھے لائحہ عمل پر مبنی ایک ادبی دبستان ہو۔ لیکن لاطینی امریکا میں اس کے نمودار ہونے کی معنویت کسی تہذیبی اُبال یا عجیب الخلفت حادثے سے کم نہیں زیادہ تھی۔ یہ اپنا شعور رکھنے والی جدت پسندی کا خود پر اصرار تھا؛ اس سے علاقائیست اور عذرخواہی کا خاتمہ ہوا؛ اور اسے، ایک اور تعریف کی رو سے، بالکل درست طور پر ایک تحریک کہا جاسکتا ہے، کیوں کہ یہ مخصوص قوتوں کے ایک مخصوص وقت پر مجتمع ہو جانے کا مظہر تھا۔ یہ مخصوص وقت ۱۹۶۰ کی دہائی کا تھا (اس "بوم" کے دور سے تعلق رکھنے والا آخری ناول شاید دونوسو کا *The Obscene Bird of Night* تھا جو ۱۹۷۰ میں شائع ہوا) اور یہ مخصوص قوتیں بنیادی طور پر ادبی بے صبری اور سیاسی نامیدی کی قوتیں تھیں۔

بے صبری کا وجود واضح ہے۔ ان ادبوں پر بدلیسی اثرات، محبوب فلموں کے پُر تخیل اور جذباتی عناصر، بورخیس، کارپتیئر اور اونیتی کی عجیب و غریب اور ذہن پر چما جانے والی انگشت، ان سب نے مل کر قصہ گوئی کی ان تکنیکوں کے لیے سرمایہ فراہم کیا جو آزمائے جانے کے استعار میں تھیں؛ طرز اور الفت کا ایک آمیزہ ایجاد کیا؛ منصوبہ بند حقیقت پسندی کے بارے میں -- فکشن میں اور اس سے باہر کی دنیا دونوں میں -- گہرے شکوک پیدا کیے۔ کارپتیئر نے لاطینی امریکی حقیقت کے عجائبات کا تذکرہ کیا، جو فریضے کے طور پر اختیار کردہ حقیقت پسندی میں لازمی طور پر غیر موجود ہوتے ہیں؛ اور مقبول عام تنقیدی اصطلاح "خادوئی حقیقت نگاری"، جو اگرچہ ابہام سے بھرپور ہے، لیکن اس کے باوجود ادبی تناظر میں ایک تغیر کی نشان دہی کرتی ہے۔ اس مقام تک آکر ہمارا سامنا قابل لحاظ فلسفیانہ اور تاریخی پیچیدگیوں سے ہوتا ہے، اس لیے شاید اتنا کمنا کافی ہو گا کہ "بوم" سے تعلق رکھنے والے ادبوں پر، گویا پہلی بار اور اچانک، یہ انکشاف ہوا کہ دنیا، ایک ساختہ شے اور بذیانی ناممکنات سے بھرپور ہونے کے باوجود، ایک حقیقی وجود رکھتی ہے؛ اور یہ کہ تخیل تقریباً ہمیشہ درست ثابت ہوتا ہے، چاہے اس کی وجہ یہ ہو کہ جو چیز آپ کے محض تخیل میں آئی ہے کوئی نہ کوئی شخص پہلے ہی اسے سرانجام دے چکا ہے، یا یہ کہ آپ کے تخیل نے کسی شخص کی ضرورت کے مطابق ایک موزوں استعارہ وضع کر لیا ہے؛ اور یہ کہ ان حالات میں فکشن تخیل کا میدان بھی ہے اور جنگ کا میدان بھی، یہی وہ مخصوص جگہ ہے جہاں کلچر کے بنیادی جھگڑے چکائے جاسکتے ہیں، اور چکائے جاتے ہوئے دیکھے جاسکتے ہیں۔ ایک اعتبار سے یہ فراوان اور کچھ کچھ مضطرب بے صبری خاصی پرانی ہے۔ وقفوں کو نظر انداز کرتے ہوئے، اور کئی پُشت چپھے جا کر، ہم ایک غیر متواتر ہسپانوی امریکی روایت کی

تشکیل کر سکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ طریقہ چھٹے کوٹ کر اس روایت کے ٹکڑے جوڑنے کا عمل ہے، لیکن روایت کی شکل متعین کرنے کا مروج طریقہ اور کون سا ہے؟ مثلاً بیروک (Baroque)، یورپ میں زوال کو پہنچ جانے کے بہت بعد تک لاطینی امریکا میں پھلتا پھولتا رہا، اور یہ عجیب حقیقت "بوم" کے تحریروں کے بعض مخصوص نقوش کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتی ہے۔ "بوم" دوسری قسم کے ناول کے پھلنے پھولنے کا موقع ثابت ہوا: وہ ناول جو ہر چیز کو بیان کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے اور خواب میں دیکھی ہوئی چیزوں کو بھی۔ یہ بیروک کا ایک جدید روپ ہے۔

اس تحریک کے ابتدائی خدوخال ہمیں بورخیس کے ہاں نظر آتے ہیں، جہاں حقیقت کی ایسا مدار نہ نقل کی بجائے اس کی منقلب شدہ صورت کا راج ہے۔ یہ بات کہ فکشن کا یہ ادراک اب خاصا مانوس لگتا ہے، بلکہ "بوم" کے لیے اس کی حیثیت ایک روزمرہ کے معمول کی سی ہے، بورخیس کے اثرات کی ہمہ گیری کی شاہد ہے۔

اوکتاویو پاز (Octavio Paz) کا کہنا ہے کہ تاریخی اعتبار سے لاطینی امریکا یورپ کی ایجاد ہے، "یورپی یونیویورسٹیوں کی تاریخ کا ایک باب"، اور یہ بات "غیر حقیقی" ہونے کے ایک آزار کن اور عجیب وغریب احساس کا مأخذ ہو سکتی ہے: یہ نہ تو جدید یورپیوں کا مابعد الطبیعیاتی یا epistemological کرب ہے، نہ شمالی امریکیوں کی، تیزی سے بدلتے ہوئے سماجی اور جغرافیائی منظر سے پیدا ہونے والی، ناراحتی ہے، بلکہ یہ تو کسی اداکار کی اُس شکن اور اسٹاٹ کی طرح کا احساس ہے، جو ایک طویل عرصے تک جاری رہنے والے ٹانگ سے پیدا ہوئی ہے، جس کے بارے میں وہ ایک قدیم اور دلی بے یقینی کا شکار ہے، یہ احساس ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ حقیقت بر گز نہیں ہو سکتی، یہ تو کسی اور کا دیکھا ہوا خواب ہے۔ یہ "کوئی اور" مختلف زمانوں میں بلاشبہ مختلف روپ اور vantage-points اختیار کرتا رہا ہے، اور آزادی کے بعد کے لاطینی امریکی اور طرح کے خوابوں میں مقیم ہیں۔ لیکن غیر حقیقی پن کا وہ احساس اب بھی برقرار ہے۔

دوسرے الفاظ میں، غیر حقیقی پن کا احساس مقامی حقیقت کا ایک حصہ ہے، جس کا بہترین بیان بیروک کی مختلف شکلوں میں ملتا ہے۔ اسی ادراک کی پُر جوش اور اکثر حیرت خیز تقسیم کے اعداد کی بے تابی ہی وہ منظر ہے جسے میں ادبی بے صبری کا نام دیتا ہوں۔

سیاسی ناامیدی کا تخمینہ لگانا البتہ اس سے زیادہ دشوار ہے۔ ایک زمانہ تھا جب "بوم" کو ۱۹۵۹ کے کیوبن انقلاب کا ادبی بازو خیال کیا جاتا تھا، اور یہ ایک ایسا خیال تھا جس میں اگر ایک سچی سچی فہم کے ریح نہ ہوتے تو اسے قطعی مہمل قرار دیا جاسکتا تھا۔ یہ تمام ادیب بائیں بازو کی

تہائی کے سوال

طرف جھکاؤ رکھتے تھے اور کیوبن انقلاب کے ابتدائی دنوں میں اس کے ہمدرد تھے۔ ان میں سے بعض نے۔۔ مثلاً گارسیا مارکیز نے، اور ۱۹۸۴ میں وفات پانے تک کورٹازار نے۔۔ ہمدردی، یا بلکہ ہمدردی سے زیادہ کارویہ جاری رکھا، اور بعض نے اس سے محتاط فاصلہ اختیار کر لیا یا اس نے خود کو بالکل علیحدہ کر لیا، مثلاً کابریرا انفانتے نے، جو اب ایک برطانوی شہری کی حیثیت سے لندن میں مقیم ہے۔ لیکن یہ سب دراصل غیر اہم معمولی واقعات ہیں اور درحقیقت اس کچی پچی فہم کا تعلق تمام لاطینی امریکیوں کے پہلے کیوبن انقلاب کی ناقابل فرار حیثیت سے ہے، خواہ اس کے بارے میں ان کا رویہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ادب اس انقلاب کا حاشیہ بردار نہیں تھا، لیکن اس کا ممکن کوئی آوردنیا تو نہیں تھی۔

اس انقلاب کی اہمیت نہ صرف ادب کے لیے بلکہ تقریباً ہر چیز کے لیے مسلم ہے، لیکن اس اہمیت کا واضح طور پر تخمینہ لگانا ناممکن ہے۔ میں صرف ایک اندازہ لگانا چاہتا ہوں، جو میرے خیال کے مطابق گارسیا مارکیز کے معاملے میں، اور مارکیز کے بارے میں میرے احساس کے حوالے سے، تو خصوصاً بر محل ہے ہی، لیکن دوسرے ادیبوں کے سلسلے میں بھی اس میں کوئی کام کی بات ہو سکتی ہے۔ میں سیاسی ناامیدی کا ذکر کر رہا ہوں، اور کیوبن انقلاب نے اس احساس کو زائل بھی کیا اور اس میں پیچیدگی بھی پیدا کی۔ اس نے اس تصور کو تبدیل کیا کہ لاطینی امریکیوں کے لیے کیا کچھ ممکن ہے، اس نے ثابت کیا کہ جو چیز ناقابل تغیر سمجھا جاتی تھی اُسے تبدیل بھی کیا جاسکتا ہے، اور عزم کے سہارے، ہر قسم کی حیران کن رکاوٹوں کو عبور کر کے کوئی بھی مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ انقلابات اپنے ابتدائی دنوں میں اسی طرح کا تاثر پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اس انقلاب کے اثرات ایک چھوٹے سے جزیرے تک محدود رہے اور بقیہ برصغیر کی حالت پہلے کی طرح رہی، بلکہ پہلے سے روز بروز بدتر ہوتی گئی۔ انقلاب کی قائم کردہ مثال مستند تھی، لیکن اس کے اثرات کھماں تک پہنچ سکتے تھے؟ ان حالات میں ناامیدی تقدیر نہیں بلکہ انتخاب کا معاملہ بن گئی۔ اسے ترک کیا جاسکتا تھا، اور بہت سوں نے کیا بھی۔ لیکن یہ ناامیدی کسی شخص کا اعتقاد متزلزل ہونے پر دوبارہ مستطرت ملتی تھی، اور اکثر اوقات حقائق اسی کی تائید کرتے تھے۔

"ہوم" کے زمانے کا زیادہ تر فکشن اسی ناامیدی سے باوقار انداز میں انکار کیے جانے، لیکن اس کے پھر بھی منڈلاتے رہنے کی پیداوار ہے۔ یہ ادبی فراوانی، بیانیہ تکنیکوں کا یہ بلند ہمت مظاہرہ ایک آزادی کی خواہش کا جشن منانے کے لیے ہے، جو اخلاقی بھی ہے، سیاسی بھی اور فنکارانہ بھی؛ لیکن ایک سوگوار حس مزاح، الم اور باوقار شکست سے مانوس ذہنی کیفیت

لاشیں شمار کرتی ہے، ایذاؤں، بظاہر لافانی حکمرانوں، فرقہ وارانہ جھڑپوں، اور آگے کے طویل راستے کا حساب کرتی ہے۔ گرامشی کے قول "عقل کی قنوطیت، غزم کی رجائیت" کی طرح، اس کیفیت کو ذہن اور دل کی رجائیت، لیکن جسم اور بدیوں کی قنوطیت، ایک غیر حقیقی اور مطلق العنان تاریخ کے ناقابلِ برداشت بوجھ کے طور پر بیان کیا جاسکتا ہے۔

وہ ادب خود شاید اس تجزیے سے اتفاق نہیں کریں گے اور غالباً ممکنات کے زیادہ مثبت خیال کے حق میں بحث کریں گے، اور میں ان کو درست سمجھتا چاہوں گا۔ لیکن ان کی تصور کردہ دنیاؤں کا استناد ان کے خلاف شہادت دیتا ہے۔ ان کے حق میں جو بہترین بات کہی جاسکتی ہے۔۔۔ مگر یہ بہت بڑی بات ہے، اور ان کی تحریروں کی طاقت کے بنیادی سرچشمے کی نشان دہی کرتی ہے۔۔۔ وہ یہ ہے کہ وہ ناامیدی کو ایک شدید آزمائش میں ڈالتے ہیں، جو ان سے پہلے کسی نے شعوری اور حقیقت پسندانہ انداز میں کبھی نہیں کیا۔ یہ ادب ناامیدی کے وجود سے انکار نہیں کرتے، نہ اس سے بغل گیر ہوتے ہیں، یہ تو اس سے پچھا چمڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ "ستہانی کے سوسال" میں ناامیدی کو پاش پاش کر دیا گیا ہے، اسے ایک واہجے، تقدیر کے ایک فریب نظر کی شکل دے دی گئی ہے۔ لیکن یہ ایک پرکشش واہجہ ہے، جبکہ پاش پاش کرنے کا عمل رازدارانہ ہے، جو آسانی سے نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ترقی پسندوں کو اس کتاب نے، اور اس کے نام سنا دقنوطی اور معدومیت پسند انداز نے ہمیشہ الجھن میں ڈالا ہے۔ یہ انداز تو ذاتی اور تاریخی اسباب کی پیداوار ہے جسے ہر صورت میں موجود ہونا ہی تھا، لیکن جس توانائی سے کتاب میں اس کی مزاحمت کی گئی ہے، حتیٰ کہ وہ مزاح اور تسخیر جس کے ذریعے اسے بیان کیا گیا ہے، بلاشبہ بڑی حد تک ناامیدی کے اس احساس کی پیچیدگی کا مرہونِ منت ہے جو کیوبا کی مثال سے پیدا ہوا۔

لیکن اس نقطہ نظر میں معاصر لاطینی امریکی ادبوں کی قومی شناخت کو نظر انداز کر کے ان پر ایک پین امیریکن ازم لاد دینے کا خدشہ موجود ہے۔ لاطینی امریکا کے لوگ متوازی تاریخ اور مشترک امیدیں اور مشترکہ آسیب رکھتے ہیں، لیکن ان کی، درجہ بہ درجہ مختلف، مقامی تاریخیں بھی ہیں۔ "ستہانی کے سوسال" اس اعتبار سے "بوم" کے زمانے کی تحریروں کا مکمل طور پر نمائندہ ہے۔ یہ اختلافات کو حذف کر کے وقت اور سیاست، موسم اور تہذیب کے ایک مشترکہ لاطینی امریکی تجربے تک رسائی پانے کی کوشش کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ اس تاثر کو حاصل کرنے

تسنائی کے سوال

میں کامیاب بھی ہوا ہے، لیکن اختلاف کو نہیں بلکہ صرف ناموں کو حذف کر کے۔ یہ تقسیم یا تجرید سے کام نہیں لیتا، یہ مسئلہ کولومبیئن حقیقتوں کو اٹھاتا ہے اور ان پر سے لیبل ہٹا دیتا ہے۔ اس سے ان حقیقتوں کے کولومبیئن ہونے میں کوئی کسر نہیں آتی، مگر اتنا ضرور ہوتا ہے کہ وہ صرف کولومبیئن نہیں رہ جاتیں۔

کولومبیا جمہوریت کی ایک طویل روایت رکھتا ہے، لیکن یہ اونچے طبقوں کی جمہوریت ہے، جو درحقیقت امرا کے چند حریف گروہوں کے درمیان مسابقت سے زیادہ کچھ نہیں۔ لبرل اور کٹروئیٹو جو پوری انیسویں صدی، اور بیسیویں صدی کے بیشتر حصے کی سیاست پر چھائے رہے، قطعی مختلف اصولوں کے علم بردار تھے: اصلاح یا رجعت پسندی، آزادی تجارت یا تحفظات، کلیسا اور ریاست کی علیحدگی یا یکجائی۔ لیکن ان دونوں گروہوں کی یکسانیت کو "تسنائی کے سوال" میں مبالغہ آمیز سمسٹر کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تاہم یہ دونوں پارٹیاں طبقاتی مفادات کے ایک تنگ دائرے کے اندر رہتے ہوئے بھی دو متضاد تناظروں کی نمائندگی کرتی تھیں، اور انہوں نے مقامی طور پر شدید وفاداریوں اور نفرتوں کو جنم دیا جنہیں، یہاں تک کہ لوگوں کے مفادات کے برخلاف بھی، سختی سے برقرار رکھا گیا، جس کے اثر سے لوگ خود کو ڈیموکریٹ اور ری پبلکن کی بجائے ("رومیو اینڈ جولیٹ" کے حریف فاندان) کیولیٹ اور مونٹیگو خیال کرنے لگے۔ ناول میں فاندان دارڈرافٹ کے کھیل سے متعلق ایک گفتگو میں اس سیاسی کیفیت پر ایک تیز اور پُر مزاح تبصرہ کیا گیا ہے۔ حوزے آرکادیو بوئندیا پادری کے ساتھ ڈرافٹ کھیلنے پر تیار نہیں، کیوں کہ وہ ایسے کسی مقابلے میں حصہ لینے پر خود کو آمادہ نہیں کر سکتا جس میں حریفوں کے درمیان اصولوں پر اتفاق رائے ہو چکا ہو۔ پادری، جس نے ڈرافٹ کے کھیل کو کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا تھا، کھیل جاری نہیں رکھ پاتا۔ یہ ایک دھیم اور معمولی سا تبصرہ ہے، لیکن اس کی وسعت قابلِ لحاظ ہے۔ اس سے یہ تاثر بھی مل سکتا ہے کہ حوزے آرکادیو بوئندیا، جسے فائرل عقل سمجھا جاتا ہے، ڈرافٹ کے کھیل کو نہیں سمجھ سکتا، کیوں کہ وہ جنگ، یا سیاست، یا جینیوا کنونشن، کو سمجھنے کے قابل نہیں: یہ ایک انتشار زدہ اور للکارنے والی تسنائی ہے۔ اس سے یہ اشارہ بھی مل سکتا ہے کہ دنیا کے زیادہ تر تنازعات کا تعلق اصولوں کے سوا ہر چیز سے ہوتا ہے: اصولوں پر یا تو اتفاق رائے ہو چکا ہوتا ہے، یا پھر وہ قطعی غیر متعلق ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اس وقت جب کرنل اور یلیانو بوئندیا پر انکشاف ہوتا ہے کہ لبرل اور کٹروئیٹو دونوں کی جنگ کا مقصد صرف اقتدار کا حصول ہے، اور وہ اس مقصد کے لیے اصولوں کے بنیادی ٹکٹ کو قربان کرنے پر تیار ہیں۔

کولومبیا کی بیشتر تاریخ دے بے پاؤں "تسنائی کے سوال" میں درآتی ہے: انیسویں صدی

میں اصلاحات پر بحثیں، ریلوے کی آمد، ہزار روزہ جنگ، امیریکن فروٹ کمپنی، سنیما، موٹر کاریں، برہمنی کھیت مزدوروں کا قتل عام، جو مارکیز کی پیدائش کے برس ہوا تھا۔ کولومبیا کی تاریخ سے ناول کے واقعات کی ان مطابقتوں نے کئی نقادوں کو یہ خیال کرنے پر آمادہ کیا ہے کہ مارکیز قطعی مخصوص طور پر ایک کولومبیئن ادیب ہے جو اپنے کرداروں کی تمام تر تاریخ پر حاوی ہے، جب کہ اس کے بہت سے ہم وطن اس سے محروم ہیں۔

لیکن کولومبیا کی جدید تاریخ کی سب سے تعجب خیز حقیقت کا، یعنی تشدد کی اس لہر کا جسے صرف "دی والکنس" (la violencia) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، "تشنائی کے سوسال" میں ہمیں ذکر نہیں۔ یہ لہر گریلوں، غنڈوں، خودمدافعتی گروپوں، پولیس اور فوج کی پیدا کردہ تھی، اور اس میں تقریباً دو لاکھ افراد مارے گئے تھے (جو اس کا کم سے کم تخمینہ ہے)۔ انیس سو باسٹھ میں، جب دعویٰ کیا گیا کہ اس کا خاتمہ ہو گیا ہے یا کم و بیش اس پر قابو پا لیا گیا ہے، تب بھی ہر ماہ دو سو افراد اس کی بھیشت چڑھتے رہے۔ تشدد کی یہ لہر کولومبیا کے لوگوں کے لیے ناقابل فرار حقیقت ہے، خواہ وہ ذاتی طور پر اس سے متاثر ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں، بالکل اسی طرح جیسے عموماً لاطینی امریکی باشندوں کے لیے کیوبن انقلاب ایک ناقابل گریز حقیقت رکھتا تھا۔ تشدد کی اس لہر نے فکشن کے ایک سیلاب کو جنم دیا، اور خود مارکیز کی تحریروں "کرئل کو کوئی خط نہیں لکھتا" اور "منسوس وقت" میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ گو کہ وہ اس کا ذکر نہایت ڈھکے چھپے انداز میں کرتا ہے، اور تاریخ کی بربریت کے ہاتھوں بے سکون محسوس ہوتا ہے، میری مراد یہ نہیں کہ وہ اس کے ہاتھوں، ہم سب کی طرح، مضطرب ہے، بلکہ یہ کہ اسے تشویش ہے کہ ہمیں اس کا فن اس کی لپیٹ میں نہ آجائے۔ اس بات کے کئی پہلو ہیں۔ گارسیا مارکیز کا اسلوب تیز رفتار اور سرسری ہے، اور اسے خمدار بیانیے میں کمال حاصل ہے۔ اس کی تحریروں میں ولن کے کردار تقریباً ناپید ہیں، کوئی صورت حال ایسی نہیں جو پیچیدگی میں انتہا کو پہنچی ہوئی نہ ہو۔ اس کے بیانیہ اسلوب کی سادگی ایک ظاہری پردہ ہے، بالکل اسی طرح جیسے چارلی چپلن کا بے ڈھنگا پن۔ اور اس کے پاس ہولناکیوں کے بیان کے لیے مزاح اور طعنے کی زبان کے سوا اور کوئی لغت نہیں۔ سب سے بڑھ کر اس کی نظر اس پر مرکوز ہے کہ لوگ، اپنے ساتھ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ، کس طرح رہتے ہیں، اور اپنی دنیا کو کس طرح دیکھتے ہیں؛ اور اگر یہ ارد گرد کی دنیا تشدد کی اس لہر کی دنیا ہے تو بلاشبہ اسے بھی اسی سرسری غامیانہ انداز میں دیکھا جاتا ہے۔ اس قسم کی دنیا میں اسی طرح رہنا ممکن ہے۔ ہولناکی ان تحریروں میں اسی غامیانہ انداز کے باعث در آتی ہے جس سے کرفیو اور لاشوں اور غیر فرو شدہ نفرتوں کا ذکر کیا گیا ہے؛ گویا یہ سب کچھ روزمرہ کا معمول ہے۔

تنبائی کے سوسال

یہ کمنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ "تنبائی کے سوسال" میں تشدد کی یہ لہر ہر ممالی مزدوروں کے قتل عام کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، جو بجائے خود بے حد پُر تشدد ہے اور بعد کے آنے والے واقعات کا خلاصہ اور ان کی پیش گوئی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ درست ہے کہ خورنئے ایلینسیر گیتان (Jorge Eliecer Gaitan) نے، جس کے قتل سے تشدد کی اس لہر کا آغاز ہوا تھا، سیاسی شہرت ۱۹۲۸ کی اس ہر ممال کی تحقیقات ہی کے باعث حاصل کی تھی۔ گویا ان دونوں واقعات میں ایک طرح کا تعلق موجود ہے۔ ایک نقاد کا خیال ہے کہ ناول کے اختتام پر آنے والی وہ آندھی جس میں ماکوندو کا قصبہ نیست و نابود ہو جاتا ہے، درحقیقت تشدد کی اس لہر ہی کا "پردہ پوش استعارہ" ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ تو آندھی اور نہ قتل عام، تشدد کی اس لہر سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔ یہ دونوں واقعات ظالمانہ لیکن ابہام سے پاک ہیں، خوفناک لیکن اسرار سے عاری ہیں؛ یہ ہلاکت خیز اور موثر ہیں، جبکہ تشدد کی لہر بے حد منتشر، سیاسی طور پر مبہم، اور ایک ٹوٹا اور بکھرا ہوا المیہ ہے؛ یہ کسی تعریف یا تمجینے، حدود یا معنویت کو روا نہیں رکھتی۔ اس کا احساس بے قابو ہو جانے والی جھڑپوں کے بے حد وسیع پھیلنے کا سا ہے۔ اور میرے خیال میں اس تشدد کی بے معنویت ہی ہے جو "تنبائی کے سوسال" پر مسلط ہے، یعنی یہ سبق نہیں کہ تاریخ سفاک ہوتی ہے، بلکہ یہ کہ تاریخ بے قابو اور وحشی بھی ہو سکتی ہے، اور یہ کہ محض انتشار بھی ممکن ہے، اور یہ کہ جب یہ ہماری سمجھ سے باہر ہو تو ہمیں اس کو سمجھنے کی اداکاری نہیں کرنی چاہیے۔

مورخوں نے بلاشبہ تشدد کی اس لہر کے اسباب کی بابت نہایت دلچسپ قیاس آرائیاں کی ہیں۔ ظاہر ہے یہ اسباب معاشی، سیاسی اور دیگر محرکات کا مرکب تھے، لیکن اگر ہم مورخ نہیں ہیں تو ان تمام محرکات پر اس طرح نظر ڈالتے ہیں جیسے شمالی آئرلینڈ کی صورت حال، یا فٹ بال میچوں میں تشدد کے واقعات پر۔ ہم بعض محرکات کو قبول کر لیتے ہیں، بعض کو غیر اہم قرار دے کر رد کر دیتے ہیں، اور بعض دوسرے محرکات کو متعلق قرار دے لیتے ہیں، بغیر یہ جانے کہ ان سب کی دل کر کیا صورت بنے گی۔ لیکن ان سب کو ملا کر بھی صورت حال کی وضاحت نہیں ہو پاتی، اور ایک ناقابل فہم مریضانہ کیفیت کا تاثر زائل نہیں ہوتا۔ تشدد کوئی غیر انسانی یا آسیبی شے نہیں ہے، نہ یہ کہیں آور سے بھیجی گئی کوئی وبا ہے، بلکہ یہ خود ہمارا مسخ شدہ چہرہ ہے، لیکن یہ چہرہ عقل کی رسانی سے باہر ہے اور ہماری جانب دیکھ کر دانت نکوستا ہے۔

"تنبائی کے سوسال" کے کردار خود بھی تاریخ کی بہت سی مختلف خواندگیوں کی نمائندگی کرتے ہیں، اگرچہ وہ خود اس نمائندگی کا دعویٰ نہیں کرتے۔ یہ خواندگیاں عموماً جابلانہ یا مغالطے پر مبنی ہوتی ہیں، اور اکثر تاریخ سے قطعی طور پر جان چھڑانے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن گارسیا مارکیز

خود تاریخ کی ان تمام خواندگیوں کی حریف، یا ان سے بالاتر، کوئی خواندگی پیش نہیں کرتا۔ اس نے اپنے ناول کی شکل ان توہمات کی شکل پر ڈھالی ہے جو اس کا حصہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ ناول نامیدی کا اظہار کرتا معلوم ہو سکتا ہے؛ اور خود مصنف اپنا اظہار محض تشکیک، صبر اور مزاح کے ذریعے کرتا ہے، اور دانائی کے سوانگ یا منافقت سے صاف انکار کر دیتا ہے۔ لیکن یہ اظہار خواہ کتنا ہی دھیمہ معلوم ہوتا ہو، بے حد قابل لحاظ ہے، اور بجائے خود ایک آزادی ہے، اور ہمیں اس انتہائی پرکشش اور بظاہر ناگزیر دیوالا کو بیک وقت جاننے اور اس پر یقین نہ کرنے کا اختیار دیتا ہے۔

مارکیز کی ابتدائی افسانوی تحریریں ان خیرہ کردینے والے اکادمکامات کے باعث یادگار ہیں، بیانیہ جن کا ساتھ نہیں دے پاتا۔ "دروازہ نہ کھولنا"، "ایک عورت کہتی ہے"، "رابداری دشوار خوابوں سے بھری ہوئی ہے۔" "نادام"، "ایک ڈاکٹر کسی اور عورت سے کہتا ہے"، "آپ کے بچے کو ایک سنگین مرض ہے: وہ مر چکا ہے۔" ان میں سے زیادہ تر تحریریں غیر معمولی، یا بمشکل تصور میں آنے والے حالات سے متعلق ہیں، مثلاً کسی ایسے شخص کی موت جو پہلے ہی مر چکا ہے، زندوں کو دیکھتی ہوئی کسی بدروح کی زندگی، آئینے میں ایک ہستی کا جداگانہ وجود، ایک مرد اور عورت کی گفتگو جو صرف خوابوں میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ان تحریروں سے ایک ایسے نوجوان ادیب کا تصور ابھرتا ہے جو ایڈگر ایلن پو کو جدید روپ میں پیش کرنے کی کوشش میں ہو، جسے شعور کی منتہی حالتوں، اور نقل مکانی اور عدم وجود کے استعاروں سے دلچسپی ہو۔

"پتوں کا طوفان" (۱۹۵۵) میں گارسیا مارکیز ماکونڈو کی دنیا کو دریافت کرنا شروع کرتا ہے، ماکونڈو، منطقہ حارہ کی بارشوں کا شکار، کیلے کے باغوں والا قصبہ جو "ستھانی کے سو سال" کا محل وقوع ہے اور جو "بڑی ماما کا جنازہ" نامی مجموعے کی کئی کہانیوں میں، کبھی اپنے نام کے ساتھ اور کبھی گمنام، نمودار ہوتا ہے۔ گارسیا مارکیز انکار کے ساتھ بالزاک اور فاکٹر کی پیروی کرتے ہوئے، کرداروں اور واقعات کی باجا تکرار سے کام لیتا ہے، اس طرح کہ کہانی کے ٹکڑے بے بے ایک متن سے دوسرے متن میں چلے جاتے ہیں۔ یہ عمل اس وقت بھی پیش آتا ہے۔۔۔ مثلاً "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا"، "شمس وقت" اور "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" میں۔۔۔ جب یہ مقام ماکونڈو نہیں بلکہ اس بے نام ملک کے اسی حصے میں واقع ایک اور قصبہ ہے، جہاں ریلوے لائن نہیں ہے، اور جہاں تک صرف دریائی کشتی سے پہنچا جاسکتا ہے۔ کرنل اور یلیانو بونڈیا نے، مثال کے طور پر، خانہ جنگی کے زمانے میں ماکونڈو واپس آتے ہوئے اس قصبے کے ایک خستہ حال ہوٹل کی بالکنی میں

ایک رات بسر کی تھی۔ کرنل، جس کے نام خط نہیں آتا، پہلے ماکوندو ہی میں رہا کرتا تھا، لیکن جب کیلے کی تجارت کا جنون (banana fever) شروع ہوا تو وہ وہاں سے کوچ کر گیا۔ مزید برآں، یہ قصبہ ماکوندو کے بعد کے زمانے کا ہے، اور اپنے مرکزی بیانیے کے اعتبار سے حالیہ تاریخ اور تشدد کی لہر کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔ ماکوندو ایک آندھی کی زد میں آ کر وقت کے کسی ایسے نقطے پر نیست و نابود ہو گیا جس کی واضح طور پر نشان دہی نہیں کی گئی، لیکن یہ ۱۹۳۰ کی دہائی سے بعد کا نہیں ہو سکتا۔ گارسیا مارکیز کا کہنا ہے کہ ماکوندو کا خاتمہ اس کی پیدائش کے سال ہوا تھا، لیکن اس بات کے درست ہونے کے لیے ہمیں ہرٹال اور قتل عام کے واقعات کو ان کے اصل تاریخی سیاق و سباق سے بہت پیچھے لے جانا پڑے گا، کیوں کہ ان واقعات کے بعد ساہسال گزرتے اور بچے بڑے ہوتے دکھائے گئے ہیں۔ بلاشبہ اس طرح کی کوئی تاریخیں ناول میں نہیں دی گئیں، اور ہمیں واقعات کے تاریخ وار سلسلے کے بارے میں زیادہ رد و قدح نہیں کرنی چاہیے جس کے اشارے اندرونی طور پر موجود نہیں ہیں۔ جو بات اہم ہے وہ یہ ہے کہ ماکوندو، دوسرے قصبے کے برعکس، نابود شہر ہے، اور اسے نابود ہوئے کچھ عرصہ گزر چکا ہے۔ ماکوندو صرف ایک یاد ہے، بلکہ یاد سے بھی کم؛ یہ افسانے کے اندر ایک افسانہ ہے۔

"کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" (۱۹۶۱) اور "سمنوس وقت" (۱۹۶۲) دونوں ناول زبان اور ادب سے متعلق گارسیا مارکیز کے برتاؤ کی حکایات پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے اول الذکر ہزار روزہ جنگ میں بچ جانے والے ایک صابر اور باوقار کرنل کے بارے میں ہے، جو اپنی اس پینشن کا بے سود انتظار کر رہا ہے جس کا بہت پہلے وعدہ کیا گیا تھا، اور اس دوران مغربی کے عالم میں اپنی بیمار بیوی کی دلیوٹی کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ان کا بیٹا تشدد کی لہر کے دوران مارا جا چکا ہے، اور خود کرنل اب تک کبھی کبھار ممنوعہ پمفلٹ تقسیم کیا کرتا ہے۔ یہ ایک پاکفایت، تیکھی، متاثر کن اور پُر مزاح کہانی ہے، جس میں درباری رکھ رکھاؤ والا کرنل گالی دینا سیکھتا ہے، اور یوں لفظوں کے تشدد پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے وہ اس طرح کی بدتہذیبیوں کے قائل خلاف رہا ہے لیکن اب خود کو لفظ "shit" (گو) کہتا ہوا پاتا ہے اس لیے کہ کسی اور لفظ سے وہ اپنا اظہار نہیں کر سکتا۔

اس ایک لمحے تک پینشن میں کرنل کو پچتر برس لگے تھے، ایک ایک لمحہ کر کے بسر کیے ہوئے اس کی زندگی کے پچتر برس۔ جواب دینے کے لمحے میں اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر پاک صاف، واضح اور ناقابلِ تسخیر محسوس کیا۔۔۔

یہ ایک پوری زندگی پر تبصرہ ہے، اور یہ تبصرہ سب کچھ کہہ دیتا ہے۔ لیکن یہ اتنا تیکھا اور مرتکز ہے

کہ اسے کھولنے کی کوشش میں اس کے معنی ضائع ہو جائیں گے، اور شاید ہمیں اس کوشش کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ نکتہ، میری رائے میں، دراصل یہی ہے کہ لفظ جملوں سے کہیں زیادہ کچھ جانتے ہیں، اور جہاں فتح پانا ناممکن ہو، وہاں ایک لفظ فتح کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

"منموس وقت" اسی قصبے کو ایک سیاسی جنگ بندی کی حالت سے گزرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ میسر المدار ہو رہا ہے، اور مزید المدار ہونے کے لیے اسے امن درکار ہے۔ "ہم ایک شائستہ قصبہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں،" وہ کہتا ہے، اور ایک غریب عورت تیکھا جواب دیتی ہے: "یہ ایک شائستہ قصبہ ہی تھا جب تک تم لوگ نہیں آئے تھے۔" میسر کا ماضی بربریت سے بھرپور ہے، لیکن قصبے کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ بہتر نہیں۔ اور جب یہ جنگ بندی، انتشار اور خول ریزی کی جانب واپسی کے اشارے کے ساتھ ختم ہوتی ہے، تو پوری آبادی "اس بات کی تصدیق ہونے پر اجتماعی فتح کے احساس سے ہمکنار ہوتی ہے جو ہر شخص کے شعور میں موجود تھی: کہ حالات تبدیل نہیں ہوئے۔" یہ احساس، بدترین توقعات سے یہ تلخ ہمکناری ہی وہ شے ہے جس میں کیوبن انقلاب نے تبدیلی پیدا کی، کم از کم بعض لوگوں کے لیے۔

وہ کیا شے ہے جو جنگ بندی کو ختم کرتی ہے؟ غالباً بیویہ دیواروں کی پوسٹروں کی وبا، افواہیں جنہیں نیلی روشنائی میں تسخیر کر راتوں رات پورے شہر کی دیواروں پر پھیلا دیا جاتا ہے۔ بدکاریوں اور بد عنوانیوں کی داستانیں۔ سب لوگ ان سے واقف معلوم ہوتے ہیں، اگرچہ اس بارے میں بات نہیں کرتے۔ یہ کسی کو حیرت زدہ نہیں کرتیں، لیکن بدنامیوں کو مشتہر ضرور کرتی ہیں، اور ہر اس شخص کو پریشان کرتی ہیں جس کے ان سے پریشان ہونے کی توقع ہو۔ ایک شخص ایک حامد شوہر کے ہاتھوں مارا جاتا ہے، قصبے کی معزز خواتین کے متواتر طعنوں سے پادری کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے، اور میسر کرفیو نافذ کر دیتا ہے۔ میسر کے گرگے غلطی سے ایک قیدی کو مار ڈالتے ہیں، گولیاں چلنی شروع ہو جاتی ہیں، قصبے کے مرد قصبہ چھوڑ چھوڑ کر جنگل میں گریلوں سے جا ملنے لگتے ہیں۔ اور اس تمام کے باوجود بیویہ پوسٹروں کا بانی اپنی یہ معمولی تباہ کن سرگرمی جاری رکھتا ہے، گویا ان تمام حالات سے اس کا کچھ تعلق ہی نہ ہو۔

شاید اس کا ان حالات سے کوئی تعلق ہے بھی نہیں، اس لیے کہ گارسیا مارکیز خود بھی اسباب کا ایک اور سلسلہ تجویز کرتا ہے۔ قصبے کا دنداں ساز خفیہ سیاسی پمفلٹ تقسیم کر رہا ہے، قیدی، جسے مار ڈالا گیا، انہی پمفلٹوں کو تقسیم کرنے پر گرفتار ہوا تھا، اور گولیاں چلنی اس لیے شروع ہوئیں کہ حجام کی دکان کے فرش میں سے بندوقیں برآمد ہوئی تھیں۔ سیاست یا افواہ طرازی؟ ممکن ہے مصنف یہاں اپنے موضوع کے بارے میں ہچکچاہٹ میں مبتلا ہو، اسے یقین نہ ہو کہ اسے کون سا

تنہائی کے سوال

رخ دے، لیکن ہجو یہ پوسٹروں اور پمفلٹوں کا قریبی تعلق خاصا واضح لگتا ہے، اور ان دونوں کے افسانہ طرازی کے فن سے تعلق کو نظر انداز کرنا بھی آسان نہیں۔

تعلق تعمیل کی قوت کی طرف اشارہ نہیں کرتا، جیسا کہ ماریو برگس یوسا نے "منحوس وقت" کے بارے میں کہا ہے، بلکہ اس سے فتنہ انگیزی کی قوت کا اشارہ ملتا ہے۔ اگر معاصر ادب، ادب عالیہ کے بجائے افواہ طرازی اور پروپیگنڈا سے زیادہ قریب ہو تو؟ باؤزن اور محفوظ ہونے کی بجائے بے وزن اور خطرناک ہو تو؟ تب شاید ڈے دارانہ ادب ہمیں اپنے خطروں کو پہچاننے کی تربیت دے سکے۔

وٹگنشتین (Wittgenstein) نے ایک بار کہا تھا کہ اس کے لیے ایک ایسی فلسفیانہ تحریر کا تصور کرنا ممکن ہے جو تمام کی تمام لطیفوں پر مشتمل ہو۔ میرا خیال ہے کہ بہت سے لطیفے اگر فلسفے پر مبنی نہ بھی ہوں تو اس سے نہایت قریبی تعلق ضرور رکھتے ہیں۔ لطیفہ اس شے کی عین ضد ہے جسے ہم سنجیدگی خیال کرتے ہیں، اور میں انہیں ان کے مقام سے ہٹا کر دیاندار شہریوں کے رتبے پر فائز کرنے کی خواہش نہیں رکھتا۔ لیکن میں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ لطیفوں کا سنجیدگی سے ایک نہایت دلچسپ تعلق ہوتا ہے، جو صرف تضاد کا تعلق نہیں ہے۔ یعنی یہ کہ وہ ہلکے پھلکے، ٹیڑھے میسرے یا احمقانہ انداز سے اُن موضوعات کو بھڑکتے ہیں جن کی ہمارے نزدیک بہت اہمیت ہے۔ اور یہ کہ معاصر کشن۔۔۔ خواہ ہم بیکٹ، بورخیس، کلوینو، کیٹو (Queneau)، گراس، رشدی، فلپ روتھ، گارسیا مارکیز یا کتنے ہی دوسرے ادیبوں کی تحریروں کا تصور کریں۔۔۔ تمام کا تمام اس اعتبار سے لطیفوں سے بھرا پڑا ہے۔ تنقید کو ابھی تک اس انداز تحریر کے لیے مناسب زبان میسر نہیں آسکی ہے، اور وہ مسلسل معاصر ادیبوں کو ان سے پیشتر گئے ادیبوں کی پیروی، یا ان کا رد کرنے والوں کے طور پر دیکھنے میں مشغول ہے، گویا یہ ادیب صرف ان معیارات پر پورا اتر کر، یا ان کی مخالفت کر کے ہی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں جو ہمارے پاس تھوک کے حساب سے موجود ہیں۔

گارسیا مارکیز کسی وضاحت کا محتاج نہیں، وہ ان ادیبوں میں سے ہے جن تک رسائی نہایت آسان ہے، اور میں نے "تنہائی کے سوال" میں کسی طرح کے مدفون، پوشیدہ معانی کی کوئی جستجو نہیں کی۔ مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں تھی، اس لیے کہ کتاب کے سطحی معانی ہی اس قدر فراوان اور متنوع اور بحث کو ہمیر دینے والے ہیں۔ بلاشبہ مارکیز کا اس قدر رسائی میں ہونا ہی دراصل انتہائی غیر معمولی خصوصیت ہے، کیوں کہ یہ ایک ہسپیدہ ورژن کے نہایت سادہ اظہار پر مشتمل ہے، جو سادہ لوحی سے، یا ہسپیدگی کو کم یا زائل کرنے سے، ایک قطعی مختلف کارنامہ ہے۔ میں اسے قرین

قیاس یا مناسب بات نہیں سمجھتا کہ کوئی ادیب ان تمام یا اکثر معانی سے باخبر ہو جو کوئی پڑھنے والا اس کی تحریر میں دریافت کر سکتا ہے، گو کہ "باخبر" بجائے خود ایک بحث طلب اصطلاح ہے۔ عملی طور پر ادیب وہ سب کچھ جانتے ہیں جو تنقید نگار جاننے کا دعویٰ رکھتے ہیں، بلکہ اس سے کہیں زیادہ۔ لیکن عموماً وہ اس کا اظہار تنقیدی الفاظ میں، بلکہ کسی بھی قسم کے الفاظ میں، نہیں کرتے، یا پھر وہ اس کا اظہار مصنوعی طور پر رنج یا متروک الفاظ میں کرتے ہیں، ایک ایسے پیشے کی اصطلاحات میں جو ان کا پیشہ نہیں ہے۔ اس خطے میں بہروں کے درمیان بہت سے مکالمے ہوئے ہیں۔ ہنری جیمز کے بیو وریکر (Hugh Vereker) نے امتیازی طور پر نقادوں کو اپنے قالمین میں کوئی شبہ تلاش کرنے کی دعوت دی، یا بلکہ یہ خیال کرنے کی کہ کوئی شبہ ہے جو، اور کسی کو بھی نہیں، نقاد کو نظر آ سکتی ہے۔ میں نے "تنبہائی کے سو سال" کے اڑتے ہوئے قالمین میں کوئی شبہ تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی، لیکن اس میں فتنہ انگیزی کی نمایاں ترین بُنت کو جاننے کی کوشش ضرور کی ہے۔



"امروڈ کی مہک" کے عنوان سے آئندہ صفحات میں پیش کیے جانے والے متن کو مارکیز کے اپنے دوست پلینیو اپولیسیو جندوزا کے ساتھ اُس طویل مکالمے کے اقتباسات سے ترتیب دیا گیا ہے جو ۱۹۸۳ میں *The Fragrance of Guava* کے نام سے کتاب کی صورت میں شائع ہوا۔ اپنی زندگی، فن اور دوسرے موضوعات پر مارکیز کے خیالات کی وضاحت کے علاوہ اس گفتگو سے قصہ گوئی کے ہنر پر مارکیز کی مکمل قدرت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

گا برینٹل گارسیا مارکیز

ترجمہ: اجمل جمال

امروڈ کی مہک

میری سب سے دیر پا اور واضح یاد لوگوں کی نہیں بلکہ اراکاتاکا کے اُس مکان کی ہے جہاں میں اپنے نانا تانی کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ یہ بار بار لوٹ کر آنے والا ایک خواب ہے جو اب بھی خود کو دوہراتا رہتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اپنی زندگی کے ہر روز، میں یہ حقیقی یا فرضی احساس لے کر بیدار ہوتا ہوں کہ میں نے اس وسیع و عریض قدیم مکان میں ہونے کا خواب دیکھا ہے۔ یہ نہیں کہ میں اس مکان میں لوٹ کر گیا ہوں، بلکہ یہ کہ میں وہیں ہوں؛ خواب میں میری کوئی مخصوص عمر نہیں ہوتی، نہ وہاں موجودگی کا کوئی خاص سبب ہوتا ہے، گویا میں کبھی اس مکان سے رخصت ہی نہیں ہوا۔ اب بھی میرے خوابوں میں رات کی پیش آگئی کا وہ احساس برقرار ہے جو میرے پورے بچپن کے زمانے پر طاری رہا۔ یہ سرکش اور بے قابو احساس ہر شام کے آغاز پر شروع ہو جاتا، اور میری نیند کے دوران اس وقت تک مجھے اذیت پہنچاتا رہتا جب تک میں دروازے کی درزوں میں سے صبح کو نمودار ہوتے نہ دیکھ لیتا۔ میں اسے واضح طور پر بیان نہیں کر سکتا، لیکن میرا خیال ہے کہ پیش آگئی کے اس احساس کی جڑیں اس حقیقت میں تھیں کہ رات کے وقت میری نانی کے تمام تصوراتی کردار، آئندہ پیش آنے والے واقعات اور پرانی یادیں مجھم ہو جایا

کرتی تھیں۔ ان سے میرا رشتہ اسی قسم کا تھا، جو ایک غیر مرنی تار کے ذریعے ہم دونوں کو ماورائے فطرت دنیا سے رابطے میں رکھتا۔ دن کے وقت میری نانی کی طلسمی دنیا مجھے مسور رکھتی، میں اس میں کھویا رہتا، یہ میری دنیا تھی۔ اب بھی جب میں دنیا کے کسی کونے میں، کسی غیر مانوس ہوٹل میں اکیلا سوتا ہوں، تو اکثر اضطراب سے میری آنکھ کھل جاتی ہے، اور میں اندھیرے میں تنہائی کے ہاتھوں دہشت زدہ ہو جاتا ہوں، اور پھر مجھے سکون پانے اور نیند میں لوٹ جانے میں کئی منٹ لگ جاتے ہیں۔ دوسری جانب میرے نانا تھے، جو میری نانی کی غیر یقینی دنیا میں مکمل تحفظ کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان کی موجودگی میں میرے تمام اندیشے ہوا ہو جاتے۔ مجھے لگتا کہ میرے قدم مضبوطی سے زمین پر جڑے ہوئے ہیں، اور میں دوبارہ حقیقت کی دنیا میں ہوں۔ عجیب بات یہ تھی کہ میں اپنے نانا کی طرح حقیقت پسند، دلیر اور محفوظ بننا چاہتا تھا، لیکن اپنی نانی کے علاقے میں جمانے کی مستقل ترغیب کی مزاحمت بھی نہ کر پاتا تھا۔

کرنل کولاس رکاردو مارکیز میما۔۔۔ یہ میرے نانا کا پورا نام تھا۔ وہ ایک ایسی ہستی ہیں جس سے میرا تعلق زندگی میں سب سے بہتر رہا ہے اور جس کے ساتھ میری ہم آہنگی مشکل رہی ہے۔ لیکن تقریباً پچاس سال بعد پچھے مڑ کر دیکھنے پر مجھے خیال آتا ہے کہ انہیں اس کا احساس غالباً کبھی نہیں ہوا۔ میں نہیں جانتا کیوں، لیکن یہ خیال، جس سے میں پہلی بار اپنے لوکپن میں دوچار ہوا، میرے لیے ہمیشہ پریشان کن رہا ہے۔ یہ بہت بے تاب کر دینے والا خیال ہے، گویا آپ اس اذیت ناک بے یقینی کے عالم میں رہنے پر مجبور ہوں جسے دور ہو جانا چاہیے تھا، لیکن جواب کبھی دور نہیں ہو سکتی، کیوں کہ میرے نانا کا استیصال اُس وقت ہو گیا تھا جب میری عمر آٹھ سال تھی۔ میں نے انہیں مرتے ہوئے نہیں دیکھا، کیوں کہ اس وقت میں اراکاتا کا سارے دور ایک اور قصبے میں تھا؛ مجھے ان کے استیصال کی خبر تک براہ راست نہیں دی گئی، مگر میں جس گھر میں مقیم تھا وہاں کے لوگوں کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگا لیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس خبر نے مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں کیا تھا؛ اس کے باوجود، بڑے ہو جانے کے بعد جب بھی میرے ساتھ کوئی واقعہ پیش آتا ہے، خصوصاً جب وہ کوئی خوش گوار واقعہ ہو، تو مجھے اپنی خوشی کے مکمل ہونے میں جس واحد شے کی کمی محسوس ہوتی ہے وہ میرے نانا کی موجودگی ہے۔ اس طرح میری بلوغت کی تمام زندگی کے خوش گوار لمحات بے اطمینانی کے اس جرثومے کے ہاتھوں متاثر ہوتے رہے ہیں، اور ہمیشہ ہوتے رہیں گے۔

(میری تحریروں میں) وہ واحد کردار جو میرے نانا سے مشابہت رکھتا ہے، "پتول کا طوفان" کا بے نام کرنل ہے۔ درحقیقت یہ کردار ان کی اندرونی شخصیت اور ظاہری روپ کی

بے حد تفصیل سے بتائی گئی تصویر ہے، مگر ہر حال یہ ایک موضوعی رد عمل ہے کیوں کہ کرئل کو اول میں ہمیں بھی تفصیل سے بیان نہیں کیا گیا، اور پڑھنے والے کے ذہن میں اس کا تصور البتہ میرے تصور سے مختلف ہوگا۔ میرے نانا کی ایک آنکھ ایسے واقعے میں متاثر ہو گئی تھی جسے اول میں شامل کرنا مجھے ضرورت سے زیادہ ڈرامائی محسوس ہوا: وہ اپنے دفتر کی کھڑکی سے ایک خوب صورت سفید گھوڑے کو دیکھ رہے تھے کہ انھیں اپنا ننگ اپنی بانیں آنکھ میں کسی چیز کا صاس ہوا: انھوں نے اسے اپنے ہاتھ سے ڈھانپ لیا اور کسی درد کے بغیر اپنی بیٹائی کھو بیٹھے۔ مجھے یہ واقعہ خود یاد نہیں، لیکن میں نے اپنے بچپن میں اس کی تکرار اکثر سنی تھی، اور میری ثانی خرم میں ہمیشہ کہا کرتی تھیں: "ان کے ہاتھ میں آنسوؤں کے سوا کچھ نہ رہ گیا۔" ان کے اس جہانی قص نے کرئل کے کردار میں ایک مختلف شکل اختیار کی ہے: وہ ایک ٹانگ سے لنگڑا ہے۔ میں نے اپنے ناول میں یہ بات بیان نہیں کی مگر میرے ذہن میں ہمیشہ رہا کہ اس کا لنگڑاپن ایک جنگ میں زخمی ہونے کا نتیجہ ہے۔ نانا نے اس صدی کے اوائل میں کولومبیا میں ہونے والی ہزار روزہ جنگ میں لبرل پارٹی کی انقلابی فوج کی جانب سے لڑتے ہوئے کرئل کا عمدہ حاصل لیا تھا۔ میرے ذہن میں ان کی سب سے واضح یاد اسی سے متعلق ہے۔ ان کے استقال سے کچھ رخصہ پہلے ایک ڈاکٹر بستر میں ان کا معائنہ کر رہا تھا (مجھے یاد نہیں کہ اس کا سبب کیا تھا) کہ اس نے میرے نانا کے جسم پر ناف کے پاس ایک پرانے زخم کا نشان دریافت کیا۔ "یہ گولی کا نشان ہے،" نانا نے کہا۔ انھوں نے اکثر مجھ سے خانہ جنگی کے زمانے کی باتیں کی تھیں، اور خنیں کی وجہ سے مجھ میں اس تاریخی زمانے سے وہ دل چسپی پیدا ہوئی جو میری تمام کتابوں میں جھلکتی ہے، لیکن انھوں نے مجھے کبھی نہیں بتایا تھا کہ یہ نشان گولی کے زخم کا ہے۔ جب انھوں نے ڈاکٹر کو اس راز میں شریک کیا تو یہ میرے لیے دیومالائی دلیری کے ایک واقعے کا انکشاف تھا۔

("سنہائی کے سوسال" میں) کرئل اور یلیانو بوئندیا کا کردار میرے ذہن میں نانا کے تصور کے قطعی برعکس ہے۔ نانا بجاری بھر کم تھے، ان کی رنگت سُرخ مائل تھی اور ان جیسا کھانے کا شائق میں نے پوری زندگی میں کوئی اور نہیں دیکھا۔ ان کی جنسی اشتہا بھی اسی درجے کی تھی، جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ کرئل اور یلیانو بوئندیا، اس کے برخلاف، اپنے چہرے جسم کے باعث جنرل رافیل اریبے اریبے سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے، اور اسی کی طرح جُرسی پر مائل ہے۔ بے شک، میں نے جنرل اریبے کو کبھی دیکھا نہیں، لیکن ثانی نے مجھے بتایا تھا کہ، میری پیدائش سے پہلے، وہ اراکاتاکا سے گزرا تھا اور اس نے نانا کے دفتر میں، ان کے اور

خانہ جنگی کے دیگر پرانے سورماؤں کے ساتھ بیئر کے چند گلاس نوش کیے تھے۔ تانی کے بیارے بننے والی اس کی تصویر "پتوں کا طوفان" میں ایدیلیداک زبانی بیان کی ہوئی فرانسیسی ڈاکٹر کا تفصیل سے مطابقت رکھتی ہے: وہ کہتی ہے کہ پہلی بار دیکھنے پر وہ اسے ایک فوجی معلوم ہوا بہت اندر کہیں مجھے علم ہے کہ وہ اسے جنرل اریبے ارپے سمجھی تھی۔

اپنی ماں کے ساتھ میرے تعلق کا سب سے واضح پہلو کم عمری کے زمانے ہی سے اس تعلق کی سنجیدگی رہی ہے۔ یہ شاید میری زندگی کا سب سے سنجیدہ رشتہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی ایسی بات نہیں جو ہم ایک دوسرے کو نہ بتا سکیں، اور کوئی موضوع ایسا نہیں جس پر ہم دونوں گفتگو نہ کر سکیں، لیکن ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ ہمیشہ قربت سے زیادہ ایک خاص تقریباً پیشہ ورانہ رسمی انداز کا برتاؤ کیا ہے۔ اس کی وضاحت کرنا مشکل ہے، لیکن یہ ہے ایسا ہی شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے جب نانا کے استقال کے بعد اپنے والدین کے ساتھ رہنا شروع کیا تو میں اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ اپنے طور پر سوچ سکوں۔ میری ماں کے نزدیک اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ ان کے متعدد بچوں میں (جو سب کے سب مجھ سے چھوٹے تھے) ایک بچے کا اضافہ۔ گیا تھا جس سے وہ واقعتاً بات چیت کر سکتی تھیں اور جو گھر کے کام کاج میں ان کی مدد کر سکتا تھا۔ ان کی زندگی دشوار اور بے ثمر تھی، جس میں کبھی کبھی شدید منطی کے دور آتے تھے۔ پچہم دونوں کو ایک ہی چھت کے نیچے رہنے کا طویل عرصے تک موقع نہ ملا، کیوں کہ چند سال بعد جب میری عمر بارہ برس کی ہوئی، میں تعلیم کے لیے پہلے بار نکلا اور پھر رپا کیرا چلا گیا۔ تب سے لے کر ان سے میری بہت مختصر ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں، اُس وقت اسکول کی چٹھیوں میں، اور اب جب کبھی میرا کارتا حیاتا جانا ہو، جو سال میں ایک بار سے زیادہ نہیں ہوتا اور وہ بھی محض چہرہ بشتوں کے لیے۔ ان اسباب سے ہمارا تعلق ذرا دور دراز کا ہو گیا ہے۔ اس سے ایک ایسا ضبط اوٹھرا و پیدا ہو گیا ہے جو ہمیں سنجیدگی اختیار کرنے پر مائل کرتا ہے۔ تاہم پچھلے بارہ سال سے جب سے میں اس لائق ہوا ہوں، میں نے ہر اتوار کو ایک مخصوص وقت پر، خواہ میں دنیا کے کسی بھی کونے میں ہوں، اُن کو ٹیلیفون کرنے کی عادت اختیار کر لی ہے۔ اگر کسی شاذ و نادر موقع پر میں ایسا نہ کر پاؤں تو اس کی وجہ صرف تکنیکی مسائل ہوتے ہیں۔ یہ بات نہیں کہ میں بھاروت کے مطابق کوئی اچھا بیٹا ہوں، میں ایسا ہی ہوں جیسا کوئی اور: یہ میں اس لیے کرتا ہوں کہ میرے خیال میں اتوار کو باقاعدگی سے ٹیلیفون پر یہ گفتگو ہمارے تعلق کی سنجیدگی کا ایک حصہ ہے۔

میرے تمام پڑھنے والوں میں میری ماں واحد ہستی ہیں جنہیں وہ وجدان اور، بلاشبہ، و معلومات میسر ہیں جن کی مدد سے وہ میری کتابوں کے کرداروں کے عقب میں پوشیدہ حقیقتوں

راد کو پہچان سکیں۔ یہ آسان بات نہیں ہے، کیوں کہ میرے تقریباً تمام کردار ایک قسم کا جگ مار پزل ہیں جو کئی حقیقی افراد کی، اور ظاہر ہے کہ میری اپنی، شخصیت کے اجزائے مل کر بنتے ہیں۔ اس باب میں میری ماں کی خصوصی صلاحیت آثار قدیمہ کے ماہر کی سی ہے جو زمین سے رآمد ہونے والی چند ہڈیوں کی مدد سے ماقبل تاریخ کی کسی مخلوق کو دوبارہ تخلیق کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ میری کتابیں پڑھتے ہوئے وہ جلتی طور پر ان تمام اجزا کو جو میرا اضافہ ہوتے ہیں، الگ کر کے اس بنیادی فرد کو پہچان لیتی ہیں جس کے گرد میں نے اپنا کردار تعمیر کیا ہوتا ہے۔ کبھی بھی پڑھتے ہوئے ان کے منہ سے اپنا نکل نکلتا ہے، "اے میرا دینی باپ! دیکھو بے چارے کا یا حشر ہو گیا!" میں انہیں بتاتا ہوں کہ ان کا خیال درست نہیں ہے، اور اس کردار کا ان کے دینی باپ سے کوئی تعلق نہیں، لیکن یہ بات میں محض کہنے کی خاطر کہتا ہوں، ورنہ وہ جانتی ہیں کہ میں جانتا ہوں کہ وہ جانتی ہیں۔

"ایک پیش گفتہ موت کی روداد" سے پہلے کی کسی کتاب میں کوئی نوانی کردار میری ماں سے مشابہت نہیں رکھتا۔ "تہائی کے سو سال" کی ارسلا اگواران کے کردار میں ان کے چند ایک خدوخال موجود ہیں، لیکن اس میں میری جان پہچان کی آور بہت سی عورتوں کی بہت سی خصوصیات بھی ہیں۔ درحقیقت ارسلا میرے لیے مثالی عورت کی حیثیت رکھتی ہے، اس اعتبار سے کہ اس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جن پر، میرے خیال میں، ایک عورت مشتمل ہوتی ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے، یعنی جوں جوں میری ماں زیادہ مر سیدہ ہوتی جا رہی ہیں، اُس ہمہ گیر تصور کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہیں جو میرے ذہن میں ارسلا، بابت موجود ہے، اور ان کی شخصیت کی نشوونما اسی سمت میں ہو رہی ہے۔

اس طرح "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" میں ان کا غمور ایک لحاظ سے ارسلا کے کردار کی لڑاں محسوس ہو سکتا ہے، لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ وہ مجھے جیسی نظر آتی ہیں، یہ کردار اس کا ایک سچی تصویر ہے، اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اس کردار کا نام بھی ان کے نام پر رکھا ہے۔ باب انھوں نے دیکھا کہ میں نے اسے ان کا ثانوی نام، ساتیاگا، دیا ہے تو انھوں نے بس اتنا بصرہ کیا: "اوہ میرے خدا! ساری عمر میں اپنے اس بد صورت نام کو چھپانے کی کوشش کرتی رہی ہیں، اور اب یہ ہر زبان میں مستقل ہو کر پوری دنیا میں پھیل جائے گا۔"

جب میں تینتیس سال کا ہوا تو اپنا نکل مجھے احساس ہوا کہ میرے والد کی عمر اتنی ہی رہی ہو گی جب میں نے انھیں پہلی بار اپنے نانا نانی کے گھر میں آتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے، کیوں کہ اُس روز ان کی سالگرہ تھی، اور کسی نے کہا تھا کہ "آج تم یسوع کی عمر کے ہو

گئے ہو۔" وہ ایک دبلے پتلے، گہری رنگت والے آدمی تھے، بڑے سنج اور دوستانہ انداز کے مالک وہ سفید رنگ کے ڈرل سوٹ اور تنکوں کے بنے بیٹ میں ملبوس تھے۔ انیس سو تیس کی دہائی کے ایک بے عیب معزز کریئسمین شخص کی مثال۔ مزے کی بات یہ کہ اب بھی، جبکہ ان کی عمر اسی سال ہے اور وہ ہر لحاظ سے پوری طرح صحت مند ہیں، میرے ذہن میں ان کا تصور اسی موقع کا ہے جب میں نے انہیں پہلی بار نانائانی کے گھر میں دیکھا تھا۔ کچھ عرصے پہلے انہوں نے ایک دوست کو بتایا کہ میں غالباً ایک خود کو ایک ایسا چوڑے سمجھتا ہوں جو مرغی کی مدد کے بغیر پیدا ہو گیا ہے۔ یہ بات انہوں نے خوش دلی سے کہی تھی اور اس میں حس مزاح کی جھلک بھی تھی، لیکن یہ دراصل مجھے ایک نرم تنبیہ کرنے کے لیے تھا، کہ میں ہمیشہ اپنی ماں سے تعلق کے بارے میں باتیں کرتا رہتا ہوں جب کہ ان کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ ان کا خیال درست ہے۔ لیکن اس وجہ یہ ہے کہ میں انہیں نہیں جانتا، یا کم از کم ان سے اُس حد تک واقف نہیں جتنا اپنی ماں سے واقف ہوں۔ یہ کہیں اب جا کر ہوا ہے جب ہم تقریباً ہم عمر ہو چکے ہیں، (یہ بات میر نے کبھی کبھار ان سے کہی بھی ہے) کہ ہم ایک دوسرے کو خاموشی کے ساتھ سمجھنے لگے ہیں۔ میرا خیال ہے میں اس کی وضاحت کر سکتا ہوں۔ جب آٹھ برس کی عمر میں میں اپنے والدین کے ساتھ رہنے کے لیے گیا، اس وقت مجھے باپ کا ایک سنایت ٹھوس تصور نانائی کی شکل میں مل چڑھا۔ میرے والد نہ صرف میرے نانائے سے بہت مختلف تھے بلکہ وہ ان سے بالکل متضاد تھے۔ ان کی شخصیت، اقتدار کے بارے میں ان کا تصور، دنیا کے بارے میں ان کا نقطہ نظر، اور اپنی اولاد سے ان کا تعلق، سب کچھ نانائے سے انتہائی مختلف تھا۔ بہت ممکن ہے کہ اس اچانک تبدیلی نے اُس عمر میں مجھ پر گہرا اثر کیا ہو، کیوں کہ لڑکپن کی عمر تک میں والد سے اپنے تعلق کو بہت دُشوار پاتا تھا۔ یہ بڑی حد تک میرا اپنا تصور تھا۔ میں کبھی ان سے بڑا و کا درست طریقہ دریافت نہ کر سکا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ انہیں کس طرح خوش کروں، اور ان کی سخت گیری کو ہمدردی کا فقدان سمجھتا رہا۔ اس تمام کے باوجود، میرا خیال ہے ہمارے تعلقات ٹھیک رہے، اس لیے کہ ہمارے درمیان کبھی کوئی سنگین تنازعہ نہیں ہوا۔

دوسری جانب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ادب سے میرا شغف بڑی حد تک انہیں کی وجہ سے ہوا۔ نوجوانی میں وہ نظمیں لکھا کرتے تھے جو ہمیشہ خفیہ نہیں رہتی تھیں، اور جب وہ ارا کا تا کہ میں ٹیلیگراف آپرٹر تھے، وہ سنایت عمدہ واکمن بجایا کرتے تھے۔ انہیں ادب سے ہمیشہ محبت رہی ہے اور وہ ایک پُر شوق قاری ہیں۔ ان کے گھر پہنچ کر ہمیں یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ وہ کہاں ہیں، کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ اپنی خواب گاہ میں مطالعے میں مصروف

ہوں گے۔ اس دیوانے مکان میں وہ واحد سکون کی جگہ ہے۔ وہاں کسی کو پتا نہیں ہوتا کہ دسترخوان پر کتنے لوگ موجود ہوں گے، کیوں کہ بیٹے بیٹیوں، پوتے پوتیلیں اور بھتیجے بھتیجیوں کی ایک پوری آبادی ہے جو اپنے اپنے شغل میں منہمک، دن رات گھر میں آتی جاتی رہتی ہے۔ میرے والد کے مطالعے میں ہر وہ چیز شامل ہوتی ہے جو ان کے ہاتھ آجائے: ادب عالیہ، تمام اخبار اور رسالے، اشتہاری اطلاعات، ریفر۔ بزم۔ ٹر کے میسول، کوئی بھی چیز۔ میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو ان سے بڑھ کر پڑھنے کا شوقین ہو۔ باقی معاملات یہ ہیں کہ انھوں نے کبھی الکحل کا ایک قطرہ نہیں چمکا، کبھی ایک سگریٹ تک نہیں پیا، لیکن ان کی سولہ جائز اولادیں ہیں، اور ان کے علاوہ خدا جانے کتنی اور۔ اور اب بھی وہ میری جان پہچان کے لوگوں میں سب سے قوی الجشہ اور خوش وضع اسی سالہ شخص ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر نہیں لگتا کہ ان کے روز و شب میں کسی تبدیلی کے آنے کا کوئی امکان ہے۔

مرسیدس سے میری ملاقات سیوکے میں ہوئی تھی جو کہ بیسن کے ساحل سے ذرا سا اندر کی طرف واقع ایک قصبہ ہے۔ وہاں ہمارے گھرانوں نے کئی سال گزارے تھے، اور ہم اپنی اپنی چھٹیاں گزارنے وہاں جایا کرتے تھے۔ اس کے والد اور میرے والد بچپن کے دوست تھے۔ ایک روز، جب اس کی عمر صرف تیرہ سال تھی، طلباء کے ایک رقص کے موقع پر میں نے اس سے شادی کی درخواست کر ڈالی۔ اب چھٹھے ٹرکڑ دیکھنے پر مجھے خیال آتا ہے کہ شادی کی یہ درخواست اس تمام کھکھڑے بچنے کی ایک استعاراتی کوشش تھی جو اس زمانے میں کسی لڑکی کو دوست بنانے کے سلسلے میں اٹھانی پڑتی تھی۔ اس نے بھی اس بات کو اسی انداز میں سمجھا ہوگا، کیوں کہ ہم ایک دوسرے سے کبھی کبھی، اور محض سرسری طور پر، ملتے تھے، لیکن میرا خیال ہے کہ ہم دونوں میں سے کسی کو بھی اس بات پر شبہ نہیں تھا کہ یہ استعارہ ایک نہ ایک روز حقیقت بن جائے گا۔ اس نے افسانے کے کوئی دس برس بعد حقیقت کی شکل اختیار کی، لیکن ہماری کبھی باقاعدہ منگنی نہیں ہوئی۔ ہم محض دو افراد تھے، جو بغیر کسی عجلت یا سببان کے، اس ناگزیر واقعے کا استعارہ کر رہے تھے۔ ہم اپنی شادی کی چھبیسویں سالگرہ جلد ہی منانے والے ہیں، اور اس عرصے میں ہمارا کبھی کوئی سنگین نوعیت کا جھگڑا نہیں ہوا۔ میرے خیال میں اس کا راز یہ ہے کہ ہم اب بھی چیزوں کو اسی انداز میں دیکھتے ہیں جس انداز میں شادی سے قبل کے زمانے میں دیکھتے تھے۔ شادی، خود زندگی کی طرح، اس قدر ناقابل یقین طور پر دشوار ہے کہ آپ کو ہر روز نئے سرے سے آغاز کرنا پڑتا ہے، اور ایسا ساری عمر کرتے رہنا پڑتا ہے۔ یہ ایک مسلسل، اور اکثر تھکا دینے والی، جنگ ہے، لیکن آخر کار قابل قدر ہے۔ میرے ایک ناول کے ایک کردار نے

اے زیادہ مناسب الفاظ میں بیان کیا ہے: "محبت ایک ایسی چیز ہے جسے سیکھا جاتا ہے۔" میرے ناولوں کا کوئی کردار مریدس سے مشابہ نہیں۔ وہ "تہائی کے سوسال" میں دو بار نمودار ہوتی ہے، اپنے ہی روپ میں، اپنے ہی نام کے ساتھ، مگر اس کی شناخت ایک کیمیادان کی ہے۔ اسی طرح "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" میں بھی وہ بار داخل ہوتی ہے۔ میں اس کا اس سے زیادہ ادبی استعمال اس وجہ سے نہیں کر سکا جو بظاہر خیالی معلوم ہوگی لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے: میں اسے اتنی اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے ذرا اندازہ نہیں کہ وہ کیسی ہے۔

میرے چند دوست راستے میں بچھڑ چکے ہیں، لیکن ان میں سے جو میرے لیے سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں وہ تمام نشیب و فراز کے بعد بھی میرے ساتھ رابطے میں ہیں۔ اور یہ اتفاق کی بات نہیں ہے، بلکہ تمام زندگی، ہر قسم کے حالات میں، میں نے اپنی دوستیوں کو بڑی احتیاط سے قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ میں اپنے بہت سے انٹرویوز میں کہہ چکا ہوں، یہ میری شخصیت کا حصہ ہے۔ میں نے کبھی اس بات کو فراموش نہیں کیا کہ، اپنے اندر، میں اراکا تاکا کے ایک ٹیلیگراف آپریٹر کی سولہ اولادوں میں سے ایک ہوں، اور ہمیشہ سی رہوں گا۔ پندرہ سال پہلے، جب شہرت مجھ پر کسی خواہش یا توقع کے بغیر نازل ہوئی، تب سے میرا دشوار ترین کام اپنی نجی زندگی کی حفاظت کرنا رہا ہے۔ اگرچہ اب یہ پہلے سے زیادہ محدود اور زیادہ محدود ہو گئی ہے، لیکن میں نے اس میں اس شے کے لیے مناسب گنجائش رکھی ہے جس کی میں دنیا میں سب سے زیادہ قدر کرتا ہوں: اپنے بچوں اور دوستوں کی محبت۔ میں بے تحاشا سفر کرتا ہوں، اور میرے سفر کرنے کا بنیادی مقصد اپنے پرانے دوستوں سے ملاقات کرنا ہوتا ہے۔ یہ دوست تعداد میں بہت زیادہ نہیں ہیں، لیکن صرف انہیں کی صحبت میں میں اپنے آپ میں رہ سکتا ہوں۔ ہم ہمیشہ چھوٹے چھوٹے گروپوں کی شکل میں ملتے ہیں، جو ترجیحاً چھ یا، اس سے بھی بہتر صورت میں، چار افراد پر مشتمل ہوں۔ بہترین صورت یہ ہوتی ہے کہ اس نشست کے لیے دوستوں کا انتخاب میں نے خود کیا ہو، کیوں کہ مجھے اس بات میں خاصی مہارت حاصل ہے کہ ان دوستوں کو ایک جگہ اکٹھا کروں جن کے تعلقات آپس میں خوش گوار ہوں، تاکہ گروپ میں کوئی کشیدگی راہ نہ پائے۔ ان نشستوں میں، بلاشبہ، خاصا وقت صرف ہو جاتا ہے، مگر ہم سب اس کے لیے وقت نکال لیتے ہیں، کیوں کہ ایسا کرنا بہت اہم ہے۔ میں دوستی میں صنف کا امتیاز نہیں رکھتا، لیکن میرا احساس ہے کہ میری دوستی مردوں کی بہ نسبت عورتوں سے زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ اپنے بچوں سے میرا تعلق غیر معمولی طور پر اچھا ہے، اور اس کے اسباب بھی وہی ہیں جو دوستوں کے سلسلے میں ہیں۔ اگرچہ میں بعض اوقات ٹھکن کا شکار، پریشان، مشتعل، یا کسی اور

ہمیں میں گرفتار ہوتا ہوں، لیکن ابتدا ہی سے، اپنے بچوں کے لیے میرے پاس ہمیشہ وقت رہا ہے، کہ ان کے ساتھ رہ سکوں، ان سے باتیں کر سکوں۔ جب سے بچے اپنے طور پر سوچنے سمجھنے کے قابل ہوئے ہیں، ہم اپنے گھر کے تمام مسائل بات چیت کر کے اجتماعی طور پر حل کرتے رہے ہیں۔ ہم چاروں سر جوڑ کر ہر چیز کا فیصلہ کرتے ہیں۔ میں ایسا اس لیے نہیں کرتا کہ میں کسی نظام کا پابند ہوں یا اسے کوئی بہت اچھا طریقہ سمجھتا ہوں، بلکہ اس لیے کہ ابتدا ہی میں، جب میرے بچوں نے بڑا ہونا شروع کیا تھا، میں نے خود میں باپ کے کردار سے شغف کو دریافت کر لیا تھا۔ مجھے اس میں لطف آتا ہے: اپنے دو بیٹوں کو بڑا ہونے میں مدد دینا میری زندگی کا سب سے پُر شوق تجربہ رہا ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ میری زندگی کا اہم ترین حاصل میری کتابیں نہیں بلکہ میرے بچے ہیں۔ یہ ہم میاں بیوی کے دوستوں کی حیثیت رکھتے ہیں، ایسے دوست جنہیں ہم نے خود پالا ہے۔

اگر مجھے کوئی بڑا مسئلہ درپیش ہو تو میں مرسیڈس اور اپنے لڑکوں کو اس میں شریک کرتا ہوں۔ اگر کوئی بہت بڑا مسئلہ ہو تو غالباً اپنے دوستوں سے رجوع کر کے ان کا دماغ چاٹوں گا۔ لیکن اگر مسئلہ واقعی بہت ہی بڑا ہو، بے حد بڑا، تو میں اس کا ذکر کسی سے نہیں کرتا۔ اس کی وجہ ایک تو میری کم گوئی کی عادت ہے، اور دوسرے یہ میں مرسیڈس یا اپنے لڑکوں یا دوستوں کو انسانی فکروں میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔ سو میں ان سے خود ہی نمٹتا ہوں۔ اس کا نتیجہ بے شک آنتوں کا یہ السر ہے۔ میں نے پوشیدہ عاشق کی طرح اس کے ساتھ رہنا سیکھ لیا ہے: یہ دشوار ہے، کبھی کبھی تکلیف دہ بھی، لیکن اسے بھولنا ناممکن ہے۔

لکھنا میں نے مضی اتفاق سے شروع کیا، شاید ایک دوست پر صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ہماری نسل میں بھی ادیب پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ پھر میں مضی لذت کی خاطر لکھنے کے اس جال میں پھنس گیا، اور اس کے بعد اس انکشاف کے دام میں آ گیا کہ مجھے دنیا میں لکھنے سے زیادہ کسی اور کام سے محبت نہیں۔

لکھنا ایک لذت بھی ہے اور اذیت بھی۔ ابتدا میں، جب میں اپنا ہنر سیکھ رہا تھا، میں ایک سرشاری کے عالم میں، تھریبا غیر ذمے داری سے لکھا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اُس زمانے میں، رات کے دو تین بجے اخبار کا کام ختم کرنے کے بعد، میں اپنی کتاب کے چار، پانچ، حتیٰ کہ دس صفحے بھی آسانی سے لکھ لیا کرتا تھا۔ ایک بار میں نے ایک پوری کہانی ایک ہی نشست میں لکھ لی تھی۔ اب

میں دن بھر میں ایک پیرا گراف بھی لکھ پاؤں تو خود کو خوش نصیب سمجھتا ہوں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کا عمل بہت تکلیف دہ ہو گیا ہے۔ دراصل ہوتا صرف یہ ہے کہ آپ کے احساس ذمہ داری میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ آپ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ آپ کے لکھے ہوئے ہر لفظ میں اب زیادہ وزن ہے، کہ اب وہ زیادہ لوگوں پر اثر انداز ہو گا۔ (شاید یہ شہرت کا نتیجہ ہے)۔ اس کی وجہ سے میں فکر مند رہتا ہوں۔ ایک ایسے براعظم میں جو کامیاب ادیبوں کے لیے ابھی تیار نہیں ہے، ادبی کامیابی سے شغف نہ رکھنے والے آدمی کو جو بدترین چیز پیش آ سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی کتابیں دھڑا دھڑا فروخت ہونے لگیں۔ ایک عوامی تماشا بننا مجھے ناگوار محسوس ہوتا ہے۔ مجھے ٹیلی ویژن، کانگریسوں، کانفرنسوں اور گول میزوں سے نفرت ہے۔ اور انٹرویوز سے بھی۔ میں کسی کو کامیابی کی دعا نہیں دیتا۔ یہ کسی کو ہپیسا کی مثال ہے جو چوٹی تک پہنچنے میں خود کو تقریباً ہلاک کر ڈالتا ہے، اور وہاں پہنچ کر وہ کیا کرتا ہے؟ یہی کہ بڑی احتیاط سے، اور مقدور بھر تمکنت کے ساتھ نیچے اترنے لگے، یا نیچے اترنے کی کوشش کرنے لگے۔

خالی صفحہ، دم گھٹنے کی دہشت کے بعد، میرے لیے سب سے زیادہ دہشت ناک شے ہے۔ لیکن میں نے ہینگ وے کی ایک نصیحت پڑھنے کے بعد اس کے بارے میں زیادہ فکر کرنا ترک کر دیا۔ اس نے کہا تھا کہ دن بھر کا کام اس وقت ختم کرو جب تمہیں معلوم ہو کہ اگلے روز کا کام کہاں سے شروع کرنا ہے۔

میں سمجھتا ہوں دوسرے ادیبوں کے لیے کتاب کا جنم کسی خیال یا کسی تصور سے ہوتا ہے۔ میری ہر تحریر کسی بصری منظر سے جنم لیتی ہے۔ "سنگل کے دن کا قیلولہ"، جسے میں اپنی بہترین مختصر کہانی سمجھتا ہوں، ایک ویران شہر میں چٹلائی دھوپ میں ایک عورت اور ایک نو عمر لڑکی کو، سیاہ لباس میں، سیاہ چستری لیے، پیدل چلتے ہوئے دیکھنے سے پیدا ہوئی۔ "پتوں کا طوفان" میں یہ بصری منظر ایک بوڑھے آدمی کی تصویر ہے جو اپنے پوتے کو ایک جنازے میں شرکت کے لیے لے جا رہا ہے۔ "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" کا نقطہ آغاز بارکیلا کے بازار میں کسی لانچ کے منتظر ایک شخص کی شبیہ ہے؛ وہ ایک قسم کے خاموش اضطراب میں انتشار کر رہا تھا۔ برسوں بعد پیرس میں میں نے خود کو اسی اضطراب کے عالم میں ایک خط۔۔۔ غالباً ایک مٹی آرڈر۔۔۔ کا انتظار کرتے ہوئے پایا، اور خود کو اس شخص کی یاد سے منسلک محسوس کیا۔

وہ بصری منظر جس سے "سنہائی کے سو سال" کی ابتدا ہوئی، اس میں ایک بوڑھا شخص ایک بچے کو برف دکھانے لے جا رہا تھا جو ایک سرکس میں عجوبے کے طور پر نمائش کے لیے رکھی گئی تھی۔ یہ میرے نانا کرنل مارکیز تھے۔ یہ بات ہو ہو اسی طرح تو پیش نہیں آئی تھی مگر اس کی بنیاد

بہر حال واقعے ہی پر ہے۔ نانا ایک روز مجھے اونٹنی دکھانے سر کس لے گئے۔ اگلے روز جب میں نے انھیں بتایا کہ میں نے نمائش میں رکھی ہوئی برف تو دیکھی ہی نہیں، تو وہ مجھے بنانا کمپنی کی چٹوانی میں لے گئے، منجمد سمندری مچھلیوں کا ایک کریٹ کھلوایا، اور مجھے اس میں ہاتھ ڈالنے کو کہا۔ "ستھائی کے سوسال" سارے کا سارا اس ایک منظر سے پیدا ہوا۔

(میں دو یادوں کو ساتھ ساتھ رکھ کر کتاب کا پہلا جملہ حاصل کر لیتا ہوں۔ پہلے جملے کی بڑی اہمیت ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے پہلا جملہ لکھنے میں باقی پوری کتاب لکھنے سے زیادہ وقت لگ جاتا ہے۔) اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلا جملہ وہ تجربہ گاہ ثابت ہو سکتا ہے جس میں کتاب کے اسلوب، ساخت، یہاں تک کہ اس کی طوالت تک کو پرکھا جاسکتا ہے۔

ناول کو لکھنے کا عمل اتنا سست رفتار نہیں ہے۔ یہ تو بلکہ خاصا تیز عمل ہے۔ "ستھائی کے سوسال" لکھنے میں مجھے دو سال سے کم عرصہ لگا تھا۔ لیکن ٹائپ رائٹر پر بیٹھ کر لکھنا شروع کرنے سے پہلے، میں نے پندرہ سولہ سال اس کے بارے میں سوچتے ہوئے گزارے تھے۔ ("سردار کا زوال" کے میرے ذہن میں تیار ہونے میں بھی تقریباً اتنا ہی عرصہ لگا، اور "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" کی تیاری کے انتظار میں تیس برس۔)

جب ۱۹۵۱ میں وہ واقعہ پیش آیا (جس پر "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" کی بنیاد ہے) تو مجھے اس میں ناول کے موضوع کے طور پر نہیں بلکہ اخباری مضمون کے موضوع کی حیثیت سے دل چسپی پیدا ہوئی۔ مگر ان دنوں کولومبیا میں اخباری مضمون کی صفت اتنی ترقی یافتہ نہیں تھی، اور میں قصباتی صحافی کی حیثیت سے ایک مقامی اخبار میں کام کر رہا تھا جسے یوں بھی اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی۔ میں نے ادبی حوالے سے اس واقعے کے بارے میں سوچنا کئی سال بعد شروع کیا، لیکن ہمیشہ میرے ذہن میں یہ خیال رہا کہ میری ماں کے لیے اپنے بیٹے کی لکھی ہوئی ایک کتاب میں اپنے اتنے سارے دوستوں اور رشتہ داروں کو دیکھنے کا تصور ہی کتنا تکلیف دہ ہو گا۔ پھر بھی، سچ یہ ہے کہ اس وقت تک اس موضوع نے مجھے پوری طرح اپنی گرفت میں نہیں لیا تھا، یہاں تک کہ برسوں ذہن میں اس کی جگالی کرتے رہنے کے بعد میں نے اس کا اہم ترین جزو دریافت کر لیا۔ وہ یہ کہ دونوں قاتل اس جرم کا ارتکاب کرنا نہیں چاہتے تھے، اور انھوں نے پوری کوشش کی تھی کہ کوئی شخص اسے ہونے سے روک دے، مگر انھیں اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس ڈرامے میں یہی ایک منفرد عنصر ہے، باقی سب تو لاطینی امریکا میں روز کا معمول ہے۔ اس کے بعد تاخیر کا سبب ساخت کا مسئلہ تھا۔ حقیقی زندگی میں یہ کہانی اس وقت انجام کو پہنچتی ہے جب، جرم کے پیچس سال بعد، شوہر اپنی رد کردہ بیوی کے پاس لوٹ آتا ہے، لیکن مجھ پر یہ بات ہمیشہ سے واضح تھی کہ

کتاب کا اختتام جرم کے تفصیلی بیان پر ہو گا۔ اس کا حل یہ نکلا کہ ایک ایسا کردار متعارف کرایا جائے جو ناول کی زانی تعمیر میں آسانی سے حرکت کر سکے: سوائے لکھنے کے لیے میں نے پہلی بار واحد مشکل کا صیغہ استعمال کیا۔ ہوا صرف یہ تھا کہ میں نے، تیس برس بعد، ایک ایسی بات دریافت کر لی تھیں جسے ہم ناول نگار بھولنے پر مائل رہتے ہیں، یہ کہ بہترین ادبی فارمولا صرف سچ ہے۔

(ہینگ وے کہا کرتا تھا کہ کسی موضوع پر لکھنے میں بہت عجلت یا بہت تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے، مگر مجھے کسی ایسے موضوع سے کبھی دل چسپی نہیں رہی جو کئی برسوں کی نظر اندازی کا مشعل نہ ہو سکے۔ اگر وہ اتنا مضبوط ہے کہ "تنہائی کے سوسال" کی طرح پندرہ سال، "سردار کا زوال" کی طرح سترہ سال، اور "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" کی طرح تیس سال کے عرصے کو سہار جائے، تو میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ اسے لکھ ڈالوں۔

سوائے خال خال اشارے درج کرنے کے (میں اپنی تحریروں کے لیے نوٹس کبھی نہیں لیتا۔) مجھے اپنے تجربے سے یہ معلوم ہے کہ جب آپ نوٹس لینے لگیں تو آپ کا وقت نوٹس کے بارے میں سوچنے میں گزر جاتا ہے، اور کتاب کے بارے میں سوچنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

(اپنی تحریروں پر نظر ثانی کے سلسلے میں) میرا طریق کار اب خاصا تبدیل ہو چکا ہے۔ جب میں جوان تھا تو لکھتا چلا جاتا، مکمل کرنے کے بعد اس کی نقلیں تیار کرتا، اور نئے سرے سے اس پر کام کرنے میں جٹ جاتا۔ اب میں لکھنے کے ساتھ ساتھ سطر بہ سطر اس پر نظر ثانی کرتا رہتا ہوں، تاکہ دن کے اختتام پر میرے پاس بد صورت نشانات اور کئی پھٹی لکیروں سے پاک ایک مکمل صفحہ ہو، اشاعت کے لیے تقریباً تیار۔ (اس عمل کے دوران) مجھے ناقابل یقین تعداد میں کاغذ پھاڑنے پڑتے ہیں۔ جب میں ٹائپ کرنا شروع کرتا ہوں۔۔۔ میں ہمیشہ ٹائپ کرتا ہوں، برقی ٹائپ رائٹر پر۔۔۔ اور کوئی جملہ غلط ہو جاتا ہے، یا اپنا لکھا ہوا کوئی لفظ مجھے پسند نہیں آتا، یا محض ٹائپنگ کی کوئی غلطی ہو جاتی ہے، تو کسی بد عادت، ضبط یا شکی پن کے زیر اثر، میں وہ صفحہ مٹانے کے ٹائپ رائٹر میں نیا صفحہ لگا لیتا ہوں۔ میں بارہ صفحے کی ایک مختصر کہانی لکھنے کے عمل میں پانچ سو صفحے تک مٹانے کر سکتا ہوں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ میں اس دیوانے خیال پر کبھی حاوی نہیں ہو سکا جس کی رو سے ٹائپنگ کی غلطی اور تخلیقی فیصلے کی غلطی مساوی حیثیت رکھتی ہیں۔

(دوسرے بہت سے ادیبوں کے برعکس) میں برقی ٹائپ رائٹر کا اتنا دلدادہ ہو گیا ہوں کہ اب میں کسی اور شے کی مدد سے نہیں لکھ سکتا۔ میرا عام عقیدہ یہ ہے کہ اگر تمام تخلیقی آرائشیں آدمی کے ارد گرد ہوں تو وہ بہتر لکھتا ہے۔ میں اس رومانوی خیال سے اتفاق نہیں رکھتا کہ ادیب کے تخلیقی طور پر رز خیز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ فاقہ کشی کا شکار اور مصیبتوں کا مارا ہوا ہو۔

اگر آپ نے اچھا کھانا کھایا ہے، اور آپ کے پاس ایک برقی ٹائپ رائٹر ہے، تو آپ بہتر طور پر لکھ سکیں گے۔

(میں اپنے انٹرویوز میں اپنی زیر تحریر کتابوں پر اظہار خیال کرنا پسند نہیں کرتا) کیوں کہ وہ میری نجی زندگی کا حصہ ہیں۔ سچ یہ ہے کہ میں اُن ادیبوں کو قابلِ رحم سمجھتا ہوں جو اپنے انٹرویوز میں اپنی آنے والی کتاب کا خاکہ بیان کر دیتے ہیں۔ اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے کا کام خاطر خواہ طور پر نہیں چل رہا، اور وہ ان مسائل کو اخبارات میں زیر بحث لا کر تسکین حاصل کر رہے ہیں جنہیں وہ ناول میں حل نہیں کر پار رہے۔ (لیکن میں اپنی زیر تحریر کتاب کے بارے میں اپنے قریبی دوستوں سے ضرور گفتگو کرتا ہوں) بلکہ درحقیقت میں انہیں اس پورے عمل سے گزارتا ہوں۔ میں جو چیز لکھ رہا ہوں اس کے بارے میں ان سے خوب باتیں کرتا ہوں۔ یہ اس بات کو جاننے کا ایک ذریعہ ہے کہ میرے قدم کھان ٹھوس زمین پر ہیں اور کھان دلدل پر۔ یہ اندھیرے میں راستا تلاش کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ (لیکن اس کے باوجود میں انہیں اپنے لکھے ہوئے صفحات پڑھنے پر گز نہیں دیتا۔) کبھی نہیں۔ یہ ایک قسم کا وہم بن چکا ہے۔ درحقیقت میرا عقیدہ یہ ہے کہ ادیب، غرقاب شدہ جہاز کے قلعہ کی طرح، سمندر کے پہیوں پر بچ بالکل تنہا ہوتا ہے۔ اس پیشے کی تنہائی کسی بھی اور پیشے کی تنہائی سے بڑھ کر ہے۔ جب آپ لکھ رہے ہوں تو کوئی شخص آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔

(میرے نزدیک لکھنے کے لیے مثالی جگہ) صبح کے وقت ایک ریٹیلہ جزیرہ اور رات ۔ ۔ ۔ وقت ایک بڑا شہر ہے۔ صبح کے وقت مجھے خاموشی درکار ہوتی ہے، اور شام کو شراب کے چند جام اور اچھے دوستوں سے گپ شپ۔ عام لوگوں سے مسلسل رابطہ رکھنا، اور یہ جاننا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، میرے لیے انتہائی ضروری ہے۔ یہ سب ولیم فاکنر کے خیال سے مطابقت رکھتا ہے، جس نے کہا تھا کہ کسی ادیب کے لیے لکھنے کی مثالی جگہ ایک قلعہ خانہ ہے، جہاں صبح کے وقت خاموشی چھائی رہتی ہے اور شام کو جشن برپا رہتا ہے۔

(لکھنے کے سفر کی طویل تربیت کے دوران جو ہستی سب سے بڑھ کر اور میری اولین مددگار ہوئی وہ میری نانی تھیں۔) وہ مجھے انتہائی ہولناک قصے پلک جھپکائے بغیر یوں سناتی تھیں گویا یہ سب انہوں نے ابھی ابھی خود دیکھا ہو۔ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ یہ ان کا موثر انداز اور امیجز کی فراوانی تھی جس کے باعث ان کی کہانیاں اتنی قابلِ یقین لگتی تھیں۔ میں نے "تنہائی کے سو سال" میں اپنی نانی ہی کا طریقہ استعمال کیا ہے۔ (لیکن یہ بات کہ مجھے ادیب بننا ہے، مجھے اپنی نانی سے نہیں بلکہ کافکا سے معلوم ہوئی) جو جرمن زبان میں قصہ گوئی کا وہی انداز رکھتا تھا جو میری نانی کا

تھا۔ جب سترہ سال کی عمر میں میں نے "یٹامور فورس" پڑھا تو مجھے احساس ہوا کہ میں ادیب بن سکتا ہوں۔ جب میں نے دیکھا کہ کس طرح گریگر سما ایک صبح ایک بڑے سے کیرٹے میں منقلب بیدار ہو سکتا ہے، تو میں نے خود سے کہا، "مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایسا بھی کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر ایسا ممکن ہے تو یقیناً مجھے لکھنے کے کام سے دلچسپی ہے۔"

(مجھے اس کہانی میں اتنی شدید کشش اس لیے محسوس ہوئی کہ) اچانک مجھے پتا چلا کہ ادب میں، سیکنڈری اسکول کے نصاب میں شامل، عقلی اور انتہائی درسی مثالوں سے ہٹ کر کس قدر بے شمار امکانات موجود ہیں۔ یہ انکشاف گویا عصمت کی پیٹی توڑ ڈالنے کے مترادف تھا۔ لیکن برسوں کے عمل میں میں نے یہ بھی دریافت کیا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنی مرضی سے کچھ بھی ایجاد یا متصور کر لیں، کیوں کہ اس طرح آپ سچ نہ بولنے کے خطرے سے دوچار ہو جاتے ہیں، اور جھوٹ ادب میں حقیقی زندگی سے بڑھ کر سنگین نتائج پیدا کرتا ہے۔ ہر بظاہر بے سرو پا تخلیق بھی اپنے کچھ اصول رکھتی ہے۔ آپ عقلیت کا برگ انجیر اسی وقت اتار کر پینک سکتے ہیں جب آپ مکمل انتشار اور لغویت اور فینٹسی کی دلدل میں اتر جانے کے خطرے سے آزاد ہوں۔

(مجھے فینٹسی سے نفرت ہے) کیوں کہ میں تخیل کو حقیقت کی تخلیق کا ذریعہ سمجھتا ہوں، اور یہ کہ تخلیق کا سرچشمہ، آخری تجزیے میں، حقیقت ہی ہے۔ فینٹسی، والٹ ڈزنی کے انداز کی اختراع کے مضموم میں، جس کی حقیقت پر بنیاد ہی نہ ہو، مجھے سب سے زیادہ ناگوار ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار جب مجھے بچوں کی کہانیوں کی ایک کتاب لکھنے کا شوق ہوا اور میں نے "گم شدہ وقت کا سمندر" کا مسودہ (ایک دوست کو) بھجوایا تو (اس نے) اپنی مخصوص صاف گوئی سے بتایا کہ یہ کہانی (اسے) پسند نہیں آئی۔ (اس کے) خیال میں اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ فینٹسی کا ذوق نہیں رکھتا تھا۔ اس بات نے مجھے تہہ و بالا کر دیا، کیوں کہ بچے بھی فینٹسی کو پسند نہیں کرتے۔ وہ جس چیز کو پسند کرتے ہیں وہ تخیل ہے۔ اور ان دونوں میں وہی فرق ہے جو انسان ہونے اور شعبہ باز کا پُتلا ہونے میں ہے۔

(کاٹاکا کے علاوہ جس دوسرے ادیب نے لکھنے کے ہنر کو سنوارنے اور اس کی باریکیاں سیکھنے میں میری مدد کی) وہ ہیمنگ وے ہے، جسے میں عظیم ناول نگار نہیں سمجھتا، لیکن نہایت عمدہ افسانہ نگار مانتا ہوں۔ اس کی ایک نصیحت یہ تھی کہ افسانے کی بنیاد، آئس برگ کی طرح، اُس حصے پر قائم ہونی چاہیے جو نظروں سے اوجھل ہو، یعنی وہ سارا غور و فکر اور مطالعہ، اور وہ سارے لوازمات جنہیں اکٹھا کیا گیا لیکن افسانے میں براہ راست استعمال نہیں کیا گیا۔ بے شک ہیمنگ وے آپ کو بہت کچھ سکھا سکتا ہے۔ یہ تک دیکھنا سکتا ہے کہ بلی کوئی مور کیسے مڑتی ہے۔

گراہم گرین نے مجھے سکھایا کہ گرم خطوں کو کس طرح دریافت کیا جائے، جو کوئی معمولی بات نہیں۔ جس ماحول سے آپ بے تحاشا واقفیت رکھتے ہوں، اس کے شاعرانہ مرکب میں سے اس کے بنیادی عناصر کو علیحدہ کرنا انتہائی دشوار کام ہے۔ یہ سب کچھ اتنا مانوس ہوتا ہے کہ آپ کو علم نہیں ہو پاتا کہ کہاں سے آغاز کیا جائے، اور پھر بھی آپ کے پاس کھینے کو اتنا کچھ ہوتا ہے کہ انجام کار آپ کچھ بھی سمجھ پانے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ منطقہ حارہ کے بارے میں مجھے بھی مسئلہ درپیش تھا۔ میں کرسٹوفر کولمبس، پیگافیتا اور انڈیز کے دیگر وقائع نگاروں کی تحریریں بے حد دل چسپی سے پڑھ چکا تھا، اور ان کے اور جنرل ورٹن کی داد بھی دے چکا تھا۔ میں نے ساگر می اور کونریڈ اور بیسویں صدی کے اوائل کے لاطینی امریکی "منطقہ حارہ کے ماہرین" کو بھی پڑھ رکھا تھا جو ہر چیز کو جدیدیت کی عینک سے دیکھتے تھے، اور بہت سے دوسرے لکھنے والوں کو بھی، لیکن مجھے ان کے بیانیے اور اصل حقیقت کے درمیان بے حد وسیع و عریض خلیج حاصل دکھائی دیتی تھی۔ ان میں سے بعض، چیزوں کی فہرستیں بنانے کے جال میں گرفتار ہو گئے تھے، اور ستم ظریفی یہ کہ ان کی فہرست جتنی طویل ہوتی، ان کا ورٹن اُتنا ہی تنگ موس ہوتا۔ بعض دوسرے لکھنے والے، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، خطابت کی زیادتی کا شکار ہو گئے تھے۔ گراہم گرین نے اس ادبی مسئلے کو بہت مختصر اور موثر انداز میں حل کر دیا۔ اس نے چند ادھر ادھر کے عناصر چن لیے، جو ایک دوسرے سے ایسے داخلی ربط کے ذریعے وابستہ تھے جو لطیف بھی تھا اور حقیقی بھی۔ اس طریقے کو استعمال کر کے آپ منطقہ حارہ کی تمام تر پیچیدگی کو ایک گلے ہوئے امرود کی مہک کے ذریعے بیان کر سکتے ہیں۔

(ایک اور نصیحت جس پر کان دھرنا مجھے یاد ہے) وہ بات ہے جو دو مینیکن ادیب حوان بوش (Juan Bosch) نے پچیس سال پہلے کاراکاس میں کہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ لکھنے کا سارا ہنر۔۔ تکنیک، ساخت کے طریقے، نہایت باریک اور پوشیدہ جوڑ، سب کچھ۔۔ نو عمری ہی میں سیکھ لینا پڑتا ہے۔ ہم ادیب لوگ تو توں کی طرح ہیں، بڑھے ہو کر ہم بولنا نہیں سیکھ سکتے۔

(صحافت نے ادب کے پیشے میں میری مدد کی) لیکن زبان کا زیادہ موثر استعمال سکھانے کے ذریعے نہیں، جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے۔ صحافت نے مجھے اپنی کہانیوں کو استناد بخشا سکھایا۔ حسین ریمیدیوس کو بلند ہو کر آسمان میں چلے جانے سے پہلے چادروں۔۔ سفید چادروں۔۔ میں لپیٹنا، یا فادر ٹانور رانٹا کے زمین سے چھو اچھ اور اٹھ جانے سے پہلے اس کے ہاتھ میں سیال چاکلیٹ کا۔۔ چاکلیٹ کا، کسی آور مشروب کا نہیں۔۔ گلاس تھمنا، یہ سب صحافتی ترکیبیں ہیں، اور حد درجہ مفید۔

(سنیاد رکھنے کا میں ہمیشہ سے آزد شائق رہا ہوں، لیکن سنیاد ادیب کو مفید تکنیکیں سکھا سکتا

ہے یا نہیں) اس بارے میں میں یقین سے کوئی بات نہیں کہہ سکتا۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے سنہیا کی حیثیت امانت کی بھی رہی ہے اور رکاوٹ کی بھی۔ اس نے مجھے بصری تصویروں میں سوچنا سکھایا۔ لیکن دوسری طرف اب مجھے "تنہائی کے سو سال" سے پہلے لکھی گئی اپنی تمام کتابوں میں کرداروں اور مناظر کو بصری انداز میں تصور کرنے کا غلو آمیز جوش، بلکہ کسرے کے زاویوں اور فریموں سے جنون کی حد تک گلاو بھی محسوس ہوتا ہے۔ (مثلاً "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا") ایک ایسا ناول ہے جو اسلوب کے اعتبار سے کسی فلم اسکرپٹ سے مشابہ ہے۔ کردار یوں حرکت کر رہے ہیں جیسے کیرا ان کا تعاقب کر رہا ہو۔ اب میرا خیال یہ ہے کہ ادبی طریقے سنہیا کے طریقوں سے قطعی مختلف ہوتے ہیں۔

مکالمے ہسپانوی زبان میں سچ محسوس نہیں ہوتے۔ میں نے ہمیشہ کہا ہے کہ اس زبان میں بولے جانے والے اور لکھے جانے والے مکالموں کے درمیان بہت بڑی خلیج حاصل ہے۔ کوئی ہسپانوی مکالمہ جو اصل زندگی میں اچھا لگتا ہو، ضروری نہیں کہ کسی ناول میں بھی اچھا لگے۔ اس لیے میں اپنی تحریروں میں مکالمات بہت محکم استعمال کرتا ہوں۔

(ناول لکھنے کے دوران اس بات کا مجھے بس عمومی سا احساس رہتا ہے کہ کس کردار کے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔) لیکن ناول لکھنے کے عمل میں غیر متوقع واقعات پیش آ جاتے ہیں۔ کرنل اور یلیانو بوندیا کے بارے میں مجھے پہلا خیال یہ آیا تھا کہ وہ خانہ جنگی کا ایک پرانا سورما ہوگا جس کی موت ایک درخت کے نیچے پیشاب کرتے ہوئے واقع ہوگی۔

(جب اس کی موت درحقیقت واقع ہوئی تو یہ میرے لیے ایک انتہائی تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ کسی نہ کسی مقام پر اسے موت کے گھاٹ اتارنا ہی ہوگا، لیکن مجھ میں اس کی ہمت نہیں تھی۔ کرنل اس وقت تک خاصا معطر ہو چکا تھا اور بیٹھا اپنی طلائی مچھلیاں بناتا رہتا تھا۔ تب ایک سہ پہر میں نے سوچا، "اب اس کا وقت آ گیا ہے۔" مجھے اس کو ختم کرنا ہی پڑا۔ جب یہ باب مکمل ہوا تو میں لرزنا ہوا مکان کی دوسری منزل پر مریدس کے پاس گیا۔ اس نے میرے چہرے پر نظر ڈالتے ہی اندازہ کر لیا کہ کیا ہو گیا ہے۔ "کرنل مر گیا،" وہ بولی۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور دو گھنٹے تک روتا رہا۔

انسپریشن (inspiration) ایک ایسا لفظ ہے جو رومانویوں کے ہاتھوں بے اعتبار ہو چکا ہے۔ میں اسے کوئی خاص آرفع کیفیت یا جنت کی ہوا کا جھوٹا خیال نہیں کرتا، بلکہ ایک ایسا لمحہ سمجھتا ہوں جب ثابت قدمی اور ضبط کے ذریعے سے آپ اور آپ کا موضوع مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ جب آپ کچھ لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو آپ کے اور آپ کے موضوع کے درمیان ایک

طرح کا باہمی تناؤ پیدا ہو جاتا ہے؛ اور اس طرح جوں جوں آپ اپنے موضوع کو سمیڑ دیتے جاتے ہیں، وہ آپ کو سمیڑ دیتا جاتا ہے۔ ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب ساری رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں، تمام کش مکش غائب ہو جاتی ہے، ایسی باتیں آپ پر کھلنے لگتی ہیں جو کبھی آپ کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی تھیں، اور اس لمحے دنیا میں لکھنے سے بہتر کوئی اور چیز باقی نہیں رہتی۔ میں تو اسی کو انسپیریشن کہتا ہوں۔

(کبھی کبھی میں کوئی کتاب لکھنے کے دوران اس آرف کیفیت سے محروم ہو جاتا ہوں)، اور تب میں اس کے بارے میں از سر نو، ابتدا سے سوچنا شروع کر دیتا ہوں۔ ایسے لمحے آتے ہیں جب میں پہنچ کس اٹھا کر سارے گھر کے تالے اور قبضے مرمت کرنے لگتا ہوں یا دروازوں پر سبز رنگ کرنے لگتا ہوں، کیوں کہ بعض اوقات ہاتھ سے کام کرنے سے آدمی حقیقت سے خوف کے احساس پر قابو پالیتا ہے۔

ایسا مسکد عموماً ساخت کے معاملے میں پیش آتا ہے، اور کبھی کبھار اتنی سنگین نوعیت کا ہوتا ہے کہ مجھے از سر نو آغاز کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ میں نے میکیکو میں ۱۹۶۲ میں "سردار کا زوال" کے تین سو صفحات لکھ لینے کے بعد اس پر کام روک دیا تھا، اور اس مسودے کی کوئی چیز باقی بچی تو صرف اس کے مرکزی کردار کا نام۔ انیس سو اڑسٹھ میں بارسلونا میں تھیں نے پھر اس پر دوبارہ کام شروع کیا، اور چھ مہینے اس پر صرف کر کے اسے دوبارہ ادھورا چھوڑ دیا، کیوں کہ اس کے مرکزی کردار، ایک بہت بوڑھے ڈکٹیٹر، کی شخصیت کے بعض اخلاقی پہلو میری گرفت میں نہیں آ رہے تھے۔ تقریباً دو سال بعد میں نے افریقا میں شکار کے موضوع پر ایک کتاب خریدی، کیوں کہ مجھے اس پر ہینگ وے کے لکھے ہوئے پیش لفظ سے دلچسپی تھی۔ پیش لفظ میں تو کوئی خاص بات نہ نکلی مگر میں نے ہاتھیوں کے بارے میں ایک باب پڑھنا شروع کر دیا، اور وہاں سے مجھے اپنے ناول کی کلید ہاتھ آ گئی۔ ہاتھیوں کی بعض عادات نے میرے ڈکٹیٹر کی اخلاقیات کی مکمل طور پر وضاحت کر دی۔

(ناول کی ساخت اور مرکزی کردار کی نفسیات کے مسائل سے قطع نظر) ایک لمحہ ایسا آیا جب مجھ پر ایک گھمبیر حقیقت کا انکشاف ہوا۔ میں کتاب میں موسم کو مناسب حد تک گرم نہیں بنا پا رہا تھا۔ یہ بات بہت گھمبیر اس لیے تھی کہ یہ واقعات کریمینن کے ایک شہر میں پیش آنے تھے جہاں کا موسم ناقابلِ یقین حد تک گرم ہونا چاہیے تھا۔ اس کا واحد حل جو میں سوچ سکا وہ یہ تھا کہ سامان باندھوں اور پورے خاندان کو ساتھ لے کر کریمینن کی طرف نکل جاؤں۔ میں تقریباً ایک برس تک، کچھ کیے بغیر، اس خطنے میں گھومتا رہا۔ سفر سے بارسلونا واپس پہنچ کر، جہاں میں یہ کتاب

لکھ رہا تھا، میں نے کچھ پودے اگائے، کچھ خوشبوؤں کا اضافہ کیا، اور آخر کار منظرِ حارہ کے اس شہر کی شدید گرمی پڑھنے والے تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔

(جب میں کوئی ناول مکمل کر لیتا ہوں تو) اس میں ہمیشہ کے لیے دل چسپی کھو بیٹھتا ہوں۔ جیسا کہ سیمنگ وے کہا کرتا تھا، یہ اب ایک مُردہ شیر کی طرح ہے۔

(میرے خیال میں ہر ناول حقیقت کی ایک شاعرانہ تقلید ہے۔) اس سے مراد یہ ہے کہ میرے نزدیک ناول خفیہ کوڈ میں بیان کی گئی حقیقت ہے، دنیا کے بارے میں ایک قسم کی پہیلی۔ ناول میں آپ جس حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں وہ اصل زندگی کی حقیقت سے مختلف ہوتی ہے، اگرچہ اس کی جڑیں اسی میں ہوتی ہیں۔ یہی بات خوابوں کے بارے میں بھی درست ہے۔

(میں نے اپنی تحریروں، خصوصاً "تسہائی کے سوسال" اور "سردار کا زوال" میں حقیقت کو جس طرح برتا ہے، اسے طلسمی حقیقت نگاری کا نام دیا گیا ہے۔ میرے یورپی قارئین غالباً میری کہانیوں کے طلسم سے تو باخبر ہوتے ہیں لیکن اس کے عقب میں چھپی حقیقت کو نہیں دیکھ پاتے۔) اس کی وجہ یقیناً یہ ہے کہ ان کی عقلیت پسندی انہیں یہ دیکھنے سے باز رکھتی ہے کہ حقیقت مٹاڑوں اور انڈوں کے بجائے محدود نہیں۔ لاطینی امریکا کی روزمرہ زندگی یہ ثابت کرتی ہے کہ حقیقت نہایت غیر معمولی باتوں سے بھری پڑی ہے۔ اپنی یہ بات واضح کرنے کے لیے میں عموماً امریکی مہم جوایت ڈبلیو اپ ڈی گرافٹ (F W Up de Graff) کی مثال پیش کرتا ہوں جس نے پچھلی صدی کے آخر میں لازون کے جنگل میں ایک ناقابل یقین سفر اختیار کیا، اور دوسری چیزوں کے علاوہ ابلتے ہوئے پانی کا ایک دریا دیکھا اور ایک ایسا مقام جہاں انسانی آواز کے اثر سے موسلا دھار بارش ہونے لگتی تھی۔ ارجنٹینا کے انتہائی جنوب میں واقع کمودور روادو ایماں قطب جنوبی سے چلنے والی ہوا ایک پورے سرکس کو اڑا لے گئی اور اگلے روز مجھیروں کے جالوں میں سے شیروں اور زرافوں کی لاشیں برآمد ہوئیں۔ "بڑی ماما کا جنازہ" میں میں نے ایک کولوہیسن گاؤں میں پوپ کے ایک ناقابل تصور اور ناممکن سفر کی کہانی بیان کی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے پوپ کا استقبال کرنے والے صدر کو گنجا اور موٹا بیان کیا تا کہ اس پر اس وقت کے اصل صدر مملکت کا شبہ نہ کیا جاسکے جو دبلا اور دراز قامت تھا۔ اس کہانی کے لکھے جانے کے گیارہ برس بعد پوپ نے واقعی کولوہیا کا دورہ کیا، اور اس کا استقبال کرنے والا صدر کہانی میں بیان کیے گئے صدر کی طرح گنجا اور موٹا تھا۔ جب میں "تسہائی کے سوسال" لکھ چکا تھا تو ہارکلیلا میں ایک لڑکا نمودار ہوا جس کا دعویٰ تھا کہ اس کے سور کی دم ہے۔ جو غیر معمولی باتیں ہمیں روز پیش آتی رہتی ہیں ان پر نظر ڈالنے کے لیے آپ کو صرف اخبار کھولنے کی ضرورت ہے۔ میں ایسے عام لوگوں سے واقف ہوں جنہوں نے

تنہائی کے سو سال "کوایست غور سے اور بڑی مسرت کے ساتھ پڑھا، لیکن انہیں ذرا بھی تعجب میں ہوا کیوں کہ، انجام کار، میں نے کوئی ایسی چیز بیان نہیں کی تھی جو خود ان کی زندگی میں پیش آچکی ہو۔

(میری کتابوں کا) ایک فقرہ بھی ایسا نہیں جس کی بنیاد حقیقت پر نہ ہو۔ ("تنہائی کے سو سال" میں بعید از قیاس چیزیں پیش آتی ہیں۔ حسین رمید یوس بلند ہو کر آسمان میں چلی جاتی ہے۔ زرد تتلیاں مور سیو بایلو نیا کے گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔) یہ سب کچھ حقیقت پر مبنی ہے۔ مثلاً مور سیو بایلو نیا۔ جب میں پانچ سال کا تھا، اراکاتا کا میں ہمارے گھر میں ایک میٹر بشین میٹر تبدیل کرنے آیا۔ مجھے یہ واقعہ ایسے یاد ہے گویا کل کی بات ہو، کیوں کہ اس کی مڑے کی اس پیٹی نے مجھے مسور کر لیا تھا جو وہ اونچے کھمبوں پر چڑھتے ہوئے، گرنے سے بچنے کے لیے باندھ لیا کرتا تھا۔ وہ کئی بار آیا۔ ان میں سے ایک بار میں نے اپنی نانی کو دیکھا کہ جھاڑن کی مدد سے ایک تتلی کو بچکانے کی کوشش کر رہی ہیں، "جب بھی یہ آدمی گھر میں آتا ہے، یہ زرد تتلی بھی اس کے پیچھے پیچھے آ جاتی ہے۔" یہ مور سیو بایلو نیا کا جنین تھا۔

حسین رمید یوس کے بارے میں میرا اصل منصوبہ یہ تھا کہ وہ گھر میں رہیگا اور امارانتا کے ساتھ کڑھائی کرتے کرتے غائب ہو جائے گی۔ مگر یہ تقریباً سنیاٹو گرافک ترکیب قابل عمل نہ لگی۔ رمید یوس اب بھی نظروں کے سامنے موجود تھی۔ تب مجھے اس کو، جسم اور روح سمیت، بلند کر کے آسمان میں بھیج دینے کا خیال آیا۔ اس کے پیچھے کیا واقعہ تھا؟ ایک عورت جس کی پوتی صبح کی دس گھنٹوں میں گھر سے بھاگ گئی تھی، اور جس نے اس واقعہ پر پردہ ڈالنے کی غرض سے یہ کہانی شور کر دی تھی کہ وہ اوپر آسمان میں چلی گئی ہے۔

(لیکن اسے اڑا کر آسمان میں بھیجنا خاصا دشوار ثابت ہوا۔) وہ زمین سے اٹھ کر جی نہ دیتی تھی۔ ایک روز اسی مسئلے پر غور کرتا ہوا میں باہر اپنے باغ میں نکل آیا۔ بہت تیز ہوا چل رہی تھی۔ ایک لیم لیم، نہایت حسین سیاہ فام عورت نے ابھی ابھی کپڑوں کی دھلائی ختم کی تھی، اور چادر کو سوکھنے کے لیے رسی پر پھیلائے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے کامیابی نہیں ہو رہی تھی، کیوں کہ ہوا چادروں کو مسلسل اڑائے جا رہی تھی۔ میرے ذہن میں اچانک ایک لہر ابھری۔ "یہ ہے طریقہ!" میں نے سوچا۔ حسین رمید یوس کو اوپر آسمان میں جانے کے لیے چادریں درکار تھیں۔ اس قصے میں حقیقت کا عنصر چادروں نے فراہم کیا۔ جب میں اپنے ٹائپ رائٹر پر لوٹا، تو حسین رمید یوس کو اوپر، اور اوپر جانے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ اب اسے خدا بھی نہیں روک سکتا تھا۔

میں آپ کو خبردار کر دوں کہ میری پسندیدہ کتابیں لازماً وہی نہیں ہوتیں جنہیں میں بہترین کتابیں سمجھتا ہوں۔ میرے ان کتابوں کو پڑھنے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں، جن کی وضاحت کرنا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا۔ سوفوکلز کا *Amadis of Gaul*، *Oedipus Rex*، *Lazarillo de Tormes*، *A Journal of the Plague Year*، *ڈینیئل ڈیفو* کا *First Voyage around the World* اور ہاں، *(ایڈگر رائس) Tarzan* پیرنگلینا کا *of the Apes*۔

(جن ادیبوں کی طرف میں سب سے زیادہ لوٹ لوٹ کر جاتا ہوں) وہ کونریڈ اور سانت ایگزوپیری (Saint-Exupery) ہیں۔ کسی ادیب کی طرف لوٹنے اور اسے دوبارہ پڑھنے کی واحد وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ آپ کو پسند ہے۔ ان دونوں ادیبوں میں مجھے جو بات پسند ہے وہ ان کی واحد مشترک خصوصیت ہے: حقیقت تک رسائی کا ایک عجیب وغریب انداز جس کے باعث وہ شاعرانہ معلوم ہونے لگتی ہے، خواہ اس مقام پر وہ بالکل عامیانہ ہی کیوں نہ ہو۔ میں تالستانی کی کوئی کتاب کبھی اپنے ساتھ نہیں رکھتا، مگر اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ "جنگ اور امن" سے اچھا ناول کبھی نہیں لکھا گیا۔

(لیکن کسی نقاد کو میری کتابوں میں ان ادیبوں کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیا۔) میں اس بات کی ہمیشہ سخت کوشش کرتا رہا ہوں کہ کسی اور کی طرح نظر نہ آؤں۔ جو ادیب مجھے پسند ہیں، میں نے ان کی نقل کرنے کے بجائے ہمیشہ ان سے دور بھاگنے کی کوشش کی ہے۔

(اس کے باوجود نقادوں کو میری تحریروں پر فاکٹر کا سایہ ہمیشہ نظر آتا رہا ہے) اور انہوں نے فاکٹر کے اثرات پر اس قدر زور دیا کہ کچھ عرصے کے لیے تو میں بھی قائل ہو گیا تھا۔ لیکن میں اس کا بُرا نہیں مانتا، کیوں کہ وہ تمام زبانوں کے عظیم ترین ناول نگاروں میں سے ایک ہے۔ تاہم نقاد جس انداز میں اثرات کی نشان دہی کرتے ہیں وہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ فاکٹر کے ساتھ میری مماثلتیں ادبی سے زیادہ جغرافیائی ہیں۔ مجھے اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب، اپنے شروع کے ناول لکھ چکنے کے بہت بعد، میں ریاست ہائے متحدہ کے جنوبی علاقوں میں سفر کر رہا تھا۔ اس سفر کے دوران میرا سامنا جن تپتے ہوئے گرد آلود قصبوں اور شکست خوردہ لوگوں سے ہوا، وہ اُن قصبوں اور لوگوں سے گہری مشابہت رکھتے تھے جنہیں میں اپنی کھانیوں میں خلق کرتا ہوں۔ شاید یہ مشابہت اتفاقی نہیں تھی، کیوں کہ اراکاتا کا بیشتر حصہ ایک امریکی کمپنی، یونائیٹڈ فروٹ، نے

نعمیر کیا تھا۔

(شاید آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مشابہت اس سے آگے جاتی ہے۔ کرنل سارٹورس اور کرنل وریلیا نو بونڈیا کے درمیان، اور ماکونڈو اور یوگنا پوٹا فاکونٹی کے درمیان ایک قریبی رشتہ، کم و بیش سلف و خلف کا سا تعلق معلوم ہوتا ہے۔ تو کیا فاکنر کو تسلیم کرنے سے روگردانی کرنا آبا و اجداد کو قتل کرنے کے مترادف نہیں؟) شاید ایسا ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کہا کہ میرا سسکہ یہ نہیں تھا کہ فاکنر کی نقل کیوں کر کی جائے، بلکہ یہ کہ اسے نیست و نابود کس طرح کیا جائے۔ اس کا اثر واقعی مجھے بے حد نقصان پہنچا رہا تھا۔

(ورجینیا وولف کے ساتھ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ میں اپنی تحریروں پر اس کے اثرات کا ذکر کرنے والا واحد شخص ہوں، جبکہ دوسروں کو یہ اثرات دکھائی نہیں دیتے۔) آج میں جس قسم کا ادیب ہوں اس سے قطعی مختلف ہوتا، اگر بیس سال کی عمر میں میں نے "مسز ڈالووسے" کا یہ حصہ نہ پڑھا ہوتا:

'But there could be no doubt that greatness was passing, hidden, down Bond Street, removed only by a hand's breadth from ordinary people who might now, for the first time and last, be within speaking distance of the majesty of England, of the enduring symbol of the state which will be known to curious antiquaires, sifting through the ruins of time, when London is a grass-grown path and all those hurrying along this Wednesday morning are but bones with a few wedding rings mixed up in their dust and the gold stoppings of innumerable decayed teeth.'

مجھے یاد ہے کہ میں یہ جملہ پڑھتے ہوئے، اس زمانے میں جب میں گواہیرا کے علاقے میں انسائیکلو پیڈیا اور طبی کتبائیں فروخت کرتا پھرتا تھا، ایک بوسیدہ ہوٹل کے کمرے کی شدید گرمی اور پتھروں کے تھپیرٹوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ (اس جملے کا اتنا گہرا اثر ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے میرے احساسِ زمان کو یکسر منقلب کر دیا۔ میں نے ایک ہی جملہ کے میں ماکونڈو کی شکست و ریخت کا پورا عمل اور اس کی آخری تھدیر دیکھ لی۔ مجھے خیال آتا ہے کہ کہیں "سردار کا

زوال "کی وحندلی سی ابتدا بھی اسی جھلے سے نہ ہوئی ہو، جو ایک ایسی کتاب ہے جس کا موضوع، اقتدار کا معرکہ، اس کی تنہائی اور اس کی کراہت ہے۔

(دیگر اثرات جو میری تحریروں پر پڑے) ان میں سوفوکلیر، رال بو، کاکا، ہسپانوی سنہر، دور کی شاعری، اور، شومان سے لے کر بارٹوک تک کی، جیمس موسیقی شامل ہیں۔

گرامر گرین اور بیسنگ وے دونوں نے مجھے خالص تکنیکی ترکیبیں سکھائیں۔ اگرچہ میں ہمیشہ ان کی اہمیت تسلیم کی ہے، لیکن یہ سطحی اقدار ہیں۔ میرے نزدیک حقیقی اثر۔۔ اہم اثر۔ اُس وقت ہوتا ہے جب کسی ادیب کی تحریر آپ کو اتنی گہرائی تک متاثر کر دے کہ اس کا باعث دنیا اور زندگی کے بارے میں آپ کے چند ایک تصورات تبدیل ہو جائیں۔

ادب سے میری دل چسپی شاعری کے ذریعے شروع ہوئی؛ خراب شاعری کے ذریعے مقبول عام شاعری کے ذریعے، اس شاعری کے ذریعے جو کیلنڈروں پر چھاپی جاتی ہے یا پوسٹروں کے طور پر فروخت ہوتی ہے۔ مجھے پتا چلا کہ مجھے شاعری اتنی ہی پسند ہے جتنی مجھے کاسٹیلیس درس اسباق کی گرامر سے نفرت ہے، جو مجھے سیکنڈری اسکول میں پڑھائے گئے تھے۔ مجھے ہسپانوی رومانویوں۔۔ نیونیوزی آر کے، اسپرونیڈا۔۔ سے محبت تھی۔ میں نے انھیں رپا کیرا میں پڑھا تھا۔ آپ اسے سمندر سے چھ سو میل دور واقع اس غمناک شہر کے طور پر جانتے ہیں جہاں ("تنہائی کے سو سال" میں) اور یلیانو سگندو، فرناندا دیل کارپیو کو لینے گیا تھا۔ میری ادبی تعلیم وہیں ایک سیکنڈری اسکول میں شروع ہوئی جہاں میں بورڈنگ ہاؤس میں مقیم تھا۔ ایک طرف میں خراب شاعری پڑھا کرتا تھا تو دوسری طرف مارکسٹ تحریریں، جو میرا تاریخ کا استاد مجھے خفیہ طور پر دیا کرتا تھا۔ میں اتوار کا دن بوریت دور کرنے کے لیے اسکول کی لائبریری میں گزارتا تھا۔ سو میں نے خراب شاعری سے ابتدا کی، اس سے پیشتر کہ اچھی شاعری کو دریافت کر سکوں: رال بو، والیری، اور بلاشبہ نیرودا۔ میں نیرودا کو بیسویں صدی کا، کسی بھی زبان میں، سب بڑا شاعر سمجھتا ہوں۔ حتیٰ کہ جب وہ مشکل مقام میں پھنس جاتا تھا۔۔ مثلاً اس کی سیاسی شاعری، اس کی جنگی شاعری۔۔ تب بھی شاعری بذاتِ خود ہمیشہ اول درجے کی رہتی تھی۔ میں یہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں، نیرودا ایک قسم کا شاد میدان تھا، وہ جس چیز کو چھو لیتا تھا شاعری بن جاتی تھی۔

(ناول سے میری دل چسپی) بہت بعد میں شروع ہوئی، جب میں یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم کے پہلے سال میں تھا۔ اس وقت میری عمر انیس سال کی رہی ہو گی اور میں نے "پشاور فورس" پڑھا۔ میں اس کثف کے بارے میں پہلے بات کر چکا ہوں۔ یہی وہ موقع تھا جب مجھے ناول سے پہلی بار دل چسپی پیدا ہوئی، جب میں نے ہر زمانے کے تمام اہم ترین ناولوں کو

پڑھنے کا تہیہ کیا، سارے ناول، بائبل سے لے کر، جو ایک ایسی داستانِ کتاب ہے جس میں ہر وقت عجیب و غریب واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ میں نے ہر چیز ترک کر دی، اپنی قانون کی ڈگری سمیت، اور خود کو ہمہ تن ناول پڑھنے میں لگا دیا۔ ناول پڑھنے میں، اور ناول لکھنے میں۔

(میرے شاعرانہ پس منظر کا اظہار، سب سے بڑھ کر) میرے خیال میں "سردار کا زوال" میں جوتا ہے (جس کی تعریف میں نے نثری نظم۔۔۔ اقتدار کی تنہائی کے موضوع پر ایک نظم۔۔۔ کے طور پر کی ہے)۔ میں نے اسے نثری نظم ہی کے طور پر لکھا تھا۔ کیا آپ نے محسوس کیا کہ اس میں روبن داریو کی شاعری کے پورے پورے ٹکڑے شامل ہیں؟ "سردار کا زوال" داریو کے چاہنے والوں کی جانب اشاریوں کنایوں سے بھرا پڑا ہے۔ وہ کتاب کا ایک کردار بھی ہے، اور اس کی ایک نظم بڑے اطمینان سے ڈال دی گئی ہے، وہ نثری نظم جو اس طرح ہے:

There was a monogram on your white
handkerchief, a red monogram of a name which
was not yours, my Lord.

(ناول اور شاعری کے علاوہ) میں بہت سی ایسی کتابیں پڑھتا ہوں جو بطور ادب کے نہیں بلکہ اپنی دستاویزی قدر و قیمت کے باعث زیادہ معروف ہیں۔ مثلاً مشہور لوگوں کی یادداشتیں، خواہ وہ جھوٹ پر مبنی ہوں، سوانحی کتابیں اور مضامین۔ (میری پسندیدہ کتابوں میں *Or I'll Dress You in Mourning*، دو مینیک لایبیرس اور لیری کونز کی لکھی ہوئی ایل کوردویز کی سوانح، *The Day of the Jackal* شامل ہیں، اور باباں *Papillon*) جو ایک بے حد دلورہ انگیز کتاب ہے جس میں کسی طرح کی کوئی ادبی خوبی نہیں ہے۔ اسے کسی ایسے اچھے ادیب کے قلم سے دوبارہ لکھا جانا چاہیے جو یہ تاثر دے سکے کہ اسے کسی ہندی نے لکھا ہے۔

(جہاں تک ان غیر ادبی اثرات کا تعلق ہے جو میری تحریروں کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوئے) میں پہلے ہی ذکر کر چکا ہوں کہ میری نانی ایک توہم پرست عورت تھیں جن کا تخیل بے حد آب دار تھا اور جو ہر رات قبر کے اُس پار کے قصے سنا سنا کر مجھے دہلائی رہتی تھیں۔ میرے نانا نے، جب میں آٹھ سال کا تھا، مجھے ان تمام جنگلوں کے واقعات سنائے تھے جن میں انھوں نے حصہ لیا تھا۔

میرے نانا نانی کا تعلق گالیسیا سے تھا، اور انھوں نے مجھے جو مافوق الفطرت قصے سنائے تھے ان میں سے بیشتر گالیسیا ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ مافوق الفطرت سے ہمارے شغف میں ہماری افریقی وراثت کا بھی حصہ ہے۔ کولومبیا کا کریبین سائل اور برازیل مل کر لاطینی

امریکا کا وہ حصہ میں جو افریقا سے قریب ترین ہے۔ اس سلسلے میں ۱۹۷۸ میں میرے انگولا کے سفر نے مجھے میری زندگی کا ایک سب سے مسور کن تجربہ بخشا۔ یہ میری زندگی کا ایک اہم موڑ تھا۔ مجھے وہاں ایک اجنبی، مکمل طور پر نامانوس، دنیا پانے کی توقع تھی، لیکن جس لمحے میں نے افریقا میں قدم رکھا اور وہاں کی ہوا میں سانس لیا، اسی لمحے سے مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میں اپنے بچپن کی دنیا میں واپس پہنچ گیا ہوں۔ ہاں، وہاں میں نے اپنے بچپن کو از سر نو دریافت کیا، ان سب رسوم و رواج، تمام چیزوں کو جنہیں میں بھول چکا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے اپنے بچپن کے دیکھے ہوئے ڈراونے خواب بھی دوبارہ نظر آنے لگے۔

لاٹینی امریکا میں ہمیں سکھایا جاتا ہے کہ ہم ہسپانوی ہیں۔ بے شک یہ جزوی طور پر درست ہے، اس لیے کہ ہماری تہذیبی تشکیل میں ہسپانوی عنصر کی اہمیت مسلم ہے؛ لیکن انگولا کے اس سفر میں میں نے دریافت کیا کہ ہم افریقی بھی ہیں، یا بلکہ ہم ایک نسلی آمیزہ ہیں۔ ہمارے کلچر کو بہت سی مختلف نسلوں نے مالال کیا ہے۔ مجھے اس سے پہلے اس کا شعور نہ تھا۔

کریبین کے خطے میں، جہاں میرا جنم ہوا، کلچر کی ایسی بیہتیں موجود ہیں جو اپنی اصل میں افریقی ہیں، جو اتنی پلانوں کے علاقے میں پائی جانے والی تہذیبی بیہتوں سے بہت مختلف ہیں جہاں مقامی تہذیبیں زیادہ مضبوط ہیں۔ افریقی غلاموں کے فراوان تخیل، کولمبس سے پہلے کے مقامی باشندوں کے تخیل، فیئٹھی کے آندھنی ذوق اور گالیسیا کی مافوق الفطرت روایات نے آئینت ہو کر حقیقت کو ایک مخصوص طلسمی انداز میں دیکھنے کی صلاحیت پیدا کی۔ یہ کریبین کے علاقے اور برازیل میں مشترک ہے۔ اس صلاحیت سے ایک مخصوص ادب، ایک مخصوص موسیقی اور مصوری کا ایک مخصوص اسلوب پیدا ہوا (جو کیوبا کے ولفرید ولام کے اسلوب کی طرح ہے)، جو سب اس خطے کے جمالیاتی اظہار ہیں۔

کریبین نے مجھے حقیقت کو ایک مختلف انداز سے دیکھنا اور مافوق الفطرت کو روزمرہ زندگی کے ایک حصے کے طور پر قبول کرنا سکھایا۔ کریبین ایک منفرد دنیا ہے جس کے طلسمی ادب کی پہلی تحریر "کرسٹوفر کولمبس کی ڈائری" ہے، ایک کتاب جو نادر روزگار پودوں اور دیومالائی معاشروں کے قصے سناتی ہے۔ کریبین کی تاریخ طلسم سے بھرپور ہے؛ ایک طلسم جسے سیاہ فام غلام افریقا سے لائے، لیکن جسے سویڈش، ولندیزی اور انگریز قزاق بھی لائے جو نیو آریلینز میں اوپر باؤس قائم کرنے یا عورتوں کے دانتوں کو بیروں سے بھرنے کو کوئی بڑی بات نہ سمجھتے تھے۔ دنیا میں کہیں بھی آپ کو یہ نسلی آمیزش اور یہ تصادات نہیں ملیں گے جو کریبین میں پائے جاتے ہیں۔ میں اس خطے کے تمام جزیروں سے واقف ہوں؛ ان میں بسنے والے شہد کی رنگت

والے ملاتا باشندے جن کی آنکھیں سبز ہوتی ہیں اور گردنوں میں سنہری رومال پڑے ہوتے ہیں، یا دوٹلے ہند چینی جو کپڑے دھوئے اور تعویذ فروخت کرتے ہیں؛ سبزی بائیں جلد والے ایشیائی جو اپنی ہاتھی دانت کی دکانوں سے اٹھ کر گلی کے بیچوں بیچ رفیع حاجت کرنے لگتے ہیں؛ ایک طرف ان جزیروں میں واقع پتے ہوئے گرد اُکود قصبے ہیں جن کے مکانات سمندری طوفانوں میں ڈبے جاتے ہیں، اور دوسری طرف دھندلے شیشوں والی بلند و بالا عمارات اور سات رنگوں کا سمندر۔ اگر میں کریبین کے بارے میں بات کرنا شروع کر دوں تو پھر میں رک نہیں سکتا۔ یہ نہ صرف وہ دنیا ہے جس نے مجھے لکھنا سکھایا بلکہ یہ وہ واحد مقام ہے جو مجھے واقعی اپنا گھر محسوس ہوتا ہے۔

عام طور پر میں سمجھتا ہوں کہ کوئی ادیب ایک ہی کتاب لکھتا ہے، اگرچہ یہ واحد کتاب کئی جلدوں میں مختلف عنوانات کے تحت شائع ہوتی ہے۔ یہ بات آپ کو بالزاک، کوئریڈ، میکول اور بلاشبہ فاکنر کے ہاں نظر آتی ہے۔ ان کئی کتابوں میں سے بعض اوقات کوئی ایک کتاب بقیہ کتابوں کے مقابلے میں بہت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے اور اس ادیب کو ایک واحد اور اصل کتاب کا مصنف سمجھا جانے لگتا ہے۔ سروانٹیس کی کہانیاں کس کو یاد ہیں؟ مثلاً The Graduate who Thought He was Made of Glass کس کو یاد ہے؟ لیکن اس کے باوجود اسے اتنی ہی مسرت کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے جتنا سروانٹیس کی نمائندہ تحریروں کو۔

(اگر یہ سچ ہے کہ ہر ادیب زندگی بھر ایک ہی کتاب لکھتا رہتا ہے تو میری کتاب کون سی ہوگی؟ ماکوندو کی کتاب؟) ایسا نہیں ہے۔ میرے دو ناول "پتوں کا طوفان" اور "تنہائی کے سو سال"، اور چند کہانیاں جو "بڑی ماما کا جنازہ" نامی مجموعے کا حصہ ہیں، ماکوندو میں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ میری دیگر تحریروں "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا"، "سمسوس وقت" اور "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" کا محل وقوع کریبین کا ایک اور ساحلی قصبہ ہے۔ (ایک ایسا قصبہ جس میں ریل گاڑیاں اور کیلوں کی مٹک نہیں ہے، مگر ایک دریا ہے۔ ایک ایسا قصبہ جہاں تک صرف لانچ کے ذریعے سے پہنچا جاسکتا ہے۔

(میری کتاب ماکوندو کی نہیں بلکہ) تنہائی کی کتاب ہے۔ اگر آپ کو یاد ہو تو "پتوں کا طوفان" کا مرکزی کردار تنہائی میں زندہ رہتا اور مر جاتا ہے۔ تنہائی "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" کے مرکزی کردار پر بھی مسلط ہے؛ کرنل ایک کے بعد ایک ہر صبح کو، اپنی بیوی اور اپنے مرغ کے

ساتھ، جنگ کی اُس پینشن کا انتظار کرتا ہے، جو کبھی نہیں آتی۔ "موسم وقت" میں قصبے کا میر بھی، جو وہاں کے باشندوں کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے، ایک تنہا کردار ہے۔ وہ اپنے انداز میں اقتدار کی تنہائی سے متعارف ہوتا ہے۔ (بالکل اور یلیانو بوندیا اور "سردار کا زوال" کے ڈکٹیٹر کی طرح۔) "سردار کا زوال" اور بلاشبہ "تنہائی کے سوسال" کا بنیادی خیال تنہائی ہی ہے۔

تنہائی میر سے نزدیک ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے ہر کوئی دوچار ہوتا ہے۔ ہر ایک جدا جدا ذریعے اور طریقے سے اس کا اظہار کرتا ہے۔ یہ احساس اتنے بے شمار ادیبوں کی تحریروں میں نفوذ کرتا نظر آتا ہے، اگرچہ ان میں سے بعض اس کا اظہار غیر شعوری طور پر کرتے ہوں گے۔ میں بھی انہیں میں سے ایک ہوں۔

("پتوں کا طوفان" اپنے اندر "تنہائی کے سوسال" کا بیج رکھتا تھا۔ اس نوجوان شخص کے لیے جس نے وہ پہلا ناول لکھا) مجھے بہت ہمدردی محسوس ہوتی ہے، کیوں کہ اس نے یہ کتاب عجلت میں لکھی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ آئندہ کچھ نہیں لکھے گا، کہ اس کے پاس یہی ایک موقع ہے، تو اس نے اپنی تمام جمع شدہ آگہی، خصوصاً وہ ادبی تکنیکیں اور ترکیبیں جو اس نے ان انگریز اور امریکی ادیبوں سے مستعار لی تھیں جنہیں وہ اُن دنوں پڑھا کرتا تھا، اس میں سمودی تھی۔

میری عمر اس وقت بائیس برس کی تھی۔ میں کوچہ جراثیم میں رہا کرتا تھا، اتفاقی گاہکوں کے لیے ایک ہوٹل میں، جو درحقیقت قہر خانہ تھا۔ رات بھر کے لیے کمرے کا کرایہ ڈیڑھ پیسو ہوا کرتا تھا۔ اخبار سے مجھے فی کالم تین پیسو ملا کرتے تھے، اور کبھی کبھی ادارہ لکھنے کے عوض تین پیسو اور مل جاتے تھے۔ جب کبھی میرے پاس کمرے کا کرایہ ادا کرنے کے لیے رقم نہ ہوتی تو میں ہوٹل کے ملازم کے پاس "پتوں کا طوفان" کا مسودہ ضمانت کے طور پر رکھوا دیا کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میرے لیے ان کاغذوں کی بہت اہمیت ہے۔ بہت زمانے بعد، جب میں "تنہائی کے سوسال" لکھ چکا تھا، مجھے وہی ملازم ان لوگوں کے ہجوم میں ملا جو مجھ سے ملنے یا آٹو گراف لینے آئے تھے؛ اُسے سب کچھ یاد تھا۔

جب میں نے "پتوں کا طوفان" لکھا تو میرا عقیدہ تھا کہ ہر اچھے ناول کو حقیقت کی شاعرانہ تکتیلیب ہونا چاہیے۔ لیکن، اگر آپ کو یاد ہو، وہ کتاب جس زمانے میں شائع ہوئی وہ کولومبیا میں بے حد خوں ریز سیاسی استبداد کا دور تھا، اور میرے جنگجو دوستوں نے مجھے بہت لعنت ملامت کی۔ "تمہارا ناول کسی چیز کی مذمت نہیں کرتا، نہ کسی شے کا پردہ چاک کرتا ہے،" انہوں نے کہا۔ اب

مجھے یہ خیال نہایت سادہ لوحی اور بھولپن پر مبنی معلوم ہوتا ہے، لیکن اُس وقت مجھے محسوس ہوا کہ مجھے اپنی تحریروں میں ملک کی فوری سیاسی اور سماجی حقیقت کا زیادہ احاطہ کرنا چاہیے، اور میں اپنے ابتدائی ادبی خیالات سے بہت دور ہٹ گیا۔ خوش قسمتی سے بعد میں میں دوبارہ انہیں خیالات کی طرف لوٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر اس درمیانی عرصے میں مجھے اپنا سر پیاز دیے جانے کا شدید خطرہ لاحق رہا۔

"کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا"، "منوس وقت" اور "بڑی ماما کا جنازہ" یہ تمام کتابیں کوئٹہ میں زندگی کی حقیقت کو منعکس کرتی ہیں، اور یہی بنیادی خیال ان کی منطقی ساخت کا تعین کرتا ہے۔ مجھے ان کو لکھنے پر کوئی پچھتاوا نہیں، لیکن یہ کتابیں پہلے سے سوچے ہوئے ادب سے تعلق رکھتی ہیں، جو حقیقت کا ایک جامد اور محدود ورژن پیش کرتا ہے۔ یہ کتابیں خواہ کتنی ہی اچھی یا بری کیوں نہ ہوں، یہ وہ کتابیں ہیں جو اپنے آخری صفحے پر ختم ہو جاتی ہیں۔ اب میں انہیں بہت محدود کن پاتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اس سے بہتر لکھے کا اہل ہوں۔

(میرے ادبی خیالات میں تبدیلی کا باعث) میرا اپنی تحریروں پر غور و فکر تھا۔ میں ان پر طویل عرصے تک غور کرتا رہا، اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ میری وابستگی اپنے ملک کی سماجی اور سیاسی حقیقت سے نہیں بلکہ پوری موجودہ اور آئندہ دنیا کی حقیقت سے ہے، اس کے کسی پہلو کی طرف داری یا تھیں کیے بغیر۔

جیسا کہ آپ کو بخوبی علم ہے، جب میرے ذاتی سیاسی انتخاب کا معاملہ آتا ہے تو میری سیاسی وابستگی واضح ہے۔ میں دنیا کو سوشلسٹ دیکھنا چاہتا ہوں، اور یقین رکھتا ہوں کہ جلد یا بدیر ایسا ہی ہو گا۔ لیکن اس شے پر مجھے بے شمار اعتراضات ہیں جس کا نام لاطینی امریکا میں "وابستہ ادب" پڑ گیا ہے، یا جسے زیادہ درست طور پر سماجی احتجاج کا ناول کہا جاتا ہے، یعنی اس ادب کا نقطہ عروج۔ ان اعتراضات کی وجہ یہ ہے کہ میرے نزدیک دنیا اور زندگی کے بارے میں اس کا محدود تصور سیاسی معنوں میں کسی مقصد کے حصول میں مدد نہیں کرتا۔ شعور کی بیداری کے کسی عمل کو ممیز کرنے کے بجائے وہ درحقیقت اسے سُست کر دیتا ہے۔ لاطینی امریکا کے باشندے کسی ناول سے اس جبر اور بے انصافی کے انکشاف سے، جس سے وہ بخوبی واقف ہیں، کچھ زیادہ کا تھکنا کرتے ہیں۔ میرے بہت سے جنگجو دوست جو ادیبوں پر یہ پابندیاں عائد کرتے ہیں کہ انہیں کیا لکھنا چاہیے اور کیا نہیں، تخلیقی آزادی پر پابندی عائد کر کے، شاید غیر شعوری طور پر، ایک رجعت پسندانہ موقف اختیار کر رہے ہوتے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ محبت کے موضوع پر لکھا ہوا ناول بھی

اتنا ہی معتبر ہے جتنا کوئی اور ناول۔ درحقیقت کسی ادیب کا فرض -- آپ چاہیں تو اسے اس کا انقلابی فرض کہہ لیں -- یہ ہے کہ وہ اچھا لکھے۔

(فوری سیاسی حقیقت سے وابستگی سے خود کو آزاد کر کے، حقیقت کے بارے میں وہ رویہ اختیار کرنے کے سلسلے میں جس کا اظہار "تنہائی کے سو سال" کی صورت میں ہوا) میری نانی کی سنائی ہوئی کہانیوں نے پہلے رہنما اشارے فراہم کیے۔ ان کے قصبے کے باشندوں کے اساطیر، روایتیں اور عقائد بڑے فطری انداز میں نانی کی روزمرہ زندگی کا حصہ تھے۔ ان کی شخصیت کو اپنے ذہن میں رکھ کر میں نے یکایک محسوس کیا کہ میں ہرگز کوئی چیز ایجاد نہیں کر رہا ہوں، بلکہ فقط شگুনوں، پیش قیاسیوں، معالجوں اور ہموں کی ایک ایسی دنیا کو گرفت میں لا کر اسے بیان کر رہا ہوں، جو نہایت مستند طور پر ہماری اپنی ہے، لاطینی امریکی ہے۔ مثال کے طور پر کولومبیا کے وہ باشندے جو دعائیں پڑھ کر اپنی گایوں کے کانوں میں گھسے ہوئے کیرٹسے ٹکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لاطینی امریکا میں ہماری روزمرہ زندگی اس قسم کی چیزوں سے بھری پڑی ہے۔

ان محدودات کی مدد کے بغیر جو عقلیت پسند اور اسٹالنٹ، حقیقت پر، ہماری حقیقت پر، اُسے اپنے لیے آسان بنانے کی غرض سے زنانوں سے عائد کرتے آئے ہیں، صرف اس حقیقت پر نظر ڈال کر میں "تنہائی کے سو سال" لکھنے میں کامیاب ہو سکا۔

(جہاں تک "تنہائی کے سو سال"، "سرور کا زوال" اور بعد کی کہانیوں میں پائے جانے والے عدم تناسب اور مبالغے کا تعلق ہے) تو یہ عدم تناسب بھی ہماری حقیقت کا حصہ ہے۔ ہماری حقیقت خود عدم تناسب کی ایک مثال ہے۔ اس سے اکثر لکھنے والوں کے لیے سنگین مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں، کیوں کہ انہیں اس کو بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ اگر آپ کسی دریا کے بارے میں بات کر رہے ہوں تو وہ طویل ترین دریا جس کا کوئی یورپی قاری تصور کر سکتا ہے ڈینیوب ہے، جو ۷۰۰ میل لمبا ہے۔ کسی قاری کے ذہن میں آمازون کس طرح سما سکتا ہے جو بعض مقامات پر اس قدر چوڑا ہے کہ اس کے پار دیکھا نہیں جاسکتا؟ لفظ "طوفان" سے یورپی قاری کے ذہن میں ایک تصور ابھرتا ہے، اور ہمارے ذہن میں بالکل مختلف تصور۔ یہی معاملہ لفظ "بارش" کا ہے، جو ممکن ہی نہیں کہ منطقہ حارہ کی موسلا دھار برسات کے مضموم کی ترسیل کر سکے۔ ابلتے ہوئے دریا، زمین کو لرزا دینے والے طوفان، پورے پورے قصبوں کو بہا لے جانے والے سیلاب اختراعات نہیں بلکہ ہمارے ضعف کرے کی فطری دنیا کی وسیع و عریض جہات ہیں۔

("تنہائی کے سو سال" میں جو زبان میں نے استعمال کی وہ میری اس سے پہلے کی تحریروں میں، سوائے "بڑی ماما کا جنازہ" نامی کہانی کے، استعمال نہیں ہوئی تھی)۔ شاید یہ تعلی معلوم ہو، لیکن

یہ زبان ہمیشہ سے میرے قبضہ اختیار میں تھی۔ یہ محض اتفاق ہے کہ مجھے اس سے پہلے اسے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ (میں نہیں سمجھتا کہ زبان کسی ادیب کی شناخت کا ایک لاشعور حصہ ہے؟) میرا خیال ہے کہ تکنیک اور زبان کے انتخاب کا تعین کتاب کے موضوع سے ہوتا ہے۔ جو زبان میں نے "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا"، "منوس وقت" اور "بڑی ماما کا جنازہ" میں استعمال کی وہ چچی تلی اور محتاط تھی، اور درستی کے ایک صحافیانہ شغف کا نتیجہ تھی۔ "تہائی کے سو سال" میں مجھے، اس حقیقت کو بیان کرنے کے واسطے جس کا نام میرے اور آپ کے درمیان دیوالائی یا طلسمی حقیقت طے ہوا ہے، مجھے ایک زیادہ فراوان زبان درکار تھی۔ جبکہ "سردار کا زوال" لکھنے کے لیے مجھے ایک اور طرح کی زبان وضع کرنی پڑی، اور خود کو اس زبان سے علیحدہ کرنا پڑا جو میں نے "تہائی کے سو سال" میں استعمال کی تھی۔

اپنی اولین تحریروں کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے وہی شفقت محسوس ہوتی ہے جو ایک باپ اپنے بچوں کے بارے میں محسوس کرتا ہے، جو بڑے ہو کر گھر سے چلے گئے ہوں۔ میں ان ابتدائی کتابوں کو بہت دور اور بے مدافعت پاتا ہوں، مگر ان میں اور بعد کی کتابوں میں ایک رشتے کا تار موجود ہے، اور میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے ہمہ وقت یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ یہ تار موجود ہے، اور اس کی حفاظت کرنا ضروری ہے۔

ادبی نقطہ نظر سے میری سب سے اہم کتاب "سردار کا زوال" ہے، جو شاید مجھے فراموشی سے بچا سکے۔ (مجھے سب سے زیادہ لطف بھی اسی کتاب کو لکھنے میں آیا) کیوں کہ یہی وہ کتاب ہے جسے میں ہمیشہ سے لکھنا چاہتا تھا، اور اسی میں میں اپنے ذاتی اعترافات کے معاملے میں، دیگر کتابوں کی بہ نسبت، سب سے آگے گیا ہوں (جو ظاہر ہے کہ مناسب طور پر چھپا کر بیان کیے گئے ہیں۔) اسے لکھنے میں مجھے سترہ برس لگے، اور میں نے پہلے دو مسودوں کو ترک کر کے اسے تیسری بار لکھا۔ "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" لکھنے سے پہلے میں "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" کو اپنی بہترین تحریر خیال کیا کرتا تھا۔ میں نے اسے نو مرتبہ لکھا تھا اور وہ مجھے اپنی تحریروں میں سب سے کم شکست پذیر معلوم ہوتی تھی، (لیکن سیرے خیال میں "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" اس سے بہتر ہے)، اس لحاظ سے کہ میں اس کے ساتھ وہ کرنے میں کامیاب رہا جو میں کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس سے پہلے کبھی ممکن نہیں ہوا تھا۔ میری دوسری کتابوں میں کہانی غلبہ پالیتی تھی، کردار خود اپنی زندگی حاصل کر لیتے تھے اور جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ لیکن میں محسوس کرتا تھا کہ مجھے ایک ایسی کتاب ضرور لکھنی چاہیے جس پر میں مکمل قابو رکھ سکوں، اور میرے خیال میں "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" میں میں ایسا کر پایا ہوں۔ اس کا موضوع ایک سراغ رسانی کی کہانی کی سی جو کس

ساخت کا مستاضی تھا۔

(میں اپنی تحریروں میں کبھی "تنہائی کے سوسال" کا ذکر نہیں کرتا، جب کہ بہت سے نقادوں کے خیال میں یہ میری بہترین کتاب ہے۔ مجھے اس کے بارے میں سوچتے ہوئے بہت تلخی محسوس ہوتی ہے۔) اس نے میری زندگی کو قریب قریب تباہ کر دیا۔ اس کے شائع ہونے کے بعد کوئی چیز ویسی نہ رہی جیسی پہلے تھی۔ کیوں کہ شہرت آپ کے احساس حقیقت کو زبردست کر دیتی ہے، تقریباً اسی حد تک جس حد تک اقتدار، اور اس سے آپ کی نجی زندگی کو مستقل خطرہ لاحق رہتا ہے۔ بد قسمتی سے کوئی شخص اسے باور نہیں کر سکتا جب تک اسے اس سے خود سابقہ نہ پڑے۔

(مجھے محسوس ہوتا ہے کہ "تنہائی کے سوسال" کی کامیابی میری بقیہ تحریروں کے حق میں غیر منصفانہ ہے۔) "سرمدار کا زوال" اس سے کہیں زیادہ اہم ادبی کار نمایاں ہے۔ لیکن جبکہ یہ اقتدار کی تنہائی کے بارے میں ہے، "تنہائی کے سوسال" روزمرہ زندگی کی تنہائی سے متعلق ہے۔ یہ ہر شخص کی داستان حیات ہے۔ مزید یہ کہ ایک سادہ، رواں، مستقیم، اور میں تو یہاں تک کہوں گا کہ، سلی انداز میں لکھی گئی ہے۔

(جب میں "تنہائی کے سوسال" لکھنے بیٹھا تو) درحقیقت میں ادب میں ان تمام تجربات کے اظہار کا ذریعہ تلاش کرنا چاہتا تھا جو بچپن میں مجھ پر اثر انداز ہوئے تھے۔ (بہت سے نقاد اس کتاب میں بنی نوع انسان کی تاریخ کے بارے میں کوئی حکایت یا تمثیل دیکھتے ہیں، لیکن) میں صرف اپنے بچپن کی دنیا کی ایک تصویر چھوڑ جانا چاہتا تھا جو، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، ایک بہت وسیع اور غمناک مکان میں بسر ہوا تھا، جہاں میری بہن تھی جو مٹی کھایا کرتی تھی، میری نانی تھیں جو مستقبل کی پیش گوئیاں کیا کرتی تھیں، اور یکساں ناموں والے بے شمار رشتے دار تھے جو مسرت اور دیوانگی میں کبھی کوئی خاص تفریق نہ کر پاتے تھے۔

(نقادوں کو اس کتاب کے پیچھے اس سے زیادہ پیچیدہ ارادے دکھائی دیتے ہیں) لیکن اگر ان کا وجود ہے تو وہ قطعی غیر ارادی رہے ہوں گے۔ ہوتا یہ ہے کہ ناول نگاروں کے برعکس نقاد کسی کتاب میں وہ شے تلاش کر لیتے ہیں جو وہ چاہتے ہیں، نہ کہ وہ شے جو دراصل اس میں ہوتی ہے۔

(نقادوں کے بارے میں میرے طنزیہ لہجے کی وجہ یہ ہے کہ) ان میں سے بیشتر کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ "تنہائی کے سوسال" جیسا ناول کچھ ایک مذاق کی طرح ہے، قریبی دوستوں کے لیے شرارتی اشاروں سے بھرا ہوا، اور یوں خلیفہ گیری کے ایک پہلے سے مقرر حق کی بنیاد پر وہ کتاب کی تشریح کی ذمہ داری لے بیٹھتے ہیں، اور خود کو پرلے درجے کا احمق بنا دینے کا خطرہ مول لیتے ہیں۔

مثال کے طور پر، مجھے یاد ہے کہ جب ایک نقاد کی نظر اس بات پر پڑی کہ ایک کردار۔۔ گاہر۔ نکل۔۔ رابیلے (Rabelais) کے کلیات پیرس لے جاتا ہے، تو اس نے سوچا کہ اس نے اول کی ایک اہم کلید پالی ہے۔ اس دریافت کے بعد اس نے تمام مبالغہ آرائیاں اور 'پینٹا گروئل' کی سی فراوانیاں رابیلے کے اثرات کے سر منڈھ دیں۔ درحقیقت میں نے یہ کنا یہ بان بوجھ کر کیلے کے چھلکے کے طور پر ڈالا تھا، اور بہت سے نقاد اس پر سے بھسلے ہیں۔

(لیکن نقادوں کے فرمودات سے قطع نظر، بونڈیا خاندان کی کہانی لاطینی امریکا کی تاریخ کا بیان بھی ہو سکتی ہے۔) لاطینی امریکی تاریخ بھی دیوبیکل بے مصرف مہمت اور عظیم ڈراموں سے ل کر بنی ہیں، آغاز سے پیشتر ہی سے فراموشی جن کی تھدیر تھی۔ ہم یادداشت کی گم شدگی کی وبا کا بھی شکار ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب کسی کو یاد نہیں رہا کہ بنانا کمپنی کے مزدوروں کا قتل عام واقعی پیش آیا تھا۔ انہیں کچھ یاد ہے تو بس کرنل اور یلیانو بونڈیا۔

(اور وہ تینتیس جنگیں جو کرنل اور یلیانو بونڈیا نے باریں، ہماری اپنی سیاسی محرومیوں کا اظہار ہو سکتی ہیں۔ اگر، برسیل تذکرہ، کرنل فتح مند ہو جاتا) تو وہ بہت کچھ "سردار کا زوال" کے مرکزی کردار جیسا ہوتا۔ لکھنے کے دوران میں ایک مقام پر مجھے تحریک ہوئی تھی کہ کرنل کو اقتدار حاصل کرنے دوں۔ اگر ایسا ہو جاتا تو یہ کتاب "تنہائی کے سوسال" کے بجائے "سردار کا زوال" ہوتی۔

"تنہائی کے سوسال" میں کرنل اور یلیانو بونڈیا کا ایک قیدی اس سے کہتا ہے، "مجھے فکر یہ ہے کہ فوج سے اتنی نفرت کے باعث، اس کے خلاف اس قدر جدوجہد اور ان کے بارے میں اس قدر سوچتے رہنے کے باعث، تم بھی اتنے ہی برے بن گئے ہو جتنی فوج۔" اور اپنی بات کے اختتام پر وہ کہتا ہے، "اس لحاظ سے تم ہماری تاریخ کے سب سے زیادہ مطلق العنان اور خوں ریز ڈکٹیٹر ثابت ہو گئے۔"

(بونڈیا خاندان کی تنہائی کا منہج) میرے خیال میں ان میں محبت کا فقدان ہے۔ آپ اس کتاب میں دیکھ سکتے ہیں کہ پوری صدی کے دوران میں، سور کی دُم والا اور یلیانو خاندان کا واحد فرد ہے جس کی پیدائش محبت کے نتیجے میں ہوئی۔ بونڈیا خاندان کے لوگ محبت کرنے کے اہل نہیں تھے، اور یہی ان کی تنہائی اور محرومی کی کلید ہے۔ تنہائی میرے نزدیک یگانگت کی عین ضد ہے۔

(یہ لاطینی امریکا کا ایک نہایت مخصوص رواج ہے کہ ہمارے نام باپ یا دادا کے نام پر رکھے جاتے ہیں، اور میرے خاندان میں تو یہ رواج لغویت کی اس سطح کو پہنچ چکا ہے کہ خود میرے بھائی کا نام بھی وہی ہے جو میرا۔ لیکن ناول میں اور یلیانو اور حوزے آرکا دیو نامی افراد میں امتیاز

کرنے کا ایک) نہایت سادہ سراغ موجود ہے۔ حوزے آرکادیو نسل کو آگے بڑھاتے ہیں، جبکہ اوریلینا نولاولدرہتے ہیں۔ استثنا صرف ایک ہے: حوزے آرکادیو سگندو اور اوریلینا نو سگندو۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہم شکل جڑواں بجائی ہونے کے باعث پیدائش کے وقت دونوں کی خصوصیات الٹ پلٹ ہو گئیں۔

(ناول میں حماقت۔۔ ایجادات، کیمیاگری، جنگ بازی۔۔ مردوں کی باطنی خصوصیت ہے، اور عقل مندی عورتوں کی۔) میرے خیال میں دنیا کا جاری و ساری رہنا عورتوں کی بدولت ہے اور وہی ہر شے کو تخریب اور فنا سے محفوظ رکھتی ہیں، جبکہ مرد تاریخ کا پسیا آگے چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں سے کون زیادہ پاگل ہے۔

(اس ناول کو لکھنے کے دوران سب سے دشوار لمحہ) اسے شروع کرنے کا تھا۔ مجھے وہ دن بالکل واضح طور پر یاد ہے جب بے انتہا دشواری سے میں نے اس کا کہ پہلا جملہ مکمل کیا، اور پھر دہشت زدہ ہو کر خود سے سوال کیا کہ آخر اس کے بعد کیا ہو گا۔ درحقیقت اس مقام تک جب جینگل میں قدیم جہاز کو دریافت کیا جاتا ہے، مجھے یہ خیال نہ تھا کہ یہ کتاب آگے چل پائے گی۔ لیکن اس مقام کے بعد سے اس تمام شے نے ایک جنون کی سی صورت اختیار کر لی جس میں بے پناہ لذت بھی تھی۔

(جس روز میں نے اسے مکمل کیا) مجھے روز صبح نو بجے سے سہ پہر تین بجے تک کام کرتے ہوئے اٹھارہ مہینے ہو چکے تھے۔ میں یقینی طور پر جانتا تھا کہ یہ آخری دن ہے۔ لیکن کتاب اپنے فطری انجام تک ایک غلط وقت پر پہنچی، اس وقت گیارہ بجے تھے۔ مریدس گھر پر موجود نہ تھی، اور مجھے فون پر کوئی شخص نہ مل سکا جسے میں اس کے بارے میں بتا سکتا۔ مجھے اپنی مدد درجہ حواس باختگی یوں یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس باقی ماندہ وقت کا کیا کروں، اور میں اپنے ذہن میں مختلف چیزیں ایجاد کرنے لگا تھا کہ خود کو تین بجے سہ پہر تک باقی رکھ سکوں۔

میرے ایک روسی دوست کی ملاقات ایک خاتون، ایک نہایت بوڑھی خاتون، سے ہوئی جو اس پوری کتاب کو، پہلی سے آخری سطر تک، ہاتھ سے نقل کر رہی تھی۔ میرے دوست نے اس سے وجہ پوچھی تو اس نے جواب میں کہا، ”کیوں کہ میں جانتا چاہتی ہوں کہ پاگل دراصل کون ہے، مصنف یائیں، اور یہ جاننے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ میں کتاب کو نئے سرے سے لکھوں۔“ میرے لیے اس خاتون سے بہتر قاری کا تصور کرنا محال ہے۔

(”تنہائی کے سو سال“ کی مقبولیت میرے لیے ایک معما ہے) لیکن میں اس کا راز جاننا

نہیں چاہتا۔ میرے خیال میں یہ جاننا بہت خطرناک ہو گا کہ جو کتاب میں نے چند بہت قریبی دوستوں کو ذہن میں رکھ کر لکھی تھی، کیوں کہ باتوں باتہ بکے لگی۔

(میں نے اس ناول کو اٹھارہ برس کی عمر میں لکھنے کی کوشش کی تھی۔) اس وقت میں نے اسے "مکان" کا عنوان دیا تھا، کیوں کہ میرا خیال تھا کہ پوری کہانی بوئندیا خاندان کے مکان میں وقوع پذیر ہوگی۔ لیکن میں اس مقام تک بھی نہ پہنچ پایا کہ کہانی کی ایک مسلسل ساخت وجود میں آسکتی۔ میں نے اس کے صرف متفرق حصے لکھے، جن میں سے چند ان اخباروں میں شائع ہوئے جن میں میں اُن دنوں کام کر رہا تھا۔ (لیکن میں اس ناول پر کام جاری نہ کر سکے، کیوں کہ) اس وقت نہ تو میرے پاس اتنا تجربہ تھا، نہ اتنا ضبط، اور نہ اتنی تکنیکی مہارت کہ اس قسم کی کتاب لکھ سکتا۔

(لیکن یہ کہانی میرے ذہن میں پندرہ برس تک گھومتی رہی۔) مجھے اس کو بیان کرنے کے لیے مناسب لہجہ نہیں مل رہا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ مجھے پتہ چلتا ہو۔ ایک روز، جب مرسیڈس اور میں بچوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے اکاپلکو جا رہے تھے، یہ لہجہ ایک کوندے کی طرح میرے ذہن میں آیا۔ یہ کہانی مجھے اس انداز میں بیان کرنی تھی جس انداز میں میری نانی اپنی کہانیاں سنایا کرتی تھیں، اور مجھے اُس سے پہلے سے آغاز کرنا تھا جب ننھے بچے کو اس کے نانا پہلی بار برف دکھانے لے گئے تھے۔ خط مستقیم میں بیان کی گئی تاریخ، جس میں غیر معمولی عنصر نہایت معصومیت کے ساتھ روزمرہ میں گھل جاتا ہے۔

ہم اکاپلکو نہ پہنچ سکے۔ (میں نے گاڑی کا رخ موڑا اور گھر پہنچ کر لکھنا شروع کر دیا۔) مرسیڈس کو اس طرح کی دیوانگی کا اکثر سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ نہ ہوتی تو میں یہ کتاب نہ لکھ سکتا۔ اس نے صورت حال کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ جو گاڑی میں نے چند ماہ پہلے خریدی تھی، اسے بیچ کر حاصل کردہ رقم مرسیڈس کے حوالے کر دی۔ میرا خیال تھا کہ ہم اس رقم کے سہارے چھ ماہ گزار سکتے ہیں، لیکن کتاب مکمل کرنے میں مجھے ڈیڑھ سال کا عرصہ لگ گیا۔ جب رقم ختم ہو گئی تو اس نے مجھ سے ایک لفظ نہ کہا۔ میں نہیں جانتا کہ اس نے یہ کس طرح کیا، لیکن ہمیں قسائی سے گوشت اور نان پانی سے روٹی ادھار ملتی رہی، اور مالک مکان نو ماہ تک کرائے کا انتظار کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ وہ مجھے کچھ بتائے بغیر سارا انتظام چلاتی رہی، اور مجھے وقتاً فوقتاً پانچ سو کاغذ بھی لالا کر دیتی رہی۔ میں ان پانچ سو کاغذوں سے کبھی محروم نہ رہا۔

جب کتاب مکمل ہوئی تو یہ مرسیڈس ہی تھی جس نے اسے ڈاک کے ذریعے ایڈیٹوریاں سیوڈاسیر کانا کو بھجوا دیا۔ (اسے ڈاک خانے لے جاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی، "اگر اس تمام مصیبت کے بعد یہ ناول بے کار ثابت ہوا تو کیا ہو گا؟") اس نے مسودہ نہیں پڑھا تھا۔ اسے

مسودے پڑھنا پسند نہیں۔

مجھے یقین تھا کہ یہ کتاب نقادوں کو پسند آئے گی، لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ اسے عوام میں بھی اتنی مقبولیت حاصل ہوگی۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید یہ پانچ ہزار کی تعداد میں بک جائے گی۔ اس سے پہلے میری تمام کتابیں اس وقت تک ایک ہزار سے زیادہ فروخت نہیں ہوتی تھیں۔ میرے مقابلے میں سیوڈامیریکانا والے زیادہ پُر امید تھے؛ ان کا خیال تھا کہ کتاب آٹھ ہزار تک بک سکتی ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ پہلا ایڈیشن دو ہفتوں کے اندر اندر صرف بیونس آئرس میں فروخت ہو گیا۔

(میرے والد کنزرویٹو پارٹی کے حامی ہیں۔ میں نے ابتدا ہی میں بائیں بازو کی حمایت کو سیاسی شعار بنالیا۔ لیکن اس کی وجہ میرا اپنے خاندان کے سیاسی خیالات کے خلاف رد عمل نہیں تھا) کیوں کہ اگرچہ میرے والد کنزرویٹو ہیں لیکن میرے نانا کرنل مارکیز لبرل تھے۔ میرے اولین سیاسی خیالات کا منبع وہی تھے، اس لیے کہ بچپن میں وہ میری تواضع پر یوں کی کہانیوں کے بجائے پچھلی خانہ جنگی کے ہولناک واقعات سے کرتے تھے جو آزاد خیال اور کلیسا کے مخالف افراد نے کنزرویٹو حکومت کے خلاف برپا کی تھی۔ میرے نانا ہی نے مجھے بنانا کمپنی کے مزدوروں کے اس قتل عام کے بارے میں بتایا تھا جو اراکانا کا میں میری پیدائش کے سال ہوا تھا۔ اس طرح آپ دیکھ سکتے ہیں کہ خاندان کے اثرات کے باعث میں جسے جمائے نظام کی حمایت کے بجائے اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوا۔

(میں نے پہلی بار سیاسی مضامین) رَپا کیرا میں اپنے سینکڑی اسکول میں پڑھے۔ اس میں ایسے بہت سے استاد تھے جن کی تربیت انیس سو تیس کی دہائی میں، صدر الفانسلوپیز کی بائیں بازو کی حکومت کے دور میں، ٹیپرز ٹریننگ کالج کے ایک مارکسی استاد کی زیر نگرانی ہوئی تھی۔ الجبرا کا استاد وقتے کے دوران ہمیں جدلیاتی مادیت پر لکچر دیا کرتا، کیسٹری کا استاد ہمیں لینن کی کتابیں پڑھنے کے لیے دیا کرتا، اور تاریخ کا استاد ہمیں طبقاتی کش مکش کے بارے میں بتایا کرتا۔ جب میں نے اس برفانی قید خانے کو خیر باد کہا تو میرے دو عقیدے بالکل پختہ ہو چکے تھے۔ ایک تو یہ کہ اچھے ناولوں کو حقیقت کی شاعرانہ تقلید ہونا چاہیے، اور دوسرا یہ کہ انسانیت کا فوری مستقبل سوشلزم میں ہے۔

بیس سال کی عمر میں میں کچھ عرصے کے لیے کمیونسٹ پارٹی کے ایک سیل سے بھی وابستہ ہا، لیکن مجھے یاد نہیں کہ اس عرصے میں میں نے کوئی خاص دلچسپی کا کام کیا ہو۔ میں کوئی پرجوش کارکن نہیں بلکہ ہمدرد تھا۔ اس کے بعد سے کمیونسٹوں کے ساتھ میرے تعلقات میں بہت سے شیب و فراز آئے ہیں۔ ہم اکثر ایک دوسرے سے برسریکا رہتے ہیں، کیوں کہ جب کبھی میں کوئی ایسا موقف اختیار کرتا ہوں جو انھیں پسند نہیں آتا تو ان کے اخبارات مجھ پر ہیج وچل پڑتے ہیں۔ لیکن میں نے کبھی سرعام ان کی مذمت نہیں کی، بدترین وقت میں بھی نہیں۔

(انیس سو ستاون میں میں نے ایک دوست کے ساتھ مشرقی جرمنی کا دورہ کیا) جس نے میرے سیاسی خیالات پر فیصلہ کن اثر ڈالا۔ میں نے اپنے اس سفر کے تاثرات اسی زمانے میں بوگوتا کے ایک رسالے میں قسط وار مضامین کی شکل چھپوائے تھے۔ ان مضامین کو بیس سال بعد چوری بچے غیر قانونی طور پر دوبارہ چھاپا گیا، جس کی وجہ میرے خیال میں کوئی صحافیانہ یا سیاسی دلچسپی نہیں تھی، بلکہ مقصد یہ تھا کہ میری ذاتی سیاسی تشوونما میں واقع ہونے والے مفروضہ تضادات کو انا گر کیا بائے۔ حالانکہ ان تضادات کا کوئی وجود نہ تھا۔ میں نے ان مضامین کے مجموعے کو قانونی حیثیت دے کر اپنی تحریروں کے کلیات میں شامل کیا جس کا عوامی ایڈیشن کو لومبیا کی ہر گلی کے کنڈر پر دستیاب ہے۔ میں نے ایک لفظ بھی تبدیل نہیں کیا۔ مزید برآں، پولینڈ کے موجودہ بحران کے اسباب کی وضاحت، میرے خیال میں، ان مضامین میں تلاش کی جا سکتی ہے جن پر اس زمانے کے عقیدہ پرستوں نے ریاست بائے متحدہ سے معاوضہ لے کر لکھے جانے کا الزام عائد کیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہی عقیدہ پرست آج، چوبیس برس بعد، بورشو سیاسی اور مالیاتی اداروں کی آرام دہ کرسیوں پر مستکن ہیں، جبکہ تاریخ نے میرے موقف کو درست ثابت کیا ہے۔

ان مضامین کا بنیادی قضیہ یہ تھا کہ عوامی جمہوریتیں جس راہ پر گامزن ہیں، اس راہ پر چلتے ہوئے وہ نہ تو مستند طور پر سوشلسٹ ہیں اور نہ ہو سکتی ہیں، کیوں کہ ان کا نظام ہر ملک میں موجود مخصوص حالات کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ باہر سے عائد کیا ہوا ایک نظام تھا جسے سوویت یونین نے مقامی عقیدہ پرست، بے تحیل کمیونسٹ پارٹیوں کی مدد سے نافذ کیا تھا جن کا واحد مقصد سوویت نمونے کا نظام ایک ایسے معاشرے میں زبردستی قائم کرنا تھا جہاں وہ درست نہیں بیٹھتا۔

(جس زمانے میں میں کیوبن خبر رساں ایجنسی پریندا لاطینا میں کام کرتا تھا، پرانی کیوبن کمیونسٹ پارٹی نے بہت سے انقلابی اداروں پر قبضہ جمانا شروع کر دیا، اور میں نے، اور دوسرے دوستوں نے، بطور احتجاج استعفا دے دیا۔) میری رائے میں ہمارا فیصلہ درست تھا۔ اگر ہم اپنے خیالات کے باوجود وہ ملازمت جاری رکھتے تو ہم پر انقلاب دشمن، سامراجی ایجنٹ یا ایسا ہی کوئی اور

لیبل لگا کر، جو اُس زمانے کے عقیدہ پرست، لوگوں پر لگانے کے عادی تھے، نکال باہر کیا جاتا۔ میر نے خود کو پیش منظر سے ہٹا لیا۔ میکسیکو میں اپنی کتابیں اور فلم اسکرپٹ لکھنے کے دوران، میر قریب سے اور احتیاط کے ساتھ کیوبا کے سیاسی عمل کے ارتقا کا مشاہدہ کرتا رہا۔ میری رائے یہ ہے کہ اگرچہ شروع کے طوفانی مدوجزر کے بعد سے کیوبا کے انقلاب نے ایک دشوار اور کبھی کبھی متناقض راہ اختیار کی ہے، اس کے باوجود اب بھی اس میں ایک ایسے سماجی نظام کا امکان موجود ہے جو زیادہ جمہوری، زیادہ منصفانہ اور ہماری ضروریات سے زیادہ مطابقت رکھنے والا ہے۔

(بعض لوگ کیوبا کو ایک طفیلی سوویت سیارہ سمجھتے ہیں،) لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میرے خیال میں ریاست ہائے متحدہ کی خاصیت اور عدم تقسیم کی بدولت، جو فلوریڈا کے ساحل سے نوے میل کے فاصلے پر ایک متبادل نظام حکومت کی موجودگی کو برداشت نہیں کر سکتا، کیوبا کو بیس سال سے ہنگامی حالات کا سامنا ہے۔ اس میں سوویت یونین کا کوئی قصور نہیں، جس کی مدد کے بغیر۔۔۔ چاہے اس مدد میں اس کے مفادات اور مقاصد کچھ بھی رہے ہوں۔۔۔ آج کیوبا کا وجود باقی نہ ہوتا۔ جب تک ریاست ہائے متحدہ کی خاصیت برقرار ہے، کیوبا کی صورت حال کو صرف ان ہنگامی حالات ہی کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے جو اسے، اپنے فطری تاریخی، جغرافیائی اور تہذیبی مفادات کے دائرے سے باہر، ایک مدافعا نہ طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

(جب فیدل کاسترو نے ۱۹۶۸ میں چیکوسلوواکیا میں روسی مداخلت کی حمایت کی تو) میں نے اس پر برسرعام احتجاج کیا، اور اگر اسی صورت حال دوبارہ پیش آئے تو میں دوبارہ یہی موقف اختیار کروں گا۔ میرے اور کاسترو کے موقف میں اختلاف یہ تھا۔۔۔ ہمارا ہر چیز پر اتفاق رائے نہیں ہے۔۔۔ کہ وہ روسی مداخلت کا جواز پیش کرنے لگا تھا، جب کہ میں اس کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ دوسری طرف اس نے اپنی تقریر میں عوامی جمہوریتوں کی اندرونی صورت حال کا جو تجزیہ کیا وہ اس تجزیے سے کہیں زیادہ شدید طور پر ناقدانہ تھا جو میں نے اپنے مضامین میں کیا تھا۔ ہر کیف، لاطینی امریکا کا مستقبل ہنگری، پولینڈ یا چیکوسلوواکیا میں نہیں بلکہ خود لاطینی امریکا میں صورت پذیر ہو گا۔ اس کے سوا کچھ سوچنا محض یورپی ذہن کا خبط ہے۔

میں کسی واحد تیسرے متبادل پر یقین نہیں رکھتا۔ میری رائے میں بہت سے متبادل موجود ہیں؛ اتنے ہی متبادل جتنے ملک امریکی براعظموں، بشمول ریاست ہائے متحدہ، میں واقع ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں اپنا اپنا راستا خود تلاش کرنا ہو گا۔ جہاں کہیں ممکن ہو ہم دوسرے براعظموں کی طویل، پر آشوب تواریخ کے حاصلات سے استفادہ کر سکتے ہیں، لیکن ہمیں میکسیکی انداز میں ان کی نقل نہیں کرنی چاہیے، جیسا کہ ہم اب تک کرتے آ رہے ہیں۔ صرف اسی طرح ہم آخر کار اپنے

فصوص انداز کا سوشلزم وضع کر سکتے ہیں۔ (جہاں تک میرا سوال ہے میں اپنے ملک میں) ایک ایسی حکومت دیکھنا چاہتا ہوں جو غریبوں کو خوشی دے سکے۔

(انسانی حقوق کے سلسلے میں میری طویل جدوجہد کی کامیابی یا ناکامی کا) تعیند لگانا بے حد دشوار ہے۔ اس قسم کا کام کوئی فوری یا واضح نتائج پیدا نہیں کرتا۔ اس کے نتائج اچانک، غیر متوقع طور پر، ظاہر ہوتے ہیں، اور ان میں اتنے سارے عناصر کارفرما ہوتے ہیں کہ یہ اندازہ لگانا ناممکن ہوتا ہے کہ اس میں کسی شخص کے کسی خاص عمل نے کیا کردار ادا کیا۔ یہ کام مجھ جیسے مشہور ادیب کے لیے، جو کامیابی کا عادی ہے، انکار کا ایک سبق ہے۔

اس سلسلے میں میرے جس کام نے مجھے سب سے زیادہ ذاتی تسکین بخشی، وہ میں نے ہمارا گوا میں ساندینستا کی فتح سے کچھ پہلے سرانجام دیا تھا۔ تو اس بورخے نے، جو اب وہاں کا وزیر داخلہ ہے، مجھے ایسی کوئی ترکیب سوچنے کو کہا جس سے سوموزا پر دباؤ ڈالا جاسکے کہ وہ کولومبیا میں سفارت خانے میں پناہ گزین بورخے کی بیوی اور سات سالہ بیٹی کو ملک سے، بمحافظت نکل جانے کی اجازت دے دے۔ ڈکٹیٹر یہ اجازت دینے سے انکار کر رہا تھا، کیوں کہ یہ کسی چھوٹے موٹے شخص کا نہیں بلکہ ساندینستا فرنٹ کے واحد بقید حیات بانی رکن کا خاندان تھا۔ بورخے اور میں گھنٹوں اس مسئلے پر غور کرتے رہے، یہاں تک کہ ہمیں ایک کارآمد نکتہ آ گیا۔ بچی ایک بار گردے کے انفیکشن میں مبتلا ہو چکی تھی۔ ہم نے ایک ڈاکٹر سے دریافت کیا کہ موجودہ صورت حال کا بچی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے، اور ڈاکٹر کے جواب نے ہمیں وہ دلیل فراہم کر دی جو ہم تلاش کر رہے تھے۔ اٹالیس گھنٹوں سے بھی کم وقت میں ماں اور بیٹی میکسیکو پہنچ چکی تھیں، کیوں کہ انہیں، سیاسی بنیاد پر نہیں بلکہ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر، بمحافظت انخلا کی اجازت مل گئی تھی۔

دوسری جانب مجھے سب سے زیادہ حوصلہ شکن معاملہ اس وقت پیش آیا جب، ۱۹۷۹ء میں، میں نے دو انگریز بینکاروں کی رہائی میں مدد دی جنہیں ایل سلوادور میں گریلوں نے اغوا کر لیا تھا۔ ان کے نام ایان میسی اور مائیکل چیٹرٹن تھے، اور انہیں اٹالیس گھنٹوں کے اندر اندر قتل کیا جانے والا تھا، کیوں کہ دونوں فریقوں میں کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکا تھا۔ جنرل عمر تورے موس نے اغوا کردہ افراد کے خاندانوں کی طرف سے مجھے فون کر کے ان دونوں کی جان بچانے میں مدد دینے کی درخواست کی۔ میں نے گریلوں کو پیغام بھیجا، جو متعدد واسطوں سے ہوتا ہوا بروقت پہنچ گیا۔ میں نے تاوان کے مذاکرات کے فوری طور پر دوبارہ شروع ہونے کی یقین دہانی کرائی، اور وہ رضامند ہو گئے۔ پھر میں نے گراہم گرین سے رابطہ کیا، جو آنتیب (فرانس) میں مقیم تھا، اور اس سے انگریزوں سے رابطہ قائم کرنے کو کہا۔ گریلوں اور بینک کے درمیان مذاکرات چار ماہ تک جاری رہے۔ یہ طے ہو

چکا تھا کہ میں یا گراہم گرین اصل مذاکرات میں کوئی حصہ نہیں لیں گے، لیکن مذاکرات کے دوران کسی تعطل کی صورت میں کوئی بھی فریق مجھ سے رابطہ قائم کرے گا تاکہ مذاکرات بحال کرنے کا کوشش کی جاسکے۔ آخر کار بیٹکاروں کو رہا کر دیا گیا، لیکن مجھے یا گراہم گرین کو شکریے کا ایک لفظ تک موصول نہ ہوا۔ بے شک یہ کوئی بہت اہم بات نہیں تھی، لیکن مجھے اس پر تعجب ہوا۔ بہت غور کرنے کے بعد میں ایک وضاحت تک پہنچ گیا: میں نے اور گراہم گرین نے اتنا اچھا بندوبست کیا تھا کہ انگریزوں نے ضرور یہ سوچا ہو گا کہ ہم گریلوں سے ملے ہوئے ہیں۔

کئی سال تک میں نے اپنے دوستوں کو دوڑوں میں منقسم رکھا: وہ جو "ستھائی کے سوسال" سے پیشتر میرے دوست تھے، اور وہ جن سے میں اس کے بعد متعارف ہوا۔ اس سے میری مراد یہ تھی کہ اول الذکر مجھے زیادہ قابل اعتماد معلوم ہوتے تھے کیوں کہ ہماری دوستی کا سبب میری شہرت نہیں تھی بلکہ اس کے بہت سے مختلف اسباب تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے احساس ہوا ہے کہ یہ میری غلطی تھی۔ دوستی کے بے شمار، ناقابل تصور اسباب ہو سکتے ہیں، اور شہرت سے پیدا ہونے والی کشش بھی، کسی اور سبب کی طرح، ایک مستند سبب ہے۔ بلاشبہ یہ دونوں طرف کار فرما ہوتی ہے۔ مجھے بھی بہت سے ایسے مشہور لوگوں کو جاننے کا موقع ملا ہے جن سے اس سے قبل میری ملاقات کا امکان نہیں تھا، اور مجھے یہ موقع کسی اور سبب سے نہیں بلکہ صرف اُن کی شہرت کے باعث مل سکا۔ بعد میں ہم ایک ایسی یگانگت کے سبب دوست ہو گئے جس کا میری یا ان کی شہرت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس لحاظ سے شہرت ایک مثبت چیز ہے۔ یہ دوستی پیدا کرنے کے ایسے قابل قدر مواقع فراہم کرتی ہے جو اس کے بغیر میسر نہیں آسکتے۔ اس کے باوجود، اور اپنے نئے دوستوں سے اپنے لگاؤ کے باوجود، میں "ستھائی کے سوسال" سے پہلے کے اپنے دوستوں کو ایک الگ گروہ خیال کرتا ہوں، ایک قسم کی خفیہ تنظیم جسے ایک مشترکہ نوستلجیا لافانی طور یکجا کیے ہوئے ہے۔

یہ سچ ہے کہ میں اب لوگوں پر پہلے کی طرح سادہ لوحی سے اعتماد نہیں کر سکتا، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ شہرت کی نازک صورت حال مجھے ایسا کرنے سے روکتی ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی رفتہ رفتہ آپ کو آپ کی معصومیت سے محروم کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے بارہ سال ہوئے خط لکھنا ترک کر دیا تھا، جب مجھے اتفاق سے معلوم ہوا کہ کسی شخص نے میرے ذاتی

خطوط ریاست ہائے متحدہ کی ایک یونیورسٹی کی آرکائیوز کے ہاتھ فروخت کر دیے۔ لیکن یہ صرف میرے دوستوں ہی کے ساتھ نہیں؛ میں کسی کو بھی خط نہیں لکھتا۔ اس انکشاف نے کہ میرے خطوط بھی ایک فروختی شے بن گئے ہیں، مجھے بے حد آزرده کر دیا، اور میں نے اس کے بعد سے کوئی خط نہیں لکھا۔

(لیکن میں اپنے دوستوں کو فون کرتا رہتا ہوں) بلکہ آدمی دنیا کا چکر لگا کر، ہوشندی سے عاری اخراجات برداشت کر کے، ان سے ملاقات کو تیار رہتا ہوں۔

(میرے حالیہ دوستوں میں بعض سربراہان مملکت بھی شامل ہیں، لیکن میری سیاست سے دل چسپی اس کا باعث نہیں۔) قصہ یہ ہے کہ مجھے زندگی سے ایک بے اختیار کر دینے والا شغف محسوس ہوتا ہے، اور سیاست اس کا ایک پہلو ہے؛ لیکن یہ میرے نزدیک سب سے محبوب پہلو نہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر میں کسی ایسے برا عظم میں پیدا ہوا ہوتا جہاں لاطینی امریکا کے مقابلے میں کم سیاسی مسائل ہوتے تو شاید میں سیاست میں قطعاً دل چسپی نہ لیتا۔ مجھے لگتا ہے کہ میں حالات سے مجبور ہو کر سیاسی سرگرمی میں آ گیا ہوں۔ ان سربراہوں سے میرا ذاتی تعلق شہرت۔۔۔ میری اور ان کی شہرت۔۔۔ سے پیدا ہونے والے تعارف کے لائحہ و مواقع کی پیداوار ہے۔ لیکن ان میں سے ایک یا دو سے میری دوستی اقتدار یا شہرت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی؛ یہ ذاتی یگانگت کا نتیجہ ہے۔

اقتدار مجھے بے پناہ مسحور کرتا ہے، اور میں اپنے اس احساس کو پوشیدہ نہیں رکھتا۔ بلکہ میرے نزدیک یہ میرے بہت سے کرداروں میں بالکل واضح ہے، حتیٰ کہ اُر سلا اگواران میں بھی، جہاں نقادوں نے اس کا سب سے کم سراغ لگایا ہے۔ اور "سر دار کا زوال" کا تو بنیادی موضوع ہی یہ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقتدار انسانی بلند ہمتی اور قوت ارادی کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ایسی شے دوسرے آدمیوں کو اتنی شدت سے اپنی گرفت میں کیوں کر نہیں لیتی جو ان کی تمام تر زندگی پر اس درجہ اثر انداز ہوتی، بلکہ بعض اوقات اس کا تعین کرتی ہے۔

اس بات کا وافر ثبوت موجود ہے کہ میں کسی بھی سطح پر اقتدار کے مواقع سے متواتر اور باصنا بطور پر احتراز کرتا رہا ہوں، کیوں کہ مجھ میں نہ تو اس کی طلب موجود ہے، نہ وہ پس منظر، اور نہ فیصلے کی وہ صلاحیت جو اس کے لیے درکار ہوتی ہے۔ کسی بھی پیشے کے لیے ان تین خصوصیات کا ہونا ضروری ہوتا ہے، اور میری یہ تینوں خصوصیات میرا تعین ایک ادیب کے طور پر کرتی ہیں۔ اپنی طلب کو نہ پہچان پانا بھی ایک سنگین سیاسی غلطی ہے۔

فیدل کاسترو سے میری قریبی اور دلی دوستی کا آغاز ادب کے حوالے سے ہوا۔ انیس سو ساٹھ کے دوران، پرنسٹن لائبریری میں ملازمت کے دنوں میں، میں اسے سرسری طور پر جاننے لگا تھا، لیکن مجھے کبھی یہ محسوس نہیں ہوا تھا کہ ہمارے درمیان کچھ زیادہ چیزیں مشترک ہیں۔ بعد میں جب میں ایک مشہور ادیب اور وہ دنیا کا معروف ترین سیاست دان بن چکا تھا، ہماری کئی بار ملاقات ہوئی، مگر تب بھی، باہمی احترام اور خیرگالی کے باوجود، میں نے محسوس نہیں کیا کہ اس تعلق میں سیاسی ہم آہنگی سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ چار برس پہلے ایک روز صبح منہ اندھیرے اس نے مجھ سے اجازت چاہی، کیوں کہ اسے گھر جا کر بہت سا مطالعہ کرنا تھا۔ اس نے کہا کہ اگرچہ یہ کام اسے لازماً کرنا پڑتا ہے لیکن وہ اسے بیزار کن اور تھکا دینے والا کام لگتا ہے۔ میں نے مشورہ دیا کہ اس لازمی مطالعے کی ممکن دور کرنے کے لیے وہ کوئی ایسی چیز پڑھا کرے جو ذرا بلکی پبلکی ہو مگر اچھا ادب ہو۔ میں نے مثال کے طور پر چند کتابوں کے نام لیے، اور یہ جان کر حیران ہوا کہ نہ صرف اس نے یہ تمام کتابیں پڑھ رکھی تھیں بلکہ ان پر اس کی اچھی نگاہ تھی۔ اس رات مجھ پر اس بات کا انکشاف ہوا جس سے چند ہی لوگ واقف ہیں: کہ فیدل کاسترو بے حد پرجوش پڑھنے والا ہے، کہ اسے ہر زمانے کے اچھے ادب سے محبت ہے، اور یہ کہ وہ اس کا نہایت سنجیدہ ذوق رکھتا ہے۔ دشوار ترین حالات میں بھی، فرصت کے لمحات میں پڑھنے کے لیے اس کے پاس ایک نہ ایک عمدہ کتاب ضرور رہتی ہے۔ اس شب رخصت ہوتے ہوئے میں نے اسے پڑھنے کے لیے ایک کتاب دی۔ اگلے روز بارہ بجے جب میں اس سے دوبارہ ملا تو وہ اسے پڑھ چکا تھا۔ وہ اس قدر محتاط اور باریک بین قاری ہے کہ وہ نہایت غیر متوقع مقامات پر تضادات اور واقعاتی غلطیوں کی نشان دہی کر دیتا ہے۔ میری کتاب "ایک غرقاب شدہ جہاز کے ملحق کی داستان" پڑھنے کے بعد وہ صرف یہ بتانے کے لیے میرے ہوٹل آیا کہ میں نے کشتی کی رفتار کا حساب لگانے میں غلطی کی ہے، اور اس کے پسینے کا وقت ہرگز وہ نہیں ہو سکتا جو میں نے بیان کیا ہے۔ اس کی بات درست تھی۔ اس لیے "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" کو شائع کرانے سے پہلے میں مسودہ اس کے پاس لے گیا، اور اس نے شکاری رائفل کی خصوصیات کے بارے میں ایک غلطی کی نشان دہی کی۔ لگتا ہے اسے ادب کی دنیا سے محبت ہے، یہاں اس کا جی لگتا ہے، اور اسے اپنی بے شمار تحریر شدہ تقریروں کے ادنیٰ اسلوب پر منت کرنے میں لطف آتا ہے۔ ایک موقع پر اس نے، حسرت کے سے انداز میں، مجھے بتایا، "اپنے اگلے جنم میں میں ایک ادیب بننا چاہتا ہوں۔"

میری (فرانوا) متران سے دوستی بھی ادب ہی کے ذریعے شروع ہوئی۔ جب پابلو نیرودا فرانس میں چلے کا سفیر تھا تو اس نے متران سے میرا تذکرہ کیا تھا، اس لیے جب متران چھ سال

ملے میکسیکو کے دورے پر آیا تو اس نے مجھے دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ میں اُس کی کتابیں پڑھ چکا ہوں، اور اس کی تحریروں میں واضح طور پر جھلکنے والے ذوق اور زبان سے اس کے پیدائشی ادیبوں جیسے خف کا مداح تھا۔ اس نے بھی میری کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔ اس روز دوپہر کے کھانے پر، اور اس سے اگلے روز رات کے کھانے پر ہم نے ادب پر بہت باتیں کیں، اگرچہ ہم دونوں کے ادبی پس نظر مختلف تھے، اور ہمارے پسندیدہ ادیب بھی یکساں نہ تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ میں رانسیسی ادب سے زیادہ اچھی طرح واقف نہیں ہوں، جب کہ اُس کا علم اس معاملے میں نہایت عمیق، تقریباً پیشہ ورانہ ہے۔ لیکن میری اس سے دوستی، فیدل کاسترو سے دوستی کی طرح نہیں ہے، اس لحاظ سے کہ جب کبھی ہماری ملاقات ہوتی ہے، خصوصاً اُس کے فرانس کا صدر بننے کے بعد سے، تو ہم ہمیشہ سیاست پر تبادلہ خیال کرتے ہیں اور ادب کے بارے میں شاذ و نادر ہی گفتگو ہوتی ہے۔ اکتوبر ۱۹۸۱ میں میکسیکو میں صدر فرانوا متران نے میکسیکی ادیب کارلوس فونتنیس کو، لواتے مالا کے شاعر اور نقاد لوئس کاردوزای آراگون کو اور مجھے دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ یہ ایک نہایت اہم سیاسی ضیافت تھی، اور بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ داماد انیکل متران کو اس سے بظاہر بڑی مایوسی ہوئی، کیوں کہ وہ ادب کے بارے میں گفتگو سننے کی توقع کر رہی تھیں۔ دسمبر ۱۹۸۱ میں مجھے ایلیرنے پیلےس میں لیروں کو دور کا اعزاز عطا کرتے ہوئے متران نے اپنی مختصر تقریر میں ایک ایسی بات کہی تھی جس سے متاثر ہو کر میری آنکھوں میں تقریباً آنسو آ گئے تھے، اور مجھے یقین ہے کہ وہ خود بھی اس سے کم متاثر نہ تھا۔ اس نے کہا تھا، ”تم اُس دنیا سے تعلق رکھتے ہو جس سے مجھے محبت ہے۔“

پنما کے حکمران جنرل عمر تورےسوس سے میری دوستی کی ابتدا ایک تنازعے سے ہوئی۔ انیس سو تتر کے لگ بھگ اپنے ایک انٹرویو میں میں نے کہا تھا کہ وہ صرف ایک مقبولیت پسند لیڈر ہے جو پنما کی قومی تعمیر نو کی اپنی مہم کے ذریعے اُن سماجی اصلاحات کے بارے میں اپنی بے عملی کی پردہ پوشی کر رہا ہے جن کی پنما کو شدید ضرورت ہے۔ لندن میں پنما کا قونصل مجھ سے ملنے آیا، اور اس نے مجھے بتایا کہ تورےسوس مجھے پنما آنے کی دعوت دینا چاہتا ہے تاکہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں کہ میرا بیان کتنا غیر منصفانہ تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ تورےسوس محض پروپیگنڈا کا ایک ذریعہ حاصل کرنا چاہتا ہے، اس لیے میں نے کہا کہ میں اس شرط پر یہ دعوت قبول کروں گا کہ میرے دورے کی تہنیر نہ کی جائے۔ وہ اس پر آمادہ ہو گیا، لیکن میرے وہاں پہنچنے کی تاریخ سے دو دن پہلے خبر رساں ایجنسیوں نے یہ خبر جاری کر دی۔ سو میں جہاز میں سوار ہو کر سیدھا کولومبیا چلا آیا۔ تورےسوس کو اس بات سے، جس کا ذمے دار کوئی اور شخص تھا، بہت شرمندگی ہوئی، اور اس

نے دوبارہ اپنی دعوت پر اصرار کیا۔ میں نے چند ماہ بعد خفیہ طور پر وہاں کا دورہ کیا، لیکن مجھے نیشنل سکیورٹی کے افراد کی مدد حاصل کرنے کے باوجود تورہوس کو تلاش کرنے میں چوبیس گھنٹے صرف کرنے پڑے۔ جب وہ آخر کار مجھ سے ملا تو ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ "کیا تم جانتے ہو کہ نیشنل سکیورٹی والے مجھے کیوں تلاش نہیں کر پارہے تھے؟" وہ بولا، "اس لیے کہ میں اپنے گھر پر تھا، اور وہ آخری جگہ ہے جہاں مجھے تلاش کرنے کا لوگوں کو، یہاں تک کہ سکیورٹی والوں کو بھی، خیال آسکتا ہے۔ اُس وقت سے ہماری دوستی ہو گئی، کریبینس کے دو باشندوں کی ساز باز سے ملتی جلتی دوستی۔ ایک موقع پر، نہر پنا کے مذاکرات کے دوران انتہائی تناؤ اور بے یقینی کے دنوں میں، ہم دونوں نے چند دن فراہم کے فوجی اڈے میں تنہا باتیں کرتے اور وہاں کی پیتے ہوئے گزارے۔ میں اسے چھو کر جانے کی ہمت نہ کر سکا، کیوں کہ مجھے یہ ہیبت ناک احساس تھا کہ اگر وہ تنہا رہ گیا تو اس شدید تناؤ کے سامنے ڈھیر ہو جائے گا اور خود کو گولی مار لے گا۔ مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ میرے اس خوف کی کوئی بنیاد تھی یا نہیں، لیکن مجھے ہمیشہ خیال آیا ہے کہ تورہوس کی شخصیت کا سب سے منفی پہلو اس کی شہادت کی طلب ہے۔

تورہوس کو کتابیں پڑھنے کی بالکل عادت نہ تھی۔ وہ اتنا بے صبر اور بے تاب تھا کہ باضابطہ مطالعہ کر ہی نہ سکتا تھا۔ لیکن اسے تازہ مقبول عام کتابوں کا ہمیشہ علم رہتا۔ وہ، میری جان پہچان کے کسی بھی اور شخص سے بڑھ کر، ایک تقریباً حیوانی وجدان کا مالک تھا، اور اس کی حقیقت کی فہم کبھی کبھی ساحری کو چھوٹی ہوتی موس ہوتی تھی۔ فیدل کا سترو کے برعکس، جو اپنے کسی خیال کو آخری شکل دینے کی غرض سے اس کے بارے میں مسلسل باتیں کرنے کا عادی ہے، تورہوس ایسے موقعوں پر خود کو ایک راہبان سکوت میں قید کر لیا کرتا۔ اُس کے دوستوں کو جنوبی علم ہوتا کہ وہ جو باتیں کر رہا ہے دراصل ان سے بہت مختلف کسی اور چیز کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ جن لوگوں سے میں واقف رہا ہوں ان میں وہ سب سے زیادہ شہی آدمی تھا، اور اس کے کسی عمل کی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی تھی۔

(میری اس سے آخری ملاقات) اس کی موت سے تین دن پہلے ہوئی۔ میں ۲۳ جولائی ۱۹۸۱ کو پنا میں اس کے مکان پر اس کے ساتھ تھا، اور اس نے مجھے اپنے ساتھ اندرون ملک کے دورے پر چلنے کو کہا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ کیوں، مگر اس سے دوستی ہونے کے بعد پہلی بار، میں نے انکار کر دیا۔ اگلے روز میں میکسیکو روانہ ہو گیا۔ دو دن بعد ایک دوست نے مجھے یہ بتانے کے لیے فون کیا کہ تورہوس نے اس جہاز میں خود کو ہلاک کر ڈالا جس میں اس کے آدھے دوستوں کی طرح ہم نے بھی متعدد بار اس کے ساتھ سفر کیا تھا۔ اس کی موت کے رد عمل کے طور پر مجھے اپنی آنتوں میں سے

گہرا طیش اٹھتا محسوس ہوا، کیوں کہ مجھے اس وقت احساس ہوا کہ میرا اس سے لگاوا اس سے زیادہ تھا جتنا میں سمجھتا تھا، اور یہ کہ میں اس کی موت کا کبھی عادی نہیں ہو سکوں گا۔ ہر گزرنے والا دن میرے اس خیال کو آوروں بختہ کرتا جاتا ہے۔

گراہم گرین ان ادیبوں میں سے ہے جن کی تحریروں سے میں سب سے بہتر طور پر واقف ہوں۔ میں نے اس کی تحریروں اپنے طالب علمی کے زمانے میں پڑھنی شروع کی تھیں۔ وہ ان ادیبوں میں بھی شامل ہے جنہوں نے گرم منظرہ دارہ کے خطوں کو دریافت کرنے میں میری مدد کی، یہ جاننے میں میری مدد کی کہ ادب میں حقیقت فوٹو گرافی کی طرح نہیں بلکہ مرکب ہوتی ہے، اور اس مرکب کے بنیادی عناصر کو پالینا بیانے کے فن کے رازوں میں سے ایک ہے۔ گراہم گرین کو اس میں ملکہ حاصل ہے، اور میں نے یہ راز اسی سے سیکھا ہے۔ میرے خیال میں یہ بات میری بعض کتابوں، خصوصاً "منوس وقت" میں بہت واضح طور پر نظر آ سکتی ہے۔

میں گراہم گرین کے بارے میں جو تصور رکھتا ہوں، کوئی اور ادیب جس سے میں واقف ہوں اس تصور سے مطابقت نہیں رکھتا۔ وہ نہایت کم گو ہے اور آپ کی باتوں میں بھی کوئی خاص دل چسپی لیتا ہوا معلوم نہیں ہوتا؛ لیکن اس کے ساتھ چند گھنٹے گزارنے کے بعد آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ آپ متواتر گفتگو کرتے رہے ہیں۔ ایک طویل ہوائی سفر کے دوران ایک موقع پر میں نے اس سے کہا کہ وہ اور ہیمنگ وے دو ایسے ادیب ہیں جن کی تحریروں پر کسی کے ادبی اثرات کا پتا نہیں چلتا۔ "میری تحریروں پر ہنری جیمز اور کوئریڈ کے اثرات واضح ہیں،" اُس نے جواب دیا۔ پھر میں نے پوچھا کہ اس کی رائے میں کیا وجہ ہے کہ اسے نوبل انعام کا مستحق نہیں گردانا گیا۔ اس نے صاف جواب دیا: "اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ مجھے سنجیدہ ادیب نہیں سمجھتے۔" یہ بڑی عجیب بات ہے لیکن صرف ان دو جوانی فوروں نے مجھے سوچنے کے لیے اتنا کچھ دیا کہ اس سفر کے بارے میں میری یاد پانچ گھنٹوں کی ایک مسلسل گفتگو کی سی ہے۔

گراہم گرین کی توریموس سے دوستی، ان دونوں سے میری دوستی کی طرح، ایک قسم کی ساز باز پر مبنی ہے۔ گراہم گرین کے ریاست ہائے متحدہ میں داخلے پر کئی برس تک اس لیے پابندی عائد رہی کہ اس نے ویزا کی درخواست کے فارم پر یہ اعلان کر دیا تھا کہ وہ نوجوانی میں چند ماہ تک کمپوٹ پارٹی کا رکن رہ چکا ہے۔ مجھے بھی ایسا ہی مسند درپیش تھا، کیوں کہ میں کیدوبا کی خبر رساں انجمنی کا نیویارک میں نمائندہ رہ چکا تھا۔ توریموس چاہتا تھا کہ ہم دونوں ۱۹۷۸ میں واشنگٹن میں نہر پنا کے معاہدے پر دستخطوں کی تقریب میں اس کے مہمان ہوں، اور اس نے ہمارے نام پر پنا کے دو سرکاری پاسپورٹ جاری کر دیے۔ میں گراہم گرین کے چہرے پر آنے

والے طنزیہ تاثر کو کبھی نہیں بھولوں گا، جو اس وقت نمودار ہوا جب ہم واشنگٹن کے اینڈریوز ایر بیس پر اترے، جہاں رنگارنگ تقریبات، قومی ترانوں اور توپوں کی سلامیوں والا ایک ایسا خیر مقدم ہمارا منتظر تھا جو سربراہان مملکت کے لیے مخصوص ہے۔ اگلے روز دستخطوں کی تقریب میں ہم اس طویل میز سے چند گز دور ساتھ ساتھ تھے جس کے گرد لاطینی امریکا کے تمام حکمران نشستے تھے: پیراگوئے کا استوسنر (Stoessner)، چیلے کا پنوچیت (Pinochet)، ارجنٹینا کا ودیلا (Videla) اور بولیویا کا بانزیر (Banzer)۔ اس لذیذ انسانی چڑیا گھر کا ایک ایسی اشتہا کے ساتھ مشاہدہ کرتے ہوئے جس سے آپ بخوبی واقف ہیں، ہم دونوں نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ تب اچانک گراہم گرین میری طرف جھکا اور فرانسیسی زبان میں مجھ سے سرگوشی کی: "بانزیر یقیناً ایک بہت ناخوش آدمی ہے۔" میں اسے کبھی فراموش نہیں کروں گا، سب سے بڑھ کر اس لیے کہ اس نے اس بات کو اس قدر ہمدردی کے ساتھ ادا کیا تھا۔

آپ میری زندگی کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک آپ اس کردار کی اہمیت کا اندازہ نہ کر لیں جو عورتوں نے میری زندگی میں ادا کیا ہے۔ میری پرورش میری نانی اور بہت سی خالوں کے ہاتھوں ہوئی جو مجھ پر اپنی توجہ کی بارش کیے رکھتی تھیں، اور ان خالوں کے ہاتھوں جنہوں نے مجھے بچپن کے بہت سے خوش کن لمحات بخشے، کیوں کہ ان کے تعضبات خاندان کی عورتوں کے مقابلے میں کم تو نہیں لیکن مختلف ضرورت تھے۔ جو عورت مجھے اسکول میں پڑھاتی تھی وہ بے حد خوب صورت اور پروقار تھی، اور مجھے اسکول جانا اسی وجہ سے پسند تھا کہ میں اسے دیکھ سکوں۔ میری ساری زندگی کے دوران ایک نہ ایک عورت میرا ہاتھ تھامے رہی ہے، اور وجود کے اس الجھاوے میں، جسے مردوں کی بہ نسبت عورتیں زیادہ اچھی طرح سمجھتی ہیں، میری رہنمائی کرتی رہی ہے۔ وہ اپنا راستا نسبتاً زیادہ آسانی سے اور راہ نمائی کے کم ذرائع پر انحصار کر کے تلاش کر لیتی ہیں۔ اس معاملے میں میرے احساس نے قریب قریب تو ہم پرستی کی صورت اختیار کر لی ہے: مجھے لگتا ہے کہ اگر میں کسی عورت کے ساتھ ہوں تو مجھے کوئی بری بات پیش نہیں آ سکتی۔ ان کی بدولت مجھے تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ اس تحفظ کے بغیر، میں زندگی میں ان سے آدھے قابل قدر کام بھی نہ کر سکتا جو میں نے کیے ہیں، اور خاص طور پر میں سوچتا ہوں کہ میں لکھ تو ہرگز نہ سکتا۔ اس کا مطلب، بلاشبہ، یہ بھی ہے کہ میرے تعلقات عورتوں سے، مردوں کی بہ نسبت، بہتر ہیں۔

"تنہائی کے سو سال" سے پہلے تک میری کتابوں میں عورتوں اور مردوں کے درمیان کرداروں کی تقسیم قطعی غیر شعوری اور بے ساختہ تھی۔ یہ صرف نقادوں، خصوصاً ارنستو وولکیننگ، کی بدولت ہوا کہ مجھے اس کا شعوری احساس ہو گیا۔ میں اس پر کچھ زیادہ خوش نہیں ہوں، کیوں کہ اب میں اس بے ساختگی کے ساتھ زنانہ کردار خلق نہیں کرتا جیسے پہلے کیا کرتا تھا۔ بہر حال، اس روشنی میں اپنی کتابوں پر غور کر کے میں نے اسے دونوں جنسوں کے تاریخی کردار کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کے مطابق پایا ہے؛ یعنی یہ کہ عورتیں آہستہ گرفت سے سماجی نظم و ضبط کو قائم رکھتی ہیں جب کہ مرد، حماقت پر ٹٹے ہوئے، دنیا کی خاک چھانٹتے پھرتے ہیں، جس سے تاریخ کا پتلا آگے بڑھتا ہے۔ انجام کار یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ دونوں میں سے کون زیادہ پاگل ہے۔ بہر کیف، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عورتیں تاریخ کے احساس سے قطعی بیگانہ ہوتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ نوع انسان کو قائم رکھنے کے اپنے بنیادی کام کے قابل نہ ہوتیں۔

(میرے اس خیال کا آخذ) غالباً اسے نانا نانی کے گھر میں سنے ہوئے خانہ جنگیوں کے قصے ہیں۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ یہ جنگیں ہرگز واقع نہ ہوتیں اگر عورتوں میں وہ تھریبا راضی قوت نہ ہوتی جو انہیں اتنی بے خوفی سے دنیا کا سامنا کرنے کے قابل بناتی ہے۔ میرے نانا مجھے بتایا کرتے تھے کہ کس طرح مرد بدوقت کندھے پر ڈال کر جنگ پر روانہ ہو جاتے تھے، یہ جانے بغیر کہ وہ کہاں جا رہے ہیں، یہ سوچے بغیر کہ واپسی کب ہوگی اور، ظاہر ہے، یہ فکر کیے بغیر کہ ان کی غیر موجودگی میں گھر میں کیا ہوگا۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ صرف اپنی قوت اور تھیل پر انحصار کرنے والی عورتیں پیچھے رہ جاتیں تاکہ نوع انسان کو جاری رکھ سکیں اور جنگ میں مارے جانے والوں کی جگہ لینے کے لیے نئے مردوں کو جسم دے سکیں۔ وہ یونانی ماؤں کی طرح تھیں جو اپنے مردوں کو میدان جنگ کی جانب روانہ ہوتے ہوئے ان الفاظ کے ساتھ الوداع کہتی تھیں: "اس حالت میں واپس آنا کہ تم نے اپنی ڈھال کو اٹھا رکھا ہو یا ڈھال نے تمہیں اٹھا رکھا ہو۔" یعنی زندہ یا مردہ، لیکن شکست خوردہ نہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ یہ رویہ، جو کریستین عورتوں میں عام ہیں، کمپن ہماری جارج مردانگی (machismo) کا اصل سبب تو نہیں۔ یا یہ کہ کمپن یہ جارج مردانگی عام طور پر مادری معاشرہ کی پیداوار تو نہیں ہوتی۔

پہلی عورت جس نے مجھے اپنے سر میں گرفتار کیا وہی استانی تھی جس نے مجھے پانچ سال کی عمر میں پڑھایا تھا، مگر وہ مختلف معاملہ تھا۔ لیکن جس نے مجھے پہلی بار جنسی طور پر بیدار کیا وہ ہمارے گھر میں کام کرنے والی ایک لڑکی تھی۔ ایک رات جب پڑوس کے مکان سے موسیقی کی آواز آرہی تھی، اس نے، بالکل معصومیت سے، مجھے اپنے ساتھ باغچے میں رقص کرنے کی دعوت دی۔ میرے

اور اس کے جسم کا اتصال۔۔ میری عمر اس وقت چھ برس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔۔ ایک ایسا جذباتی پہچان تھا جس سے میں آج تک آزاد نہیں ہو سکا ہوں۔ میں نے پھر کبھی اتنی شدت یا اس بے پروائی کے احساس کا تجربہ نہیں کیا۔

یہ جھوٹ نہیں ہو گا اگر میں کہوں کہ مجھے بیدار کرنے والی تازہ ترین عورت وہ تھی جسے میں نے کل رات پیرس کے ایک ریستوراں میں دیکھا تھا۔ یہ میرے ساتھ اتنی بار ہوتا ہے کہ میں نے گننا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے یہ خصوصی جبلت حاصل ہے۔ جب میں لوگوں سے بھری ہوئی کسی جگہ میں داخل ہوتا ہوں تو ایک قسم کا پُر اسرار سنگل میری نگاہ کو ناقابل مزاحمت طور پر اس بھوم میں موجود سب سے زیادہ مسکورت کی طرف موڑ دیتا ہے۔ وہ لازماً سب سے زیادہ حسین عورت نہیں ہوتی، لیکن ایسی عورت ہوتی ہے جس سے مجھے نہایت واضح طور پر گہری یگانگت کا احساس ہوتا ہے۔ میں کبھی کچھ کرتا نہیں، صرف یہ جانتا کہ وہ وہاں موجود ہے میری مسرت کے واسطے کافی ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی بے لوث اور خوبصورت چیز ہے کہ کبھی کبھی مریدس تک اس عورت کی نشان دہی کرنے اور اسے دیکھتے رہنے کے مناسب ترین مقام کا انتخاب کرنے میں میری مدد کرتی ہے۔

(میرا دعویٰ ہے کہ میرے وجود میں جارح مردانگی کا ایک ذرہ تک نہیں،) لیکن اسے نظری اصطلاحات کی مدد سے ثابت نہیں کیا جاسکتا؛ اس کا اظہار صرف عملی طور پر کیا جاسکتا ہے۔ صرف ایک مثال کے طور پر، "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" یقیناً اس بنیادی جارح مردانگی کا پردہ بھی چاک کرتی ہے، اور اس کی مذمت بھی کرتی ہے، جو ہمارے معاشرے میں موجود ہے، جو درحقیقت ایک مادری معاشرہ ہے۔ میرے نزدیک کسی مرد یا عورت میں موجود یہ جارح مردانگی محض دوسرے لوگوں کے حقوق کو غصب کرنے کا نام ہے۔

میرا خیال ہے یہ قول (ہنری) کسبر کا ہے کہ اقتدار ایک شہوت انگیز شے ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مقتدر افراد اکثر ایک خاص قسم کے جنسی جنون میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن میں کہوں گا کہ "سردار کا زوال" میں پیش کردہ میرا خیال اس سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ اقتدار محبت کا متبادل ہے۔ میں اسے اس طرح دیکھتا ہوں کہ محبت کرنے کی اہلیت سے محروم ان افراد کو اقتدار میں تسکین حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ لیکن میں نظریہ سازی میں مہارت نہیں رکھتا، جو بہر حال بعد از وقت گھڑے جاتے ہیں۔ میں اس کام کو دوسرے لوگوں کے لیے چھوڑ دینے کو ترجیح دیتا ہوں، جو اس میں زیادہ ماہر ہیں اور جنہیں اس سے لذت حاصل ہوتی ہے۔

"سنوس وقت" میں لینٹنٹ کا کردار اقتدار کے اسرار کی کرید کے سلسلے میں۔۔ چاہے وہ

چھوٹے سے قصبے کے میسر کی معمولی سطح ہی پر کیوں نہ ہو۔۔۔ میری پہلی کوشش تھی، اور سردار کا زوال "کاڈکلیٹر سب سے زیادہ پیہیدہ کوشش تھی۔ ان دونوں کرداروں اور کرنل اور یلیانو دنیا کے کردار کے درمیان تعلق واضح ہے۔ کرنل بونڈیا برٹی آسانی سے ایک سطح پر "منموس" کا لیفٹننٹ، اور دوسری سطح پر "سردار کا زوال" کا ڈکلیٹر ہو سکتا تھا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کی سی صورت حال میں ویسا ہی طرز عمل اختیار کرتا۔

میرے خیال میں محبت کرنے کی اہلیت سے محرومی سے بڑھ کر کوئی اور انسانی ابتلا نہیں ہو تی۔ نہ صرف اس شخص کے لیے جو اس میں مبتلا ہو بلکہ ان تمام لوگوں کے لیے جو بد قسمتی سے شخص کے مدار میں آجائیں۔

(جنسی آزادی کے بارے میں) ہم سب اپنے اپنے تعصبات کے باتھوں یرغمال ہیں۔ ایک باوخیال آدمی کے طور پر میرا عقیدہ ہے کہ نظری طور پر جنسی آزادی کو کسی بھی طرح محدود نہیں جانا چاہیے۔ لیکن عملی طور پر میں اپنے کیتھولک پس منظر اور بورژوا معاشرے کے تعصبات سے ر اختیار نہیں کر پاتا، اور دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح دوسرے معیارات کا شکار ہو جاتا ہ۔

(میں نے کبھی کہا تھا کہ تمام مرد نامرد ہوتے ہیں، لیکن ایک نہ ایک عورت ضرور ایسی ہوتی ہے جو ان کا مسئلہ حل کر دیتی ہے۔) میرے خیال میں یہ کسی فرانسیسی کا قول تھا: "نامردوں کا فی وجود نہیں، صرف بعض عورتیں بے حس ہوتی ہیں۔" درحقیقت، اگرچہ بہت سے اس کا انتراف نہیں کرتے، ہر نارمل مرد کو ہر نیا جنسی تجربہ دہشت ناک لگتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ہشت کا سبب تہذیبی ہے۔ وہ احمق ثابت ہونے سے ڈرتا ہے، اور آخر احمق ہی ثابت ہوتا ہے یوں کہ وہ اتنی اچھی کارکردگی نہیں دکھا پاتا جتنی اس کی جارح مردانگی اس سے تھاغنا کرتی ہے۔ اس غموم میں ہم سب نامرد ہیں، اور اپنے احترام ذات کو سلامت رکھتے ہوئے اس صورت حال سے اہر آنا صرف کسی عورت کی ہم دردی کی بدولت ممکن ہوتا ہے۔ یہ کوئی بری بات نہیں۔ یہ بہت کو ایک خاص طلسم کا حامل بنادیتی ہے، کیوں کہ ہر بار پہلی بار کی مانند ہے، اور ہر مردوزن کو ہر بار نئے سرے سے، پہلی بار کی طرح، آغاز کرنا پڑتا ہے۔ اسی جذبے اور پراسراریت کی کمی کے باعث پورنو گرافی میرے نزدیک اس قدر بیزار کن اور ناقابل قبول ہے۔

ضمیمہ ۱

واقعات کی سن وار ترتیب

مارکیز کی زندگی کے واقعات

متعلقہ تاریخ اور ادبی واقعات

۱۸۹۹

یوناٹینڈ فورٹ کمپنی کی کولومبیا میں آمد

۱۸۹۹-۱۹۰۲

کولومبیا کی خانہ جنگیوں کا نصف صدی طویل سلسلہ ہزار روڈہ جنگ کی صورت میں اپنے عروج کو پہنچتا ہے۔ زیر لاندیا کے معاہدے پر دستخط ہوتے ہیں۔

۱۹۰۹-۱۹۳۵

دینی زویا کے ڈکٹیٹر حوآن وینسٹ گوئیرا کا دور اقتدار۔

۱۹۱۹

کولومبیا ٹرویئل آئل کمپنی کے ساتھ معاہدے پر دستخط کرتا ہے۔

۱۹۲۸

شمالی کولومبیا کے گرم خطے کے قصبے اراکاتا کا میں ۶ مارچ کو گاربرٹل حوزے گارسا مارکیز کی پیدائش۔

۱۹۲۸-۱۹۳۶

مارکیز اپنے نانا کرٹل ٹولس رکاردو مارکیز سمبیا کے گھر میں رہتا ہے۔ بڑے بوسے پروو اکثر خواب دیکھتا ہے کہ وہ اس مکان سے کبھی نہیں نکلا۔ اس کا کہنا ہے: "تب سے لے کر میرے ساتھ کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔"

۱۹۲۲

حوزے پوسٹاسیرو پیرا کی کتاب (The Vortex) کی اشاعت۔

۱۹۲۸

شمالی کولومبیا کے قصبے سانٹا مارٹا کے نزدیک بنانا کمپنی کے مزدوروں کی برہمی برٹائل جس کے نتیجے میں ان کا قتل عام ہوتا ہے۔

۱۹۲۹

رومولو گامیگوس کی کتاب Dona Barbara کی اشاعت۔

۱۹۳۶-۱۹۳۹

ہسپانیہ میں فائو جنگی۔

۱۹۴۱

یوناٹیدڈ نیشنل کمپنی کی کولومبیا سے روانگی، یا فمالیت میں نمایاں کمی۔

۱۹۴۲

حورے ٹولس پورٹس کی کتاب Ficciones کی اشاعت۔

۱۹۳۶-۱۹۴۳

کولومبیا کے پہاڑی علاقے میں باریکلا اور زاپا کیرا میں پراسری اور سیکنڈری تعلیم۔ تیرہ برس کی عمر میں مارکیز پہلی بار دارالحکومت بوگوتا پہنچتا ہے۔

۱۹۴۷-۱۹۴۹

نیشنل یونیورسٹی، بوگوٹا اور یونیورسٹی آف کارتاخینا میں قانون کی تعلیم۔
بوگوٹا کے اخبار "ایلیکٹرا دور" کے بہت دور ایڈیشن میں مارکیز کی اولین
کہانیوں کی اشاعت۔ کارتاخینا کے اخبار "ایلی یونیورسل" کے لیے کالم لکھنے کا
کالم۔

۱۹۴۸-۱۹۵۷

کولمبیا میں بے قاعود اور سوتار تشدد کا دور ہے *La violencia* کا نام دیا جاتا
ہے۔ اس کا آغاز نیرل رہنما مورخے گیتان کے قتل سے ہوا۔ تشدد کی اس لہر
میں مار سے ہانپنے والوں کی تعداد دو سے تین لاکھ تک بتائی جاتی ہے۔

۱۹۴۹

ایلیو کارینیئر کی کتاب *El reino de esto mundo (The Kingdom of this World)*
کی اشاعت۔

۱۹۵۰

ولیم فاکنر کو ادب کا نوبل انعام دیا جاتا ہے۔

۱۹۵۲

جنرل گسٹاو رو باس پیڈیا کولمبیا میں اقتدار پر قبضہ کرتا ہے۔

۱۹۵۸-۱۹۵۴

دینی زویلا کے ڈکٹیٹر سیریزہ جیمینیز کا دور اقتدار۔

۱۹۵۵

حوان رونکو کی کتاب *Pedro paramo* کی اشاعت۔

۱۹۵۰-۱۹۵۵

مارکیز قانون کی تعلیم ترک کر کے بہت وقتی صوفی کا پیشہ اختیار کر لیتا ہے اور
بارکیلا کے اخباروں "ایلی میرالدو" اور "ایلی ناسینٹال" اور "ایلی ایلیکٹرا دور"
کے لیے کالم کرتا ہے۔ مزید کہانیاں شائع ہوتی جاتی ہیں، اور پہلا ناول "پتوں کا
طوفان"۔

۱۹۵۷-۱۹۵۷

"انٹل ایسپکٹادر" کے نامہ نگار کی حیثیت سے یورپ میں۔ روم میں فلم سازی کا ایک کورس مکمل کرنا ہے۔ ڈکلیئر روباس پیٹلا کے باتوں "انٹل ایسپکٹادر" کی اشاعت بند ہو جاتی ہے۔ مارکیز ٹافٹی اور بے درنگاری کی حالت میں پیرس میں ٹھہر جاتا ہے اور "کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" پر کام کرنا ہے۔ (اشاعت ۱۹۶۱)۔ کئی سو ٹکٹ لکھوں کا دورہ کرتا ہے اور اپنے تاثرات 90 Days Behind the Iron Curtain کے عنوان سے تحریر کرتا ہے۔

۱۹۵۸

بارنکلیا میں مرسیڈس باربا سے شادی۔ کاراکاس میں جرائد "مونیتور"، "ایلیٹ" اور "قدتی زویلا گرافیکا" میں ملازمت۔ "بڑی ملا کا جنازہ" میں شامل ہونے والی زیادہ تر کمائیوں کی تکمیل۔ (اشاعت ۱۹۶۲)۔

۱۹۵۹-۱۹۶۱

"آپریمیوں ووداد" نامی مقدمے کی نامہ نگاری کے لیے ہوانا میں۔ بوگوتا میں کینیڈین خبر رساں ایجنسی "پرنسٹن لاطینا" کا دفتر قائم کرتا ہے۔ اسی خبر رساں ایجنسی کے لیے ہوانا اور نیویارک میں کام کرتا ہے۔

۱۹۵۷

روباس پیٹلا کا استعفیٰ۔ فوجی جُنٹا انتخابات کا اعلان کرتی ہے جو ۱۹۵۸ میں مسترد ہوئے ہیں، جن کے نتیجے میں مخلوط حکومتوں کا ایک سلسلہ اقتدار میں آتا ہے، لیکن بد امنی اور گریلا کارروائیاں جاری رہتی ہیں۔

۱۹۵۹

ایلیو کارینیئر کی کتاب *Los pasos perdidos* (The Lost Steps) کی اشاعت۔
فیمل کاسٹرو کی فوجیں ہوانا پر قبضہ کر لیتی ہیں؛ صدر پائاسکا کا استعفیٰ اور فرار۔

۱۹۶۱-۱۹۶۷

سلیکٹو سٹی میں۔ جرائد کی ادارت۔ ایک اشتداری ہفتہی میں ملازمت، اور ناول "نہیں وقت" (اعامت ۱۹۶۲) پر کولومبیا کا ایک انعام۔ کئی فلموں کے اسکرپٹ پر کام کرتا ہے۔ "تنہائی کے سوال" کی تحریر اور اعامت (۱۹۶۷)۔ فوری اور بے پناہ کامیابی۔ اسے "دون کیوتے" کے بعد سے ہسپانوی زبان کی سب سے زیادہ مقبول کتاب کہا جاتا ہے۔

۱۹۶۱

موان کا لوس اونٹنی کی کتاب *El asillero (The Shipyard)* کی اعامت۔

کیلیبن حکومت کے خلاف ریاست ہائے متحدہ کا *Bay of Pigs* پر ناکام حملہ۔

۱۹۶۳

کیوبا میں روسی میزائیلوں کے ڈسے پر بین الاقوامی بحران۔

۱۹۶۳

مولیہ کوئینازار کی کتاب *Rayula (Hopscotch)* کی اعامت۔

۱۹۶۵

ماریا برگس یوسا کی کتاب *La casa verde (The Green House)* کی اعامت۔

گیٹر موکا بربرا اٹانے کی کتاب *Tres tristes tigres (Three Sad Tigers)* کی اعامت

۱۹۶۶

موزے لیرنا لیریا کی کتاب *Paradiso* کی اعامت۔

۱۹۶۷-۱۹۷۵

بارسلونا (ہسپانیہ) میں۔ کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک سے ایک اعزاز کی ڈگری ملتی

ہے۔

"معموم اینڈرا" کی اشاعت (۱۹۷۲)۔ بوکوتا کے ایک سیاسی رسالے

"آئینہ تیار" قائم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ رسل ٹریوٹی کا نا سب صدر مقرر ہوتا

ہے۔

"سرور کا زوال" کی اشاعت (۱۹۷۵)۔

۱۹۶۷

کلاروس فریتیس کی کتاب *Cambio de piel* (Change of Skin) کی اشاعت۔

جے گویرا کی بولیویا میں وفات۔

۱۹۷۰

خون سے دو نومبر کی کتاب *El obsceno pajarero de noche* (The Obscene Bird of Night) کی اشاعت۔

سلوادر آئینہ سے چلے کا صدر منتخب ہوتا ہے۔

۱۹۷۳

آئینہ کا مختصر اٹھ دیا جاتا ہے۔

۱۹۷۴

آئینہ کا مختصر اٹھ دیا جاتا ہے۔

۱۹۷۵

آئینہ کا مختصر اٹھ دیا جاتا ہے۔

۱۹۷۵

آئینہ کا مختصر اٹھ دیا جاتا ہے۔

ہسپانیہ کے ڈیپٹی ڈائریکٹر کی وفات۔

۱۹۷۵-۱۹۸۱

میکیکو ڈسٹی اور پوگوتا میں۔ کئی فلموں کے اسکریپٹ پر کام کرتا ہے۔ انگولا اور ٹاراگووا کا دورہ کرتا ہے اور تاثرات لکھتا ہے۔ سرگرم سیاسی کام۔ مارکیز کو لومبیا کی پارٹی "فرمیز" کا بانی رکن ہے۔ پوینیکو کے لیے مواصلت کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کرتا ہے۔ سیاسی قیدیوں کی امداد کے لیے ایک ادارہ "Habeas" قائم کرتا ہے۔ "ایک پیش گفتہ موت کی روداد" کی اشاعت (۱۹۸۱)۔

۱۹۸۲

نوبل انعام حاصل کرتا ہے۔

۱۹۸۳-

کولومبیا اور میکیکو میں قیام۔ "وبا کے دنوں میں ممیت" کی اشاعت (۱۹۸۵)۔
سیاسی سرگرمیاں جاری ہیں۔
The General in His Labyrinth کی اشاعت (۱۹۸۹)۔

۱۹۷۹

ٹاراگووا میں ۱۹۳۹ سے برسرِ اقتدار سوموزا خاندان کا تختہ الٹ کر ساندینista برسرِ اقتدار آجاتے ہیں۔

۱۹۸۱

ماريو برگس پيسا کی کتاب *La guerra del fin del mundo* (The War of the End of the world) کی اشاعت۔
پنا کے صدر عمر قورديوس کی ایک ہوائی حادثے میں وفات۔

ضمیمہ ۲
کتابیات

گابریئل گارسیمار کیز کی تصانیف:

"پتوں کا طوفان"

La hojarasa

Leaf Storm and other stories

tr. Gregory Rabassa

Harper & Row, 1972.

"کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا"

El coronel no tiene quien le escriba

No One Writes to the Colonel

tr. J S Bernstein

Harper & Row, 1968.

"بڑی ماما کا جنازہ"

Los funerales de la Mama Grande

Big Mama's Funeral

tr. J S Bernstein

(included in "No One Writes to the Colonel")

"منوس وقت"

La mala hora, 1962.

In Evil Hour

tr. Gregory Rabassa

Harper & Row, 1979.

"تنہائی کے سو سال"

Cien anos de soledad, 1967.
One Hundred Years of Solitude
tr. Gregory Rabassa
Harper & Row, 1970.

"سردار کا زوال"

El otoño del patriarca, 1975.
The Autumn of the Patriarch
tr. Gregory Rabassa
Harper & Row, 1976.

"معتوم ارندرا"

La candida Erendira y su abuela desalmada
Innocent Erendira and other stories
tr. Gregory Rabassa
Harper & Row, 1978.

"ایک پیش گوشت موت کی روداد"

Cronica de una muerte anunciada, 1981.
Chronicle of a Death Foretold
tr. Gregory Rabassa
Harper & Row, 1982.

"ایک غرقاب شدہ جہاز کے طبع کی داستان"

Relato de un naufragio, 1970.
The Story of a Shipwrecked Sailor.

"وبا کے دنوں میں محبت"

El amor en los tiempos del colera, 1985.
Love in the Time of Cholera
tr. Edith Grossman
Knopf, 1988.

La aventura de Miguel Littin clandestino en Chile, 1986
Clandestine in Chile

tr. Asa Zatz
Granta Books, 1989.

"جنرل اپنی بھول بھلیوں میں"
El general en su laberinto, 1989.
The General in his Labyrinth, 1990.

دیگر کتابیں:

Plinio Apuleyo Mendoza,
El olór de la guayaba, 1982.

The Fragrance of Guava

tr. Ann Wright
Verso, 1983.

Michael Wood,
Landmarks of World Literature: 100 Years of Solitude
Cambridge University Press, 1990.

آج کی کتابیں

آج: پہلی کتاب
تخلیقی نظم و نثر کا انتخاب
ترتیب: اجمال کمال

آج: دوسری کتاب
میلان کنڈیرا کی تحریروں کا انتخاب
ترتیب: اجمال کمال

بوف کور
ناول
صادق ہدایت

چیمینی ہونی تاریخ
نظمیں
افضال احمد سید

بارہ ہندوستانی شاعر
پانچ زبانوں کی نظموں کا انتخاب
ترتیب: اجمال کمال

خیمہ سیاہ
غزلیں
افضال احمد سید

آوارگی
منتخب تراجم
محمد عمر میمن

چڑیوں کا شور
نظمیں
ذی شان ساحل

دور بانوں میں سزائے موت
نظمیں
افضال احمد سید

ضمیر نیازی

کی معروف اور اہم تصنیف

The Press in Chains

کا اردو ترجمہ

صحافت پابند سلاسل

بہت جلد شائع ہو رہا ہے

تقسیم کار
مکتبہ دانیال
و کٹوریہ چیمبرز نمبر ۲ عبداللہ بارون روڈ صدر کراچی

ٹامس اینڈ ٹامس
صدر کراچی

کلاسیک
شاہراہ قائد اعظم لاہور

بیکن بکس
گول باغ گلگشت ملتان

آج

عالمی ادب کا سہ ماہی اردو جریدہ

سالانہ خریداری

چار شماروں کی قیمت : دو سو روپے

خزاں ۱۹۸۹

تاراشنکر پنرجی ستیہ جیت رے اسد محمد خان
محمد خالد اختر ڈونلڈ بارتھیم ولیم سیرویان
افضال احمد سید ذی شان ساحل نسریں انجم بھٹی سعید الدین
نیر مسعود فروغ فرخ زاد بابا مقدم

سرما ۱۹۹۰

نجیب محفوظ لیو تالستانی کیم مونزو
منظفر علی سید فہمیدہ ریاض عذرا عباس
احمد فواد محمد خالد اختر اکرام اللہ

بہار ۱۹۹۰

اتالو کلونو امین مالوف محمد عمر میمن
محمد سلیم الرحمٰن جیک لنڈن محمد انور خالد
زیبا الیاس محمد خالد اختر تادیوش روزنوج
زیگنیو ہربرٹ ویسلاوا شمبورسکا الیکزانڈر وات

گرما ۱۹۹۰

وجے دان دیتھا انور خان حسن منظر
محمد سلیم الرحمٰن شمس الرحمٰن شمس الحق
فہمیدہ ریاض

۱۹۹۰ خزان

منوچہر خسرو شاہی بابا مقدم جمال میرصادقی
ثروت حسین ذی شان ساحل اوکٹاویو پاز
یہودا امیحائی جولین بارنر فاروق خالد
محمد خالد اختر علی امام نقوی
خورخے لوئس بورخیس

۱۹۹۱ سرما

افربام یہوشوا صلاح الدین محمود
فہمیدہ ریاض نیر مسعود
یانس رتسوس انطون شماس
اسما راجا ولاس سارنگ

۱۹۹۱ بہار

خصوصی شمارہ
گابریئل گارسیا مارکیز

۱۹۹۱ گرما / خزان

منوچ داس ضمیرالدین احمد نیر مسعود
اکرام اللہ خالدہ حسین نکانور پارا
اقتخار جالب اوسپ ماندلستام افضل احمد سید
عذرا عباس بیری پین ذی شان ساحل
گریگور فان ریزوری

۱۹۹۲ سرما

خصوصی شمارہ
مصر، جنوبی افریقا، موزمبیق، زمبابوے،
ہندوستان، امریکا، میکسیکو،
انگلستان، آئرلینڈ اور اٹلی
کی کہانیاں

بہار ۱۹۹۲

خصوصی شماره

معاصر اردو فکشن : تیرہ کہانیاں اور ایک ناول

نیر مسعود اسد محمد خان

حسن منظر مسعود اشعر

انور خان قمر احسن

فہمیدہ ریاض صغیر ملال

گرما / خزاں ۱۹۹۲

محمد خالد اختر اسد محمد خان

نیر مسعود فہمیدہ ریاض

افضال احمد سیّد میروسلو بولب

سیمون ڈبوار ژان ژینے

سرما ۱۹۹۳

پریم چند گابریئل گارسیا مارکیز ٹیڈ ہیوز

فہمیدہ ریاض ضمیرالدین احمد

ذی شان ساحل سعیدالدین محسن خان

آنزک ہاشیویس سِنگر

بہار ۱۹۹۳

خصوصی شماره

عربی کہانیاں

توفیق الحکیم عبدالسلام العجیلی زکریا تامر محمد برآدا

علیفہ رفعت حنا شیخ بہاء طاہر محمود دیاب

ابراہیم الکونی یوسف ادريس یوسف شارونی ادورد الخراط

طیب صالح نبیل جورجی محمد خضیر غسان کنفانی

آج

بی ۱۲۰ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ٹاؤن شپ کراچی ۷۵۸۵۰